

دل پھولوں کی بستی



نگہت عبداللہ



نگہت عابدی

خواتین ڈائجسٹ
اُردو بازار کراچی

دل پھولوں کی بستی

صبح کے لیے کپڑے استری کرتے ہوئے اُس نے اچانک جھجھانے والی خاموشی کو محسوس کیا اور بالکل غیر ارادی طور پر سر اوجھا کر کے جھپٹ کو دیکھنے لگی۔ اصل میں سارا ہنگامہ اوپر برہا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی بڑے بھیا اور بھائی کا آپس کا جھگڑا جس نے سارے گھر کا سکون غارت کر رکھا تھا۔ اور دونوں میں سے کسی کو احساس نہیں تھا حالانکہ شادی کو نو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک ہی پختہ فیمل جو کہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اُس کی خاطر بھی دونوں آپس میں سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بڑے بھیا اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے اور بھائی اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ اماں جی اور ابا جی بھائی کو تو کچھ نہیں کہتے تھے البتہ بڑے بھیا کو سمجھانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور بتا نہیں کیوں ماں باپ کی ہر بات پر سر جھکانے والے بڑے بھیا ایک یہی بات ماں کے نہیں دے رہے تھے۔ سر جھکا کر عاجزی سے کہتے۔

”ابا جی! آپ اس معاملے میں نہیں بولیں“

حالانکہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل میں بھائی بہت بڑے گھر کی محنت۔ زمانہ طالب علمی میں ہی غالباً ان کی بھیا کے ساتھ انڈرائیونڈنگ ہو گئی تھی اور شادی کا پیغام بھی ان کی ہی طرف سے آیا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ بڑے بھیا تھے ہی بہت لائق خالق۔ محنتی اور بہت ہنر مند۔ اس کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ماں باپ۔ ان سے چھوٹے بین بھائی، غلیل، شکیل، عدیل اور ایک بہن آسیہ۔ گو کہ اُس وقت ابا جی بھی ملازمت کرتے تھے اور ڈیڑھ دو سال میں ان سے چھوٹے غلیل بھی ابا کا سہارا بننے والے تھے۔ ایسے میں اگر بھیا چاہتے تو اپنا الگ گھر بسا سکتے تھے لیکن ایک توان میں خود غریبی نہیں مسمیٰ دوسرے انہیں ماں باپ۔ بہن بھائیوں کا خیال بھی تھا اور خصوصاً اپنے بھائیوں کے لیے وہ مثال بننا چاہتے تھے۔ یعنی اُن کے خیال میں اگر آج وہ اپنا گھر بسا کر الگ ہو گئے تو اپنی باری آتے پر اُن کے بھائی بھی ایسا ہی کریں گے اور آخر میں اُن کے ماں باپ اکیلے رہ جائیں گے۔

گو یاد دہانہ شی سے سوچتے ہوئے انہوں نے بھیلہ بھائی کو شادی سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے ماں باپ اپنا گھر نہیں چھوڑیں گے اور اس وقت یقیناً محبت پوری خدو توں پر تھی۔ جب ہی بھیلہ بھائی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ بڑے بھیتا سے وعدہ کیا کہ وہ ہمشا اُن کے ساتھ اسی گھر میں خوش رہیں گی اور بس ابتدائی چند ماہ ہی انہوں نے ہنسی خوشی گزارے تھے اس

کے بعد انہیں یہ گھر بہت چھوٹا لگنے لگا۔ پہلے دیے لفظوں میں پھر واضح الفاظ میں کہ وہ یہاں نہیں رہ سکیں۔ یہاں ان کا دم گھٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت وہ یعنی آسیہ صلاح الدین کافی چھوٹی تھی۔ غالباً ساتویں آٹھویں میں پڑھتی تھی تب اسے نیکل بھائی کا روز بروز داد ملنا چاہا اور بڑے عینا کو تنگ کرنا سخت برا لگتا تھا اور اب جبکہ وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھی تو اسے بڑے عینا پر غصہ آتا تھا کہ آخر وہ نیکل بھائی کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ خواجہ اپنا اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کم از کم نیکل کا ہی خیال کر لیں۔ بے جا راجہ پھر روز کے جگر دلوں سے کیسا سہم کر رہ گیا ہے۔ نیکل بھائی کے بچوں کی طرح شرارتی ہے۔ ان کی طرح ہنستا کھیلتا ہے پتا نہیں پڑھائی میں کیسا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے استری شدہ کپڑے پہن کر رہی تھی کہ میمونہ بھابی دروازے سے جھانک کر آہستہ آواز میں پوچھنے لگیں۔

”اے۔ چائے پیو گی؟“
”اُس نے چونک کر دیکھا اور اُن کے سر گوشانہ انداز پر ہنس کر اکر بولی۔

”مذہب یوں گی لیکن کیا چائے پینے پر پابندی لگ چکی ہے؟“

”نہیں تو؟ میمونہ بھابی کا انداز نہ سمجھنے والا تھا۔

”پھر اپنی رازداری سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”ابھی بتائی ہوں، پہلے چائے پیو، اُنوں نے میمونہ بھابی کہتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد دو لگ لے کر آئیں اور انک اُسے ہنسا کر کہنے لگیں۔

”جیسے تم رازداری کہہ رہی ہو وہ خوف ہے۔“

”کیسا خوف؟“
”وہ تو سننا نہیں تم نے۔ ابھی اوپر کتنا شور تھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آج نیکل بھابی کچھ زیادہ ہی غصے میں تھیں۔“

میمونہ بھابی ابھی بھی آواز دبا کر بول رہی تھیں۔ قصداً وہ خدا سا ہنسی پھر اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”یہ اُن کا معاملہ ہے بھابی! آپ کیوں ڈر رہی ہیں۔ پھر یہ تو روز کا معمول ہے۔ اتنے سالوں سے آپ

خود دیکھ رہی ہیں اور اب تک تو آپ کو عادی ہو جانا چاہیے۔“

”عادی تو میں ہو چکی ہوں اور اتنی کم از کم کسی دن اُن کا جھگڑا نہ ہو تو مجھے تشویش ہونے لگتی ہے۔“

”ابنی بات پر میمونہ بھابی خود ہی ہنسی پھر کہنے لگیں۔“ نیکل بھابی کو تکلیف کیا ہے۔ انا جی نے اوپر

سارے رازداری انہیں دے دیا ہے۔ ہم کو کون سے تو بالکل الگ تھلک ہی ہیں پھر اُن کا الگ گھر کا مطالبہ

پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”ان کا مسئلہ الگ گھر نہیں ہے بھابی! اصل بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہی نہیں ہو پائیں۔“

”ہے تو یہ حقیقت لیکن سچ یہی ہے کہ وہ آزادی چاہتی ہیں۔“

”وہ تا سب بھرے انداز میں سیدھی سادی میمونہ بھابی کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”کلب، پارٹیز، آواز مردوں سے میل جول یہ ساری باتیں ہمارے ہاں محبوب سمجھی جاتی ہیں اور نیکل

بھابی یہاں رہ کر یہ سب نہیں کر پائیں۔ اس لیے الگ گھر چاہتی ہیں۔ وہ بھی ہم سے بہت دور۔“

”لیکن چندا اُن کی شادی کو نو دس سال ہوئے ہیں۔ پھر بچے کی مال بھی ہیں۔“

”یہ ساری باتیں ہم، ہمارے طبقے کی عورتیں سوچتی ہیں بھابی۔ انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے اُن کے انداز نہیں دیکھے اور اسرار نہیں انہیں سے بھی شادی شدہ عورت لگتی ہیں؟“ میمونہ بھابی نے غمی میں سر ہلا کر

گیں۔ اُن کی نگاہوں میں نیکل بھابی کا سراپا سایا ہوا تھا۔ وہ موضوع بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔

”نیکل بھابی اور بچے سوچتے کیا؟“

”نہیں، غلیل دونوں کو ہوم ورک کر رہے تھے۔ میمونہ بھابی کو جیسے ہی احساس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہیں۔ فوراً چائے کے خالی مگ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ کو بھی ہوم ورک کرنا ہے؟“

”نہیں میرا آج کا ہوم ورک ختم ہو گیا۔“ میمونہ بھابی ہنستی ہوئی چلی گئیں تو کچھ دیر تک وہ اُن کے

بارے میں سوچتی رہی پھر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔

صبح کا ذہن بے وقت شاہ سکندر جیات نے اُٹھتے ہی کھرکی کے پردے سمیٹ دیے اور تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لینے کے بعد واش روم کا رخ کیا۔ اُسے تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اور کم وقت میں ہی اُس کی تیاری بھر پور ہوتی تھی۔ ٹھیک بندہ منٹ بعد قدامت آئینے میں اُس نے خود پر بس ایک نظر ڈالی۔ آسمانی شلوار سوٹ پر سیاہ ڈیسٹ کوٹ نے اُس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔ قیمتی رسٹ وائچر کمانی پر سجتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر بابا جان کے کمرے میں آیا تو جا نماز پر بیٹھے ہوئے بابا جان نے آہٹ پر گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔

”السلام علیک بابا جان! اُس نے مؤذبانہ سلام کیا۔

”جیتے۔ ہو۔ کہاں کی تیاری ہے؟“ دعا دینے کے ساتھ ہی بابا جان نے پوچھا۔

”میں ایک کام سے کراچی جا رہا ہوں۔ آپ کوئی کام ہو توں تکیئے؟“

”کراچی تا تو کوئی کام نہیں ہے البتہ زمینوں پر جانا تھا۔ کم کب تک لوٹو گے؟“

بابا جان نے قدرے سوچتے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اُس سے واپسی کا پوچھا۔

”شاید شام تک۔“

”یقین سے کہو تو پھر ہم کل تمہارے ساتھ چلیں گے دروازے اُن بارون کو بھیج دیتے ہیں۔“

”اگر میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے تو پھر میں یقیناً شام تک آ جاؤں گا۔“ اُس نے کہا تو بابا جان ہنس کر بولے۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کل چلیں گے۔“

”مجھے اجازت ہے؟“

”ہوں۔ اپنی بی بی جان سے پوچھ لو۔ انہیں شہر سے کوئی کام ہو تو۔“

”بی بہتر۔“

وہ انہیں سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ پھر بی بی جان سے بہت عجلت میں بات کر کے باہر آیا

تو مورچہ طلوع ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کمرے لینڈ کروڈز میں کراچی جا رہا تھا اور اُسے اپنا تو کوئی کام نہیں تھا بلکہ اُس کے

دوست احمد حسن کی بہن کو کچھ ممبروں کی کمی کے باعث میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں مل رہا تھا اور احمد حسن

نے سفارش کے طور پر اُسے بلایا تھا۔ وہ کیونکہ وعدہ کر چکا تھا اس لیے آج اس کا جانا ناگزیر تھا۔ پھر ویرت

کا معاملہ تھا دروازے کے معمولی کاموں کے لیے وہ خود زحمت نہیں کرتا تھا۔ بہر حال تین گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے

میں طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر پہنچا تو وہ منتظر تھا۔ ادھر چاہتا تھا کہ پہلے اُس کی کچھ خاطر مدارت کرے لیکن

وہ منع کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں احمد حسن! جو ضروری کام ہے پہلے وہ کر لینا چاہیے۔ تم چلو گے یا؟“

”میں چل رہا ہوں۔ احمد حسن فوراً دوسری طرف سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے گاڑی آگے

بڑھادی پھر پوچھنے لگا۔

”گھر میں سب چیز تیار ہے ناں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ بس وہ نائٹ نے ایڈمیشن نہ ہونے کی وجہ سے رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے۔“

احمد حسن نے بتاتے ہوئے اُسے یوں دیکھا جیسے اس کی طرف سے کوئی یقین چاہتا ہو لیکن اُس نے قہراً خاموشی اختیار کر لی۔ اور جب اُس کا کام ہو گیا یعنی نالندہ کا ایڈمیشن تب مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے۔ نالندہ کے لیے یہ بڑی خوشخبری ہوگی۔“
 ”واقعی وہ تو خوشی سے باہل ہو چلے گی۔“ نالندہ کی خوشی کے خیال سے احمد حسن خوش ہو کر بولا۔
 ”جلد پھر اُس روٹی ہوئی تو کی کو ہنسائیں۔“ اُس نے کہا پھر معاً خیال آئے پر رک کر بولا۔ ”ایسا کرو احمد حسن تم جا کر نالندہ کو خوشخبری سننا اور اُس سے کہنا اپنے ہاتھوں سے میرے لیے شامی کباب بنا رکھے۔ میں دوپہر کے کھانے تک پہنچ جاؤں گا۔“

”ابھی کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے غمگینہ بھرے انداز پر احمد حسن نے فوراً پوچھا۔
 ”بی بی جان کا ایک کام ہے۔ بس منشا کر آتا ہوں۔ کہو تو نہیں ڈرا پ کرتا جاؤں؟“ اس نے گاڑی کا لالک کھولتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں چلا جاؤں گا۔ نو پر اہم۔ بس تم یہ یاد رکھنا کہ کھانا نہیں ہمارے ساتھ کھانا ہے۔“ احمد حسن نے تاکید کرنی ضروری سمجھی۔
 ”یاد رکھوں گا یہ وہ مسکراتا ہو گا گاڑی میں بیٹھ گیا۔“

بھرنی بی جان کے کام سے فارغ ہو کر اُس کا دل چاہا وہیں سے واپسی کی راہ لے۔ احمد حسن سے اگلی ملاقات پر معذرت کر کے گا۔ پھر نالندہ کا خیال آیا جس نے یقیناً اُس کے لیے خاص اہتمام سے شامی کباب بنا رکھے ہوں گے۔ یوں ہی بقول احمد حسن وہ دروازہ پر ہلکا ہوا ہدیہ بھی اُسی کے دروازے پر پہنچ جائے گی۔ بس اُسی باخیاں کر کے اُس نے واپسی کا خیال ترک کر دیا اور گاڑی احمد حسن کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔
 دو بج رہے تھے اور اُسے واپس بھی آج ہی جانا تھا، کیونکہ بابا جان سے کہہ چکا تھا۔ اسی حساب سے وہ واپسی کا سوچنے لگا کہ چار بجے تک پہنچے پر وہ ساڑھے چھ سات بجے تک پہنچ جائے گا۔ اور گرمیوں کے دن تھے۔ سات بجے تو شام بھی پوری طرح نہیں اُترتی تھی۔ گویا وہ اطمینان سے ہو گیا اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی تاکہ سگنل بند ہونے سے پہلے نکل جائے۔ لیکن اس سے پہلے ہی ریڈ سگنل آن ہو گیا۔ اُس نے کچھ جھنجھلا کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر لوہی وائیلز جانب گردن موڑی تو یکجہت ساری جھنجھلاہٹ دور ہو گئی۔ حالانکہ وہ کوئی دل چھینک شہر کا نوجوان نہیں تھا نہ ہی کسی خوبصورت لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی بہت زیادہ حسین و جمیل بھی نہیں تھی لیکن کوئی بات تو ضرور تھی اُس میں جو شاہ سکندر حیات کی نظر میں اُس پر منحصر گئی تھیں۔ سگنل ٹران ہو گیا۔ پیچھے گاڑیوں کے ہارن شور مچانے لگے تب اُس نے چونک کر گاڑی اگلے بڑھائی لیکن سارا دھیان وہیں رہ گیا تھا۔

پریکٹیکل کی وجہ سے آج اُسے اپنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے کچھ کپڑے بدل کر کچن میں آگئی اور کھانا گرم کرنے لگی۔ پھر ایک پلیٹ میں سالن اور ڈاٹ باٹ سے ایک روٹی نکال کر وہ ڈائننگ روم کے بھانے اُٹا کر بی کے کمرے میں آگئی۔

”آئیں بیٹا؟“ اُٹا کر بی اُسے دیکھ کر بولیں۔
 ”جی اور دیکھ لیں، کھانا بھی کھا رہی ہوں۔ پھر آپ کہیں گی میں نے کچھ کھایا نہیں۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اتنی سی روٹی کھاؤ گی تو یہی کہوں گی؟“ اُٹا کر بی نے اُس کی منہ میں دینی روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہ بھی بہت ہے اُٹا کر بی اگر میں تو کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“ تمہی نیل دروازے میں آکر پوچھنے لگا۔

”اُٹا کر بی! میں آپ کے پاس سو جاؤں، ادھر ادھر سو گیا مجھے سوئے نہیں دے رہے۔“
 ”آج او میرے بچے۔“ میری جان! اُٹا کر بی جان نے پکارتے ہوئے نیل کے لیے بائیں پھیلا دیں اور

اُس نے کھانا چھوڑ کر نیل کو اُٹا کر بی کی آغوش میں سماتے ہوئے دیکھا پھر دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔
 ”کیا ہوا اُٹا کر بی۔“ نیل نے کہاں کہاں ہیں؟“

”بیکے گئی ہوں گی۔ یعنی اُٹا کر بی کو خود پتا نہیں تھا۔ اپنے طور پر فرض کر لیا۔ وہ اُن کی بے بسی محسوس کرتے ہوئے نیل سے کہنے لگی۔“

”نیل بیٹا! آپ میرے کمرے میں چلے جاؤ۔ ابھی میں بھی آ رہی ہوں پھر ہم مل کر سوئیں گے۔“
 ”بھو بھو! کہاں کہاں بھی سنائیں گی؟“ نیل اُٹا کر بی کی آغوش سے نکل کر پوچھنے لگا تو وہ اُس کا گال تھپک کر بولی۔

”کہانی رات میں۔ ابھی ہم سوئیں گے۔ جلو شامش۔“
 نیل دوسرے پتوں کی طرح کبھی ضد نہیں کرتا تھا۔ جو کہ وہ اُٹا کر بی سے بات اُس کی فطرت میں شامل تھی یا اپنے ماں باپ کی طرف سے نظر انداز ہونے پر عدم تحفظ کا شکار ہونے کے ساتھ اندر سے خائف تھا۔ ابھی بھی چپ چاپ جا کر تو قدرے توقف سے وہ اُٹا کر بی سے کہنے لگی۔

”اُٹا کر بی! آپ بڑے بھیا تو سمجھائیں۔ اُن کے لیے بھائی کی بات مان لینا ہی بہتر ہے۔ آخر وہ کیوں اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ بچے کا بھی کوئی خیال نہیں۔“
 ”میں کیا کروں۔“ اتنی دفعہ تو کہہ چکی ہوں۔ اور ابھی کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ یہاں تو نیل کو دیکھنے والے ہم سب ہیں۔ اکیلے گھر میں نیل اُسے چھوڑ کر جائے گی تب بچے کا کیا حال ہوگا؟ اُٹا کر بی اس معاملے میں خاصی مجبور نظر آئیں۔

”عجیب مشکل میں ہیں بڑے بھیا۔ پتا نہیں کیا ہوگا؟“ وہ کہتے ہوئے آنکھ کھری ہوئی۔
 ”اللہ بہتر کرے والا ہے۔“ اُٹا کر بی نے کہی۔ ”کچھ بھی ہو۔ پھر اُسے نیل کے پاس جانے کا کہا تو وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ نیل کی آنکھوں میں دیند بھری ہوئی تھی لیکن اُس کے انتظار میں زبردستی آنکھیں کھولے ہوئے تھا۔

”کیا بات ہے چاند اُتر سوئے نہیں؟“ وہ اس کے پاس لیٹتے ہوئے بولی۔
 ”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا پھو پھو۔“

”سو رہی بیٹا! میں اُٹا کر بی سے بات کرنے بیٹھ گئی۔ جلو سو جاؤ۔“
 وہ اُس کی پیشانی پر حوٹ کر اُٹا کر بی سے کہنے لگی۔ نیل فوراً سو گیا اور کچھ دیر بعد اُسے بھی نیند آگئی تھی۔
 شام میں اچانک طور سے اُس کی آنکھ کھل گئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ دل بھی زبرد زبرد سے دھڑکنے لگا تھا کیونکہ نیند میں سے اُٹھتی تھی اُس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ سوئے ہوئے نیل کی طرف سے اطمینان کے کمرے سے نکل کر آتی تو ادھر سے آتی میوز بھائی نے بتایا کہ اسلام آباد سے شکیل بھائی بھائی پتوں سمیت آئے ہیں۔ اُس نے خوش ہو کر اُٹا کر بی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اور کمرے میں ہی اسی تیزی سے داخل ہوئی تو اُٹا کر بی اُسے دیکھ کر بولیں۔

”لو آئی! آئی! السلام علیکم۔“ اُس نے سلام کیا پھر پہلے بھائی سے ملی اس کے بعد بھائی کے گلے لگ گئی۔
 ”تمہی پتوں سے تو ملو۔“ بتایا کر کرتے ہیں تمہیں۔ شکیل بھائی نے کہا تو سہما بھائی سے الگ ہو کر اُس نے ٹیبلٹ اور اشعر کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا پھر اُن سے پوچھنے لگی۔

”چچا جانا۔ تم دونوں میں سے کون زیادہ یاد کرتا ہے مجھے؟“
 ”دونوں۔“ پتوں سے پہلے سہما بھائی بول پڑیں۔ ”دونوں بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔“
 ”اور آپ؟“ اُس نے شہزاد سے پوچھا تو سہما بھائی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔
 ”مجھے قسمت ہی نہیں ملتی۔“ وہ ہنس پڑی۔
 تب ہی میوز بھائی چلے اور پتوں کے لیے سکرائٹ لے کر آئیں تو وہ اس کے بعد کے کام

سوچ کر کہے سے نکل آئی۔ پھر پہلے نبیل کو اٹھا کر اس کا منہ ہاتھ دھلایا اس کے بعد خود منہ ہاتھ دھو کر سیدھا کچن کا رخ کیا۔
 شکیل بھائی ابھی چھ ماہ پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر اسلام آباد آئے تھے۔ اس سے پہلے ہمیں کراچی میں ان کی جانب مئی اور اسی گھر میں سب کے ساتھ رہتے تھے۔ سولہ بیل بھائی کے اس گھر میں سب مل جل کر محبت سے رہتے تھے۔ جیسی کو سیما بھائی کا اسلام آباد میں دل نہیں دل لگتا تھا۔ ہر تیسرے دن ان کا فون آتا اور تنہائی کا رونا رونق مٹیں۔ لیکن کیا کرتیں مجبور تھیں۔ رہنا بہر حال انہیں میل کے ساتھ تھا۔ ابھی بھی شکیل بھائی آفس ٹوڑ کر صرف دو دن کے لیے آئے تھے اور وہ بھی خد کر کے ساتھ چلی آئیں۔ رات میں شکیل بھائی، اماں جی کے ساتھ باقاعدہ ان کی شکایت لے کر بیٹھ گئے۔
 ہمیں آفس کے کام سے آ کر ہاتھ اماں جی! یہ خواہ مخواہ تیار ہو گئیں۔ بتائیے دو دن میں ان کی طبیعت بہر ہو جلنے لگی؟

”صرف دو دن! اماں جی نے تعجب سے پوچھا۔
 ”جی! اس سے زیادہ ایک دن نہیں اور بچوں کے سکول کی وجہ سے انہیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتا! شکیل بھائی نے کہا تو اماں جی ان کے بچلے بھائی کی طرف داری میں کہنے لگیں۔
 ”کیا کرے نیچی بے جباری۔ وہاں اکیلے گھبراتے ہو گئی۔
 ”لیجئے اب تو انہیں اور شرم دے رہی ہیں“ شکیل بھائی نے سر ہٹا اور سیما بھائی بیٹھنے لگیں۔
 دو دن گھر میں خوب رونی رہی۔ احمد اور سونیا بھی سمیٹے اور اشعر کے آنے سے بہت خوش تھے۔ البتہ نبیل اسی طرح جب چپ سا رہا۔ گوکہ ان سے براعتاً پھر بھی وہ چاروں اس پر رعب جم رہے تھے۔ اس وقت وہ۔ یہی دیکھ رہی تھی۔ سمیٹے نہ کہا۔
 ”نبیل! تم وہاں بیٹھ جاؤ“ وہ بیٹھ گیا۔ پھر اصرار نہ کیا۔
 ”نبیل وہ کرسی اٹھا لاؤ“ اور وہ اس کے حکم کی تعمیل میں کھڑا ہو گیا۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ سب کو ہلا کر لاٹن سے کھڑا کرتے ہوئے بولی۔
 ”کتنی بری بات ہے۔ نبیل تم سب سے بڑا ہے اور تم لوگ بھلے اس کی عزت کرنے کے اس پر رعب جم رہے ہو“
 ”میمو! نبیل نے“ سمیٹے جلنے کیا کہنے جا رہی تھی کہ وہ فوراً لوٹ کر بولی۔
 ”اول ہوں۔ نبیل نہیں۔ نبیل بھائی کہہ رہے“
 ”نہیں میمو! میں نبیل بھائی نہیں کہوں گی“ سمیٹے بیور کر بولی۔ تو اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”کیوں؟“
 ”میمو! تجھے مامے کا“ سمیٹے کی معصومیت جو غالباً یہ سمجھ رہی تھی کہ بڑا بھائی ماما زاد ہے۔
 ”بالکل نہیں! اس نے سمیٹے کو قریب بلا لیا اور بازو کے حلقے میں لے کر بولی: ”نبیل بہت اچھا بچہ ہے کسی کو نہیں مار سکتا۔ اب اسے نبیل بھائی کہو گی تو یہ آپ کا خیال رکھے گا“
 ”اشعر کا بھی؟“ سمیٹے کو فوراً چھوٹے بھائی کا خیال آیا۔
 ”ہاں اشعر کا بھی! احمد اور سونیا کا بھی سب کا خیال رکھے گا“
 ”اور میمو! نبیل بھائی کا خیال کون رکھے گا؟“
 آہنی سی سونیا نے آہنی سمجھداری سے پوچھا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی پھر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے بولی۔

”میں۔ بلکہ ہم سب نبیل کا خیال رکھیں گے“
 ”تجھی میمو! نبیل اور سیما بھائی لاؤں سے نکلیں اور اسے بچوں میں گھرے دیکھ کر سیما بھائی ہنسنے

ہوئے بولیں۔

”لوہر مستقبل قریب کی ڈاکٹر صاحبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں لا“
 ”جناب! میں ان پر دلیرانہ کر رہی ہوں! وہ دھمک رہی ہیں۔“
 ”ماشاء اللہ! دو دنوں بعد وہیں کرسیاں اس کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئیں تو اس نے پہلے بچوں کو اکام سے کھینے کی تاکید کی پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
 ”تو صبح ایک جا رہی ہیں؟“
 ”ہاں دیکھو اپنے بیٹا کو۔ ایک دن اور نہیں رگ رہے! سیما بھائی کا بالکل جلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ منہ پچلا کر بولیں۔
 ”آپ نے غلطی کی ناں بھائی! اگلے بیٹھے بچوں کی چٹیاں ہو رہی ہیں! اب اطمینان سے آئیں۔ شکیل بھائی تو جب بھی آئیں گے ایسے ہی آئیں گے! وہ بھائی کی تجوری کا احساس کر کے بولی۔
 ”ہاں تمہارے بھائی بھی۔ یہی کہہ رہے تھے۔ خیر تم چلو ہمارے ساتھ۔ آج کل اسلام آباد کا موسم بہت اچھا ہے“

”سیما بھائی نے محبت سے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔
 ”میں کیسے جا سکتی ہوں بھائی! آپ کو خیال ہے میرا آخری سال ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ فرار ہوؤں گی! اس نے کہا تبھی نبیل بھائی انگلی میں کی رنگ گھاٹی اپنے مخصوص انداز میں اونچی ہیل کی ٹنگ نکال کر تکی آئیں اور پیسے بادل غواستہ ان کے قریب رک کر سیما بھائی سے پوچھنے لگیں۔
 ”تم صبح جا رہی ہو؟“
 ”جی! سیما بھائی محترمہ جواب دے کر خاموش ہو گئیں۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”بیٹھیں بھائی!“

”نہیں۔ بس تم ميمو۔ اچھا سیما! صبح تم جاؤ گی میں سو رہی ہوں گی! اس کے بعد کچھ کہا نہیں لیکن انداز کو باہمی وقت خدا حافظ کا ساتھ۔ اور جلنے لگیں کہ نبیل دیکھ کر بھاگا گیا۔
 ”معمی! نبیل نے ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر لپکا لا تو وہ اسے بازو سے پکڑ کر پرے دھکیلتے ہوئے بولیں۔
 ”یہ کیا بد قیڑی ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ کیا کرو رہے جو بچلے“
 ”اس نے ساتھ ہی ٹنگ نکال کر تکی میرٹھیاں چڑھ گئیں تو وہ جو بلا ارادہ ان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی سر جھٹک کر دوبارہ بیٹھنے لگی۔ کہ نظر نبیل پر پڑی۔ بچہ ماں کی بے رحمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اس نے اندر ہی اندر گڑھتے ہوئے اسے ہلا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ ابھی بابا احان کے ساتھ زمینوں سے لوٹا تھا اور لینے کے بعد جلنے اس نے اپنے کپے میں ہی منگولی لٹی تھی۔ اور رگ رگ کر جلنے کے سبب لپکتے ہوئے وہ کپے سے نکل کر ٹیڑھیں پر اٹھ کر ہوا تو سلونی شام میں اسے وہ بڑی شدت سے یاد آئی جسے تین روز پہلے اس نے تپتی دھوپ میں سر کی کے کنارے غالباً بس کے انتظار میں کھڑے دیکھا تھا اور ان تین دنوں میں مسلسل تو نہیں لیکن وقفے وقفے سے فرد اس کا دھیان اس کی طرف کیا تھا۔ اور وہ خود حیران ہو رہا تھا کہ اس طرح تو اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صنف نازک کو اس نے کبھی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ گزشتہ سال جب شہر بانو اور شاہ ہارون کی منگنی کے ساتھ بدلے میں اس کی مہر انصار سے نسبت ملے ہوئی تھی تب بھی اس کے اندر کوئی خوشگوار احساس نہیں جاگا تھا۔ نہ ہی اس کے بعد مہر النساء کا اس کے سامنے آنے سے گریز کرنا یا اچانک سامنا ہو جانے پر لجا نا اسے متوجہ کر سکا۔ جبکہ وہ بہت خوبصورت بھی تھی لیکن ساری بات تو دل کی ہے۔ رگ کہاں بے اختیار ہو جائے کچھ بتا نہیں جاتا اور شاہ سکندر حیات

نہیں خیر رات تو وہاں نہیں بٹھ سکتا۔ سب بچے ساتھ ہیں اس کے اور شاہ یونس کے بھی ۛ
اس نے بی بی جان کی بات سن کر مزید کچھ نہیں کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی روز کی طرح وہ پستی ہوئی دھوپ میں بس کے انتظار میں کھڑی نظر آئی اور اُسے دیکھتے ہی شاہ بکد جات
کو اپنے کرائی آنے کا مقصد سمجھ میں آیا۔ اور واقعی وہ حیران رہ گیا یعنی صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خاطر وہ شاہ پور
سے یہاں آتا تھا۔

”نہیں ۛ اُس نے اس حقیقت کو جھٹلانا چاہا لیکن کسی طرح حقیقت جھٹلائی نہیں گئی۔ اُسے دیکھ کر ہی

تو اس کا اضطراب اچانک ختم کیا تھا۔ درگزر شدہ دو گھنٹے سے انتہائی مضطرب حالت میں گاڑی مختلف
سڑکوں پر دوڑاتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کس کام سے آیا ہے۔ حالانکہ کل شام
بی بی جان کے استفسار پر اس نے کہا تھا سو کام ہوتے ہیں اور ہوتے بھی تھے۔ لیکن آج تو کوئی کام نہیں
تھا پھر بھی کسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہو اور اب مقصد کا ادراک اُسے سخت
حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ تحیر سے نکلتا وہ بس میں سوار ہو کر نظروں سے اوجھل
ہو گئی اور اپنے پیچھے منظر میں جو وہ خلا چھوڑ گئی تھی اُسے شدت سے محسوس کرتے ہوئے وہ چونک
کر رادھارادھ دیکھنے لگا۔ اور وہ تو کہیں نظر نہیں آتی البتہ نالہ اُسے دیکھ کر جھانک آئی۔

”ارے کندہ بجائی آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ۛ“

”وہ ایک کام سے آیا تھا ۛ“ وہ بھل کر بولا۔

”کچھ گئی کسی کا ایڈمیشن کروانے آئے ہوں گے ۛ نالہ نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”خیر اب ایسا اندیشہ بھی نہیں بچا کہ میرے کہنے پر وہ تم جیسی نالائق لڑکیوں سے کالج بھر دیں ۛ

”جی ۛ میں نالائق نہیں ہوں ۛ نالہ منہ جھٹلا کر بولی۔

”اچھا چلو بیٹھو ۛ میں تہاری طرف جا رہا ہوں ۛ اُس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو

نالہ رک کر شوق سے پوچھنے لگی۔

”ابنی دوستوں کو نہیں بلالوں ۛ“

”کیا ۛ میں تمہیں اتنا فالو نظر آتا ہوں ۛ چلو بیٹھو۔“

اُس نے ناگواری اور رعب سے کہا تو نالہ بڑ بڑاتی ہوئی دوسری طرف سے آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی

سے ڈرامہ کرنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔

”تمہاری کلاسز شروع ہو گئیں ۛ“

”جی ۛ“ نالہ ابھی اُس کے رعب سے نکلے نہیں تھی جیہی اُس کے حلق سے مشکل سے آواز نکلی اور

وہ سمجھ کر قہقہہ انجان سا بن گیا۔

پھر اُس نے جاکر نالہ کو اُس کے گھر پر اتار کر چلا جائے کیونکہ احمد حسن اس وقت گھر پر نہیں
تھا لیکن نالہ نے اُسے جانے نہیں دیا۔ گو کہ اس گھر میں اُس سے کوئی پردہ نہیں تھا پھر بھی نالہ اور
اُس کی امی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے وہ کچھ جھجک رہا تھا۔ کھانے کے دوران نالہ کی امی نے

اُس کے گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت پوچھی پھر کہنے لگیں۔

”کبھی اپنی بی بی جان اور بہنوں کو لے کر آیا وہ بالکل بھی حویلی سے باہر نہیں نکلتیں ۛ

”نہیں ان کا کراچی آنا جانا رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھار البتہ مری اسلام آباد سال میں دو بار جاتی ہیں وہ

بھی بچوں کی وجہ سے ۛ“

اُس نے بتایا تو انہوں نے ناممبھی کے عالم میں کہا۔

”بچوں کی وجہ سے ۛ“

”جی ۛ اصل میں میرے بھائیوں کے بچے مری کاؤنٹیٹ میں پڑھتے ہیں۔ جھٹیوں کے علاوہ جب بی بی

بہلی بار اپنے دل کو اپنے اختیار سے باہر محسوس کر رہا تھا۔
”بھائی! اب کوئی بی جان بلا رہی ہیں ۛ“ تعجب سے شہر بانو نے پکار کر کہا تو اس نے اپنے خیال سے چونک
کر جلت کر دیکھا اور کوئی بھی پوچھ لیا۔

”خیریت ۛ“
”خیریت نہیں لگتی بھائی! بی بی جان کچھ ناراض لگ رہی ہیں ۛ شہر بانو نے کہا تو وہ اپنی طرف اشارہ
کے کئے بولا۔

”مجھ سے ۛ“
”جی نہیں آپ سے یا کسی اور سے۔ آپ چلیں تو ۛ“
”ہاں چل رہا ہوں۔ وہ چلے گا خالی کپ اُسے فکرا کہ بی جان کی ناراضگی سوجھتا ہوا میٹھیان اتر کر آیا تو وہ بڑے
بال کرے میں بیٹھی نظر آئیں۔ اُس نے قریب آکر سلام کیا تو بی بی جان اُسے دیکھ کر قدرے خفگی سے
بولیں۔

”ماشاء اللہ۔ تین دن بعد لوٹے ہو ۛ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ پہلے ماں کو اپنی صورت دکھا دو ۛ“
”سوری بی بی جان ۛ“ وہ اپنی کوتاہی پر تادم ہوا اور ان کے قریب بیٹھ کر ان کے گرد اپنے بازوؤں
کا گھیرا بنا کر صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اصل میں راستوں کی گرد سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی سوچا
پہلے نہالوں پھر آپ کی خدمت میں پیش ہوں گا ۛ“

”کچھ کھا لیتے ۛ“ بی بی جان نے اپنا آب چھڑاتے ہوئے پوچھا۔
”جیسے بی چکا ہوں، اور کھانا رات میں ہی کھاؤں گا ۛ“ گویا اس وقت اُس نے کچھ بھی کھانے
سے انکار کر دیا۔

”اتنی گرمی میں چائے، کتنی بار منع کیا ہے، کم از کم گرمی نہیں چلے نہیں پیا کر دھمت خراب
کر رہے ۛ“ بی بی جان نے حسب عادت چائے کا سن کر ٹوکنا ضروری سمجھا۔

”بی بی جان جس چیز کی عادت ہو وہ پھر گرمی سردی نہیں دیکھتی، شہر بانو نے بتائیے خاموشی کیسی ہے
میرا مطلب ہے بچے سب کہاں ہیں ۛ“
اُس نے اچانک خاموشی محسوس کرتے ہوئے اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے بارے میں پوچھا۔

”بچے سب شاہ جہانگیر کے ساتھ تمہارے پچا جان کی طرف گئے ہیں ۛ“
”خیریت ۛ“
”ہاں صبح مہر الساء آئی تھی تو شہر بانو نے اُسے روک لیا ابھی سب اُسے چھوڑنے گئے ہیں جہانگیر

جا رہا تھا تو بچے بھی ساتھ تیار ہو گئے ۛ“
بی بی جان نے بتایا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر قدرے توقف سے پُرسوج انداز میں
بولی۔

”میں صبح کراچی جاؤں گا ۛ“
”کیوں ۛ ابھی اُس دن تو گئے تھے ۛ“ بی بی جان نے ٹوکتے ہوئے کہا۔
”بی بی جان! سو کام ہوتے ہیں، پھر کراچی کون سا دور ہے۔ ابھی جاؤ ابھی آؤ ۛ“

اُس نے کام کی نوعیت نہیں بتائی، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔
”میں اپنے کمرے میں ہوں، جہانگیر بھائی آئیں تو کھے بلا لیجئے گا ۛ“
”جہانگیر کو تمہارے چچا اتنی جلدی تو نہیں آنے دیں گے ۛ“ بی بی جان نے کہا تو وہ جاتے جلد
رک کر بولا۔

”کیا مطلب ۛ رات وین رکیں گے ۛ“

”اچھا اچھا!“ انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا پھر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولیں: ”گری بہت ہے تم ایسا کرو سکنڈ ریج دیر آرام کر لو۔ احمد حسن کے کمرے میں یا نالکھ سے کپو گسٹ روم کھول دے“ جی۔! وہ اسی قدر کپکپ سوچنے لگا کہ آیا اسے یہاں لکنا چاہیے یا دلہی کی راہ لے۔

چلیں سکندر بھائی کہاں بیٹلنا ہے احمد بھائی کے کمرے میں یا۔!

”میرا خیال ہے مجھے گسٹ روم میں پہنچا دو یا ایک بل میں فیصلہ کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔“

میونہ بھائی کے ہاں تمیرے بچے کی آمد تھی۔ اماں جی انہیں لے کر ہاسٹل گئی ہوئی تھیں اور نبیلہ بھائی بچوں ہی گھر پر نہیں رہتی تھیں۔ وہ کالج سے لوٹی تو تینوں بچے نبیل احمد اور سونیا۔ آبا جی کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ اسے دیکھتے ہی سونیا وہیں سے پکار کر لولی۔

”بھو بھو! اماں جی اور امی نہیں ہیں!“

”کہاں گئی ہیں؟“ اس نے پوچھا لیکن پھر فوراً ہی اُسے میونہ بھائی کی کنڈیشن یاد آئی تو اس سے پہلے کہ سونیا آبا جی کے سامنے کچھ اٹا سیدھا بولتی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر نہ ہاتھ دھو کر نکل کر پہلے آبا جی اور بچوں سے کھانے کا پوچھا۔

”ہم کھا چکے ہیں بیٹی۔ تم کھا لو!“ آبا جی نے کہا۔

”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے!“ اس نے کہا پھر آبا جی کے آرام کے خیال سے تینوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”جلو اب تم سب آرام سے سو جاؤ۔ شام میں اٹھو گے تو میں تمہیں ایک پیارا سا گول مٹل سامنا دکھاؤں گی۔“

اپنے تینوں اُس نے بچوں کو لالچ دیا لیکن سونیا بڑے آرام سے بولی۔

”مجھے پتا ہے۔ امی لیئے گئی ہیں!“

”چلا کو ماسی! تمہیں لیئے پتا ہے؟“ وہ سونیا کے چھوٹے گال پر ہلکے سے چٹکی کاٹ کر بولی۔

”اماں جی نے بتایا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ ہم تمہارے لیے منسا بھان لینے جا رہے ہیں!“

یقیناً اماں جی انہیں بہلا کر گئی ہوں گی اور سونیا نے ان کا حرف بہ حرف دہرایا۔ پھر پوچھنے لگی۔

”بھو بھو! وہ منسا بھائی میرا ہو گا ناں۔ نبیل کا تو نہیں ہو گا!“

”کیوں نبیل کا کیوں نہیں ہو گا؟“ اس نے نبیل کے معصوم چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”اس لیے جاری امی لے کر آئیں گی۔ نبیل کی امی تو!“

”سونیا۔! اس نے فوراً ٹوٹک دیا۔ بڑی بات ہے بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نبیل بھی تمہارا بھائی ہے اور تم سب کو مل جل کر رہنا ہے۔“

”بھو بھو! سونیا گندی بچی ہے۔ یہ نبیل بھائی کو نبیل کہتی ہے۔! احمد نے خود کو سمجھا دیکھا کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میں گندی بچی نہیں ہوں! سونیا کو سخت برا لگا۔ رونے لگی تو وہ اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر لولی۔

”نہیں! آخر! سونیا بہت اچھی بچی ہے!“

مقابلہ برپا نظر پڑی۔ وہ سونیا کو روکتے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ تب وہ بہت پیار سے اُسے مخاطب کر کے بولی۔

”کیا بات ہے نبیل تم کیوں خاموش ہو۔؟“ جواب میں معصوم بچے کے سینے میں جانے کب سے دلی ہوئی گہری سانس آہ کی صورت خارج ہوئی تو اس نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”میرا جان۔! وہ بس یہی کہہ رہی تھی کہ سونیا گندی بچی ہے۔! وقت عدیل بھائی آگئے اور زوردار سلام کے ساتھ لپٹا دیا۔

”نیا بھتیجا مبارک ہو۔!“

”نیا بھتیجا۔! اس نے چونک کر دیکھا پھر پوچھنے لگی: ”آپ ہاسٹل سے آ رہے ہیں۔؟“

”نہیں! آفس سے!“ عدیل بھائی سونیا کو گود میں اٹھا کر اُس کی جگہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

”پھر آپ کو کیسے پتا چلا۔؟“

”اماں جی کا فون آتا تھا غلطی سے۔ یعنی نہ ملنا چاہ رہی تھیں خلیل بھائی کے مل گئے میرے!“

عدیل بھائی محفوظ انداز میں بتا کر رہے تو وہ بھی نہیں بڑی پھر پوچھنے لگی۔

”اور کچھ کہا اماں جی نے۔؟“ عدیل بھائی سونیا کو گود گرائے میں لگ گئے تھے۔ جب ہی اُس کی بات سنی نہیں۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر قدر سے اونچی آواز میں اُن سے کھانے کا پوچھا۔

”ہاں، کھانا کھاؤں گا!“ انہوں نے کہا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اگلے دن صبح اُس کی سمجھ میں نہیں آ گیا کہ اسے کیونکہ اماں جی اور میونہ بھائی دونوں نہیں تھیں اور اس کا کالج جانا ناگزیر تھا۔ بچوں کو تو اس نے آرام سے اسکول بھیج دیا۔ اس کے بعد مسئلہ دوسرے کا ہوا کا تھا جنسوی بچوں کے اسکول سے واپس آنے پر انہیں اٹینڈ کرنا اور اُس وقت تک وہ کالج سے نہیں لوتی تھی۔

”کیا بات ہے تمہیں کالج نہیں جانا!“ عدیل بھائی نے اُسے تیار نہ دیکھ کر پوچھا۔ روزانہ صبح وہ انہی کے ساتھ جاتی تھی۔

”کیا کروں بھائی! جانا بھی ضروری ہے!“ وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

”پھر کیا مسئلہ ہے۔؟“

”اتناں جی اور بھائی نہیں ہیں۔ بچے اسکول سے آئیں گے تو پریشان ہوں گے، کیا کروں، چھٹی کر لوں۔؟“

”نہیں چھٹی کرنے سے تمہارا نقصان ہو گا۔ ایسا کرو نبیلہ بھائی سے کہہ آؤ۔ وہ دیکھ لیں گی بچوں کو!“

عدیل بھائی بڑے آرام سے کہہ کر تیار ہونے چلے گئے اور وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”نامن۔! نبیلہ بھائی ایک اپنے بچے کا تو خیال کرتی نہیں ہیں!“

اس نے نبیلہ بھائی کے پاس جانے کا خیال جھٹک دیا اور آبا جی کے پکارنے پر کچن سے نکل کر برآمدے میں آئی تو وہ کہنے لگے۔

”بیٹا! بچوں کی فکر نہیں کرو! میں ہوں ناں!“

”لیکن آبا جی! آپ کھانا تو نہیں پکا سکتے۔ اور بچے تو آتے ہی کھانا مانگیں گے۔“

”کھانا بازار سے آجائے گا۔ اور خلیل میاں بھی ابھی ہاسٹل کا چکر لگا کر آجائیں گے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی، تم جاؤ۔“

آبا جی نے اسے اطمینان دلایا اُدھر سے عدیل بھائی چلائے۔

”جلدی کرو آسیہ! صرف دس منٹ ہیں!“

”دس منٹ۔! وہ تیار ہونے اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔“

اور جب یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ صرف اُس لڑکی کی خاطر میلوں مسافت طے کر کے آیا تھا تو اب خود اس نے طے کر لیا تھا کہ اس تک رسائی حاصل کیے بنا وہ واپس نہیں جائے گا کیونکہ گزشتہ نام اُس نے تین بار واپس کا قصد کیا اُسے لگا وہ کل پھر آئے گا۔ اور روزانہ شاہ پور سے آجائے گا اس کے لیے کوئی اتنا مشکل تو نہیں تھا لیکن بس یہ خیال کہ وہاں باا جان اُسے کسی کام میں مصروف کر سکتے تھے۔

دو دو جانا تھا کہ اب وہ کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ جب تک اُس کے بارے میں جان نہ لے۔

وہ جو کوئی بھی تھی پہلی نظر میں نہ صرف اُسے اچھی لگی بلکہ اُس کے حواسوں پر چھا گئی تھی اور شاہ سکندر نیات کے لیے یہ بھی تو حیران کن بات۔ اس کے ساتھ وہ اپنی کوفیات سے لطف بھی لے رہا تھا

اور اُسے عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ کیونکہ اُس نے صفت نازک کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی کھدو یا جذبات سے عاری شخص نہیں تھا۔ البتہ معنہ و ضرور تھا۔ اور شاید یہ اس کا حق بھی تھا۔ بے پناہ وجاہت کے ساتھ نواز بزاؤں جیسی شان و شوکت پر ایک کے حصے میں تو نہیں آتی۔ پھر خود سے واقف بھی تھا۔ جانتا تھا کہ جس راستے پر قدم رکھتا ہے وہ خود پر رشک کر رہا ہے۔ بہ حال یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ وہ خود کسی لڑکی کی تلاش میں جا رہا تھا۔ یورپی تدریس کے ساتھ اور یہ نتیجہ کر کے کہ اپنی تین رائوں کی بے غرابی اور دلوں کا انتظار اس کے کھاتے میں ڈال آئے گا۔

اتنا زعم۔ یعنی اُسے یقین تھا کہ اُسے دیکھ کر وہ اپنی نیندیں گھوٹا بیٹھے گی۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔ کیونکہ اوّل روز وہ سینڈ کوٹ پر نظر آئی تھی، اور کل اُسے دیکھنے کے بعد نہیں سے اس نے نالندہ کو یک کیا تھا۔ اور وہ چاہتا تو نالندہ کے ذریعے آسانی سے اس کا نام پتا جان سکتا تھا لیکن اپنے دل پر گزرنے والی واردات میں فی الحال وہ کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس جستجو کا ایک الگ مزہ تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اُس نے گاڑی کی اسپید کم کر دی۔ پھر جیسے ہی سمنے دیکھا وہ بہت عجلت میں رو کر اس کوئی نظر آئی، اور اسی بل وہ اسپید بڑھا کر گاڑی یوں اُس کے قریب لے گیا جیسے اُسے چیلنا ہوا نکل جانے کا۔ حقیقتاً دیکھنے والوں کو بھی یہی لگا اور وہ جو اسی طرف دیکھ کر چل رہی تھی، وہ ایک گاڑی کو اتنی اسپید سے اپنی طرف آنے دیکھ کر لو کھلا گئی اور بہت کو ششش سے بھی اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ سکی۔ ادھر ادھر کتنی گاڑیوں کے بریک چر چراتے اور اس نے بھی گاڑی روکی تو لیکن اُسے بھی سی ضرب لگانے کے بعد۔

پھر پہلی کی تیزی سے اُس کو اس کے قریب آیا تو پتی ہوئی مرکب پر گرتے ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے گرد لوگ جمع ہونے لگے تب اس نے جلدی سے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور اپنی نگاہوں کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ پھر ایک ہی نظر میں سب کو دیکھ کر بولا۔
”زادہ چوٹ نہیں ہے، میں انہیں اسپید لے جاتا ہوں تا اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ پر بیٹھا اُس نے نگاہوں آگے بڑھا دی۔ اور راستے میں جو پیلا کلینک نظر آیا۔ وہ وہیں رُک گیا۔۔۔ ابتدائی مرحلے سے گزرنے کے بعد اُسے طبی امداد ملنے تک وہ قدرے بے چین رہا۔ پھر سکون سے ہو کر اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے کے ساتھ اُس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا، کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے اور کوئی بات تو تھی جو اس کی جستجو بڑھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے لے چپ چاپ سرک گئے۔

وہ اگر بیڈ پر بے حس و حرکت بڑی تھی تو وہ بھی اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں وہاں زندگی ہے ہی نہیں محسوس کی جانے والی خاموشی تھی۔ مگر اُس کی پلکوں نے ذرا سی حرکت کی تو جیسے ہر شے متحرک ہو گئی۔

وہ جو ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے اُس کے بیڈ کے قریب آگیا۔ دوسرے بل اُس نے آنکھیں کھولیں تو نظروں کے عین سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر ذریعہ طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا بلکہ وہ چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔ تب بیڈ کی پی پر ایک ہاتھ جاکر وہ قدرے جھک کر پوچھنے لگا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ کو کر اُس کی آواز دھیمی تھی پھر بھی اُس کا سوا ہوا ذہن یکلفت پیدا ہونے کے ساتھ بے شمار سوالات کی زد میں آگیا۔ بولی تو پیشانی پر لمبی سی ناگواری کی شکلیں نمودار ہو گئیں۔
”کون ہیں آپ؟“
”خاکسار کو سکندر رکھتے ہیں۔ شاہ سکندر حیات۔“

گھٹی موخیاں تھے اُس کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی کہ وہ اندر ہی اندر تیز بڑی ہو کر اُس پر سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”پلیز! اجنبی آپ آرام کریں!“ وہ کہتے ہوئے اُنکڑ کر بیٹھ گئی۔ اور کہیں چوٹ کا احساس ہوا تو لیکن شکریہ میں جھجک ہوئی۔ وہ کہتے ہوئے اُنکڑ کر بیٹھ گئی۔ اور کہیں چوٹ کا احساس ہوا تو لیکن قصداً اُس نے خود کو دیکھنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔

ابھی آپ شیک نہیں ہیں۔ پلیز! آپ ہاتھ لگائیے۔ وہ اُس کی بات کاٹ کر بولنے لگی۔
”خدا ہر ہے میں۔ اور پلیز! آپ یہ مت کہیںے گا کہ کیوں لائے ہیں۔ مجھے وہیں مرجانے دیتے

و غیرہ وغیرہ۔“
اُس نے کہا تو وہ ہونٹ پیچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ تب سکندر حیات سوچ کر بولا۔
”میرا خیال ہے۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں۔ وہی بتائیں گے کہ آپ گھر جا سکتی ہیں یا نہیں۔“

وہ خاموش رہی اور جب وہ کمرے سے نکل گیا تب اپنے بدن کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھنے لگی کہ کہاں چوٹ آئی ہے۔ باہاں بازوؤں کا اس سے کہیں تنگ چھل گیا تھا اور گاڑی کی ٹکر کے باعث کمزور شدہ درد کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھ میں چوٹ کا نشان نہیں تھا پھر بھی ٹکر کے علاوہ بھی اُسے کہیں درد کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ابھی وہ جھجک سے دیکھ نہیں پاتی تھی کہ کوئی بدوڑ میں قدموں کی آواز سن کر دوبارہ اسی طرح بیٹھ گئی۔ سکندر حیات ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑ ہو گیا۔

”کہیں تکلیف تو نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے معاند کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کم میں درد ہے اور شاید میرے پیس میں موقیع آگئی ہے۔“
وہ یوں بولی جیسے پیر کی موقیع اُسے تکلیف کے ساتھ شدید کوفت میں مبتلا کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اُس کے شے کی تصدیق کی۔ پھر میڈیسن لکھنے کے ساتھ سکندر حیات سے کہنے لگا۔
”کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ فکر کریں معمولی ایکسیڈنٹ تھا۔ یہ میڈیسن فوراً لے لیں۔ اور چائیاں تو ابھی انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔“

وہ ڈاکٹر کی آخری بات پر بیٹھا کر دیکھنے لگی۔

”تھیک یو۔“ سکندر حیات نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے ہر چالے لیا پھر اُس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا تو وہ خود کو دوبارہ اُس کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ کر سکی۔

کچھ دیر بعد وہ پورے اعتبار سے کمرے میں داخل ہوا جیسے وہ اس کی قریبی عزیز ہو۔ لیکن جب اُس پر نظر پڑی تو جھجک گیا۔ کیونکہ اُس کے ہر انداز سے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔ میں ناک کرنا بھول گیا۔“ وہ کچھ نہیں بولی تو قدرے رُک کر کہنے لگا۔

”اب کیا پروگرام ہے آپ کا۔“ میرا مطلب ہے گھر چلیں گی تو چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں؟“

”بہت بہت شکریہ سکندر حیات صاحب! آپ تو پہلے ہی اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔“

اُسے رسالت بھانے کا خیال آیا تو فوراً اپنی ناگواری چھپا گئی۔

”مجھے بالکل زحمت نہیں ہونی میں۔“ وہ بظاہر سیدھے سادے انداز میں کہہ کر اُس کے اور سولہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ جیسے ناچار بولی تھی۔

”اسیہ! پہلے مرحلے کی کامیابی پر اس کی آنکھیں ایک لحظہ کو پکس پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے میں اسے! مجھے آپ کو گھٹک چھوڑنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔“

”جو سکتا ہے، پھر بھی میں جلی جاؤں گی۔“ اُس نے ایک طرح سے انکار کر دیا۔
”کیسے جائیں گی۔ آپ تو چل بھی نہیں سکتیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے پیس میں موقیع؟“

اُس نے فوراً احساس دلایا تو وہ خاموش ہو کر اپنے پیرو کو دیکھنے لگی۔ واقعی چلتا مشکل تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔
 ”آپ کیا سوچنے لگیں؟“ بالآخر اُسے ٹوٹنا پڑا۔ اندر ہی اندر پریشان ہونے کے ساتھ خود کو لیتھین بھی دلا رہا تھا کہ اس لڑکی کے پاس اُس کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔
 ”جی۔“ اُس نے چونک کر دیکھا پھر لہجے میں سر ہلا کر بولی۔

”جلیں پھر آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“
 اُس نے کہا تو اُسے اگے سے گھر کا خیال آیا اور وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ آج تو یوں بھی اُسے جلدی گھر جانا تھا۔ بیٹھے آج ہی کو تنگ کر رہے ہوں گے اور پتا نہیں کھانا بھی کھا یا ہوگا کہ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ان ساری باتوں کا خیال آنے کے باوجود وہ اسے دیکھ کر حتمی انداز میں بولی۔
 ”سوری، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“



۱ ص صاف انکار پر شاہ سکندر حیات کو سخت توہین کا احساس ہوا۔ اس کی پیشانی پر گرہی لکیریں نمودار ہوئیں۔ اس کی بچی اگر کوئی اور ہوتی یا ہوتا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اسے اٹھا کر باہر پھینک دیتا لیکن اس کے سامنے وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اور یہی بے بسی ہی تو اُس کی کمزوری کا سبب بنی تھی۔ مقدری کو شش سے خود پر قابو پا کر قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔
 ”اوکے، جیسے آپ کی مرضی، اور میرا خیال ہے اس سے پہلے کہ آپ مجھے گینٹ لاسٹ کہیں مجھے خود ہی چلے جانا چاہیے۔“

”نہیں پلےز۔ آپ کچھ دیر تک جا میں۔“ اُس نے کچھ مدت سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ سمجھ کچھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیوں روک رہی ہے۔ کوئی سوال نہیں کیا تب وہ ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”وہ میری کتابیں اور میرا بیگ؟“
 ”میری گاڑی میں ہے۔ لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے جانے لگا تو وہ فوراً بولی۔

”ایک منٹ، ایک فنون کرنا ہے اگر آپ۔“
 ”جی، مہربانی، وہ دروازے کے قریب رک کر پوری تو تیسرے دیکھنے لگا تو وہ مہربان کر کے کہنے لگی۔
 ”عدیل صاحب ہوں گے۔ ان سے کہئے گا، مجھے یہاں سے لے جائیں۔“
 ”عدیل صاحب؟“ اُس نے سوچتے ہوئے انداز میں دہرایا اور کمرے سے نکل گیا۔ تو وہ بد ڈکی بچی پر سر رکھ کر سوچنے لگی۔

یعنی یہ حادثہ بھی آج ہی ہونا تھا۔ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے آج اور بچے۔ پریکٹیکل کے دلوں میں بھی وہ اتنی لیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بہت دیر ہو گئی۔
 اُس نے وقت دیکھنے کے لیے کلائی پر نظر ڈالی۔ گھڑی نہیں تھی۔ اور پہلا خیال یہی آیا کہ وہیں روڈ پر کہیں گر گئی ہوگی۔ اُسے انہیں نہیں بلکہ دیکھ ہونے لگا۔ کیونکہ وہ گھڑی اُسے بہت عزیز تھی۔ جب اُس نے میزک میں فرسٹ کلاس مقرف پوزیشن لی تھی تب آج ہی اُسے دیکھتی ہوئی ہوگی کہ اس کے بعد مختلف مہنگوں پر پہنچاؤ ہونے لگا۔ اُسے بہت اچھی اور خوبصورت گھڑیاں دی تھیں لیکن اس سب سے پہلی اور اناجی کی دنی ہوئی گھڑی کی اہمیت اس کے نزدیک سب سے زیادہ تھی کہ اُسے دیکھتے ہوئے جہاں وہ اپنی پہلی خاندار کا سیانی پر اسی روز کی طرح مسرور ہوتی تو اُن اس کے اندر مزید کامیابیاں حاصل کرنے کا عزم پختہ ہو جاتا تھا۔ اترشتہ چھ سالوں سے وہ اس کی ساتھی تھی۔ اپنی خالی کلائی کو بہت نرمی سے وہ

دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے چھوئے گی۔ مٹا خیال آیا کہ وہ جو عدیل بجائی کو فون کرنے گیا تھا وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

”کہیں چلا تو نہیں گیا؟“
 وہ اُس نے جانے کا سوچ کر کچھ الجھنے لگی کیونکہ یہی بہت تھا کہ وہ اُسے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے بعد میڈلین اور ڈاکٹر کی فیس غالباً اُس نے ادا کر دی تھی اور اُس نے عدیل بجائی کو بلایا ہی اس لیے تھا کہ وہ جو خرچ کر چکا ہے اُسے لوٹا دیں۔ خواہ مخواہ ایک اجنبی کا مقروض ہونا اُسے بالکل اچھا نہیں لگا۔ اور اگر وہ چلا گیا ہوگا تو واقعی بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ اسی صبح پر سوچ رہی تھی کہ کورڈور میں قدموں کی آواز سن کر فوراً دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ عدیل بجائی کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اُسے کچھ اطمینان ہوا۔

”کیا ہوا؟“ اُس نے قہر میں پوچھا۔
 ”عدیل بجائی کی پریشانی فطری تھی۔ لیکن کرا اُس کے پاس بیٹھے اور سر سے پاؤں تک اسے دیکھنے لگے۔
 ”میں شک ہوں بجائی، زیادہ جوت نہیں آئی، اُس نے سکڑا کر عدیل بجائی کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔

”بھیر کتنے لگی، اگر میر میں موج نہ آتی تو میں آپ کو رحمت نہ دیتی۔ خود ہی گھر پہنچ جاتی۔“
 ”خینکس گا، لیکن یہ ہوا کیسے؟“ اتنی لاپرواہی نہیں ہو، عدیل بجائی نے شکر کرنے کے ساتھ پوچھا۔
 ”بس وہ۔“ وہ جانتے کیلئے کہنے جا رہی تھی کہ نظر خاموش کھڑے سکندر حیات پر بڑی تو عدیل بجائی کو اُس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے بجائی! پہلے آپ ان کا شکریہ ادا کریں۔“
 اور عدیل بجائی کو جیسے اُس کی موہو دگی کا احساس ہوا فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اُس کا ہاتھ تھام کر بولے۔

”میں بہت ممنون ہوں شاہ سکندر حیات آپ کا۔ بہت احسان کیا ہے آپ نے ہم پر۔“
 ”کوئی احسان نہیں۔ آپ پلیز مجھے شرمندہ نہیں کریں۔“
 وہ کہہ رہا تھا اور بالکل اچانک عدیل بجائی سے ہوتی ہوئی اُس کی نظرس اُس پر جا پھری تھیں۔

”پتا ہے شہر باتو اکبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے شاہ سکندر کو میری ذرہ برابر پروا نہیں ہے بلکہ شاید بڑے سے میرے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔“
 فوراً کے گرد سنگ مرمر کی بنی چار دیواری کے قریب رک کر مہر النساء نے افسردگی سے کہا تو بانو چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”اچھی ہو تم، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بجائی سکندر کو تمہاری پروا نہ ہو؟“
 ”ایسا ہی ہے شہر باتو۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتا ہے۔“ مہر النساء نے جھک کر پانی میں ہاتھ دالتے ہوئے کہا۔

”بجائی سکندر کی دنیا صرف اور صرف تم ہو مہر و اور تمہاری دنیا سے نکل کر وہ کہیں نہیں جاسکتے۔“
 بانو نے اسے یقین دلایا۔

”پھر وہ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟“ مہر النساء اُس کا یقین کر کے ممی بے یقین سی تھی۔
 ”جسے تم ناراضگی سمجھ رہی ہو وہ محبت کا ایک انداز ہے۔ شہر باتو نے اُسے چھیڑا۔

”خینکس ہے۔ میں ہارون بجائی سے کہوں گی وہ بھی محبت کا ایسا ہی انداز اپنائیں۔“ مہر النساء نے فوراً اتارا۔

”ناممکن۔ شاہ ہارون کبھی تمہاری بات نہیں مانے گا۔“ شہر باتو کے لہجے کا نرم تار ہاتھ کا اُسے اپنی تہ پکڑنا مہر و سا ہے۔ مہر النساء نے پانی میں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگی۔

کتنے یقین سے تمہیں بارون بھائی پر۔ میں بھی ایسا ہی یقین پاجی ہوں جو شاہ سکندر نے کبھی میری جہول میں نہیں ڈالا۔ بتاؤ یہ محبت کا کون سا انداز ہے؟
 ”تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو مہر و ساری بات مزاج کی ہے۔ کوئی اظہار کرتا ہے اور کسی کو اظہار کرنا اچھا نہیں لگتا۔“
 ”تم شکاک کہہ رہی ہو لیکن جب تک کسی اظہار کے محتاج نہیں ہوتے شہر بازو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ۔ بارون بھائی نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ انہیں تم سے محبت ہے۔ اس کے باوجود تمہیں ان کی محبت کا یقین ہے۔ بتاؤ کیوں؟“
 مہر النساء براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالیہ نشان بن گئی۔

”یہ تو تجھے بھی نہیں معلوم۔“
 شہر بازو کو کوئی جواب نہیں سوجھا تو دامن بچایا۔ اور مہر النساء ڈرا سا ہنسی۔ تاسف بھری ہنسی تھی۔ جس پر شہر بازو اندر ہی اندر جڑ بزرگ ہو کر بولی۔

”سنو۔ میں پھر کہوں گی کہ تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو۔ کیا سکندر بھائی کی انگلی میں تمہارے نام کی انگوٹھی نہیں ہے؟“
 ”ایک اسی خیال کے سہارے تو اپنے تمام خدشات کو مات دیئے میں لگی ہوئی ہوں۔“
 مہر النساء کے بچہ کی شکفتنی چھپائے نہیں چھپی۔ دوبارہ پانی پر تھکنا بھائی تھی کہ گھٹ سے داخل ہوتی گرے لیٹ کر روز کو دیکھ کر اپنا دوش بٹا سنبھالنے میں لگ گئی۔ اس کے ہر انداز سے نگہ اٹھتے خال تھی جسے محسوس کر کے شہر بازو نے لیٹ کر دیکھا۔ شاہ سکندر حیات گاڑی سے اتر رہا تھا۔ تب کچھ سوچ کر شہر بازو نے اسے اس طرف آنے کا اشارہ کیا پھر مہر النساء کی طرف پلٹ کر سرگوشی میں بولی۔

”دیکھ لو۔ کئی دور سے بندھے چلے آ رہے ہیں۔“
 ”کون؟“ مہر النساء نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جن سے آئی بدگمان ہو۔“ شہر بازو نے شرارت سے کہا اور جواب میں دیکھ کر کہنا پاجی تھی کہ۔
 سکندر حیات کے قریب آنے پر فوراً سارنچ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم بھائی۔“ شہر بازو نے فوراً سنبھل کر اسے سلام کیا۔
 ”و سلام۔ کیسی ہو؟“ سکندر حیات نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”میں تو مشک ہوں بھائی۔ البتہ لوگوں کو آپ سے بڑی شکایتیں ہو گئی ہیں۔“
 شہر بازو کا اشارہ مہر النساء کی طرف تھا وہ سمجھ گیا اور اتفاق سے بہت اچھے موڈ میں تھا بلکہ مسرتی سے عالم میں جیسے ہی سونچی سے بولا۔

”لوگ براہ راست شکایت کریں تو بات بھی بنے۔“
 ”ابھی بات بن جاتی ہے یا شہر بازو بیٹے ہوئے بولی اور مہر النساء کو کندھوں سے تمام کر اس کی طرف موڑنا چاہتی تھی لیکن مہر و جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر چند قدم آگے چلی گئی کیونکہ اس طرح وہ شاہ سکندر حیات کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ جب دل پوری قوت سے دھکنے لگا تھا اور اپنے جبر سے اتنی قویں قزح وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ شاہ سکندر نے بہن کو دیکھ کر ذرا سے کندھے اچکائے پھر بی بی جان کا پوچھ کر اندر چلا گیا تب شہر بازو نے لپک کر زور سے مہر النساء کے بازو میں چٹکی لگائی۔

”اب بتاؤ، کون کس سے ناراض ہے؟“
 ”مجھے نہیں پتا۔“ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے میں معروف مہر النساء دھیرے سے بولی۔
 ”بڑی بے ایمان ہو تم۔“ خراخواہ میرے بھائی پر شک کرتی ہو؟ شہر بازو اس موقع سے فائدہ اٹھا اُسے وہم سے لگانا چاہتی تھی کہ شاہ سکندر کو اس کی پروا نہیں اور وہ چیخ مگر بولی۔
 ”خراخواہ تو نہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا شہر بازو نے؟“ آنکھیں نکالیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی دلاؤیز ہنسی تھی۔

وہ جوان دونوں اپنی کوئی ایک کلاس میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پیر میں موع کے باعث تین دن سے بستہ پر پڑی تھی اور بے حد تھکنا کر سوچ رہی تھی کہ اگر اس روز کا بج جاتی تو حادثہ بھی نہ ہوتا لیکن زندگی میں آنے والے حادثوں کو کون روک سکتا ہے۔ اس روز نہ سہی پھر کسی دن یہ حادثہ تو اس کے ساتھ ہونا ہی تھا۔ جس میں کسی گاڑی سے ٹکرا نا شرط نہیں۔ اس کے ساتھ بس اتفاق تھا اور اصل حادثے کی خبر تو کسی کو نہیں تھی۔ جو اس کی نیندیں اڑالے گیا تھا۔ اس وقت اس سے ہٹ کر وہ صرف اپنے تعلیمی نقصان کا سوچ کر تھکنا رہی تھی۔ ظاہر ہے میڈیکل میں اس کا آخری سال تھا۔

”مجھو مجھو کیا بہت درد ہو رہا ہے؟“
 اس کی تھکنا ہٹ سے نہیں بھی سمجھا کہ وہ درد سے بے چین ہو رہی ہے۔ اس کا چہرہ انھوں میں لے کر یوں پوچھنے لگا جسے اس کی تکلیف کو محسوس کر رہا ہو۔
 ”نہیں بیٹا! کوئی درد درد نہیں ہو رہا وہ نیچے کی اتنی خفگی دیکھ کر قصداً مسکرائی۔ دیکھو بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بس ذرا چلنے میں پاؤں میں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ صبح تک وہ بھی نہیں ہوگی۔ پھر میں آرام سے کالج جا سکوں گی۔“

”نہیں مجھو! اب آپ کالج نہیں جائیں۔“
 ”کیوں؟“ وہ سمجھ گئی تھی نیل کیوں منع کر رہا ہے پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔
 ”پھر آپ کی ٹکڑ ہو جائے گی۔“ نیل کا خدشہ فوراً ظاہر ہو گیا۔

”ارے نہیں میری جان ابار بار تھوڑی ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے نیل کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازو لپیٹ کر مٹا کسی خیال میں گھر کر بولی۔

”وہ تو جس سے ٹکرا نا ہوتا ہے اس سے ٹکر ہوتی ہے اور پتا نہیں دوبارہ کبھی۔“ لا حول و لا قوت یہ تم نے مجھے کہاں اُلجھا دیا۔ جاؤ دیکھو اتنا اور سوچا کیا کر رہے ہیں۔“
 نیل نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا تو اپنی حماقت پر پہلے اس نے خود کو ڈکا پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

گزشتہ تین دنوں سے اس سے ایسی ہی حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے اچانک ذہن بندک جاتا اور پھر پلے پتا ہی نہ جلتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اور یہ بھی غیبت تھا کہ ابھی زیادہ تر نیچے ہی اس کے پاس رہتے تھے۔ میمونہ بھائی تو اپنا پیشل سے لکڑا بھی اپنے کمرے تک ہی محدود تھیں اور بے جاری اتان جی کو گھر کے سارے کام کرنے پڑ رہے تھے۔ کسی دقت اس کے کمرے میں آکر کھڑے کھڑے اس کا احوال پوچھ جاتیں۔ رات میں پتا نہیں کیسے بنید بھائی بڑی فراغت سے اس کے پاس آئیں۔ کتنی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر اس سے آئندہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”یہ تمہارا آخری سال ہے اس کے بعد کیا کرو گی؟“
 ”ظاہر ہے ہاؤس جاب۔“ اس نے سیدھا سا جواب دیا تو نبیلہ بھائی غوت سے بولیں۔

”مشکل ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے ہاں لڑکیاں سارا پڑھا لکھا جو بے ہیں جھونکتی ہیں۔“
 اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور وہ مزید گویا ہوئیں۔

”تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتحانوں سے فارغ ہوئی نہیں کہ اتنا جی اور آجی تمہاری شادی کی فکر میں لگ جائیں گے، بے ناں۔“
 ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ وہ جڑ بزرگ ہو کر بولی۔

”یہی تو غلط ہے۔ پڑھ کر کبھی دی جاؤں جیسی بات کر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

بہت کچھ سوچ ڈالا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس کی ہر سوچ پر اپنا نام لکھ گیا تھا۔

کلاسز آف ہوتے ہی اُس نے لائبریری کا رخ کیا۔ پانچ دن کی عین حاضری سے واقعی اُس کا بہت نقصان ہوا تھا۔ اور اتنا ہی تراج بھی اُسے نہیں آئے دے رہی تھیں لیکن وہ مندرکہ چلی آئی۔ ساتھ ہی اماں جی سے یہ بھی کہہ آئی تھی کہ اُس کی دلچسپی دیر میں ہوگی کیونکہ اُسے گزشتہ دنوں کے نوٹس تارنے تھے۔ لائبریری میں اس وقت خاصا سکون تھا۔ جتنے اسٹوڈنٹس موجود تھے سب اپنے کام میں مصروف تھے وہ ایک نظر میں سب کا جائزہ لے کر آخری بیس پر آئی تھی اور فائل کھول کر اپنے کام میں مصروف ہوئی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا چار دن چکے تھے اور مسلسل لکھتے لکھتے اُس کی انگلیاں دکھنے لگی تھیں۔ پھر بھی اُس نے باقی نہیں دیا کیونکہ اب دو تین صفحے لکھنے رہ گئے تھے اور کل پریکٹس دینے کے بجائے اُس نے سوچا اسی وقت مکمل کر لے۔ وقت گزرنے کا احساس بھی تھا ابھی وہ اور تیز باغیچہ چلنے لگی۔ تبھی اُس کی نظروں کے عین سامنے وہ گھڑی آگئی جس کے کھولنے کا میلان اُس کے اندر سے جھٹکتا تھا۔ اُس کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا اور بے اختیار سراپنچا گیا تو بہت قریب شاہ سکندر حیات ہونٹوں میں دلخیز مسکراہٹ دہانے لگا تھا۔

”آہ“ سراسیمہ سی آپ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ نیم دا ہو کر رہ گئے۔
”جی شاہ سکندر حیات“ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا سا جھکا تو وہ اُس پر سے نظریں ہٹا کر اپنی گھڑی ہاتھ میں لے کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“
”اُس روز میرے پاس رہ گئی تھی بلکہ میں نے قصداً اپنے پاس رکھ لی تھی“ شاہ سکندر نے صاف گونی سے کہا۔
”کیوں؟“

”دوبارہ ملاقات کو بہانا چاہیے تھا“ اتنی جرات پر اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن وہ کمزور لڑکی نہیں تھی نہ ہی اتنی جلدی خود کو اُس پر عیاں کرنا چاہتی تھی جب ہی پہلے میں قدرے ناگواری سے سو کر بولی۔
”کیوں؟“

”یہ تو آپ اپنے آپ سے پوچھیں“ وہ کہتے ہوئے اُس کے دامن جانب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو اُس نے ایک لحظے کو اُسے دیکھا پھر گویا بات ختم کرنے کی غرض سے بولی۔
”بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ“
”کس بات کا؟“

”گھڑی لوٹانے کا“ وہ کچھ بے نیازی سے کہہ کر اپنی چیزیں سیٹھنے لگی۔ اندازاً ایسا تھا جسے ابھی اُنھ کے چل دے گی۔ اور واقعی فائل سینے سے لگا کر گھڑی ہوئی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔
”سنیں مس! میں اتنی دور سے آپ کو صرف گھڑی لوٹانے نہیں آیا“ وہ پھر کچھ کہتے رہ گئی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”میر خیال ہے۔ یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے“
”میرا بھی یہی خیال ہے“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکل کر آئے تب وہ کہنے لگا۔
”میں پہلے آپ کے گھر گیا تھا۔ وہاں آپ کے آبا جی سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے میں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ آپ یہاں ملیں گی“
”جی!“ وہ واقعی بے حد حیران ہوئی۔ ”آپ نے آبا جی سے میرے بارے میں پوچھا۔“

نبیلہ بھابی پہلے تیز ہو کر بولیں پھر جیسے موڈ میں آکر اُسے سمجھانے لگیں۔
”دیکھو۔ تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ اپنے پیشے میں بہت نام کما سکتی ہو۔ ہمیں گائے بکری بننے کی ضرورت نہیں ہے کوہاں باب جس کھونٹے سے چاہیں باندھ دیں۔ ہمیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اس حق کو ضرور استعمال کرنا۔ سمجھ رہی ہوں؟“

وہ ایک لفظ جی تک نہیں کہہ سکی۔ کچھ کم صدمے سے انداز میں دیکھ گئی۔ تب نبیلہ بھابی اُس کا ہاتھ ہلا کہنے لگیں۔

”مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں اسکا نہیں رہی بلکہ تم پر تمہاری اہمیت واضح کر رہی ہوں۔ میٹرک سے پوزیشن لیتی آ رہی ہو۔ مزید کامیابیاں تمہاری منتظر ہیں۔ اسکا لارنلپ پرائیٹ آرس ایس کے پر باہر جا سکتی ہو لیکن میں جانتی ہوں اماں جی اور آبا جی پر کڑی تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔ اس کے برعکس دیکھنا کہ وہ تمہاری شادی پر زور دیں گے اور میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، ضرور کرنا لیکن ایسے شخص کے ساتھ جو تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی تمہیں پوری آزادی اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے“

انہوں نے کچھ دیر خاموش ہو کر ٹوٹتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا پھر رازداری سے پوچھنے لگیں۔
”اس عرصے میں کسی نے پروپوز تو کیا ہوگا تمہیں؟“ اُسے بہت شرم آئی کیونکہ نبیلہ بھابی کے ساتھ اُس کی بے تکلفی نہیں تھی۔ سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

”نہیں بھابی!“
”اس میں قصور کس کا ہے۔ سراسر تمہارا کیونکہ کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں ہوگا اُن سے“

نبیلہ بھابی یوں افسوس سے بولیں جیسے اُس نے وقت گنوا دیا ہو۔
”شاید ایسا ہی ہے“ اُس نے اعتراف کیا۔

”شاید نہیں یقیناً۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ اور بتاؤ تو کون سا معاملہ مل جائے گا تمہیں ڈگری کے ساتھ اعزازی سند ملے گی؟“
نبیلہ بھابی جل کر بولیں اور وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔ پھر ایک طرح سے اپنی جان چھڑانے کا خاطران کے ہاتھ مقام کر بولی۔

”بھابی! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا ضرورت ہے اپنے بارے میں سوچنے کی؟“
”صدقے تمہاری سعادت مندی کے“ نبیلہ بھابی کا انداز تیار ہوا تھا کہ انہیں اُس کی بات پسند نہیں آئی۔ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اُنھ گھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر پلٹ کر بولیں۔
”سنو! میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا“

”جی!“ اُس نے فوراً سر ہلایا اور اُن کے چلتے ہی گہری سانس کھینچ کر بھڈکی بنی پر سر رکھ لیا۔ اُسے نبیلہ بھابی کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا لیکن اتفاق کرتے ہوئے بھی وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔
”صحیح ہے کہ گزشتہ چار سالوں میں اُس نے کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں تھا اور گو کہ ابھی وقت اُس کی دسترس میں تھا لیکن اب وہ کہاں دیکھتی۔ یہاں وہاں ہر طرف ایک ہی جہاں تھی جس کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اُس کا نام شاہ سکندر حیات ہے۔ حالانکہ اُس روز وکیلینک سے ہی رجسٹر نہیں ہو گیا تھا بلکہ اسے اور عدیل بھابی کو کھڑک چھوڑنے آتا تھا اور عدیل بھابی اُس سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ صرف اسے بٹھایا بلکہ اُس کی خاطر مدرست بھی کئی تھی۔ آبا جی بھی اُس سے ملے تھے اور ظاہر ہے اُس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا لیکن وہ کیونکہ اُس روز سے اپنے کرتے ہی تک محدود تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ نہیں جان سکی تھی۔ البتہ اپنے آپ اُس کے بارے میں

”ماشاء اللہ اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“
”بیشک ہیں، بس ذرا لا یمومہ بھائی جانے کیوں خاموش ہو گئیں تو اس نے فوراً ٹوکا۔“
”ذرا کیا؟“

”جیسوڑ اور اب کنواری لڑکی سے کیا کہوں؟“
”جناب! کنواری لڑکی تقریباً ڈاکٹر مان جی کی ہے۔ تانے کیا تکلیف ہے، وہ اپنی اہمیت جلتے ہوئے فوراً اٹھ بیٹھی اور ان کی کلائی تھامنا چاہتی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ کیچ کر لوئیں۔“
”بس رہنے دو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ چلو تم اپنی چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ مجھے؟“
”نہیں نہیں، میں ہمیں پوری ڈاکٹر مان جی ہوں، لا یمومہ بھائی نے درمیان ہی میں اس کی بات اچک لی۔“
”تو اس ڈاکٹر کا مشورہ یہ ہے کہ ابھی آپ کو کرام کی ضرورت ہے۔“
”خلک کے لیے اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ سدا دن امتاں جی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے دیکھیں۔ ایمان سے اتنی شرم آتی ہے۔ ابھی مگر کوئی ان کے حوالے کر کے میں چلے سے چڑ، میں اتنی تھی لا یمومہ بھائی باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ توڑ کر لوئیں۔“
”بہت اچھا کرتی ہیں امتاں جی اور آپ کو کچن میں کیا کام تھا؟ اس نے ان کی جھنجھلاہٹ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔“

”ہام تو اب کروں گی۔ یعنی رات کا کھانا پکا ڈالوں گی۔ لا یمومہ بھائی نے بھی جیسے اسے چڑا یا لیکن وہ ہنس پڑی۔“
”آپ بھی کمال ہیں۔ لوگ تو کام نہ کرنے کے ہمارے ڈھونڈتے ہیں۔“
”اللہ کا شکر ہے۔ لوگوں کی وہ قسم اس گھر میں نہیں پائی جاتی۔ تم بھی تو چار دن میں بیزار ہو گئی تھیں لا یمومہ بھائی نے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔“
”واقعی وہ تو شکر ہے معمولی تو ہیں تھیں۔ اگر کہیں سیریس ایکسیڈنٹ ہوتا تو؟“
”اللہ نہ کرے۔ اسے ہاں ایکسیڈنٹ پر یاد آیا آج وہ آیا تھا۔ کیا تاہم ہے اس کا وہ جو تیس روڈ سے اٹھا کر کلینک لے گیا تھا۔ کیا نام تھا بھلا اس کا؟“
”یمومہ بھائی بتا کر اس سے پوچھنے لگیں تو وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں سے گھبرا کر ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔“

”پتا نہیں شاید سکندر؟“
”ہاں سکندر۔ یاد آیا۔ شاہ سکندر حیات؟“
”کیوں۔ میرا مطلب ہے کیوں آیا تھا؟ اس نے کن اکیوں سے یمومہ بھائی کو دیکھ کر پوچھا۔“
”پتا نہیں، تو بھئی سامنے چلا آیا ہو گا۔ اباتی تو بہت تعریف کر رہے تھے اس کی۔“
”یمومہ بھائی کا انداز سرسری تھا جس پر وہ قدرے اطمینان سے ہو گئی تھی۔“

”ایک تھما جانے والی خاموشی کو محسوس کرتے ہی شاہ سکندر حیات چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے نتیجے میں تھیں ابھی یہاں آٹھ پچوٹی کھلتے ہوئے بہت شور مچا رہے تھے۔ اور اب کوئی بھی نہیں تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی اور یقیناً انہیں بی بی جان نے اندر بلا لیا ہو گا۔ کیونکہ دنوں وقت ملنے پر بی بی جان تھوڑے پچوٹی کو بارہ درہ کی طرف نہیں جانے دیتی تھیں۔ شاہ سکندر کا ذہن بچہ درو کو ادھر ادھر بھٹکا پھر وہ کسوٹی سے اس لڑکی کو سوچنے لگا جس سے ملنے کے بعد سے اسے اپنی زندگی میں کچھ بچل کا احساس ہونے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے سیدھی سپاٹ زندگی جس میں روزمرہ کے معمولات جیسے بیٹھ سے ملے تھے۔ اور بی بی پردہ مٹھن بھی تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود کو بھلا تا رہا ہے۔ جب بھی اس

”کیوں نہیں پوچھنا چاہیے تھا؟“
وہ نظر بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمکتی شوقی چٹنی نہیں رہ سکی۔ جس پر وہ خشکی سے دیکھنے لگی۔ تو قدریسا ہنس کر وہ کہنے لگا۔
”بس ذرا سی غلطی ہو گئی ہے۔ اصل بات کچھ یوں ہے کہ میں نے آپ کے اباتی سے آپ کی خیریت معلوم کی تھی جس پر انہوں نے بتایا کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں اور آج کا دن بھی اچھا ہے۔“
”اور آپ سہتے یہاں چلے آئے ہر وہ فوراً آؤں۔“

”بڑا لگا آپ کو میرا آنا؟“
ایک بل میں وہ اسے اپنی گرفت میں لے گیا اور اس کے لیے خود کو چھپانا ممکن نہیں رہا۔ جان گئی خواہ کتنی بھی کوشش کرے کامیابی نہیں ہوگی۔ سر جھکا کر دھیر سے بولی۔

”نہیں؟“
”شکریہ۔“ وہ بے حد سرشار ہو گیا مگر اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”چلیے آپ کو گھر ڈراپ کروں؟“
”نو پزمکس۔ میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے مہولت سے منع کیا تو شاہ سکندر نے مزید اصرار نہیں کیا اور کچھ دیر تک کمر بستہ لگا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے لیکن ابھی نہ وقت ہے نہ یہ جگہ مناسب ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ کب؟ دن اور وقت آپ بتا دیں۔ جگہ نہیں ملے کروں گا۔“
اس کی بات پر وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی ہوا کچھ بند کر کے اس کی بات مان لیتی اور مشکل یہ تھی کہ اسے ملاؤں بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بہت سوچ کر بولی۔
”میرا خیال ہے آپ میرے گھر کا راستہ دیکھ چکے ہیں کبھی دن بھی آجلیے؟“
”آپ نے شاید میٹیک سے میری بات سمجھ لی تھیں۔ جگہ میں ملے کروں گا۔ آپ صرف دن اور وقت بتائیے۔“
اس نے زور دے کر کہا تو وہ بے بسی سے بولی۔

”میں نہیں بتا سکتی۔“ اور اس نے کیوں کا سوال ہی نہیں اٹھایا خود ہی ملے کر کے بولا۔
”بیشک ہے آج ہی کے دن۔ جب گھر کی سوتیلیاں AM سے نکل کر PM کی طرف پہلا قدم برعکس لگیں۔ یاد رکھیں گا خلافاً۔“

وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور بہت خاموشی سے اسے جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تب اپنے اطراف دیکھتے ہوئے وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ اور گھر کے تک وہ سوچ کر خود کو سخت سست سمجھتی رہی کہ اتنی در باتیں کرنے کے باوجود بھی وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکی تھی۔ یعنی ابھی بھی وہ اس کے لیے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ پھر گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے معا سے یاد آیا کہ اس کے پاس آنے سے پہلے وہ یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ اس نے تو یہ بھی کہا تھا۔ اسے پتا نہیں آتا تھا یا محض اسے چھپنا مقصود تھا۔ وہ بہر حال کچھ فیورٹ سی ہو گئی کہ اس کی آمد کو کہیں کوئی اسے تو منسوب نہیں کر رہا۔ یہ شاید اس کے دل کا چور تھا۔ خود سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔
کچھ دیر سے اور منہ اچھو دھوئے میں قندار دیر لگائی۔ اس کے بعد بالوں میں برش کر رہی تھی کہ یمومہ اس کے لیے چائے لے کر آئیں۔ وہ سچ مجھے حد ضرمند ہوئی۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں بھائی۔ میں خود تالیق؟“
”اتنی تو تھکی ہوئی آئی ہو۔ لا یمومہ بھائی کہے کا راز پر رکھ کر آرام سے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ تو وہ پوچھ رہی تھی کہ کہاں ہے؟“
”امتاں جی کے پاس۔ تیل کی ماش کر رہی میں اسے اور ہاں اس جیسوڑے کا نام اباتی نے عرکھا ہے۔“
بھائی نے بتایا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

کے اندر کسی بے نام سی آرزو نے انگڑائی لی وہ یہ کہہ کر خود کو اطمینان دلاتا کہ کیا کمی ہے۔ میرے پاس سہ کچھ تو ہے۔ اور واقعی سب کچھ تھا لیکن دل کی دنیا خالی۔ ویران کھنڈر جس میں مہر النساء کی محبت بھی پھول نہیں کھلا سکی تھی۔ حالانکہ وہ بے خبر نہیں تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ اس کا دل بھی مہر النساء کی طرف مائل ہو سکا۔ اس وقت بھی نہیں جب بابا جان نے ان دونوں کی نسبت طے کی تھی اور اس نے احتجاج کیا کہ کیا تھا کہ کسی اور کا خیال نہیں تھا۔ اور اب خیال، خراب بلکہ دل کی دنیا میں بھی جو پھل بھی مٹی وہ اسے لگ رہی تھی۔ بڑے برکیت لمحات تھے جب وہ تصور میں اسے مخاطب کر رہا تھا۔ تبھی ملازم جیرا آواز سے اس کا تصور چٹکا چور ہو گیا۔ بے حد ناگواری سے اسے دیکھ کر غصے سے بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”اوجی، تسال نول وڈے شاہ جی نے یاد کیا اسے“

جیرا اس کے غصے سے سہم کر بولی تو وہ مزید سوال جواب کیے بغیر اٹھ کر اندر چلا آیا۔ بابا جان خلاف معمول اس وقت ہال کمرے میں بی بی جان کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ وہ انہیں سلام کرتے ہوئے فاصلے پر بیٹھ گیا تو بی بی جان فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

”ہم تمہاری آیا نور بانو کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو“

”میں۔ میرا مطلب ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے باری بارہ کو دیکھ کر پوچھا۔

”سب خیریت سے بیٹا، بس تمہاری بی بی جان کو اٹانک۔ بیٹی کی یاد تازہ لگی ہے۔“

بابا جان نے اس کی تشلیش پر تسلی دیتے ہوئے کہا تو بی بی جان کچھ ناراض سی ہو کر بولیں۔

”اٹانک تو نہیں شاہ جی اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں نور بانو کی خیر خبر نہیں آئی اور اب تو گھبرا رہا ہے۔“

”بڑے یوتس کی مال۔ بچوں کے سامنے روتے نہیں ہیں۔ بی بی جان کی آواز بھرتے پر بابا جان۔ انہیں نو کا پھر اس سے پوچھنے لگے۔“

”چل رہے ہو سکندر؟“

”اگر آپ کا حکم ہے تو مال نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔“

”جیتے رہو بیٹا! لیکن یہ راجہ نہیں ہے۔ چلتا چاہو تو چلو۔“ بابا جان نے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

”مشکرے بابا جان! پھر آپ ہوا کیسے۔ میں پھر کسی دن چلا جاؤں گا۔“ اس نے فوراً شکریے کے ساتھ سے معذرت کر لی۔

”اچھی بات ہے۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ ہم آتے ہیں۔“

بابا جان نے کہا تو وہ باہر نکل آیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر وہیں ٹک کر بابا جان بی بی جان کا انتظار کرنے لگا۔ پھر انہیں رخصت کرنے کے بعد اندر آ رہا تھا کہ معاً شہر بانو کا خیال آیا وہ بی بی جان کے ساتھ نہیں گئی۔ یہی پوچھنے وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”شہر بانو! شاہ سکندر نے پہلے پکارا پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ دوپٹا سنبھالتے ہو کھڑی ہوئی۔“

”بی بی جان! تم بی بی جان کے ساتھ نہیں گئیں۔ آپا کی طرف؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تو جانا چاہتی تھی لیکن بی بی جان نے منع کر دیا۔ شہر بانو نے کہا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اسے افسوس ہے۔“

”کیوں۔ کیوں منع کیا بی بی جان نے؟“

”پتا نہیں۔“

”اچھا جائے دو۔ میں تمہیں کراچی لے جاؤں گا۔ وہ میرا دوست ہے ناں احمد حسن، اس کی امی اکثر کہتی ہیں کہ بی بی جان اور شہر بانو کو لے کر آؤ۔ اس بار میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔“

اس نے مسکرا کر ایک طرح سے اسے بھلائی کی کوشش کی لیکن وہ منہ پھلا کر بولی۔

”بی بی جان نہیں جانے دیں گی۔“

”میں کہوں گا بی بی جان سے اور دیکھنا وہ منع نہیں کریں گی۔ چلاؤ بھدی سے موڑ ٹھیک کرو۔ وہ اس کا سر ہلا کر لولا تو وہ ذرا سا ہنسی پھر ہو پوچھنے لگی۔“

”آپ کب جائیں گے کراچی؟“

”چار دن رہ گئے ہیں۔ وہ جیسے دن گن رہا تھا۔ بے وصیائی میں اسی حساب سے کہہ گیا پھر فوراً احساس ہونے پر قدرے پشیمان ہوا۔“

”میرا مطلب ہے۔ تین چار دن میں چلیں گے۔ تمہیں کچھ لینا ہے وہاں سے؟“

”جی۔ میں بہت ساری شاپنگ کروں گی۔ شہر بانو خوش ہو کر بولی۔“

”اچھی بات ہے۔ وہ اس کے خوش ہونے پر اطمینان سے ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے ٹک کر بولا۔ اب ذرا اچھی سی جائے میرے کمرے میں معبود دو۔“

”ایک منٹ رکھیں بھائی! شہر بانو کچھ یاد آنے پر اسے روکے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خاموشی سے دیکھنے لگا۔ شہر بانو الماری میں سے ایک بیگ نکال کر اس کے قریب آئی اور دونوں ہاتھوں پر بیگ رکھ کر اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔“

”یہ مہر النساء نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“ اس کا سارا اشتیاق دل میں رخصت ہو گیا۔

”بھلا میں نے کھول کر نہیں دیکھا۔ ہزار تحفے کے باوجود۔“

”شہر بانو خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ایک سرسری نظر پیکٹ پر ڈال کر کہنے لگا۔“

”میری طرف سے اجازت ہے۔ بے شک کھول کر دیکھو۔ اس کے بعد مہر النساء کو لونا کر کہنا کہ اسے کسی ایسے شخص کے لیے سنبھال رکھے جو اس کی قدر کر سکے۔“

”بھائی! شہر بانو کا دل انجانے اندیشوں سے کانپ کر رہ گیا اور وہ فوراً اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔“

اتنا جی آج کل سارا وقت عمر کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ اسے تیل کی مالش کرنا پھر نہلا نا اس کے بعد پاؤں دھو کر آنکھوں میں بھر بھر سرمہ۔ پھر اپنے پاس ہی سلا لیتیں۔ بس دودھ کے اوقات میں ہی وہ میمونہ بھابی کے پاس نظر آتا تھا۔ اور میمونہ بھابی بڑے آرام سے تھیں۔ اس وقت کچن میں اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھیں۔

”میں نے تو صرف بچے پیدا کیے ہیں۔ ان کی پرورش کی تکلیفیں تو میں جانتی ہی نہیں۔“

”دعا میں دیں اماں جی کو کہ اس نے کھولنا ہوا پانی کی پاٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔“

”اماں جی کو میری دعاؤں کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں اماں جی جیسی ماس دے۔“

میمونہ بھابی نے بڑے غلوں سے کہا۔

”بیٹے۔ اگر میری قیمت میں سرے سے ساس ہی نہ ہو تب؟“

اس نے شرارت سے کہا اور میمونہ بھابی اپنی دھن میں بول گئیں۔

”کیوں نہ ہو ضرور ہوگی۔“

”اب کہہ دیجئے بھیا ساس کے بنا بھی کوئی زندگی ہے۔“

”بالکل! اپنے لیے تو میں۔ یہی کہوں گی۔ پتا ہے اسلام آباد سے سیما کا فون آیا تھا۔ بہت اصرار سے

امتاں جی اور اتاجی کو بھاری تھی۔ اور میں اس وقت سے یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اگر امتاں اور اتاجی کچھ دنوں کے لیے بھی اسلام آباد چلے گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟
 میمونہ بھائی نے ساس سسر کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔
 ”فکر نہیں کریں، ہم بھی ساتھ چلیں گے۔“
 ”ہاں سارا گھر جانے گا۔ ہمیں تو کھانا ہے اسلام آباد۔“

”اچھا چلیں، پہلے چلے پی لیں۔“
 وہ مڑے آنکھ لٹولی اور میمونہ بھائی کے ساتھ کچن سے نکل کر امتاں جی کے کمرے میں آئی تو وہاں امرا سونیا امتاں جی کی گود سے عمر کو لینے کی ضد کر رہے تھے اور امتاں جی انہیں ڈانٹ رہی تھیں۔
 ”کیوں تنگ کر رہے ہو امتاں جی کو۔ چلو بھاگو یہاں سے۔“
 میمونہ بھائی نے سختی سے ڈانٹ کر دونوں کو بھٹکا یا تو امتاں جی ان پر ناراض ہونے لگیں۔
 ”ہائیں دلہن! اس طرح ڈانٹتے ہیں بیٹوں کو۔ دیکھو تو کیسے چھوٹا سامنے کر گئے ہیں یا میمونہ بھائی تو کچھ نہیں بولیں لیکن وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔“
 ”اور جو آپ ڈانٹ رہی تھیں امتاں جی۔“

”میں کب ڈانٹ رہی تھی؟“
 ”خیر چھوڑیں، اچلے نہیں۔ وہ مڑے میں کب سیدھے کرتے ہوئے بولی۔ پھر چلے بنا کر پہلے آنا پھر میمونہ بھائی کو دئی۔ اور اپنا کپ لے کر تخت پر آرام سے بیٹھ گئی۔ تب ایک دم نبیل کا خیال آ پوچھنے لگی۔“

”نبیل نظر نہیں آیا۔ اوپر سے کیا؟“
 ”نہیں، بڑی دلہن آج اسے اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔“
 امتاں جی نے ناگوار سے انداز میں بتایا تو اس نے مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور تدریس سے محض امتاں جی کو خوش کرنے کی خاطر کہنے لگی۔
 ”امتاں جی! اب عدیل بھائی کی شادی کر دیں۔ گھر کی رونق میں اضافہ ہو جائے گا۔“
 ”ہاں امتاں جی! اب تو ماشاء اللہ عدیل ابھی پوسٹ پر ہے۔ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میمونہ نے فوراً اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، لیکن امتاں جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلے کیا سوچنے لگا۔
 ”آپ کو چاہیے عدیل بھائی باہر جانے کا سوچ رہے ہیں؟ اس نے کہا تو امتاں جی جو تنگ کر گئیں۔“

”مے سے کس نے کہا؟“
 ”خود عدیل بھائی نے۔ کسی جرمن فرم میں ایلائی کر رکھا ہے انہوں نے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے میرا پائمنٹ ہو جائے تو پھر میں جرمنی چلا جاؤں گا۔ آپ کو نہیں بتایا انہوں نے؟“
 ”آخر میں اس نے کچھ عجیب سے پوچھا پھر خود ہی کہنے لگی۔“
 ”آپ پریشان ہو جاتی ہیں ناں۔ اس لیے نہیں بتایا ہوگا۔“
 ”حالانکہ یہ پریشانی کی نہیں خوشی کی بات ہے۔“ میمونہ بھائی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں اور آٹھا کر کمرے سے نکل گئیں۔

”بھائی ٹھیک کہہ رہی ہیں امتاں جی۔“
 ”ہاں تم سب بھینک بکتے ہو۔ ایک میں ہی غلط سوچتی ہوں۔“
 امتاں جی رنجیدہ ہو کر بولیں۔ انہیں انہوں اس بات کا پتا کہ عدیل بھائی نے انہیں نہیں بتایا وہ اندر ہی اندر ہتھیان ہوئے تھی کہ ناحق یہ موضوع چھیڑا۔ پھر ان کی دہکونی کی خاطر ان کے گلے ڈال کر بولی۔

”آپ سمجھ غلط نہیں سوچ سکتیں امتاں جی۔ خیر چھوڑیں اس قصے کو عدیل بھائی کی شادی کی بات کریں۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“
 ”ہاں۔ ایک دولڑکیاں تو ہیں نظر میں لیکن میں سوچ رہی ہوں تم امتیازوں سے فارغ ہو جاؤ پھر تم دونوں کی ایک ساتھ کہیں بات چلاؤں گی؟“
 امتاں جی نے پر سوچ انداز میں کہا تو وہ کچھ ٹھنک سی گئی۔ بہت دھیرے سے ان کے گلے میں سے بازو کھینچ کر تدریس سمٹ کر پیچھے ہٹی تو نبیلہ بھائی کی بات یاد آئی۔
 ”تمہارے ہاں لڑکیاں سارا پڑھا کچھ چولے میں بھرنے لگی ہیں۔ دیکھنا تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتیازوں سے فارغ ہوئیں نہیں کہ امتاں جی تمہاری شادی کی فکر میں لگ جائیں گی۔“
 امتاں جی اب اسی موضوع پر رول رہی تھیں۔ وہ کچھ غائب و معانی سے سنتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے پاس سے آنکھ کرا گئی اور اس رات وہ بہت سنجیدگی سے نبیلہ بھائی کی باتوں کو سوچ رہی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ بڑے آرام سے نظر انداز کر چکی تھی۔ کیونکہ نبیلہ بھائی خود سری و ہٹ دھرمی کے باعث اپنا وقتا رکھتی تھیں۔ اس لیے خیال یہی آتا تھا کہ جو عورت اپنا گھر نہیں بنایا رہی۔ وہ دوسرے کو کیا اچھا سبق سکھائے گی۔ اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں اور انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ

”تہیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اور اس حق کو مزور استعمال کرنا۔“
 اور جب وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی تو اس کا دل اندر ہی اندر غم کرنے لگا کہ ہر سوچ پر وہ قابض تھا جو اس کے ساتھ دن اور وقت طے کر گیا تھا۔ گو کہ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی نہ ہی ایڈیٹرزم پر یقین رکھتی تھی لیکن کیا کرتی کہ مقابل شاہ سکندر حیات آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ابھی تک وہ سر راہ نظر آتا تب بھی شاید وہ ایک بل کو ٹھکر کر اسے مزور دیکھتی جبکہ اب تو وہ خود جل کر آگیا تھا اور مزید ریٹ بڑھانے کا خواہش مند بھی تھا۔ وہ جا بھی تو اسے نہیں روک سکتی تھی۔ جیسے اب بہت کوشش کے باوجود اس سے ہٹ کر نہیں سوچ پاری تھی۔ حالانکہ ابھی تک وہ اس کے لیے سوالیہ نشان تھا لیکن وہ جو کوئی بھی تھا۔ اسی صلاح الدین اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ اور ایسی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد بالآخر اس نے ہار مان لی اور نبیلہ بھائی کی باتوں کی روشنی میں سوچتے ہوئے اس نے پہلے ہی قدم پر شاہ سکندر حیات کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کو دبا یا نہیں تھا۔ جیسا کہ نبیلہ بھائی نے کہا تھا۔
 ”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، مزور کرنا لیکن اپنے شخص کے ساتھ جو تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی ہمیں پوری آزادی دے اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے۔“

اور نبیلہ بھائی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ اگر شاہ سکندر حیات اس کا ہم پیشہ میں سے تب بھی وہ پہلے مقام پر اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کر دے گی اور اگر وہ اس کے لیے سنجیدہ و اتو پیر لیتا اس کی مزید تعلیم اور پھر پریکٹس پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں اپنے طور پر وہ سارے نمونوں پر سوچ کر اطمینان سے سو گئی تھی۔
 اور جس روز شاہ سکندر حیات کو رانا تھا۔ اس روز پہلی بار اس کا دھیان لکچر کے بجائے اونٹن اور دھوکھٹا ہار بھی نظر میں کرنے لگی سے باہر اور کبھی گڑھی پر آکھٹیں۔ جس کی سونیاں پی ایم کی حدود میں داخل ہو چکی ہیں۔ اور وہ تشدد خود پر جبر کے بیٹھی تھی۔ پیر بڈاٹ ہونے کے بعد بھی وہ فوراً باہر نہیں نکلی بتائیں کہ اس کی آزمائش مطلب تھی یا اپنی بہر حال اس کے طے کیے ہوئے وقت کے ہوئے ایک گھنٹے بعد وہ برنگل کرائی تو پہلی نظر اسی پر پڑی جو اس کے اسباب سے چند قدم آگے لپٹی گاڑی کے ساتھ ٹینک گائے کے اٹھانے پر تھک ویر کو واقعی وہ بڑی طرح زور دیتی تھی لیکن پھر بہت جلد خود پر قابو پا کر قدم اس کی رٹ بٹھا دیے۔ اور اس کے قریب پہنچ کر فوراً معذرت کرتے ہوئے بولی۔

”سوری مجھے بتا ہی نہیں چلا وقت کا۔ آپ کو شاید کافی انتظار کرنا پڑا۔“
 ”مجھ آپ کا انتظار کرنا اچھا لگا۔ پلیز اس نے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بانکسی پس و پیش کے بعد بیٹھ گئی۔“
 ”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ڈرائیونگ پر بیٹھا تو اسے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے قصداً سیدھا سا جواب دیا۔
 ”میری آمد کا یقین تھا آپ کو؟“ شاہ سکندر نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ سہولت سے دامن بچا کر بولی۔

”یہ خیال ہے۔ ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیں۔“
 ”جلدی کیا ہے۔ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“

شاہ سکندر نے قدرے بے نیازی سے کہہ کر گاڑی کی اسپید بڑھا دی اور وہ کیونکہ خود کو بہت براعات والا ظاہر کر رہی تھی اس لیے ذرا سے کندھے اچکا کر کھینچنے سے باہر دیکھنے لگی۔ تمام راستے اس کے دیکھنے ہوئے تھے۔ جب شاہ سکندر نے ایک فائنو اسٹار ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی تو وہ یونہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان ہیں؟“ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا اور وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

”میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔“
 ”آپ کا اختیار صرف اتنے دنوں کے لیے تھا اور اب۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر نئے اتر گیا، پھر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ خود کو اس کے قدم و کمر پر محسوس کر کے کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن جب اس کے ساتھ چلنے لگی تو اپنا آپ بہت محفوظ بہت اچھا لگا کر شہر و فلوں کا سارا اضطراب ساری بے چینی ختم گئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ پہلی بار اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی تو وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔

”شکریہ۔“
 ”کس بات کا؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”تمہاری مسکراہٹ نے میرے اس یقین پر مہر ثبت کر دی ہے آسید کہ تمہاری زندگی میں میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں جہاں مجھ سے پہلے کوئی نہ تھا۔“ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔“

شاہ سکندر نے بہت یقین سے کہا پھر نیل پر اپنا ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور سوچ کر کہنے لگی۔

”میرا ہاتھ تمہارے سے پہلے سوچ بیچھے شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خواب میری سوچیں صرف ایک خوبصورت گھرنک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے میں پس پشت نہیں ڈال سکتی۔ میرے نزدیک یہ سراسر بددیانتی ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟“

آخر میں اس نے اچانک سر اٹھا کر پوچھا تو وہ جو بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور کچھ دیر تک کھڑک بولا۔

”میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا بلکہ تم بہت جلد میرے ساتھ جاؤ گی۔ اور کچھ۔“
 ”اور؟“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ گلاس ڈور سے داخل ہوئی بیٹھ جانی کو دیکھ کر اظہار اس کے ہونٹوں میں ی رگڑنے لگا۔ بیٹھ جانی اکیلی نہیں تھیں ان کے ساتھ جو کوئی بھی تھا بہت بے تکلفی سے ان کی کمریم بازو ڈالے ہوئے تھا اور وہ یہ تو جانتی تھی کہ بیٹھ جانی آزاد ماحول کی پروردہ آزاد خیال خاتون ہیں لیکن

آزادی ہے۔ وہ روی کی حد چھو لے گی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کوئی اور اگر میڈیجائی کے ایسی بات کرتا تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی وہ بھٹانے کی کوشش نہ کرتی لیکن سامنے منظر بہت واضح تھا۔ آف وائٹ سلک کے شلوار سوٹ میں دوپٹے سے بے نیاز بی کہیں سے بھی نیل کی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔ نا انہیں بڑے ہیتا کی عزت کا خیال تھا۔ خیر کے اظہار کی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ اور وہ سٹائے میں بیٹھ گئی۔

بے فائز آرام کہاں کھو گئیں؟ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا تو وہ یونہی گھم سی بیٹھ گئی۔

”جیت تو تمہارے سامنے موجود ہے۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر اپنی بات پوری کی تو وہ ذرا سا چوکی ہوئی طرف سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھٹکا دینے کے بعد کہنے لگی۔

”خیال سے چلنا چاہیے۔“
 ”اگر تم جیہ کر رہا ہے کہ میری ہر بات کو یونہی نظر انداز کر دو گی۔“ شاہ سکندر کا موڈ یکلخت بگڑ گیا۔

”نہ میری بات نہیں سنی جا سکتی نہیں کہ تمہارا اختیار اٹھانے کے لئے تمک تھا۔ اب جب میں جا ہوں گا تب اسکو کی۔ انداز میں۔“

”یرے خدا! وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔“



شاہ سکندر نے کچھ دیر خاموش ہو کر مئے دیکھا۔ پھر اپنے لیے پر نام ہو کر کہنے لگا۔
 ”اگر آپ سوری۔“ مجھے تم سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اصل میں میں۔“

پھر شاہ سکندر۔“ وہ عاجزی سے ٹوٹ کر بولی۔ ”میں یہاں بہت دسترب ہر رہی ہوں۔ آپ میری کیفیت نہ دیکھیں۔ چلیں باقی باتیں رستے میں۔“

”اگر تم جلد میں آنا ہوں۔“ وہ اس کی عاجزی نظر انداز نہیں کر سکا۔ بلکہ کچھ ٹھٹھک سا گیا تھا۔ جیہی اس کی بات مان کر جانے کا کہا تو وہ ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے باہر نکل آئی اور۔

مندر کے آگے تک وہ خود دیر قابو پا چکی تھی۔

شاہ سکندر کا ارادہ آسید کو گھر تک چھوڑنے کا تھا۔ لیکن وہ راستے ہی میں آگے گئی تب اس سے اگلی ملاقات طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جہاں سے اسے شہر باز کو لینا تھا۔ اپنے وعدے کے

وہ شہر باز کو ساتھ لے آیا تھا۔ لیکن ابھی اسے ٹانگ کر ان باقی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی پھر بے نیازی سے وہ اسپید بڑھا کر منٹوں میں احمد حسن کے گھر پہنچ گیا۔ شہر باز شدت سے اس کی منتظر تھی۔

”ٹانگ کی میں وہ بالکل فور نہیں ہوں تھی۔ لیکن اسے واپس کا خیال تھا۔ بی بی جان نے بہت تاکید اٹھا کر شام دھنسنے سے پہلے واپس آجانا۔ اس نے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی وہ منہ پھلا کر بولی۔

جانی! آئی دیر لگا دی۔“ آپ ہم بازار کو نہیں جاسکیں گے۔“
 ”نہیں کرو۔ یہاں بازار بہت دیر تک کھلے رہتے ہیں۔ تمہاری شاپنگ آرام سے ہو جائے گی۔“ شاہ سکندر سے اطمینان دلایا۔

”میری شاپنگ تو آرام سے ہو سکتی ہے اور جو بی بی جان نے جلدی آنے کو کہا تھا۔“ شہر باز نے اسے

”آپ کیا کروں، دیر ہو گئی۔ چلو نا مل جلدی سے چلے جاؤ پھر ہم چلتے ہیں۔ اور ہاں احمد حسن آفس سے ہیں۔“ وہ شہر باز سے بات کرتے ہوئے ایک دم نا امل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”احمد بھائی ابھی نہیں آئے۔ آتے ہی ہوں گے۔“ شہر باز نے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھ کر بولا۔

”اچھا تم جانتے تو بلاؤ گے۔“ سکندر بھائی اور وہ بھی بیٹ اچھی سی لیکن آپ کو میری ایک بات جانتے تو نہیں آپ کو پلاری ہی ہوں۔

”کیا؟“ وہ سوالیہ لفظوں سے دیکھنے لگا۔
”آج آپ لوگ یہیں تنگ جاؤں، جی بھئی کا دن ہے۔ ساحل پر چلیں گے بہت مزہ آئے گا، ٹائلڈ نے خوش ہو کر پروگرام بنایا تو وہ فوراً شہر بلاؤ کو دیکھنے لگا کہ آیا دونوں نے پہلے سے یہ پروگرام بنایا ہے یا نہ ٹائلڈ کی خواہش ہے۔ اور اس کے دیکھنے پر شہر بلاؤ نے اشارے سے منع کر دیا، تب وہ ٹائلڈ سے معذرت کرتے ہوئے نکلوا۔

”سوری ٹائلڈ، آج ہمارا ٹکنا ممکن نہیں ہے۔ پھر کسی دن بلکہ خاص چھٹی ہی کے دن میں شہر بلاؤ کو لے آؤں گا۔“

”مجھے بتا تھا آپ میری بات نہیں مانیں گے،“ ٹائلڈ روٹھ کر بولی۔
”اور آپ تم مجھے جانتے بھی نہیں بلاؤ کی؟“
”نہیں خیر چلنے تو ضرور بلاؤ کی؟“ ٹائلڈ فوراً خشکی بھول کر چائے بنانے چلی گئی تو وہ شہر بلاؤ سے کہتا تھا۔
”تم آئی سے مل لو اور ان سے جانے کی اجازت بھی لے لو۔ شہر بلاؤ خاموشی سے چلی گئی تب وہ دریا ٹائلڈ جھیل کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ آج ہی شہر بلاؤ کو آسہ کے گھر لے جائے گا لیکن وقت ہی نہیں تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے احمد حسن کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کی امی سے دو جلد آئے کہ کبکہ شہر بلاؤ کو خانیک کے لیے طاق روڈ لے گیا۔

شہر بلاؤ بی بی جان کے درے بہت جلدی کر رہی تھی، حالانکہ اس نے بار بار اطمینان دلایا کہ بی بی جان ناراضگی کو وہ خود فیس کرے گا۔ وہ آرام سے خریداری کر رہے۔ لیکن شہر بلاؤ بہت جلدی فارغ ہو گئی۔ ”بس جہاں آجئے اور کچھ نہیں لینا۔“ شہر بلاؤ نے مزید کچھ بھی خریدنے سے انکار کر دیا۔
”چلو پھر کسی دن صرف اور صرف تیار شادی خانیک کے لیے آئیں گے۔“ وہ بھج گیا شہر بلاؤ کو بی بی جان کی ناراضگی خیال پر لیٹان کر رہا ہے۔ جیسی مزید اصرار نہیں کیا۔

”شام تو یہیں ہوگی، ہر رات میں یہیں گے شہر بلاؤ نے گاڑی میں بیٹھے ہی کہا۔
”ہوں،“ اس نے زیادہ کوسجہ نہیں دی، اور احتیاط سے گاڑی بیک کر کے لگا۔ پھر جب کشادہ شہر تک اس کا دھیان بٹانے کی خاطر پوچھنے لگا۔

”کیسا وقت گزرا تھا! ٹائلڈ اور اس کی امی کے ساتھ؟“
”جیت اچھا، کبھی آپ انہیں شاہ پور لے کر آئیں ناں۔“
”مہ نے دعوت دی انہیں؟“

”ہاں۔“
”پھر ضرور آئیں گی۔“ اس نے کہا تو شہر بلاؤ تعجب سے پوچھنے لگی۔
”کیوں آپ نے کبھی نہیں بلایا انہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے اصل میں وہ شاید اس انتظار میں تھیں کہ پہلے میرے گھر سے کوئی آئے۔ آج ہو تو اب وہ بھی آئیں گی۔“ اس نے کہا تو شہر بلاؤ فوراً بولی۔
”پھر تو مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔“

”یوں؟“ وہ یوں بیکر خاموش ہو گیا، اصل بات شروع کرنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔ ایک طرح سے ذہن کو تیار کر رہا تھا اور دیگر بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر ایکدم سے یاد آئے پر بظاہر سرسری ا پوچھنے لگا۔

”سنو، تم نے مہر انسلا کو اس کا پکیٹ لوٹا دیا تھا؟“
”نہیں، یا شہر بلاؤ جو برسی میں ہی۔“

”کیوں؟“ سنو سرسری انداز لیکن پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو گئی تھی۔
”کیا میں بوجھ نہکتی ہوں کہ آپ اس کا اتنی محنت سے دیا ہوا تحفہ کیوں لوٹنا نا چاہتے ہیں؟ شہر بلاؤ نے اٹل سوال کر کے گویا اس کی تشکل آسان کر دی، برصے آرام سے بولا۔

”یہی بتانے کے لیے تو میں نہیں لے کر آیا تھا۔ لیکن انیس ہتھاری اس سے ملاقات نہیں کر سکا۔“
”گس سے؟“ شہر بلاؤ گواہی دیا کہ گس بہت دور سے سناں دی، شہر بلاؤ نے اسی روز ہو گیا تھا، لیکن مسلسل خود کو بیلاری بھی کٹا شہر سکندر کی قیمت پر مہر انسلا سے منہ نہیں موڑ سکتا، کیونکہ بدے میں وہ شاہ پور سے منسوب ہے۔ اس کا بھائی اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اپنی کسی خواہش سے مغلوب ہو کر بہن کے ارمانوں کا خون کر دے۔ کتنا مان تھا بہن کو اپنے بھائی پر جسے ٹوٹنے میں ایک بل لگا۔

”آسیہ سے؟“ وہ اسی قدر کچھ خاموش ہو گیا، بلکہ انتظار کرتے لگا کہ وہ سوال پر سوال کرے گی۔ کون ہے کہاں رہتی ہے۔ آپ کو کہاں ملی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دوسری طرف سنا تھا۔ جسے محسوس کر کے شاہ سکندر نے اپنے طور پر آخری بات کہی۔

”خیر آسیہ سے ہماری بھی ملاقات ہو جائے گی، لیکن بی بی جان کو تم ابھی بتا دینا کہ میں مہر انسلا سے شادی نہیں کروں گا۔ اور مارے صدمے کے شہر بلاؤ سے بولا ہی نہیں گیا۔ ورنہ شاید نہیں تو اتنا ضرور کہیں کہ وہ یہ بات خود بی بی جان سے کہہ دے، اسے دریا میں ڈالتے۔ اور شاہ سکندر نے اس کے بعد کچھ کہنا ضروری ہی نہیں تھا، بتانے پر شہر بلاؤ کی کیفیت سمجھ نہیں رہا تھا یا اقلہ نظر انداز کر رہا تھا۔ باقی داغ دھننے کے مغز یوں آجانا بنا رہا جسے وہ اس کے ساتھ موجود ہی نہ ہو۔

پھر سوچی کے بڑے گھٹ سے داخل ہو کر گاڑی ابھی ڈرائیو سے پر رنگ رہی تھی کہ شہر بلاؤ بہت جلدت میں اوتار کر تیز تیز دروں سے اندر چلی گئی، وہ ہونٹ جھینے آئے دھکتا رہا۔ پھر گل خان کو لیکار کر اسے گاڑی پورج میں کھڑی کرنے کا کہہ کر اندر آتا سیدھا بی بی جان کے کمرے کا رخ کیا۔ بی بی جان عشا کی نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے لگا۔

”میونہ بھائی کے ساتھ بات کرتے ہوئے وہ ایکدم خاموش ہو گئی، کیونکہ ادھر سے بیلہ بھائی آ رہی تھیں۔ اور ان پر نظر پڑتے ہی اسے دوہرا واقعہ یاد آ گیا تھا۔ حسب عادت بیلہ بھائی سرسری انداز میں بیلو کہتی ہوتی ان دونوں کے قریب سے گزرتی رہی جہاں چڑھ گئیں۔ تب بھی وہ ایسے ہی کھم کھم سمی رہی تھی۔
”کیا انور ہیں۔“ ایمان سے مجھے تو رشک آتا ہے۔“ میونہ بھائی نے کہا تو وہ چونک کر بولنے لگی۔
”کیا کیا؟“

”میں کہہ رہی ہوں اصل زندگی تو بیلہ بھائی کی ہے۔ کوئی فکر ہی نہیں، آرام سے دن چڑھے تک سو رہی ہوں۔ اس کے بعد جہاں دل چاہے جاتے کو تیار کوئی مردک لوگ نہیں آ رہا ابھی دیکھو کس شان سے آئی ہیں۔“ میونہ بھائی کے لیے میں حسرت نہیں تھی بلکہ کچھ مذاق کا عنصر تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کو صوف سے ہٹنے کی خاطر بولی۔

”ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ہاں عدیل بھائی کی شادی، اماں جی بتا رہی تھیں ان کی نظر میں ایک دو لڑکیاں ہیں۔“
”اچھا! کون ہے؟“ میونہ بھائی نے دلچسپی سے پوچھا۔ تو اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
”بتا نہیں۔“

”ہاں میں تم نے پوچھا نہیں اماں جی سے؟“ میونہ بھائی نے تعجب سے کہا۔
”یہی پوچھی،“ میونہ نے عدیل بھائی کے ساتھ میری شادی کا ذکر فطیر دیا تھا، اس لیے میں خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی یا اس نے اپنی مجبوری بتائی تو میونہ بھائی ہنسے لگیں۔
”آپ نہیں کہیں رہی ہیں؟“

”ہاں یوں ہی۔ ویسے میری کچھ مین رہیں آتا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں اتنا بڑھ لکھ کر بھی اپنی شادی کے ذکر

پر خاموش کیوں ہو جاتی ہیں؟ میمونہ جہانی نے بڑے مخطوط سے انداز میں کہا۔

”بھیر کیا کریں؟ اسے میمونہ جہانی کے مخطوط ہونے پر مبنی آئی۔
”میں نے کہا کہ آپ اپنی مرضی تو ضرور بتایا کریں۔ ویسے ہتھاری کیا مرضی ہے؟“ میمونہ جہانی نے اتنا اچانک بول چا کہ وہ چلی گئی۔

”میری کیا مرضی ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں؟“ آخر اپنے بارے میں کچھ سوچا تو ہو گا تم نے؟
”ابھی تک تو نہیں سوچا۔ لیکن اب ضرور سوچوں گی۔ اس نے لیے پھلے انداز میں بات اٹائی تھی عدیل جہانی اپنے کمرے سے نکل کر آئے اور انہیں دیکھ کر لوٹے۔

”نوٹو، دو غائبین جہاں بٹھ جائیں؟“

”تم بھی آ جاؤ؟“ میمونہ جہانی نے کہا تو اس نے کرسی کھینچ کر آگے کر دی۔

”مجھے یارنی کہاں ہے؟“ عدیل جہانی نے پیٹھے ہی پوچھا۔

”مجھے سب سو گئے۔“ میمونہ جہانی نے بتایا تو وہ تعجب سے بولے۔

”آئی جلدی؟“

”بہت شور کر رہے تھے، تمہارے خلیل جہانی نے ڈانٹ کر سلايا ہے۔“

”یہ زیادتی ہے مجھ سے کہا تو میں انہیں باہر لے جاتا، یوں بھی کل چھٹی ہے۔ نیل بھی سو گیا؟“

”عدیل جہانی نے آخر میں اس سے پوچھا۔“

”نیل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شام میں بڑے بھیا اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر کچھ دیر آسٹاں جی کے پاس لیٹا پھر بڑے بھیا اسے اوپر لے گئے۔“ اس نے بتایا تو عدیل جہانی تشویش سے پوچھنے لگے۔

”زنا وہ طبیعت خراب تو نہیں ہے؟“

”نہیں موسیٰ بخار رہے۔ مع تنگ انشاء اللہ اتر جائے گا۔“ اس نے تسلی دی پھر پوچھنے لگی: ”آپ کے لیے چلتے لاؤں؟“

”نہیں پہلے ہی نیند نہیں آرہی۔“ عدیل جہانی نے منع کیا تو میمونہ جہانی انہیں دیکھ کر شرارت سے ہنسنے لگی۔

”بچہ جوان ہو گیا ہے اب اکیلے میں اسے نیند نہیں آتی۔“

”اٹ یہ میمونہ جہانی! اسے بے حد شرم آئی اور عدیل جہانی بھی اس کی موجودگی کے باعث سٹپا کر لوٹے۔

”آپ تو خاموش ہی رہا کریں؟“

”کیوں خاموش رہا کروں؟ خلیل کہتے ہیں۔ تم بولیں ہوں بہت اچھی لگتی ہو۔“ میمونہ جہانی نے ایک ادا سے کہا جس پر وہ سبے ساتھ ہنس اور ہنسی تو عدیل جہانی کو بھی آئی لیکن منہ بنا کر لوٹے۔

”اؤں یوں بڑے بددوق ہیں خلیل جہانی یا پھر انہوں نے آپ کو خاموش دیکھا نہیں ہو گا؟“

”تمہارا مطلب ہے؟“

”جناب آپ خاموش بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیوں آسیم؟“ عدیل جہانی نے اس سے تائید چاہی۔

”جی ہاں! مجھے تو میمونہ جہانی ہر حالت میں اچھی ہی لگتی ہیں۔“ اس نے کہا تو عدیل جہانی مصنوعی حیر سے بولے۔

”ماہیں تم جھوٹ بھی بولتی ہو؟“

”کوئی جھوٹ نہیں۔ بالکل سچ کہہ رہی ہے یہ۔“ قدرے جوش میں میمونہ جہانی کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

”غالباً ان کی آواز پر ہی خلیل جہانی کی آنکھ کھل اور اسوں نے وہیں سے انہیں دیکھ لیا۔

”جلئیے۔“ آپ کے جوان کو نیند نہیں آرہی؟ عدیل جہانی کو بدلدہ اُتارنے کا موقع مل گیا۔ سرگوشی میں

جہان کو چھڑک کر کہا تو وہ انہیں گھورتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔ تب عدیل جہانی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جلو بھی آسیم، تم بھی سو جا کر۔“

”جی جانی! میں ذرا چین دیکھ لوں۔“ دہکتے ہوئے اٹھ کر کچن میں آگئی۔ دو چار برتن میز پر رکھے تھے انہیں دھویا پھر لائٹ آف کر کے نکلی تو میز پر بڑے بھیا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔

”کیا بات ہے بڑے بھیا۔ کچھ چاہیے؟“ بڑے بھیا آخری تری بھی تک آئے تو اس نے پوچھ لیا۔

”ہاں، نہیں۔“ بڑے بھیا کا ذہن جیسے کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر سوچ کر بولے: ”ہاں وہ تم ذرا نیل کو دیکھ لو، بہت بے چین ہو رہا ہے۔ بخار بھی تیز ہو گیا ہے۔“

”جیس؟“ وہ کچھ پریشان سی ہو کر بڑے بھیا سے پہلے ہی میز پر چلیا نکلتی ہوئی اوپر آگئی۔ اس بخار کی حالت میں بھی نیل کمرے میں اکیلا تھا۔ اسے مقصود کچھ نہ سمجھ رہی تھی۔

”اٹھنا اسے سو رہی تھی۔ وہ اندر جی اندر کھتی ہوئی نیل کو جیک کر کے نکلی، بخار بہت تیز تھا لیکن بڑے بھیا کے سامنے اس نے تشویش ظاہر نہیں کی۔ بلکہ تسلی دی۔

”پہریشانی کی بات نہیں ہے بڑے بھیا۔ بخار اتر جائے گا، اسے میں اپنے پاس لے جاتی ہوں۔“

”نہیں بھیا۔ اسے یہیں رہنے دو۔ تمہیں تنگ کرے گا۔“

”نہیں بھیا! میرے پاس یہ آرام سے سوتے گا۔“ وہ کہہ کر نیل کو اٹھانے لگی کر بڑے بھیا آگے بڑھ آئے۔

”نکو۔ میں لے چلتا ہوں۔ تم سے اٹھا یا نہیں جائے گا۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی پھر اسی طرح بڑے بھیا کے پیچھے چلتی ہوئی میز پر آکر اپنے کمرے میں آئی۔ اور جب بڑے بھیا نیل کو اس کے میز پر لٹا کر چلے گئے۔

تب وہ کھڑے میں ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور اس میں کچھ اچھو بھلو کر نیل کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جا کر کچن بخار کم ہوا۔ تب وہ قدرے اطمینان سے ہو کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ ابھی بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی اور اس نے سونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ دیر تک نیند جہانی کے بارے میں سوچ رہی تھی پھر سر ٹھٹک کر ان کی طرف سے دھیان بٹا یا تو ذہن کے درجوں پر شاہ مسکندر حیات دستک دینے چلا آیا۔ اب وہ اس کے لیے سواہی نشان نہیں تھا۔ واپسی کے راستے میں اس نے اپنے بارے میں اسے بتایا تھا۔

چار سال سے وہ امریکہ میں تھا۔ وہاں سے ایگر بیکل میں ماسٹر کر کے گزشتہ سال لوٹا تھا اور ظاہر ہے بڑے زیندار کا بیٹا تھا۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک طرح سے شاہی زندگی گزار رہا تھا۔ اور اسے اس نے یقین دلایا تھا کہ شاہ پور میں وہ اسے پورا مائیکل کیمبرگوا دے گا۔ اور اس کے لیے کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اس وقت اسے سوچتے ہوئے وہ خود کو کبھی حویل اور کبھی مائیکل میں چلتا پھرتا محسوس کر رہی تھی۔

”مع تنگ نیل کا بخار اتر چکا تھا۔ بڑے بھیا اٹھتے ہی نیچے اتر کر آئے۔ اس وقت وہ نیل کو اپنے ماتھے سے ناشتہ کر رہی تھی۔ بڑے بھیا کو دیکھ کر ابھی جگہ سے اٹھنے لگی کہ انہوں نے ماتھے سے پیچھے نہپنے کا اشارہ کیا پھر نیل کے قریب آکر پوچھنے لگے۔

”اب کیسی طبیعت ہے بھیا؟“

”پاپا! میں تو ذات کو آپ کے پاس سویا تھا پھر پھر پھر کے پاس کیسے آگیا؟“ ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے نیل غالباً جو سوچ رہا تھا وہی پوچھ لیا۔

”آپ کو سہ لے کر آئی تھی؟“ بڑے بھیا نے نیل سے وہ بول بڑی۔

”اب بخار تو نہیں ہے اسے؟“ بڑے بھیا اس سے پوچھنے لگے۔

”نہیں بھیا! بالکل نہیں ہے۔ آپ بیٹیں ناں۔“ اس نے پھر اٹھنا چاہا۔

”بس چلتا ہوں، تم اس کا خیال رکھنا؟“ بڑے بھیا جانے کیوں نظر میں چرا کر لوٹے اور فوڈ اکمرے سے

نکل گئے۔
 ”بھو بھو! کیا کہاں ہیں؟“ نبیل نے پوچھا تو وہ جو بڑے بھیا کے جانے پر اُن کے پیچھے دیکھ رہی تھی چونک کر بولی۔
 ”سو رہی ہیں۔ چلو تم جلدی سے یہ خیمہ کرو بھرا اور سونیا آجائیں گے تو تم اُن کے ساتھ باتوں میں لگ جاؤ گے۔“
 ”بس بھو بھو! اچھا نہیں لگ رہا۔ نبیل نے منہ بنایا تو اُس نے ہنسی سے ہنسی میں رکھ دیا۔ اور اُسے آرام سے بیٹھنے کی تاکید کرتے ہوئے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔
 ”بھو بھو! بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ اور وہ بالکل اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ سب جانتے تھے امتحانوں کی وجہ سے وہ سب سے کٹ جاتی ہے اور کوئی اُسے دُشرب بھی نہیں کرتا تھا۔ پھر اب تو اُس کا آخری سال تھا۔ اس لیے میونہ بھائی بھی اس کے کمرے میں کم ہی آتی تھیں۔ ورنہ انہیں کہاں چپن آتا تھا۔ جب تک گھنٹوں کے حساب سے اس سے باتیں نہ کر لیں۔ اُن کا کھانا نہیں پڑتا تھا۔
 اب پہاڑی سارا وقت اماں جی کے پاس بیٹھی اُن کی سُنی تھی تھیں۔ کسی کسی وقت اُسے چائے دینے جاتیں تو اُن کی ہنسی شکل دیکھ کر وہ مسکرا کر کہتی۔
 ”بس بھائی کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم بہت فراغت سے مل بیٹھیں گے۔“
 ”یکہ نہ ہی تو نہیں گزر رہے؟ اُس وقت اُس کے تسلی دینے پر وہ اُٹھا کر بولیں۔
 ”اچھا چلیں میرے چائے پینے تک آپ یہیں بیٹھ جائیں۔ اور اتنے وقت میں جتنا بول سکتی ہیں بولیں۔ اُسے اُن پر رحم آگیا۔ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور چائے کا کپ اٹھا کر پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو کر میونہ بھائی بہت خوش ہو کر بیٹھیں لیکن پھر فوراً ہی بھڑکی ہو گئیں۔
 ”کیا بولا؟ وہ حیران ہوئی۔
 ”اُس وقت نہیں بیٹھ سکتی۔ مہمان کو چائے وغیرہ بھجوانی ہے۔ میونہ بھائی نے عجلت میں بتایا۔
 ”کون آیا ہے؟“ اُس نے پوچھ لیا۔
 ”وہ آیا ہے عدیل کے ساتھ۔ لیکن نام ہے اس کا شاہ سکندر۔ میونہ بھائی ایسے ہی عجلت میں بتاتے ہوئے چلی گئیں۔ اگر ایک لمحہ بھی ٹھہرتیں تو اُس کی دھڑکنوں کی آواز سن سکتی تھیں۔
 ”کیسا اذکھا خوشگوار احساس تھا کہ وہ ہیں اُس کے پاس موجود ہے۔ ایک بل کو پلکیں مونہ کر اُس نے اُس کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا۔ پھر جلدی سے چائے پی کر خالی کپ رکھنے کے، مہمانے کپن میں آئی تو عدیل بھائی میونہ بھائی سے کہہ رہے تھے۔
 ”جانے فرسٹ کلاس ہونی چاہیے بھائی اور یہ ٹرائل میں کیا سجا رکھا ہے آپ نے۔ ہٹائیے یہ سب میں اور سامان لے کر آتا ہوں۔“
 ”ادوفو۔ تم تو بول کر رہے ہو، جیسے کوئی نواب آیا ہو۔“ میونہ بھائی کچھ ہنسیلا کر بولیں۔
 ”نواب سے کچھ نہیں۔ عدیل بھائی کہتے ہوئے بہت نیازی میں باہر نکل گئے، تب وہ آگے بڑھ کر آئی اور ٹرائل پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔
 ”یہ سب ٹھیک تو ہے اور کیا چاہیے عدیل بھائی کو؟“
 ”چنانچہ، ایسے ہی اس کے آنے پر بولکھلا جاتا ہے۔ خیر، ہٹاؤ یہ سب۔ میونہ بھائی نے کہا تو وہ ٹرائل میں کھی مختلف لوازمات سمجھ رہی بیٹھیں نکال کر رک پر رکھنے لگی۔
 ”کچھ دیر بعد عدیل بھائی جانے کی کھینچ لے کر آگئے۔ اور شاہ پرزائے تھا کہ میونہ بھائی سے کہنے لگے۔
 ”بھائی پلینز آپ آپ اندر آئے آئیے گا؟“
 ”نہیں بھئی، میں نہیں پکار لوں گی خود ہی آکرے جانا، بھائی نے حذر پر نظر ڈالتے ہوئے گویا اپنے حزاب چیلے کا احساس دلایا۔ تب وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”میں بے آؤں گی بھائی۔ آپ جاتیں۔“ عدیل بھائی نے کچھ چونک کر اُسے دیکھا لیکن وہ شاہ پرزائے کھلنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ پھر نے سر سے ٹرائل سجا کر میونہ بھائی کو اس میں چائے رکھنے کا کہا اور ہاتھوں سے بال ٹھیک کر کے نکلی۔
 ”تیرا خیال ہے دوپٹہ کوئی ڈھنگ کا اور ڈھ۔“ میونہ بھائی نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ پھر ٹرائل دھکیلے ہوئے ڈرائیونگ روڈ میں آئی تو سامنے آبا جی کو بیٹھے دیکھ کر قدرے جھجک کر دروازے کے پاس ہی رُک گئی۔ پھر وہیں سے پلٹا چاہتی تھی کہ آبا جی نے اُسے اُس کا اشارہ کر دیا۔
 ”اسلام علیکم! شاہ سکندر اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں جو چمک لہرائی تھی اُسے یکسر نظر انداز کر کے وہ سادہ سے انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”کیسے ہیں آپ؟“
 ”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اُس نے ذرا سا سر ہلانے کے ساتھ اُسے بیٹھے کا اشارہ کیا پھر عدیل بھائی کو بول دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو میرے لیے کیا حکم ہے۔ اور عدیل بھائی اُسے میرا بی کے فرائض سونپ کر خود اٹھانے سے اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تباہانوں دونوں کس ممنوعہ پر بات کر رہے تھے۔ جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا دوبارہ وہیں سے شروع ہو گیا۔ اُس نے ٹرائل میں سے نکال کر تمام لوازمات نبیل پر رکھے پھر چائے بنانے کے لیے ٹرائل کھینچتے ہوئے آبا جی کے پاس آ بیٹھی۔
 ”آنا کھٹ کر ڈالو! آپ نے؟“ عدیل بھائی کے کہنے پر وہ ٹیل کی طرف متوجہ ہو کر لولا۔
 ”کچھ بھی نہیں ہے آپ نہیں لوتے؟“ عدیل بھائی نے پلٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی تو وہ کہنے لگا۔
 ”پیلے آبا جی کو؟“
 ”نہ تو کیا، میں بس چائے پیوں گا۔“ آبا جی نے کہا تو اُس نے ایک اچھٹی نظر اُس پر ڈالی جو بڑے ہی کپ سیدھے کر رہی تھی پھر اُلکیم سر اُچا کر کے اس سے پوچھنے لگی۔
 ”آپ چینی کتنی لیں گے؟“
 ”ایک پیوچ۔“ وہ اس کے اجنبی انداز پر محظوظ ہو کر لولا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“
 ”بس اب تو ڈاکٹر بننے والی ہے اُس سے پہلے عدیل بھائی بول پڑے۔
 ”اچھا۔ مگر ہم بی وغیرہ کر لیتی ہیں۔“ شاہ سکندر نے ازراہ مذاق کہا تو وہ بھی اُس کے انداز میں بولی۔
 ”مگر ہم بی نہیں جیہ ہمارا بھی کر لیتی ہوں۔“ شاہ سکندر کے ساتھ عدیل بھائی بھی بے ساختہ ہنسنے اور آبا جی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
 ”میری بیٹی بہت قابل ہے۔“
 ”اسی لیے میں کہتا ہوں آبا جی کہ اسے ایف آر سی الیں کے لیے باہر بھیج دیں۔“ عدیل بھائی نے کہا تو اُس نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن دھیان آبا جی کی طرف تھا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں اور آبا جی نے اُن کے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ ممنوعہ ہی بدل گئے۔
 ”شاہ سکندر کچھ نے نہیں رہے۔“ لوناں بیٹیا۔ اور اُس نے دیکھا شاہ سکندر اطمینان سے ہو گیا تھا۔
 ”تب وہ باری باری سب کو چائے پکھا کر کمرے سے نکل آئی۔ اور نبیل برآمدہ میں بیٹھے کیمرو پر ڈھکیل رہے تھے۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر ان کے کھیل کود دیکھا پھر اتار جی کے کمرے میں آئی میونہ بھائی بھی وہیں موجود تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔
 ”مہمان خلائو؟“
 ”نہیں میں چلی آئی۔“ اپنے ہی کسی خیال میں رہ کر اُس نے کہا اور اماں جی کے پاس بیٹھ گئی۔

تہی ہوں طویل دوہر میں ختم ہونے میں ہی نہیں آکر رہی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شہر بانو نے ٹیس پر بڑک کر دُور تک نظر ڈال کر دھوپ میں سرختے جگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں زیادہ دیر تک دھوپ میں نہیں دیکھ سکیں۔ اس طرف سے رُخ موزا آؤ آٹھنوں کے سامنے وارے سے بٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد منظر صاف ہوا تو تکیب وہ سست روی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ ان طویل دوہروں میں ہمیشہ وہ بھرپور زندگی گزرتی تھی۔

لیکن جس روز سے شاہ سکندر نے اپنا بوجھ اُس کے کانہوں پر ڈالا تھا۔ دوہر تو کیا رات کی نیندیں بھی اُچاٹ ہو گئی تھیں۔ اور خود شاہ سکندر گتے آرام سے تھا۔ اُس کا اطمینان دیکھ کر تو شہر بانو کے اندر الاؤ دیک اٹھتا تھا۔ یعنی اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی عبتوں کا خزن کرنے جا رہا ہے۔ اپنی محبت میں اتنا خود غرض ہو گیا کہ بہن کا بھی خیال نہیں اُٹا اپنا بوجھ اُس پر ڈال دیا۔

”بی بی جان سے کہہ دینا میں تمہارا سارے شادی نہیں کروں گا۔“ آج صبح بھی وہ اُسے بہت تاکید سے کہہ گیا تھا اور اُس کے لیے بی بی جان تک اُس کا پیغام بھی بنا کچھ مشکل تو نہیں تھا۔ لیکن اس نے بعد اُٹھنے والے طوفان کو سوچ کر ہی وہ اب تک خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ اُس طوفان میں اس کا بھی اتنا ہی نقصان ہو گا جتنا ہمہ انسا کا۔ اتنے دن اُس نے بہت کوشش کی کہ خود کو فریب دینے کی شاہ سکندر کا انکار اُس کی زندگی پر انداز نہ کرے۔ لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے اپنی یا شاہ بارون کی محبت پر ہر سانس میں تھکا۔ بہت یقین تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بی بی جان کی روایات کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

اس لیے اپنے دل میں کسی خوشی بھی کو جگہ نہیں دے سکی۔ مسلسل ذہنی اشتراک کے باعث اُسے اپنا جو کسی نامعلوم شے میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شام میں بی بی جان کے بلانے پر وہ اُن کے کمرے میں آئی تو دل جا بان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو رہی جائے گا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ کیونکہ بی بی جان پہلے ہی کچھ برہم دکھائی دے رہی تھیں۔

”سکندر آج پھر کراچی گیا ہے۔“ وہ جیسے ہی بی بی جان کہنے لگیں: میں نے تمہارے بابا جان سے پوچھا ہے اُن کا تو ایسا کوئی کام نہیں ہے پھر سکندر کس کام سے ہر چوتھے دن کراچی جاتا جاتا ہے؟ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ فردی طور پر وہ بھی کہہ سکی کیونکہ کچھ نہیں پانتی تھی کہ بی بی جان اُسے شاہ سکندر کا یہ بیانیوں بتا رہی ہیں یا اُس سے سوال کر رہی ہیں۔

”کیوں اُس روز تمہیں بھی تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کوئی خاص خریداری بھی نہیں کی تم نے پھر سارا دن کہاں رہے؟“ بی بی جان نے اُسے تعجب سے دیکھ کر پوچھا۔

”میں سارا دن جہاں کے ساتھ نہیں تھی بی بی جان؛ وہ مجھے اپنے دوست احمد صحن کے گھر پھر کر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ سہمہ پھر میں واپس آئے تب مجھے شاپنگ کے لیے لے گئے اور وہاں سے ہم سیدھا یہاں چلے آئے تھے۔“ اُس نے کچھ رُک کر صاف گوئی سے بتایا تو بی بی جان بوچھنے لگیں۔

”احمد صحن کے گھر کون کون ہے؟“

”الان والدہ اور جھوٹی بہن۔ دونوں بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت سے ملیں۔“ اُس نے بتانے کے ساتھ تعریف بھی کی۔

”سکندر کے سامنے آتی ہیں وہ خواتین، پردہ نہیں کرتیں۔“ بی بی جان کے مشکوک انداز پر وہ جمر بنز کر بولی۔

”نہیں۔“

”ہوں۔“ بی بی جان ہنسا رہا بھر کر جلنے کیا سوچنے میں لگ گئیں۔ اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ قدرے توجہ سے محبت کر کے بولی۔

”ہاں شادی کس غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں بی بی جان سکندر جہاں نائلہ کو بالکل بہنوں کی طرح بچہ

ہیں۔“ بی بی جان نے ایسی تیز نظر سے گھورا کہ وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ اور وہاں سے اُٹھنے کا بہ

سوچنے لگی۔ شہر بانو میں بتداری ماں ہوں۔ مجھ سے اگر تم کچھ پچھانا بھی چاہو گے تو نہیں چھپا سکو گے۔“ بی بی جان نے پہلے اُسے گویا تینہ کی پھر کہنے لگیں۔

”میں دیکھ رہی ہوں جس روز سے تم سکندر کے ساتھ کراچی سے ہو کر آئی ہو پریشان ہو۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے وہاں یا تم نے کیا دیکھا ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتی بی بی جان؛“ وہ انھوں میں چہرہ ہچکا کر رو پڑی۔

”کیا نہیں جانتیں؟“ بی بی جان نے اُس کا رد ناقصاً نظر انداز کر دیا۔ اور ایسے جھمٹے لیے میں پوچھا کہ وہ ڈر کر جلدی سے بولی۔

”اُس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔ جہاں نے بھی زیادہ کچھ نہیں بتایا بس اتنا کہا ہے کہ وہ مہر النساء سے شادی نہیں کروں گے۔“

”کیا؟“ بی بی جان جھک گئیں۔ ”یہ یہ کہہ کر سکندر نے تم سے؟“

”اُسی روز، جب میں اُن کے ساتھ کراچی تھی کبھی بدشکل مرحلے سے گزر کر اب وہ در سے پرسکون ہو گئی تھی۔“

”اور تم نے اُس روز مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”بتانا چاہتی تھی اور جہاں نے تو بہت تاکید کی تھی کہ میں ذرا آپ کو بتا دوں لیکن میری بہت نہیں پڑی۔“ اُس نے صاف گوئی سے اپنی بے بسی ظاہر کی تو بی بی جان کچھ دیر تک اُسے دیکھی رہیں پھر کمری سانس کے ساتھ جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

”تو شاہ سکندر کسی ٹوک کے پچھتیں ہر تیسرے چوتھے روز کراچی جاتا ہے؟ پھر یکدم نرم ہو کر اُس کا ہاتھ تھپک کر کہنے لگیں۔

”تم اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔ ماں باپ کے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جھلا۔ اور سزا بھی یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“

”جی۔“ اُس نے جھکے ہوئے سر کو آہستہ سے ہلایا پھر بولنے لگی۔ ”میں جاؤں بی بی جان؟“

”ہاں اور دیکھو سکندر آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا بی بی جان کی اجازت ملے ہی وہ اُن کے کمرے سے نکل آتی۔“

بڑی جہانی تباہی کس بات پر جہاں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ وہ کیسے نظر انداز کر کے راہداری میں مُڑ گئی اور وہاں سے برآمدے میں نکل آئی شاہ سکندر نے صبح سے اپنے جانے کا بتایا تھا لیکن واپسی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جلنے آج اُس کی واپسی ممکن تھی یا نہیں۔ وہ کتنی دیر تک دوش پر قبل کر اُس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر تھک کر فوراً اُس کی منڈیر پر آجلی۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب کچھ ہوا چلنے لگی تھی۔

شاہ لوٹس جات اور شاہ جہاں کی جات کے بچے یوں جھگڑتے ہوئے کمرے سے نکلے جیسے انہیں قدرت سے رہائی ملی ہو۔ ان کے شور پر وہ آپ ہی آپ اُن کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور کچھ دیر تک انہیں کیستے اور ایک دوسرے کے پیچھے جھگڑتے ہوئے دیکھ رہی پھر اُن کا اُٹھنے کو بھی کہ بڑے ٹیٹ سے داخل ہوتی پھیرو

گودھیکر اُس نے اُٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا دھیان شاہ سکندر کی طرف تھا۔ اور وہ انتظار بھی اُسی کا کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی بجائے شاہ مارون کے ساتھ مہر النساء کو دیکھ کر اُس کا دل اندر ہی اندر پیٹنے لگا۔

بہن کی طرح وہ بے اختیار مہر النساء کی طرف لپکی بھی نہیں بلکہ اُس طرح اپنی جگہ بیٹھ رہی۔ شاہ مارون نے اندر جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اُسے سلام کیا تکیب وہ کچھ ہوش میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مہر النساء کو دیکھ کر کوشش سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آنا ہی تھا تو صبح سے آئیں۔“ وہ تو ابھی مارون جہاں آ رہے تھے مجھ سے پوچھا چلو گے اور میں باقاعدہ پروگرام کے تحت نہیں آئی۔“ وہ تو ابھی مارون جہاں آ رہے تھے مجھ سے پوچھا چلو گے اور میں

جل پڑی۔ مہر النساء نے یوں بتایا جیسے اُس کے سن کی مراد برائی ہو۔

”اچھا کیا۔ آؤ اندر چلیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح میرا ساؤ کو جھپٹنے کی بجائے نظریں چلا کر بولی۔
”تم تیناں اگل بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“ میرا ساؤ نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھ لیا اور وہ
بلا ارادہ سچ بول گئی۔
”میں سکندر جہاں کا انتظار کر رہی تھی۔“

”کہاں گئے ہیں؟“ میرا ساؤ کے لیے میں ہمیشہ والی بے قرار تھی۔ اور اس بار وہ سنبھل کر بولی۔
”کراچی۔ اصل میں، میں نے اُن سے کچھ چیزیں منگوائیں تھیں خصوصاً دو تین ناول جن کا کچھ شدت
سے انتظار تھا۔ اور میں نے جہاں سے کہا بھی تھا کہ آج مجھے ہر حال میں مل جائے چاہیں۔ لیکن دیکھو ابھی
تک نہیں آئے۔“

”بہت غیر ذمہ دار ہیں مبادے جہاں اور لاہور ابھی؟“ میرا ساؤ نے کہا تو وہ ہمیشہ کی طرح اُسے جھٹلا
نہیں سکی۔ بلکہ یوں بن گئی جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں۔ اور اندر داخل ہو کر کہنے لگی۔
”تم تو بی جان سے مل لو پھر اوپر آجانا۔ بی بی جان اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ میرا ساؤ کچھ کہے بغیر
بی بی جان کے کمرے کی طرف مڑ گئی اور وہ اوپر چل آئی۔

اس وقت میرا ساؤ کی آمد نے اُسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ کیونکہ ذہنی طور پر وہ بہت اب سیٹ
تھی۔ اور اُسے خدشہ تھا کہ کہیں میرا ساؤ کے سامنے بے دھیانی میں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جو اُسے
شبہ میں مبتلا کر دے۔ جیسا اُس کے اوپر آنے تک وہ مسلسل خود پر قابو پانے میں لگی رہی۔
”آف، اتنی گرمی میں کیسے بیٹھی ہو۔ پردے تو ہٹاؤ، میرا ساؤ نے کمرے میں آتے ہی کہا تو اُس نے
جلدی سے پیلے پیلے کاٹن آن کیا پھر کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ میرا ساؤ نے اپنا بڑا سا دوپٹہ اتار
کر ایک طرف رکھا پھر کھڑکی کے قریب آ کر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بولی۔
”بارش ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ لیکن شکر ہے ہوا چلتی لگی ہے۔ دن میں کتنی گرمی تھی۔“

”ہوں؟“ وہ اپنے ذہن کو حاضر رکھنے کی خاطر پوری توجہ سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ لیکن جواب میں صرف
”ہوں کہہ کر رہ گئی۔“

”کیا بات ہے؟“ کچھ دیر بعد میرا ساؤ اُس کی خاموشی محسوس کر کے ٹوکتے ہوئے بولی: ”آج تم کچھ چپ
چپ سی ہو۔ بی بی جان نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔“

”بی بی جان آج کچھ غصے میں ہیں؟“ اُس نے پوچھتی بات بنا ڈالی۔
”جی ہریت؟“

”ہاں بس۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگی: ”یاد آ رہا ہو۔ میں کراچی سے بہت
اچھے گاؤں کی ٹیکس لائن ہوں سنو گی؟“
”معلوم؟“ میرا ساؤ نے اشتیاق سے کہا تو وہ فوراً ریک کے پاس آ کر لیٹ دیکھنے لگی۔ لیکن پھر یاد آ کر
اُس روز اُس نے ساری چیزیں الماری میں رکھ دی تھیں۔ ریک چھوڑ کر الماری کھولی اور جیسے ہی شاپرنگ لٹنے
لگی اُسے رکھا میرا ساؤ کا پکیٹ جو اُس نے شاہ سکندر کے لیے دیا تھا۔ نیچے آ رہا جیسے اُس سے پہلے ہی میرا ساؤ
نے پیک کر اٹھا لیا اور بہت خاموشی غلوں سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔

”میں جانتا ہوں تمہارا وقت کتنا قیمتی ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب جب تک تم امتحانوں سے
فارغ نہیں ہو جاؤ گی شہر تو کیا تمہارے خیالوں میں بھی نہیں آؤ گا۔“ شاہ سکندر کے بلا سے پر وہ آگے بڑھی
معتی لیکن شاکھی بھی تھی جیسے وہ اُس سے آئندہ احتیاط کا وعدہ کرتے ہوئے بلا تو اُس کی آخری بات پر وہ اپنی
بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کی خاطر چہرہ موڑ کر لہروں کی سرکشی دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر
تھکا پھیر بھی قصداً انجان بن کر چند قدیم آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ قریب آ کر پوچھنے لگی۔
”جب آپ جانتے ہیں میرا کچھ قیمتی ہے پھر ملنے پر اتنا اصرار کیوں تھا؟“

”میں شاہ پور جاتے سے پہلے یہ یقین چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے حالات میں تم میرا ساتھ دو گی۔“ شاہ سکندر

اُس کے چہرے پر نظریں جاکر کہا۔
”کیا مطلب؟“ وہ کچھ اُلجھتی تھی۔ اور اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر لوں دیکھنے لگا۔
جیسے بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔
”میرا خیال ہے یہاں تک نہیں ہے آؤ ادھر ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں؟“ وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے
اُس کے ساتھ چل پڑی۔ ریسٹوران میں داخل ہو کر شاہ سکندر نے ایک میبل کی طرف متوجہ اٹھا کر اُسے وہاں
بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی مدد آب کے تحت کھڑے اٹھا کر اُس میں سینڈویچز اور ڈرنکس رکھنے لگا۔
پھر آ کر کمرے اُس کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”کیسے یاد آد ام آپ کے لیے؟“
”ہائیز آسید نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید بولنے سے روک دیا اور اُس کے بیٹھنے پر کہنے لگی۔
”ترے جبر کا امتحان اب پھر کیسے لے لیے گا۔ اس وقت میں سخت الجھن محسوس کر رہی ہوں۔“
”سواری، میں تمہیں الجھنا یا پریشان کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی تم پریشان ہونا۔ وہ ایک دم سنجیدہ

ہو کر بولا۔
”کیا کوئی ایسی بات ہے؟“ آسید کے لیے میں آپ ہی آپ اندر بیٹھ سٹ آئے تو وہ اُس کی آنکھوں
میں دیکھ کر قصداً مسکرایا پھر کہنے لگا۔

”جی نہیں تم کچھ رہی ہو۔ میں تو تمہیں بیڑتا نا چاہتا ہوں کہ تمہارے امتحانوں کے فوراً بعد میں اپنے
گھر والوں کو آؤں گا۔ تمہیں اب تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا ناں۔“ وہ جو اس پر نظریں
جمائے بیٹھی تھی، اُس کی بات پر نہ شرمائی نہ الجائی اسی طرح اُسے دیکھتے رہتی پھر پلکیں جھکا کر بولی۔
”میرا خیال ہے اصل بات کچھ اور ہے۔“

”اصل بات یہی ہے۔ باقی ساری باتیں اس کے بعد کی ہیں؟“ وہ فوراً بولا۔
”میں سن رہی ہوں۔ آپ بلا جھجک باقی ساری باتیں بھی کہہ ڈالیے؟“ وہ مزید شفاف سطح پر انگلی سے
آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے بولی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی جھکی ہوئی پلکیوں کو دیکھتا رہا پھر سوچ کر کہنے
لگا۔

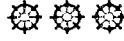
”مجھے غلط نہیں سمجھنا آسید، میں تمہارے ساتھ اتنا ہی غلط ہوں جتنا اپنے آپ کے ساتھ۔ میں
نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور پھر تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر کے ہی میں نے تمہاری طرف پیش رفت کی۔ اگر
محض دوستی یا وقت گزاری کا خیال ہوتا تو میں کبھی تمہارے گھر تک نہ پہنچتا۔ ہر حال کچھ یقین ہے تمہارے
گھر میں کوئی بھی مجھے ناپسند نہیں کرتا۔ لیکن اصل مسئلہ میرے گھر کا ہے۔ جہاں برادری کے باہر شادی
کا تقوید ہی نہیں ہے۔“ وہ جو سر جھکائے سکون سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ ذرا سی پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھنے
لگی۔ لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ نہیں۔

”صرف جامد لاؤنگ وجہ سے آپس ہی میں رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔ اگر اچانک تم نے آ کر میری
زندگی میں پہنچ کر نہ چلی ہو تو شاید بلکہ یقیناً میری زندگی کی نا ڈھکی ایک محفوض دھارے پر بہہ نکلتی۔ لیکن
اب ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم سے بہت کم سوچ بھی نہیں سکتا اور میری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ میرے
والدین غور سے میرے فیصلے کو قبول کر لیں۔ دوسری صورت میں؟“ وہ خاموش ہو کر ایک دم اُس کی آنکھوں
میں دیکھنے لگا۔ تو وہ ہونٹ جھینچ کر نظروں کا ڈاؤن پر دل گئی۔ شاہ سکندر سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا سوچ رہی
ہے۔ قدرے توقف سے کہنے لگا۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ دوسری صورت میں کیا ہو گا؟“
”میں جانتی ہوں، دوسری صورت میں آپ سب چھوڑ کر چلے آئیں گے؟“ اُس نے کہا تو وہ فوراً بے تاب

سے بولا۔
”اور میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں تم میرا کتنا ساتھ دو گی؟“ اُس کی بے تاب شدت سے
محسوس کرنے کے باوجود وہ فوراً جواب دے کر بجائے سوچ کر بولی۔

”بی بی جان! وہ شہر باؤنے آپ کو تیار ہوگا۔ میرا مطلب ہے، آسیہ کے بارے میں!“
 بی بی جان بہت خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ اپنے آپ رگ گیا۔ اور محض اُن کی نظروں
 سے بچنے کی خاطر اُلٹھ کر کھڑکی سے دُرا سا پردہ سرکایا پھر وہیں سے کہنے لگا۔
 ”اگر نہیں بتایا تو میں بتا رہا ہوں کہ میں آسیہ کو پسند کرتا ہوں۔ اور اُس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“
 کتنے درمیدار اُسے احساس ہوا کہ بی بی جان نے کچھ کہا نہیں۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پل کر اُس کی رنگ میں ہونے لڑکھ
 قسم کی جتنی سانسے باباجان کھڑے تھے۔



شاہ سکندر نے سکینڈ کے ہزاروں حصے میں خود پر قابو پایا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
 ”بڑی مبارک ساعت ہے کہ بی بی جان اور باباجان میرے کمرے میں موجود ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کیا
 باتیں کہیں گی اُن کو۔“
 ”سکندر حیات! ہمیں جیکو دینے کی کوشش مت کرو، تم جانتے ہو ہم ہر پھر پھر پسند نہیں کرتے۔“
 باباجان نے ٹوٹے ہوئے غصہ ناک لہجے میں کہا تو وہ اُن کے غصہ سے مرعوب ہوا بھی تو ظاہر نہیں کیا
 بت سنبھل کر بولا۔
 ”میں بھی ہر پھر پھر پسند نہیں کرتا باباجان پوچھ لیجیے بی بی جان سے۔ سیدھے صاف لفظوں میں نہیں
 نہیں بتایا ہے۔“
 ”اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے برخوردار ہم تہا دی بات سن چکے ہیں۔ اب تم سن لو کہ ہمارے فیصلے

بھری کمر ہوتے ہیں۔“
 باباجان نے فوراً ہی اس انداز میں اُس پر واضح کیا کہ مزید اس سلسلے میں کچھ نہیں سنیں گے اور وہ بھی
 ذرا بولی بڑھا۔
 ”میں آپ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہا باباجان۔“
 ”پھر تیار امقصد کیا ہے؟“

”آپ دیکھ رہے ہیں میری بات سنیں۔“ وہ چاہتا تھا سہولت سے بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کرے۔ لیکن باباجان
 سادہ نہیں ہوئے۔

”میں تہا دی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ اس لیے کہ ہم انسا سے تہا دی نسبت ہم نے بالا ہی بالا طے نہیں
 بھی۔ تم نے پوچھ کر تہا دی مرہقی سے یہ رشتہ طے سوا تھا۔ کیوں پولس کی ماں؟ باباجان نے ایکدم بی بی جان کو
 مایہ کیا تو وہ جو بہت خاموشی سے بابا بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں۔ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔
 ”تو پوچھو اس سے کہ اب اسے میرا انسا میں کون سے عیب نظر آنے لگے جو۔“

”خدا کے لیے باباجان! ایسی باتیں نہیں کریں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں ایسے کسی سبب سے مہر انسا کو
 بیکٹ نہیں کر رہا۔ بلاشبہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“
 ”اور میں اچھی لڑکی اس کھڑی بہو بنے گی۔“ باباجان کے حتی انداز پر وہ ہونٹ بھیج کر بی بی جان کو دیکھنے لگا۔
 ”شاید وہ کہیں کچھ پھر ان کی طرف سے مایوس ہو کر قدرے جرات سے بولا۔

”کہ ازم میں تو اسے بیاتنے نہیں جاؤں گا۔“
 ”کیا کہا۔“ استانی غصے سے باباجان کی آواز بیٹ گئی۔ ”سُرخ آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے چند قدم
 اُسے مگر رک گئے۔ اور کمر دھڑک اُس پر نظر پڑا۔ جھانٹے رکھنے کے بعد کہنے لگے۔
 ”میں اسی وقت تمہیں ٹوٹ کر سکتے ہیں۔ یا اگر چاہیں تو عاقبت کر کے جیتنے کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیں۔
 ت تو ایک ہی ہے۔ لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بجائے ہو کیوں؟“
 اس قدر ٹھہرا ہوا سفاک تہج تھا کہ اس کو ٹیل جوان کا پورا وجود سن ہو گیا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ

”گو کہ میرے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار میرے والدین کو ہے۔ لیکن میں جانتی
 میری مرہقی کے لیے وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، اور شاہ سکندر جیات آپ ہی سے تو کہ
 کہ آپ میری زندگی میں اُس مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔ جہاں آپ سے پہلے کون تھا نہ آپ کے
 کوئی ہو سکتا ہے۔“
 ”آسیہ!“ شاہ سکندر نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو وہ گھبرا کر بولی۔

”پلیز! کچھ خیال کریں۔“
 ”سواری!“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔
 ”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔“ وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ اور فوراً کھڑی بھی ہو گئی تو مجبوراً شاہ سکندر
 اٹھنا پڑا۔

والہیں کے رستے میں وہ لقصداً اس موقع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور جب وہ
 اسٹاپ پر اُترنے لگی تب روک کر کہنے لگا۔
 ”سنو! تم ابھی کچھ مدت سوچنا۔ میرا مطلب ہے اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالنا۔ ہو سکتا ہے تم
 امتحانوں کے بعد جب میں اُن دنوں میرے ساتھ بی بی جان اور باباجان بھی ہوں۔ وہ کیا کہنی۔ ذر
 پلانے پر اکتفا کیا۔ پھر نیچے اُتر کر اُسے دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔
 ”جلدی آؤں گا۔ خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھائی اور ویو مرمیں اُسے دیکھنے
 لمحہ بر لمحہ دور ہونے کے باوجود اُسے اپنے ساتھ ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔

شاہ سکندر تمام راستہ ہی سوچتا آیا تھا کہ اگر شہر باؤنے بی بی جان کو آسیہ کے بارے میں
 بتایا ہوگا تو آپ وہ خود ہی سبکی فرمت میں بی بی جان سے بات کرنے کا۔ کیونکہ اب زیادہ دن
 تھے۔ اور وہ جانتا تھا کہ بی بی جان اور باباجان آسانی سے نہیں مانیں گے، اگر مہر انسا سے اُس کی لڑ
 طے نہ ہو تو ہونی تب بھی اُن کا ماننا مشکل تھا۔ اور اب تو ظاہر ہے اُن کے پاس جواز موجود تھا۔
 حوالی آتے ہی اُس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ خیال تھا شادی لینے کے بعد پہلے شہر باؤنے
 گا۔ لیکن جیسے ہی مناد نے گھر کا آگے وقت بی بی جان اُس کے کمرے میں آگئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ
 ہونے کے ساتھ کچھ نادام ہو کر بولا۔

”میں ابھی آپ ہی کے پاس آ رہا تھا بی بی جان۔“ بی بی جان اُس کے میڈ پر آرام
 گئیں اور اُس کی بات کی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”کراچی سے آ رہے ہو؟“
 ”جی ہاں۔“ وہ دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ لیکن اُن کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تا
 تھا۔

”مہرے کہاں تھے؟“
 ”جی ہونٹ میں۔“
 ”وہاں کوئی ننگہ کیوں نہیں خرید لیتے۔ اکثر جانا ہوتا ہے۔ تمہارے باباجان بھی جاتے رہتے۔
 گھر بیٹا جیسے۔ میں کہوں گی تمہارے باباجان سے۔“ بی بی جان نے سرسری سے انداز میں کہا پھر
 کہ وہ اُن کے گفتگوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”یہیں ناں بی بی جان! کہاں جا رہی ہیں؟“
 ”میں تمہارے لیے جاتی ہے۔“ منتر سے آ رہے ہو۔
 ”ہاں چائے کی غواہش تو ہے۔ لیکن آپ بیٹھیں، میں جہاں سے کہہ آتا ہوں۔“ وہ کہتا ہوا کہ
 نکل آیا۔ زمین اُترتے ہی جہاں نظر آئی۔ اُسے جلدی سے جانے لائے گا کہ وہ دیں گے پلٹ
 بی بی جان کے پاس بیٹھے ہی ہیں اچانک بلا ارادہ ہی کہنے لگا۔

اُن کی طرف دیکھ نہیں سکا۔
 ”کیونکہ ابھی میرا سنا کو اس حویلی کی بہو بننا ہے۔ جسے تم بیاہ کر لاؤ گے۔“
 باباجان اسے ٹوٹ کر نہ بول سکا۔ مگر فوراً اُس کے کمرے سے چلے گئے۔ اور رجب بی بی جہاں
 پیچھے جانے لگیں تب ایک دم ہوش میں آکر وہ ایک ہی جست میں اُن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور اُن کے
 کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بی بی جان! میں آپ کو اور باباجان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔
 اور کس طرح ناراض کرو گے؟“ بی بی جان کے شان کی لہجے پر وہ رنج پرور بولا۔

”آپ میری بات تو سنیں۔“
 ”نہیں سکندر راجا! جو کچھ تمہارے باباجان کہہ گئے ہیں اسے حرف آخر سمجھو۔“
 بی بی جان نے اُس کی بات سننے سے صاف انکار کر دیا۔ تو گہری سانس کھینچتے ہوئے اُس نے اُن
 کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے پھر اُن کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولا۔
 ”کہہ دیجیے باباجان سے کہ میرا سنا کو بیاہنے میں نہیں میری لاش جلنے گی۔“
 بی بی جان نے دہل کر اُسے دیکھا تھا۔

شاہ سکندر کے لیے کوئی بات غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا باباجان اور بی بی جان کو رام کرنا آسان
 پھر بھی وہ مایوس نہیں تھا۔ اور ابھی تو بات شروع ہوئی تھی۔ اُس کے خیال میں پہلے چلے پر ہی ہوتا
 باباجان اُسے ٹوٹ کرنے کی دھکی دیں گے۔ پھر کھڑن ناراضگی کا اظہار اُس کے بعد آپ ہی آپ
 جائیں گے۔ اس وقت وہ یہی سب سوچتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر ٹیس پر آ کھڑا ہوا۔ خام اُم
 پہلے اُسے بے پناہ خاموشی کا احساس ہوا۔ جیسے اُس کے پاس بلکہ پوری حویلی میں اور کوئی نہ
 نہ ہو۔ پھر اچانک ہلچل مچ گئی۔ اُس نے رینگ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے جھانک کر دیکھا۔ باباجان شاہ لا
 کے ساتھ بہت تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اُن کے پیچھے دو تین ملازم بھاگتے
 باوجود درمیانی فاصلہ کم نہیں ہونے دے رہے تھے۔
 اُس نے بہت خاموشی سے باباجان اور شاہ یونس کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا اور جب گاڑی
 ہونی حویلی کی حدود سے نکل کر سیاہ چلتی ہوئی سڑک پر گڑے پھرنے لگی تب اُسے سیلا خیال یہ آیا
 وقت باباجان کہاں گئے ہیں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ کچھ ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ یہ باباجان
 نہیں تھا۔ اور ابھی وہ اس غیر معمولی بات پر غور کر رہی رہا تھا کہ عقب سے شاہ جہانگیر نے اُسے

”سکندر!“
 ”جی بھائی!“ وہ بے اختیار فوراً پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا تو قریب آکر انہوں نے یونہی
 ”کہاں کیا کر رہے ہو؟“
 ”کچھ نہیں باباجان کو دیکھ رہا تھا، کہاں گئے ہیں؟“ اُس کی سوچ آپ ہی آپ سوال کی صورت
 آگئی۔
 ”باباجان کہاں گئے ہیں؟“ شاہ جہانگیر نے اُٹھا اُس سے پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے انہیں
 جلنے کی خبر ہی نہیں۔

”جانتا نہیں، میں نے ابھی انہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یونس بھائی بھی ساتھ تھے۔“
 ”اچھا، کچھ نہیں معلوم، شاہ جہانگیر کے بے نیازی دکھانے پر وہ خاموش چور ہوا تو اُس نے
 دھڑاتے ہوئے شاہ جہانگیر کے خود گاڑی کے انداز میں کہا۔
 ”شام ہو رہی ہے، پھر اُسے دیکھ کر بولے: ”آؤ اندر چلیے ہیں۔“
 ”جی!“ وہ ان کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ ٹیوٹ لائیٹ اُن کی پھر انہیں بیٹھنے کا

”گلتا ہے۔ آپ کو بچتے یا آدھے ہیں۔“
 ”ہاں ہاں! بس اب جلدی سے چھٹیاں ہوں تو جا کر انہیں لے آؤں یہ شاہ جہانگیر بیٹھے ہوئے بولے۔
 ”میرا تو خیال ہے بھائی! بچوں کو گراچی کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرادیں۔ قریب بھی ہے ہر

”نہیں یار! بچے گراچی کی آب و ہوا پسند نہیں ہے۔ موسموں کا پتا ہی نہیں چلتا۔“
 ”ہوں!“ وہ کیا نکتہ جس اُن کی نائید کر کے رہ گیا۔

”سننا ہے۔ نہیں گراچی کا موسم راس آگیا ہے۔“
 شاہ جہانگیر نے نفی خیز سکراٹھ کے ساتھ کہا تو وہ ذرا سا چونکا پھر اُن کا اشارہ سمجھ کر اُس کے ہونٹ
 کے ساتھ مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ جبکہ نظروں میں وہ خوبصورت سراپا آن سما تھا جس کی خاطر وہ اپنی
 بذاتی روایات تو کیا ساری دنیا سے لڑ سکتا تھا۔ شاہ جہانگیر نے گہری نظروں سے اُسے کھوجا پھر کہنے

”محنت حاققت کی ہے تم نے، جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟“
 ”زیادہ سے زیادہ باباجان مجھے ٹوٹ کر دیں گے، اُس نے اتنے آرام سے کہا کہ شاہ جہانگیر کو واقعی

”لہجہ اپنے بارے میں سوچ لیا تم نے، اور ہم سب؟ ہم سب کی کوئی اہمیت نہیں تمہاری نظر میں۔“
 ”یہ بات نہیں ہے بھائی!“ وہ نظروں چرائ گیا۔

”پھر؟“
 ”میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا۔ اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ آپ اگر جان ہی گئے ہیں تو میرے بجائے

”بی بی جان اور باباجان کو سمجھائیں۔“
 ”کیا کہاؤں؟“ شاہ جہانگیر نے اپنی نشست کا انداز بدلتے ہوئے پوچھا تو وہ انہیں اپنی بات توجہ

”میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھنا چاہتا بھائی، سیدھی صاف بات یہ ہے کہ میں اسیہ سے شادی
 نہ چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر بی بی جان اور باباجان خوشی سے راضی ہو جائیں تو اچھی بات ہے دوسری
 صورت میں میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”گویا فیصلہ کر چکے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے کہتے ہوئے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور سگائے کے بعد کہنے

”ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں کچھ حادثات اچانک زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب
 نہیں ہے کہ بندہ ایک دم سے ہتھار ڈال دے۔ اُس لڑک کی طرف پیش رفت سے پہلے نہیں کم از کم یہ تو

”چننا چاہیے تھا کہ میں شہر بانو اس گھر میں منسوب ہے جہاں تمہاری نسبت مٹھ چلی ہے۔“
 ”میں اگر یہ سب سوچتا تب بھی خود کو اُس کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔“
 اُس نے صاف کوئی سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو شاہ جہانگیر نے ہنسیوں اچکا کر تعجب سے اُسے

”کیا پھر کہنے لگے۔“
 ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے جذباتی ہو، اور اب تو نادان بھی کہوں گا۔ کیا ضرورت تھی اتنی جلد بازی کا

”نظم بکرنے کی۔ کچھ حکمت عملی کے کام لیتے؟“ اُس نے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا تو کہنے لگے۔
 ”ایک دم سے یہ کہہ دینا کہ میرا سنا سے شادی نہیں کروں گا، حاققت کے ساتھ خود غرضی بھی ہے۔ کتنی
 مذاکیاں متاثر ہوں گی تمہارے انکار سے اگر پہلے نہیں سوچا تو اب سوچو۔ جلد دوسروں کو چھوڑ دو صرف اپنے

بارے میں سوچ کر بتا دیکر یہاں سے نکل کر کیا کر دینگے؟
 ”ظاہر ہے، آسیہ سے شادی۔ وہ بنا سوچے بول گیا تو شاہ جہانگیر ذرا سا مسکرائے۔
 ”تمہارے ذہن پر صرف آسیہ سوار ہے۔ باقی داؤے کیا کرتی ہے؟“
 ”انہوں نے پہلے بار اُس لڑکی کے بارے میں اشتیاق سے پوچھا۔
 ”میرے کل کے آخری سال میں تھی، میرا مطلب ہے آج کل فائنل امتحان دے رہی ہوگی؟“
 وہ اُن کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ آسیہ کی تعریف کرنے لگا۔
 ”بیت ذہین لڑکی ہے، میری ک سے پوزیشن لیتی آ رہی ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے مستقبل قریب کی کامیاب ڈاکٹر؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں جیسے اپ
 آپ سے کہا۔ پھر اُسے دیکھ کر تائید سے بولے۔
 ”اسی لیے اسنے اطمینان سے جوتم، بابا جان عاق کر دیں یا تم خود سب چھوڑ کر چلے جاؤ۔ آگے کوئی
 نہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔“
 ”نہیں، جہانگیر بھائی، جوش جذبات سے اجانک اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”اتنا بے غیرت نہیں ہوں میں کہ عورت کی گئی پر تکیہ کرے لگوں۔ میں اُسے لڑکی کی اجازت
 اُس وقت دن کا جب میرے گھر میں اس کے پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“
 ”اور اس سے پہلے کیا کر دینگے؟ شاہ جہانگیر کا انداز ہنوز تھا۔ جھٹھرا ہوا، دوستانہ، جیسے اُس سے
 اگلوانے کا سوچ کر آئے ہوں۔
 ”میں خود کیوں گا۔ لڑکی یا کوئی چھوٹا موٹا بزنس۔“
 ”ہوں، یہی میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر کیا کر دینگے اور تم نے فوراً آسیہ سے
 کی بات کر دی۔“
 ”انہوں نے کہا تو وہ اپنی جلد بازی پر جرحی سا ہو کر سر کھانے لگا۔
 ”بہر حال، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس لیے میرا مشورہ مانو، بابا جانا
 مت کرو۔“ انہوں نے کہا تو وہ پھر فوراً بول پڑا۔
 ”میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“
 ”میں اُسے چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے لیے تم یہاں سے سارے
 توڑ کر چلے جاؤ۔ بلکہ کوئی اور راستہ سوچو۔“
 ”تمہارے پیش نظر صرف اپنی ذات نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ سمجھ رہے ہونا؟
 چنانچہ اُسے کیا سمجھا نا چاہتے تھے۔ وہ بے حد خاموش نظر دے انہیں دیکھنے لگا۔

آسیہ کو اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے امتحانوں کے دوران اُس نے کسی خیال
 قریب بیٹھنے نہیں دیا۔ پوری کیوں اور دلچسپی سے پڑھنے میں لگی رہی تھی۔ خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا
 جہاں اُس نے سکون کا سانس لیا وہاں اُس کے بھیجے بیٹھیاں خوش ہو گئیں۔ کیونکہ امتحانوں کے دو
 کو اُس کے کمزورے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور سب نیچے اُس سے اتنے مانوس تھے جب
 دن بھر کی روداد اُسے سنا کر انہیں چین نہیں آتا تھا۔
 وہ سب سے محبت بھی تو بہت کرتی تھی۔ اکثر اُن کے ساتھ بچہ بن جاتی۔ اُن کے کھیل میں
 ہوتی۔ اور ادھر اتنے دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی تو ظاہر ہے بچے پریشان ہو گئے تھے۔ میو
 الگ بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ اور وہ جو آخری یہ سچے کمرے کے بعد یہ سوچ کر سوئی تھی کہ اب لگے دن؟
 گی، میمونہ بھائی نے سر شام ہی اُسے جھنجھوڑا لیا۔
 ”بس اب فوراً اٹھ جاؤ۔ بچے پیار سے تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔“

تو یہ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ وہ آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ پھر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔ کہاں
 جا رہے؟
 ”ارے امیر اور سونا تو یہیں دھاوا بولنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا ہے۔ چلو اب تم
 مدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ چائے بھی تیار رکھی ہے۔“
 میمونہ بھائی جاتے جاتے چٹکے کا بن بند کرنی لگیں۔ غالباً اس خیال سے کہ کہیں وہ دوبارہ نہ سوجھلے
 درنا جا رہے اٹھنا پڑا۔ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلی تو اُسے دیکھتے ہی امیر اور سونیل نے شور مچا دیا۔
 ”چھوڑ آگئیں، پیپو آگئیں۔“ وہ کھل کر سدا کی اور بارہی باری اُن کے کال چھو کر اماں جی کے پاس
 منت بڑی پریشانی اور اُن کی گود سے عمر کو اٹھاتے ہوئے بولی۔
 ”ماشاء اللہ، یہ تو بہت مبارک ہو گیا ہے کس پر گیا ہے؟“
 ”تم تارو؟“ اماں جی نے کہا تو وہ فوراً سے عمر کو دیکھنے کے بعد بولی۔
 ”مجھے تو بیل کی طرح لگ رہا ہے۔“
 ”ہاں پشانی اور آنکھیں نیلی جیسی ہیں۔“
 ”بیل سے کہاں؟“ اُسے اچانک بیل کی کمی محسوس ہوئی کدھر اُدھر دیکھ کر بوجھا۔
 ”ابھی تمہارے آبا جی کے ساتھ باہر گیا ہے۔“ اماں جی نے بتایا بھی میمونہ بھائی چائے لے کر آئیں۔
 ”سے دریاں نہیں رکھی پھر بیٹھیں تو کھینے لگیں۔“
 ”بچوں کی چٹیاں ہونے والی ہیں، کیوں نہ ماناں جی اسلام آباد چلیں۔“
 ”ہاں برسوں سینا کا فون آیا تھا۔ وہ بھی بہت اصرار سے بلارہی تھی۔ اب دیکھو تمہارے آبا جی کیا کہتے ہیں؟“
 ”اُن جی نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔
 ”آبا جی منع کر دیں گے کیا؟“
 ”نہیں، منع کیوں کر دیں گے۔ لیکن سارا گھر ایک ساتھ بھی تو نہیں جاسکتا ناں۔ یہاں خلیل اور عدیل لڑکی
 لے گئیں انہیں بھی کہاں ملے گی اور اُن کے لیے گھر میں ایک عورت کا ہونا بھی ضروری ہے۔“
 ”اماں جی کی بات سنی ٹھیک تھی، وہ تاخیر کرتے ہوئے میمونہ بھائی کو دیکھ کر شرارت سے بولی۔
 ”یہ تو ہے، بس میمونہ بھائی یہیں رہ جائیں گی۔“
 ”کیا؟“ میمونہ بھائی جمع بڑھی۔
 ”میرا مطلب ہے، ابھی اماں جی اور آبا جی کو جانے دیں، ہم بعد میں چلیں گے میں، آپ اور بچے۔“
 ”فوراً وضاحت کر کے خود ہی ہنس پڑی۔
 ”نہیں اگر جانا ہو، تو پہلے تم دونوں چلی جانا بچے خوش ہو جائیں گے۔“
 ”اماں جی نے کہا تو میمونہ بھائی کے اشارے پر اُسے خاموش رہنا پڑا۔ ورنہ وہ منع کرنا چاہتی تھی۔
 لہ اُسے شاہ سکندر کا خیال تھا، جانتی تھی کہ وہ بے خبر نہیں ہوگا۔ آج امتحان ختم ہوئے ہیں تو اب
 آکا جانا رہے گا۔ اور جب تک کچھ طے نہ ہو جائے وہ کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔
 ”امتحانوں کی وجہ سے اُس نے ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ اُسے شاہ سکندر
 یاں آیا ہی نہیں۔ بلکہ اس کا خیال تو کبھی نہیں ہوا تھا، البتہ اُس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے وہ گریز
 کرتی تھی۔ اور اب وہ آزاد تھی۔ اُس رات درمیک وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ جو کہہ کر گیا تھا کہ اس بار
 بے والدین سے بات کرے گا۔ وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ سب چھوڑ آئے گا۔ تو جانے اُس کی آمد کس
 نہ ہوگی، البتہ والدین کو لے کر آئے گا یا نہ۔“
 ”میر دو موٹوں میں اُس نے اسی دقت سے اپنا دل انتظار کی دلمیز پر رکھ چھوڑا تھا۔
 ”میر دو معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ اور جب تک میمونہ بھائی بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتیں اُس نے
 ستیا کر لیا۔ بڑے بیٹا بیل کے ساتھ نیچے اترے تو میمونہ بھائی نے امیر اور سونیل کے ساتھ بیل کو

بھی بٹھالیا۔ اور تینوں کو ناشتا کرا کر اسکو بھیجا۔ اس کے بعد خلیل اور عدیل کی باری آئی تو اس کی نظر بڑے بھینکاؤں سے گزرتی تھی۔ لیکن وہ جا چکے تھے۔ پھر میری وہ میمونہ بھابی سے پوچھنے لگی۔

”بڑے بھینکا چلے گئے کیا؟“

”ہاں شاید“ میمونہ بھابی نے ہاتھ میں چائے دم کر رہی تھیں۔ مصروف انداز میں جواب دیا۔
”ناشتا بھی نہیں کیا؟“ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جب بڑے بھینکا کو دیکھا تھا تو اسی وہ انہیں روک کیوں نہیں لیا۔

”وہ ناشتا نہیں کرتے، شاید انہیں صدمہ ہو گئی ہے کہ اپنی بیوی ناشتا بنا کر دے گی تو کرس۔ ورنہ نہیں؟“

”میمونہ بھابی نے اپنا خیال ظاہر کیا پھر ٹیپاٹ اٹھا کر اُسے دیکھتی ہوئی بولیں۔

”میں یہ اندر دے آؤں۔ تم اب اپنے اور میرے لیے ناشتا بنا لو؟“

”اماں جی اور آبا جی؟“

”وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ کر رہے ہیں؟“

میمونہ بھابی کہتے ہوئے چلی گئیں۔ تو اس نے جلدی سے دو اونٹے فراں کیے پھر کتلی میں مزید پا کر چوبلیا تیز کر دیا۔ اور جب تک میمونہ بھابی خلیل بھابی کو کسی آف کر کے آئیں تو وہ دُشے میں ناشتا رکھتی۔ انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کہاں بھینک گئی؟“

”اپنے کمرے میں چلو، کیونکہ میرا کمرہ اس وقت بھینکے کے قابل نہیں ہے۔

میمونہ بھابی نے بولی ہوئی ہی تھیں اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ان کے پیچھے اپنے کمرے میں داخلہ ناشتے کی طرف سے میل پر رکھ کر ٹیپاٹ کے قریب کھینچی۔ پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔ ایک کتب خانے بنیل بھابی کو دے آؤں ہو سکتا ہے انہیں کچھ احسا۔

”اس کے لیے پہلے کہیں چلے کاٹنا پڑے گا تاکہ تیار کی جانے کی بیانی میں کچھ اثر ہو۔

میمونہ بھابی نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا پھر بھی اُسے بے ساختہ ہنسی آئی۔

”اب بھی کس کمال میں؟“

”اچھا چلو ناشتا کرو، اس کے بعد جو دل چاہے کرنا۔“

میمونہ بھابی نے ٹوک کر خود کھا ناشتہ شروع کر دیا تو وہ کب سیدھے کر کے ان میں چائے ڈالنے

پھر ناشتے کے بعد وہ واقعی چائے کا کپ دے کر اوپر چلی آئی۔ بنیل بھابی بے خبر سو رہی تھیں

کی کھ میں نہیں آیا انہیں کیسے اٹھائے اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ بتا نہیں اٹھائے جانے پر ان کا دل

کیا ہو۔ گو کہ اس کے ساتھ ان کا رویہ شگ ہی تھا۔ لیکن جس طرح وہ بڑے بھینکا کے ساتھ تلخ کلاسی کو

اس سے وہ اپنے آپ ان سے خائف رہتی تھی۔ کچھ درخشش و بے چینی میں کھڑی رہی۔ پھر پکارا تو آواز

نکلے یا شاید بے خبر سوئی بنیل بھابی تک نہیں پہنچی۔ تب آہستہ سے ان کا کندھا ہلکا کر لوی۔

”بھابی جان! چائے لے بیٹھے؟“

”ہوں؟“ بنیل بھابی نے کسمپرسی سے اس کی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا پھر وال کلاک پر نظر ڈالی جس کا

نوجوا رہی تھیں۔ اور غائبانہ وہ ابھی پوری طرح۔ میدا نہیں ہوئی تھیں جب ہی اٹھی ہوئی بولیں۔

”بارہ بج رہے ہیں؟“

”نہیں، ابھی نو بجے ہیں۔“ وہ چائے کا کپ انہیں تھما کر دے ہوئے بولی۔

”تمہارا آج پیر نہیں ہے؟“ انہوں نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔

”نہیں کل آزی پیر تھا۔“

”اچھا، کیسے ہوئے پیر؟“

”بہت اچھے۔“
”اس کا مطلب ہے اس بار بھی ٹاپ کرو گی، دیری گڈ۔ اور یہ تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔ اب تو فارغ

ہی ہو۔ انہوں نے اُسے سر ہانے کے ساتھ بیٹھنے کو کہا تو وہ قدرے تکلف سے بیڈ کے کنارے بیٹھے ہوئے

بولی۔

”میں نے آپ کو جلد ہی اٹھا دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ویسے کوئی کام ہے بھیسے؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ جڑبڑ ہو کر بولی۔

”نہیں، ابھی سب ناشتے سے فارغ ہوئے ہیں، میں نے سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں۔“

”میں ناشتا نہیں کرتی۔“ خیر تم ساڈ آب کیا ارادے ہیں۔ بڑے آرام سے اسکا کرشپ پر باہر جاسکتی ہو۔

گوٹرن چائیں ہے بس نہیں کرو۔“ انہوں نے اس کا ارادہ پوچھنے کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا تو وہ قہقرا

سکا کر بولی۔

”یہیں پرکٹیں کروں، بڑی بات ہے۔“

”ہاں، بتا دے لیجئے یہی بڑی بات ہے۔“ بنیل بھابی قدرے استہزائیہ مہنیں تو وہ وہاں سے اٹھتے

کے بہانے ڈھونڈنے لگی، اور فوری طور پر یہی بہانا سوچا۔

”آپ کے لیے اور چائے لاؤں؟“

”نہیں بس۔“ اب شادروں کی بنیل بھابی کہتے ہوئے بیڈ سے اُتریں تو وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

چلنے کا خالی کپ اٹھا یا اور اسے لگی تو وہ نیکار کر بولیں۔

”سنو، نیل آئے تو ذرا اُسے جیک کر لیتا۔ مجھے اس کی آواز بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔“

”جی؟“ وہ اختصار سے کام لیتے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ پھر کتنے دن گزر گئے۔ بچوں کی چھٹیاں ہو

گئیں تو میمونہ بھابی سنجیدگی سے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنانے لگیں، جبکہ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ

کسی طرح اس کا جاننا نہ ہو سکے۔ لیکن اس روز جب خلیل بھابی نے میمونہ بھابی کے ساتھ اُسے بھی تیار

کرنے کو کہا تو وہ سچ بخ پریشان ہو گئی تھی۔

”میں آسیدہ کو چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ اس کے لیے تم یہاں سے سارے ناتے

توڑ کر چلے جاؤ۔“ لکھ کوئی اور راستہ سوچو، شاہ جانا میرے اس سے کہا تھا اور اس وقت سے وہ الجھ رہا۔

تھا۔ بہت سوچنے کے بعد بھی اُسے کوئی تیسرا راستہ کچھ میں نہیں آیا۔ وہی دور راستے تھے کہ تھرا بالوں کی خاطر اپنی

جست و خیران کر دے یا سب چھوڑ کر چلا جائے۔ کیونکہ بابا جان اور چھری بی جان بھی اس کی مزید کوئی بات

سننے پر تیار نہیں ہوتی تھیں، جس سے ظاہر تھا کہ وہ ہر قیمت پر ہمہ السادہ کو ہونا کر لائیں گی۔ اس لیے تین دنوں

ل مسلسل ذہنی کش مکش کے بعد بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بڑی کی خاطر سب چھوڑ دے گا۔ جس نے

اُسے خوبصورت اور پر کیف لمحات بخشنے تھے گو کہ وہ ساتھ ہی نہ کوئی تیسرا پھر بھی اس میں کوئی ایسی بات

نہیں تھی کہ پہلی نظر میں ہی شاہ سکندر حیات اپنی ہستی کاغذ و رنگ بھلا بیٹھا تھا۔ اور اب یہ کسی طرح ممکن

نہیں تھا کہ وہ اُسے اپنی زندگی سے ہی نکال دے۔ جیسا اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کیونکہ

شاہ جانا نے اُس روز سہولت سے اس کی بات سنی تھی اس لیے اس نے سوچا وہ انہیں اپنے ارادوں سے

گاہ کر دے۔ اسی خیال سے وہ ان کے کمرے میں آیا تو بھابی جان کو ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تیار کرتے دیکھ

کر بولیں پوچھ لیا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“

”تمہارے بھائی جاسے ہیں مری، بچوں کو لینے۔“ بھابی جان بتاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

”وہ سوٹ کیس پر نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔“

”صرف بچوں کو لانا ہے یا کوئی اور کام بھی ہے؟“
 ”نہیں۔ لو وہ آگئے ان ہی سے پوچھ لو۔“ جہاں جان الماری بند کر کے بلیٹس تو اندر آتے شاہ جہاں کو دیکھ کر بولتے۔
 ”کیا پوچھنا ہے؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ آپ کی والدین کب ہوئی، میرا مطلب ہے مری سے؟“
 ”پرسوں یا اُس کے لنگے دن کیوں؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے پوچھا۔
 ”نک کر بولا۔“
 ”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ خیر آپ مری سے ہو آئیں۔ تب تک میں بھی کراچی کا چکر لگاؤں گا۔“
 شاہ جہاں گہرے آواز سے کہا بات کرنی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے۔ کچھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔
 ”کراچی جانے کے بجائے میرے ساتھ چلو، اُس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ”میں اہل سے بات کر رہی ہوں۔“

”میاں اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی کیا؟“ وہ بھی مسکرایا تو وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے۔
 ”جادو، اپنے ایک دوسوٹ لاکر اس سوٹ کیس میں رکھ دو پھر نکلتے ہیں۔“

”لیکن؟“
 ”لیکن فٹن جھڑو، جلدی کرو، پھنکے کی فلائیٹ ہے۔ ابھی نکلیں گے تو پانچ ساڑھے پانچ تک پہنچیں گے۔ وہ اُسے ٹوک کر بہت غصت میں بولے، تو وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اپنے کمرے پر دو سوٹ نکالے اور جیراں کو پکا کر اُس کے ساتھ جہاں جان کو بھجوا دیے۔ پھر فوراً واپس روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔
 ”کہہ دو بعد نیچے آنا تو شاہ جہاں گہری آواز سے کہا اُس کے پاس کھڑے غالباً نہیں رہی تارے تھے کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جا رہا ہے۔ قریب آکر اُس نے سلام کیا تو بی بی جان نے صرف جواب دینے پر اکتفا کیا؟ شاہ جہاں گہری طرف متوجہ ہو گئیں، تو وہ باہر نکل آیا۔ جہاں ڈرائیور گاڑی لیے منتظر کھڑا تھا۔“

شاہ پور سے کراچی اور وہاں سے باقی اسلام آباد تک کے سفر میں اُس نے آسیہ سے متعلق کوئی بات نہیں کی، کیونکہ پہلے ہی اُسے بے مری اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بعد خجالت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
 لیے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ پھر رات میں شاہ جہاں گہرے آواز سے خود ہی بات چیت کرتے۔
 ”ہاں، اب تادو کیا سوچا ہے تم نے؟“ اور وہ مایوسی سے سر ہلا کر کہنے لگا۔
 ”مجھے ایسا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایک وقت دونوں مقام پر پروردگار کے۔ بابا جان کہہ رہے ہیں مایں گے اور میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بے شک بابا جان مجھ پر اپنے گھر کے دروازے دینے میں۔“

”ایک منٹ۔“ شاہ جہاں گہرے آواز سے بولے۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے پیش نظر صرف ذات نہیں ہونی چاہیے۔ کیا نہیں سہرا بانو سے ذرا محبت نہیں یا اپنی محبت میں اتنے خود غرض ہو کر سہرا بانو کے لیے کئی نہیں ہے۔ جہاں جان؟“ وہ چڑچڑا کر آہیں نکھینچ کر لیا جاتا ہے کہ اُسے شہر محبت نہیں یا اُس کا خیال نہیں اور اُس کے برعکس شاہ جہاں گہرے آواز سے بھڑکا ہوا تھا۔
 ”میں تو تمہارا والد کو بھی نہیں ہے سکندر۔“

”بھڑ؟“
 ”بھڑ تمہارے کیوں بھول رہے ہو کہ شاہ (سید) ہیں۔ اور شاہوں کی بیٹیاں غیر خاندان میں نہیں بیا اپنے خاندان میں اور کون ہے جس کے ساتھ ہم سہرا بانو کا رشتہ جوڑیں۔ اُس کے جوڑ کا نہیں تو کوئی ہے؟“
 ”بتاؤ جیسے نور بانو کے ساتھ ہوا۔ کیا کئی بھی اُس میں، لولی ٹنڈی بھی جو جہاں بچوں کے باپ سے بیاہی تھی۔“

نئے بہت طریقے سے اُس کے احساسات کو مضبوط کیا۔
 ”نہیں۔ لو وہ آگئے ان ہی سے پوچھ لو۔“ جہاں جان الماری بند کر کے بلیٹس تو اندر آتے شاہ جہاں کو دیکھ کر بولتے۔
 ”کیا پوچھنا ہے؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”وہ آپ کی والدین کب ہوئی، میرا مطلب ہے مری سے؟“
 ”پرسوں یا اُس کے لنگے دن کیوں؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے پوچھا۔
 ”نک کر بولا۔“
 ”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ خیر آپ مری سے ہو آئیں۔ تب تک میں بھی کراچی کا چکر لگاؤں گا۔“
 شاہ جہاں گہرے آواز سے کہا بات کرنی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے۔ کچھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔
 ”کراچی جانے کے بجائے میرے ساتھ چلو، اُس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ”میں اہل سے بات کر رہی ہوں۔“

”میاں اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی کیا؟“ وہ بھی مسکرایا تو وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے۔
 ”جادو، اپنے ایک دوسوٹ لاکر اس سوٹ کیس میں رکھ دو پھر نکلتے ہیں۔“

”لیکن؟“
 ”لیکن فٹن جھڑو، جلدی کرو، پھنکے کی فلائیٹ ہے۔ ابھی نکلیں گے تو پانچ ساڑھے پانچ تک پہنچیں گے۔ وہ اُسے ٹوک کر بہت غصت میں بولے، تو وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اپنے کمرے پر دو سوٹ نکالے اور جیراں کو پکا کر اُس کے ساتھ جہاں جان کو بھجوا دیے۔ پھر فوراً واپس روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔
 ”کہہ دو بعد نیچے آنا تو شاہ جہاں گہری آواز سے کہا اُس کے پاس کھڑے غالباً نہیں رہی تارے تھے کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جا رہا ہے۔ قریب آکر اُس نے سلام کیا تو بی بی جان نے صرف جواب دینے پر اکتفا کیا؟ شاہ جہاں گہری طرف متوجہ ہو گئیں، تو وہ باہر نکل آیا۔ جہاں ڈرائیور گاڑی لیے منتظر کھڑا تھا۔“

شاہ پور سے کراچی اور وہاں سے باقی اسلام آباد تک کے سفر میں اُس نے آسیہ سے متعلق کوئی بات نہیں کی، کیونکہ پہلے ہی اُسے بے مری اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بعد خجالت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
 لیے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ پھر رات میں شاہ جہاں گہرے آواز سے خود ہی بات چیت کرتے۔
 ”ہاں، اب تادو کیا سوچا ہے تم نے؟“ اور وہ مایوسی سے سر ہلا کر کہنے لگا۔
 ”مجھے ایسا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایک وقت دونوں مقام پر پروردگار کے۔ بابا جان کہہ رہے ہیں مایں گے اور میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بے شک بابا جان مجھ پر اپنے گھر کے دروازے دینے میں۔“

”ایک منٹ۔“ شاہ جہاں گہرے آواز سے بولے۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے پیش نظر صرف ذات نہیں ہونی چاہیے۔ کیا نہیں سہرا بانو سے ذرا محبت نہیں یا اپنی محبت میں اتنے خود غرض ہو کر سہرا بانو کے لیے کئی نہیں ہے۔ جہاں جان؟“ وہ چڑچڑا کر آہیں نکھینچ کر لیا جاتا ہے کہ اُسے شہر محبت نہیں یا اُس کا خیال نہیں اور اُس کے برعکس شاہ جہاں گہرے آواز سے بھڑکا ہوا تھا۔
 ”میں تو تمہارا والد کو بھی نہیں ہے سکندر۔“

”بھڑ؟“
 ”بھڑ تمہارے کیوں بھول رہے ہو کہ شاہ (سید) ہیں۔ اور شاہوں کی بیٹیاں غیر خاندان میں نہیں بیا اپنے خاندان میں اور کون ہے جس کے ساتھ ہم سہرا بانو کا رشتہ جوڑیں۔ اُس کے جوڑ کا نہیں تو کوئی ہے؟“
 ”بتاؤ جیسے نور بانو کے ساتھ ہوا۔ کیا کئی بھی اُس میں، لولی ٹنڈی بھی جو جہاں بچوں کے باپ سے بیاہی تھی۔“

نئے بہت طریقے سے اُس کے احساسات کو مضبوط کیا۔
 ”نہیں۔ لو وہ آگئے ان ہی سے پوچھ لو۔“ جہاں جان الماری بند کر کے بلیٹس تو اندر آتے شاہ جہاں کو دیکھ کر بولتے۔
 ”کیا پوچھنا ہے؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”وہ آپ کی والدین کب ہوئی، میرا مطلب ہے مری سے؟“
 ”پرسوں یا اُس کے لنگے دن کیوں؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے پوچھا۔
 ”نک کر بولا۔“
 ”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ خیر آپ مری سے ہو آئیں۔ تب تک میں بھی کراچی کا چکر لگاؤں گا۔“
 شاہ جہاں گہرے آواز سے کہا بات کرنی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے۔ کچھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔
 ”کراچی جانے کے بجائے میرے ساتھ چلو، اُس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ”میں اہل سے بات کر رہی ہوں۔“

ہی مناسب سمجھا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بول: "بچوں کی آواز نہیں آرہی لگتا ہے سو گئے۔" ہاں اور اب میں بھی سونا چاہیے، ورنہ صبح اٹھ نہیں سکتی، یہاں والی لڑک پر نظر ڈالتے ہوئے ہوں تو اس نے ان کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہاں سوئی گئی؟"

"ادھر تھیمہ اور اشعر کے کمرے میں چلی جاؤ ان دونوں کو ایک میڈ برکرو اور نیل تھامے ساتھ ہاں، وہ اکثر میرے پاس سوتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے تھیمہ کے کمرے میں آئی تو ایک میڈ برنڈ اشعر سو رہے تھے، دوسرے پریمیر اکیل تھی وہ اسی کے پاس لیٹ گئی۔ اس وقت سے باتوں میں چلا تھا۔ اب لیٹتے ہی لمبے سفر کی تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ بدن میں ہلکے ہلکے درد کے باعث نیند بھی نہ تھی۔ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتے کے بعد اس نے خود کو دھلا چھڑو کر لیکس موندیں۔ تو دھار کی طرف منتقلی ہو گیا جہاں ان کے چلے آنے کے بعد خاموشی چھا گئی ہوئی۔ اور کپڑا اس خاموشی میں نہ سنا دینے لگیں، جن کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ جیسا کہ آخری ملاقات میں شاہ سکندر نے کہا، سکتا ہے اس بار میں آؤں تو میرے ساتھ بی بی جان اور بابا جان بھی ہوں۔ اور اس کی بات یاد آنے نیند پر سوچنے لگی، کہ شاید وہ اپنے گھر والوں کو ہمارا کرنے میں لگا ہوگا۔ جیسی نہیں آیا۔ ادا تانہ گھر والے مانتے گئے بھی یا نہیں۔ پھر ہر دو صورتوں میں وہ اماں بی اور آبا جی کا رد عمل سوچنے لگی، گو اور عدیل بھائی اس کی بہت تعریف کرتے تھے، وہ آتا تو اس کی بہت عزت کرتے اور اس کے بعد کتنی دیر تک اس کی باتیں کرتے تھے، پھر بھی اسے خدشہ ہوا کہ اگر شاہ سکندر اپنے گھر والا میں ناکام رہا تو شاید آبا جی کبھی تن مانتے گئے۔ لیکن اگر آبا جی اور عدیل بھائی کو کبھی یہ معلوم ہو جائے پسند کرتی ہوں تو؟ اس مقام سے آگے نیند نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ صبح وہ بہت دیر سے اٹھی۔ اس وقت تک سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے سیما بھائی کے سوا باوجود اس نے اپنے لیے خود ہی ناشتا بنایا۔ دوسلاٹس گرم کیے، ایک انڈا اڑا لے اور چائے لے بھاؤں کے پاس لاؤنج میں آ بیٹھی۔ وہ دونوں جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ اس نے ناؤں تک ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ نہ ہی ان دونوں نے اسے مخاطب کیا۔ جب وہ خالی برتن پین آئی تب سیما بھائی اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"گو کہ تم یہاں نہ مانیں ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آتے ہی کام میں لگ جاؤ۔"

"اور میں یہاں پلنگ توڑنے بھی نہیں آئی۔ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں پیچھے کہاں ہیں؟"

"ادھر براآمدے میں کھیل رہے ہیں!"

"اسی خاموشی سے کیسے کھیل رہے ہیں؟" وہ تعجب سے کہتی وہیں سے پلٹ کر براآمدے میں آئی بچے دارٹرے کی شکل میں بیٹھے بڑے انہماک سے سیدھی سہرے بالوں والی گڑیا کو دیکھ رہے تھے اور بارے میں بتا کر اپنے طور پر انہیں حیران کر رہی تھی۔

"دیکھو، یہ روٹی بھی ہے یا سیمتہ نے گڑیا کے منہ سے چوٹی نکالی تو گڑیا روٹے لگی جس پر بڑبڑا چہرے حیرت و خوشی سے چلنے لگے۔"

"اب اسے چپ کرلو، سو نیالے کہا تو سیمہ نے گڑیا کے منہ میں دوبارہ چوٹی لگا دی۔ گڑیا گئی تو نیل پوچھنے لگا۔"

"یہ ہنستی بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ بس روتی ہے۔" سیمہ نے لاعلمی کا اظہار انہوں کے ساتھ کیا۔

"متہاری طرح اور سونیا کی طرح؟" نیل نے کہا تو سونیا تڑخ کر بولی۔

"میں کب روتی ہوں؟"

"جب میں تمہارے بال نوچتا ہوں؟" امر نے کہتے ہوئے سونیا کے بال پکڑ کر کھینچ لیے جس سے وہ دائی نے غمی تو وہ جو خاموشی سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے بغیر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ فوراً آگے بڑھ آئی سونیا کو گود میں اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے امر کو ڈانٹنے لگی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، تم نے اس کے بال کیوں نوچے؟"

"ذوڑ سے تھوڑی توچے ہیں، پوچھ لیں اس سے!"

"اس سے کیا پوچھوں، میں خود دیکھ رہی تھی۔ بہت بڑی بات ہے۔ آئندہ خبردار اسے ہاتھ نہیں لگنا۔"

نہ سونیا کو چپ کرانے کے ساتھ امر کو تیبہ کی، تو وہ تیسر ہو کر بولا۔

"یہ جھوٹ کینوں بولتی ہے؟"

"کیا جھوٹ بولا ہے اس نے؟" امر کے تیز بولنے پر اس کی پیشانی پر پرل پڑ گئے۔

"کتنی ہے میں کب روتی ہوں اور اب رو رہی ہے؟" امر نے سونیا کا جھوٹ بتایا تو وہ سر دھک کر بولی۔

"ہو تو ف ہو تم۔" پھر سب کو اٹھا کر اندر لے آئی۔ دونوں بھابیوں بڑی، گشت پر رات کر رہی تھیں۔ فی کھانے میں کیا پکنا چاہیے اور یہ بڑا میٹر حائل تھا۔ جیسی وہ ان سے کترا کر ادھر ادھر سے اخبار اکٹھا کرنے میں لگ گئی۔

دوہر میں کھانے کے بعد سیما بھائی نے سب بچوں کو سلاوا۔ میونہ بھائی بھی عمر کو بغل میں دبائے آرام سے لیٹیں۔ اندر اس نے پورا گھر چھان مارا، کوئی ایک کتاب نہیں ملی، جسے پڑھنے میں وہ وقت گزارتی، محنت بھر رہی تھی۔ اس وقت تو وہی بھی بس شام میں چلتا تھا۔ یعنی صبح کی نشریات کا آغاز نہیں ہوا تھا نہ ہی دی سی آر ام تھا۔ بلکہ محنت پابندی تھی۔ اس لیے مطالعے کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ متوسط گھرانوں کی لڑکیاں ایسے نزاعت لے دون میں ناولز پڑھتیں۔ ان دنوں رضیہ بٹ اور ملکی کنول کے ناولوں کا بڑا چرچا تھا۔ اس نے سیما بھائی سے پچھا تو وہ مسکین سی شکل بنا کر بولیں۔

"کہاں اب بچوں میں کہاں فرصت ملتی ہے پڑھنے کی؟"

"مجھے نہیں پتا، آپ اس وقت مجھے کہیں سے منگو کر دیں؟" وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی۔

"بہت بڑ ہو رہی ہوں اور اگر یہی عالم رہا تو دونوں میں واپس چلی جاؤں گی۔"

"ارے رے۔ یعنی بلیک میلنگ؟" سیما بھائی ہنس پھر معاذیہ یاد آنے پر کہنے لگیں۔ "اچھا ٹھہرا بھی پلے ہیں مجھے درزی سے اپنے کپڑے لینے میں تم کو کیسے مگھڑین وغیرہ لے لینا۔"

"چلیں۔" وہ فوراً تیار ہو گئی پھر اپنے حلیے پر نظر ڈال کر پوچھا۔ "دور تو نہیں جانا؟"

"نہیں بیدل کا راستہ ہے۔ جاؤ میونہ سے کہو سوئے نہیں ہم ابھی آتے ہیں؟" سیما بھائی کہتی ہوئی اپنے لڑے میں چلی گئیں تو اس نے میونہ بھائی کے پاس جا کر بس کھڑے کھڑے انہیں بتایا پھر اپنا پرس اٹھا کر واپس آئی تو سیما بھائی اپنے پرس میں جانے کی تلاش کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کچھ بول رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" ان کے قریب آنے پر اس نے پوچھ لیا۔

"میرے کپڑوں کی رسید اسی میں کبھی تھی، مل گئی؟" انہوں نے رسید ہاتھ میں لے کر ہنس بند کیا پھر اسے بھڑکھڑا لیں۔ "جکو۔"

"گھر کے قریب ہی ماکٹ تھی۔ گو کہ زیادہ بڑی نہیں تھی پھر بھی ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ اور کونو کم قاعدہ شاپنگ کا پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے جو پہلی کتابوں کی دکان نظر آئی وہ اسی میں داخل ہوئے لگی کہ بھائی روک کر بولیں۔"

"سو، وہ اس رو میں جو بھتی دکان ہے۔ میں دہان ہوں۔ تم اطمینان سے رسالے و سلاے دیکھ کر وہاں جیسے چاہیں!"

”اچھا، یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ سیما بھائی نے براہ راست شاہ سکندر سے پوچھا۔
 ”یہاں میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میرا قیام ہوٹل میں ہے اگر آپ آنا چاہیں تو۔۔۔“
 ”خیر، اتنا سیما بھائی درمیان میں لوگ کر پھراس سے بولیں۔“

جلد آئیں، یا ابھی کیہ اور لینا ہے؟
 ”نہیں، اور تو کیہ نہیں لیتا؟“ اُس نے یوں کہا جیسے اُسے کچھ نہ لینے کا انوس ہو رہا ہو۔
 ”جلد پھر اوسے سکندر صاحب!“ سیما بھائی نے ایک طرح سے اُسے خدا حافظ کہہ دیا۔ جبکہ وہ اندر ہی
 اندر خاصی جزبہ ہو رہی تھی۔ بسست روی سے اُس کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ دھیرے سے بولا۔

”سہی اسی جگہ!“ وہ اُس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔ لیکن نفی میں سر ہلکا کر معذوری کا اظہار کرتے ہوئے قدموں
 کی رفتار تیز کر دی۔ اور جب تک سوڈ نہیں آیا تو وہ اُس کی نظروں کی گرفت سے نکل نہیں سکی۔ اس دوران
 سیما بھائی جانے لگا یوں کہ وہ ابھی اُس نے سنا ہی نہیں۔
 ”کہاں کھوئی ہو؟ میری بات کا جواب تو دو۔“ سیما بھائی نے اُس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا تب وہ
 اپنے دھیان سے نکل کر شیطانی لگئی۔

”کیا۔ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟“
 ”میں ان صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ میں توجہ کراچی میں تھی۔ اسے کبھی گھر آتے جاتے نہیں
 دیکھا۔“
 ”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ اپنا بازو سہلائی ہوئی بولی۔

”اچھا غلط بیانی کر کے کہتی ہو میرا کیا مقصود ہے؟“
 ”میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ بیوی نہ بھائی سے پوچھ لیجئے گا۔“ وہ اُن کی گھورتی نظروں کے جواب میں
 ہنسی ہوئی بولی اور سامنے ٹھہر کر بھاک کر گھٹ سے اندر داخل ہو گئی۔
 اچانک پہلی محبت کا نشہ سارے احساسات پر چھا گیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہتی تب بھی اُس کا انگ انگ
 بول رہا تھا۔ اور اس مقام پر اس کا دل چاہا کوئی ہو جسے وہ اپنی زندگی کے اس خوبصورت راز میں شریک
 کر سکے۔ اور یہ دونوں بھادیں ہی اُس سے بہت محبت کرنے والی اُس کی بہترین دوست تھیں۔

شاہ جہانگیر بچوں کو مری سے لے کر آئے تو جیسا کہ اُس کے ساتھ ملے کر کے گئے تھے، سیدھا ایر ہوٹل
 پہنچ گئے۔ جہاں وہ لکٹیں لیے اُن کا منتظر تھا۔ سب بچوں کو باری باری پیار کرنے کے بعد وہ لکٹیں شاہ جہانگیر
 کو تھماتا ہوا بولا۔

”ملائیٹ جانے میں بس ادھا گھنٹہ ہے۔ آپ لاؤنج میں چلے جائیں۔“
 ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے اُس کے ہاتھ سے ٹپٹ لیتے ہوئے سر مری انداز میں پوچھا۔
 ”کبیں نہیں، میرا مطلب ہے میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں جا رہا۔“ اُس نے کہا تو شاہ جہانگیر ٹھٹھک کر بولے۔
 ”کیوں؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی، بس میں کچھ دن تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے بغور اُسے
 دیکھا پھر کہنے لگے۔

”دوچیز جتنا سوچو گے، اُٹھتے جاؤ گے؟“
 ”سے نکر رہیں۔ میں خواہ کتنا سوچوں، کتنا الجھوں، آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ بلکہ آپ پر بھروسہ کر کے میں
 ایک طرح سے آپ کی بات مان چکا ہوں۔ اب آپ پھر بھروسہ کریں۔“

”اچھی بات ہے۔“ شاہ جہانگیر نے اُس کا کندھا تھپکا پھر پوچھنے لگے۔ ”کتنے دن رہو گے یہاں؟“
 ”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دو دن، چار دن یا۔۔۔“
 ”بس چار دن سے زیادہ نہیں۔“ ٹھیک یا بچوں دن میں اپنے گھر پہنچا جائیے۔ شاہ جہانگیر نے ٹوک

”نہیں، میں میرے پاس۔“
 ”اچھا، میں اپنے ٹیڑھے سے کراچی ہوں۔“ سیما بھائی آگے بڑھ گئیں تو اُس نے رک کر انہیں مار ڈال
 دکان میں داخل ہوتے دیکھا پھر قدم آگے بڑھنے، اور شیشے کے رک کے پاس رک کر اُس میں ترتیب
 رکھی کتا ہیں دیکھنے لگی۔ حالانکہ چند نام سوچ کر آئی تھی۔ لیکن اب انتخاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر جب
 نے دیکھا سلیزین کی نظر میں اُسی پر مبنی تھیں تب جلدی سے ایک دو کتا بوں کے نام بتا کر دوسری طرف
 گئی۔ اور ابھی نیچے کا مجموعہ تلاش کر رہی تھی کہ اُس آواز سماعتوں سے یوں ٹکرائی کہ وہ بے اختیار پلٹ کر
 لگی، شاہ سکندر کا کوئی پرکھٹے شخص سے مخاطب تھا۔
 ”ایکسکوز می، فون کر سکتا ہوں؟“ اور وہ جس طرح بے اختیار پلٹی تھی اُسی بے اختیاری سے اُس
 قریب آکر بولی۔

”ہیلو۔“ شاہ سکندر نے چونک کر دیکھا پھر خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔
 ”ا۔ س۔ م۔ تم یہاں کیسے؟“
 ”کچھ کتا ہیں لیں تھیں، اُس نے قصداً اُس کے سوال کو دوسرے معنی میں کر جواب دیا۔
 ”نہیں میرا مطلب ہے یہاں اسلام آباد میں۔“ اُس نے وضاحت کی تو ایک نظر گلاس ڈور سے باہر ڈ
 بولی۔

”بھائی کے پاس آئی ہوں؟“
 ”کون عدیل صاحب؟“
 ”نہیں، وہ تو وہیں کراچی میں ہوتے ہیں۔ اُن سے بڑے شکیل بھائی، ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں سیٹل
 ہیں۔ اور آپ؟“ آخر میں اس نے اُس کی یہاں موجودگی کا سبب پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔
 ”میں اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہوں۔ شاید میں نے نہیں بتایا تھا کہ میرے بھتیجے جیتجیاں مری کا لوہا
 پڑھتے ہیں۔ اب چٹیاں ہوئی ہیں تو ہم انہیں لینے آئے ہیں۔“
 ”لیکن آپ تو یہاں موجود ہیں۔“ اُس نے کہا تو وہ اُسے نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔
 ”تیار دے لینے۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سانسہ ہی آپ کو کیسے معلوم کر میں یہاں ہوں۔“
 ”معلوم تو نہیں تھا لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ تم ہمیں پاس کہیں موجود ہو؟“ وہ اطراف سے بیگانہ
 تھا تب اُس نے ذرا سا کھانسن کر احساس دلایا پھر کہنے لگی۔
 ”آپ شاید فون کرنا چاہتے تھے؟“

”اب نہیں کرنا، اللہ تم اپنی کتابیں لے لو، اُس نے کہا تو وہ پلٹ کر سلیزین کو دیکھنے لگی۔ وہ نہ
 تھا۔ فوراً کتا بوں کا بیڈکٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر وہ پرس میں سے پیسے نکالنے لگی۔ لیکن اُس
 پہلے ہی شاہ سکندر نے بے منت کر دی۔ وہ اس دیکھتی رہ گئی۔ پھر اُس کے ساتھ دکان سے نکلتے ہوئے
 اُسے یاد نہیں رہا کہ اُس کے ساتھ سیما بھائی بھی ہیں اور اُسے ایک اجنبی کے ساتھ دیکھ کر جانے دو
 ”چلو کسی اچھی پریکٹون جگہ بیٹھتے ہیں۔“ شاہ سکندر نے کہا تب اچانک اُسے سیما بھائی کا خیال آیا اور
 وقت وہ آگئیں۔ اپنی دھن میں تھیں۔ شاہ سکندر کو اگر دیکھا بھی تو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اُس کے سا
 ہے۔ اپنے انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔

”مل گئے تھیں نا دلرز؟“ اور وہ سیما بھائی کو دیکھتے ہی شش و پنج میں گرفتار ہو گئی تھی کہ اُن کا لہ
 کر اُسے باخا موٹی سے چل پڑے۔ جہی اُن کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹی
 نے اُن کی توجہ کھینچی۔

”آداب۔“ سیما بھائی نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا پھر کپکپ سے اُس کا کندھا دبا یا تو وہ سنبھل
 ”بھائی! یہ شاہ سکندر حیات ہیں۔ عدیل بھائی کے درست، وہاں گھر میں ان کا آنا جانا رہتا۔“

کر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر جب شاہ جہانگیر نے ان کو ملے کر لاؤنج میں چلے گئے تب خاصاً ملاحظہ کیا سوچا کہ وہ بول چلا آیا۔

اُس کا خیال تھا ان چار دنوں میں وہ آسمیہ سے مل کر اُس کے جہانگیر کی رمان حاصل کرے گا۔ اس کا مقصد سب پر چھا جاتا تھا۔ گو کہ اُس کے لیے اُسے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی شخصیت بھی ہی اتنی متاثر کن تھا ملاقات میں ہی مقابل پر گرا اور اندازاً ہی جیسے آجانی اور عدل جانی اُس کے گرد و بد تھے۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا یہاں جو آسمیہ کے جہانگیر، بھالو جہانگیر ہی اُن پر بھی وہ اپنا اثر چھوڑ جائے تاکہ بعد میں جب وہ آسمیہ سے شاہ کی بات کرے تو اس طرف سے سب اُس پر اعتماد کریں۔ ورنہ اگر کسی ایک نے بھی بی بی جان اور بابا جان کے شرکت نہ کرنے پر اعتراض کیا یا یہ شرط رکھ دی کہ اُس کے والدین ہی اگر بات کریں تو اس کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔

اور وہ اپنے گھر میں تو مشکل میں اور پریشان تھا ہی اس طرف سے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور آسمیہ سے یہاں ملاقات کو وہ جو ایک خوبصورت اتفاق سمجھ رہا تھا تو اب اس اتفاق کو بھی اپنے منہ میں سوچنے لگا تھا۔ لیکن اپنی سوچوں کے برعکس اُسے شدید کوفت اور پریشان کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی اگلے تین دن وہ گھنٹوں کے حساب سے اسی بک شاپ کے آس پاس موجود رہا اور وہ نہیں آئی۔ گو کہ اُس آنے کا وعدہ تو کیا ہاں بھی نہیں جھڑپ تھی پھر بھی اُسے یقین تھا اور اُس کا یقین ابھی ٹوٹا نہیں تھا نہ ہی وہ مایوس ہوا۔ اور اس آخری دن پھر اسی جگہ جا بیٹھا۔

جب سی بے قرار رہی تھی۔ اور اسی لیے قہری میں وہ دروازہ کھٹک رہا تھا تب اُس پر نظر پڑی۔ نسیل کہا تھا اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ مزید صبر نہیں کر سکا۔ تین قدموں سے لمحوں میں درمیان کا فاصلہ میٹ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوا تو گزشتہ تین دنوں کی ساری کوفت بھٹکا کر بولا۔

”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔ اور وہ جو اُس کے اچانک سامنے آنے پر حیران تھی۔ نسیل کی موجودگی میرے دل کے دہانے انداز پر پریشان ہوئی۔ اور کچھ گھبرا کر نسیل کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”پھر پھر یہ وہ واٹے انکل ہیں ناں جو ابائی کے پاس آتے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! آپ نے انہیں سلام نہیں کیا؟ آسمیہ نے اُسے محتاط رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہیں سے کہا۔

”السلام علیکم! نسیل نے فوراً سلام کیا۔

”وسلام! کیسے ہو بیٹا! سراسر رسمی انداز تھا۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا۔ ”چلو کہیں بیٹھ کر بات کریں گے! نہیں سکندر۔ میں۔“

”پلیز!۔“ وہ فوراً ٹوک کر کہنے لگا۔ ”میں بس آج کا دن یہاں ہوں کل صبح کی فلائیٹ سے واپس جا رہا۔ اور یہ اتنے دن میں صرف تمہارے لیے یہاں رہا۔ روزانہ یہاں آکر تمہاری راہ دیکھتا رہا ہوں اور تمہیں

”میں کیا کروں؟“ وہ اُس کے خفا ہوئے پر بے بسی سے بولی۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں شاہ سکندر! میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں، میرا بیچاریا بیچوں سے گر گیا ہے۔ اُس لیے بیٹریج اور میڈیسن لینی ہے۔ اُس کی مجبوری سن کر وہ کبھی سانس کھینچتا ہوا بولا۔

”اُس کا مطلب ہے اب تم سے کراچی میں ملاقات ہوگی؟ اُس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر بولے۔

”آپ خفا تو نہیں ہیں؟ وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اُس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر

”تب اُس کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ سکاٹھ پھیل گئی۔

”شکریہ!۔“ وہ منونیت سے کہیں آگے بڑھنے لگی۔ کہ وہ راستہ روک کر پھر چھٹے لگا۔

”یہاں کہتے دن ہو؟“

زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ اگر اس سے پہلے کراچی سے بلاوا آگیا تو پھر ظاہر ہے پہلے حل جاون گی؟

”ٹھیک ہے پھر میں اسی حساب سے آؤں گا۔“ اُس نے کہا تو وہ بے اختیار پوچھ گئی۔

”کیسے؟“

”نہیں بارات کے ساتھ؟“ وہ قدرے شوخ ہو کر بولا تو وہ جھینپ کر آگے بڑھ گئی۔ شاہ سکندر نے

اُسے ایک فزیکل اسٹوریس داخل ہوتے دیکھا پھر اُس کی واپس کا انتظار کرنے کے بجائے قریب سے

نزدق تکی روک کر اُس میں بیٹھ گیا۔

اگلے روز جب وہ پہلی فلائیٹ سے کراچی پہنچا تو ڈراپور گاڑی لیے موجود تھا۔ وہ سمجھ گیا اُسے۔

شاہ جہانگیر نے پہنچا ہوگا۔ اور اُن کا خدشہ سوچ کر وہ اپنے آپ مسکرایا تھا۔ پھر ڈرائیور نے اُس سے پوچھ

کر گاڑی شاہ پور کے راستے پر پوری اسپیدی سے دوڑانی شروع کر دی۔

اور تین گھنٹوں کے اس سفر میں وہ پوری یکسوئی سے شاہ جہانگیر کی ایک ایک بات کو سوچتا رہا۔

دران کے سامنے تو وہ اُن کی کسی ایک بات سے بھی اختلاف نہیں کر سکا تھا اور اب ہر بات عجیب

ی لگ رہی تھی۔ آخر میں اُس نے سوچا وہ سب سے پہلے شاہ جہانگیر سے بات کرے گا۔ اُن سے

جے گا کہ وہ کب بھی کٹھ پتلی نہیں بن سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اُس کے حال پر پھر پورا جائے۔ اُس کے

بعد ایک آخری کوشش کے طور پر وہ خود بابا جان سے بات کرے گا۔ اگر وہ آسمیہ کے ساتھ اُس کی شادی

رہنے پر رضامند ہو گئے تو ٹھیک ورنہ!

گاڑی رکنے سے اُس کی سوچیں بھی اسی مقام پر پھر گئیں۔ ڈرائیور نے فوراً اُس کی طرف کا

دروازہ کھولا تو گاڑی سے اترتے ہی اُسے غیر معمولی جیل پیل کا احساس ہوا۔ اپنے طور پر قیاس کرتا ہوا

وہ اندر آیا تو اُسے دیکھتے ہی بی بی جان کے پاس بیٹھی دو ٹیوں میں جیل بیچ گئی۔ وہ قصداً نظر انداز کرتا ہوا

بی بی جان کی طرف بڑھا۔ اور ابھی سلام اُس کے ہونٹوں میں تھا کہ بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔

”ماشا اللہ بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی سب تیار ہو پھر رہی تھیں۔ تھکے ہوئے لگتے رہے ہو جادو

جلدی سے غسل لے لو پھر میں کھانا تمہارے کمرے میں بھجواتی ہوں۔“ وہ اس پر حیران ہوتا اپنے کمرے

میں جانے لگا کہ بی بی جان کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے۔ وہ دو ٹیوں سے گھر رہی تھیں۔

”اب تو کچھ لیا دو لہا کو جادو اب ڈھونگ بنھا لو، اور کوئی جیراں سے کھو بڑے شاہ بی کو خبر کرے

ناہ سکندر۔ کیا ہے؟“

خوشی سے جہر پور بی بی جان کی کھٹکتی ہوئی آواز نے اُسے چکرا دیا تھا۔



فوری طور پر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بی بی جان اُس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں۔ بے حد متوش

ظنوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

کھلاکتی لڑکیاں۔ ڈھونک اور۔ اور۔ اُس کے ذہن کو تھکا سا لگا۔ تب ہی عتب سے شاہ جہانگیر

نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور خوش دلی سے بولے۔

”اگے یار! گاڑی پہنچ گئی تھی ایر پورٹ؟“

”ہی۔“ وہ جو خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں جی کہہ کر فوراً

دتر اندر اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے بھائی؟“

”شادی؟ شاہ جہانگیر مختصر جواب دے کر غائب اُس کے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر سامنے سے گزرتی

جیراں کو بیکار کر اس سے جانے کیا بات کرنے لگے لیکن وہ صبر نہیں کر سکا۔ اُن کا بازو کھینچ کر پوچھنے لگا۔
 ”کس کی شادی؟“ شاہ جہانگیر نے پہلے جیراں کو جانے کا اشارہ کیا پھر اسے دیکھ کر بولے۔
 ”شہر بانو کی پہلے اس سے مل لو۔ پھر شام تک تو گھر کے مردوں سے بھی اس کا پردہ ہوجائے گا۔“
 ”کیوں؟“

”جتنا نہیں یاد! یہ رمیں وہیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“
 شاہ جہانگیر خود کو خاصا انجان ظاہر کرتے ہوئے اس کے بازو میں بازو ڈال کر سیڑھیاں چڑھ لگے۔
 پھر شہر بانو کے کمرے کے سامنے رک کر پہلے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا تو اس نے دستک دینے سے منع کر دیا لیکن پھر چانک کسی خیال کے تحت رک کر بولا۔
 ”آپ مجھ سے کچھ پتہ چلے گا۔ ابھی بی بی جان تو رنوں سے بھرپور اور کبھی سی پھٹیں۔“
 ”بی بی جان جو کچھ رہی پھٹیں، وہ بھی ٹھیک ہے۔“ شاہ جہانگیر ایک دم سنجیدہ ہوئے۔ ”شادی مرد شہر بانو کی نہیں ٹھہری بھی ہو رہی ہے۔ اور تم اس وقت کوئی اعتراض نہیں اٹھاؤ گے کیونکہ تم سے وعدہ کر چکے ہو۔“
 ”وعدہ میں نے خاموش رہنے کا کیا تھا۔ شادی کا نہیں۔“ اس نے تلملا کر احتجاج کیا اور شاہ جہانگیر بڑے آرام سے بولے۔

”تو خاموش رہو۔“
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“
 صبر کرنے کے لئے بھی وہ جیج پڑا تو شاہ جہانگیر نے انگوٹھے سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اُس کی موجودگی کا احساس دلایا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔
 سامنے بیڈ پر شہر بانو گھٹنوں کے گرد بازو پیٹنے پشانی گھٹنوں پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی اُس نے سر اٹھا نہیں کیا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ ان کی باتیں نہیں تو اُڑ سکتی تھی۔
 ”شہر بانو!“ شاہ جہانگیر نے پکارا تب اُس نے فدا سا سر اٹھا دیا لیکن ان دونوں کی طرف دیکھا اور اس وقت شاہ سکندر کو اُس کا بازو دھکنا ہی غنیمت لگا۔ فوراً ہٹ کر جانے لگا کہ شاہ جہانگیر نے اُس کا بازو تمام لیا اور ہمیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
 ”جب تک شہر بانو اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتی۔ نہیں خاموش رہنا ہے۔ یہی وعدہ لیا تھا نا۔“
 ”تم نے؟“ اُس نے بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھا تو کہنے لگے۔
 ”اب یہ تمہاری قسمت کہ اس کی رخصتی سے پہلے اس گھر میں مہر النساء کی ڈولی اُترنا طے پانی ہے۔“
 ذہن ماؤن ہوئے لگا۔

”مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔ تمہیں کچھ کہنا ہو تو شہر بانو سے کہو۔ یہ سن سکتی ہے البتہ۔“
 حق اسے نہیں دیا گیا۔
 شاہ جہانگیر اسے سناتے میں جھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تو کتنی دیر بعد اُس نے دھیرے دھیرے گروں موڑ کر شہر بانو کو دیکھا۔ اُس نے دوبارہ پشانی گھٹنوں پر رکھ لی تھی۔ اُس کے وجود میں کوئی نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کا رونا محسوس کیسے وہ اُس کے پاس چلا آیا اور اُستہ سے اُس کے سر پر ہاتھ کر لیا۔

”رو نہ نہیں شہر بانو! میں جہانگیر بھائی سے کیا وعدہ نہیں توڑوں گا۔“ پھر فوراً اُس کے کمرے سے نکل آیا۔
 پھر شام اُترتے ہی حرم علی کی رونق اور چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر نظر لان میں جھمکتے لیکن فتنوں کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا۔
 سب کچھ اُٹا نا نا ہو گیا یعنی اُسے اپنے بھائی پر ہونے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ کتنا بھرپور تھا اسے

آپ پر اگر یہاں اپنی بات منوانے میں ناکام ہو گیا تو سب جھوڑ کر چلا جائے گا اور اس کے لیے وہ نہ صرف خود جانتا بلکہ اسے کو بھی آگاہ کر دیتا تھا۔ سید کا خیال آتے ہی وہ یوں مضطرب ہوا کہ اُس کی نظریں یہاں مڑاں اُسے تلاش کرنے لگی تھیں یہی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور اُس کے کمرے پر چلتے ہوئے اندر آ گئے۔

”یا ارم بھی لڑکیوں کی طرح مایوس بیٹھے ہو۔ چلو باز نکلو۔“
 ابراہیم آتے ہی اس کا بازو پکڑ کر کھینچے ہوئے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلاتک نہیں۔
 ”گناہ ہے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لے جانا پڑے گا۔“
 ”بڑی بے عزتی ہوگی سکندر! اپنے ساری لڑکیاں موجود ہیں۔ شرافت سے چلے چلو۔“
 ناصر نے اُس پر صورت حال واضح کرتے ہوئے چلنے کو کہا۔ وہ تب بھی اسی طرح کھڑا رہا۔ خاموش ہو کر کمرے کی خاموشی رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔
 پھر سب کے اصرار پر اسی خاموشی سے چھپا کر آتا تو چانک ڈھولک کی تحاپ تیز ہو گئی لیکن اُس کے اندر کے سناتے میں کوئی پہل نہیں بچی تھی۔

اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم
 تمہارے واسطے یہ ساری دنیا چھوڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ
 نہ ہو جس میں ہم شامل وہ بہاویں ہم نہیں لیں گے
 نظر جس میں دم آئے وہ شیش توڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ
 رہو لو کے قریب بیٹھی وہ مغنیہ کے ساتھ ساتھ خود بھی گنگنا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا جیسے اچانک کسی نے اُس کے دل کے تاروں کو جھیر دیا ہو۔ آنکھوں میں کوئی حسین خیال یوں جھلک ایا کہ گنگنا تے ہوں پر شیشی مسکان سج گئی تھی۔
 بدن کے سامنے تمہارے رنگ میں رنگ ڈالیں
 جدا کیا کر کیسے گئے تم کو مجھ سے یہ جہاں دلے
 محنت کی قسم تقدیر کا رخ موڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ۔

سیا بھائی نے پہلی بار کمرے میں بھائی کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر منس پڑیں لیکن وہ اتنی محنتی کہ اسے ہنسی کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ نہ یہ احساس کہ اس کے بعد دوسرا گانا شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی اگر تم مل جاؤ تھا۔
 مل جانے کا لیکن خدا کا زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرو۔
 سیا بھائی سے آخر ہاتھ نہیں گیا اتنی اونچی آواز میں کہ وہ اُچھل پڑی۔ پھر دونوں بھاؤ جوں کی شوخ و محنتی ہنسی سے جھینپ کر بولی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“
 ”ہمارے کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو تم نے خود ہی کہہ دیا۔ کیوں بھائی؟“
 میوز بھائی نے باقاعدہ اسے چھیننے کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سیا بھائی سے تائید چاہی تو وہ فوراً بولیں۔

”اور کیا، ہمارا کام تو اب دُعا کرنا ہی رہ گیا ہے۔“
 وہ پھر بھی اب یہ دونوں اس کا ناک میں دم کر دیں گی۔ اس لیے فوراً خود پر قابو پا کر مسکین سی شکل

بن کر بولی۔

”صرف دُعا“

”اے کیا بھتیجی! ہماری دُعاؤں کو ابھی ہاتھ اٹھاؤں تو کچھ دھماگے سے بندھ چلا آئے گا تمہارا وہ۔ کیا نام ہے اس کا؟“ میمونہ بھابی ہمیشہ اُس کے نام پر اٹک جاتی تھیں۔

”شاہ سکندر حیات“

”ہاں شاہ سکندر۔ بتاؤ اٹھاؤں ہاتھ“

”نہیں، وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑی۔

”کیوں؟“ یہاں بھابی نے تعجب سے پوچھا تو اُس سے پہلے میمونہ بھابی بول پڑیں۔

”اے جتا ہے۔ میری دُعاؤں میں اثر نہیں ہے“

”یہ بات نہیں ہے،“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ بیٹھی اور ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

”دُعا کا مرملہ بعد میں آئے گا بھابی! پہلے اب امان جی اور انا جی سے تو بات کریں“

”اے اُن سے تو میں جلتے ہی بات کروں گی۔ تجھے یقین ہے اُدھر سے کوئی اعتراض نہیں اُٹھے گا۔

کیونکہ انا جی اور عدیل بھی اُس کی کتنی تعریف کرتے ہیں“

میمونہ بھابی نے کہا تو وہ یونہی بے نیالی میں انہیں دیکھنے لگی جس پر وہ پوچھنے لگیں۔

”میں غلط کہہ رہی ہوں یا نہیں کوئی اور خدشہ ہے“

”خدشہ؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

”دیکھو آسیہ! جو بھی بات ہے صاف کہو کیونکہ ہمیں تمہاری وکالت کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو بے خبری کی

بنا پر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے“

”یہاں بھابی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر سر جھٹکا کر کہنے لگی۔

”مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے بھابی! اللہ شاہ سکندر کہہ رہے تھے کہ ان کے والدین شاید ہی راضی ہوں۔

کیونکہ اُن کے ہاں تاریاں خاندان ہی میں ہوتی ہیں“

”پھر تو اُسے تمہاری طرف نہیں بڑھنا چاہیے تھا؟“ یہاں بھابی بلا ارادہ فوراً کہہ گئیں لیکن پھر اپنی بات

کی نفی کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں خبریہ تو بے اختیاری جذبہ ہے۔ بندے کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہاں تم جاؤ۔ ایسی صورت یوں

کیا کرے گا؟“

”کہہ رہے تھے ان کے والدین نہیں مانے تو وہ چلے آئیں گے اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ زیادہ عرصے

تک اُن کے والدین ناراض نہیں رہ سکیں گے“

”وہ یونہی سر جھٹکے رک رک کر بول رہی تھی۔ یہاں بھابی معاملے کی حد تک پہنچ کر پوچھنے لگیں۔

”وہ اپنے والدین کے سامنے تک انتظار کرے گا یا پہلے ہی شادی کرنا چاہتا ہے؟“

”وہ کچھ نہیں بولی لیکن جن نظروں سے یہاں بھابی کو دیکھا اُس سے وہ کچھ کر لیں۔

”ہوں۔ پہلے شادی۔ اور ہم ہر مطلب ہے۔ تم نے سوچ لیا ہے؟“

”میں تو بس آنا جاتی ہوں بلجائی اگر میری زندگی میں آئے والا وہ پہلا اور آخری شخص ہے۔“

”سے میری شادی اب سو اسی سال بعد یہ سوچنا اور فیصلہ کرنا آپ سب کا کام ہے“

”اُس کے غضب و کلام پر دونوں بھابیوں ایک لمحے کو ہنس کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”مذاق سے شروع ہو کر سنجیدگی کا روپ دھارتی ہی ماحول کو جو جھل کر گئی تھی۔

”جائے اُسے احساس ہو کر سنجیدگی کرنے والی بھابیوں کو اُس نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔

”اُس کی آنکھوں سے تھوڑا سا آنسو نیک کر اُس کے ہاتھوں کی پشت پر گرنے لگی۔

”اے! میمونہ بھابی کی نظریہ پڑی تو تڑپ کر اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر ٹوکا۔“ اُس میں

کی کیا بات ہے؟“ اُن کے اُنسو اور روانی سے ہنسنے لگے۔

”ہشت پگی! رو دو گی تو ہم دس سال بعد کا فیصلہ سنائیں گے“

”یہاں بھابی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ساتھ ہی میمونہ بھابی کو جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ آچیل

کر بولیں۔

”دس سال، نہیں بھی۔ میں تو جلتے ہی امان جی کی منتیں شروع کر دوں گی کہ فوراً آسیہ کو رخصت

کر دیں“

”شاہ سکندر کے ساتھ؟“ یہاں بھابی نے مزید لقمہ دے کر کڑا کیا۔

”ہاں، چاہے اُس کے امان انا آئیں یا نہ آئیں۔ کیوں آسیہ؟“

”آخر میں اُسے لگدلا دیا تو وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔

”ایسے نہیں، ہنس کر دکھاؤ“

”ساتھ کا نا بھی سننا؟ اگر تم مل جاؤ لیکن دیکھو زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرنا“

”یہاں بھابی کی پیار بھری وارننگ پر وہ ہنس پڑی تو بعد ازاں کی چیخ پھاڑے ماحول پھر سے

دشگوار ہو گیا تھا۔

”امان جی۔ میں فیصلہ کو طلاق دے رہا ہوں“

”بڑے بیٹا کا پرسکون انداز بتا رہا تھا کہ یہ اچانک فیصلہ نہیں ہے بلکہ سارے طوفانوں سے گزرنے

کے بعد ہی وہ امان جی اور انا جی کے پاس آئے ہیں۔ اور اپنی بات کے رد عمل پر ٹھٹھکے بھی نہیں۔ یعنی امان

جی اور انا جی سنائے میں آگئے تھے اور وہ ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

”میں جانتا ہوں میرا یہ اقدام آپ کو دکھ دے گا۔ اتنا عرصہ اگر میں خاموش رہا تو صرف یہی سوچ کر

لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میں تجھوتے پر تجھوتا کرنا کیا اس

امید پر کہ شاید بھی وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے لیکن“

”مجھے پھر کر بولتے بولتے انہوں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا پھر ہونٹ بیچ بیچ لے کر آنا جی

سے بولے۔

”اگر تم شروع ہی میں اُسے الگ گھر لے دیتے تو ہمیں اتنے بھگوتے نہ کڑے پڑتے“

”فیصلہ کہتے ہیں آپ۔ تب تو دس دن میں ہی فیصلہ ہو جاتا“

”اُن کے بچھے میں نفی سمٹ آئی۔

”کیونکہ وہ اپنے ہر فعل میں آزاد ہو جاتی۔ اُس نے اپنی سوسائٹی کے لوگوں کو اگر اس گھر کا راستہ نہیں

دکھا یا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آپ کا امان جی کا یا میرا خیال رہا نہیں۔ ہم سب کی عزتوں کی

تواضع کے نزدیک میرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنا گھر اس کی عورت کی طرح مڈل کلاس

سے اپنا تعلیق ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے کسی کو اس گھر کا راستہ نہیں دکھایا اور اگر میں اُسے الگ گھر

لے دیتا تو جو کچھ وہ باہر کرتی پھرتی ہے۔ وہی میرے گھر میں بھی ہوتا“

”اُسے اپنی ذہنی بات بھی تو تم ہی کے دی بیٹا! جہاں مرضی آئی کبھی نہ سمجھی تو کاہمتے۔ اُسے تم نے قیوں ہی

کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جیسے تمہارا اُس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو“

”امان جی بھی انہیں الزام دینے بیٹھ گئیں۔

”اور اب اتنے عرصے بعد تمہاری غیرت جاگے تو ایک دم سے اُسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔

”نہ بیٹا! ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا۔ اُسے آرام سے پیار سے سمجھاؤ“

”آپ کا مطلب ہے۔ میں نے ایسی کوئی کرشمہ نہیں کی۔ ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا ہے امان جی۔

اب تو میری قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔
ان کی بے بسی پر اباجی کڑوا کر رہ گئے۔

میرے بیٹا میرے
بہت صبر کیا۔ مزید کی طاقت نہیں۔ اگر آپ لوگوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا تو کسی دن میرے دماغ
کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

اللہ نہ کرے! اماں جی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

تو چھوڑ دس اُس کی طرف داری۔ مت گھبراؤ اُس کے ساتھ ہمدردی۔ وہ عورت ہرگز اس قابل نہیں
ہے۔ نیل کی وجہ سے میں سناس کا بہت لحاظ رکھتی لیکن اُسے اُس کی بھی پروا نہیں ہے کتنے دن ہو گئے
میں نہیں لوگئے ہوئے۔ ایک دن بھی اُس نے آپ سے پوچھا کہ وہ کب آئے گا؟
ایک طویل عرصہ بعد وہ اتنا بول رہے تھے۔ گویا برسوں کا غبار تھا۔

”پھر بھی بیٹا! نیل کا خیال کر کے تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔“
اماں جی تسلی طرح اُن کے فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ ایک آخری کوشش کے طور پر انہیں پڑ
کا احساس دلایا تو وہ کہنے لگے۔

”نیل کا خیال ہی تو کر رہا ہوں۔ ماں کی بے توجہی سے مر رہا ہے اور جس دن اُس نے ماں
بے راہ روی محسوس کر لی بالکل لوٹ جانے کا۔“

نہ جانتے ہوئے بھی اُن کی زبان پر نیل کی بے راہ روی کا ذکر آ گیا۔
”بچے کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں ماں کے کردار کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ
کو میرا بچہ اپنے وجود پر یلوم ہوا کسی سے سزا بھرا کر بات نہ کر سکے۔“
اس کے بعد اُن کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی تو اباجی کو سر جھکائے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر
جاتے جاتے بولے تھے۔

”مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو کڑوا دے رہا ہوں۔“
ان کے جانے کے بعد اباجی نے سزا بھرا کر اماں جی کو دیکھا تو وہ رونے لگیں۔ پتا نہیں ان کے آنسوؤں
کے ڈھکے پر جھلکے تھے یا اُس عورت کے لیے جو کڑوا کا باعث تھی۔ اباجی نے بہر حال انہیں رونے سے
منع نہیں کیا۔ بکری سانس لیچنے ہوئے بولے۔

”یہ سچ ہے میرے بیٹے نے اپنی طاقت سے زیادہ برداشت کیا۔ دعا کر ڈالو اسے سکون دے
اماں جی دوپٹے کے پورے آنسو صاف کرتے لگیں۔

”شاید اسی خدا کی مصلحت ہوگی۔“

اباجی اٹھتے ہوئے پیسے اپنے آپ سے بولے تبھی عدیل نے آکر سلام کیا تو جواب دے کر اباجی
اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اماں جی نماز کی نیت سے اٹھیں
عدیل نے کھانا مانگا لیا۔

”نماز سے پہلے مجھے کھانا دے دیں اماں جی! پھر بیٹھے ہوئے اماں جی پر نظر پڑی تو ٹھک گئے
وہ کیا بات ہے اماں جی! آپ رویوں رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“
اماں جی اٹھنے لگیں تو عدیل نے جلدی سے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ اور انہیں بتانے پر
کرنے لگے۔ اسی وقت دوسرے نبیلہ بیانی گھر میں داخل ہوئیں اور دوسرے بڑے بیٹا بہت تیز
میرٹھیاں اترتے ہوئے آگے بول بیٹھے انتظار میں تھے۔ یقیناً انہوں نے دوسرے نبیلہ کو اُتے ہوئے
دیکھ لیا تھا اور بجائے اُن کا اوپر اُتار دینے کے خود ہی نیچے آکر اُن کا راستہ روک لیا۔

”کیا بات ہے؟“ نبیلہ کا اپنا انداز تھا۔ غیر معمولی بات پر بھی اُس کے تنازع میں فرق نہیں آتا۔

پیشانی پر ہل ڈال کر بوقت اس طرح راستے میں کھڑے ہونے کا مطلب ہے؟
وہاں لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو اور جس کے ساتھ آئی ہو۔
اُن کے بچے کا منہ ان اس بات کا منہ تھا کہ وہ ضبط کی انتہا پر کھڑے ہیں۔
نبیلہ نے قدرے ٹپٹپٹا کر اماں جی اور عدیل کو دیکھا پھر اُن سے بولی۔

”میں ہرگز نہیں اپنی اسلٹ کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو کچھ کہنا ہے اور چل کر کہو۔“
”کہنے کے لئے کا وقت نکل گیا ہے نبیلہ۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے تمہیں وارنٹ دی تھی۔ اپنی روش
بدلو۔ اگر نہ بدل سکو تو اس گھر میں مت آنا۔ آج کی تاریخ کو دیکھ لو۔ یہی دن طے ہوا تھا ناں؟“
انہوں نے چیختے ہوئے پہلے میں اسے یاد دلایا تو وہ کھری سانس لیچ کر بولی۔

”تو فتنے فیصلہ کر لیا ہے؟“

انہوں نے ہنٹ بھنٹ بھنٹ کر اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے اُن پر سے نظریں ہٹا کر اماں جی کو روتے
ہوئے اور عدیل کو کم کم دیکھا پھر درود یوار پر نظر ڈالنے کے بعد آخر میں انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”اگر میں نیچے درجے کی کوئی عام سی عورت ہوتی مقل احمد تو تمہاری منتیں کرنی یا پھر کوئی کہ جو کچھ تم
نے میرے ساتھ کیا تو تمہاری۔“

”خبردار۔ وہ جو بہت ضبط کر رہے تھے۔ چیخ پڑے۔ تمہاری زبان پر میرے گھر کی کسی عورت کا
نام نہ آئے۔“

”بہت یاد رہا میں تمہارے گھر کی عورتیں۔ ہا۔ وہ تملکا کر ہنسی۔ بڑی ذہن پر ہنسی تھی۔ عدیل اپنی جگہ
سے اٹھ کر دونوں کے درمیان آکھڑے ہوئے۔

”بڑے بیٹا، پلیز، آپ اوپر جائیں، پھر اس کی طرف پلٹے۔“ بیانی پلیز
”مت کہو اسے بیانی! طلاق دے رہا ہوں میں اسے۔“

”طلاق دے رہا ہوں۔“

نبیلہ کو اگر افسوس نہیں تھا تب بھی ایک لحظہ کو دل کا پناہ ضرور تھا۔ اس کے بعد کچھ نہ کہہ کر خود کو پھلے
دھبے کی عورت ثابت کرنے سے روکتے روکتے بھی دہلیز پر کھڑی ہو کر وہ چیخ کر بولی تھی۔

”عقیل احمد! مت بھولنا کہ تمہاری ایک بہن بھی ہے۔“

اتنے شور اور ہنگامے میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بی بی جان کی رسیں بھی تو ختم ہونے میں نہیں آ رہی
تھیں۔ جانے کس کس چیز پر اُس کا اور اُس کے پہلو میں کھڑی مہر النساء کا ہاتھ لکوا کر دونوں کے اوپر سے
دار رہی تھیں۔

اگر یہ سب اُس کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہوتا تو وہ کتنا خوش ہوتا۔ مجاہد توں اور کزن کی قیصرہ تھا
پر نہ صرف محظوظ ہوتا بلکہ برابر سے جواب بھی دیتا لیکن وہ تو ایسا کم کم کھڑا تھا کہ پہلو میں کھڑی مہر النساء
کے وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔

”بس کرس بی بی جان! ذہن تھک گئی ہے۔“ آخر بڑی بیانی کو احساس ہوا تو بڑھ کر مہر النساء کو قہقہہ
لیا تو واقعی بیماری کیڑوں اور زبورات کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ بی بی جان نے ہاتھ میں پکڑا تھا
نیمزل کو تھا یا پھر ایک طرف ہٹتے ہوئے مہر النساء سے بولیں۔

”سنبھل کے۔ پہلے وہاں پاؤں آگے بڑھاؤ۔“

”جیل بھی شہزادے! تو بھی آگے بڑھو! چھوٹی بیانی نے اُس کے بازو میں جھکی کانتے ہوئے کہا اور
اُس نے قدم کیا بڑھا یا کہ پھر کا ہی نہیں۔ پچھلے سب شور بجا ہی رہ گئیں۔

”ارے ابی! ذہن تو لیتے جاؤ! اُس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ راہداری سے نکل کر میٹر صیاں چڑھنے

کے بجائے پچھلے طرف بارہ دری میں نکل آیا۔
دن بھر کی جھلسا دینے والی گرمی کے بعد ابھی بھی گر کر ہوا نہیں چل رہی تھی پھر بھی قدرے سکون تھا۔
ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک تو ذہنی انتشار دوسرے تھکا دینے والی رملیں اُس کے
اعصاب تل کر گئی تھیں کتنی دیر تک وہ بالوں میں انگلیاں پھسلنے خود کو سہارا دینے کی کوشش کر
رہا پھر اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

جب ذہن کسی حد تک سوچنے کے قابل ہوا تب بھی وہ یکسوئی سے کچھ نہیں سوچ سکا۔ البتہ اب
اُس پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے سازش کا شکار ہو گیا۔ شاید اُس کے گمان
بھی نہیں تھا کہ شاہ جہاں گھرنے جو اُس سے شہر بالو کی شادی تک خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا تو
سے پہلے وہ اسے بھی پابند کر دے گا اور اسے پابند کر کے سب لوگ کتنے خوش تھے۔ اندر سے آتی ہمت
کی آوازیں اُس کے ذہن پر ہتھوڑنے برسے لگیں تو اُس کا دل چاہا وہ اسی وقت سب کی خوشیوں
رو دتا ہوا چلا جائے لیکن ابھی شہر بالو رخصت نہیں ہوئی تھی۔ کل تک اُسے انتظار کرنا تھا۔ اُس کے لیے
ایک پل یہاں نہیں ٹھہرے گا۔

اُس کا ذہن اچانک اپنے کل کے بارے میں سوچنے لگا تو پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ کتنی رات بید
گئی۔ اندر باہر ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید سب کو یقین تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا چکا ہے مگر
اُسے ذمہ داری ہوا اس طرف نہیں آیا بلکہ سب اطمینان سے سو گئے تھے۔ اور وہ اپنا اگلا اقدام سوچنے
بعد جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تب وہاں سے اُٹھ کر اندر آیا۔

اس وقت گھڑی کی سوئیاں دو بج رہی تھیں۔ وہ مہر النساء کے سوجانے کا یقین کر کے اپنے کمرے پر
آیا اور قصد اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔
اس کا خیال تھا کہ پڑے بدل کر اسی خاموشی سے اس کمرے سے نکل کر نیچے ہیں جا کر سوجانے گا۔ اب
تھیں اُس نے بہت احتیاط کی یعنی کوئی اُپٹ نہیں ہوئے دی۔ یا بھی وجہ پاؤں تھا۔ پھر کمرے پر
کراہی احتیاط سے ڈرائنگ روم سے نکلا تھا کہ بے اختیار نظر پیچ پر پڑی اُس لڑکی پر جا ٹھہری جس کی
غیر معمولی حسن کو بھی اُسے متاثر نہیں کر سکا تھا لیکن اس ایک پل میں جانے کیا سحر تھا جس کی طرف
وہ یوں آکا کہ اس پر سے نظریں ہٹا ہی نہیں سکا۔ چنانچہ اُس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گئی تھی یا تو
چمکیں موندتی تھیں۔ خود سے قدرے بے نیاز اور قدرے بے ترتیب سی ہو کر ہوش اُڑانے دے رہی
تھی۔ اور اسی مدد ہوئی کے عالم میں اُس نے درمیانی فاصلہ سمیٹا تو اُس کے ہونٹ بے آواز جنبش کر
تھے۔ مہر۔ مہر۔

اور یہ جیت کا نشہ نہیں تھا جس کا کیف ساری زندگی پر محیط ہو جاتا۔ اس کے برعکس وقتی جذبات
تھے۔ نفسیاتی خواہش جس سے مغلوب ہو کر وہ اپنی اولین شہادت اُس کے نام کر گیا تھا جس کے ساتھ
گزارنے پر اس کا دل آمادہ ہی نہیں تھا۔ اور گو کہ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی صبح ہونے سے
پہلے بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور بے حد وحشت زدہ سامہ النساء کو دیکھنے لگا جو بالینے کے احساس سے
نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔ جس سے وہ جنونی سا ہو کر اُسے صبح بھڑکنے لگا۔

”مہر۔ مہر النساء۔“
”جی۔۔۔ وہ کھڑا کھڑا بیٹھی۔“
”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ عجیب سوال تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔
”جی۔۔۔“

”تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ وہ اُسے کندھوں سے تھام کر صبح بھڑکا
لگا۔ تو بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑا کر وہ بیڈ سے اتر کر بولی۔
”آپ۔ شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر لے آئی۔“

لیجیے۔ پانی پی لیں۔“
اُس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر بیڈ کی پشت پر سر رکھتا ہوا بولا۔
”یہ اچھا نہیں ہوا مہر النساء یہ اچھا نہیں ہوا۔ اُس کے لیے بے بسی تھی۔ مہر النساء کی سمجھ میں
نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر تھیل پر رکھا پھر قریب آکر بولی۔
”آپ لیٹ جائیں، میں آپ کا سر دباؤتی ہوں۔“

اُس کے اندر اچانک تنفر پھیل گیا۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتا ہوا زہر خند سے بولا۔
”کیا سمجھتی ہو تم، اس طرح میرا دل جیت لو گی؟“
”جیسے تو آپ ہیں شاہ جہاں کو تو مانگی؟ بڑا خوبصورت بڑا دلنشین انداز تھا اس کا لیکن شاہ سکندر حیات
اب بوش میں آچکا تھا۔ کچھ دیر تک اُس کی جھکی ہوئی ہلکی کود دیکھتا رہا پھر پلو پھنے لگا۔
”مارنے کا دکھ نہیں ہے نہیں؟“

”دکھ۔ مہر النساء نے زہر خند دہرایا پھر جیسے اپنی ہار سوچ کر مسکرائی۔ اور ایسے ہی جھکی ہوئی
نظروں سے اُسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
”آپ کو جیتنے کی خوشی نہیں ہے؟“
شاہ سکندر کی آنکھوں میں خیر مسکرائی۔ کیا کہے اُس سے کہ جیسے وہ جیت کھ رہی ہے۔ وہ اس
کی سب سے بڑی ہار ہے۔

کل جب مہر النساء کی ڈولی اس حویلی میں اُتری تھی تو حویلی کی رونق میں کمی لگنا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ
ساری رونقیں شہر بالو کے رخصت ہونے ہی سے ماند پڑ گئی تھیں۔
رواج کے مطابق مہر النساء بھی اُس کے ساتھ بیٹھے چل گئی تھی۔ اور تین دن اُسے وہیں رہنا تھا۔ بہر حال
شاہ سکندر کو اس سے کوئی اعتراض نہیں تھی۔ وہ شہر بالو کی رخصتی تک خاموش رہنے کا وعدہ نہ کیا تھا اور
مزید خاموش رہنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا نہ ہی صبح ہونے کا انتظار کر سکا۔ اسی وقت جا کر شاہ جہاں گھر
کے کمرے کا دروازہ کھٹکھا دیا۔

”کون ہے آج؟“ اندر سے شاہ جہاں گھر کی آواز آئی تو اُس نے ہینڈل گھا کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن
سامنے بھائی پر نظر پڑی تو وہیں رگ کر بولا۔
”بھائی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ بھائی معلوم ہے بلکہ یاد ہے۔ کچھ دن مبر کر لو۔ پھر اطمینان سے۔“
”سہاں ایک ایک پل بھاری ہے۔“ وہ درمیان میں بول پڑا تو شاہ جہاں گھر نے اپنی بیگم کو دیکھ کر گویا
اسے ان کی موجودگی کا احساس دلایا پھر اُسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔
”کیا صبح تک انتظار بھی نہیں کر سکتے؟“

”ارے ابھی تو وہ کئی ہے۔ اتنی بے قراری؟“
”بھائی! ابھی تمہارے مطابق مہر النساء کے حوالے سے اُسے چھیڑ کر نہیں تو اُس نے شاہ جہاں گھر کو دیکھا۔
”صبح۔“ انہوں نے اسی قدر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے
چلا گیا۔

رات کے پندرہسوں لمحات کی خوشبو ابھی اُس کے کمرے سے گئی نہیں تھی، جو اُس کے سوچنے کی
راہ میں عامل ہو کر بار بار اُس کا دھیان ہٹا دیتی۔ تب صبح اُٹ کر اُس نے سیکے میں منہ چھپا لیا تھا۔
پھر صبح ناچنے کے بعد وہ بی بی جان کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کی بڑی بہن نور بانو بھی وہیں موجود تھیں۔
اور اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ سن کر کہنے لگا۔
”اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپ! ابھی راتیں ناں۔“

”تم کہاں میرے پاس بیٹھتے ہو، سارا وقت تو اپنے کمرے میں بند رہتے ہو، نور بالو گلہ کر رہے ہو۔“
 بولیں۔ ”میرے پاس آنے ہی نہیں ہو۔ اب میرا سنا کر آنا۔“
 ”جی۔“ وہ اسی قدر کہہ کر فوراً بی بی جان کو غیظ کر کے پوچھنے لگا۔ ”جہانگیر بھائی نے ناراض کیا؟“
 ”ہاں، وہ تو سیر سے ہی نکل گیا ہے۔“ بی بی جان نے بتایا تو وہ چونک گیا۔

”کہاں؟“
 ”رقبے پر گیا ہے۔“
 ”اکیلے؟“

”نہیں۔“ مہارے بابا جان بھی ساتھ گئے ہیں۔“ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”تمہیں کوئی لاؤ اس سے؟“
 ”جی۔ جی نہیں۔“ وہ اکیدم اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے ٹوک کر بولا۔ ”بھائی! آئیں تو ان سے گلا۔ میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“ بی بی جان نے ٹھیک سے سنا نہیں یا سمجھیں نہیں اور وہ اچانک سارے مصلحتوں کا دامن چھوڑ کر بیچ بڑھا۔

”میں جا رہا ہوں بی بی جان یہاں سے، چہنچہ کے لیے، آپ نے اور بابا جان نے میری بات سنی ہی نہیں تھی اور جہانگیر بھائی نے اتنا احسان کیا کہ نہ صرف میری بات سنی بلکہ سمجھ کر لکھے یقیناً دلا یا تھا کہ وہ میرے سختی میں آپ لوگوں کو ہموار کریں گے۔ لیکن وہ میرے ساتھ فاضل تحصیل اس سے زیادہ میں اپنی زندگی کے ساتھ کھیلنے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا۔“
 ”ک۔ کیا مطلب ہے مہاراجہ؟“ بی بی جان نے بوکھلا کر کہا اس سے اور دیکھا نور بالو کو

صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی پریشان ہو گئی تھیں۔
 ”آپ ابھی طرح جانتی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ میں نے بھائی پر اعتبار ان سے کیسے کیا میں منتظر بالو کی طرح گونگا بہہ نہیں ہوں نہ ہی ان کے ہمارے کامتاج یہاں۔“
 ”نکل کر اگر کچھ نہ کروں گا۔“ تب بھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گا۔“
 اس نے جانے کا فیصلہ بنا کر بی بی جان کے خواہش چھین لیے۔

”بابا جان کے الفاظ حرف آخر تھے ناں تو میرا فیصلہ بھی اہل ہے۔ ان ہی کی اولاد ہوں میں نے اپنا سونپا لورا کر لیا اب میری باری ہے جا رہا ہوں میں۔“
 وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ درنہ اس سے پہلے کہ بی بی جان کے سامنے اتنی اونچی آواز بات نہیں کی تھی۔ جانے کیسے سارے لحاظ بھلا گیا۔

”سکندر، سکندر میرے بھائی،“ نور بالو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف لپکیں۔ ”کہاں جا رہے؟“
 ”بی بی جان جاتی ہیں۔“ وہ نور بالو کے قریب آنے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
 بی بی جان اکیدم ہوش میں آکر بیکار ہو گئیں۔
 ”سکندر! اپنے بابا جان کو تو آئے دو۔“ وہ اُن سنی کرتا آگے بڑھ گیا۔ تو بی بی جان شاہ یونس بہوؤں کو بیکار کرنے لگیں۔

”کوئی روکو اسے۔ میں مہارے بابا جان کو کیا جواب دوں گی؟“
 اور غلطی شاہ جہانگیر کی تھی۔ اگر اس کی بات سن لیتے تو آرام سے سمجھا بھی سکتے تھے۔ جیسے پہلے رام کر لیا تھا۔ شاید اپنے طور پر انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا اور وہ اس کو جو گیا تھا کہ بڑی بہن اور بھادریں منتیں کرتی رہ گئیں شاہ یونس نے ہر طرح روکنے کی کوشش کی وہ نہیں رکھا۔ اسی وقت اپنا ضروری سامان لے کر حویلی سے نکل گیا تھا۔

”آسیہ!“ اُس نے تشکیل بھائی کی بیکار میں کرسب بچوں کو آرام سے کھیلنے کی تاکید کی پھر کمرے سے نکل کر اونچ میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”بھائی! وہ عدیل کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا! اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”کیا ہوا اماں جی کو؟“ ادھر سے سیما بھائی سنتی ہوئی آ رہی تھیں۔ فوراً پوچھنے لگیں۔
 ”بتانا نہیں، زیادہ کچھ نہیں بتایا عدیل نے۔“ میرا خیال ہے اکیلے میں گھبرا گئی ہوں گی۔ تشکیل بھائی بیوی کو جواب دے کر اسے دیکھنے لگے۔
 ”تو ہم چلے جاتے ہیں۔“ اُس نے کہا تو تشکیل بھائی برسوج انداز میں ذرا سار ہلا کر بولے۔

”جوں۔“ عدیل بھی کہہ رہا تھا کہ ابانی سب کو واپس بلا رہے ہیں۔
 ”عدیل نے یہاں فون کیوں نہیں کیا۔ تم از کم ہم اماں جی کے بارے میں تفصیل سے تو معلوم کر لیتے۔“

”اسی لیے اُس نے یہاں فون نہیں کیا۔ کیونکہ وہاں گھر کا فون خراب تھا اور آفس میں بیٹھ کر وہ تم خواتین سے لمبی چوڑی بات نہیں کر سکتا تھا۔“ تشکیل بھائی نے زور دے کر بیوی کو بتایا پھر اس سے کہنے لگے۔

”بھائی! تم شادی کرو۔ کل صبح کی ٹیون ہے۔“
 ”یعنی آپ لگٹ بھی لے آئے؟“ سیما بھائی نے تعجب کا اظہار کیا۔
 ”ٹھیک تو ہے بھائی! ہمیں فوراً جانا چاہیے۔“ پتا نہیں اماں جی!
 ”اُس کا دھیان اماں جی کی طرف تھا۔ اس بحث سے الٹا کر بولی۔“ تشکیل بھائی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تسلی دیتے ہوئے بولے۔

”زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس وہی اکیلے میں گھبرا گئی ہیں۔ تم جاؤ تیاری کرو۔“
 اُسے غصے ہوا۔ جسے تشکیل بھائی کچھ چھار رہے ہیں۔ تب اندر ہی اندر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اور کیونکہ بات اماں جی کی تھی۔ اس لیے کسی اور طرف اس کا دھیان ہی نہیں کیا۔ فوراً جا کر بیٹے میمونہ بھائی کو بتایا پھر آکر اپنا سوٹ کیس بیک کرنے لگی جیسے اسی وقت روانہ ہو رہی۔ اور اس کا دل تو ابھی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اماں جی کے پاس پہنچ جائے بڑی مشکل سے رات کو بھی اور پھر آگے طویل سفر تھا۔ گو کہ تشکیل بھائی اور پھر سیما بھائی بھی وقت رخصت یہی کہتی رہی تھیں کہ یہ صرف تم لوگوں کو بلانے کا ہانا ہے۔ لیکن اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ابا جی ایسے نہ بلاؤ گے تب بھی جی جانا تھا۔ ضرور کوئی بات ہے۔“
 ”تھانکس! وہ یہی سوچتی آئی تھی۔“ اُسے کراچی اسٹیشن پر عدیل موجود تھے۔ اور وہ تشکیل بھائی کے سامنے کس بے قراری یا تشویش کا اظہار نہیں کر سکتی تھی عدیل بھائی سے اپنی کیفیت چھپا نہیں سکی۔
 ”کچھ بتائیں عدیل بھائی! کیا بات ہے؟“
 ”کیا بات ہے؟“ وہ اُلٹا اُس سے پوچھنے لگے۔

”اماں جی تو ٹھیک ہیں ناں؟“
 ”باب ٹھیک ہیں اور بڑی بے قراری سے تم لوگوں کا انتظار کر رہی ہیں، پھر فوراً میمونہ بھائی کی طرف گھوم کر کہنے لگے۔

”آپ نے بھی توجہ کر دی بھائی! سب بچوں کو لے کر چل پڑیں۔ ایک دو کو اماں جی کے پاس چھوڑنا چاہیے۔“
 ”ایک تو جھوٹ تو گئی تھی۔“ میمونہ بھائی کا اشارہ اپنے میاں کی طرف تھا۔ عدیل بھکر زور سے ہنسنے لگی۔
 ”بھئی نیل پر نظر پڑی تو اُسے اپنے ساتھ لگا کر بولے۔“
 ”اور بار بار سنا کیسے ہو، یہ بیک اٹھا لو گے؟“

”میں اٹھا لوں گا!“ اصرار سے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ تو میمونہ جہابی ٹوکتے ہوئے بولیں۔
”کتوں آدھی، بلی بٹالو۔ پیسے ہیں دسے دوں گی۔“
”خواہ رہنا آسید! یہ بعد میں نگر جانی ہیں۔“

وہ بھانج کو مشارت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ تو اس جھپٹ چھاڑ میں آسید بہت حد تک دوسروں سے نکل آئی۔ ظاہر ہے اگر کوئی سرپرست بات ہوتی تو عدیل جہابی اتنے آرام سے نہیں ہو سکتے تھے تمام راستہ وہ میمونہ جہابی کے ساتھ اسی طرح مذاق کرتے رہے اور میمونہ جہابی بھی گو کہ برابر سے جواب دے رہی تھیں۔ لیکن سفر کی تھکان کے باعث ان کے لہجے میں شگفتگی نہیں تھی۔

اپنے گھر آنے کی خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔ بیچوں نے دروازے سے داخل ہوتے ہی اماں کی اور آبی کی بیکارنا شروع کر دیا۔ اصرار سونپا بھاگ کر اماں کی کے تخت — پر چڑھ کر ان سے لیٹ گئے۔ نیل بھی ان کی تقلید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی آبی نے اُسے اپنے بازوؤں میں بے کرستہ میں بٹھایا لیا۔
”اٹ اماں جی! میں تو پریشان ہو گئی تھی!“ جب اُس کی باری آئی تو اماں جی کے گلے لگتی

ہوتی بولی: ”عدیل جہابی نے آپ کی ہماری کا کیوں کہا؟“
”میں نے منع بھی کیا تھا اُسے۔ خیر تم سناؤ۔ وہاں شکیل کے ہاں سب خیریت ہے ناں: بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سیا بھی آجانی تم لوگوں کے ساتھ!“ اماں جی موضوع بدل گئیں۔
”ہاں سیا جہابی کا دل بھی چاہ رہا تھا۔ لیکن شکیل جہابی کو کھانے وغیرہ کی پرہیز ہو جاتی۔ اس لیے نہ آئیں۔ آپ آپ جائیے گا۔“
”اُس نے کہا تو اماں جی قصداً ان سنی کر کے عدیل سے کہنے لگیں۔“

”عدیل! یہ تو تھکی ہوئی آئی ہیں۔ اس وقت چائے تم بنا لو۔“
”نہیں! اماں جی!“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”عدیل جہابی کیوں بنائیں گے!“
”بناتے دو۔ بنانے دو۔ میمونہ جہابی کو موقع مل گیا۔“ چلو عدیل شاباش کام کیا کر دیا۔

”نہیں بھابی! یہ کام میرا ہے۔“
وہ تکرر جانتے لگی کہ نیل کو ریڑھیاں اُترتے دیکھ کر وہیں رک گئی۔ پتا نہیں کس وقت وہاں جاگ اُٹھا تھا۔ حالانکہ اُسے ابھی طرح پتا تھا کہ اس وقت اوپر کوئی نہیں ہوتا۔ پھر بھی آخری سیڑھی تک اُتر گئے لگا۔

”بھیبھو! اوپر کوئی نہیں ہے۔“
”بابا! تو شام آئیں آتے ہیں بیٹا اور میں بھی آجائیں گی۔ آپ جاؤ اماں جی کے پاس بیٹھو، چائے پیو گے ناں!“
وہ اُسے نرمی سے سمجھا کر کہیں میں آگئی۔ اور ابھی چوہا جلا کر کتلیں میں پانی رکھ رہی تھی کہ عدیل جہابی اُس کے پیچھے آگئے۔

”میں بناؤں گی جہابی!“ وہ یہی سمجھی اُس کا ہاتھ پٹانے آئے ہیں۔
”نیل کیا کہہ رہا تھا؟“ انہوں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ تو وہ معروف سے انداز میں بولی۔

”بچہ ہے ناں، اتنے دن ماں باپ سے دور رہا۔ اپنی کاپو پھر رہا تھا۔“
”سوفی! عدیل جہابی اُسے مصروفیت سے نکال کر کہنے لگے۔ اس بچے کو نہیں کسی طرح بھلا نا۔ کیا مطلب؟“ وہ ان کے لہجے پر ہلک گئی۔ اور انہوں نے پہلے اپنے پیچھے دیکھ کر گویا کسی نہ ہونے کا یقین کیا پھر دروازہ دبا کر بولے۔

”بڑے بھیا نے بیلہ جہابی کو طلاق دے دی ہے۔“

”کیا؟“ اُسے شدید دھچکا لگا تھا۔ انتہائی دکھ سے بولی: ”کیوں عدیل جہابی؟ بڑے بھیا نے ایسا کیوں کیا؟“
”میرے حساب سے تو بڑے بھیا کو یہ قدم بہت پہلے اٹھانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں کی۔“
عدیل جہابی بڑے آرام سے کہہ کر کہیں سے نکل گئے۔ اور اُس کے آئسو ہلک پر پڑے۔ حالانکہ بیلہ جہابی اس گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتی تھیں۔ پھر بھی اُسے دکھ ہر رہا تھا۔

اُس کے خیال میں نیل کو بھلا نا مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ پہلے بھی وہ سارا وقت اُس کے اور اماں جی کے پاس رہتا تھا۔ بس رات میں سونے کے لیے ہی اوپر جاتا۔ تب بھی بیلہ جہابی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اور ابھی ان کی طرف سے نیل کو ملنے یا لینے کا کوئی مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ اُسے اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتیں۔ اور حیرت انگیز طور پر نیل کے دل میں اُس عورت کے لیے اتنا گلاز تھا کہ اس کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے بیمار پڑ گیا۔ رات رات بھر جاگ کر انتظار کرتا پھر اُس سے پوچھتا۔

”بھیبھو! تم کیوں نہیں آئیں؟“
”میں کہاں جا رہی تھیں؟“
”بابا! کہہ رہے تھے۔ تمی اب کبھی نہیں آئیں گی۔ میں جو بھو؟“

وہ اُس کے سوالوں سے کبھی پریشان ہو جاتی، کبھی حیران۔ اور حیرت اُسے اس بات پر تھی کہ وہ کیسے اُس عورت سے اتنی محبت رکھتا ہے، جو اسے صرف جنم دینے کی سزاوار تھی۔ بہر حال وہ جو سوچ رہی تھی کہ اسے بھلا نا مشکل نہیں ہے۔ تو یہ آسان بھی نہیں تھا۔ اُس کا سارا وقت اس کا دھیان ادھر ادھر رکھنے میں گزر جاتا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی، ورنہ اماں جی کسی طرح نیل کو نہیں بھلا سکتی تھیں۔

بڑے بھیا نے پتا نہیں کونسی مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔ رات میں اتنی دیر سے آتے تو اُس کے کمرے میں بس دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھتے۔

”نیل سو گیا؟“
”نہیں زیادہ تنگ تو نہیں کرتا؟“
اور وہ جی اور جی نہیں سے زیادہ کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھتی ضرور تھی کہ ماں نے تو چھوڑا ہی باپ بھی اتنا لا پرواہ ہو گیا ہے۔

”مگر انہیں بڑے بھیا کو تو خاص ہونا چاہیے۔“ اُس وقت وہ میمونہ جہابی کے سامنے کڑھ رہی تھی۔ اسی لیے نیل زیادہ حساس ہو رہا ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے کوئی اُسے نظر نہیں آتا۔ ہم اس سے کتنی محبت کریں۔ اس کے ماں باپ تو جنیں ہو سکتے۔“

”ہوں!“ میمونہ جہابی گو کہ دیکھ اُسے ہی رہی تھیں لیکن جلنے دھیان کہاں تھا۔
”ایمان سے جہابی! مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ رات میں کتنی بار چونک کر اٹھتا ہے پھر ہم کمرے سے سینے میں منہ چھپا لیتا ہے۔“

”ہوں!“ میمونہ جہابی کا انداز ابھی بھی سوچتا ہوا تھا جس پر اُس نے ڈک کر نہیں دیکھا پھر ان کا ہاتھ ہلکا کر پوچھنے لگی۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“
”میں نیل کا سوچ رہی ہوں اور ساتھ ساتھ ہمارا بھی۔ میمونہ جہابی نے بغیر جوکے کہا تو وہ متعجب ہوئی۔“
”میرا؟“

”ہاں تم جو نیل کو اپنا اتنا عادی بنا رہی ہو تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کل کو جب ہتھاری شادی ہو جائے گی تو وہ کیا کرے گا؟“
 میمونہ بھائی اُسے جھکاتے ہوئے بولیں: ”میں یہ نہیں کہتی کہ اس کا خیال نہیں رکھو البتہ اُسے بالکل اپنا محتاج نہیں بنادو ورنہ وہ ایک بار پھر لوٹ جائے گا۔ اس سے ہتھاری دُوری برداشت نہیں ہو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہوں نا؟“
 ”ہوں۔“ اُس نے پُرسوج انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگی: ”میں کیا کروں۔ وہ سارا وقت میرے

ساتھ لگا رہتا ہے۔“
 ”تھوڑا نظر انداز کرو گ، تب وہ ادھر ادھر کھینے میں لگے گا، اور میں اماں جی سے کہوں گی، اُسے اپنے پاس سلا کر دوں۔“

”نہیں بھائی! ابھی نہیں۔“ اس کا اپنا دل بھی تو ایسا ہی نرم تھا۔
 ”بالکل مت بند ہو۔ ہتھارے جانے کے بعد ہم سب کو مشکل ہوگی۔ میمونہ بھائی نے لولا پھر اُسے متوجہ کر کے پوچھنے لگیں: ”سو ابھی تک وہ آیا نہیں۔ کب آئے گا؟“
 ”کوئی وقت تو مقرر نہیں کیا تھا۔ بس یہ پوچھا تھا کہ میں کب جاؤں گی؟ وہ اپنے ناخون کو دیکھتے ہوئے بولی۔“

”کراچی آئے ہوئے بھی ہیں پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں۔ اُسے کم از کم فون تو کرنا چاہیے تھا۔ کچھ حالات کا پتہ چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کو راضی کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا، میں غلط تو نہیں کہہ رہی ناں!“
 اُس کے دیکھنے پر میمونہ بھائی نے پوچھا تو ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نفی میں سر ہلانے لگی: ”اچھا سنو، میں اپنے طور پر اماں جی سے ذکر کروں، میرا مطلب ہے یونہی پہلے ہتھاری شادی

کی بات چھوڑ دوں گی پھر اس کا نام لوں گی۔“

میمونہ بھائی نے اچانک کس خیال کے تحت کہا۔
 وہ کچھ نہیں بولی، بس سر جھکا لیا گویا ان کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔
 اور اُس رات نیل کو کہانی سناتے ہوئے، وہ اپنی ہی کہانی میں کھو گئی۔ میمونہ بھائی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ شاہ سکندر کو فون فرود کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کن کاموں میں الجھ گیا ہے۔ اور جانے؟
 نے اپنے گھر میں میرا ذکر کیا بھی ہے یا نہیں۔ یا شاید: ”نہہ زادہ نہیں آئے گا تو خنزادی کی شادی

کس سے ہوگی؟“
 ”نہہ زادہ، کیوں نہیں آئے گا۔ فرود آئے گا؟“
 ”وہ اپنے خیال میں بولی پھر چونکی تو ہنس پڑی اور نیل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی تھی

”نہہ زادہ فرود آئے گا۔ پتا؟“
 ”اور اگر وہ راستہ بھول گیا؟“
 ”محبت کرنے والے راستہ نہیں بھولتے البتہ ان کے راستے میں رکاوٹیں کڑی کر دی جاتی ہیں۔
 جنہیں دور کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔“
 اُس نے سوچتے ہوئے پلکیں موند لیں۔

شاہ سکندر سیدھا احمد حسن کے پاس آتا تھا۔ کیونکہ اُس کے اکاونٹ میں جو رقم تھی، اُسے وہ ادھر رہائش اور دوسرے اخراجات میں خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی بہت احتیاط سے چلنے کے ضرور تھی۔ اور اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو کسی بھی خرچ سے پہلے اُسے سوچنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ

شانے کا عادی تھا۔ اور کبھی حساب بھی نہیں رکھا۔ جیسی اب اُسے مشکل پیش آرہی تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی رقم میں وہ کوئی چھوٹا موٹا گھر خریدے یا کا دو بار شروع کرے اور کاروبار کا بھی اُسے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

بالآخر اُسے اپنا مسئلہ احمد حسن کے سامنے رکھنا پڑا۔ گوکہ اُس نے آتے ہی اُسے بتا دیا تھا کہ اپنے والدین کے ناراضی ہو کر سب کو فچوڑ آیا ہے اور سب بھی بتایا البتہ اپنی شادی چھپا گیا تھا۔ لیکن صرف اس کا احساس برتری تھا۔ جسے وہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ کسی ایک پہلے سے کم وزن نظر آئے۔
 ”میں اپنی زندگی خود بناؤں گا۔ اسیہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ گوکہ میرے اور بھی بہت دوست ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے۔ اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں احمد حسن تم کو پورے

لہجے سے میرا ساتھ دو گے۔“

اُس نے احمد حسن سے کہا تو جواب میں وہ لولا تھا۔
 ”تم نے میرا مان بٹھا دیا ہے شاہ سکندر! میں ہر مل تمہارے ساتھ ہوں۔“

”میں تمہیں زیادہ تنگ نہیں کروں گا۔“ اُس نے کہا۔
 اور پھر دو تین روز وہ خود ہی سوچتا رہا کہ پہلے اُسے کیا کرنا چاہیے۔ جب سمجھ میں نہیں آیا تب

احمد حسن کو بلا لیا۔ اور اپنی چیک بک اُس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔
 ”میرے پاس کل اتنی رقم ہے۔ جبکہ فوری حل طلب مسئلے دو ہیں گھر اور کاروبار۔ بتاؤ اتنی رقم

میں یہ دونوں مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔“
 احمد حسن اُس کی چیک بک کا جائزہ لے کر سوچ میں پڑ گیا اور غالباً فوری طور پر اُس کی جھ میں بھی

ہیں آیا جب کہنے لگا۔
 ”اتنی جلد ہی کیا ہے بار! اطمینان سے سوچیں گے۔“

”نہیں! احمد! میرے پاس اطمینان سے سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ادھر اسیہ انتظار میں ہوگی اور میں

اُس کے پاس آئی وقت جاؤں گا تب میری اپنی کوئی حیثیت ہوگی!“
 اُس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ احمد حسن کو پھر سے سوچنا پڑا اور کتنی دیر بعد اُسے دیکھ کر مسکرایا کہ

”وہ فوراً پوچھنے لگا۔“
 ”کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ فی الحال گھر خریدنے کے بجائے کوئی اپارٹمنٹ کرائے پر

لے لو، اُس میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ باقی رقم سے کوئی بزنس شروع کر دو۔“
 احمد حسن دونوں مسئلوں کا۔ فوری حل بنا کر پوچھنے لگا۔

”کوئی بزنس سے تمہارے ذہن میں یاد بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔“
 ”مل کر سوچیں گے۔“ وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی اس بات کی غماز تھی کہ اُسے احمد حسن کا مشورہ پسند

آتا تھا۔

پھر اگلے کئی دن اُسے گھر دیکھنے میں لگ گئے۔ اب تک اُس کا جو معیار زندگی رہا تھا ظاہر

ہے وہ اکیلم سے اُس سے بہت نیچے نہیں آ سکتا تھا۔ اور اُس معیار کو برقرار رکھنا بھی مشکل تھا۔ اس لیے اُس نے ایک اچھے صاف ستھرے علاقے میں تین کمروں کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ پھر اُسے

یکورٹ کرنے میں گوکہ اپنے حساب سے اُس نے بہت بل سے کام لیا تھا۔ پھر بھی بہت خوبصورت

نہیں لگتا۔
 اُس کے بعد لڑیں اطمینان سے ہو گیا۔ جسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہوں۔ یا شاید اُس کے نزدیک مل مسئلہ ہی تھا۔ اور روزگار کی کیونکہ پہلے کبھی اُسے فکر نہیں کرنی پڑی تھی اُس لیے لا شعوری طور پر وہ

کچھ مطمئن سا تھا، جیسے یہ مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔ یا ہو سکتا ہے اتنی بڑی جائیداد میں اُسے اپنے حقے کا خیال ہو۔

بہر حال گھر کی سنگت کرتے ہی وہ آسیم سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ لیکن وہ اس طرح نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ اُس کے کہہ آیا تھا کہ اپنے گھر والوں کو لے کر آئے گا اور اب گھر والے اپنے حقے کو اُس نے احمد حسن اُس کی والدہ اور بہن نانکھ کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ نانکھ کو میں اترتی تھی اس لیے بڑے شوق سے تیار ہو گئی اور تیار تو اُس کی اتنی بھی ہو گئی تھیں لیکن انہیں دھڑکا لگا ہوا تھا۔

”بٹا! متارے ماں باپ ہم سے ناراض نہیں ہوں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہا شادی کرادی یا“

”آپ سے کیوں ناراض ہوں گے آنٹی! آپ اپنی مرضی سے تو نہیں جا رہی ہیں۔ میں آپ کو لے جا رہا ہوں۔ اور البتہ بھی نہیں ہے کہ میرے والدین کو ضرر ہی نہیں انہیں سب پتا ہے۔ بس یہ ہے وہ یہاں میری شادی کے حق میں نہیں ہیں۔ اسی لیے تو میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرے گھر والے زیادہ عرصہ میری دوری نہیں سہہ سکیں گے، میرے پاس آنے کے لیے انہیں ہر چاہیے ہوگا۔ اور وہ یہاں ظاہر ہے کہ ان کی بہو ہوئی“

”اُس نے بڑے اعتماد سے انہیں یقین اور اطمینان دلایا۔ حالانکہ اُسے ایک فی صد بھی یقین نہ تھا۔

”ہاں، ماں باپ کو اولاد کی خوشی کے سامنے جھکتا ہی پڑتا ہے“ آنٹی نے کہا تو وہ اندر ہوا اطمینان سے ہر کر بولا۔

”جی۔ اور ان لوگوں سے بھی آپ نے یہی کہنا ہے۔“

”نہیں نہیں کہیں سکندر بھائی! ان کے سامنے میں آپ کی وہ تقریفیں کروں گی وہ تقریفیں کے جوش کے سامنے اس نے بند باندھ دیا۔

”بس۔ تم براہ مہربانی خاموش ہی رہنا“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تم خاموش اچھی لگتی ہو۔“ اُس نے مذاق میں ڈالا پھر احمد حسن کو چلنے کا اشارہ کیا تو گھاڑی کی چابی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

شام اتر رہی تھی جب اُس نے آسیم کے گھر میں قدم رکھا۔ حسب سابق آبا جی بڑی خندہ پہ سے اُس سے ملنے پھر اُس کے ساتھ اور لوگوں کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھکے تو وہ فوراً تعارف کروانا ہوا بولا۔

”یہ میرے عزیز ہیں احمد حسن یہ ان کی والدہ اور سسر۔“

”اچھا۔ اچھا۔ بہت خوش ہوں، بھئی، بھئی، آپ لوگ۔“

آبا جی پر قدرے بولکھلا ہٹ سوار ہو گئی تھی، انہیں بٹھا کر فوراً کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ آئے تو عدیل کے ساتھ تھے اور پیچھے اماں بھی۔ ایک بار پھر تعارف ہوا اور جب اماں جی پیچھیں تو بولیں۔

”آپ شاہ پور سے آئی ہیں؟“ پہلا سوال ہی غیر متوقع تھا۔ آنٹی نے بے اختیار شاہ سکندر کو دیکھا لیکن اس سے پہلے نانکھ بول پڑی۔

”نہیں! ہم لوگ یہیں رہتے ہیں اور اب تو سکندر بھائی بھی یہیں آگئے ہیں۔“

”سنوں! کجا بیٹیوں پر ہی تو بس چلتا ہے۔ اور محبت بھی بہت کرتی ہیں! اماں جی نے پیار سے نانکھ کو دیکھتے ہوئے کہا پھر بول چھنے لگیں۔

”پر تھی تو بیٹی!“

”جی۔ اب میڈیکل کے دوسرے سال میں گئی ہوں۔“

”ماشاء اللہ۔“

”آپ کی بیٹی بھی تو غالباً! آنٹی آسیم کے بارے میں پوچھتے ہوئے قدرے جھجک گئیں۔

”جی، میری بیٹی کا بس آخری امتحان تھا! اماں جی سادہ غورث تھیں، اپنے انداز میں جواب دیا۔

”نانکھ شوق سے پوچھنے لگی۔

”کہاں ہیں وہ۔ میں مل سکتی ہوں اُن سے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں! اندر چل جاؤ یا میں بلاتی ہوں اُسے۔“

”نہیں! میں جا رہی ہوں۔“

نانکھ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اور کچھ شوخ نظروں سے شاہ سکندر کو دیکھا۔ لیکن وہ عدیل سے کوئی بات نہ ہاتھا۔ تب وہ احمد حسن کو کچھ اشارہ کر کے ڈرائیونگ روم سے نکل کر برآمدے تک آگئی۔ اس کے بعد کچھ نہیں آیا کہاں جاتے۔ سامنے کوئی نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ کچھ شش و پنج میں پڑ گئی۔ تبھی نیچے چھتوں کی آواز سن کر پیٹی کو عدیل کو دیکھ کر قدرے نروس ہو گئی۔ وہ غالباً چائے وغیرہ کا بنے آرہے تھے۔ رُک کر پوچھنے لگے۔

”آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟“

”وہ۔ مجھے آسیم باجی کے پاس جانا ہے!“ اُس نے کہا تو عدیل آئیے کہہ کر آگے چل پڑے۔ وہ ڈرائیونگ کے پیچھے چل پڑی۔ اور آسیم کے کمرے میں داخل ہوئی تو عدیل بہن کو غافل بہت کرتے ہوئے بولے۔

”آسیم! یہ شاہ سکندر کی سسر ہیں۔“

آسیم کا دل تیار کی بڑے زور سے دھڑکا اور چہرے پر ایسے رنگ اترے جنہیں عدیل نے رنگ کر دیکھا پھر قصداً نظریں جھرا کر کمرے سے نکل گئے۔

”اٹ! مجھے آپ سے ملنے کا آتنا شوق تھا۔“

عدیل کے جاستے ہی نانکھ نے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا۔ اور بڑھ کر آسیم کے گلے لگ کر پھر پیٹی کو کہنے لگی۔

”آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔“

”شکریہ۔“ آسیم اُس کے انداز پر بے ساختہ مسکرائی۔ ”نام تو بتایا نہیں تم نے اپنا۔“

مہر النساء حیران رہی کہ شاہ سکندر کس بات پر ناراض ہو کر گیا ہے۔ کون اُسے ستانا بھی نہیں؟ بس اُسی روز جب وہ بین دن کے رہ کر آئی تھی تو بابا جان نے اُسے اپنے کمرے میں بلایا کہ آج تمہارا ایک دن ہے۔ اب یہی ہفتار گزر رہا ہے۔ یہاں کی ہر شے پر تمہارا حق ہے تو عزت و ناموس کی پاسداری فرض ہے۔ اور مجھے یقین ہے تم اپنے فرض کے کوئی بھی نہیں کرو گی۔ اور اب جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنا، شاہ سکندر مجھ سے ناراض ہو کر یہاں سے چلا گیا ہے۔ اس کی ناراضگی مجھ سے ہے تم سے نہیں۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی گیا ہے۔ تمہیں اپنے پاس بلانے کا۔ اس کے لیے تمہیں صبر سے انتظار کرنا ہے۔ کیونکہ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا۔ تب ہی تمہارے بارے میں سوچے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے غصہ اترنے پر وہ خود ہی یہاں آجائے۔ بہر حال تم کسی سے فکر نہیں کرنا۔ تمہارے ماں باپ تک یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ شاہ سکندر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ یہیں موجود ہے مجھ پر ہی ہونا اور وہ نہ سمجھتی تب بھی اُسے سمجھنا تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔ اسی خاندان کی لڑکی تھی ایسی ہی حویلی کی پروردہ جہاں پیدا ہوئے ہی لوگوں کے ہنر و فن پر قفل لگا دیے جاتے ہیں۔ حقوق و فرائض نبھانے والے بابا جان یہ قبول کئے کہ اُس کے سینے میں ایک دل بھی ہے جس پر بدقسمتی کے بہت پہلے محبت کی لے پر دھڑکنا سیکھ لیا تھا۔

کاش بابا جان شاہ سکندر کی ناراضگی کا سبب بھی بتا دیتے۔ وہ اپنے طور پر قیاس کرتے کرتے تو گئی تھی۔ پھر انتظار کے دن بھی طویل ہوئے جا رہے تھے جس سے اُس کی سوچیں نیارخ اختیار کر گئیں۔ یعنی اُس نے جو بابا جان کی بات پر یقین کر لیا تھا کہ شاہ سکندر کی ناراضگی اُس سے نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُسے اپنے پاس بلانے کا۔ تو اب اُسے لگ رہا تھا جیسے بابا جان نے اُس سے کئی کچھ ایسا ہی سہلا دیا تھا۔ ورنہ اگر نہ ہی سمجھتا تو شاہ سکندر کم از کم اُسے ضرور بتا کر جاتا۔ ایک رات کی دہن کو چھوڑ کر جانے والا۔ اُس کے ذہن میں اچانک جھکا ہوا تھا۔

”ہر جانی۔!“



”ہاں ہر جانی ہی ہو سکتا ہے۔“ مہر النساء اس خیال پر گرفت مضبوط کر کے اپنی شب عروس کے ان سوچے لگی جب شاہ سکندر اس کے پاس آیا تھا۔ اور اسے یاد آیا اس کے اندر پانے کا احساس نہیں کھوہ تھا۔ پشیمالی اور وحشت تھی۔

”یہ اچھا نہیں ہوا مہر النساء! تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔؟“

”کیا مجھ سے ہو تم اس طرح میرا دل جیت لو گی۔“

شاہ سکندر کے لہجے کی کئی اسے اب محسوس ہوئی تھی تو سارے ارادوں پر سے پردے سرکنے لگے۔ اگر وہ اپنی روایات سے بغاوت کا حوصلہ رکھتی تو اسی وقت بیچ بچ کر حویلی میں سر اٹھاتی لیکن اس کے برعکس سے سوچ رہی تھی۔

”تم نے میرے جذبوں کو پامال کر کے اچھا نہیں کیا شاہ سکندر حیات! اس کے باوجود میں تمہارا انتظار کہ یہ میری مجبوری نہیں ضد ہے۔“

اور جب ایک کمزور عورت کسی بات کو اپنی ضد بنالے تو پھر وہ اتنی کمزور نہیں رہتی۔ فوراً تو نہیں لیکر دھیرے مہر النساء کو احساس ہو گیا کہ وہ اتنی کمزور نہیں ہے بلکہ اگر چاہے تو اس حویلی کے در و دیوار ہلا بدلے میں شہر مانو کی خوشیاں چھین کر اور اس سچ پر اس نے بس کچھ دیر کو سوچ کر سر جھٹک دیا۔ اس کے اس طرح وہ شاہ سکندر سے اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے سکتی تھی۔ وہ تو اسے وہ ذمہ لگائے گی جو اس کے

نے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ شاہ سکندر کے حویلی کے کابج جان چکی ہے۔

مہر النساء نے زیادہ ہو گیا تھا اسے گئے ہوئے۔ اس دوران شہر مانو اور شاہ ہارون دو تین بار آچکے تھے۔ دونوں دوش تھے۔ شاہ ہارون نے ہر بار اس سے شاہ سکندر کا پوچھا تھا۔ اور اس نے بڑی خوبصورتی سے اسے دیکھا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہیں تھا۔ اور ابھی کہیں گیا ہے۔ یہاں تک کہ شہر مانو کو بھی معلوم نہیں بن ہی وہ اپنی مطمئن تھی ورنہ دھڑکا تو لگا رہتا کہ کہیں مہر النساء ریا ز فاش کر کے اس کی ہنسی بستی زندگی میں لگا دے۔ اس وقت بڑی شوخی سے اسے گدگداتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

پول ری مولا تو کتنی بھی میرے بھائی کو تیری پروا نہیں۔ اب یہ کیا ہے۔؟“

نہیں کس نے بتایا۔؟“ مہر النساء بے اختیار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی تو شہر مانو کھلکھلائی ہنسی کے دل۔

”بی جان نے۔“

”نہ بی بی جان کو کوئی بات چھپا نہیں سکتی۔“

”کب تک چھپا سکتی تھیں۔ خیرینا ہونا چاہیے۔ بالکل میرے بھائی جیسا۔“ شہر مانو نے اتر کر کہا تو وہ بے ہرگز نہیں۔“ پھر فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں ڈبایا تھا۔“

~~*

ت کا کھانا بناتے ہوئے اس کا دھیان مسلسل اندر راجا جی اماں جی اور بھائیوں کے درمیان ہونے والی میننگ اہوا تھا۔ یقیناً شاہ سکندر کے پو پزل پر بات ہو رہی تھی۔ اور بتا نہیں میمونہ بھابھی اپنے کمرے میں کیا کر تھیں۔ ان ہی سے تو وہ سب کے خیالات معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن جب انہیں خود ہی معلوم نہیں ہو گا تو یا بتا میں گی یہی سوچ کر اس نے چو لہا دھیم کیا اور ان کے کمرے میں آکر قدرے بھنبلا کر پوچھنے لگی۔

”یا کر رہی ہیں آپ۔؟“

”کچھ لو۔ استری کر رہی ہوں۔“ میمونہ بھابھی اپنے مخصوص لاپرواہے انداز میں بولیں تو اس نے آگے بڑھ کر کچھ لگا لگا دیا۔

”کچھ کیا۔ اب بس کریں۔“

”اے یہ بچوں کے یو نیفارم صبح انہیں اسکول جانا ہے۔“ میمونہ بھابھی کے احتجاج پر وہ انہیں خاموشی کا اشارہ نہ ہوئے آواز دیا کر بولی۔

”یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی آپ اماں جی کے کمرے میں جائیں وہاں سب جمع ہیں۔“

”سب کون۔؟“

”بڑے بھیا، خلیل بھائی، عدیل بھائی۔“

پھر۔۔؟“ میمونہ بھابھی کے سیدھے سادے انداز پر اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”اب ایک تو آپ کو ہر بات پوری تفصیل سے سمجھانی پڑتی ہے۔“

”نہیں۔ آپ بڑی غلط فہمیاں کرتی ہیں۔“ وہ فوراً ”ٹوک کر بولی“ ”میں کھڑے کھڑے جان لیں گی کہ وہاں شاہ سکندر کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔“

”وہ بات ہے۔ میں ابھی سن کر آتی ہوں۔ تم ذرا عمر کا خیال رکھنا کہیں بچپن نہ گرجائے۔“

نوز بھابھی بہت غلبت میں بات ختم کر کے چلی گئیں۔ تو اس نے گہری سانس کھینچ کر گویا شکر کا پھر عمر کو اٹھا کر سے میں لے آئی اور نیل کو اس کا خیال رکھنے کو کہا پھر کچن میں آکر دوبارہ مصروف ہوئی۔ لیکن اب اس کا ناندھ کے بجائے نیل اور عمر کی طرف تھا۔ بار بار کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دونوں کو دیکھ لیتی۔ تب ہی اندر

سے سونیا بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے احمر بھی تھا۔

”پھوپھو! احمر کو دیکھیں، میرے بال بونج رہا ہے۔“ سونیا نے اس کی ناگوں سے لپٹ کر احمر سے بچنے کی لیکن احمر کا ہاتھ اس کے بالوں تک پہنچ چکا تھا۔

”پھوپھو!“ سونیا زور سے چیختی تو وہ جو اس اچانک افتاد سے پریشان ہو گئی تھی۔ احمر کی بدتمیزی پر اسے کر پیچھے ہٹنا پھر دونوں کو ڈانٹنے لگی۔

”ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں؟“

”اس نے میری لٹو کیوں بھاڑی ہے۔“ احمر کا لہجہ بھی بس نہیں چل رہا تھا اسے کھینچ کر مارے۔

”یہ بے ایمانی کر رہا تھا۔ میری گوشت۔“

”بس خاموش۔“ وہ سختی سے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”چلو جاؤ۔ اپنے اپنے بیک ٹھیک کرو، صبح سے اُٹے۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ احمر کے روٹھے لہجے پر وہ قدرے نرم پڑ گئی۔

”کیوں۔ تم کیوں نہیں جاؤ گے۔“

”اس نے میری لٹو کیوں بھاڑی۔“

”لٹو اور آجائے گی۔ اتنی سی بات پر لڑتے نہیں ہیں۔ چلو جاؤ شاباش۔ اسی وقت اپنے میکس وغیرہ ٹھیک اس نے احمر کو پکارتے ہوئے کہا پھر آدھے میں آئی تو نیل اس سے کہنے لگا۔

”پھوپھو! میں نے اپنا بیگ ٹھیک کر لیا ہے لیکن میرا یونیفارم نہیں مل رہا۔ پتا نہیں می نے کہاں رکھا۔“ وہیں الماری میں ہو گا۔ اچھا میں خود نکال دوں گی۔“

”پھوپھو! نیل بھائی کی می کہاں چلی گئیں؟“ ایسے موقعوں پر سونیا یہ سوال ضرور کرتی تھی۔

”پتا نہیں۔“ وہ قصداً لاروائی سے کہہ کر عمر کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کی زبان میں اس سے بولے۔

”عمر بھی انکھول جائے گا لیکن ابھی تو یہ بہت ٹوٹا (چھوٹا) ہے۔“

معصوم بچہ بیمار کی زبان پر کھلکھلائے لگا تو نیل ”احمر اور سونیا کے چروں پر بھی مسکراہٹیں دوڑ گئیں

شوق سے اسے دیکھنے لگے۔

پھر سب سے پہلے بڑے بھیا۔ اماں جی کے کمرے سے نکل کر آئے اور ان سب پر ایک سرسری

سیدھے اوپر چلے گئے۔ ان کے بعد خلیل بھائی آئے تو اسے سب بچوں میں گھرے دیکھ کر کہنے لگے۔

”میمونہ تو فاریغ ہو چکی ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتیں، بچوں کو بھی تمہارے سر پر چھوڑ دیتی ہیں۔“

”یہ کس کی تعریف، ہو رہی ہے۔“ میمونہ بھابھی پیچھے سے سنتی ہوئی آ گئیں۔

”آپ کی۔“ وہ بے ساختہ مسکرا کر بولی تو میمونہ بھابھی نے ناک سیکڑ کر شوہر کو دیکھا پھر اس سے کہ

”یہ میری ایسی ہی تعریف کر سکتے ہیں۔“

”ایسی یا ویسی۔ تعریف ہی کی سے ٹال۔“ خلیل بھائی مسکراہٹ ہونٹوں میں چھپا کر بولے۔

”ارے آپ کیا تعریف کریں گے میری۔ میں تو۔۔۔“ شابانہ انداز میں کہتے ہوئے میمونہ بھابھی کو پیچھے سے عدل بھائی ان کی بات پوری کرتے ہوئے بولے۔

”سر! تعریف ہیں، چلیے اسی بات پر کھانا لگا دیں اگر تیار ہے تو۔۔۔“

”جی بھائی! کھانا تیار ہے۔ میں لگاتی ہوں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اور کچن کی طرف جاتے جاتے

خلیل بھائی کہہ رہے تھے۔

”جب آسید چلی جائے گی تب کیا روگی۔“

پتا نہیں میمونہ بھابھی نے کیا جواب دیا۔ وہ سن نہیں سنی۔ کوشش بھی نہیں کی۔ اور کچن میں آکر گئی۔

پھر کھانے کے بعد نیل نے اسے اپنا یونیفارم یاد دلایا تو وہ اسی وقت اوپر چلی آئی۔ بڑے بھیا کھلی ہمت پر اکیلے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ جانے انہوں نے خود کو اتنا تنہا کیوں کر لیا تھا۔ اس نے سوچا وہیں واپس لپٹ جائے لیکن جس کام سے آئی تھی، وہ بھی ضروری تھا۔ کچھ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ بڑے نے اسے دیکھ لیا اور پکار کر بولے۔

”آسید! کیا بات ہے بیٹا۔؟“

”دوست! وہ قدم بڑھا کر روشنی میں آکر بولی، ”میں نیل کا یونیفارم لینے آئی تھی۔ صبح اسے اسکول جانا ہے۔“

”مکمل کھل گئے؟“ انہوں نے قدرے عجیب سے پوچھا۔

”جی مکمل سے کھل رہے ہیں۔“ اس نے بتایا اور ان کے خاموش رہنے پر پوچھا۔

”میں اس کا یونیفارم لے لوں۔۔۔؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ اپنے خیال سے نکل کر بولے۔ ”دیکھو وارڈ روپ ہی میں ہو گا۔ اور اس کے شوز وغیرہ۔“

”جی میں لے لیتی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد نیل کی ساری چیزیں لے کر نکلی تو بڑے بھیا موجود نہیں تھے۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ وہ یونی دیوار کے پاس رک کر باہر دیکھنے لگی ابھی عقب سے

”آواز سنائی دی۔“

”مل گئے کپڑے۔۔۔“

”جی۔!“ وہ نہ صرف چونکی بلکہ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عجیب سا خوف محسوس ہوا جیسے بھیا انسان نہیں جن ہوں اور نہ غائب ہوئے اور پھر حاضر۔ وہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے پتلی

رکتے دل کے ساتھ نیچے آئی تو میمونہ بھابھی چائے لیے اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں۔؟“

وہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی۔ نیل کا بیگ ریک پر رکھا پھر الماری کھول کر کپڑے ڈنگر میں اٹکا ہے۔ اس کے ران کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں اوپر گئی تھی۔ نیل کی چیزیں لینے۔“ پھر ایک دم ان کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ”مجھے بڑے بھیا سے بہت لگا۔ اتنے پر سرار لگ رہے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے، جلدی ان کی شادی کرانی پڑے گی۔“ میمونہ بھابھی ہنستے ہوئے بولیں تو وہ ان کے ہاتھ

ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ کو تو ہر وقت مذاق سوچتا ہے۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تم لوگوں کو میری ہر بات مذاق لگتی ہے۔ حالانکہ میں بہت کم مذاق کرتی ہوں۔“ میمونہ

بھابھی ایک دم سنجیدہ ہو کر بولیں اور اس بار اسے ہنسی آگئی۔

”واقعی؟“

”جناں! ذرا بتاؤ بڑے بھیا کی شادی میں مذاق کی کیا بات ہے، ساری زندگی انہیں ایسے تو نہیں رہتا۔ ماشاء اللہ ان جہان ہیں۔ دوسری بیوی آئے گی تو پہلی کا زخم بھرے گا۔ اور وہ یوں پر سرار نظر نہیں آئیں گے۔“

میمونہ بھابھی باقاعدہ اسے ٹیپ کر دینے بیٹھ گئیں اور کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ ”جی! حیرت سے انہیں

بے ضرور ہے کہ میری بات میں مزاح کا رنگ شامل ہوتا ہے لیکن وہ مذاق نہیں ہوتا۔ سمجھیں تم یا مزید

نہیں! اس۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔“ وہ فوراً ”بول پڑی۔“

”ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔“ میمونہ بھابھی اٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے پہلے بے

”اصل بات تو بتائیں کیا فیصلہ ہوا۔؟“

”اتنی جلدی فیصلے نہیں ہوتے ابھی تو سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے بس وہی بار والدین کو اتنا چاہیے یا اگر وہ بعد میں بھی نہیں مانے تو دیکھو وغیرہ۔“ میمونہ بھائی نے کہا بولی۔

”یہ خدشہ تو مجھے بھی ہے۔“

”سب کو بے سوائے عدیل کے نہ صرف شاہ سکندر کی پر زور حمایت بلکہ مسلسل سبہ کو شش کرنا رہا۔“

”عدیل بھائی کیا کہہ رہے تھے۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا تو میمونہ بھائی مسکرا کر بولیں ”وہی سب جو میں کہنا چاہتی تھی۔ یعنی اول تو شاہ سکندر کے والدین کی ناراضگی زیادہ دوسری صورت میں کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا کیونکہ شاہ سکندر ریمائٹ سیٹ ہو رہا ہے لکھی ہے۔ دونوں اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

میمونہ بھائی نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر کہنے لگیں۔

”اس کے علاوہ جو ایک بات عدیل نے کہی اور جسے سن کر سب خاموش ہو گئے۔ وہ اس ط میں نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”کون سی بات۔؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آیا۔ اور میمونہ بھائی جیسے خود بھی حیران اسی حیرت سے بولیں۔

”کہہ رہا تھا۔ ان ساری باتوں سے زیادہ ہمیں آسیہ کی پسند اور خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔ ار چلا کہ تمہاری پسند اور خوشی شاہ سکندر حیات ہے۔“

”میرے خدا! اس کا دل رکنے لگا۔ اس نے تو صرف میمونہ بھائی اور سہیا بھائی کو شرع عدیل بھائی نے کیسے جان لیا اور سب کے سامنے کہہ بھی دیا۔ وہ کیسے سامنا کرے گی ماں جی اور ا

وہ احمد حسن کا انتظار کرتے کرتے اب بالکلونی میں آکر باقاعدہ اس کی راہ دیکھنے لگا تھا۔ دوپہر یہ یہی کہا تھا کہ آفس کے بعد وہ سیدھا اس کے پاس آئے گا اور اب چھن کر رہے تھے۔ اسے تشویش احمد حسن نہ تو لاپرواہ اور غیر ذمہ دار تھا اور نہ بھولنے والا۔ اگر کسی کام میں الجھ گیا ہوتا تب بھی اسے بتاتا۔ اس نے سوچا اسے خود ہی اس کے گھر فون کر کے معلوم کرنا چاہیے شاید وہ بھولنے کی غلطی اس سوچ کے ساتھ ہی وہ اندر آیا تو پہلے تمام کمروں کی لائٹیں ان میں پھر احمد حسن کے نمبر کال نیل بجنے لگی۔ اس نے فوراً فون رکھ دیا اور آکر دروازہ کھولا تو سامنے عدیل کو دیکھ کر وہ پتا ہوا یا خوش۔ کچھ لمبی جلیبی کیفیت تھیں جو غالباً ظاہر بھی ہو رہی تھیں جب ہی عدیل پوچھنے لگے ”کیا میری آمد غیر متوقع ہے۔؟“

”نہیں آئیے پلیز۔“ اس نے فوراً ”سنبھل کر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں راستہ انہوں نے ایک طائرانہ نظر سے سارے گھر کا جائزہ لیا پھر قصداً بے نیاز سے ہو کر کہنے لگے۔

”دوسرے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا چلوں۔؟ سب تو نہیں کیا آپ کو۔؟“

”بالکل نہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں کیا نہیں گے چائے یا۔“ شاہ سکندر کو حقیقتاً ”عذب“ ایک گونہ اطمینان دے گئی تھی۔

”چائے کون بنائے گا۔؟“ عدیل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”میں خود۔“

”چلیں پھر کسی وقت خاص طور سے آپ کے ہاتھ کی چائے پینے آجاؤں گا۔“ عدیل نے ایک

منع کر دیا تو وہ پوچھنے لگا۔

”اس وقت کیوں نہیں۔؟“

”اصل میں میں ابھی چائے کی کر آ رہا ہوں۔ البتہ سگریٹ۔“

عدیل نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے سگریٹ نکالنی چاہی، لیکن اس سے پہلے ہی اس نے پیکٹ ان کی طرف

عائزہ۔

”تھیں یو۔“ عدیل ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگے تب ہی نیل کی آواز پر وہ ابھکسیو زی کہہ کر دروازہ

بولنے چلا گیا۔ واپس آیا تو احمد حسن ساتھ تھا۔ وہیں سے اپنے دیر سے آنے کا سبب بتاتا ہوا آ رہا تھا جب عدیل پر

برزی تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

”بڑی خوش ہوئی آپ سے دوبارہ مل کر۔ اور اب تو اکثر ملاقات رہے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ عدیل اپنی بے ساختگی پر خود ہی جزبہ ہو کر رہ گئے جبکہ احمد حسن نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ جلدی

ہے بولا۔

”تم عدیل صاحب کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لاتا ہوں۔“

”خدا کے لیے میرے لیے مت لانا۔“ احمد حسن اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”تمہاری میں زہر گھول کر دے

میں شوق سے پی لوں گا لیکن تمہاری چائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ اس نے بری طرح احمد حسن کو گھور کر عدیل کی موجودگی کا احساس دلایا۔ تو وہ اپنی

ت سنبھالتا ہوا بولا۔

”میرا مطلب ہے تمہاری چائے اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ ایک کپ سے دل نہیں بھرتا۔ اور تین چار کپ پینے

کے لیے میرے پاس ناگم نہیں ہے۔“

عدیل بمشکل اپنی ہنسی روک پائے۔

”چلو پھر کبھی وقت فرصت سے آنا۔ تب تمہیں۔“

”ہاں ہاں پھر کبھی وقت۔“ احمد حسن جلدی سے بول پڑا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس

نہ تو تم اپنے کام کی بات سن لو۔ میں تمہارے لیے شوروم دیکھ آیا ہوں۔ تم کل گیارہ بجے میرے آفس آ جانا تو

بڈھرتے تمہاری ملاقات کرادوں گا۔ باقی معاملات اس کے ساتھ تم خود طے کر لیتا۔“

”اچھی بات ہے۔ ویسے شوروم میں کتنی گاڑیاں تھیں۔؟“

اس نے ہائی بھرتے ہوئے پوچھا تو احمد حسن ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے میں چار یا ہو سکتا ہے۔“

”خیر کل دیکھ لیں گے۔“ اس نے عدیل کا خیال کر کے اس موضوع کو یس روک دیا۔ تو احمد حسن بھی سمجھ کر

ہٹ کر ہوا۔

”مجھے اجازت دو۔ کل ملاقات ہوگی۔“ پھر عدیل کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”اوکے عدیل بھائی! آپ سے تو

شاء اللہ ملاقات رہے گی۔“

”گم۔!“ اس بار عدیل بس اس قدر کہہ سکے۔

پھر جب وہ احمد حسن کو رخصت کر کے دوبارہ آکر بیٹھا تو عدیل اس سے کہنے لگے۔

”اے اچھے بڑا اس کا انتخاب کیا ہے۔ ابتدا میں تھوڑی مشکل تو ہوگی، لیکن جلدی سیٹ ہو جائیں گے۔“

”میں بھی جلدی سیٹ ہونا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے اختیار کہا تو جواباً ”عدیل کا جملہ بھی بے ساختہ تھا۔

”تاکہ چائے بنانے سے جان چھوٹے۔“

وہ قدرے نجل سا ہو کر بس پڑا۔ تو عدیل نے بغور اسے دیکھا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اصل موضوع چھیڑتے

سے کہنے لگے۔

”آپ جانتے ہیں شاہ سکندر! ہماری ایک بی بی بہن ہے۔ اچھی تربیت کے ساتھ ہم نے اسے بہترین اور آئندہ بھی اس کے لیے بہتری کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کے لیے آپ ہمیں کیا ضمانت دیں گے؟“

شاہ سکندر کو غالباً ”امید نہیں تھی کہ اس سے براہ راست بھی بات ہو سکتی ہے۔ جب ہی اندر ہی پریشان ہو گیا لیکن بظاہر سکون سے ان کی بات سنی پھر پوچھنے لگا۔

”آپ کیسی ضمانت چاہتے ہیں۔ انی میں شخصی مالی یا۔۔۔“ عدیل کو نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اس ادھوری چھوڑی اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد عدیل کہنے لگے۔

”مجھے صرف اپنی بہن کی خوشیوں کی ضمانت چاہیے۔ اور خوشیاں ان ضمانتوں کی مرہون منت نمبر جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہیں۔ ساری عمر بندہ صرف چھاؤں میں نہیں صرف دھوپ میں۔ دھوپ چھاؤں کے شگم سے ہی زندگی کا حسن نکھرتا ہے۔

جہاں تک شخصی ضمانت کی بات ہے تو اپنی ضمانت آپ خود ہیں۔ دوسرے یہاں کوئی کاروبار نہیں ہو آپ سے مالی ضمانت طلب کروں۔ شادی ایک مقدس بندھن ہے اور مجھے اس بندھن کی مضبوطی و پائیداری یقین چاہیے۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ کا گھربار، دھن دولت چھوڑ آنا کوئی معنی نہیں رکھتا اکثر انسان میں ایسے فیصلے کر گزرتا ہے لیکن بعد میں پچھتاوے صرف عورت کے حصے میں آتے ہیں۔“

عدیل زرا دیر کو خاموش ہوئے تھے کہ وہ بول پڑا۔

”میرا فیصلہ جذباتی نہیں ہے نہ ہی میں اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں لیکن یہ طے ہے کہ اسی وقت جاؤں گا جب میری بیوی کو اس گھر میں وہی مقام دینے کا اعلان ہو گا جو اس گھر کی دوسری بیویوں کا رہی بندھن کی مضبوطی و پائیداری کی بات تو اس کے لیے میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ لکھ کر دو زبان پر بھروسہ کر لیں گے آپ۔“

آخر میں وہ بڑی بے تاب نظروں سے انہیں دیکھنے لگا جیسے فوراً ”جواب سننا چاہتا ہو۔ اور اس بل عدیل کے جذبوں کی سچائیوں کا نہ صرف اندازہ ہوا بلکہ ایمان بھی لانا پڑا تو قدرے توقف سے مسکرا کر بولے تھے

”مجھے یقین مل گیا ہے۔“

~~*

وہ کتنی دیر سے نالکھ کی خوشامد کر رہا تھا کہ فون پر آسیم کو بلا دے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن نا کے نہیں دے رہی تھی۔ مقصد محض اسے تنگ کرنا تھا۔ اور احمد حسن نے پہلے تو نالکھ کا ساتھ دیا پھر کھاتے ہوئے بولا۔

”بے چارے کو اس کی آواز سنوا دو نالکھ! اور نہ رات بھر جاگتا رہے گا۔“

”اچھا ہے جاگتے رہیں۔“ نالکھ نے لاپرواہی سے کہا تو وہ احمد حسن کو دیکھ کر بولا۔

”یہ نہیں ہائے گی۔“

”تو یا ر! تم خود بڑی کر لوں۔ کیا پتا قسمت باوری کر جائے اور ادھر سے وہی رہیو کریں۔“

احمد حسن نے کچھ جھنجھلا کر مشورہ دیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”او کے میں چلتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ احمد حسن سمجھا۔ وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔“

”نہیں بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میں خواہ مخواہ اتنی دیر سے اس لڑکی کی خوشامد کر رہا ہوں۔“ اس نے

کر کہا۔

”تو جا کہاں رہے ہو۔؟“

”تمہارے مشورے پر عمل کرنے یعنی گھر بیٹھ کر اطمینان سے بڑائی کروں گا۔“

”وہ ملیں گی نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ پر نالکھ نے جل کر کہا تو وہ اسے مزید چڑا کر بولا۔

”تو جاکر اس کی بات ہے۔ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ نہ میری پروا ہے۔“

”گردانہ ہوتی تو آتی کیوں۔“
وہ گمہ کریشے سے باہر دیکھنے لگی تو اسے متوجہ کرنے کی خاطر وہ پوری اسپینڈ سے گاڑی دوڑانے لگا۔ لیکن اس پر ترکیب کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ وہ بڑے سکون سے بیٹھی رہی تھی۔

”مان لیا تمہیں خود پر بڑا اختیار ہے۔“ ریٹورنٹ کے خوبصورت ماحول میں بیٹھتے ہی وہ اس کے کمال پر سراہ کر کہنے لگا۔ ”اچھی بات ہے لیکن پلیز تھوڑی دیر کے لیے خود کو ان دیکھی بندشوں سے آزاد کر دو۔ میں تمہیں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا۔“ وہ قصداً مسکراتی تو کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد وہ پوچھنے لگا ”تمہیں بتانا ہے ابھی دو تین روز پہلے عدیل بھائی میرے پاس آئے تھے۔“

”اچھا! اسے جیسے حیرت ہوئی۔“
”ہوں۔“ وہ پرسوج انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ ”تمہارے گھ والوں کے خدشات اپنی جگہ درست ہیں بھی شخص ایسے حالات میں بہت سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گا۔ گوکہ عدیل بھائی میرے پاس سے بہت متاثر کر گئے تھے پھر بھی میں خاصا پریشان سا ہوں۔“

”کیوں۔؟“ وہ اسے الجھتے دیکھ رہی تھی۔
”چاہتے ہیں۔“ اس نے ذرا سے کندھے اچکا کر گویا اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو وہ فوراً ”کچھ نہیں بولی۔ نہ طرف مچھنچ کر چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی“ پھر ایک کپ اس کے سامنے رکھا اور اپنے کپ میں چٹچ چلاتے بولی۔

”کہا مجھے ہمیشہ آپ ہی کی بات دہرائی پڑے گی۔ کہ میرے دل میں آپ اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جا سے پہلے کوئی تھانہ آئندہ کوئی ہو گا۔“

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اور وہ یونہی سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔
”جس یقین سے آپ نے کہا تھا۔ اسے ٹوٹا نہیں چاہئے شاہ سکندر اگر اسی یقین پر میں نے اپنے دل کا آپ کے نام کا پہلا بیج بویا تھا اور پھر ہر روز ایک بیج اس یادگار کے نام کرتی گی۔ اب تو آپ شمار بھی نہیں کہ میرے دل کی زمین پر یہاں سے وہاں تک کتنے پھول کھلے ہیں۔ جن کی ہر پتی پر آپ کا نام ہے اور اس پھول بستی کو اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے میری زندگی سے چارہ ہو۔“

شاہ سکندر کو اپنے دل سے بوجھ سرکنا محسوس ہوا اور ہونٹوں پر ٹھیکتی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی تھی۔

~~*

اس نے اماں جی سے تو کالج میں کسی کام کا بہانہ کیا تھا لیکن میمونہ بھابی کو بتا کر گئی تھی کہ وہ شاہ سکندر بلانے پر جاری ہے۔ اس لیے دیر ہو جانے پر بھی اطمینان سے تھی کہ میمونہ بھابی نے اماں جی کا ہدیان لگا دیا ہو گا اور وہی ہوا۔ اماں جی نے اس سے پوچھا ہی نہیں کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ اننا کہنے لگیں۔
”پتا نہیں کب تمہاری کالج سے جان چھوٹے گی۔ اتنا بلکان ہوئی ہو۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔“
”آپ نے کھا لیا۔؟“ اس نے میمونہ بھابی کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر پوچھا۔

”ہاں میں نے تو کھا لیا البتہ دلن بچوں کا انتظار کر رہی ہے۔“
”کہا مطلب، بچے ابھی تک اسکول سے نہیں لوٹے؟“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ ”وہ کیوں بھابی ابھی تک آئے کیوں نہیں۔“

”پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ راتے میں کبیں دین خراب ہو گئی ہوگی۔“ میمونہ بھابی نے پہلے لا علمی کا قیاس کیا، جس پر وہ پوچھنے لگی۔
”پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔؟“

”مگر ماں جی سے پوچھو، ہفتے میں ایک بار تو ضرور ان کی دین خراب ہوتی ہے۔“
”تو آپ ان کے اسکول جا کر بات کریں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے، بچے بیچارے پریشان ہو جاتے ہوں گے میں نے سنا۔“

”اے۔؟“ وہ چیخ ماری۔ ”کہاں ہے نیل۔؟“
”اے۔؟“ پوچھ چھو۔ ”پھر کمرے میں اگر پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔“ وہ ناں نیل بھائی وہ ہمارے ساتھ ہیں آئے۔“

”کیا؟“ وہ چیخ ماری۔ ”کہاں ہے نیل۔؟“
”پتا نہیں۔“ اس کی چیخ پر سونا سسم کی اور میمونہ بھابی کی ٹانگوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی ”تو اچانک کسی نیل کے تحت اس نے کیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ باہر ڈرائیور احمد سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا وہ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔“

”نیل کہاں ہے۔۔۔؟“
”پتا نہیں بی بی! اسکول میں تو نہیں ہے۔ میں نے سارا اسکول چھان مارا۔“ ڈرائیور نے حد درجہ عاجزی دکھائی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہنوز تیکھے لہجے میں بولی۔

”اسکول میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے۔ فتح تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا۔“
”صبح تو ہی اسکول میں ہی چھوڑا تھا۔ آپ ان بچوں سے پوچھ لیں۔“
”تم نے پر پہل سے معلوم کیا۔؟“ اس کے جارحانہ انداز میں اندرونی اضطراب بھی شامل ہو گیا تھا۔
”جی بی بی۔“ نیل کی مس کمرے رہی تھیں کہ ٹھیک ہی وہ ان کے سامنے نکلا ہے۔ لیکن بی بی! وہ دین میں آکر میں بٹھاتا ہوں کس طرف۔“

ڈرائیور اپنی غفلت پر سخت پشیمان اور گھبرایا ہوا تھا لیکن وہ اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھی تبھی کیٹ کے اندر سے اماں جی نے اسے پکار لیا۔

”اماں جی! پوچھیں اس سے نیل کو کہاں چھوڑا ہے۔“
اندر آتے ہی وہ بے قابو ہو گئی تو میمونہ بھابی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئیں اور زبردستی بٹھاتے ہوئے بولیں۔

”آجائے گا نیل۔ تم پہلے اپنے حواسوں پر قابو پاؤ پھر سوچو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔“ میمونہ بھابی نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی پھر فوراً ”نئی میں سر ہلا کر بولی۔“
”وہ ابھی اتنا برا نہیں ہوا کہ خود کہیں جاسکے۔“

”لے جاتا تو جا سکتا ہے اور ایک ہی ہستی لے جا سکتی ہے۔“ میمونہ بھابی کا انداز سوچنا ہوا تھا۔
”نیل بھابی۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور بے حد خاموش نظروں سے وہ دیکھنا میمونہ بھابی کو بے یار و مددگار دیکھ رہی تھی لیکن دروازے سے داخل ہوتی اماں جی سامنے آ گئیں۔ بے حد مضطرب جیسے ابھی ڈھکے جاس گئی۔
”اماں جی۔“ وہ سارے حوصلے بجا کر کے ابھی اور برہہ کر اماں جی کو قہام لیا پھر انہیں بٹھا کر کہنے لگی۔ ”پریشانی نہایت نہیں ہے اماں جی! میں ابھی عدیل بھائی کو فون کرتی ہوں۔ وہ آتے ہوئے نیل کو لیتے آئیں گے۔“

”کہاں سے لے آئے گا۔۔۔؟“
”میں اس نے پتا نہ کر میمونہ بھابی کو دیکھا تو وہ اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے بولیں۔“
”تم جاؤ کھانا کھاؤ! احمد اور سونا کو بھی کھلاؤ۔“

پھر انہوں نے اسے ”میں سنبھال لوں گی۔“ کا اشارہ کیا تب کچن میں آکر اس نے کھانا نکالا لیکن اس کا اپنا بالکل سا نہیں چاہا کھانے کو۔ احمد اور سونا کو آرام سے کھانے کی تاکید کرتی ہوئی لابی میں آکر سوچنے لگی کہ کسے فون کر کے عدیل بھائی یا بڑے بھیا کو۔

”جیت بھوک لگی ہے۔“ میمونہ بھابھی آتے ہی شروع ہو گئیں۔
 ”ہاتھ تو دھو لیں اور چلیں ادھر برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ٹرے اٹھانی چاہی لیکن میمونہ بھابھی روکتے ہوئے بولیں۔

”بس ہمیں ٹھیک ہے تم بیٹھنا چاہو تو اسٹول کھینچ لو۔“
 ”اے! نہیں کب سے بھوک لگی۔“ اس نے اسٹول کھینچ کر انہیں بٹھادیا اور خود کھڑے کھڑے کھانے لگی۔
 ”نبیل! کھلادیا۔؟“ میمونہ بھابھی کو اچانک خیال آیا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔
 ”نہیں۔ میں ابھی اس کے پاس نہیں گئی۔ اور کھانا تو اسے نبیلہ بھابھی نے کھلادیا ہو گا۔“

”وہ تمہاری بھابیوں کی لسٹ سے خارج ہو چکی ہیں۔“ میمونہ بھابھی نے احساس دلایا تو وہ دکھ سے بولی۔
 ”برسوں کی عادت چند دن میں کیسے چھوٹ جائے گی پھر میں انہیں صرف نبیلہ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ویسے میرا خیال ہے بھابھی کتنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“
 آخر میں اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا پھر ہاتھ دھو کے کیتلی اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”چائے پیس گی آپ۔؟“

”بارہی ہو تو پی لوں گی۔“ میمونہ بھابھی لقیہ روٹی دسترخوان میں لپیٹتی ہوئی بولیں پھر ٹرے ایک طرف رکھ کر دوبارہ بیٹھیں تو اپنے مخصوص انداز میں شروع ہو گئیں۔
 ”جان میں جان آگئی۔ دماغ بھی فریش ہو گیا ہے۔ اب مزہ آئے گا تم سے بات کرنے میں۔ بھوک میں تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ خیر اب تم جلدی سے بتاؤ کیا باتیں ہوئیں شاہ سکندر سے۔۔۔؟“
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ وہ ان کے انداز پر ہنستے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ وہ جو آج اماں جی اور بابا جی اپنی منظوری دینے کے لیے شاہ سکندر کے عزیزوں کو بلوانے کی باتیں کر رہے تھے تو میں منع کر دیتی ہوں اماں جی کو کہ اتنی جلدی نہ کریں۔ تم ہم پر بھاری تھوڑی ہو۔“
 میمونہ بھابھی نے بڑی بے نیازی سے اسے اس کی خوشیوں کی نوید دی اور وہ اپنی جگہ اچھل پڑی۔
 ”کیا کہا بھابھی آپ نے کیا باتیں کر رہے تھے بابا جی اور اماں جی۔؟“
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”میمونہ بھابھی نے فوراً بدلہ لیا بھی اندر سے عمر کے رونے کی آواز آئی تو ”میرا لال اٹھ گیا۔“ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں پھر جاتے جاتے اسے دیکھ کر شرارت سے بولیں۔
 ”تمہو کا دن طے ہوا ہے۔ تمہاری بات پکی کرنے کے لئے۔“

”نئی کھجائے تولیتی جائیں۔“ ان کی غلٹ پر اس نے جلدی سے مگ اٹھا کر ان کی طرف بڑھادیا۔ جسے لے کر وہ اندر چلی گئیں اپنے پیچھے اس کے لئے سوچنے کو زندگی کا خوبصورت موڑ چھوڑ گئی تھیں۔ ان ہی سوچوں کے دھارے پر بہتی رہی وہ اپنے کمرے میں آئی تو نبیل کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلائے جانے کس سوچ میں تھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے اور نظرس ہتھیلیوں پر جمی ہوئی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تو اس کے پاس اگر بیٹھی اور آہستہ سے اس کی کلاںیاں تھام کر پوچھنے لگی۔
 ”نبیل! کچھ رہے ہو بیٹا۔“

”نبیل نے اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں تو ان پر نظر ڈالنے کے بعد وہ قدرے الجھ کر بولی۔
 ”کیا ہوا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔“

پھر لونگی اپنے ہونٹوں سے اس کی ہتھیلیوں کو چوما تو وہ بے چین سا ہو کر اٹھ بیٹھا پھر ایک دم اس کی گردن میں انڈال کر اس سے پلٹ گیا تو اس محبت اور المانہ انداز پر اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور جواباً اسے بازوؤں میں گھسیٹ لیا۔

نبیل اسے چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ کتنی دیر بعد اس نے بہت آہستہ سے اسے خود سے الگ کیا اور

اور ابھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اپنے پیچھے بہت ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی تو یونہی اسے خیال میں رہ کر نے پیچھے گردن موڑی اور نبیل کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے بچ نما آواز بلند ہونا چاہتی تھی لیکن اس سے بڑا اس نے اپنی آواز کا گلا گھونٹ دیا البتہ بے اختیار چھٹک آنے والے آنسوؤں کو نہیں روک سکی۔ اور بڑھ کر اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کے سر پر بھی اپنی پیشانی ٹکاتی کبھی ہونٹ۔ گو کہ وہ اس کی ماں نہیں لیکن اس وقت اس کے احساسات ایسے ہی ہو رہے تھے۔ جیسے کسی ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ بڑپتے ہوئے دل کو کسی حد تک قرار آ گیا تب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پو لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے۔“
 نبیل جب چاہ اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔
 ”کس کے ساتھ آئے ہو، کون چھوڑ گیا ہے تمہیں۔؟“
 نبیل کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اماں جی کے کمرے میں لے اور اسے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”نبیل! آیا ہے اماں جی۔؟“
 اماں جی اور میمونہ بھابھی نے ایک ساتھ چونک کر دیکھا پھر اماں جی نے لپک کر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس سے پہلے کہ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کریں۔ وہ اس کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔
 ”اماں جی! ابھی بچہ ہے، کتا سمجھتا ہے۔ کہیں ادھر ادھر چھپ گیا ہو گا۔“
 ”اے ہمارے تو جان نکال کے رکھ دی۔“ اماں جی کہتے ہوئے نبیل کو جھنجھوڑنے لگیں۔ ”کہاں رہ گیا ارے تیرا باپ آجاتا تو میں کیا جواب دیتی اسے۔“

”چھوڑیں اماں جی! میں سمجھاتی ہوں اسے۔ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ نبیل! تم کمرے میں جاؤ۔“
 اس نے نبیل کو الگ کر کے جانے کو کہا پھر اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”اس طرح ہمیں کریں اس جی وہ پہلے ہی سہا ہوا ہے اور ڈر جائے گا۔ میں آرام سے اس سے معلوم گی۔ میرا خیال ہے نبیلہ بھابھی اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں اور شاید وہی چھوڑ گئی ہیں۔“

اماں جی یوں پریشان ہو گئیں جیسے قیامت آئی نہیں تو آنے والی ہو۔
 ”پریشانی کی بات نہیں ہے اماں جی۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہ نبیل کی ماں ہیں اور ہم ٹھ کوئی بھی انہیں نبیل سے ملنے سے نہیں روک سکتا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن انہیں اس طرح بغیر بتائے نبیل کو نہیں لے جانا چاہئے تھا۔ کتنے پریشان ہم لوگ۔“ میمونہ بھابھی نے کہا۔ تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
 ”ہاں۔ یہ بات ان سے کھلوا کر جاسکتی ہے۔ کوئی دن یا وقت جو بھی ہو طے کر لیں اور یہ معاملات تو بڑے طے کر سکتے ہیں۔“

وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ اچانک خیال آنے پر رک کر پوچھا۔ ”بابا جی کہاں ہیں۔؟“
 ”تمہارا بچہ چائے بلوا بھیجا تھا وہیں گئے ہیں۔“

”خیریت۔۔۔؟“
 ”آہیں گے تو خیریت معلوم ہوگی۔“

اماں جی کے جواب پر وہ یونہی سر ملاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور گو کہ اس کا ہا دل یہ چاہہ فوراً ”نبیل سے ساری بات معلوم کرے۔ کہ وہ کس کے ساتھ گیا آیا اور نبیلہ بھابھی نے اس سے کیا باتیں وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے یہ ایک فطری تجسس تھا لیکن وہ فوراً خود کو باز کرتے ہوئے کچن میں آکر کھانا گرم کر۔ کیونکہ ابھی میمونہ بھابھی نے بھی نہیں کھایا تھا۔ پھر اس نے وہیں سے انہیں پکار لیا۔

ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کر رہی تھی کہ وہ کہنے لگا۔
 ”پھوپھو! میں مٹی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اسکول آئی تھیں مجھے لینے۔“
 وہ فوراً ہاتھ نیچے کر اکر اسے دیکھنے لگی۔

”مٹی کہہ رہی تھیں۔ وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ بھری رو رہی تھیں آپ کی طرح۔ انہوں نے میرے ہاتھ چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا۔ پتا نہیں وہ کیوں رو رہی تھیں۔ آپ کیوں رو رہی ہیں پھوپھو۔“
 وہ جس سادگی سے بول رہا تھا۔ اسی سادہ معصوم انداز میں پوچھا تو وہ بس ذرا سانس لی میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

شام میں اماں جی نے سب کے سامنے فیملے کا اسکول سے فیمل کو لے جانے کا بتایا تو ایک ہنگامہ اٹھ کر بڑے بھیا کے ساتھ عدل بھائی بھی غصے میں آگئے تھے اور فیملے کے اس اقدام میں کوئی انتہائی پہلو تلاش کرتے تھے غالباً ”ان کے خیال میں وہ عورت محبت کے ہاتھوں تو مجبور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یقیناً“ اس کے اخطرات نکال دیے گئے۔

”فیمل بے کماں؟ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ کسی کی اجازت سے اس کے ساتھ گیا تھا۔“
 بڑے بھیا کا بقیہ غصہ اب فیمل کی طرف منتقل ہونے والا تھا کہ اباجی فوراً ٹوک کر بولے۔
 ”نہیں بیٹا! اس میں بچے کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے ماں کو دیکھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ تم اگر روک تو اس کی ماں کو روکو۔“

”اس طرح تو وہ اور ضد میں آجائے گی۔“ بڑے بھیا۔ اباجی کی بات سمجھتے ہی اپنی بے بسی پر تملائے۔
 ”اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آرام سے ٹھنڈے دماغ سے بیٹھ کر سوچو۔ اس طرح غصے میں نقصان کرو گے۔“

اباجی نے نرمی سے ان کا کندھا سہلاتے ہوئے سمجھایا تو وہ جیسے ٹوٹ گئے۔
 ”میں کیا کروں اباجی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ بتائیے وہ جب تک یہاں تھی۔ اسے فیمل نہیں بھی۔ اب کیسے وہ۔“
 ”حوصلے سے بیٹا! حوصلے سے۔“ ان کی آواز بھرانے پر اباجی نے پھر انہیں سہارا دیا۔ ”اپنے آپ پر قہر اور اس بات کو زیادہ اہمیت مت دو۔“
 ”کیسے نہ دوں۔“

”مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ ابھی تم نے خود کہا کہ منع کرنے سے وہ اور ضد میں آجائے گی۔ اسے ضد دلاؤ۔ ضدی عورت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کی ٹھان لے تو پھر اپنا نفع نقصان سوچتی۔“

وہ باتیں جو کتابیں نہیں سکھاتیں اباجی اپنے بڑھے لکھے بیٹوں کو سمجھا رہے تھے۔
 ”پھر وہ کوئی جاہل کنوار عورت نہیں ہے جسے تم ڈراؤ۔ وہ کا سکھو۔ بڑھی لکھی ہے۔ اگر اس نے ماں کا حق کر لیا تو پھر فیمل کو یہاں سے لے جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکے گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی کر لو بلکہ ڈھیل دے دو اسے کہ وہ جب چاہے۔ فیمل سے مل لے۔ البتہ یہ ضرور طے ہونا چاہئے کہ وہ کب وقت اسے لے جائے گی تاکہ یہاں کسی کو پریشانی نہ ہو۔ سمجھ رہے ہو ناں۔“

بڑے بھیا جو ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہے تھے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔
 ”لیکن اباجی! میں نہیں چاہتا۔ فیمل اس سے ملے۔“
 ”نہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلے گا بیٹا! اس کا مقصد صرف تمہیں پریشان کرنا ہے۔ جب وہ دیکھے گی کہ کوئی ٹوکس نہیں لیا تب خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔“
 اباجی نے کہا تو عدل بھائی فوراً ”ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔

”اباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں بڑے بھیا۔ ان کا مقصد صرف آپ کو پریشان کرنا ہے۔ فیمل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بس آپ ایک بار ان سے رابطہ کر کے فیمل سے ملنے کے اوقات طے کر لیں۔ اس کے بعد فیمل کو ان کے پاس لے جانے کا نئے کی ذمہ داری میری ہوگی۔“

”ہوں۔“ ذمہ داری تو تمہیں قبول کرنی ہوگی کیونکہ میں۔۔۔“
 بڑے بھیا جانے کیوں خاموش ہو گئے۔ پھر کن آنکھوں سے خاموش بیٹھی اماں جی کو دیکھ کر اپنے تئیں آواز دبا کر بولے۔
 ”میں باہر جا رہا ہوں اباجی۔۔۔“

”ہائیں۔“ اماں جی نے پھر بھی سن لیا۔ ”باہر کا ہے کو جا رہے ہو۔“
 ”ظاہر ہے روز گائے۔“
 ”یہاں بے روز گار تو نہیں ہو۔“ اماں جی نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اور وہ اس وقت مزید کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اٹھتے ہوئے بولے۔
 ”اباجی! میں پھر بات کروں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ ماشاء اللہ! میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ اماں جی اپنی کسے جاری تھیں۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ تب اباجی ٹوکتے ہوئے بولے۔
 ”بس کرو۔ وہ کون سا ابجی جا رہا ہے۔“
 ”ابجی نہ کبھی سمجھا دیں اسے۔“

”سمجھاؤں گا تم نہ جی بلکان کرو بلکہ اس کا گھر بسانے کی سوچو۔ کیوں عدیل میاں؟“ اباجی نے اچانک عدیل کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر بولے۔

”جی۔۔۔ اباجی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“
 ”کیا ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ اباجی سمجھے عدیل نے ان کی بات سنی ہی نہیں اور یونہی تائید کر رہے ہیں۔
 ”وہی بڑے بھیا کی شادی، میرا خیال ہے آئیہ کے ساتھ ساتھ ان کا گھر بھی بس جائے تو اچھا ہے۔“
 عدیل نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشورہ بھی دے ڈالا پھر اماں جی سے کہنے لگے۔
 ”آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے اماں جی! ایسا بھابھی اور میمونہ بھابھی جیسی ان کے لئے بھی لے آئیں۔ پھر باہر نہیں جائیں گے۔“

اماں جی کے چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں۔
 ”سوچ تو میں کئی دنوں سے رہی ہوں اور میری نظر میں ایک لڑکی ہے بھی۔“
 ”کون کس؟“ اباجی فوراً متوجہ ہوئے۔
 ”سانہہ آپ کی بیٹی۔“ اماں جی نے بتایا تو اباجی یوں مطمئن ہو گئے جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔
 ”نیک عدیل بر ملا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔ بڑے بھیا کے لئے سانہہ جی بہت مناسب ہیں۔“
 ”آپ پہلی فرصت میں جا کر بات کریں۔“
 ”میں تو آن جانے کو تیار ہوں لیکن تمہارے بھائی کا تو پتا چلے۔ وہ کیا چاہتا ہے اور ادھر ساڑھ کے لئے پتا نہیں مارے پچانے کیا سوچ رکھا ہے۔ ایک جگہ بات چل تو رہی تھی اس کی۔“
 اماں جی نے سوتے ہوئے انداز میں کہا پھر اباجی سے پوچھنے لگیں۔
 ”آپ آج گئے تھے کچھ بتایا۔ ضیاء نے سانہہ کے رستے کے بارے میں طے ہوا یا نہیں۔“

”ناہ۔ تیار باتیں وہاں بات نہیں تھیں۔“
 ”میں تو پھر آپ عقل سے بات کر لیں پھر ہم چلیں گے۔“

اباجی اثبات میں سرہلانے لگے، پھر معا "خیال آنے پر عدیل کو مخاطب کر کے پوچھنے لگے۔
 "عدیل! وہ تم احمد حسن کی طرف گئے تھے۔"
 "نہیں اباجی! میرا جانا نہیں ہو سکا لیکن میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔ جمعہ کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔"
 عدیل بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ ادھر میونہ بھابھی پکار رہی تھیں۔ وہ غلت میں باہر نکل گئے۔

”مجھے نہیں معلوم مہر! جو چاہے قسم لے لوں۔“ شہرناو جیچ پریشان ہو گئی۔
 ”کھاؤ شاہ بارون کی قسم کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔“ اس نے شہرناو کی شررگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس سے وہ اور بان ہو گئی اور قدرے روہاسی ہو کر پوچھنے لگی۔
 ”کب کب گئے ہیں سکندر بھائی اور تم سے کیا کہہ کر گئے ہیں؟“

”مجھے سے“ ارے مجھے تو اس نے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ میرے آنے کا انتظار ہی کر لیتا۔ منہ میرے نام کوئی مچھوڑا جو بابا جان کی بات کو بیچ ثابت کرنا کہ وہ مجھ سے نہیں ان سے ناراض ہو کر گیا ہے۔ اس کی ناراضگی سے نہیں تھی۔ اسے ناراض کیا گیا ہے۔ سبب تم جانتی ہو شہرناو۔ اور جان تو میں بھی گئی ہوں پھر بھی رے منہ سے سنتا جا رہی ہوں۔“

تفر سے بولتی ہوئی مہرنا نے سناٹے میں بیٹھی شہرناو کا ہاتھ زور سے ہلایا پھر کہنے لگی۔
 ”شاہی کی رات شاہ اس کمرے میں آیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ خیر میرا اور شاہ کا معاملہ ہے۔ مجھے تو تم اس حرافہ کا نام ہتاؤ جو شاہ کو سے چھین کر جرات کر بیٹھی ہے۔“

”میرا تین کو مہر! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو سکندر بھائی کے جانے کا بھی ابھی تمہارے منہ سے سن رہی ہوں بی جان! یہ بھی نہیں بتایا۔“
 ”وہ نہیں بتا سکی گی اور سنو۔ تم بھی ان پر ظاہر مت کرنا کہ تم جان چکی ہو کیونکہ یہ اس گھر کا مسئلہ ہے اور تم اس گھر کی فردوس ہیں ہو۔“

مہرنا نے ہلکی سی طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جانے اسے کیا اور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اگر نہیں سمجھی، بھی یوں سر جھکا لیا جیسے اب مہرنا کی ہر جائز ناجائز پر اسے اسی طرح سر جھکانا ہے ورنہ دوسری صورت میں بھاری قیمت ادا کر لی پڑے گی۔

...

سکندر بھائی! آپ کے لئے گڈ نیوز۔“
 نالکہ نے اسے دیکھتے ہی نکلوا لگایا۔ لیکن وہ ایک تو تھکا ہوا تھا دوسرے شوروم کا سودا نہ ہونے کے باعث کچھ سا ساجھی تھا۔ جب ہی نالکہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور تھکے تھکے انداز میں بیٹھا تو احمد حسن نالکہ کو ٹوکے لے بولا۔
 ”تھک نہیں کرو۔ جاؤ پہلے چائے لے کر آؤ۔“

میں چائے سے زیادہ اچھی خبر سنانے والی ہوں۔ جو سکندر بھائی کی ساری تھکن پل میں دور کر دے گی اور ان یوں چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں گی۔ اب بتائیے پہلے چائے یا گڈ نیوز۔“
 نالکہ نے شاہ سکندر کے سامنے اگر خوشی سے پوچھا تو اس نے پہلے احمد حسن کو دیکھا اور اس کا اشارہ سمجھ کر آرام سے بولا۔
 ”چائے۔“

”برنر نیوز۔“ نالکہ چیخ پڑی۔ کیونکہ وہ خود اچھی خبر سنانے کو بے چین تھی اور جانے کب سے ان دونوں کا ار کر رہی تھی۔
 ”اچھی خبر! یہ ہے۔ اچھا خیر سناؤ۔ جلدی سناؤ۔“ شاہ سکندر نے جیسے اس پر احسان کیا۔ تو وہ منہ پھلا کر بولی۔
 ”آئیہ اباجی کے گھر سے فون آیا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو کھانے پر بلایا ہے۔“

”آئیہ آئیہ۔“ شاہ سکندر کی ساری بے نیازی رخصت ہو گئی۔
 ”جی نہیں جمعہ کو۔“ نالکہ کا انداز ہنوز تھا۔ جس پر احمد حسن ٹوکے ہوئے بولا۔
 ”تو اس میں روئے کی کیا بات ہے۔ کیا تمہیں نہیں بلایا۔“

مہرنا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے شہرناو اور شاہ بارون کو آنے دیکھا تھا۔ دونوں کتنے خوش تھے۔ پورا ہاتھ جیسے قسمت کی دیوہی نے مہرنا کو کساری رعنائیاں ان کی جھولی میں ڈال دی ہوں۔ شہرناو کے ہونٹ ہنسی کھلی پر ہنسی تھی اور شاہ بارون کی سنگت کا غور اس کے انگ سے عیاں تھا۔ جس نے مہرنا سے ایک لگاؤ کی تھی۔ جو اگر وہ اس وقت نیچے اتر کر آتی تو اس کی پیش سے شہرناو ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور ادھر سے ادھر نکل کر اپنے اندر دیکھنے والا کو کمرے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ خود اپنے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ساتھ والے کی بڑی مشکل سے وہ خود کر نیچے جانے سے باز رہے ہوئی تھی۔ پھر اپنا دھیان بنانے کی خاطر اس۔ ریکارڈ میں کیسٹ لگا کر آن کیا اور مسہری پر آ بیٹھی۔ چند لمحوں بعد سو گوارسی دھن نے کمرے کی خاموشی اداسی کا رنگ شامل کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر گھنٹوں کے گرد بازو پیٹے ٹیپ ریکارڈ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نیم دراز ہو کر مسہری کی بیک پر سر رکھ کر ٹیکس موند لیں۔

اک آگ غم تنہائی کی سارے بدن میں پھیل گئی
 جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامن دل کو بچا میں کیا
 اچانک ٹیپ بند ہونے کی آواز کے ساتھ شہرناو کی کھلکھلاتی ہنسی نے جیسے بجھتے انگاروں کو پھرتے دی اور وہ ہمیشگی طرح اس کی پذیرائی کو اٹھنے کے بجائے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”خیر تو ہے کون روٹھ گیا۔؟“ شہرناو اپنی دھن میں تھی۔

کہاں ہیں سکندر بھائی! میں پوچھتی ہوں ان سے۔“
 ”بیٹھ جاؤ شہرناو! اس کے گھر سے ہوئے سرد لہجے پر شہرناو نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس تکلف سے بیٹھتی ہوئی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”کیا ہوا مہو! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“

”ہو۔ بہت ہلکی سی ہوں کی آواز اس کے بند ہونوں کے اندوم توڑ گئی۔
 شہرناو اس کی پراسرایت سے کچھ خائف سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تو اسے سارا ماحول ہی پرا جیسے بچپن میں کمانیاں بڑھا کرتی تھی کہ ظالم دیو نے شہزادی کو قید کر کے پتھر کا بنا دیا۔ اسے مہرنا سے اپنی گمان ہو رہا تھا۔ جس گھے وجود میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بے حد گھبرا کر شہرناو اسے غور سے دیکھنے لگی۔
 کے ہونٹ پہلے ذرا سے نیم ہوا ہوئے پھر جیسے وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہنے لگی۔

”ایک بات پوچھوں شہرناو! جیچ بتاؤ گی۔“
 ”ہاں۔ کیا بات ہے؟“ شہرناو فوراً بولی۔
 ”کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟“ اس نے اتنے یقین سے پوچھا کہ شہرناو سٹپٹ گئی۔
 ”کون۔؟“

”وی۔ جس نے شاہ کو میرا نہیں ہونے دیا۔ چند لمحے بس چند لمحے شاہ نے میری جھولی میں خیرات ڈالے تھے شاید اپنی محبت کا صدقہ اتارا تھا۔ کیوں کیا یہی میری حیثیت ہے۔“ مہرنا اچانک پھٹ پڑ
 شہرناو! تم اس کی بہن ہو سب جانتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟“

”جی نہیں۔ مجھے سب سے پہلے بلایا ہے لیکن میں جاؤں گی نہیں۔“ وہ کستی پھولی باہر نکل گئی تو پچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر احمد حسن اسے دیکھ کر مسکرایا۔ مسکراہٹ تھی۔

”جمعہ کے دن۔۔۔ ضرور چلیں گے۔ اور اب جلدی سے بتاؤ۔ کیا طے کرنا ہے۔“
 ”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مائی ڈیر ان کی طرف سے بلاوے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے اور ہم جا کر باقی کر رہیں یعنی شادی کی تاریخ وغیرہ۔“ احمد حسن نے مطلب سمجھایا تو وہ کچھ الجھ کر بولا۔
”لیکن یار؟ تیاری تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیا بتا رہی کہنی ہے۔ کپڑے، زیورات، یہ سب امی اور نالکھ پر چھوڑ دو۔ وہ سب خریداری کر لیں۔ سیٹ کر چکے ہو۔ باقی رہا بڑا کس تو۔“ یہاں احمد حسن خود انک گیا تو اسے کہنا پڑا۔

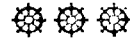
”بزلس نہیں ہو سکتا۔ آئی مین شادی کے اخراجات کے بعد بزلس کے لئے بیسہ نہیں بچے گا۔“ احمد حسن یہی بات کہنے سے رک گیا تھا اور جب شاہ سکندر اس حقیقت کا اعتراف کر کے مایوس تب اس کا کندھا ٹھپکی کر بولا۔

”کم آن یا راسب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے ان لوگوں کا ارادہ معلوم ہو جائے اس کے بعد ہم طے کیا شادی پہلے ہونی چاہئے یا برس۔“

”مہوں۔“ شاہ سکندر نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر رسٹ وائچ پر نظر ڈالی تو چونک کر بولا۔ ”ار۔۔۔ بج ایک دوست سے ملنا تھا۔“

”رکھو۔ چائے پی کر جانا۔ یہ نائلہ کہاں رہ گئی؟“ احمد حسن اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا رہنے والا احمد اُدھر ہو جائے گی۔“ وہ احمد حسن سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

پانچ بجنے میں دس منٹ تھے۔ وہ اسپتال سے گاڑی بھگائے لگا، لیکن جگہ جگہ ٹریفک جام ہونے کے باوجود گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔ پھر بھی بہم ہی امید کے سوارے اس نے مطلوبہ جیمز کے سامنے گاڑی روک دی۔ لاک لگا رہا تھا کہ اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ کچھ بے دھیالی میں اس نے گردن موڑ کر مل کو اسے اپنا وجود سن ہوتا لگا۔



”تم بڑے جلد باز ہو سکندر! میرا انتظار بھی نہیں کیا“
شاہ جہاں گھراس کے گم ممبر انداز کو قصداً نظر انداز کر کے ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگا۔
”میں کہیں بہت دودھ تو نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے ساتھ رہتے پراور اسی شام لوٹ بھی
وہ لوہی خاموش کھڑا ہاتھ شاہ جہانگیر کے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟“
 اُس کا سر اب ہی اب نفی میں ہل گیا۔
 ”چلو یہ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں بلکہ میرے ساتھ آؤ۔ میں ہوٹل میں مقیم ہوا ہوں۔“
 شاہ جہانگیر نے اُس کے کندھے پر یوں ہاتھ رکھا جیسے وہ چلنے کو تیار کرنا ہو رہا ہو۔ تب اُس نے لب کشائی کی۔

میرا تیسرا اقرار کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جلو خیز، جہاں تم کہو وہیں چلتے ہیں۔ یا مجھ سے بات ہی نہیں چاہتے، شاہ جہاںگیر نے محبت بھرے انداز میں اُس کی ناراضگی کو جتا کر پوچھا تو وہ گہری سانس لینے کو بولا۔ یہ بات نہیں ہے بھائی! اصل میں میں یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی کام ہے تو کچھ دیر انتظار کریں۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔

شاہ جہانگیر نے آخر شدلی اور فراخانی کا مظاہرہ کیا۔ پھر اطمینان سے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر اُسے تے ہوئے دیکھنے کے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں نے لگی تھیں۔

وہ جب شاہ جہانگیر کے سامنے اپنے آپارٹمنٹ میں آیا اس وقت تاریکی پر پھیلا چکی تھی۔ وہ ایک بعد ایک تینوں کمروں میں بیٹھ لائیں ان کرتا ہوا دوبارہ لافٹ میں آیا تو شاہ جہانگیر شوق میں اس کے گھٹکا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

کہنے والی کہاں ہے؟“
 کہنے والی ہے۔“ اُس نے بڑے اعتماد سے مسکاکر جواب دیا۔
 کیا مطلب۔ کہیں کچی ہوئی ہے یا ابھی شادی ہی نہیں ہوئی؟“
 شاہ جہاں گہرے بیٹھے ہوئے استفسار کیا تو وہ التان سے پوچھنے لگا۔
 ”آپ کو کیا لگ رہا ہے؟“

شاہ جہانگیر نے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہے ہوں۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتا" تب وہ اُن کے سامنے بیٹھ کر کہنے لگا۔

آٹنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک آسیہ کے گھر والوں کو میری طرف سے اطمینان نہیں ہو
 گا اپنی بیٹی ۛ
 کیسا اطمینان چاہتے ہیں وہ؟ "شاہ جہانگیر فوراً بول پڑے "تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ شاہ پور کے
 والے کیسے ہو۔ ساری زندگی صرف خود بلکہ آنے والی نس کو بھی بٹھا کر کھلا سکتے ہو۔ کیا تم نے اُن پر اپنی
 توجہ واضح نہیں کی؟

سب جانتے ہیں وہ یہ بھی کہ جس جاگیر کے بل پر میں اپنی نسل تک کو بٹھا کر کھلا سکتا تھا وہ میں چھوڑ
 دوں گا آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی۔ ان کے پیش نظر میری مالی حیثیت کبھی نہیں رہی۔ اب بھی
 ہے۔ بس وہ ان بات سے خائف ہیں کہ میں میرا اجڑا ہوا فیصلہ نہ ہوں
 اور حملے کہا تو شاہ جہانگیر کچھ دیر پر سوچ انداز میں سر ہلاتے کے بعد

نہ ہوتی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
 ہم نے نہیں اس لیے بلایا ہے کہ ہم تمہیں سکندر کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔
 مہر النساء جو کئی دن اس کے اندر کوئی اچھل مچھل نہیں کی تھی اس کے لیے عین تھا کہ بابا جان اس
 غلط بیانی کریں گے۔

سکندر کراچی میں سے اور میں نے جہانگیر کو اس کے پاس بھیجا ہے۔ اسے یہ ہے وہ اسے سمجھا جگا کر
 اسے لگا نہیں بھی آتا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ کہ اگر تمہارے لیے۔ جہانگیر اس کا ٹھکانا دیکھ گئے
 تو جی چاہے اس کے پاس چلی جانا۔ تم سے تو اس کی کوئی ناراضگی نہیں ہے اور ہمارا خیال ہے تم ہی
 اسے مار کر لاسکتی ہو۔
 مہر النساء کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ایک لحظے کو چھب دکھلا کر غائب ہو گئی تھی۔ پھر اس
 دھڑکے سے سو جا۔

کاش وہ مجھ سے ناراض ہوتا۔ میں اسے منانے کے سوچتی کرتی۔ اس کے سامنے اپنی ہستی مٹا ڈالتی۔
 "تھاری بی بی جان تھاری تھیں تم کھانے پینے میں لاپرواہی کرتی ہو۔ ایسا خیال رکھا کرو۔"
 بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت کا اظہار کیا تو اس کی بے چینی توڑنے لگی اور اس
 سے کہنے لگی "اچھا کھڑی ہوئی۔"

"میں جاؤں بابا جان؟"
 ہوں۔ اور دیکھو شاہ جہانگیر جیسے ہی اسے اسے ہمارے پاس بھیج دینا۔ بابا جان نے اجازت
 دینے کے ساتھ کہا۔
 "جی، وہ ان کے کمرے سے نکل آئی اور راہداری میں رگ کر لکھوں میں اتری غمی دوپٹے
 ماحذب کی پھراپنے کمرے میں آتے ہوئے حیران پر نظر پڑی تو اسے اسکوٹش لانے کا کہا۔ اس کے
 اندر سے کارٹ کیا۔

اپنے اندر کے جھل بن سے وہ خود کسی کسی وقت بہت پریشان ہو جاتی تھی۔ ایسی حالت میں
 رست یوں بھی اتنی اتنی رہتی ہے۔ پھر اچھا نہیں لگتا۔ اور اس کے تو اپنے ساتھ اچھا نہیں ہوا
 ماؤں اور روتے جو وہ اچھا تھا تو اب تک مختلف سوجھ بوجھ کے تارے تھے اس میں اچھا ہی رہتا تھا۔
 ادنی سے پہلے سجانے جو صورت ہینوں کی کر جیاں سمیٹے سمیٹے اس کی انگلیاں دنگا رہ گئی تھیں۔ اور
 بابا جان ابھی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔
 اسکوٹش گھونٹ گھونٹ طق سے اتار کر وہ اپنے اندر کی تپش کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن
 فرق نہیں پڑا۔ پورا گلاس خالی ہو گیا۔
 "اور ڈالوں بی بی جی؟"

حیران جگ لیے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے گلاس سامنے کر دیا۔ اور جیسے ہی حیران نے اسکوٹش
 سے پھر اس بار وہ ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ تو قدرے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچہ دیر کے لیے
 بڑی بیک پر سر رکھ کر اس نے ہلکی موندلیں۔ خالی گلاس ابھی اس کے ہاتھ میں تھا جب ہی حیران
 کی کمری وہ تھی۔ جب اس نے انھیں کھولیں تو قدرے ناگوار سی ہوئی۔
 "تم بھی نہیں ہو؟"

"نہ شربت۔ حیران نے جگ سامنے کر کے اپنے کمرے رہنے کا سبب بتایا تو وہ کارز ٹیبل کو دیکھ کر

"یہاں رکھ دو۔"
 حیران نے جگ رکھ دیا۔ پھر جانے کے بجائے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولی۔
 "بی بی جی ایک بات کہوں۔ آپ بڑا تو نہیں مایوس کی؟"

بابا جان کا حکم ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی واسطہ کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ اور حکم عدولی کی نرا
 ہو۔ اس کے باوجود ان میں ہینوں میں میں کئی بار تمہاری تلاش میں اس شہر کے اچھے لگا چکا
 "کیوں؟" شاہ جہانگیر ایک لحظے کو اس کے ہاتھ کو وہ صرف کیوں کہہ کر ہونٹ بھینچ گیا۔
 "کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے تمہیں گھر سے نکلا ہوا اکیلا شخص سمجھ کر شادی
 پس و پیش کریں۔ بابا جان کا حکم اپنی جگہ تمہیں اکیلا چھوڑنا بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ بتا
 چاہتے ہیں اس کے کمرے والے؟ ہم ان کی ساری ڈیمانڈ پوری کریں گے۔"
 شاہ جہانگیر کے لہجے میں اپنی حیثیت کا تفاخر تھا جسے وہ چھوڑا تھا۔ لیکن بھولا ہرگز نہیں
 بلکہ اس کے اندر شاید یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے کو اس شان سے بیاہ لائے۔ جو اس کی
 کا خاصا رہی تھی۔ جب ہی شاہ جہانگیر کی آخری بات اور ان کے لہجے پر اس کی گردن آپ
 تن گئی اور تسخیر کرنے کا احساس جلنے لگا تھا۔

"ابھی تک تو انہوں نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی۔ اس جمعہ کو رات کے کھانے پر بلا لیں۔"
 آپ چلیں گے ناں ہمارے ساتھ؟ اس نے قدرے بے تابی سے پوچھا۔
 "نہ صرف چلوں گا بلکہ شادی طے کر کے آؤں گا۔ شاہ جہانگیر نے قہقہے کے بازو پر مکا۔

بھولے کہا۔
 "لیکن بھائی، ابھی میرا کوئی کاروبار تو سیٹ ہوا نہیں اور پیسہ میرے پاس اتنا ہے کہ
 اس کی باقی بات شاہ جہانگیر کے ہتھتے میں دے گئی۔
 "بابا۔ یہ تمہیں پیسے کا حساب کب سے رکھنے لگے۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ تم تو میرا
 شادی کر کے عیش کرو۔"
 "عیش پیسے کے بل پر کیا جاتا ہے اور پیسہ مجھے کما نہیں۔ اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن
 اسی محفوظ انداز میں بولے۔
 "کہانے کا شوق بھی پورا کر لینا۔ پہلے شادی تو کرو۔ گھر میں عورت ہوگی تو مجھے چاہئے یا
 پوچھنے کی؟"

"سوری، وہ شرمندہ ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ میں بس ابھی
 "بس رہنے دو چائے والے، چلو کہیں باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" شاہ جہانگیر ٹوٹے
 کھڑے ہوئے۔ پھر پوچھنے لگے۔

"تمہارے کھانے کا کیا انتظام ہے؟"
 "ہے۔ اس نے اپنا روٹنڈ کی چابیوں کی تلاش میں نظریں دوڑاتے
 "باہر ہی کھانا۔ یہ تو کیونکہ نئی دہلی میں کھانے کا کام سے لگا دینا اچھی بات نہیں ہے
 ان کے فراخ دلانہ مشورے پر وہ ذرا تھک کر بولا۔

"فی الحال افروز نہیں کر سکتا۔
 "تمہیں سہاویں زیب نہیں دیتیں سکندر اپنی ہمیشہ والی آن بان اور شان سے رہو۔
 نہیں کرنا۔ میں کہیں تمہارا اکاؤنٹ خالی نہیں ہونے دوں گا۔"
 شاہ جہانگیر نے اتنے مضبوط لہجے میں کہا کہ اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

بابا جان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مہر النساء نے دوپٹے کو اچھی طرح سر
 اندر داخل ہو کر سلام کر کے یوں کھڑی ہو گئی جیسے اب اسے صرف بابا جان کی بات سننے
 کچھ بھی نہیں۔ جبکہ کہنے کو اس کے پاس بہت کچھ تھا۔
 "یہاں مگر بیٹھ مہر النساء، بابا جان نے اپنے برابر اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دھیر

”کیا بات ہے؟“ اس کی پشانی پر ہلکی سی ٹمکنیں نمودار ہوئیں تو جیراں کچھ ڈرتے ڈرتے کہنے لگا۔
 ”وہ جی۔ جہاں میری نانی کا قہر ہے وہاں ایک سائیں جی رہتے ہیں۔ بڑے پھوپھے (پہنچے) ہیں سائیں جی، ساری عورتیں اُن کے پاس جاتی ہیں۔“
 ”بھیر؟“ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں لیکن اُن میں غصہ یا ناگواری نہیں تھی جب ہی آرام سے کہہ گئی۔
 ”اگر آپ کہیں تو میں چھوٹے شاہ جی کے لیے تعویذ لا دوں۔“
 ”شاہ کے لیے؟“ وہ ایک جھٹکے سے مسہری کی بیگ چھوڑ کر سیدھی بیٹھی۔ ”کیا ہوا شاہ کو؟“
 ”اللہ کرے بی بی، جو اپنے چھوٹے شاہ جی کو کچھ ہو۔ جیراں اس کے تیوروں سے ہم کر کھڑی ہوئی۔“

”بھیر تم نے اُن کا نام کیوں لیا؟“
 ”غفلت ہو گئی بی بی جی، معاف کر دیں۔“
 ”کانچی آواز میں کہہ کر جیراں نے پیچھے یوں دیکھا جیسے اُس کا اشارہ ملے، ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔ مہاراجہ کچھ دیر تک اُسے کھنکھرتی رہی پھر دھیرے دھیرے اُس کی پیشانی کی لکیریں صاف ہونے لگی تھیں۔ اس کے بعد جب اُس نے جیراں کو پیچھے کے لیے کہا تو اس کے بچے میں مالا دھیر نہیں تھا۔“
 ”کیا کہو گی سائیں جی سے؟“ وہ اب دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”میں انہیں بتاؤں گی بی بی جی کہ چھوٹے شاہ جی گھر نہیں آتے۔ بھیر وہ ایسا تعویذ دیں گے کہ جہاں جی بھاگے آئیں گے۔ ساری زندگی غلامی کریں گے آپ کی۔“
 جیراں قدرے جوش سے کہہ رہی تھی اور اس تصور سے ہی اُس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔

”جمعے کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اور میمونہ بھائی بہن میں مصروف ہو گئیں۔ دوپہر کا کھانا، نے نماز سے پہلے ہی کھایا تھا اور اب رات کے کھانے کی تیاری تھی۔ وہ بھی مہانوں کے لیے۔ اور خاصا اہتمام کرنا تھا۔ کتاب، کوفتے، بریانی، قورمہ اور سویت ڈش میں بھی دو انیم شامل تھے پر بھی عدیل بھائی نے بہن میں جھانک کر ایک آدھ ڈش کا مزید اضافہ کرنے کو کہا تو میمونہ بھائی چسپاں۔“

”ہرگز نہیں۔ مجھے تو آج کی تاریخ میں یہ سب بھی پکتا نظر نہیں آ رہا۔“
 ”جیسے کیا کر رہی تھیں آپ؟“ عدیل نے قہر جیستی آسید پر نظر ڈال کر کہا تو میمونہ بھائی با لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔
 ”کیوں دوپہر کا کھانا تم نے پکا یا تھا۔ گھر کی صفائی بھی تم نے کی اور پتوں کو بھی تم نے ہنلا دیا۔ ہم تو ابھی سوتے سے نکل کر کچن میں آئے ہیں۔ ویسے تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ تمہارے والے تو نہیں آ رہے۔“

”میرے سسرال والوں کو آپ بے شک چاہتے بھی نہیں پلو ایسے گا۔“
 عدیل نے کہا تو قہر جیستے ہوئے اُس کے ہاتھ ایک لحظے کوڑکے تھے۔
 ”اچھا بس، جاؤ یہاں سے، ہمیں کام کرنے دو۔“
 میمونہ بھائی نے انہیں دھکیل کر باہر لگا لیا۔ ”بھیر اُس سے کہنے لگیں۔“
 ”سنو۔ تم کوفتے بناؤ کیونکہ مجھے کوفتے بنانے میں کوفت ہوتی ہے۔“
 ”مجھے آپ سے زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے یہ آئم گول کر جائیں۔“
 ”ڈونگا انہیں تمہاتے ہوئے بولی۔“

”اور عدیل؟“ کیا ضرورت ہے اور مہانوں کے سلسلے تو وہ کچھ کہنے سے رہے۔ بعد میں آپ بھائی نے کہا۔ ابھی تو کتاب بنا کر فریق نہیں رکھیے۔ میں جب تک قورمے کا مسالا تیار کرتی ہوں، وہ غامض حلیت میں اور مصروف رہ کر بول رہی تھی۔ جب میمونہ بھائی بھی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”شام تک سب کھانا تیار ہو گیا۔ صرف کتاب تلنے باقی تھے۔ جیراں اُس نے کھانے کے وقت ہی لے کر مشعرہ دیا۔ اس کے بعد میمونہ بھائی کے کہنے پر نہانے اور پھر آرام کرنے کی عرض سے اپنے رومے میں آ گئی۔ چونکہ اس کا مہانوں کے سلسلے جانا متوقع نہیں تھا البتہ نامہ اور اس کی اتنی اُس نے کمرے میں آ سکتی تھیں۔ اسی خیال کے تحت پہلے اُس نے اپنا کمرہ ٹھیک بھاگ کیا پھر نہانے لگی۔“

”بھیر جب شام گہری ہو کر تاریکی میں ڈوب رہی تھی تب مہانوں کی آمد نے خوشگوار سی پہلی مچا دی تھی۔ شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے عدیل کی نظر شاہ جہاں گھر کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کے ملازمین وہی تافخا اور زعم تھا جو اوّل روز شاہ سکندر میں نظر آیا تھا۔“

”یہ بڑے بھائی ہیں۔ بڑے بھائی، شاہ جہاں گھر حیات۔“
 ”شاہ سکندر نے اُن کا تعارف کر لیا تو سب کی نظریں بڑے اختیار اُن کی طرف اٹھی تھیں۔ یقیناً چونکہ بے والا سربراہ تھا۔ جس نے خدمتوں کے درمیان اطمینان کی لہر دوڑا دی تھی۔“
 ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ عدیل کے بعد اب جی بھیر خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کے ساتھ صاف کر کے ہوتے انہیں بھائی۔“

”مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔ اس وقت جب شاہ سکندر نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“
 ”شاہ جہاں گھر بیٹھے ہی اب جی کو دیکھ کر کہنے لگے۔“ لیکن ایک تو مصروفیات نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ دوسرے میں پہلے اپنے والدین کو کنوئس کرنا چاہتا تھا۔ میری والدہ اور ہمیں تو بہت خوش ہیں۔“

”نورالام۔ وہ بھی زیادہ دیر نا ارض نہیں رہیں گے۔ سکندر نے یہاں آ کر انہیں سوچنے پر تو مجبور ہی کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے وہ بڑے ہیں اور انہیں اپنی بات تو رکھنی ہی ہے۔ اس لیے انہوں نے لدہ اور بہنوں پر باندی لگا دی ہے ورنہ والدہ صاحبہ آئے کو تیار تھیں۔“
 ”اب جی کیا کہتے۔ بس اُن کی باتوں پر سر ہلانے جا رہے تھے۔“
 ”البتہ والدہ صاحبہ نے۔“

”شاہ جہاں گھر نے کچھ کہتے ہوئے شاہ سکندر اور احمد حسن کو دیکھ کر جلنے کیا اشارہ کیا کہ وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔“
 ”میں آسید باجی سے مل لوں؟“
 ”نامہ کو اتنی دیر سے بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ذرا دیر کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر فوراً کھڑی ہوئی۔“

”غور۔ چلی جاؤ گی یا میں؟“ میمونہ بھائی اٹھنے لگیں کہ وہ بول پڑی۔

”میں چلی جاؤں گی۔“
 ”آپ کلنے سے پہلے کچھ لیں گے۔ سیون آپ وغیرہ“ خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کو متوجہ کر کے فرار ہو گئے۔ شاہ جہاں گھر نے منع کرتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا جہاں سے شاہ سکندر اور احمد حسن سامان کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ میمونہ ناٹ سوٹ کیس اور چھوٹے بڑے کی بیگٹ

جنہیں اماں جی کے سامنے رکھ کر وہ دوبارہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ تب شاہ جہاں گھر پہنچا۔ یہ ہماری والدہ صاحبہ نے کچھ جانتے سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ان کی خوشی ہے۔ یہ سب تو یہ عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہیں۔

”اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے کسی طرح تو کرنا ہی تھا بلکہ انہوں نے تائید کی تھی کہ شادی کے لیے کس سے پہلے ہم یہ آپ کی نذر کریں کیونکہ یہ ہمارے ہاں کا دستور ہے۔“

شاہ جہاں گھر بہت اعتماد سے پوری محفل پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے تھے۔ یوں کہ اپنی با میں کہیں بھی کوئی اختلاف کا پہلو نہیں چھوڑ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے۔ اب کھانا ہو جائے۔ باقی باتیں۔“

خلیل بھائی کے اشارے پر میز پر بھائی آئے تھے۔ ہوئے بولیں تو شاہ جہاں گھر نے فوراً ہاتھ مار سیدہ وود میں لے کر اس کا سر سہلانے لگی، تو سیمیا بھابی جو اس کی طرف سے سیدہ کو ڈانٹتے تھیں اس کے برعکس دیکھ کر یہ کام انہوں نے کر ڈالا۔

ہوادرازے تک آیا۔ ہر کسی کے لیے کوئی پیغام ہو تو شاہ جہاں گھر نے دروازے میں دنگ کر اسے خوش نظرد سے دیکھا لیکن وہ ایک دم سنبھلا ہو کر بولا۔

”نہیں بھائی! کسی کے لیے کوئی پیغام نہیں۔“

ادھر کے خاندان نے شاہ جہاں گھر اس کا کنڈھا جھٹک کر باہر نکل گئے۔ تو کچھ دیر وہ ان کے پیچھے نظروں جمے تھے کہ دروازہ بند کر کے اندر کتے ہی گھر کا قہر ڈال کر گئے لگا۔ رات سے اس کا دل اس سے بات کرنے کو چل رہا تھا۔ دوسری بل پر میسے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری سانس لیچتے ہوئے بولا۔

”تھنکس گاڈ! میں ڈر رہا تھا کہیں سارا دن تمہارے ممبر ڈائل کرنے میں نہ گزر جائے۔“

اس کے لیے آپ کو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے، وہ کھٹکتی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیوں، کیا نہیں یقین تھا کہ میں فون ضرور کروں گا۔“

”جی۔ اور اسی لیے میں صبح سے فون کے آس پاس موجود ہوں۔“ اس نے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بہت بہت شکریہ لیکن ایک شکایت ہے تم سے۔“

”مات سب کے بلٹے پر بھی تم کھلنے میں ہمارے ساتھ شریک کیوں نہیں ہوئیں۔“

”کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔“

”کوئی مضائقہ نہیں تھا، خیر تم نے جو کیا ٹھیک کہا۔ یہ بتاؤ ان بندرہ دنوں کے دوران کسی دن ملاقات ہو سکتی ہے؟ وہ بڑی اس سے پوچھ کر اس کا جواب سننے کو بے تاب ہو گیا۔“

”نہیں شاہ سکندر! یہ ممکن نہیں ہے اور بلکہ آپ مجھے مجبور نہیں سمجھیں گے۔“

”اس نے عاجزی سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور قدر سے توقف سے بیکار کر رہنے لگا۔“

”سنو آسید! میں بہت خوش ہوں۔ حالانکہ اپنی اب تک کی زندگی میں میں نے جو چاہا، پایا۔ پھر بھی یوں لگ رہا ہے جیسے میری زندگی کی اولین تمنا پوری ہوئی ہو۔ اور اپنے کے احساس نے میری روح تک کو سرشار کر دیا ہے۔ اتنا خوش شاد میں کبھی نہیں ہوا۔“

”اپنی خوشی میں یہ نہیں بھولنے کا شاہ سکندر، اگر میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے قریب، میری سوچ میں صرف ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔“

”اسیہ نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بات دہرا کر اسے اس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔ اور وہ بھولا نہیں تھا۔“

”مجھے یاد ہے آسید! میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا لیکن تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہم قدم مجھے اپنے ساتھ پاؤں گی۔“

”شکریہ شاہ سکندر! مجھے یقین ہے مرا انتظار زیادہ طویل نہیں ہوگا۔“

”اسیہ نے ممنونیت سے کہہ کر تسلسلہ منقطع کر دیا تو اس نے ہونٹ ہنسی کر کر بسپور کو دیکھا پھر گردن پر ہونٹے ہوئے اس کی آنکھوں میں جانے کس سوچ کی پر چھائیاں اترنے لگی تھیں۔“

”آپ نے کہاں کر دیا بھائی! رات سے شاہ سکندر کی ہر بات کا اختتام اسی جملے پر ہوتا ہے۔“

”مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی قریبی تاریخ پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”مجھے اگر اسلام آباد نہ جانا ہوتا تو میں اس سے بھی قریبی تاریخ طے کرتا۔ خیر بندہ دن بھر نہیں ہیں۔ اتنا وقت تو نہیں بھی تمہاری کے لیے چاہیے۔ وہیں کے زیورات اور کپڑوں کی د کے لیے احمد حسن کی والدہ سے کہو۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ شادی سے دن پہلے آسکوں۔ پس دعا کرو بابا جان کا کوئی کام نہ نکل سکے۔“

”شاہ جہاں گھر اسے ہدایات دینے کے ساتھ اپنی طرف سے اطمینان بھی دلا رہے تھے۔ پھر کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔“

”پیسوں کی بالکل فکر نہیں کرنا۔ اور ہاں کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کا بھی نہیں سوچو۔ شادی کر کے ہوجاؤ پھر اپنے لیے کوئی بڑا بزنس سوچنا۔ اپنے شایان شان۔ اوسکے۔“

”انبات میں سر ہلاتے ہوئے شاہ سکندر کے بزنسوں پر چلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔“

”اب میں جاتا ہوں۔ دوپہر کے کھانے تک گھر پہنچ جاؤں گا چلیے۔“

”شاہ جہاں گھر دیکھتے ہوئے گھر سے ہو گئے تو اس نے بھی ان کی تھلید کی۔ اور ان سے

گوکہ بیٹی کے پیلا ہونے ہی اسی وقت سے اس کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع ہوجاتی ہیں۔ اتنا کہ اس نے اس کے لیے بہت کچھ بنا رکھا تھا۔ اس کے باوجود بہت کچھ باقی تھا۔ اور اتنے کم معقول میں سب کچھ کرنا تھا کہ وہ اس گھر کی اکیلی لڑکی تھی۔ بھائیوں کی لاڈلی، بھائیوں کی چینی اور صحیح امان جی پی پیچ بولھا لگی تھیں۔ اسلام آباد فون کر کے شکیل بھابی اور سیمیا بھابی کو فوراً اسے کو کہا

اُس نے باری باری سب بچوں کو دیکھا۔ سب کے ہنٹوں میں شریر مسکراہٹ دلی تھی اور ایک دوسرے کیبیاں بھی مار رہے تھے۔ اسے ہنسی آگئی۔
 ”دیکھ لیا اے لادلوں کو، یہ آرام سے بیٹھنے والے ہیں“ سیما بھائی نے کہا اور سر جھٹک کر اپنے منہ مصروف ہو گئیں۔ جو اُس نے اشارے سے سمیٹے کو اپنے اس بلایا اور گود میں بٹھا کر آمستہ آواز بن اُس سے جسنے کیا باتیں کہنے لگی تھی کہ دوسرے بچوں میں بے چینی پھیل گئی کہ چھو چھو ان سے باتوں نہیں کریں۔ آخر سے رہا نہیں گیا تو پکار کر پوچھنے لگا۔

”چھو چھو! آپ کی شادی ہو رہی ہے؟“
 اُس بے ساختہ سوال پر وہ جھینپ گئی تو میمونہ بھائی اُس کے پہلو میں چلک کر لویں۔
 ”اگر تم سے پوچھ رہا ہے، جواب دو“
 ”جیسے جتنا ہے، چھو چھو دلین نہیں گی“

وہ میمونہ بھائی کو گھورنے لگی تھی کہ ادھر سونیا نے اپنی قابلیت جنانی شروع کر دی۔
 ”اماں بی نے لال عزارہ بنایا ہے۔ وہ سنیں گی چھو چھو، اتنی باری لگیں گی“
 ”اور دولہا کون بنے گا؟“ اشعر نے یوں پوچھا جیسے کوئی ڈراما تھیلا جا رہا ہو جس پر مجاہدوں کے ہاتھ وہ بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔

”میں بنوں گا“ سب کے درمیان خاموش بیٹھنے والا نبیل جانے کیسے بولی پڑا۔
 ”افوہ، نہیں نبیل بھائی! چھو چھو کی شادی آپ کے ساتھ سٹوڈنٹی ہو رہی ہے۔ وہ تو۔ وہ اچھے والے نکل ہیں ناں۔ ان کے ساتھ ہوگی“
 سونیا کی بات پر وہ تینوں ادھر متوجہ ہو گئی تھیں۔

”وہی انکل دولہا بن کر آئیں گے اور چھو چھو اپنے ساتھ لے جائیں گے، ہیں ناں چھو چھو“
 سونیا نے بات کے اختتام پر اُس سے تائید چاہی تو وہ گردن موڑ کر میمونہ بھائی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس حال کو ماسی کو سب بتا ہے۔ بڑی تیز ہو گئی ہے۔“
 ”کس پر تیز ہے؟“ سیما بھائی تعجب تھیں۔
 ”تھ پر نہیں گئی۔ میں بہت سیدھی سادی ہوں اور اس کی عمر میں تو مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شادی کس چیز کا نام ہے۔“
 میمونہ بھائی نے منہ سے ہلے ہلے تبھی نبیل اسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا۔

”چھو چھو! آپ چل جائیں گی؟“
 ”ہاں“ اُس نے چونک کر نبیل کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ اور ہمت کو شمش سے بھی اُس کی بات کا جواب دے سکی نہ کوئی اور بات۔ کیونکہ نبیل کے چہرے پر انجانا سا خوف تھا۔ میمونہ بھائی اور سیما بھائی بھی دیکھ رہی تھیں۔

”بتائیں ناں چھو چھو! آپ کہاں جائیں گی؟“ نبیل نے پھر اس کا بازو ہلا کر پوچھا۔
 ”چھو چھو اپنے گھر جائیں گی بھائی! ان کی شادی ہو رہی ہے۔ ناں اور یہ تو خوشی کی بات ہے۔“
 ”بھائی! انہوں نے فقدا خوشی کا اظہار کر کے نبیل کو ہلانے کی کوشش کی۔

”اچھے! اچھے! سب خوش ہو رہے ہیں۔“ میمونہ بھائی بھی اپنے انداز میں شروع ہو گئیں۔ یہ اتنے اچھے اچھے بڑے دیکھ رہے ہو، یہ سب ہمتیاری چھو چھو کے ہیں، جب تم سے ملنے آئیں گی تو یہی اچھے اچھے برسے برسے کر آئیں گی، بہت اتراؤں گی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں کنکھنا کر کھکھکا کر سنیں گی، ہے ناں اسیہ۔“
 اور اسیہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اور شکیل بھائی غار سے نکلے۔ البتہ سیما بھائی کو انہوں نے اگلے دن ہی بھیج دیا۔
 سے میمونہ بھائی کو بڑا سہاوا ہو گیا۔ فرخچرخ وغیرہ کے لیے شاہ سکندر نے منع کر دیا تھا کہ بچوں اس کے اپارٹمنٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ اور اس نے تو اور بھی بہت چیزوں کو منع کیا۔ لیکن جی نہیں مانیں۔

”میری کون سی دس بیٹیاں ہیں جن کے لیے سنبھال رکھوں۔ یہ سب جو اسیہ کے لیے ہے۔ کے ساتھ جانے گا۔“

بھائیوں اور بھائیوں نے ان کی تائید کی۔ میمونہ بھائی کا کہنا تھا کہ لوگ شادی میں آئیں زیادہ اس کا جیز دیکھنے آئیں گے۔ کہ چار لائق فائق بھائیوں کی بہن کیا کچھ لے کر جائے۔

”پھر تو آپ کو جیز پر ٹکٹ لگا دینا چاہیے۔ سارے پیسے وصول ہو جائیں گے۔“
 اُس نے میمونہ بھائی کی بات سن کر شرارت سے کہا۔

بہر حال پہلا سہفہ تو سیما بھائی اور میمونہ بھائی کا بازاروں کے چرہ ہانے میں نکل گیا۔ اس کے سینکڑے کامرہ آئے تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جائی کیونکہ گھر کے کام کاج اماں جی اسے نہیں دے رہی تھیں۔ اور فارغ بیٹھنا اُس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ اُس وقت وہ مجاہد ہاتھ پٹنے کی عرصہ سے اُن کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میمونہ بھائی اُسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تم جب چلی جاؤ گی تو سب سے زیادہ تمہاری جی مجھے محسوس ہوگی۔“ سچ مجھے تو سوچ کر وہ ہو رہی ہے۔ پتا نہیں میرے دن کیسے کیں گے۔ آف میں تو بولے بغیر وہ بھی نہیں سکتی۔

جسے میں کیا باتیں کر لوں گی؟ اُس نے بڑے آرام سے کہا تو میمونہ بھائی بے ماذ

”شاہ سکندر کی؟“ وہ اچھل پڑی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ اچھل پڑی۔

”سیما بھائی پہلے ہی شاہ سکندر کا نام لیتے جانے پر ہنس رہی تھیں۔ اُس کے اچھلنے پر بھائی بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئیں تو وہ جڑ بڑی ہو کر سوٹ کیس کھولنے لگی۔

”اُسے مت چھیرو، بڑی مشکل ہے پیک کیا ہے۔“

میمونہ بھائی مہی روک کر جھلپیں تو اُس نے سوٹ کیس جوڑ دیا اور گھٹنوں کے گرد بازو بٹھ گئی۔ پھر روٹھا روٹھا سا انداز تھا۔ بھی بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے

گلتے سے سمیٹے اُس کے اوپر آن گری۔

”آف۔“ سید کا سر بڑی زور سے اُس کے سر سے ٹکرایا تھا۔ ایک لحظہ کو وہ چکر لگتی

”ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھا جاتا تم لوگوں سے۔ اسی کی افتاد آن پڑی تھی کہ بھاگے نہیں ڈانٹیں بھائی! بچتے ہیں اُس سے ڈرے ہوئے معصوم چہروں کو دیکھ کر ان کو

”بچوں کو آرام سے بیٹھا منع ہے کیا۔ چلو سب ادھر آکر بیٹھو۔“

سیما بھائی نے لائن سے اشارہ کر کے سب کو ایک جگہ بٹھایا پھر انہیں ہنٹوں پر لانگلی تو اُس نے فوراً احتجاج کیا۔

”یہ زیادتی ہے بھائی!“
 ”نہیں نہیں، یہ خاموش بیٹھیں گے۔“ سیما بھائی رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوئیں۔
 ”ٹھیک ہے میں انہیں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے اُٹھنے لگی
 نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، یہیں بیٹھو، بچوں نے کون سا ہادی بات ہے۔ ابھی دیکھنے کیسے بولیں گے۔“

”آداب!“ خوش رہو، سدا سدا گن رہو۔ اور وہ کیا کہتے ہیں دو دھوں نہاد پوتوں پھلو، کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ میونہ جہانی کی زبان جلی پڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکان کھینے لگی۔ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر بولی۔

”کچھ دعائیں بعد کے لیے بھی رہنے دیں!“

”بدرکب! یعنی بچوں کے لیے۔ اسے انہیں آنے تو دو بھر!“

”اس نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید بولنے سے روکا اور میونہ جہانی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”ان کو ساتھ لانے کا کیا درست تھی۔ شاہ سکندر کے سامنے یونہی اٹھا سیدھا بولتی رہیں گی!“

”گئے کہاں شاہ سکندر؟“ میونہ جہانی نے اپنے پیچھے دیکھا پھر اسے دیکھ کر بولیں۔ ”ہم ناشتا لائے ہیں، چلو پیسے، ناشتا کر لو!“

”نہیں پیسہ انہیں کھائیں۔ یہ خاموش بیٹھیں گی۔“ اس نے میونہ جہانی کے ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”پھر آجاک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

”آپ دونوں آج کس کس کے ساتھ ہیں؟“

”عدیل کے ساتھ۔ اور دیکھو اس نے کہا بھی تھا کہ زیادہ دیر نہیں رکتا اور ہم ابھی یہیں کھڑے ہیں۔ چلو میونہ ناشتا لگا دوں!“

”عدیل کا نام لیتے ہیں؟“ میونہ جہانی جلدی جلدی کہتے ہوئے میونہ جہانی کا ہاتھ کیلنج کر کر کے سے نکل بن۔

”پھر بے ساتھ ناشتا کیا۔ اس کے بعد دونوں بھابیوں نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ جاتے شاہ سکندر نے پہلے سے طے کھو رکھا تھا یا اسی وقت سوچ کر کہنے لگا۔

”اس وقت آپ کے ساتھ جانا اگر رسم، رواج میں شامل ہے تب بھی مجھے مذرت کرنی پڑے گی، کیونکہ آج لاہور روانہ ہو رہے ہیں۔“

”وہ چونکی ضرور لیکن یوں بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔“

”ہنرمون کے لیے لاہور؟“ میونہ جہانی کو جاننے کیوں تعجب ہوا۔

”فرسٹ اسٹےس پیلا قیام۔ لاہور اس کے بعد فری، ایسٹ آباد سوات اور جہاں سیر کریں گی۔“

”شاہ سکندر نے دمکش مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”اسلام آباد ضرور آنا ہے ہمارے پاس۔“ میونہ جہانی نے کہا تو میونہ جہانی فوراً احتجاج کرتے ہوئے بولیں۔

”یہ غلط ہے۔ جو دور ہیں، ان کے پاس آپ پہلے جائیں گے۔“

”آپ کے پاس تو مجھے آنا جانا ہے گا، کیوں اسیہ؟“

”جی ہاں اس نے بس جی کہتے پر اکتفا کیا۔

”میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ چنانچہ جب تبا کر نکلی تب بھی وہ گہری نیند میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ چنانچہ کب اٹھا تھا۔ اور وہ اسے اٹھانے کے خیال سے جھجک رہی تھی۔ پھر اسی شش و پنج میں اس سے نکل کر آئی تو پہلے پورے پارٹمنٹ کا جائزہ لیا اس کے بعد کچن میں آکر چائے بنانے اور چائے بناتے ہوئے اس نے قصداً کچھ برتنوں کو اٹھانے رکھنے میں آواز پیدا کرنا شروع کیا۔ وہ ان آوازوں سے اٹھ جائے۔ لیکن وہ تبا نہیں مردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ تبا وہ نیند پر رشک کرن ہوئی دونوں مگ ٹپنے میں رکھ کر لے آئی۔ اور جیسے ہی اس کے قریب پرہڑنے رکھنے کے لیے جھکی پشت پر کھلے لائے کیلے بال اس کے چہرے پر کھیر گئے۔

”صبح بخیر! شاہ سکندر اس کے بالوں میں سے جھانک کر مسکرایا تو وہ گھیر کر اپنے بال پر ہونی سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”چائے پیجیے۔“

”چائے! شاہ سکندر کہنیوں پر وزن ڈال کر اوجھا ہوا اور اپنے پیچھے مکیہ سیدھا کر کے ساتھ میک لگا کر بیٹھنے کے بعد اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

”چائے تم نے کیوں بنائی۔ نیچے اٹھا دیا ہوتا یا۔“

”آپ گہری نیند میں تھے۔“

”ہاں۔“ وہ اپنے آپ غلط فہم کر اور جیسے بہت خوشگوار احساس میں گھر کر بولا۔ ”زندگ بھی بال میں نے ہار کا فرہ جیسا ہے۔ بتا رہی غمت میں ہار کر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔“

”اور میں نے جیت کر بھی ہوش نہیں کھونے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ اس کی پکلیں جھلی ہوئی۔

”سر اوجھا تھا۔“

”شاہ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا اور اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کی ذہنی رو بہ جیتے تو اب بھی شاہ میں تو بارگئی۔“

”ہارنے کا دکھ نہیں ہے تمہیں؟“ وہ بے اختیار کہہ گیا۔

”ہاں۔“ وہ چونکی، حیران ہوئی پھر نیچے کارپٹ پر بیٹھنے لگا۔

”ٹکا کر ایک ہاتھ ٹوٹی کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔

”آپ تو سچ بول رہے ہیں جیسے آپ جیتے، میں ہاری اور مجھے ہارنے کا دکھ نہیں ہے۔“

”شاہ سکندر اپنی بے اختیاری پر جزبہ زور ہاتھ۔ جیسی اس کی بات کے جواب میں فوراً کچھ سکا تو ہاتھ بڑھا کر جانے کا ہٹ اٹھا کہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ تب ہی کال بیل کی آواز پر وہ نظروں سے دھکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں دیکھتا ہوں!“ وہ فوراً مگ رکھ کر کمرے سے نکل گیا چند لمحوں بعد میونہ جہا سنا دی تھی۔

”آف۔ شادی کے گھر میں اتنی خاموشی!“

”وہ جلدی سے بڑکی جادو جھک کر کے قصداً دروازے کی طرف پشت کر کے بیٹھ۔

”میونہ جہانی کا تھا۔ کسی کا کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں جو منہ میں آجاکہہ دیتیں۔

”ارے، یہاں تو گھٹا چھائی ہے۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی میونہ جہانی کی نظر اٹھنے لگی۔

”کھلے بالوں پر بڑی تھی۔“

”دیکھو میونہ برس چکا یا۔“ میونہ جہانی کی معنی خیز منہ پر وہ لجا کر کھڑی ہو گئی اور روپٹے ہوئی ان کی طرف پلٹ کر بولی۔

”جی باباجان! شاہ جہانگیر بڑے مخلوط انداز میں مسکرائے۔
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں سوا؟“
 ”نہیں، سب ٹھیک ہوگا۔ بہت خوش تھا سکندر، میں نے اُسے پیسے بھی دے دیے اور ساتھ آج کی تاریخ کے ٹکٹ بھی، میرا خیال ہے ایک مہینہ ضرور گھومتے پھرنے میں گزارا۔
 شاہ جہانگیر کا انداز روبروٹ پیش کرنے والا تھا۔
 ”ہوں، باباجان نے پُر موع انداز میں سر ہلایا پھر انہیں دیکھ کر کہنے لگے، ”ٹھیک ہے فریض ہونے دو۔ گھومتے پھرنے دو، کر لے اپنے شوق پورے۔ مہینہ دو مہینہ چھ مہینے، پیسے کی تنگی نہیں ہونے دینا اُسے، سمجھ رہے ہوں؟“
 ”جی باباجان! لیکن کیا مہر النساء، اتنا عرصہ خاموش رہ سکے گی؟ شاہ جہانگیر نے خدشہ ظاہر کیا۔
 ”اُسے خاموش کرنا مشکل نہیں ہے۔ البتہ اُسے سکندر کی شادی کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہی ظاہر کرنا کہ تمہاری ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی، ایک دو مہینے کی بات ہے۔“
 ”میکے چلے جائے گی اور بچے کی پیدائش تک وہیں رہے گی، اس کے بعد بھی ہم سنبھال لیں گے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔“
 باباجان سر سے مہر النساء کو اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔
 ”اصل مسئلہ وہ شہری لڑکی ہے، کیا بتاتا تھا تم نے کتنا بڑھی ہوئی ہے؟“
 ”ڈاکٹر نے شاہ جہانگیر کی نظروں میں اس کا چہرہ گھوم لیا۔ جس کی آنکھوں میں ہلاک دہانہ ڈاکٹر شہر میں ڈاکٹر تجربے پڑے ہیں۔ ایک تم ہو جائے گی تو تھر والوں کو فرق تو نہیں لگے گا۔“

سوچتے ہوئے انداز میں باباجان جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔
 شاہ جہانگیر چونک کر انہیں دیکھنے لگے، تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد باباجان موضوع پر گئے۔
 ”تمہیں اس بار الیکشن میں کھڑا ہونا ہے۔ میں نے راؤ صاحب سے بات کر لی ہے۔“
 مضبوط ہاتھ اور مقبول بھی، گزشتہ بار انہوں نے یونیس پر بہت زور دیا تھا کہ کم از کم اُسے سے توڑے لیکن یونیس کو ساست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، تمہیں تو بے ناں! شاہ جہانگیر بے ساست مسکرتے، جانے اُن کی مسکراہٹ میں کس بات کا اظہار تھا۔ جیسے ہی سمجھ گئے اور فہمیدہ لگا کر بولے تھے۔
 ”تم کامیاب سیاست دان ہو سکتے ہو۔“
 ”میں چلوں۔ لی بی جان صبح سے پوچھ رہی تھیں، اُن سے مل لوں؟“
 شاہ جہانگیر اُنھ کے کھڑے ہوئے اور باباجان کی اجازت ملنے پر اُن کے کمرے سے بی بی جان اُس وقت بڑے کمرے میں ہوتی تھیں۔ شاہ جہانگیر اُسی صحت جاری تھے سے نکل کر مہر النساء سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔
 قصداً انہیں بن کر بولے۔
 ”کیا بات ہے مہر؟“
 ”شاہ کا کوئی ایسا شاملا؟“ مہر النساء نے بغیر جھجکے براہ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔
 ”کیا تو ایک لمبہ کو وہ ٹھیک گئے کیونکہ ایسی بے باک جرات کا مظاہرہ اس گھر کی عورت نے نہیں تھی۔“
 ”میں سنبھل کر بولے تھے۔“
 ”مل جائے گا تمہارے شاہ کا آتا ہوتا۔“
 ”کب؟“ مہر النساء کا استفسار جاری نہ تھا۔ جیسے صبر اور ضبط کی حد ختم ہو رہی ہو۔

جب زندگی مہربان ہو جائے تو جانے وقت جہانگیر کیوں لگتا ہے۔ خوبصورت دلفریب لمحے ملتے چلے جاتے ہیں۔ ان دنوں لاہور کا موسم بھی غضب کا تھا اور ادھر دل کی بستی میں بھی جہادیں سے قبوین پر تھیں۔ سارا دن اُن کا گھومنے پھرنے میں گزر جاتا۔ تاریخی مقامات میں وہ سب سے وہ شاہی قلعے سے شائر ہوتی تھی۔ اور وہاں سے آنے کے بعد بھی اُس کا ذہن وہیں جھٹک رہا۔
 ”سچ مجھے ایسا لگا جیسے جنت کا کوئی گوشہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ سبزے اور پھولوں پر کیسا نکھار کیا اُس زمانے میں بھی یہ اتنا خوبصورت تھا۔ وہ جن خوبصورتیوں کو شدت سے غموش کر رہی تھی۔ اس وقت ابھی کا تصور تک رہی تھی۔“
 ”کس زمانے میں؟“ شاہ سکندر بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔
 ”بادشاہوں کے زمانے میں۔“
 ”نہیں، شاہ سکندر نے اُسے یقین سے کہا کہ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔
 ”جس پر وہ مسکرا کر بولا، اُس وقت تم نہیں تھیں اور ساری خوبصورتیوں کا تصور تمہارے ساتھ بہتے۔“
 ”اچھا۔“ وہ ذرا سانس لی۔
 ”میں سچ کہہ رہا ہوں، اس سے پہلے تو مجھے یہ جگہیں بلکہ دنیا میں کہیں اتنی خوبصورتی نظر نہیں تھی۔ اور آج مجھے ہر شے حیران لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ کسی۔۔۔ بھی سمت اُنھ سے پہلے نظر آئے چہرے پر پڑتی ہے۔“
 ”تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں اُس کر میں نے جانا تھا کہ سکندر کے اندر کتنے سیپ چھپے۔“

”تمہاری ہلکوں کی جھاروں نے اول روز تیری دھوپ میں مجھے پُر کیف چھاؤں کا احساس بخشتا تھا۔ اور میں نے کیا لیاں چٹکتی ہوئی بار بار دیکھی تھیں لیکن اُن کی خوبصورتی کا ادراک تمہاری مسکراہٹ جتنے کے بعد ہی ہوا تھا۔“
 ”اُس کے لیے میں جہلوں کی شدتیں تھیں اور لوری طرح اُس کی محبت میں ڈوب کر بول رہا تھا۔ وہ ہم اُسے دیکھ گئی۔ جبکہ دل اتنی قبت پر رکھنے لگا تھا۔ اور پھر بے اختیار اُس کا ہاتھ آنکھوں پر اکر دیڑھی۔“
 ”بس کرؤں سکندر! میں مرجاؤں گی۔“
 ”اُسے شاہ سکندر نے حیران ہوتے ہوئے اُسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔“ تم رونے لگا لگیں، کیا میری کسی بات سے تمہیں دکھ ہوا ہے؟“
 ”اُس کے آنسو اور شدت سے بہہ کر اُس کی قمیص میں جذب ہونے لگے تو اپنے سینے پر غمی غموش سے ہی شاہ سکندر اُس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرنا ہوا بولا۔“

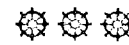
”بتاؤ اُس میں برائیاں ہو رہی ہوں؟“
 ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اُس کی آواز آنسوؤں میں جھجک رہی تھی۔“
 ”اُس سے؟“
 ”شاہ سکندر نے ایک بل میں اُسے خود سے الگ کر کے اُس کا چہرہ اپنے منہ کیاتو وہ ذرا سانس میں سر ہلا سکی۔“

”بھڑ“ وہ اچانک کسی خیال سے خائف ہو کر بولا۔
 ”وقت سے، جس نے میری جھولی میں اتنی غبت، اتنی خوشیاں ڈال دی ہیں اور وقت کا اعتبار۔“
 وہ جھولیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ شاہ سکندر اس کا مطلب سمجھ کر ادا شانت ہو گیا۔ اور پھر اسے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا تھا۔
 ”وقت خواہ کتنے پہلو پر لے میری غبت میں کتنی نہیں ہوگی، تمہیں مجھ پر اعتبار رہے کہ نہہ“
 ”آپ پر تو اسے آپ سے بڑھ کر اعتبار ہے۔“
 ”پھر وقت کے کیا ڈرنا۔ چلو منہ دھو کر فریض ہو جاؤ۔ میں چائے منگواتا ہوں۔ اور اس بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟“
 شاہ سکندر نے خوشگوار موڈ میں آکر فضا کو کبیر بدل دیا۔

”یکٹنگ۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”جناب اور پہلے ہم مری جائیں گے۔ شاہ سکندر نے اپنا اگلا اسٹیشن بتایا تو وہ واٹ کی طرف جاتے جاتے ٹوک کر بولی۔
 ”اسلام آباد کیوں نہیں؟“
 ”اسلام آباد۔ ہم صرف ہتھارے جہانی بھائی سے ملنے جائیں گے، وہاں قیام کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔“
 شاہ سکندر اپنا پروگرام بتا کر لوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے پروگرام میں کوئی رد و بدل کی لیکن وہ جانتے کیوں سوچ کر خاموش ہو رہی تھی۔

مری میں ان کا استقبال سرد ہواؤں نے کیا تھا۔ اس کے بعد بارش کا جو سلسلہ شروع دو دن وہ ہوٹل کے کمرے سے نکل نہیں سکے۔ سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سارا دن سامنے بیٹھ کر جانے کب کب کے واقعات دہرائے گئے۔ اور جب وہ اپنے لندا کے واقعات سن رہا تھا۔ تب وہ درمیان میں بول پڑی۔
 ”پہلے مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتائیں۔“
 ”گھر کے بارے میں کیا بتاؤں؟“ وہ کہہ کر سرکٹ سلگنے لگا۔
 ”میرا مطلب ہے گھر والوں کے بارے میں، باباجان، بی بی جان اور کون کون ہے اس نے جتنے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ اس قدر سرسری انداز میں بتانے لگا۔
 ”سب سے بڑے یونس جہانی اور ان کی سیم اور ان کے چار بیٹے جن میں سے تین: کالونیٹ میں ہوتے ہیں۔ پھر آیا نور بالوہیں جو اپنے گھر ہوئی ہیں۔ ان کے بعد جہانگیر، تامل جی جی۔ ان کے تینوں بچے بھی یہیں ہیں۔ پھر میں ہتھارے سامنے بیٹھا ہوں اور میرا ابھی آٹھے نہیں۔“

وہ بری طرح بھیپ گئی۔ لیکن وہ اسی روانی سے بول رہا تھا۔
 ”آخر میں تہہ بالوہیں ہے وہ بھی اپنے گھر کی سہیلی۔ یعنی اس وقت حویلی میں زیادہ افراد یونس جہانی، جہانی اور ان کی چھٹی بیٹی جہانگیر جہانی، جہانی، باباجان، بی بی جان اور مہر النساء مہر النساء کون؟“ وہ اس اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
 ”مہر النساء کون؟“ وہ اس اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
 بے حد بوکھلا کر شاہ سکندر نے سکریٹ کا جھٹکا ہوا سرا ہوٹلوں سے لگا لیا تھا۔



”اب“ آسید نے جھینٹے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایش برے میں پھینکا پھر اس کے ہونٹ پر بخشا سا بدمذکر خفگی سے بولی۔ ”یہ کیا کیا آپ نے۔ سارا ہونٹ جلادیا۔“
 ”بس وہ۔“ بے دھیانی میں سگریٹ الٹا وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے نظریں چاکر کر بولا۔
 ”بس آج سے سگریٹ بند“ وہ قطعیت سے کہہ کر غالباً ڈسٹ بن میں ڈالنے کی عرض سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھانے کی بجائے شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”اوں بول“ یہ نہیں چھوڑ سکا۔ اب خدا را یہ مت کہہ دینا کہ اسے نہیں چھوڑ سکتے تو مجھے چھوڑ دیں؟
 وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
 ”یہ تو کہہ سکتی ہوں کہ سگریٹ دھواں سے پیسا کریں۔“
 ”سارا دھواں تو تم خرچ کر لیتی ہو۔“ شاہ سکندر بڑی خوبصورتی سے اس کا دھواں بنا کر خود بھی اطمینان سے بو لگا تھا۔

”اگلی صبح بارش تھرپکی ٹپ ٹپک بادل اسی طرح موجود تھے۔ ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر گلاس ونڈوسے باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر آکر اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا دور ختم ہو رہا تھا اور نئے الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا اخبار انہی خبروں سے بھرا پڑا تھا اور اسے سیاست سے دلچسپی نہیں تھی لیکن ہر شہری کی طرح یہ ضرور جاننا چاہتی تھی کہ آئندہ حکومت کس کی ہوگی۔
 ”کوئی خاص خبر ہے؟“ شاہ سکندر واٹس روم سے وریں آپ ہو کر نکلا تھا۔ اسے اخبار میں معروف دیکھ کر روہی پوچھ لیا۔
 ”تمام سیاسی جماعتوں نے اتحاد کر لیا۔ ادھر بھٹو صاحب کا کہنا ہے کہ سب مل کر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کوئی عوام ان کے ساتھ ہیں۔“ وہ اور بھی آواز میں سرخیاں بڑھنے لگی۔
 شاہ سکندر اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
 ”ہاؤم تیار ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ دوبارہ بارش شروع ہو مومن گیلانی کے گھر پہنچ جائیں۔“
 ”یہ کون ذات شریف ہیں؟“ اس نے پوچھا تو وہ جو اخبار پر نظر پڑا دوٹوٹ لگا تھا، سرسری انداز میں بولا۔

”میرا دوست ہے محسن۔ آکسفورڈ میں ہم ساتھ پڑھتے تھے۔“
 آسید نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور جونی کے بل کھولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی اور جب وہ دونوں ہوٹل سے نکلے اس وقت بھی بادل گھر گھر کر رہے تھے۔ کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد شاہ سکندر نے ٹیکسی کو اشارہ کیا تھا۔
 پھر پہلے مرحلے پر محسن گیلانی بہت پر خوش انداز میں شاہ سکندر سے بغل گیر ہوا لیکن جب اس کا تعارف ہوا تو فوراً ناراض بھی ہو گیا۔
 ”یارا تم نے شادی کر لی ادھر جبے خبر تک نہیں کی۔ ایمان سے اگر بھائی کا خیال نہ ہوتا تو میں نہیں کہنے کو لے نکال دیتا۔“

”پہلے یہ بات سن لو مجھے شک نکال دینا۔ شاہ سکندر دھیرے دھیرے اسے رام کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میری شادی اس طرح نہیں ہوئی جیسے تم سمجھ رہے ہو۔ میرے اپنے گھر سے کوئی شریک نہیں ہوا۔“
 ”مومن کو میری یا محسن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

شاہ سکندر نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور آسید تقدیر انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔
 ”مومن تو مجھے نہیں موست ویکم کہنا چاہیے۔“ بھٹو میں املاں کو ہلاتا ہوں۔ محسن ساری ناراضگی مومن کو خوشدلی سے بولا۔ پھر کمرے سے نکل گیا تو وہ اس سے کہنے لگی۔

کہا ضرورت تھی انہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہ تھی۔
 "تو جتنا تو یہ میرا بہت برا حشر کرتا۔ دیکھ کر کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے۔"
 شاہ سکندر نے اسے غور سے نظروں سے دیکھا تو وہ جھپٹ کر اس سے دودھ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔
 محسن اپنی والدہ کے ساتھ اندھا یاں اور اس انہیں کھڑے دیکھ کر تعجب سے بولا۔

"تم ابھی تک کھڑے ہو۔ ارے کم از کم بھائی کو تو کھانا دے۔"
 "السلام علیکم" شاہ سکندر نے محسن کی بات ان سنی کر کے اس کی اماں کو سلام کیا تو امیر زادہ فوراً اس کی قید کر کے اور اس کے گرد گھومتے لگ گئی۔

"جیتی رہو، خوش رہو، اللہ عمر دراز کرے" اماں نے دھیروں دعا میں دیں۔ پھر اسے اپنے بھٹاکر پوچھنے لگیں "شاہ پور سے آ رہی ہو۔ کیسی ہیں تمہاری بی بی جان اور وہ ان کی بچی شہزادی؟"
 "جی ہاں، کچھ گھبرا کر وہ ہیں جی کہہ سکتی۔"

"میں ایک بار بھی کبھی تمہارے سسرال کوئی چار سال پہلے کو گئے ہیں؟" بڑی بی بی ذہن پر ہونے تھکتے لگیں "ماشاء اللہ بڑے مستند بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ بڑی خاطر مدارت کی تم نے ہماری۔ پھر میرے محسن کی شادی پر تمہاری ساس آئی تھیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔"
 "جی ہاں" وہ ابھی بھی گھبرا رہی تھی کہ کہیں بڑی بی بی ان کے بارے میں اس سے کوئی سوال نہ کرے۔
 "تم ان کی سب سے چھوٹی بہنوئی ہو، بھوناں؟"

"جی اور آپ کی بہنوئی کہاں ہے؟" اس نے فوراً دھڑکنے والی طرف مڑ دیا۔
 "وہ ہیں اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ میں نے بلوایا ہے اسے ابھی آتی ہوگی" ابھی بات ان بہنوئیوں میں محسن کی بیوی نے کوئی نکتہ میں دبا کر دروازے سے پوچھتے ہوئے آگئی۔

"کون آیا ہے۔ ارے سکندر بھائی۔ السلام علیکم۔"
 "آپ اتنی سہری میں کہاں گھوم رہی ہیں؟" شاہ سکندر نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ وہ میں نہیں گھوم رہی۔ یہ کچھ گھبرا رہے تھے۔ "وہ بچے کو محسن کی گود میں دلتے ہوئے بولا۔
 "خود اسیر کی طرف اشارہ کیا۔"

"بھلا بھائی سے ملو، وہ اماں کی باتوں سے بور ہو رہی ہیں؟"
 "بھائی؟" وہ خود اسیر کی طرف متوجہ ہوئی لیکن اس کی طرف بڑھنے سے پہلے سوالیہ نظروں کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔
 "نیک سکندر حیات؟"

"اسیر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اس سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔
 "بڑے بے مروت ہیں سکندر بھائی۔ یعنی اپنی شادی میں نہیں بلایا۔ خیر ان سے تو بہ نمٹوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ جائے وغیرہ بھی پی پائیں؟" وہ اسیر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔
 "نہیں بیٹی، ابروین کو تو میں نے نہیں بلانے بھیج دیا تھا۔ چائے کون بناتا؟" اماں نے چائے کا سبب بھی بتایا۔

"یہ تو زیادتی ہے مہمانوں کے ساتھ؟" وہ کہتے ہوئے جلتے لگی پھر غالباً اسیر کے بور ہونے کے اسے دیکھ کر بولی۔ "مہرو! تم بھی آ جاؤ۔"

"اسیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے مخاطب کر رہی ہے، جبکہ دیکھ اُسے رہی تھی۔ کچھ شش اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

"اماں کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، میرے ساتھ آؤ۔"
 اس نے شاہ سکندر کو دیکھا وہ محسن کے ساتھ سیاست پر بات کر رہا تھا تب وہ اماں کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابھی آپ نے مجھے مہر و کبر کر پکا رکھا۔ میرا نام مہر و تو نہیں ہے؟"

کچھ میں آتے ہی اسیر نے اس سے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی پھر فوراً سنبھل کر ہنسنے ہوئی۔
 "سہری، مجھ سے غلطی ہوئی۔ اب جلدی سے اپنا نام بتاؤ تا کہ دوبارہ غلطی نہ ہو۔"

"اسیر؟"
 "اچھا نام ہے؟" وہ پلٹ کر چو لہا جلاسنے لگی تو اسیر کو لگا جیسے وہ اس کے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر اسے ٹوٹتی ہے اور اگر یہ پہلی ملاقات نہ ہوتی تو وہ سوال ضرور کرتی۔

شاہ سکندر نے کہا تھا کہ اس کا اسلام آباد میں قیام کا کوئی پروگرام نہیں اور اس وقت وہ بھی ناموش ہو رہی تھی۔ ابھی بھی اس نے سکندر سے کچھ نہیں کہا۔ خود ہی سوچ رہی تھی کہ اس طرح خوشحال بھائی اور خصوصاً سیما بھائی ناراض ہوں گی کیونکہ انہوں نے بہت اصرار سے بلایا تھا اور جلتے شاہ سکندر کو اسلام آباد پھرنے پر اعتراض کیوں تھا۔

"بھو! کس سوچ میں ہو؟" شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی۔

"وقت کے بیکارے پر حیران ہو رہی ہوں۔ آخر یہ اُسی وقت کیوں بھاگتا ہے جب ہم اسے روکنے کی خواہش رکھتے ہیں؟"

"یہ تو وقت سے پوچھنا بڑے گا۔ ویسے تم اسے روکنا کیوں چاہتی ہو؟" شاہ سکندر نے غور سے مسکرا کر بولی۔

"روکنا نہیں چاہتی، بس یہ بے فکری کے لحاظ کچھ طویل ہو جائیں۔" وہ برف مٹی میں دبا کر اوپر چلتے ہوئے بولی تو شاہ سکندر قد سے رک کر کہنے لگا۔

"یہ تو ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہم کچھ دن اور یہاں رک سکتے ہیں بلکہ جب تک تم چاہو۔" وہ بے فکری کا لہجہ تھا یہاں وہاں سے نہیں ہے شاہ سکندر؟ وہ اس کی بات پر غور کر رہی تھی تو وہ کہنے لگا۔

"کبھی کبھی تم بہت گہری باتیں کرنے لگتی ہو۔ میں گھبرا سیدھا سا دا بندہ۔ پریشان ہو جاتا ہوں؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے؟" وہ ہنسی۔
 "پریشانی کی بات یہ ہے کہ تم بہت دُور نکل آئے ہیں اور یہاں سے کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی نہیں ملے گی؟" شاہ سکندر تبھی مڑ کر دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

"یہاں سے ٹیکسی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سامنے کا فوٹیف نظر آ رہا ہے۔ چلیں پہلے بیچوں میں لیں؟"

"اس نے سامنے اسکول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شاہ سکندر اندر ہی اندر حیرت زدہ ہو کر بولا۔
 "بیچوں سے مل کر کیا کرو گی۔ بہت شرارتی ہیں جیسے تمہارے بھتیجے بھتیجیاں بلکہ ان سے بھی زیادہ۔"

"یہ سب سوالوں سے نہیں پریشان کر کے رکھ دوں گی؟"
 "میں پریشان نہیں ہوں گی۔ بس آپ چلیں؟" اس کا اشتیاق فطری تھا۔ مجبوراً شاہ سکندر نے بارگاہ صلیب سے۔

غالباً شدید سہری کے باعث ہی اسکول کے لان اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ایک بڑے برآمدے میں جو کچھ درمل گیا۔ جس نے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی سلام کرنے کے ساتھ ایک روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"یہاں آئے ہی تھے اپنا پچھن یاد آ جاتا ہے؟" شاہ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے "جب بابا مہمان مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں کتنی دیر ان سے غبار بٹاتا تھا کہ انہوں نے مجھے ساکین پھوڑ دیا ہے۔ پھر میں ان کے ساتھ جلتے کو چلتا تھا تو وہ مجھے بھلاتے بھلاتے پریشان آئے تھے، لیکن اس وقت تک نہیں جلتے تھے جب تک میں بہل نہیں جاتا تھا اور خوشی سے

”میں نے غلط تو نہیں سوچا ناں؟“ شاہ سکندر کی سرگوشی قریب سے سنائی دی تو وہ بری طرح
خجکی تھی۔

”اماں جی پھو پھو کیوں چلی گئیں۔ پھو پھو کو بلائیں۔ نیل غنودگی میں لول رہا تھا۔
اماں جی مانا کے بعد دھکے لیے ہاتھ پیسوں سے بھی نہیں۔ نیل کی بڑ بڑاٹ سن کر انہوں
نے جلدی سے ہاتھ منہ پر پھیرے اور آٹھ کر نیل کے چہرے اور سینے پر دم کرنے کے بعد اُس کی
پیشانی چھو کر کہنے لگیں۔
”نیل! کیا بات ہے بیٹا۔ مجھ سے کہو۔“

”پھو پھو!“
”اماں جی! بیٹا! تمہاری پھو پھو بھی آجائیں گی۔ تم اچھے تو ہو نا اماں جی! اُس کا سر گود میں رکھ کر اسے
بھلانے لگیں۔ پھو پھو نے بھائی سوپ لے کر آگئیں۔
”اماں جی! کسی طرح یہ نیل کو بلائیں۔ صبح بھی اس نے دوتھیلے کر چھوڑ دیا تھا۔“
”کیا کروں۔ میرے ہاتھ سے تو بچے لے ہی نہیں رہا۔ کہتا ہے میں نے اس کی پھو پھو کو بھیج دیا۔
پہلے اسے بلاؤں پھر میرا کہنا ملنے کا۔“ اماں جی بے بسی سے گویا ہوئیں۔
”منگ کر آئی! آج اسے کو کو نہ بچے کو ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھو۔ شادی ہو کر چلی جاؤ گی تو
سب سے زیادہ یہی محسوس کرے گا۔ دیکھ لیں گئے دونوں سے، بخار میں پڑا ہے۔“
”میمو نہ بھائی! تاحف سے کہتے ہوئے نیل کے پاس جگہ بنا کر بیٹھیں اور سوپ کا پیالہ نیل پر رکھا
پھر دیکھ لیں۔“ اُس کا چہرہ اچھک کر بولیں۔

”نیل! اٹھو بیٹا! یہ مٹو سا سوپ پی لو۔“
”پھو پھو! نیل تے قسطی آئیں کھول کر پکا۔ تو میمون نہ بھائی اُس پر جھک کر بولیں۔
”ابھی پھو پھو کا فون آیا تھا۔ بہت ناراض ہو رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں اگر نیل نے کچھ کھایا پیسا
نہیں اور دوا نہیں لی تو میں نہیں لوں گی۔“
”کیا آئیں گی پھو پھو؟“
”معلمی سے اچھے ہو جاؤ پھر دیکھنا وہ آجائیں گی! میمون نہ بھائی اُس کے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر
اُنکے کی کو شش ش کرتے ہوئے بولیں تو نیل نے فوراً اماں جی سے تصدیق چاہی۔

”ہاں اماں جی!“
”ہاں بیٹا! تمہاری چچی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چلو آٹھ کر بیٹھو۔ شاباش لاؤ دُھن! یہ پیالہ مجھے
دو میں اسے پلائی ہو۔“
”نیل کے ہوشیار ہونے پر اماں جی کے ہاتھوں میں بھی تیزی آگئی۔ فوراً میمون نہ بھائی سے پیالہ
لے کر چچے سے نیل کو سوپ پلانے کے ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں۔
”تمہیں بتا ہے، پھو پھو کو ہمارے نیچے اچھے نہیں لگتے۔ اس کے کان سے پہلے ٹھیک ہو جاؤ ورنہ وہ
بہت ناراض ہوگی۔“

”اوند مجھ سے توڑے گی کہ میں نے تمہارا خیال نہیں رکھا۔ ہیں ناں اماں جی! میمون نہ بھائی بھی اس
کا دھیان ہلانے میں لگ گئیں۔ لیکن میں تو صاف کہہ دوں گی اُس سے کہ نیل نے میرا کہنا نہیں مانا۔
مذوقت نہ کرنا ناگنا یا دوا دانی۔ پھر وہ مے ناراض ہوگی۔“
”ہاں آپ کا کہنا مانوں گا چچی! نیل فوراً بول پڑا۔ آپ پھو پھو کو نہیں بتائے گا۔“
”دیکھتی ہوں کہ کیا کہنا ملنے ہو! میمون نہ بھائی کہتے ہوئے آٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد بانی کا گلاس
اور اُس کی دوا میں سے کراٹھیں لو ان کے کہنے سے پہلے ہی نیل بول پڑا۔
”میں دوا پیوں گا۔“

انہیں خدا حافظ کہتا۔ تب وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ سوچ
تو حیرت ہوتی ہے کہ میری سرخوشی کا خیال رکھنے والے بابا جان اسے۔
”وہ اپنا کب خاموش ہو گیا اور اس کی خاموشی کا بھرم رکھنے اُس کے ہاتھ پتھیں اُس کے
”سکندر چاچا!“ خفی سے جلاتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں
اُس کے اوپر آن کرے۔
”اسیہ کے ہونٹ بے ساختہ مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ اور وہ بہت شوق اور دلچ
دیکھ رہی تھی۔
”لاٹن سے چلو سب لاٹن سے کھڑے ہو جاؤ۔“ شاہ سکندر نے ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ
لاٹن سے کھڑا کیا پھر اسیہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ پہلے انہیں سلام کرو۔“
”السلام علیکم! یہ کون ہیں؟ سلام کے ساتھ ہی بچوں کی طرف سے سوال آ گیا تو شاہ سکندر
پہلے وہ بول پڑی۔
”میں تمہاری چچی ہوں۔“

”دُھن چچی! ایک نیچے شوق سے کہا تھا کہ دوسرا فوراً بول پڑا۔
”یہ دُھن چچی! معذرتی ہیں! وہ تو۔“
”ہاں! شاہ سکندر بہت سخیل کر نیچے کو ٹوٹتے ہوئے بولا۔ یہی دُھن چچی ہیں اور دیکھو
شوق سے تم سب سے ملنے آتی ہیں۔ تم اُس طرح بدتمیزی کر دے کہ تو یہ کیا سوچیں گی۔“
”افو! کہاں بدتمیزی کر رہے ہیں! وہ بول پڑی۔ اسنے پیارے نیچے ہیں۔ آؤ بیٹا میرا
آؤ۔“

”سب نیچے ایک دوسرے کو دیکھ کر اسیہ کے پاس جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ جبکہ چھوٹی
ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر ہنسنے کی تھی تا سیر نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گود میں اٹھا
وہ اُس کے پیوے پیوے کال پر بیٹا کر کے ہونٹے بولی۔
”یہ تو بالکل گڑبادی ہے۔ کس کی بیٹی ہے؟“
”جہانگیر بھائی کی۔ اور یہ بھی اہلی کا بیٹا ہے۔ شاہ سکندر نے ایک چھ سات سالہ نیچے کا
بچہ دکرا اپنی طرف کھینچے ہوئے کہا تو اسیہ اسے دیکھ کر بولی۔

”ماشاء اللہ۔ بہت پیارا بچہ ہے، کیا نام ہے اس کا؟“
”اسی سے پوچھو۔ شاہ سکندر نیچے کا ہاتھ پھو پھو کر آرام سے پھٹ گیا تو اسیہ نے پہلے گود
نیچے کو مومنے پر مٹھایا پھر اس نیچے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور ایک ہاتھ اُس کے کندھے
کر کر پھینٹ لگی۔
”کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟“
”شاہ علی جہانگیر۔ دن میں پڑھتا ہوں۔ نیچے کے فخر سے بتلنے پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔
”ویری گڈ۔“

”یہ بہت افسار دہ ہے اور مجھ سے بہت مانوس۔ شاہ سکندر نیچے کو ہمارے دیکھنے
بولا۔ میں بھی سب بچوں کی نسبت اس سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اور پتا ہے میں نے کیا
رکھا ہے۔“
”وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو شاہ سکندر قدرے اُس کی طرف جھک کر بولا۔
”ہماری پہلی بیٹی اس کے ساتھ منسوب ہوگی۔“
”اسیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مجھ کو لگا کہ اس کی طرف سے رخ موٹا تھا کہ نظریں نیچے
پر مٹھائیں۔ چلتی ہوئی روشن تھیں، خوبصورت پیشانی، سُرخ مائل گندمی رنگت۔ اُس
کے سامنے جیسے وہ بڑا ہونے لگا۔

”شاہنشاہ بننا اچھے پہلے تم بہت اچھے تھے، میوز بھائی نے خوش ہو کر کہا اور اسے
 کر اماں جی کو نون دیکھا جسے بہت مشکل مرہم سر کر لیا ہو۔
 خوش رہو دلہن! اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے۔“
 اماں جی کے دل سے دعا میں نکل رہی تھیں۔ میوز بھائی کی آنکھوں کی ہر گھبراہٹیں، جلدی
 لگا کر کمرے سے نکل گئیں اور دوپٹے کے پوسے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔
 ”کیا بات ہے میوز؟“ اور صرستے گزرتے بڑے بچا ہنٹک کر رگ گئے۔
 ”جی!“ میوز بھائی نے چونک کر ہاتھ نیچے کر لیے، ”کچھ نہیں بڑے بیٹا۔“
 ”نبیل کی طبیعت اب کیسی ہے؟“
 ”قدرے بہتر ہے۔ اب بھی دوا پلائی ہے اُسے۔ آپ دیکھ لیں۔ میرا مطلب ہے وہ جاگ
 وہ بڑے بیٹا کے سامنے پونہی کر رہا جاتی تھیں۔
 ”ہوں“ بڑے بیٹا جانے کیا سوچتے ہوئے اماں جی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگے تو مورت
 جان کر وہ وہاں سے خشکے لگی تھیں کہ بڑے بیٹا اچانک مڑ کر بیٹھے۔
 ”سنو۔ وہ۔ اگر رحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے۔ میں ادھر ڈرائنگ روم میں ہوں
 بیٹا بیٹہ کبھی کام کے لیے کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔
 ”کوئی اور بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی جہان؟“ میوز بھائی نے رگ کر پوچھا۔
 ”نہیں“ بڑے بیٹا اختصار سے کام لیتے آگے بڑھ گئے تو انہوں نے کچن میں جلتے سے پہلے اپنے
 میں جھانک کر دیکھا۔ آخر اور سونیا اپنا بوم و دھم کر رہے تھے اور عرجو لے میں آرام سے تھا۔
 طرف سے ملش ہو کر انہوں نے چائے بنائی اور کپ بڑے میں رکھ کر بڑے بیٹا کے پاس لے کر آ
 انہیں دیکھتے ہی وہ سیدھے ہو بیٹھے۔
 ”بہت تکلیف دیتا ہوں میں نہیں۔“
 ”واقعی؟“ میوز بھائی نے بے ساختہ کہہ کر بچلا ہوٹ دانتوں میں دھالیا اور جلدی سے بڑ
 جانا بلکہ مہانا چاہتی تھیں کہ بڑے بیٹا سامنے اشارہ کر کے بولے۔
 ”بھئی۔ کچھ بات کرنی ہے۔“
 ”انہی رحم؟“ وہ جتنی زندہ دل تھیں اتنا ہی ان کا دل مڑو رہی تھا۔ یوں سہم کر بیٹھیں جیسے
 ان کی کلاس لینے والے ہوں۔
 ”میں نبیل کی طرف سے پریشان ہوں۔ بڑے بیٹا چائے کے دو تین سپینے کے بعد
 ”اُس کی ماں کا کئی بار فون آچکا ہے۔ وہ چاہتی ہیں۔ نبیل کو کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس
 جائے۔“
 ”آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ نبیل بیمار ہے؟“ اس سنجیدہ موضوع نے میوز بھائی کو ایک
 کر دیا تھا۔
 ”بیماری کا سن کر ہی تو کہہ رہی ہیں بلکہ دوا کر رہی ہیں کہ ماں سے بہتر اُس کی کوئی دیکھا
 کر سکتا۔ ان کا دوا سمجھ ہے لیکن خود ان پر صادق نہیں آتا۔“ بڑے بیٹا نے تاسف سے کہہ کر
 بیچنے والے تو قدرے توقف سے میوز بھائی کو پوچھنے لگیں۔
 ”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“
 ”بیماری ہے۔ بیچنا بڑے کا نبیل کو۔ اور میرا خیال ہے نبیل جانے کے لیے تیار بھی ہو جا
 البتہ اماں جی۔ انہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ دونے تھی ہیں اس لیے میں ان سے ا
 کر سکتا۔ تم کو مان سے۔“
 بڑے بیٹا نے یہ فتنہ داری انہیں سوپ کر چمچ انہیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کتنی
 کے بعد پوچھنے لگیں۔

”میں کیا کہوں اماں جی سے؟“
 بڑے بیٹا اپنی سوچ میں تھے۔ ان کی بات سنی ہی نہیں۔ البتہ آواز پر چونک کر دیکھنے لگے تو وہ
 ت دہرے کے بجائے آنکھ کھڑی ہوئیں اور خالی کپ بڑے میں رکھ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔
 ”میں کو شش کرتی ہوں۔“
 ہاں دیکھو کل شاید بیل خود بچے کو لینے آجائیں۔ اس سے پہلے اماں جی کو ذہنی طور پر تیار کر لینا۔
 بڑے بیٹا نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آئیں۔
 اماں جی مسلسل رو رہی تھیں اور رد اس بات کا نہیں تھا کہ نبیل ماں کے ساتھ جلا گیا تھا بلکہ اُس
 ان کی بے پرواہیاں زلزلہ رہی تھیں۔ آٹھ سال وہ عورت اس گھر میں جس طرح نبیل کو نظر انداز کرتی
 تھی۔ وہ سب کے سامنے تھا پھر بھی سب خاموش مٹا شامی بنے ہوئے تھے۔
 اماں جی آپ خواہواہ رو رہی ہیں۔ ہم نے نبیل کو زبردستی تو نہیں بھیجا۔ آپ کے سامنے اس
 ذوقانے پر اماں کی غماہ کی تھی۔
 اماں جی کی مسلسل گریہ و زاری سے بڑے بیٹا زچ ہو کر بولے تھے۔
 ”ارے وہ تو بچہ ہے۔ تم تو بچے نہیں ہو۔ اچھی طرح جانئے ہو کہ وہ عورت اس کی دیکھ مہال نہیں کر
 ”اماں جی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ اُس نے تو بھی ہنسنے لپٹے نہ پنے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔
 بچے کا کیا خیال کر رہے گی؟“
 آپ کی بات خشک ہے میری ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ بڑے بیٹا نے بات ختم کرنے کی عرض سے
 دیا جس پر اماں جی تاسف سے بولیں۔
 ”تم کچھ کہتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟“
 بڑے بیٹا کا چہرہ لکھت سرخ ہو گیا۔
 ”بس کتنی اماں جی! دو چار دن کی تو بات ہے۔ عدل سے بڑے بھائی کی لا چاری دیکھی نہیں گئی۔
 ”ابول بڑے۔“ ”بیلہ کچھ کچھ تھی سہی، بہر حال نبیل کی ماں ہیں۔ ایسے دھوپ میں نہیں ڈال دیں
 اسے۔“
 اماں جی کو غالباً احساس ہو گیا تھا جب ہی خاموش ہو رہیں۔ اور اتنا جی جو اس ٹکرا کے دوران
 میں تھے انہوں نے پہلے ہنگامہ اٹھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے بعد گویا خود کو بولنے پر تیار
 پھر بڑے بیٹا کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”غفلت میاں! تم نے باہر جانے کی بات کی تھی۔ پھر کیا ارادہ بدل گیا تھا؟“
 ”نہیں۔ بس اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔“ بڑے بیٹا نے کن انہیوں سے اماں جی کو دیکھا جو پوری
 ممتوہ ہو گئی تھیں۔
 ”کیا مطلب؟“ اتنا جی نے پوچھا تو وہ تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے۔
 ”ہماری فرم کی ایک شاخ جدہ میں قائم ہوئی ہے۔ اور اسے ایک بڑا پروڈیکٹ بھی مل گیا ہے
 ان سے کچھ لوگ تیار کیے ہیں۔ ہم یہاں سے ہی لیبر بھرتی کر کے بھیج رہے ہیں۔ جب یہ مسئلہ
 ہو گا تو کم از کم ہمارے باری آئے گی۔ تین چار سال کا ایکرینٹ ہے۔ اس کے بعد کوئی نیا۔
 جملہ مل گیا تو اس کے لیے ہماری اپنی جو اس ہوگ کہ ہم اس پر کام کریں یا یہاں آجائیں۔ بہر حال
 بعد کی بات ہے۔ ابھی میں چار سال کا ایکرینٹ کر چکا ہوں۔“
 ”ہوں!“ اتنا جی کچھ دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔
 ”اچھی بات ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے باہر چلے جاؤ۔“
 ”اچھا!“ اماں جی کچھ بولنے لگی تھیں کہ اتنا جی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ اور اپنی بات
 ختم کرتے ہوئے بولے۔

متمارے لیے یہی بہتر ہے۔ بہت عرصہ تم نے ٹینشن میں گھرا ہے۔ اور ابھی نہیں ہو۔ اس لیے متمارے بیان سے چلنے جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ”بیل ابھی چھوٹا ہے، آبا جی پھر مجھے زیادہ ہے۔“
 ”میں صرف بیل کی بات نہیں کر رہا، آبا جی نے درمیان میں لوگ کر نہ صرف ہر کو خاموش کر دیا، بلکہ حیران بھی۔ پھر ایک نظر آستان جی پر ڈال کر بولے تھے۔
 ”میں متمارے شادی کر رہا ہوں۔ متماری چچا زاد سارہ کے ساتھ اور یہاں سے تم شروع کرو گے۔“
 بڑے بھتیجیلے اپنی پسند منوا چکے تھے اور اس کے بعد دس سال جھگڑ بھی چکے۔ اب اگر کوئی اختلاف یا اعتراض تھا بھی تو ان کے پاس احتجاج کا حوصلہ نہیں تھا۔ بس ذہین کر سر جھکا لیا۔
 ”میں یہ نہیں کہوں گا کہ پہلے متمارا انتخاب غلط تھا۔“ قدرے توقف سے آبا جی نے بولیں۔
 ”بس نہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ اپنی اپنی آنائیں تم لوگوں نے ایک دوسرے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس لیے اپنے گھر کو نہیں بچا سکے۔ بہر حال جو غلطیاں پہلے کی انہیں دوبارہ مت دہرانا۔“
 ”تھے یقیناً ہے سارہ کے ساتھ تم خوشگوار زندگی گزارو۔ ایک ٹینٹ میں اپنی فیملی کو بھی شامل کر لو۔“
 بڑے بھتیجیلے اسی طرح سر جھکا کر بولے۔
 ”کیوں خاموش تھیں۔ تب عدیل انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔
 ”کیوں آستان جی، ابھی بھی آپ بڑے بھتیجے باہر جانے پر اعتراض کریں گے؟“
 ”میں کیوں اعتراض کروں گی؟ آستان جی چونکہ کر بولیں تو عدیل آبا جی کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔
 ”بڑے بھتیجیلے اسی طرح خاموش تھے۔“

اسلام آباد میں شکیل بھائی اور سیما بھائی نے ان کا پُر جوش استقبال کیا تھا۔ اشعرا پھو پھو کر دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اور مسلسل اس کا طواف کر رہے۔
 سیما بھائی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں تب وہ دونوں بچوں کو آواز کرنے کی تاکید کرتے ہوئے سیما بھائی کے پاس پہنچیں۔
 ”اب سناؤ، آپ کراچی سے کب آئیں گے؟“ اس نے بیٹھنے کے لیے اسٹوا

لو جھا تو سیما بھائی کمر آستان جی کے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ پھر جیسے ہی وہ ٹھوڑی جھوڑ کر بولیں۔

”بہت پیاری ہو گئی ہو۔ ماشاء اللہ۔“

”اچھا،“ وہ جھینپ کر ذرا سا ہنسی۔

”میں اس وقت سے دل ہی دل میں متمارے نظر اتار رہی ہوں۔ محبت نے تمہارا بنا دیا ہے۔ یقین کرو جب تم شاہ سکندر کے ساتھ گیٹ سے داخل ہو رہی تھیں تو نے تمہیں پہچانتا ہی نہیں تھا۔“

”جی نہیں،“ وہ سچ زور سے ہونٹا رہی تھی۔
 ”سچ کہہ رہی ہوں، تمہارے تو انداز ہی بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے شاہ سکندر کروا رہے۔“ سیما بھائی کو وہ زور سے ہونٹا اور انہیں لگی۔
 ”وقت سے بڑا جادو اور کیا ہوگا۔“ وہ لگائی میں بڑی سرخ سبز کالج کی جوتیوں دھرنے سے بولی۔

”یہ تو میں کہہ رہی ہوں، خیر، بتاؤ کہاں کہاں گئیں؟“ سیما بھائی نے کسی چیز کی تلاش میں بیٹ میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”لاہور اور مری۔ اب یہاں سے سوات جانے کا پروگرام ہے۔ سکندر کہہ رہے تھے صبح ہی چل جائیں گے۔“ اس نے بتایا تو سیما بھائی کام چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”کیا مطلب ہے متمارا، یقیناً لاہور اور مری میں اس دن اور ہمارے پاس نہیں، خبردار جو صبح اسے نام لیا تو۔“ بھتیجیلے بھائی جان بھی ناراض ہوں گے۔

”اچھا آپ تو ناراض نہ ہوں۔ لائیے یہ پیاز میں کاٹ دوں۔“ اس نے اس موضوع سے ہٹنے کا خطرہ بھائی کو ڈکری اٹھائی۔ جیسے سیما بھائی فوراً بھینٹے ہوئے بولیں۔

”کوئی ضرورت نہیں کسی کام کو ہاتھ لگانے کی آرام سے بیٹھ رہو۔ تمہارے میاں نے دیکھ لیا پھر وہ بھیج بھی نہیں ہونے دے گا۔ ابھی کہے گا چلو۔“

وہ ہنس بڑی پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگی۔
 ”جہاں: میں مری میں سکندر کے بھتیجے بھتیجیوں سے بھی ملی ہوں۔ مری کالونیٹ میں پڑھتے ہیں۔“

”اچھا،“ ویسے یہ سکندر لوگ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلاتے ہیں البتہ، سیما بھائی نے قصداً تادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”کہہ دیں جو کہنا ہے۔ میں برا نہیں مانوں گی۔“
 ”نہیں، بھئی، اب تم بھی انہی ڈیڑوں میں شامل ہو گئی ہو اور متماری سوچ بدلتے دیر نہیں لگے۔“

”جی نہیں، مری سوچ نہیں بدلے گی، آپ دیکھیے گا۔ میں جب بھی شاہ پور گئی سب سے پہلے ان کے بچوں کو تعلیم دلائے پر زور دوں گی۔ اور شاہ سکندر نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ بھی اٹھا، اس نے عزم سے کہا۔

”اچھی بات ہے،“ ویسے متمارا شاہ پور جانا کب تک متوقع ہے۔ میرا مطلب ہے سکندر ہمارے میں کیا کہتا ہے۔“ سیما بھائی نے اپنے کام میں مصروف رہ کر پوچھا۔

”میں نے ابھی اس موضوع کو نہیں چھڑا، ابھی اور نہ ہی اسے مسئلہ بناؤں گی۔ کیونکہ سکندر نے بہتر پہلے ہی بتا دیا تھا اور اس وقت تو انہیں جہانگیر بھائی کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ البتہ زور کہنے میں کہ ان کے گھر والے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکیں گے اور میرا خیال ہے ٹھیک

کہا تھا کہ اب صرف بابا جان ہی رہ گئے ہیں۔ باقی سب گھر والے تو اس شادی پر خوش ہیں۔
 نف بھی بیٹھنے اور جہانگیر بھائی شریک بھی ہونے۔“

”وہ بہت فطین انداز میں بولی رہی تھی۔ تبھی شکیل بھائی نے لاؤنج سے ہی اُسے پکار لیا۔
 ”اسیہ! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جہاں کہہ رہی تھی، نہیں تو میری شامت آج لگے گی۔“ سیما بھائی نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ

”جی بھائی۔“

”شاہ! اگر کھانا کینے میں دیر ہے تو سکندر کو چاہئے ہی ملا دو۔“

شکیل بھائی نے کہا تو اس نے بے اختیار شاہ سکندر کو دیکھا۔ کچھ تھکا تھکا سا، اتنی دیر تک کے نظروں سے اوجھل ہونے پر شاہی بھی ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اس سے نظریں چرا کر بولی۔

”کھانے میں دیر نہیں ہے بھائی، اور چائے کھانے کے بعد ملے گی۔“
 ”اچھا، تم یہاں میرے پاس بیٹھو، شکیل بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: میں ابھی سکندر سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہاؤس جاب کرنا
تیار کیا پروگرام ہے؟
”جی، یہی پروگرام ہے، اُس نے شاہ سکندر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھتے تو شاید
میں خاموشی اختیار کر لیتی۔“
”ہاں، وقت ضائع نہیں کرنا، جب تک شاہ سکندر کسی بزنس میں سیٹ ہوں گے تو
تم یہ فون کی بیل سے شکیل بھائی کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ ایک کیویزی کہتے ہوئے آؤ
ایڈٹر کرنے چلے گئے تو شاہ سکندر فوراً بولی پڑا۔“

”سنو، صبح یہاں سے نکل چلیں گے؟“
”کیوں؟“ وہ انجان بیٹے بیٹے بھی ہنس پڑی۔
”متاثر کیوں کا جواب ابھی بھی دے سکتا ہوں؟ شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھنے لگاؤ
نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیے۔“

”پلیز، وہیں بیٹھے رہیں؟“
”صبح چلنا ہے؟ شاہ سکندر اسی وقت اپنی بات منوا سکتا تھا۔“
”کہو ہاں۔ ورنہ؟“

”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“
”ٹائپ، یہ دوبارہ تین بار ہاں کہہ انے کی فزیت کیوں آئی؟“ سیمیا بھابی سنتی ہوئی آگئی
اس کے بجائے انہوں نے براہ راست شاہ سکندر کو ٹوکا تو وہ جلی سا ہو کر سر جھکائے
”ہاں بھی، کھانا تیار ہو گیا؟“ عقب سے شکیل بھائی آواز پر سیمیا بھابی اُن کی طرف
پوچھنے لگیں۔
”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”وہ اتنا ہی کا فون تھا:“ انہوں نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ آسیہ نے سوالوں کی بو
”آبا جی کا، کیا کہہ رہے تھے۔ ٹھیک تو ہیں ناں اور اماں جی۔“
”سب ٹھیک ہیں۔ سب ٹھیک ہیں، شکیل بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے
لگے۔“ ابھی خبر ہے، لیکن کھانے کے بعد سناؤں گا؟“
”نہیں بھائی، پہلے سٹائپ ورنہ کھانا نہیں کھا یا جائے گا؟“ اُس نے اپنی بے تار
سے کہا تو شکیل بھابی دوبارہ اسی جگہ پر بیٹھ گئے اور سیمیا بھابی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کر
بولے۔

”بڑے بیٹا کی شادی ہے اسی جمعہ کو۔“
”نہج۔“ آسیہ کی آوازیں خوشی کی کھٹک تھی۔ اور سیمیا بھابی خوشی کے ساتھ تعجب
”اسی جمعہ کو؟“
”ہاں۔ بس سادہ سی تقریب ہے۔ اور جلدی میڈیوں طے پائی ہے کہ اگلے ایک
میں بڑے بیٹا باہر جانے والے ہیں اور میرا خیال ہے ساڑھے چھ بجے ان کے ساتھ
آخر میں شکیل بھائی نے اپنا خیال ظاہر کیا تو آسیہ فوراً پوچھنے لگی۔
”اور نیل؟“

”ظاہر ہے وہ بھی جائے گا۔“
”آسیہ نے چند لمحے توقف کیا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر بولتی تھی۔
”بس تو کل ہم پہلی فلائیٹ سے کراچی جائیں گے۔“

شاہ سکندر نے اُس کے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی خوشی کی خاطر ورنہ
اسے افسوس تھا کہ زندگی کے یہ خوبصورت دن دوبارہ ٹوٹ کر نہیں آئے تھے۔ بہر حال اُس
آسیہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنا ہی مون پر نیڈ فکڑ ہونے پر ناخوش ہے، اُس کے
سین اُس کی خوشی میں شریک رہا۔ گوکہ بڑے بیٹا کی برادرار کیا تھا پھر بھی ابھی خاصی رونی
ٹی تھی۔ تین چار دن آسیہ آبا جی کے گھر میں بے حد معروف رہی۔ اس کے باوجود شاہ سکندر کی
سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ وہ جہاں گھر میں داخل ہوتا اُس کی طرف لبک کر جاتی، چائے کھانا
ش روم میں کپڑے تیار یعنی ہر بات کا خیال۔ اپنی طرف سے اُس نے شکایت کا کوئی موقع نہیں
پھرائے۔ یہ بھی احساس تھا کہ وہ اُس کی خاطر سب چھوڑ آیا ہے۔ جیسی دہلیں کے گھر آئے
وہ اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شاہ سکندر جارحانہ کہاں تھا۔ وہ اُسے چلنے کا پتہ کے
بجائے سے نکل کر آئی تو برا آمدے میں میوز بھابی مل گئیں۔
”شاہ سکندر کو دیکھا ہے؟“ اُس نے میوز بھابی کو روک کر پوچھا۔ تو وہ اپنے مخصوص انداز
بولیں۔

”ہاں بہت بار۔“
”میں ابھی کی بات کر رہی ہوں۔ کہاں ہیں وہ؟“
”اُدھر ڈرائنگ روم میں، سب وہیں بیٹھے ہیں؟“ میوز بھابی غمگین ہیں بتا کر جانے لگیں
س نے راستہ روک لیا۔
”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”چلنے بٹانے۔“
”ہمارے لیے مت بنائے گا کیونکہ ہم اب گھر جا رہے ہیں؟“ اُس نے ”ہم“ اپنے اور شاہ سکندر
لئے استعمال کیا تھا اور میوز بھابی کو کبھی گھبراہٹ کی نقل آتے ہوئے بولیں۔
”ہم اس وقت شوق میں چائے بنانے نہیں جا رہے۔ آپ کے شاہ سکندر نے فزائش
ہے۔ ورنہ ہم تو بہت تھکے ہوئے ہیں؟“

”آپ بھی لیں؟“ اُس نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کہنے لگی۔ ”رہنے دیں چائے واٹے میں منع کرتی
سکندر کو؟“
”ارے رے، دومنٹ کا کام ہے۔ اور اب تو سب پئیں گے؟“ میوز بھابی کہتے ہوئے
ان کی طرف بڑھیں تو وہ بھی اُن کے ساتھ چل پڑی۔
”تم ابھی جانے کی بات کیوں کر رہی ہو۔ صبح جانا؟“ میوز بھابی نے کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے
کہا۔

”ابھی کیا اور صبح کیا۔ بس جانے دیں۔ صبح سے میں اپنے گھر کے معمولات سیٹ کر رہی گی۔
نہیں سکندر نے بزنس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ اب اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھیں
تو سب کچھ سے سوچیں گے؟“
وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ میوز بھابی نے مسکرا کر اُسے دیکھا تو
پچھلے غامض ہونی پھر ایک دم موضوع بدل گئی۔
”نیل سے نہیں مل سکیں تو عجیب سا لگ رہا ہے کب سے گیا ہوا ہے صبح عدیل بھائی سے
یہ گلے لے کر میری طرف آئیں گے؟“
”میوز بھابی نے فوراً گھٹی جواب نہیں دیا۔ ٹرے اتاری پھر اس میں کپ دھکتے ہوئے
نیل لگیں۔“

”نیل کا تمہیں نہیں بتا رہا تھا کہ بعد بہت بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی بھی پتا نہیں
ہاں ہے۔ کیونکہ اسی بیماری کی حالت میں جیلا سے لے گئی تھیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ

ماں سے بہت اُس کی جھگڑا کوفی نہیں کر سکتا۔
 ”کیا کہہ رہی ہیں بھائی! یہ سب تو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ وہ اکیدم پریشان ہو گئی۔
 تو سمجھ رہی تھی بڑے بیٹیاں شادی کی وجہ سے۔
 ”نہیں بلکہ اُس کی وجہ سے بڑے بیٹا شادی پر رضامند ہوئے ہیں۔ کیونکہ صرف نیل کو وہ
 ساتھ باہر نہیں لے جاسکتے تھے۔ دلیتے آبا جی نے بڑے موقع پر بڑے بیٹا کو گھبراہٹ
 کے پاس باجی تھرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔“
 ”میونہ بھائی کی بات اُس نے بے دھیانی میں سنی، سارا دھیان نیل کی طرف تھا۔ فوراً

لگی۔ نیل کی طبیعت اب کیسی ہے۔ کوئی اُس کے پاس گیا بھی؟“
 ”ایک بار عدیل گیا تھا۔ لیکن بیلہ نے اُس سے ملنے نہیں دیا۔ کہنے لگیں، جب ٹھیک
 سکا بھیج دوں گی، یہاں آئے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”میونہ بھائی نے بیٹا میں جانے دم کرتے ہوئے بتایا چھر بڑے اٹھا کر اُس کی
 رُخ موڑا تو اُسے پریشان دیکھ کر کہنے لگیں۔

”زیادہ پریشان کی بات نہیں ہے۔ اور تم ابھی اماں جی کے سامنے نیل کا ذکر نہیں چھوڑا۔
 رونے لگتی ہیں۔ اور اس خوشی کے موقع پر رونے دھونا ابھی بات نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہوں نا؟“
 اُس نے پوہنی ذرا سائبات میں سر ہلا دیا اور ان کے جانے کے بعد پہلے خود پر قابو لیا
 ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا۔

پھر جانے کے دوران اُس نے آبا جی اور اماں جی کو اس وقت اپنے گھر جانے کا بتایا تو
 شاہ سکندر کاما یوس چہرہ یکھت دیکھنے لگا۔ اتفاق تھا کہ میونہ بھائی اُسے ہی دیکھ رہی تھیں
 ہی بے ساختہ زور سے ہنس پڑیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تو فوراً بولی تھیں۔
 ”اب کوئی یہ نہ پوچھے کہ میں کیوں ہنسی۔“

عدیل نے شاہ سکندر کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، جواب نہیں۔ جو اُشاہ سکندر نے
 انداز میں سر ہلایا پھر لہجہ چانے ایک ہی ٹھونٹ میں ختم کر کے کپ تیل پر رکھتے ہوئے آبا جی کو دبا
 لولا۔

”اجازت دیجیے آبا جی، گیارہ بج چکے۔ چلیں اسیہ۔“
 ”جی۔“ وہ اماں جی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی نیل کا سر کہ کچھ مصلیٰ سی ہوا
 شاہ سکندر نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر سب کو سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔
 اپنے اپارٹمنٹ میں اگر بھی وہ کچھ چپ چاپ سی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس وقت فون
 نیل کی تحریریت معلوم کرے۔ لیکن اس خیال سے خود کو روک رہی تھی کہ کہیں بیلہ بھائی آ
 بھی یہ نہ کہہ دیں کہ یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

”کیا بات ہے، تھک گئی ہو؟“ شاہ سکندر مسلسل اُسے فون کر رہا تھا۔ بہت سے
 جب اپنی جگہ پر اگر لیٹی تو اُس کے بالوں میں انگلیاں جھنسا کر پوچھنے لگا۔
 ”نہیں۔“ وہ قصداً مسکراتی دکھیں وہ یہ نہ کہہ لے کہ اپنے گھر آکر وہ خوش نہیں۔
 پھر اُس کا ہاتھ بالوں میں سے نکال کر اپنے ہونٹوں سے چھو کر بولی۔
 ”اب کی فست میری ساری ممکن سمیٹ لیتی ہے۔ پتا ہے ابھی یہاں آتے ہوئے
 سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“ شاہ سکندر خاموش ہو کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
 ”کہ میں تو بہت عام سی لڑکی تھی پھر آپ۔“
 ”اوں ہوں؟“ شاہ سکندر نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا، ”خود کو عام سی لڑکی کہ

نیت کرو۔“ شاہ سکندر حیات نے کسی عام سی شے کو کہتی درخود اعتنا نہیں کیا۔
 ”وہ اُس کے لئے کے زعم پر سن سی ہو گئی تھی۔
 ”ایک عام سی لڑکی کا میری زندگی میں کیا دخل، نہیں اسیہ ایسا کبھی نہیں سوچنا، تمہارے لیے
 ایک طرح سے سخت و تاج چھوڑ آیا ہوں۔“
 ”اب بھی کمال ہیں۔“ وہ بہت سنبھل کر اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”میں کیا کہنے جا رہی تھی آپ
 مجھے۔“ پھر چوڑیں۔ یہ بتائیں صبح ناٹنے میں کیا لیں گے؟“
 ”صبح کی بات صبح اور رات کی بات۔“ وہ شروع نظروں سے دیکھتا اُس پر جھک گیا۔

کوئی دو گھنٹے پہلے ہر النساء نے جیراں کو اپنے کمرے میں آنے کو کہا تھا، اُس وقت وہ بڑی
 کا کوئی کام کر رہی تھی۔ اُس کے بعد بتا نہیں وہ بھول گئی تھی یا ان جان نے اُسے کسی کام سے
 دیا تھا۔ جو اب تک نہیں آئی تھی۔ مرنٹا کا انتظار کے بعد اب بارہ لائی ہو گیا تھا۔ اتنا ہی
 ہیں وہ اپنے کمرے سے نکل کر اُس کی تلاش میں پچھائی تھی کہ شاہ سکندر کا نام سن کر ٹھٹھک
 شاہ جہانگیر فون پر غالباً اُس سے بات کر رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں ان کی پشت کی طرف
 گئے۔

”میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں ایک اور چیک جمع کر دیا ہے۔ فی الحال تم آرام سے رہو
 نہیں سکندر۔ ابھی کوئی زلزلہ نہیں ہو سکتا۔ اگلے مہینے الیکشن میں جیتا نہیں ہی حکومت کیا پالیسی
 راکھ ہے۔ اس لیے اس وقت کسی بھی زلزلہ میں پیسہ نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”ہاں ایک مہینے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“

”نہیں، میں ابھی تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔“
 ”اور۔ اور ب ٹھیک ہے۔“
 ”پھر بات کروں گا۔ خدا حافظ۔“

شاہ جہانگیر نے فون بند کر دیا۔ اور پلٹے ہی ہر النساء کی طنز آمیز تائت بھری نظروں کا سامنا
 پس ایک ہی اس کے بعد ہر النساء فوراً بلیٹ کر جانے لگی۔
 ”روکو ہر النساء۔“ انہوں نے بھی فوراً لیکار لیکر دیکھنے کے بجائے ہر النساء کے قدروں میں
 ی آئی، اور ان کی نظروں کے سامنے وہ ٹیڑھیاں جھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر
 لے اُسے جیراں پر رقعہ تھا اب اُس کی نوعیت بدلنے ہی وہ باکل ہون جا رہی تھی۔ ایک ایک
 اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا، اُس کے بعد صبح جینج کر
 سا چائے پتی کر اُس وقت شاہ جہانگیر اُس کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ہی
 آ گئے اور ایک اچھٹی نظر کرنے پر کمال کر قدرے سخت لہجے میں بولے۔
 ”یہ کیا پیغام مچا رکھا ہے تم نے۔ اس گھر کی دوسری عورتوں کو بھی دیکھا ہے کہیں ایسی حرکتیں
 سے ہوئے۔“

”ہیں، میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔“ وہ ان کی بات کیسر نظر انداز کر کے چینی۔
 ”کہاں جاؤ گی؟“ شاہ جہانگیر کی پشانی پر بے شمار شکنیں پڑ گئیں۔
 ”اپنے بابا سائیں کے گھر، انہیں بتاؤں گی میں کہ شاہ اقل روز مجھے چھوڑ گیا تھا۔ اور آپ
 ب لگ بھی اُس کے ساتھ ہیں۔“

وہ کس طرح شاہ جہانگیر سے مرعوب نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک طرح سے انہیں دھکی دی جس سے
 اندر ہی اندر ٹھٹھکا کر بولے۔
 ”پھر کیا کر لیں گے تمہارے بابا سائیں۔ زیادہ سے زیادہ شہر بالو کو بیان بھجوا دیں گے۔
 شہر جہاں شہر بالو کے لیے۔ اور یہ تو تمہارے لیے جس جگہ بنا نا چاہتے ہیں لیکن

تم شاید یہاں رہنا ہی نہیں چاہتیں۔“ اُسے انہوں نے سر سے کوئی مہر لٹا دیا۔ چکر لگتی کر جیس بات پر وہ اکر رہی تھی۔ اُسے انہوں نے سر سے کوئی ہی نہیں دی تھی۔
 اگر رہنا ہے تو طرے سے رہو مبر کے ساتھ۔ ہم میں سے کوئی بھی تم سے غافل نہیں اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کی تمہاری بہتری ہے۔ شاہ سکندر کو لانا کوئی مشکل بات نہیں اسی وقت لے کر آسکتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ دوبارہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تو میری نہیں ہوگی۔ شاہ جہانگ نے خاموش ہو کر اُسے دیکھ دیا۔ وہ شاید اُن کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی تب

قرے نرم پڑ کر سمجھاتے ہوئے بولے۔
 ”اس طرح دو ایلا چاکر ہمارے لیے مشکلات کھڑی مت کرو مہر النساء، جتنا عرصہ تم اس گھر میں گزارا ہے اتنا عرصہ اور پھر دیکھنا شاہ خود چل کر تمہارے پاس آئے گا۔ یہ وعدہ ہے تم سے۔“ پھر بڑھ کر اُس کے پرہیزگار ہوتے ہوئے بولے۔
 ”خوش رہا کرو۔ تمہاری خوشی ہم سب کی خوشی ہے۔“

مہر النساء کی آنکھوں میں آن اتر آیا۔ جس سے نظریں چل کر شاہ جہانگیر کے سے نکلے۔
 تو وہ جو کچھ دیر پہلے جمع جمع کر دینا چاہتی تھی۔ ہنٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دباتے وہیں گئی۔ اور گھٹنوں پر سر رکھا جتا کر آنسو نور سے بہہ نکلے۔ کتنی دیر بعد جب آنسو اب ہی آپ گئے تب اُسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گھٹنوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاں خاموشی سے کمرے کا خلیہ ٹھیک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر اُسے دیکھنے کے بعد وہ اگر الماری میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں بند ہو گئی۔
 ”جتنا عرصہ میں نے یہاں گزارا، اتنا عرصہ اور بیٹھنا ہے۔“ ہنسنے کے دوران اور پھر باہر آنے وہ اس عرصہ کا ہر ایک پل غبار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”بی بی،“ جہاں نے کچھ دُڑے دُڑے پکارا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔
 ”آپ کے باتوں میں کتنی گروں،“ جہاں نے نکلیں والا ہاتھ اس کے سامنے کیا تو اُس پہلے سارے کمرے پر نظر ڈال، پھر آرام سے بند پر بیٹھ گئی۔ اور سر پر سے تولیہ اتار کر اُٹھا ڈال دیا۔ سنہری بالوں سے اُس کی پوری کمر چھپ گئی تھی۔ جہاں نے بہت احتیاط سے ہاتھ کر سنبھالنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ اُس کے تیز رہی بیٹھتے جا رہی تھی۔ اور وہ پتا نہیں کس مٹی۔ کتنی دیر بعد جہاں اُسے مخاطب کرنے کی ہمت کر پائی تھی۔
 ”بی بی، اُس وقت میں آپ کے پاس آ رہی تھی۔ لیکن بڑی بی بی نے مجھے کام سے

تھا۔ آپ نے کس کام سے بلایا تھا مجھے؟“
 ”میں نے،“ مہر النساء نے چند لمحے سوچا پھر پوچھنے لگی۔ ”تم سائیں جی کے پاس گئی؟“
 ”ہاں جی،“ جہاں الیکم اُس کے بال چھوڑ کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور راز داری سے ”سائیں جی کو سب پتا ہوتا ہے بی بی جی،“ انہوں نے چھوٹے شاہ جی کے بارے میں سب بتایا ہے۔“

”وہ بتا رہے تھے چوٹے شاہ جی ادھر شہر میں کس عورت کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں عورت بڑی خطرناک ہے،“ جہاں کا انداز مبنوز تھا۔
 ”میر تو میں بھی جانتی ہوں،“ مہر النساء نے بڑے آرام سے بیڈ کی بیک سے ٹیک تو جہاں کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اپنے تئیں اُس نے دھماکہ کیا تھا۔
 ”ہاں اور بتاؤ، اور کیا کہہ رہے تھے سائیں جی۔ شاہ اُس عورت کے چنگل سے پکڑے اُس نے پوچھا تو جہاں پھر پڑ خوش ہو گئی تھی۔

”کیوں نہیں جی، اپنے سائیں جی ایسا چلے گا میں گے کہ چھوٹے شاہ جی اُسے چھوڑ کر آپ کے پاس آئیں گے۔ سائیں جی کہہ رہے تھے کہ میں آپ اجازت دے دیں پھر دیکھیں اُن کا کمال۔“
 ادھر چالیس دن پورے ہوئے نہیں کرے۔“ مہر النساء جہاں سے کیا سوچنے لگی تھی۔
 ”ہاں جی، چالیس دن زیادہ تو نہیں ہوتے، یوں گزر جائیں گے۔ بس آپ دو کالے بکروں کے پیسے دے دیں۔ سائیں جی کہہ رہے تھے آپ کی گود بھرنے والی ہے۔ پہلے اس کا صدقہ اتاریں گے چاند سا ملنا ہوگا۔“
 جہاں کی آخری بات پر وہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

وہ کتنی بار شاہ سکندر کے سامنے نبیل کے لیے تشویش ظاہر کر چکی تھی۔ ادرا اب اُس کے مشورے پر نبیل جہاں کے غیر فائل کر رہی تھی۔ پھر دوسری طرف بیل جانے کے ساتھ ہی۔
 ”ٹھیک لگا تو وہ فوراً بول پڑی۔“
 ”نبیل جہاں ہیں۔“

”کون آسید،“ دوسری طرف اتفاق سے وہی تھیں۔
 ”جی السلام علیک،“
 ”وعلیک السلام،“ بھی شادی مبارک ہو،“ وہی انداز تھا اُن کا۔
 ”جی، آسید کی کچھ میں نہیں آیا کہ وہ اُس کی شادی کی مبارکباد دے رہی ہیں یا بڑے بھائی کی۔“
 ”ابھی تک ویس کی ویس ہو تو ارے اب تو شادی ہو چکی ہے تمہاری یا بند یوں سے نکل لی ہو۔ پھر کیا جی جی نکال رکھی ہے، کھل کر بات کرو،“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ٹوکا تو وہ مدد ہی اندر بزم بنو کر بولی۔
 ”وہ نبیل کیسی ہے؟“

”نبیل کی طبیعت نہیں سنبھل رہی، دو دن ٹھیک ہوتا ہے پھر پڑھتا ہے۔ حالانکہ بہت اچھے پیشکش کو دکھا رہی ہوں۔ اور یہاں کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے پھر پتا نہیں۔“
 اُن کے لمحے میں تشویش سے زیادہ اُن ہٹ تھی، جیسے بچے کی بیماری سے عاجز آگئی ہوں۔
 جب ہی وہ کہنے لگی۔

”آپ اُسے یہاں بھیج دیں۔ میرا مطلب ہے اماں جی کے پاس۔“
 ”نہیں آسید،“ جب تک تر تھیں مجھے اطمینان تھا۔ اب میں اپنے بچے کو وہاں نہیں بھیجوں گی۔“
 ”انہوں نے صرف ابھی بلکہ آئندہ کے لیے بھی صاف منع کر کے آسید کو کچا دیا تھا کہ وہ۔“
 ”انہوں نے نہیں سکی۔ اور ادھر سے وہ مزید گویا ہوئیں۔
 ”اماں جی،“ بڑی عورت حرف واری صدقے جاسکتی ہیں نبیل کا خیال نہیں رکھ سکتیں۔ بیہوش بچے بچوں میں گھری ہوئی ہے اور۔ ہاں سننا ہے تمہارے بھائی صاحب نے بھی دوسری آوی کر لی ہے۔“

”جی،“ بولنے کی کوشش میں اُس کے حلق سے ایسی ہی آواز نکلی تھی۔
 ”خیر، اُن کے شادی کرنے،“ کرنے سے نبیل کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے پہلے اُن کا خیال کیا جو اب میں کہوں کہ دوسری عورت کی وجہ سے وہ بچے سے غافل ہو جائیں گے۔ وہ تو پہلے ہی غافل تھے۔“
 ”انہوں نے بڑے بھائی کی شادی کو میرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی، پھر بھی پوچھنے لگیں۔“
 ”وہ کس لیے؟“
 ”وہ سارے بچا جان کی بیٹی،“ وہ اب جیسے مجبوراً یا مروتاً جواب دے رہی تھی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ اُسے اچانک احساس ہوا کہ وہ انہیں وہیں جھوڑ کر آگئی ہے۔ انہیں

سارہ۔ اچھا ہاں۔ اُس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی؟ پھر وہ ہتھ لگا کر بولیں: تمہارا بھائی کے لیے وہی ٹھیک ہے۔ ایک بیرونی۔
 آسیہ کا دل چاہا فون پیج دے لیکن بیل کے وجہ سے ضبط کر گئی۔
 ”خیر تمناؤ سب پڑھا لکھا جو کچھ میں چھوڑ دی ہوں۔“
 ”میری بیل سے بات کرادیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔
 ”وہ سو رہا ہے۔“ اُس سے عذر تیار تھا۔

”اچھا میں پھر فون کروں گی؟“ اُس نے فون رکھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔
 کس احساس کے تحت اُس کا چہرہ ہمتا رہا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔
 ”اُس کیلئے ہوا؟“ شاہ سکندر گے سے نکلا تھا اُسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر قدر سے براؤ
 ہو گیا۔ تو اُس نے آہستہ سے دونوں ہاتھ نیچے کر کر کے دیکھا اور یوں سر ہلایا جیسے کوئی بار
 نہیں۔

”وہ کیا نام ہے اُس کا۔ تمہارا بھتیجا ٹھیک ہے۔ بات ہوگئی تمہاری اُس سے؟“ شاہ سکندر
 جانتا تھا کہ وہ ابھی بیل کو فون کر رہی تھی۔
 ”ہاں نہیں۔ میرا مطلب ہے بیل سے بات نہیں ہوئی۔“ وہ کچھ کنفیوز ہوگئی۔ شاید اُس
 بتانا نہیں چاہتی تھی۔
 ”اچھا چلو۔ فٹاٹ تیار ہو جاؤ۔“ شاہ سکندر اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھاتے ہوئے بولا تو اُس
 بے دھیانی میں لو پھلایا۔
 ”کہاں جاتا ہے؟“

”کیا مطلب، تمہیں یاد نہیں احمد حسن نے کھانے پر بلایا ہے اور دوپہر میں نالندہ کا فون ہو
 تھا۔“
 ”اچھے یاد ہے۔“ وہ تعداد مسکرائی۔ ”آپ کی یادداشت کا امتحان مطلوب تھا۔ پاس ہوگیا۔“
 ”صرف اس امتحان میں؟“ وہ اُس کے ہاتھ کو زور سے دبتے ہوئے شوخ مسکرائی۔
 ”نہیں۔ اب تک جتنے بھی امتحان آئے۔ البتہ آئندہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“
 ”کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی پھر چیخ پڑی۔“ آف میرا ہاتھ
 توڑنے کا ارادہ ہے کیا؟“
 ”ارے۔“ شاہ سکندر نے فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر قدرے نادم ہو کر بولا۔“

”کچھ زور سے دب گیا۔ لاؤ دکھاؤ۔“
 ”بس رہنے دیں۔“ وہ ہاتھ جھٹکتی ہوئی تیار ہونے چلی گئی۔
 ”احمد حسن نے اگر حضور کھانے پر نہ بلایا ہوتا تو وہ اس وقت آبا جی کے گھر جانے کی
 کرتی۔ کیونکہ اُسے بیل کی فکر تیار ہی تھی۔ اور وہ بھائیوں کو نبیلہ کے حالات سے آگاہ کر
 تھی۔ بے شک وہ مان تھیں اس کے باوجود نبیلہ ان کے پاس جا کر ٹھیک نہیں ہوا
 وہ بیل کو کسی سے ملنے بھی نہیں دے رہی تھیں۔ آج اُسے جی نال دیا تھا۔ وہ اگر فون پر
 کی آواز سن لیتی تو اتنی پریشان نہ ہوتی۔ احمد حسن کے گھر نالندہ اور اُس کی امی سے
 دوران بھی وقفے وقفے سے اُس کا ذہن ہلکتا رہا جس پر خود اُسے کتنی بار شرمندگی ہوئی کہ
 سوال کیا کیا اور اس نے جواب کیا دیا تھا۔

پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر اور احمد حسن کے درمیان سیاست کا موضوع چھوٹے
 سمجھ گئی کہ اب یہ نشست خاصی طویل ہو جانے لگی۔ اس لیے نالندہ کے ساتھ اُس کے کمرے
 ”بیت لورڈ ٹاپک ہے۔“ نیچے بھی سخت وحشت ہوتی ہے۔“ نالندہ اُس کے لیے
 رکھتے ہوئے بولی؟ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں جانے نہیں لے آتی ہوں۔“

”آئی اب نماز پڑھیں گی۔ اگر آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو“
 ”نہیں، میں ان کے اکیلے ہونے کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ بس ٹھیک ہے انہیں نماز
 پڑھنے دو۔“ وہ جلدی سے بولی تھی۔
 ”اُدھے میں چائے لاتی ہوں۔“ نالندہ مسکرائی پھر جاتے جاتے کارنر پر سے اپنا البم اٹھا کر
 اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ”آپ جب تک یہ دیکھیں۔ پور نہیں ہوں گی۔“
 اُس نے البم تمام لیا۔ پھر آرام سے میڈیٹر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ شروع میں نالندہ کی تصویریں تھیں۔
 اس کی اسکول اور کالج کے دوستوں کے ساتھ۔ پھر کچھ گھر کے لوگوں کی بات کی۔ وہ عدم دلچسپی سے پلٹی
 جلی گئی۔ پھر کچھ اکثر البم بند کر دیا۔ جب نالندہ چائے لے کر آئی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو پیٹے
 بیٹھ گئی۔
 ”آئی جلدی آپ نے تصویریں دیکھ لیں۔“ نالندہ نے بقیہ کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر بولی۔
 ”جی نہیں اکیلے دیکھنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ تمہارے ساتھ دیکھوں گی۔“
 ”نالندہ نے چھوٹی سی طرے سے اُس کے قریب رکھی پھر میڈیٹر چڑھ کر بیٹھی اور درمیان میں البم
 کھولتے ہوئے بولی۔“

”جلیں میں آپ کو بتاتی ہوں، میرے ساتھ کون کون ہے؟ پھر وہ اپنی ایک ایک ہسٹل کا نام
 بتاتے لگی۔ اُس کے بعد گھر کے لوگوں کی تصاویر میں اپنے خاندان کے ہر فرد سے متعارف
 فرمایا۔ پھر ایک تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔“

”اور جناب یہ ہیں آپ کے سسرال والے۔“
 وہ بے اختیار تصویر پر جھک گئی۔ شاہ سکندر کے ہتھکے جھینچوں سے وہ مل چکی تھی۔ اس
 لیے تصویر میں جتنے نیچے نظر آ رہے تھے۔ انہیں وہ پہچان گئی۔ پھر روکیوں کے بارے میں
 نالندہ سے پوچھا تو وہ ایک چہرے پر انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگی۔
 ”یہ شہر بالو ہیں۔ ایک بار سکندر بھائی انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ تصویر میں نے انہی سے
 لی تھی۔ سچ بھائی بہت مشکل سے دی تھی انہوں نے۔ کہہ رہی تھیں۔ سکندر بھائی کو بتا نہ چکے آپ
 بھی نہیں بتائے گا بھائی۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔ اور شہر بالو کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کھڑی دوسری
 روکی کے غیر معمولی حسین چہرے پر اس کی نظر میں جہم کر رہی تھیں۔

”کتنی باری ہے ناں بھائی یہ روکی؟“ نالندہ اُس کی نظروں کے نیچے دیکھ کر کہنے لگی۔ میں بھی
 جب کبھی اس تصویر کو دیکھتی ہوں تو میری نظر اس چہرے سے ہٹتی نہیں ہیں۔“
 ”کون ہے یہ؟“ اُس نے اسی مبہوت عالم میں پوچھا۔
 ”بتا نہیں۔ شاہ سکندر بھائی کی چچا زاد بہن ہیں شہر بالو نے ان کے بارے میں بتایا تو تھا۔
 ”کیا خیر؟“ وہ بالوں والا نام ہے ان کا۔“
 ”نالندہ نے نیچے لگی بھی کہ اچانک جانے ذہن کے کس گوشے سے نکل کر ایک نام آسیہ کے
 فون پر آ گیا تھا۔“

”مہر النساء۔“
 ”ہاں مہر النساء۔“ نالندہ خوش ہو کر بولی پھر پوچھنے لگی: ”آپ جانتی ہیں انہیں؟“
 ”ایسا میرے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ خود حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ یہ نام اُس کی زبان پر



”کہاں گھر گئیں آپ؟“ نامہ نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو چونکنے کے ساتھ ہی اُمّ ذہن میں جھانکا ہوا تھا۔

”جوتی میں زیادہ افراد نہیں رہتے۔ بابا جان، بی بی جان اور مہر النساء“

”اُسی وقت احمد حسن نے وہیں سے نامہ کو لکڑیا تو وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے سکندر چلنے کا نہیں گئے۔ تم آؤ ناں کسی دن۔ صبح سے آؤ۔ سارا دن میرے ساتھ

”آف۔ سارا دن آپ برداشت کر لیں گی مجھے،“ نامہ اُس کے ساتھ بیڈ سے اُترتے ہوئے بولا

”تم آؤ تو؟“ اُس نے ہلکے سے نامہ کا رخارتھ کیا۔

”بھڑک کر سے نکل کر آئی کر۔“ توشاہ سکندر چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ اُسے رکنے کا کہر

کی امی سے ملنے اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے اُنی توشاہ سکندر احمد حسن کے ساتھ باہر نکلے؛

اُس نے نامہ کو گٹھ لگا کر خد کا فظ لکھا اور اپنے پاؤں کی تائید کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

”ابھی نہیں ہے۔ بہت پر خلوص اور مہربان! رستے میں وہ ایمانداری سے احمد حسن کے گھر کی تہ

کرتے ہوئے بولی۔

”ایسے مخلص لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور نامہ کو اتنا ہی

”ہے کہ“ وہ اچانک کسی خیال کے تحت ایک ٹخنے کو چپ ہوئی پھر ایک دم شاہ سکندر کا بازو

کڑ بولی۔

”سکندر مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے، نامہ عدیل بھائی کے لیے کسی رہے گی۔ وہ کہیں گنج

ہے ناں؟“

شاہ سکندر نے مسکرا کر اُسے دیکھا پھر دوہری ذرا سا سر ہلا کر بولا۔

”ساری بہنوں کے جذبات اپنے بھائیوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ جہاں کسی اچھی لڑکی

فورا بھائی کا خیال آ گیا۔ بے چارے تو مردوں کا خیال کسی کو نہیں آتا“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ جو اُس کا بازو تھامے بیٹھی تھی اس میں ناخن پھینک کر بولی۔

”آف، ظالم، بوی۔ مجھے جوابی کارروائی پر مجبور کر دو۔ ایکسٹنٹ ہو جانے کا؟“ وہ اس کا

سے بازو پھینک کر پھر اس کی گردن میں ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

”راتے میں ایسی حرکتیں میں پسند نہیں کرتی“

”پہل تمہاری طرف سے ہوئی تھی؟“ وہ اُس کی گردن میں بازو نہیں ڈال سکا تو بالوں کو ہا

جھٹکا دے کر بولا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ گھورنے لگی۔

”بہت کچھ۔ تفصیل کہہ جا کر بتاؤ گا۔ اس وقت تم اپنی بات کرو کیا کہہ رہی تھیں۔ عدیل

اور نامہ؟“ وہ اس کی کھلی آنکھوں میں ایک نفردال کر کہنے لگا: ”اچھا خیال ہے لیکن“

”لیکن کیا؟“ وہ فوراً بول پڑی۔

”ایک منٹ“ شاہ سکندر نے پہلے گاڑی پارک کی۔ پھر اُس کے ساتھ اپارٹمنٹ کی سیٹا

”میں سکندر! ہم نے بہت گھوم پھیر لیا۔ بہت دعوتیں اُڑائیں۔ اب ہم اپنی زندگی میں سیٹ ہونا

چاہیے“ شاہ سکندر نے کوٹ ہٹ کر کرتے ہوئے رک کر اُسے دیکھا پھر قصداً خاموش رہ کر اُس کی طرف سے

وضاحت کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بڑے آرام سے زیورات دراز میں ڈال کر دوش روم میں چلی گئی۔

”نہ ہاتھ دھو کر دایں آئی تب بھی اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ جس سے وہ یہی سمجھا کہ اُس کا دھیان

میں ادھر اکوہ ہو گیا ہے جبکہ وہ جانتا چاہتا تھا کہ اپنی زندگی میں سیٹ ہونے سے اس کا کیا مطلب ہے۔

”بھی پہلے دوپٹے پہن کر کمرے کے آگے پھر آرام سے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

”ان کیا کہہ رہی تھیں تم کسی یونگ ہوئی چاہیے“

”میرا مطلب اپنے اپنے کام سے لگنے کا ہے۔ یوں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ آپ کو عمومی

ہارڈ ورک کرنا ہے اُس کا شو چیں اور میں اوس جانب! بات ابھی اس کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً

بول پڑا۔

”نہیں!“ وہ کچھ بھی نہیں اور کچھ حیران ہو کر دیکھنے لگی تھی۔

”تم ابھی کچھ نہیں کرو گی۔ پاؤں جاب بھی نہیں! وہ قطعیت سے کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”کیوں؟“ اُس کی حیرت میں تدریس اُنھیں بھی شامل ہو گئی۔

”بس میں نہیں چاہتا کہ تم ابھی سے کمرے کے علاوہ دوسری مصروفیات میں آجھ جاؤ بلکہ جب تک

میں پوری طرح اسٹبلش نہیں ہو جاؤ تم سوچنا بھی نہیں۔ اسے تم میری خواہش سمجھ لو اور مجھے یقین ہے

کہ تم میری خواہش کا احترام ضرور کرو گی۔“ حتیٰ انداز میں کہتے ہوئے آخر میں شاہ سکندر اُسے دیکھ

کر مسکرایا۔

اور وہ مسکانے کی کوشش میں ناکام ہو کر سر جھٹکا گئی تھی۔

شاہ سکندر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اُسے کام کے سلسلے میں کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ اس لیے وہ

اس وقت اُسے اپنا جی کے گھر اترنے پر اصرار کر رہے بلکہ اُس کی طرف سے معذرت بھی کرے اور یہ

کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ احتجاج کرتی اس لیے جب اُس نے اباجی کے گھر کے سامنے گاڑی

دکڑ تو وہ اُتر کر اُس کی دایسی کا پوچھنے لگی۔

”دو پہرے کھانے تک آجائیں گئے؟“

”کچھ نہیں سکتا۔ تم بہر حال کھانے پر انتظار نہیں کرنا۔ اوکے! وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ

بلا تا گاڑی بڑھانے لگا تو کچھ دیر اُس کے پیچھے دیکھنے کے بعد وہ اندر آ گئی۔ اباجی اور عدیل بھائی

حسب معمول راندے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اُس نے قریب آ کر سلام کیا تو دونوں چونکے اور

عدیل بھائی فوراً اُٹھ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

”سکندر بہت عجلت میں تھے اس لیے نہیں اس کے معذرت کر رہے تھے۔ آپ بیٹھیں ناشتا کریں!“

”میں نے عدیل بھائی کے انداز سے کچھ کر کہا۔

”تم نے ناشتا کیا؟“ اباجی نے اُس سے پوچھا۔

”جی اباجی۔ ناشتا کر کے آ رہی ہوں۔“ اباجی جی کمرے میں ہوں گی؟“ وہ جواب دینے کے ساتھ

امان جی کا پوچھتے ہوئے ان کے کمرے میں آ گئی۔

”السلام علیکم امان جی!“

”جی جی۔“ ابو غرغرش رہو۔“ بڑی عمر سے تھاری۔ ابھی میں نہیں یاد کر رہی تھی! امان جی اُسے دیکھ کر

کس اُنھیں۔

”خیرت۔“ صبح ہی صبح کس سلسلے میں یاد کر رہی تھیں! وہ ان کے گلے تک کر پوچھنے لگی۔

”روزانہ یاد کرتی ہوں، بلکہ صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال تمہارا آتا ہے۔ خوش تو ہونا لازماً ہے بہت محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں ختم لیا۔“

”جی“
”اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے، ہمیشہ خوش رہو! اماں جی نے اُس کی پیشانی بچم لی چہرہ نکلیں۔ سکندر کہاں تھا بے ابا جی کے پاس ہے نہیں آتا جی، انہیں کام تھا باہر ہی سے چلے گئے ہیں! اُس نے جواب دیا تھا کہ میمونہ سنتی ہوئی آئیں۔“

”بہت غلط کیا، ایک کپ چلے پینے میں کیا دیر لگتی؟“
”اسلام علیکم! لایئے جائے تجھے پلاؤں! اُس نے میمونہ بھابی کے ہاتھ سے چلنے کا کپڑا پھر پلو چھنے لگی۔“ ایہ کس کے لیے ہے؟“
”تمہارے لیے۔ اور اگر ناشتا کرنا ہو تو میرے ساتھ آؤ! میمونہ بھابی جاتے جاتے رک کر،“
”شکر ہے بھابی۔ ناشتا کرو چکی ہوں۔ آپ بچوں کو گرائیں! اُس نے کہا تو میمونہ بھابی بڑے ہوئے بولیں۔

”بس بڑا بچہ رہ گیا ہے۔ جھوٹے تو اسکول جا چکے!“
”اُس نے مسکاکر کپ ہونٹوں سے لگا لیا اور اُس کے جلنے کے بعد اماں جی سے پوچھنے لگی۔“
”بڑے بیٹا شک ہے! اماں جی! افس چلے گئے کیا؟“
”نہیں! آج کل دیر سے جاتا ہے! اماں جی نے بتایا تو وہ کیوں کہتے تھے رہ گئی۔ معاً ساڑہ خیال آگیا تھا۔ اور وہ فوراً کھڑی ہوئی۔“
”میں آئی ہوں اماں جی!“

”ارے چلے تو آرام سے لیو! اماں جی نے ٹوکا لیکن وہ ان سنی کرتی اُن کے کمرے سے نکل بیٹھیاں چڑھ گئی۔ کھلی چھت پر سردیوں کی چمکی ہوئی دھوپ میں بڑے بھٹا اخبار پر معروف تھے۔ اُس نے قریب جا کر سلام کیا تو وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے بولے۔“
”وسلام، کیسے ہو بیٹا، آؤ بیٹھو! پھر اخبار رکھ کر وہیں سے پکارا۔“
”ساڑہ! اسیہ کے لیے بھی ناشتا!“

”نہیں نہیں، بھابی جان! وہ بھی بے اختیار وہیں سے چلائی پھر مھاگ کر کچن میں جا کر جا ملی اور انہیں اپنے ناشتے کا منہ کر کے دو بارہ بڑے بیٹے کے پاس آکر بیٹھی تو اُسے اُن میں تبدیلی نظر آئی۔ جیسے دھیمی ہوئی بہاریں لوٹ آئی ہوں۔ اُن کے چہرے پر قلبی سکون کا تھا کہ کچنوں میں اب بھی چمک اور ہونٹوں سے مسکراہٹ خفا نہیں ہو رہی تھی۔ نیسے دیکھے اس کی آنکھیں ترس گئی تھیں بلکہ شاید جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا انہیں اتنا خوش تھا۔ بید بھابی کے ساتھ ہو سکتا ہے ابتدائی دنوں میں وہ خوش رہے ہوں۔ بہر حال یاد نہیں ہے تو ہمیشہ انہیں ایک مجرمانہ احساس میں گھرے ہوئے دیکھا تھا۔ نہ اونچی آواز میں بولتے نہ بغیر ناشتے کے چپ چاپ گھر سے نکل جاتے اور اکثر اُن کی واپسی بھی ایسے ہی ہوتی تھی کہ کسی کو چلتا تھا کہ وہ کب آئے۔ پھر بید بھابی کو طلاق دے کر تو وہ اور زیادہ دُسر ب ہو گئے تھے۔ کتنے گئے گئے تھے جس پر میمونہ بھابی نے کہا تھا کہ اُن کی فوراً شادی کرانی پڑے گی۔ اُس دن یاد آنے پر وہ بے ساختہ مسکرائی اور دُردردہ نظروں سے انہیں بچن کی طرف جاتے دیکھ کر ہوئی۔ اس وقت بیل کا ذکر چھیرنا اسے مناسب نہیں لگا۔ حالانکہ آجی جلدی وہ اسی متعدد تھی لیکن مصلحتاً خاموشی اختیار کر کے نیچے چل آئی۔

زندگی میں کبھی کبھی لوں بھی سمجھتے کرتے رہتے ہیں کہ وہ جس نے بیل کو صرف جنم نہیں باقی مانتا کے سارے تقاضے تو اسی نے نبھائے تھے پھر بھی مصلحت کا دامن تھماتے ہیں۔

بیل کا نام سن کر بڑے بیٹا کا منتا مسکراتا چہرہ اتار دیا۔ وہ بھائی کے دوپہر میں جب احمد اور سونا اسکول سے آئے تو انہیں لڑکیں بائیں اینے بازوؤں میں سیٹے ہوئے بھی آئے بیل نڈت سے یاد آیا کہ سنا موٹی سے وہ اپنی باری کا انتظار کرتا تھا جب اُس کی نظر پڑی تو وہ احمد کو ایک طرف کر کے اُسے اپنے ساتھ لگا کر بھی کبھی کبھی دیکھتی تھی کہ اُن دونوں سے پہلے مھاگ کر آکر نہ اور وہ بھالتا بھی تھا پھر چلنے کیوں رک جاتا۔ ماں باپ کی عدم توجہی اور لڑائی جھگڑنے نے اُسے سہا کر رکھ دیا تھا کہ وہ بہت کوشش کے باوجود اُس کے اندر دوسرے بچوں جیسا اعتماد پیدا نہیں کر سکی تھی۔

”بھائی کے بعد جب میمونہ بھابی فراغت سے اُس کے پاس آکر بیٹھیں تب وہ اُن سے پوچھنے لگی۔“
”بڑے بیٹا بیل کو لینے گئے تھے؟“
”نہیں۔ بیٹا! بیگم نے صاف منع کر دیا تھا کہ بیل کو لینے اُن کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب اُن کے پاس رہے گا۔“ میمونہ بھابی نے بتایا تو وہ دبے دبے لہجے میں چیخ پڑی۔
”تو اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا؟“
”ہمارا تمہارا اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا جی۔ کیونکہ بڑے بیٹا بخوشی ان کی بات مان گئے ہیں!“

میمونہ بھابی کو افسوس تھا۔
”کیا؟“ ڈھک اور تائمت سے اُس کی آواز بھٹ گئی۔ ”بڑے بیٹا مان گئے؟“
”ہاں، بڑے آرام سے کہہ رہے تھے کہ خلیک تو ہے وہ اس کی ماں ہے۔ اُن سے زیادہ حق رکھتی ہے! میمونہ بھابی نے قدرے طنز سے کہہ کر سر جھکا پھر اُس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگیں۔“
”مگر ابھی نہیں سمجھو گی۔ مرد پیدائشی خود عرض ہوتا ہے۔ صرف اپنی خوشی چاہتا ہے اور اس میں کسی کی شرکت بھی برداشت نہیں کرتا۔ پھر بے چارے بڑے بیٹا کو تو اب انہیں جا کر ناز اٹھانے والی بیوی ملی ہے۔ اس لیے اُن کی بیل کی طرف سے لاپرواہی کم از کم میری نظر میں قابل گرفت نہیں ہے۔ اور میں تم سے بھی یہی کہوں گی کہ اس مسئلے کو مت اٹھاؤ۔ بیل ماشاء اللہ تمہارا ہے۔ تین چار سال میں خود ہی یہاں آئے جانے لگے گا۔“

”یہ تو بیک کی بات ہے بھابی۔ ابھی آپ کو نہیں بتاؤ کہ کتنا ہمارے۔“ وہ بے حد تشویش سے بولی۔
”نہیں کیسے بتاؤ؟ میمونہ بھابی نے چونک کر پوچھا تو اُس نے ہمد بھابی کو فون کرنے اور اُن سے ہونے والی تمام گفتگو کہہ سنائی۔ جس پر میمونہ بھابی بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔“
”تو اس لیے بیل اسکول نہیں جا رہا۔ اس کا نام بھی کٹ چکا ہے۔ اور میں یہ سمجھتی رہی کہ بید بھابی نے اُسے کسی اور اسکول میں ڈال دیا ہوگا۔ بہر حال ہے تو تشویش کی بات لیکن ہم کیا کیسے ہیں؟“
”کچھ نہ بچو تو کرنا پڑے گا بھابی۔ بتائیے میں کیا کروں؟“ اُس نے آجی عاجزی سے میمونہ بھابی کے ہاتھ تقاضے کر کے دھرتک اسے دھکی کر رہیں پھر کتنی دیر سوچنے کے بعد گویا ہوئی تھیں۔

”دیکھو! سیر۔ تمہاری ابھی شادی ہوئی ہے۔ شاہ سکندر ہرگز نہیں چاہے گا کہ تم خود کو سیکے مسئلوں میں اٹھاؤ۔ تمہاری ساری توجہ اُس کی طرف ہونی چاہیے کیونکہ وہ تمہاری خاطر سب چھوڑ آیا ہے اور ایسا مرد اگر بیوی سے سب کو چھوڑ دینے کی توقع نہیں رکھتا تو یہ ضرور چاہتا ہے کہ اُس کی ہر ادا دی و خیر ادا دی سوچ پر صرف وہ قابض ہو۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم شاہ سکندر کے سامنے۔ میری بات سمجھ رہی ہوں!۔“

وہ اثبات میں سر بھی نہیں ہلائی بس چپ چاپ دیکھتی رہی تھی۔
”اور رہا بیل، تو یہ سچ ہے کہ وہ سب سے زیادہ تم سے سچ رہا ہے اور تمہاری دُوری کو ہی اُس نے دل پر لے لیا ہے۔ جیسی خلیک ہو کے نہیں دے رہا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ تم اُس سے فون پر رابطہ رکھو۔ وہ تمہاری بات مانتا ہے اور تمہاری ناراضگی سے بھی خائف رہتا ہے۔ چنا ہے جب وہ

یہاں تھا تو میں اُس کو یہ کہہ کر دوڑائی پلائی تھی کہ اگر تم نے دوڑائی نہیں لی تو پھر پھوندا ہوں وہ خورائی لیتا تھا۔ تم اسی طرح وقتاً فوقتاً اسے ہلاؤ۔ حوصلہ دو اسے۔ مجھے لگتا ہے وہ گھبراہٹ میں کر رہی ہے۔ اُس نے کہا۔ بہت پیار کرتا ہے تم سے۔ میں ناں! میوزہ بھائی نے اسے کم عمر حالت نکالنے کے لیے آخر میں زور سے اکاٹھا۔

وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔
 ”میں جانتی ہوں۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“
 ”جی نہیں، سب میں میں شامل نہیں ہوں! میوزہ بھائی کی شوخی خدا لوٹ آئی۔ بھتا نہیں ام سنجیدہ گفتگو کیسے کر لی تھی انہوں نے۔“
 ”آپ بھی شامل ہیں! وہ زور دے کر بولی تو میوزہ بھائی کھلکھلا کر نہیں۔ تبھی برا کمرے سے بھائی کے پکارنے پر وہ ہنسی روک کر کچھ تعجب سے بولیں۔

”یہ عدیل اس وقت کیسے آگیا۔“
 ”آپ سے۔ دوسری آواز کے ساتھ ہی عدیل بھائی کمرے میں آگئے۔“
 ”جی بھائی! وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔“
 ”وہ۔“ وہ دیکھو نہیں بنا۔ جی بھائی نے کہا۔
 عدیل بھائی جس طرح ٹپک کر بولے اُس سے وہ سمجھ گئی کہ اُسے وہاں سے سنانا مقصود اور اگر وہ صاف لفظوں میں کہتے تو وہ تجسس نہ ہوتی بلکہ چپ چاپ چلی جاتی جیکب اب دھمک جاکر فوراً پلٹی تھی۔
 ”میں آئیہ کمرے کے ہاپٹنل جا رہا ہوں۔ شاہ سکندر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ عدیل بھائی بہت میں میوزہ بھائی کو بتا رہے تھے۔
 اُس نے متوقع پہنچ کر دھمکے کے لیے ایک ہاتھ ہونٹوں پر اور دوسرے ہاتھ سے جودھ سہارا لیا تھا۔

بی بی جان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد تسبیح لے کر جوڑے کمرے میں بیٹھتی تو پھر ڈھلے تک اُن کی بیٹھک وہیں رہتی تھی۔ اس دوران مزارعوں کی عمو میں انہیں سلام کرتے، اسی پہلے اپنے دکھ تکہ انہیں سنا جاتی تھیں۔ کسی وقت کو ہی ہوا کہ بیٹی۔ یہی اُن کی رونا لیکن اُس روز وہ اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔ بڑی ہونا سننے کا کہنے آئیں تو خلاف معمول بڑے کمرے کے بجائے ادھر دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگیں۔

”بی بی جان! خیر تو ہے؟“
 ”خیر ہے بیٹی۔ بس جتنا نہیں کیوں دل گھبرا رہا ہے۔“ بی بی جان نے انہیں تسلی دینے کے۔
 کیفیت بھی بتا ڈالی۔ میں ناشتا نہیں لے آتی ہوں۔ بڑی، ہمو جانے لگیں کہ وہ بولیں۔
 ”میں میرے لیے کچھ مت لاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم سب آرام سے ناشتا کرو پھر میرا پاس بیچ دینا۔“

”جی اجازت! بڑی ہمو چلی گئیں اور بی بی جان مہر النساء کی شادی سے دن اور بیٹے انگلیا کرنے میں تک گئیں۔ غالباً حساب لگا رہی تھیں کہ مہر النساء کی ڈیلیوری میں کتنے دن باقی اس خاندان کے رواج کے مطابق دو بیٹے بیٹے ہی مہر النساء کو اپنے سینک چلے جانا تھا اور پھر تک وہیں رہنا تھا لیکن اُس نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ بس جس روز نے اُس نے شاہ جہاں پر شاہ سکندر رہے بائیں کرتے سنا تھا کہ وہ کچھ اپنی منوانے ہی تھی۔ آخر میں تو اسے

جانی تھی۔ شاہ جہانگیر پر تو بس نہیں جلا تھا نہ وہ اُس کی دھمکی سے مرعوب ہونے لگتا۔ بہر حال جب اُس نے سینکے جانے سے منع کر دیا تو ظاہر ہے کوئی زبردستی نہیں تھی۔ البتہ بی بی جان اُس کی طرف سے نکر مند رہنے لگی تھیں کہ ایک تو پہلا بچہ تھا دوسرے وہ اپنا خیال نہیں رکھتی تھی۔ کھانے پینے سے حد درجہ لاپرواہی کی بنا پر بہت کم روز بھی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر جب بھی جیکب آپ کے لیے آتی اُس کی کمزوری کا سبب خود لک کی کمی بتاتی تھی۔ پھر بی بی جان سے کہتی کہ اُسے زبردستی کھائیں دلائیں۔ ورنہ کیس میں مشکل ہوگی۔ اور بی بی جان اس پر ہرگز برا آزمایا ہی نہیں۔ آرام سے پیات سے اور کسی وقت بڑی طرح دشمنی بھی نہیں لیکن اُس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”بس میرا دل نہیں چاہتا۔“
 آخر کیا چاہتا ہے تمہارا دل؟ ایک بار بی بی جان نے اسی طرح غصے میں پوچھ لیا تھا اور جواب میں اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بی بی جان اپنے آپ مجرم سی بن گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسے لکھنا چھوڑ دیا لیکن اُس کی نکر ہر وقت رہتی تھی۔
 مگر شہنشاہ نے جب لیڈی ڈاکٹر کی بھی تو اُس نے مہر النساء کی ڈیلیوری میں بس بائیں دن بننے سے اور اُن کے دل اُسے ڈرب لکھنے کا کہا تھا۔ کچھ دیر میں اُس کی آمد متوقع تھی کہ وہ ہیں اُن کے پاس لیٹ جاتے گی۔ اصل میں وہ اُس کے ساتھ ساتھ اپنا دھیان بھی بنا نا چاہتی تھیں۔ جلنے کیوں صبح سے دل گھبرا رہا تھا۔ بابا جان بھی کل سے شاہ جہانگیر کے ساتھ زمینوں پر گئے ہوئے تھے اور اپنی دلیبی کے بارے میں بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

”میں بی بی جان پر دودھ پی لیں سکو کوڑ ملا کر لاتی ہوں۔“ بی بی جان نے ناشتے کو منہ کیا تھا تو بڑی ہمو دودھ کا گلاس لے کر آگئی تھیں۔
 خوش رہو! بی بی جان محض اُن کا دل کھانے کی خاطر گلاس تھامنا چاہتی تھیں کہ مہر النساء کی دلہنوز جنسے دودھ کا گلاس دے اور سینے والے ہاتھوں کے درمیان سے پیئے جارہا۔
 ”الہی خیر! بی بی جان نے دل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ بھی حیران بھانکتی ہوئی آئی۔
 ”وہی بی بی، وہ چھوٹی بی بی بیڑھیوں سے گرتی ہیں۔“

”کون ہمو؟ بڑی ہمو بھائی کیس اُن کے پیچھے تھیں۔“
 مہر النساء کا جانے کون سی بیڑھی پر پاؤں مٹھنے سے توازن بگڑا تھا کہ وہ فرش پر پڑے ہوئی بڑی تھی۔ بی بی جان کے سچا سچ ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ ایک تو وہ پورے وزن سے تھی دوسرے زنی اپنل بھی فریب نہیں تھا۔
 بڑی ہمو نے حیران کی مرد سے مہر کو اکٹھا کر وہیں صوفے پر لٹایا پھر پریشان کھڑی بی بی جان سے کہنے لگیں۔

”بی بی جان! آپ دیکھیں اسے۔“
 ”اسے میں کیا دیکھوں۔ وہ ڈاکٹر آئے ہی والی تھی۔ جتا کر اُس کا۔ شاہ سکندر کہاں ہے بیجو؟“
 ”گھبراہٹ میں بی بی جان کے ہونٹوں پر شاہ سکندر کا نام آیا تھا۔“
 مہر النساء نے ہونٹوں کے عالم میں ہی کراہنے لگی۔ شاید وہ خود میں درد کی لہر سے اٹھنے لگی تھیں۔
 بی بی ہمو نے حیران کو اپنے کمرے کی طرف دوڑایا کہ شاہ یونس حیات کو بلا لائے اور اتفاق سے مہر النساء پر ٹپک گئی۔ بڑی ہمو نے فوراً اسے مہر النساء کے بیڑھیوں سے گرنے کا بتایا تو وہ اسی تیزی سے تیار سے باہر ہو چکی۔ جس ایک انگلیش لگایا پھر بی بی جان سے کہنے لگی۔
 ”بچہ پڑنے پر دھوکے کی حالت میں لٹا تھا ہے آپ انہیں کسی ہاپٹنل لے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ ریش

”عدیل کرو بی بی۔ میں اور بھی کام ہیں۔“ سسر نے کہا تو وہ اپنا دوپٹہ کھینچے ہوئے عدیل بھائی کے پیچھے چل پڑی۔
 فاطمہ سسر پر اپنی ایک پریشانی سے تنہا تھا۔ اور اُسے کہاں کہاں اور کتنی چوئیں آئی تھیں اس بارے میں احمد حسن بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ تو وہ بے اختیار ریش پڑی۔

”یک آپ سکھ سکھ سہ سہ تھیں تھیں“ عدیل بھائی نے دھیرے سے اُسے آرام سے آسیر دیا۔ اس طرح کروٹی ٹوٹیں تھیں گھر چھوڑاؤں گا۔ عدیل بھائی نے دھیرے سے اُسے دھکا دیا تو اُس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چسپا لیا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اُسواپ ہی آپ تھکے رہے تھے۔

”میرے خدا! تجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی کم ہمت ہو۔ چلو یہاں بیٹھو۔“ عدیل بھائی نے اُسے کندھوں سے تمام کر بیچ پر بٹھایا پھر اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے احمد حسن سے پوچھنے لگے۔

”آپ بتائیں احمد حسن، آپ کو شاہ سکندر کہاں اور کس حالت میں ملے؟“
 ”آسیہ نے احمد حسن کا جواب سننے کے لیے فوراً ہتھیلیوں سے انہیں دگر کر ہاتھ پیچھے کر لیے۔
 ”مجھے سکندر کہیں نہیں ملا۔ میں تو اپنے افس میں تھا۔ وہاں ڈاکٹر احسن کا فون آیا اور انہوں نے بتایا کہ سکندر یہاں ہے۔ پھر میں آپ کو فون کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اور آسیہ بھائی کو ساتھ لے کر آیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ خود ڈاکٹر ہیں، ہم سے زیادہ کچھ سکتی ہیں لیکن“ احمد حسن نے یکدم بچھا ہونٹ انہوں میں دبایا۔

”سناقم نے، تم سے زیادہ سمجھ سکتی ہو۔ جاؤ معلوم کرو سکندر کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔“ عدیل بھائی نے اُس کا کندھا لپیٹ کر کہا تو اُس نے کانڈنٹر پر گھڑی زس کو دیکھا پھر مایوسی سے سر ہلا کر دلی۔

”وہ سسر کچھ نہیں بتا سکے گی۔ ڈاکٹر باہر آجائیں۔ ان سے معلوم کریں گے۔“ پھر کسی خیال کے تحت ڈاکٹر کاڈنٹر پر چل گئی اور سسر کو متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”میں سسر ڈاکٹر پریشانی تھیں جو پیشانت ہے اُسے سختی دیر ہوئی ہے۔ آئی مین یہاں آئے ہوئے۔“
 ”اوچھا۔ یوں کھنڈ ہوئے“ سسر نے گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔
 ”کوئی سیریس“ ڈاکٹر پریشانی تھیں کہ وہ اس کی بات ادھوری رہ گئی اور ڈاکٹر کے باہر جانے کا انتظار کرنے کے بجائے وہ بھاگ کر اندر چلی تو کئی لیکن پھر اُسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر کا سر اور دھچکا چہرہ سینڈیلوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پھر ایک کندھے سے ہیٹ تک اور اس میں نامک پل سڑی قید میں تھی۔

”آسیہ! وہ کرنے کو بھی کہ ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر ان ہتھ اُٹھائے تم آسیہ ہوناں؟“
 ”بی بی! اس نے کم عمر انداز میں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر عبدالوہاب تھے۔ جن سے پریشانی کے دوران مول احمد حسن نے اس کی بی بی بارگاہا قات ہوئی تھی۔ بہت مہربان اور شفقت، جن کے بارے میں وہ کہا کرتی تھی کہ اگر کبھی میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی تو میری آخری امید ڈاکٹر عبدالوہاب ہوں گے۔“
 ”مولا! اسی کم عمر انداز میں اس نے شاہ سکندر کی طرف اشارہ کیا تو وہ پوچھنے لگے۔“
 ”وہ اس کے ساتھ ہو گیا۔“

”ڈاکٹر عدیل۔“ ای اراؤٹ آف ڈیجر۔ (یہ خطبے سے باہر سے) کم ان گول بی بی بڑی ڈاکٹر وہاب کو دیکھ کر بولے پھر اسی طرح اُسے اپنے ساتھ لگے ہوئے ڈاکٹر پریشانی تھیں۔ باہر سے آئے فون کرنے عدیل اور احمد حسن سوا لیلہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”جو صدمہ رکھیں بی بی جان! بڑی بھونے کہا اور شاہ لونس کو آتے دیکھ کر ان کے پاس چل گیا۔ کچھ دیر بعد بی بی جان اور بڑی بھونے مہر النساء کو لے کر شہر روانہ ہو رہی تھیں۔ لیدی ڈاکٹر کے ساتھ تھی۔ سفر غماطیل تھا۔ عام حالات میں ڈھائی تین گھنٹے بھاری تھیں اور اب پورے پچھترے تمام راستے بی بی جان قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی تھیں۔ انہیں اور بڑی بھونے چٹا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ڈاکٹر نے ڈرائیور کی رہنمائی کی تھی۔
 اور ایک پرائیویٹ کلینک میں دو دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔
 ”پوتا مبارک ہو بی بی جان! ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ بالکل اپنے باپ پر گلیا۔“
 بھونے پچھترے بی بی جان کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ نکل آئیں۔

”خیر مبارک۔“ بھونے بھی مبارک ہو۔ مہر و کبھی ہے؟“
 ”مہر و ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ بڑی بھونے بی بی جان کے پاس بیٹھے ہوئے کھنے لگیں ڈاکٹر جو ہو گئی تھی۔ بالکل سفید بڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بوجھ رہی تھی اُسے کھانے کو نہیں دیتے۔“
 ”بتاؤ کھانے کی کمی ہے کیا۔ وہ خود نہیں کھاتی؟“ بی بی جان نے ناکواری سے سر جھٹکا پھر بولا۔
 ”گھر کب چلنا ہے؟“
 ”مہر و کھانے کے قابل ہو گئی تب تو۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا۔“
 ”نے بتایا تو بی بی جان اچھنبے سے بولیں۔“

”گھر کس مجبوری ہے۔ البتہ آپ جانا چاہیں تو شاہ لونس آئیں گے۔ ان کے ساتھ آجائیں گے۔“
 ”ہاں۔ میں کہاں اتنے دن گھر چھوڑ کر بیٹھ سکتی ہوں۔“ بی بی جان نے تائیدی انداز میں بھونے کہا تھا۔

آسیہ کو خود کو سنبالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تمام راستے وہ کسی سہمی ہوئی جگہ کی طرح کا بازو مضبوطی سے تھامے رہی تھی۔ اور عدیل خود بھی پریشان تھے پھر بھی اُسے مسلسل رہے۔ پھر اُسے بازو کے حلقے میں لے کر کلینک میں داخل ہوئے تو احمد حسن انہیں دیکھنے آیا تھا۔

”ارے بھائی، آپ کو کیا ہوا۔ بہت کریں۔ آپ تو خود۔“
 ”سکندر کیسے ہیں؟“ اُس نے ساری باتیں پکی کر کے ٹوک دیا۔
 ”ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلیں آپ خود دیکھ لیں! احمد حسن نے کہتے ہوئے لفٹ کی طرف کیا تو عدیل پوچھنے لگے۔

”کہاں۔“ ڈاکٹر پریشانی تھیں۔
 ”ہاں۔ یہاں میٹرنی ڈیپارٹمنٹ میں تو نہیں ہو سکتے۔ احمد حسن سے قصداً ہکا بھکا اختیار کیا۔ جسے نظر انداز کر کے وہ فوراً لفٹ کی طرف بڑھی تھی کہ گروں میں ہکا سا جھکا گیا اس کے قدم آپ ہی آپ ٹک گئے۔ بلٹ کر دیکھا تو ایک زس اسٹریچر دھکیلتی ہوئی تھی جس کے کونے میں اس کا دوپٹہ اچھ گیا تھا۔

”سسر! پھر یہ؟“ وہ اُسے روک کر اپنا دوپٹہ نکالتے گی اور اس دوران بس ایک سرسبز اسٹریچر پر بڑے تندرست بڑی لڑکی پر ڈالی۔ اگر اس وقت اس کا وہن اس بڑی طرح متاثر ہو ایک بیل کر فٹنگ ضرور اور میر کہاں دیکھا ہے۔“ میں اچھی ہوئی آگے بڑھتی لیکن اُسے اپنا نہیں تھا۔

پھر ملتی نظروں سے عدیل بھائی کو دیکھا تو وہ اس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔

دو میمونہ بھائی سے کہہ کر سوئی تھی کہ اسے دو گھنٹے بعد اٹھادیں۔ غالباً اس کے خیال میں دو گھنٹے کی بندش کو پیش کر دے گی اور میمونہ بھائی نے ہامی تو بھرتی تھی لیکن اٹھایا نہیں کیونکہ عدیل تھی سے منع کر گئے تھے۔ پھر وہ خود بھی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں، بیوی کی سیاسی رات بھر کی جاگ بونی۔ اماں کی زیر نگرانی اسے ناشتا کرایا تھا اور پھر جو وہ دو گھنٹے کا کہہ کر سوئی تو وہ پھر نہ چلنے پر ہی اٹھتی تھی اور زندگی میں پہلی بار میمونہ بھائی سے اٹھ کر پڑی۔

اب کو بتا ہے میں سکندر کو کس حال میں چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔ بہت فکر ہے میری۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میمونہ بھائی اس کے غمزہ بولنے پر بالکل خاموش رہیں۔ ایک لفظ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ اسے خود احساس ہو گیا۔ خاموش ہوئی تو اسے ہنسنے لگے۔

”دیکھو، رومت۔ بے شک کالیاں دے لو مجھے“ میمونہ بھائی نے فوراً ٹوکا۔ بات نہیں کر س مجھ سے؟ وہ رو مجھے پہلے میں کہتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھ گئی۔ ابانی بھی اپنل گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے انتظار کرنا پڑا کہ عدیل بھائی انہیں چھوڑنے آئیں گے تب وہ ان کے ساتھ جائے گی۔ اس دوران میمونہ بھائی نے اسے کھلانے کے بعد چائے اور ساتھ میں اپنی باتوں سے بہت حد تک اسے ذہنی امتحان سے نجات دلا دی تھی کہ پھر وہ سکندر کے پاس بہت ناراض حالت میں گئی تھی۔

شاہ سکندر کو محض ہوش میں آنے میں تین دن لگے تھے۔ اور اسی روز اس کے سر اور ہجرے کی میڈن کھول دی گئی۔ چہرے پر معمولی زخم تھے البتہ سر میں کافی ٹکٹے آئے تھے۔ آسیہ نے ڈاکٹر واپ کے لئے پرفورم کیا پھر معائنہ سی ہو کر بولی تھی۔

”میرا خیال ہے سراب زخم تھلی بھر جائیں گے“ ہوں، جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو تم یقین کیوں نہیں کر رہی تھیں؟ ڈاکٹر واپ نے مسکرا کر کہا زوہ قدرے پشیمان گئی۔

”میں ان کی بے ہوشی سے خائف تھی؟“ اب تو مطمئن ہونا! ”میں سراب وہ شاہ سکندر کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”لڈ ڈاکٹر واپ نے اپنے شفیق انداز میں ہلکے سے اس کا سر تھپکا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر کچھ محفوظ انداز میں اس سے کہنے لگے: ہمارے ہاں جب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو پھر وہ صرف بیوی بن کر رہ جاتی ہیں۔ گذشتہ تین دنوں سے میں اس لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں جیسی ایک لڑکی بھی یہ وہ نظر نہیں آتی جیسا میں اسے پرکھنے کے دوران دیکھتا تھا۔ بہت اکیٹو، بہت اسارٹ۔ اور ابھی اگر اس سے ایک انجکشن بھی تیار کرتے تو کہتا تو یہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھول گئی کہ یہ ایک ڈاکٹر بھی ہے۔“

پھر مسکراہٹ سے شاہ سکندر کے ہونٹ ذرا سے پھیلے تھے۔ جبکہ آسیہ نے قدرے جھینپ کر سر جھکا کر ڈاکٹر واپ جاتے ہوئے تھے۔

آسیہ نے ہلکی بات سے لیکن اس سے اچھی بات یہ ہو گی کہ تم بیوی کے ساتھ اپنا ڈاکٹر ہونا بھی یاد رکھو۔ اس کا ہر باتوں میں اسے ڈاکٹر صاحب کو جلتے ہوئے دیکھا پھر احتیاط سے شاہ سکندر کے پاس بیٹھی اور آپ کیساتھ محسوس کر رہے ہیں؟

”تم ہاں ہو کر کوئی غم کوئی تکلیف نہیں؟“ شاہ سکندر اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا: ”میں جانتا ہوں مجھے

آسیہ نے ذرا سا سر ہلا کر انہیں اطمینان دلایا تھا۔ پھر شاہ سکندر کو کمرے میں منتقل کرنے تک وہ ایک طرف چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔ اس کا ابھی تک کام نہیں کر رہا تھا اور اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ عدیل بھائی شاید ڈاکٹر عبدالوہاب کے ان کے کمرے میں چلے گئے تھے اور اچھا حسن میں نرمی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ملنے کو کہہ کے طرف سے جایا گیا تب بھی وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی، پھر عدیل بھائی اسے اٹھایا تھا۔

رات میں میمونہ بھائی اور خلیل بھائی آگئے اور آسیہ کے حالات کے پیش نظر انہوں نے بہت اسے بے حس ساتھ گھر لے جائیں۔ عدیل بھائی نے بھی بہت زور دیا لیکن وہ نہیں مانی اور وہ لڑی اس نے ایک کرسی پر بیٹھ کر گزار دی تھی۔ صبح سویرے کچھ دیر پہلے شاہ سکندر کو ذرا سا ہوش آیا تو اسی انتظار میں بیٹھی تھی۔ فوراً اٹھ کر اس پر جھک گئی۔

سکندر! آپ صلیک ہیں ناں؟ شاہ سکندر ایک آنکھ ذرا سی کھول کر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر آنکھ بند کر لی تو اس نے آہستہ آہستہ تمام کر لیا۔

”سکندر! پھر اس کی بغض چمک کی اور قدرے مطمئن سی ہو کر اس کے پاس سے ہٹ آئی۔ بعد ہی اندر صبر سے چھٹنے لگے اور کھڑکی کے شیشوں پر اچالے کی دستک کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں آرتے لگی تو اس نے واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے پھینٹے مارے۔ ابھی بھی وہ سونا نہیں لیکن نیند غالب آ رہی تھی جیسے کھگانے کے لیے وہ ادھر سے ادھر پھرتے لگی۔ بہت مشکل گھڑی سے کچھ کھانا پیا بھی نہیں تھا۔ سرانگ دروسے پشیمان رہا تھا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز تو وہ دنگ کر دیکھنے لگی۔

عدیل بھائی کے ساتھ ڈاکٹر عبدالوہاب اندر آئے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولے۔

گذشتہ مارنگ۔ کیسا ہے تمہارا پینٹنٹ؟“

”اب ایک گھنٹہ پہلے انہیں ہوش آیا تھا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے“ اس نے قریب آ کر بتایا صاحب کوئی جھوٹے بغیر شاہ سکندر کو چمک کرنے میں لگ گئے۔ پھر سسر کو ہدایات دیں کے بعد عدیل بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو کہ جو میں کافی آئی ہیں لیکن شکر کہ اس کوئی گہری جوت نہیں پھر آسیہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگے: ”آپ اس کے کون ہیں؟“

بھائی! عدیل اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھ کر بولے تھے۔

”بڑے یا چھوٹے؟“ ڈاکٹر صاحب انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے جس پر عدیل کو بھی جواب دینا پڑا۔

”بڑا!“

”کیسے بڑے بھائی ہیں جو انہیں ڈانٹ نہیں سکتے۔ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ۔“

”پہنچائیں درد اس مہین کی جگہ یہ لیٹی نظر آئی گی!“

ڈاکٹر واپ عدیل کو تنبیہ کرنے کے بعد اس سے قدرے زعب سے بولے۔

جلو آئیہ کچھ جاؤ۔ آرام کرو اور پھر فریش ہو کر یہاں آنا۔

اس ٹیٹک بول سر نہ وہ کمزوری آواز میں بولی۔

”کوئی ٹیٹک نہیں ہو۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلے عدیل بھائی بول پڑے۔“ ڈاکٹر صاحب جھٹا رہے ہیں۔ چلو میں نہیں کچھ چھوڑ کر آتا ہوں۔“

وہ بے بسی سے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی۔ دل کسی طرح بھی اس کے پاس سے جانے کو چاہتا

اس حال میں دیکھ کر ہمیں ہنسنے لگا۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر تمہیں دکھ نہیں دیا۔
 میں آپ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے یوں سے دھوکا دیا کہ خیال آئے پرکھنے
 "سکندر! اب میں جہانگیر بھائی کو اطلاع دینی چاہتا ہوں۔ میں تو بعد میں وہ ناراض ہوں گے۔"
 شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور یوں انھیں بند کر دیں جیسے آپ اس میں بولنے کی
 جگہ نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی پھر اسی احتیاط سے اس کے پاس سے اٹھ گئی اور اپنے آپ
 لگی کر وہ شاہ جہانگیر کو فون ضرور کرے گی۔ آخر وہ سکندر کے بڑے بھائی ہیں اور ناراض بھی نہیں
 ہو سکتا ہے اسی پہلے بی بی جان اور بابا جان بھی آجائیں۔ شاید قسمت میں ان سے ملنے اور ان
 منوانے کا یہی بہانا نکلا ہو۔ اتنے سنگدل تو وہ نہیں ہو سکتے کہ شاہ سکندر کے ایکسڈنٹ کا سن کر
 آئیں۔ ضرور آئیں گے۔

کدو کی جو کھٹ پر دونوں کہنیاں لگانے نیچے دیکھتے ہوئے وہ مسلسل اسی بیج پر سوچا۔
 کہ سیاہ چمکتی ہوئی لمبی سی گاڑی میں بیٹھی لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔
 مزید آگے جھپک کر اس لڑکی کا پورا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی
 کیونکہ لڑکی اپنی گردن کو زیادہ نیچے نہ ڈال سکتی تھی اس قدر غور نہ کر کے اسے گرد و پیش کا بالکل غور
 یا وہ قصداً پروا نہیں کر رہی تھی۔

"کون ہے؟ کہیں دیکھا ضرور ہے۔" اس نے الجھنے لگی تھی۔ تبھی گاڑی چلنے سے لڑکی نے یونہی برا
 تو بس ایک پل کو اس کا چہرہ سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔
 "کہاں دیکھا ہے؟" اس نے ابھی ابھی الجھ رہی تھی اور شاید مقصود ہی کوشش سے اسے یاد آجائے
 سے پہلے ہی عتب سے عدیل بھائی نے پکار لیا تھا۔

"آپ کب آئے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
 "کہاں ہے۔ تیار ہے۔ سہنے ہی تو آیا ہوں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا؟" عدیل بھائی نے مسکرا کر کہا
 نے بے اختیار ریٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا پھر کمری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"نہیں، میں کسی اور کو دیکھ رہی تھی۔"
 "کہئے؟" عدیل بھائی نے لہجہ میں بل پر رکھتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔
 "وہ ایک لڑکی۔ شاید میرے ساتھ پڑھتی تھی یا پتا نہیں۔"
 "اس کا دھیان عدیل بھائی کے آنے سے ہی بٹ گیا تھا۔ جیسا سرسری انداز میں کہتے ہوئے"

کہتے تھی۔
 "سکندر کی طبیعت اب کیسی ہے؟" عدیل کی نظر میں شاہ سکندر کے چہرے کو دیکھنے لگی تھیں
 "کافی بہتر ہیں۔ ابھی باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر سو گئے۔ آپ پکار کر دیکھیں شاید۔"
 "نہیں، سوئے دو۔ عدیل بھائی نے فوراً ٹوک کر اسے ڈسٹرب کرنے سے منع کر دیا تھا۔

شاہ سکندر ابھی گھر آئے تو تیار نہیں تھا۔ گو گردنوں میں اس کے تمام زخم بھر چکے تھے
 ناگہم پر بلا سزا باقی تھا اور وہ اسی کی وجہ سے منع کر رہا تھا کہ اسے کو پریشانی ہوگی۔ اس کے ذہن
 کام کرنے کے دور کرنے رہے گی۔ اپنے نہیں وہ اسے پریشانی سے بچانا چاہتا تھا لیکن اسے
 پریشانی کا خیال تھا۔ صبح شام اسے کھانا پہنچانا، پھر عبادت کو انا۔ گو کہ بھائیوں نے انھیں
 نہیں ہونے دیا تھا کہ انھیں ایسا دفرہ چھوڑ کر ناپرتاب ہے لیکن اسے خود احساس تھا اس لیے وہ
 کی اجازت ملتے ہی وہ شاہ سکندر کو گھر لے آئی اور اتنے ہی بولی تھی۔
 اب آپ صرف میرے پیشکش ہیں۔ اور جیسا میں کہوں گی ویسا کر س گے۔

میں پہلے بھی تمہارے حکم کا غلام رہا ہوں۔
 شاہ سکندر کی شوق مسکراہٹ پر وہ انگلی اٹھا کر قلیبی انداز میں بولی۔

"مذاق نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"
 "یہ مذاق ہے۔ بتاؤ میں نے کب تمہاری بات نہیں مانی۔ میری جان تم دن کو رات کہو میں وہ
 بھی مان لوں گا۔" شاہ سکندر نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔
 "میری ساتھیوں کی دوسرا آپ کے ساتھ بندھ گیا ہے سکندر! آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔
 "بے وقوف رشا! سکندر نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔" میں جانتا ہوں تمہارا دل پھر پور
 کی جیتی ہے۔ جس کی گھبراہٹ مجھے سوئے کر تم نے مجھے آنا پنا بند کر دیا ہے کہ میں جاؤں بھی تو خود سے غانا
 نہیں ہو سکتا۔"

عدیل بھائی نہیں حکمرانی بھی! وہ اس کے سینے پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔
 اپنل میں گو کہ ساری سہولتیں موجود تھیں لیکن گھر گھر گھر جو تپا ہے اور اپنے گھر کی اضافی ضرورتیں
 بھی کم از کم وہی گرفت میں مبتلا نہیں کرتی اور اس کے پاس تو یوں بھی اتنی کوئی زیادہ ضرورتیں
 نہیں ہیں۔ صبح دو ادوی کا ناشتا منٹوں میں بن جاتا۔ پھر وہ شاہ سکندر کو اخبار پھا کر صاف ستھرت
 گھر کے برائے نام صفائی کرتی، اس کے بعد اس سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے آتی تو وہ کی گھنٹے اسے
 دہرا دھرا باتوں میں لگاتے کہتا اور آخر میں کتنا جو تپا دل چاہے پکا لوتے میں سب کھاؤں گا۔
 پھر پختی اٹھ جاتی۔

شام میں عدیل بھائی ضرور پکڑ لگاتے تھے جن سے وہ ضرورت کی اشیاء منگوا لیتی تھی۔ چھپنے کے
 غیل بھائی، ایسوز بھائی اور بچوں کے ساتھ آئے تھے اور ایک شام بڑے بھینا سا بڑا بھائی کو لے
 آئے تھے تو انھیں دیکھ کر اسے بیل کا خیال آیا تھا، جسے فون کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یا
 شاید اپنی پریشانی میں گھر کر یا دی نہیں رہا تھا۔ اور ایک احمد حسن تھا جو شاہ سکندر کو کپہنی دیتے
 آتا کسی روز آنے سے مجبور ہوتا تو فون پر اس سے بہت دیر باتیں کرتا تھا۔ اس شام وہ نامانوس
 کر آیا تو وہ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ناراض بھی ہوئی۔

احمد حسن بھائی صبح سے آنے کو کہا تھا۔
 احمد بھائی سے پوچھیں۔ روزانہ سے کہتی ہوں مجھے آپ کے ہاں بیچوڑیں۔ لیکن، نہیں، اس سے
 نہ چند دن ہیں ہے۔ ناموسہ صاف کوئی سے کام لے کر اپنا دامن بچا لیا۔
 "نہیں، احمد بھائی۔ کیا آپ ہمارے تحریک دن آئیں سے یہ نہیں ہو سکتے۔" اس نے احمد حسن سے
 باوجود فوراً بولا تھا۔

"آپ کی خاطر ہی تو جلدی جاتا ہوں۔"
 "کیا مطلب؟" وہ بھی نہیں۔
 "مطلب یہ کہ اس نالودگی بچی کی عادتیں کچھ بگڑی ہوئی ہیں۔ جتنی اونچی آواز میں بولتی ہے اس سے زیادہ
 دہش آواز میں نیپ جاتی ہے۔ اگر یہ صبح سے یہاں آگئی تو شام تک آپ دونوں پورے ہیں تو کدو
 گل ضرور پھوٹ جائے۔ اس لیے میں صبح آٹھ بجی جاتا ہوں تاکہ اسے یہاں نہ پھوڑنا پڑے۔"

احمد حسن کی وضاحت پر ناموسہ تیار کر بیٹھی تھی تو وہ جلدی سے اس کے گھر میں بار و فال کر بولی۔
 "مجھ سے نہیں روٹھنا میں نے احمد بھائی کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔"
 "میں جو یقین کر رہا ہوں" شاہ سکندر نے احمد حسن کو آنکھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا۔
 "شاہ سکندر! میں نے سکندر آپ کو ناموسہ ناراض نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے ٹوکنے کے ساتھ شاہ سکندر
 رشا سے یہ بھی منہ کیا پھر ناموسہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "آؤ ہم ادھر چلتے ہیں۔"
 "کہاں؟" شاہ سکندر نے فوراً پوچھا۔

"میں چلنے بیٹھنے جابری تھی۔ عدیل بھائی پتا نہیں کہاں رہ گئے۔ میں نے ان سے دو دھ منگوا لیا تھا۔"
 یہ بڑھتے ہوئے ناموسہ کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

”سکندر بھائی کی ٹانگ کا پلا سٹریک اترے گا۔ آپ تو خاصی پابند ہو گئی ہوں گی“ نائلہ نے کچن دروازے پر رک کر کہا۔
 ”ہاں بس، ویسے اب ایک ڈیڑھ ہفتے کی بات ہے۔ پلاسٹریک لگا جانے لگا۔“ اُس نے چلنے کا پا جو لیے پر کھینچے ہوئے بتایا۔
 ”دودھ تو بے نہیں چلنے کیسے بنائیں گی؟“ نائلہ نے اُس کے چوہا جلاسنے پر ٹوٹا۔
 ”اُسے ولے ہوں گے عدیل بھائی“ اُس نے کہا تبھی اندر سے شاہ سکندر نے اُسے پکارا تو وہ نائلہ کو آتی ہوں کہہ کر اندر چلی آئی۔
 ”فرمائیے“

”وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانے میں وہی دو پہر والا سالن ہو گیا کچھ اور بھی“ شاہ سکندر نے غالباً بتانا چاہا کہ احمد حسن اور نائلہ یہیں کھانا کھا میں گئے۔
 ”اور بھی بہت کچھ“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی تھی۔
 ”نہیں۔ ہمارے لیے کوئی تکلف نہیں“ احمد حسن بھی سمجھ گیا اور فوراً منع کرتے ہوئے بولا: ”کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔ بس چلنے ٹھیک ہے۔“
 ”تم سے کسی نے پوچھا ہے؟“ شاہ سکندر، احمد حسن ٹوک کر اُس سے کہنے لگا: ”ہاں اسیہ! میرے بہ کسٹروڈ ضرور بنالینا۔“
 وہ اثبات میں سر ہلاتے، دوبارہ کچن میں آئی تو عدیل بھائی کو نائلہ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر اُہ ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی اور کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی عدیل بھائی تقدیر سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو شاہ پر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔
 ”دیکھو، کوئی چیز وہ تو نہیں لگی۔“

”اس وقت ضرورت صرف دودھ کی ہے اور وہ موجود ہے۔ وہ بڑے سے شاپرے دودھ کو نکالتے ہوئے بولی۔ پھر اُسے نائلہ کو تھا دیا۔
 ”وہ دودھ کی پتیلی کھینچ رہی ہے بلکہ اسے کھول دینا۔“
 ”تم مہاروں سے کام کروانی ہو؟“ عدیل بھائی نے جانتے جانتے رک کر اُسے ٹوٹا۔
 ”یہاں کسی کہہ رہے ہیں آپ، اچھے بابے آپ کو؟“ اسیہ سے پہلے نائلہ نے بول کر انہیں لالچ دیا تھا۔ کام تو وہ بھی ابھی کر کے اترے تھے وہ بھی باہر کا۔
 ”کوئی یہاں نہیں ہے یہاں، سب میرے اپنے ہیں۔ بھائی ہیں اور تم۔“ اسیہ نے رک کر دیکھا پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی: ”تہیں کیا کہوں؟“
 نائلہ نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے بوکھلا کر بے اختیار اس کے پیچھے کھڑے عدیل کو دیکھا

خلاف رقم شاہ سکندر کے بچے کے حقیقی پر خاندان کے غیر کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تک نے اپنی بیٹیوں کو بھی نہیں بلا یا تھا۔ اتفاق سے شہر بانو خود ہی اُس روز حقیقت کو دیکھنے اور بے شک لگی تھی۔ یہاں آکر جب اُسے بچے کے حقیقی کا معلوم ہوا تو جہاں وہ خزان ہوئی وہاں آ کر ایسا شاہ سکندر کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی بی بی جان سے کہے بغیر نہیں رہے۔ بی بی جان، خوشیاں اپنی خاموشی سے نہیں منائی جاتیں، آپ کو کم از کم میرے تسمیرال کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ بچے کے نانائانی ہیں۔
 ”شاہ سکندر راجا جیسے خیر بہت خوشیاں منائیں گے۔ بڑی دھوم کے ساتھ۔ آئے والا ہے۔“
 بی بی جان نے دھیر دھیر سے اور یقین سے کہا تھا۔
 ”اگر واقعی سکندر بھائی اُسے ولے ہیں تو یہ خوشی اُن کی آمد پر ہوئی چاہیے تھی۔ اچھی کیوں؟“
 کا لہجہ جھٹکا ہوا تھا۔

”مجھ پر ہے۔ آج پچاس سال دن کا ہو گیا ہے۔ صد قد منجائے اس کا۔ اور نام بھی رکھنا ہے۔ بی بی جان ہوری تیار فوراً بات بدل گئیں۔ ”تم جلد مہر دے پاس۔ دیکھو وہ بچے کا کیا نام بتاتی ہیں؟“
 وہ سمجھتی تھی اسے وہاں سے اٹھانا مقصود ہے اور بی بی جان نے اُسے بھیجا بھی اُس کے پاس جس کے ماننے وہ خود کو جرم محسوس کرتی تھی۔
 ”میں مبارک ہو مہر دے۔ شہر بانو کو خوشی کے اٹھارہ میں بھی کوشش کرنی پڑی تھی۔ لاؤ میری گود میں دو۔“

مہر الساند نے جب چاپ بچہ اپنی گود سے اٹھا کر اُس کی گود میں ڈال دیا۔
 ”اے یہ تو بالکل۔“ شہر بانو اپنی بے اختیاری پر فوراً پچھا ہونٹ داؤتوں میں دبا گئی۔
 ”تم تو یوں خاموش ہو گئیں جیسے شاہ سکندر کا نام لینا گناہ ہو۔“ مہر الساند نے سبک کر جتایا، پھر مہر کے انداز میں سر جھٹک کر بولی۔
 ”گناہ صرف میرے لیے ہے۔ میں گناہ گار ہوتی ہوں اُس کا نام لے کر اُس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔“
 شہر بانو اُس سے نظر میں چلا کر نپٹے پر جھک گئی اور قدرے توقف سے اُس کا دھیان بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔
 ”کیا نام سوچا ہے اس کا؟“

”میں نے۔“ مہر الساند نے کسی خیال سے چونک کر شہر بانو کو دیکھا پھر تلخ آہستہ آہستہ ہنسی کے ساتھ کہنے لگی: ”بچے کا نام۔“ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں کیا۔ میں تو اس عرصے میں صرف اس کے باپ کو سوچتی رہی ہوں۔“
 ”اُسے ولے ہیں سکندر بھائی؟“ شہر بانو کو غالباً کچھ اور نہیں سوجھا تو بی بی جان کی بات دہرا دی لیکن ان میں یقین اُس کے بلے میں نہیں تھا۔
 ”اتھار کیا انہیں اطلاع مل چکی ہے اس کے اُسے کی؟“ مہر الساند نے بچے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 ”بتائیں شہر بانو نے اطلاع کا اظہار کیا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی: ”مہر داتم مجھ سے بہت دودھ پکھی ہو۔ ہمارے درمیان ایسی تلخ اور رسمی باتیں تو بھی نہیں ہوتی تھیں۔ سچ جاناؤ کیا ہم دونوں کی محبت اور دوستی سکندر بھائی کی وجہ سے بھی جو اُن کی بے مہری سے تم نے مجھ سے بھی وہ سارے ناتو توڑ لیے ہیں؟“

مہر الساند اچانک گم سم ہو کر اُسے دیکھنے لگی تھی۔
 ”مہر داتم راز دہی نہیں ہم راز بھی تھیں۔ گھنٹوں نہیں بارہ دری میں کبھی آم کے گھنے پھڑتے اور فریوں کی آواز میں تاروں کی چھاؤں میں ہم کیسے راز چننا کر رہی تھیں۔ ہمارے دل شفاف آئینے تھے جہاں ہر کرداروں کی وصولیوں جی۔ اگر سکندر بھائی کی وجہ سے تو آج میں کہا سے ملنے قسم خانی ہوں کہ میں زندگی بھر اس بھائی کی۔“ اُس کی آواز بھر لگئی۔
 مہر الساند نے بھی اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں نے دو بچے، انہی کی وجہ سے تم مجھ سے دور ہوئی ہو۔“ شہر بانو نے ہونٹوں سے اُس کا ہاتھ ہٹا کر دھڑک دیا۔
 ”میں نے میرے ساتھ تو شاید تمہارا کوئی نا تھا ہی نہیں۔ نہ نجات نہ دوستی کا دور۔ سب سے پہلے تمہیں جانی کر شاہ سکندر جو بلی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی تم نے ایسی تمہارے بچوں کے دکھ مجھ میں منائے۔ کیونکہ تم نے مجھے صرف شاہ سکندر کی بہن سمجھا، اور اگر اُس کے جرم کی سزا مجھے دینا ہی ہے تو۔“

”نہیں شہر بانو! مہر الساند نے فوراً ٹوک دیا۔ ”میں تمہارا گھر نہیں آ جاؤں سکتی۔“
 ”کیوں؟“ بھلے خوش ہونے کے شہر بانو نے تیز سب سے پوچھا۔

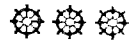
ہی دیر کرے گی، تاہم سکندر آپ کو میری قسم اور وعدہ کریں مجھ سے کہ ہم اپنے دل میں کبھی کسی معمولی سی ریش کو بھی گھر نہیں کرنے دیں گے، کس قدر جذباتی ہو گئی تھی وہ کہ سبب بتانے کے بعد ہاتھ بھی اسے ہی جوڑنے پر طے تھے۔
چلتے، آپ آسیہ کا وارنہ پر اس نے چونک کر آنکلیں کھولیں۔ وہ اس کے قریب کارنر ٹیبل پر بس

یک کپ رکھ رہی تھی۔
آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی خاموشی سے پلٹ گئی اور شام تک جانے کن کاموں میں مصروف رہی تھی۔
شب معمول عدیل بھائی اپنے تو پہلے آسیہ نے جو سامان منگوانا تھا وہ لا کر دیا اس کے بعد شاہ سکندر کے پاس کشتی دیر بیٹھے رہے تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی وہ لاڈلے میں کھڑی جانے لگا کر رہی تھی۔ شاہ سکندر کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر گہرا کر پکا لیا۔
"اُس! یہاں آؤ۔"
وہ دروازے تک آکر رُک گئی۔

"میرے پاس آکر بیٹو، کیا مجھے وضاحت کا موقع نہیں دو گی؟ شاہ سکندر کا لمبہ بٹی تھا۔ وہ آکر بیٹھ گئی تو کہنے لگا۔ "تم ناراض کی سبب بناؤ، میں وضاحت کروں گا۔"
"میں ناراض نہیں ہوں۔ ناراضی تو آپ ہوئے، میری کس بات سے مشتعل ہو کر آپ چلائے تھے؟ وہ ناخوش سے کہنے ہوئے بولی پھر اسے دیکھنے لگی تھی۔
شاہ سکندر جانتا تھا کہ وہ یہی پوچھ گئی، اور اس سارے وقت میں وہ اسی بات کی وضاحت سوچتا رہا تھا۔ جیسا اب بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔
"تم نے میرا انداز کے بارے میں بات ہی ایسی کی کہ مجھے غصہ آگیا، یعنی اُس کی ڈیوری اوز پچہ، جبکہ ابھی اُس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"
"کیا؟ وہ سچ بول کھلا گئی۔
"وہ تو کب سے تم نے دیکھا، ہو سکتا ہے میرا سب سے مشابہت رکھتی ہو۔ لیکن میرا سب سے مشابہت رکھتی نہیں دھوکا ہوا ہے۔ اور آئندہ اس کے بلکہ میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے بارے میں اس وقت تک یقین سے کچھ نہ کہنا جب تک تم اُس سے مل کر اسے جان نہ لو، شاہ سکندر کے چہرے پر بڑے لمبے میں واضح تبصرہ تھی۔
آسیہ کچھ محرم سی چوتھی تھی کہ پتا نہیں وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا جو اُس نے دیکھا وہ سچ تھا۔

نامک کا بلاسٹر اترنے کے بعد شاہ سکندر اب کوئی بھی بزنس کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے متوجہ نہ رہا تھا۔ کیونکہ اتنے دن گھر میں رہ کر وہ اکت گیا تھا زندگی مفلوج چلنے لگی تھی، جبکہ وہ شروع سے بندوں سے گھرا تھا۔ ادھر ڈیڑھ دو مہینے بالکل گھر کا ہو رہنے سے اس کی صحت بھی متاثر ہوئی تھی اور کچھ مزاج بھی۔ اگر آسیہ بھرداری سے کام نہ لیتی تو وہ روزانہ اس سے جھگڑتا، بہر حال اب صحت باب پر وہ پہلے کی طرح ایک نظر آنے لگا تھا۔ اور جانتا تھا جلد سے جلد کوئی کام شروع کرے۔ لیکن نامک بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس اُس کی شادی پر ہی آئے تھے۔ اور کہا تھا کہ پھر اطمینان سے آئیں گے تو اُس کے خایان شان بزنس سوچیں گے، چھوٹے موٹے بزنس کو انہوں نے منع کیا تھا۔ اور یہ کہ ٹنٹ سے بھی اطمینان دلایا تھا۔ پھر وہ الیکشن میں مصروف ہو گئے، اور اب تو الیکشن کا دور بھی ختم ہو چکا تھا۔ ان دو مہینوں میں اُس نے بی باران سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ملے

"میرا سب سے مشابہت رکھتا ہوں والا نہیں ہے۔ بہت خوبصورت ہے ناں وہ؟ اُس کی کیفیت بے خبر آسیہ کا اشتیاقی ہنوز تھا وہ غالباً ڈیوری کے لیے آئی تھی۔ اُس کی گود میں کچھ بھی تھا۔
شب آپ آسیہ "شاہ سکندر" چانک پتہ پڑا تھا۔



ہنسی آسیہ اُس کے چمکنے پر قدرے سہم گئی تھی اور ہونٹ بھیج کر سر جھکا لیا پھر سوچنے لگی کہ بات سے وہ مشتعل ہوا ہے۔ کچھ مجھ میں نہیں آیا تب اسی خاموشی سے اُس کے پاس سے اُڑا شاہ سکندر کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے۔ اس کے باوجود اُس نے نہیں روکا۔ اور اس کے کمرے سے نکلنے ہی بدلتی ایک پر سر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہر نکالیں۔ حقیقتاً وہ بہت پریشان ہو گیا کہ کہیں اُس کی شخصیت کا یہ کمزور پہلو سامنے آکر اُس اور زمرہ زور دے جو اُس کی شخصیت کا خاصا تھا۔ گو کہ میرا انداز کے ساتھ شادی کو نہ تو وہ تسلیم نہ اُس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت تھی، اُس کے برعکس وہ ایک ہی بار خود کو یاد کر چکا تھا کہ بابا جان کی سازش تھی جس میں انہوں نے شاہ جہانگیر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو اُسے گھر کرے تھے۔ پھر شہر بالو کو دیکھ کر وہ واقعی مجبور ہو گیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو پہلے ہی آسیہ کو وہ سارے مال کر اُسے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی اُسے یہی خیال تھا کہ وہ کسی پہلو سے کرا نہ آئے۔ اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اور احساس برتری کے زعم میں شاید یہ معمول گیا شاہ پور سے چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ پھر سال میں ایک دوبار ہی اس کی گھر کی آتی ضرور تھیں۔ کبھی شاپنگ اور کبھی تفریح کے لیے۔ یا ہو سکتا ہے اُس نے یہ سب بھی سوچ اپنے گھر سے وہ اعلان نہ نکالا تھا۔ اس لیے یہ خدشہ نہیں تھا کہ اُس کے گھر والوں میں سے کسی نے آسیہ کے ساتھ دیکھ لیا ہو کیا ہوگا۔ البتہ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ آسیہ کسی کو پہچان لے گی۔ کم بات مٹی اور خود اُس کے لیے حیرت انگیز اور لٹو لٹاشاک کہ جو بات اُس کے گمان میں نہیں ہو گئی تھی۔

وہ دیر سے دیر سے بالوں میں انگلیاں پھیر کر خود کو ریلیکس کرنے میں مصروف تھا۔ کیونکہ ہونی لڑکی کو منانے کے لیے اُسے بہت پر سکون رہنے کی ضرورت تھی۔ جانتا تھا ناں کہ وہ اچانک غصے میں آنے کا سبب ضرور پوچھے گی۔ اس عرصے میں وہ یہ جان گیا تھا کہ وہ اپنے درمیان ذرا سی غلط فہمی برداشت نہیں کر سکتی۔ اُسے یاد تھا لاہور میں اُس کی کوئی بات نہ گزری تھی تو وہ اُس پر جتنانے کے بجائے خاموش اور اپنے آپ کھنڈا راض ہو گیا تھا۔ کچھ اُس نے محسوس کیا تو اُس کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"سکندر! اگر آپ کو میری کوئی بات ناگوار گزری ہے تو بتائیں، میں وضاحت کروں بعد بھی اگر ناراضگی کا پہلو نکلتا ہو تب آپ کو ناراض ہونے کا حق ہوگا۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر "تو منادو ہاتھ جوڑ کر" وہ منکرٹ پٹ پٹا کر بولا تھا۔
"نہیں! پہلے مجھے سبب معلوم ہونا چاہیے تاکہ دوبارہ وہ غلطی دہرائی نہ جائے، اور آپ میں جو ذرا سی رنجش پیدا ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔ وہ اصل بات جلنے پر بڑھا "وہ تہیاری معافی سے دور ہو جائے گی" اُس نے کہا۔
"نہیں! سکندر! معافی سے رنجش دور نہیں ہوتی، میرے ہاتھ جوڑ لینے سے یقیناً آپ دور ہو جائے گی، لیکن ناراضگی کا سبب جو رنجش کی صورت آپ کے دل میں ہے اُسے میری

ہی نہیں۔ بتا نہیں کہاں مصروف تھے۔ آخری بار اُس کے ایکسڈنٹ سے پہلے اُن کا فون آیا تو انہوں نے کہا تھا کہ فی الحال کسی برنس میں پسہ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ الیکشن کے بعد دیکھیں گے۔

اُس کے اکاؤنٹ میں ڈرافٹ جمع کرانے کا بھی بتایا تھا جو کہ بہت بڑی رقم کا نہیں تھا۔ اُس نے حصار لگایا تو اتنا پسہ اُس کے علاج معالجے میں خرچ ہو چکا تھا اور بتا نہیں اس سے پہلے اس کے اکاؤنٹ میں کتنا پسہ تھا۔ اس وقت اس بیج پر سوچتے ہوئے وہ حقیقتاً برلین میں ہو گیا کہ اگر وہ ایکدم تھوہر ہو گیا تو کیا کرے گا۔

”مکرمیت کرو، میں تمہارا اکاؤنٹ کبھی خالی نہیں ہونے دوں گا“ شاہ جہانگیر نے کہا تھا اور اُن بات یاد آتے ہی اُس نے گاڑی بینک جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔ اور دھیرے اطمینان — ہو گیا کہ شاہ جہانگیر اُس سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے ایک اور ڈرافٹ اُس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود کہاں تھے اُسے اُن کی ضرورت تھی، کیونکہ اگلے دن بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جو ڈرافٹ انہوں نے جمع کر لیا تھا۔ وہ بھی اتنی بڑی رقم کا نہیں تھا۔ جس پر وہ کوئی برنس سیٹ کر سکتا۔ بس اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ تہی دست نہیں ہوا۔ اور شاہ جہانگیر نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

”کہاں خفیہ گئے تھے؟“ وہ گھر میں داخل ہوا تو آسیہ نے چھوٹے ہی سوال کیا۔
 ”لیس یونیورسٹی آوارہ گردی کو دل چاہ رہا تھا“ وہ اسے چھپ کر بولا۔
 ”آوارہ گرد لگتے تو نہیں؟“ آسیہ نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔
 ”پھر کیا لگتا ہوں؟“ وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔
 ”بعد میں بتاؤ گی، ابھی وقت نہیں ہے۔ چلیں جلدی سے تیار ہو جائیں۔“ وہ اُس کے چلتی ہوئی غصت میں بول رہی تھی۔ ”پرے ہاتھ روم میں لٹکا دیے ہیں۔ نہالیں تو اچھا ہے اور“

”جانا کہاں ہے؟“ وہ لوگ کر پوچھنے لگا۔
 ”لیجیے آپ کو یاد ہی نہیں۔ آج بڑے بھیا اور بھائی جدہ جارہے ہیں۔ آسیہ نے رک کر بتایا ہی اُسے ہاتھ روم جانے کا اشارہ کیا تو وہ کندھے اچکاتا آگے بڑھ گیا۔
 ”آپنی بیٹی کے گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ چچا جان کے سب گھر والے آٹے ہوئے تھے۔ اماں اُسے بھی صبح سے آٹے کو کہا تھا لیکن شاہ سکندر کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔
 ”اپنی اہمیت جتانے کا یہ طریقہ کچھ پرانا نہیں ہو گیا۔ میمونہ بھائی نے اُن کی دیر سے آمد کو مخصوص انداز میں جتنا۔
 ”سوری بھائی! اصل میں سکندر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ پھر انہیں یاد بھی نہیں تھا آسیہ کرتے ہوئے بتایا۔

”اچھا جاؤ، اماں جی کو اپنی شکل دکھاؤ۔ بار بار تمہارا پوچھ رہی ہیں۔ میمونہ بھائی کہتے ہوئے کہ چلی گئیں۔
 آسیہ نے پہلے اماں جی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سب موجود تھے۔ اور صوفوں کے بجائے نیچے کارپٹ پر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اس نے دیکھا بھی سب کے ساتھ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اماں جی کے پاس اور دھیمی آواز میں اُن کا حال احوال پوچھنے لگی۔ اُس کا خیال تھا اماں جی بڑے بھیا کے باپ سے ناراض ہوں گی، لیکن اس کے عکس وہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی یہ ماسٹا کی بھودی اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔

پھر میمونہ بھائی نے وہیں سب کے درمیان دسترخوان بچھا دیا تو وہ اُن کی مدد کے لیے آ

ہوئی۔ ساڑھ بھائی سے چھوٹی طاہرہ بھی ساتھ مل گئی تھی۔ کھانے میں اسے سارے آئیٹم دیکھ کر وہ تعجب سے میمونہ بھائی سے پوچھنے لگی۔

”اتنا سارا کھانا آپ نے اکیلے پکایا ہے؟“
 ”جواب: میمونہ بھائی نے پہلے گردن اکڑائی پھر ہنستے ہوئے بولیں۔ ”نہیں طاہرہ نے میری مدد کی تھی۔“

”وہی میں کہوں؟“ اُس نے شرارت سے بات ادا ہوئی چوڑی۔
 ”تم کچھ بھی کہو لیکن جانی اچھی طرح ہو کہ میں اکیلی بھی یہ سب کر سکتی ہوں“ میمونہ بھائی اُس کے ہاتھ میں سالن کا ڈونگ بٹھاتے ہوئے بولیں۔
 ”میں صرف جانتی ہی نہیں آپ کو مانتی بھی ہوں۔“ وہ بہت فحشت سے کہتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔
 پھر کھانا بہت خوشگوار ہوا جو ان میں کھا گیا۔ اس کے بعد ساڑھ بھائی اپنی پکینگ دیکھنے کے لیے تھیں تو ان کے پیچھے ساری خواتین باہر آگئیں۔ فلائیٹ چار بجے تھی اور گھر سے روانگی دو بجے گھڑی کی سوئیاں ایک سے کچھ آگے جا رہی تھیں۔

”بھائی جان! یہ تو ڈراما سا وقت آپ ہمارے پاس بیٹھ جائیں پھر تو سال دو سال بعد ہی ملاقات ہو گی۔“
 ”میں نے ساڑھ بھائی کو غلط کرتے ہوئے کہا۔“
 ”تم اگر صبح سے آجاتیں تو یہ سٹوڈنٹ سے وقت کی شکایت نہ ہوتی۔“ ساڑھ بھائی نے جتا بھی اور اُس نے پاس بیٹھ بھی گئیں۔
 ”بس غلطی ہو گئی۔ جب سکندر کام سے جا رہے تھے میں اس وقت انہیں یاد دلانا بھول گئی۔ لیکن آپ مجھے خط لکھنا نہیں بھولیے گا۔ میرا ایڈریس ہے آپ کے پاس یا کمپن کر دوں؟“ اُس نے اپنے بیگ تلاش میں نظروں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں لکھ دو“ ساڑھ بھائی اُس سے کہہ کر اماں جی کے پیکارنے پر اُن کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔
 کچھ دیر بعد عدیل بھائی نے آکر جلدی جلدی کا شور مچا دیا۔ اور شاہ سکندر کے اشارے پر وہ بھی باہر لوٹ بنے تو تیار ہو گئی۔ درختوں میں سے کوئی نہیں جا رہی تھی اُس کی وجہ سے طاہرہ کو بھی اجازت مل گئی۔
 ”وہ جلدی سے اُس کا ہاتھ تمام کر لوی۔“

”تم ہمارے ساتھ چلو، ہم والیس میں تمہیں چھوڑ بھی دیں گے۔“
 ”والیس کا کوئی مسئلہ نہیں، التوجی ہیں ناں۔“ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔
 ”ارے ہاں، چچا جان بھی تو جا رہے ہیں۔“ وہ خوشدلی سے کہتی ایکدم خاموش ہو گئی، کیونکہ ادھر لمبے کا سلسلہ شروعات ہو چکا تھا۔ اماں جی اور بی بی جان کے رونے پر ساڑھ بھائی کی آنکھیں بھی جھلکانے لگیں۔ اور میمونہ بھائی اماں جی کو تسلی دینے میں مصروف تھیں۔ پھر آبا جی کے ٹوکنے پر سب نے اپنے صوفوں پر لے کر اور ساڑھ بھائی، بڑے بھیا کے اشارے پر جلدی سے باہر نکل گئیں۔

پہلے بے حس ہوتے ہیں مرد، ایر پورٹ سے والیبی پردہ شاہ سکندر کو مخاطب کیے بغیر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”بھئی تو بڑے بھیا پر حیرت ہو رہی ہے۔ کتنی جلدی بدل گئے ہیں۔ ایک بار بھی ان کا نام نہیں لیا۔ اتنا ہی کہہ دیتے کہ وقتاً فوقتاً نیل کا تیا کرتے رہنا۔ یہ بھی نہیں کہا۔ اور جب اس خوشی سے نیل سے مل کر جا رہے ہیں تو بڑے آرام سے لوٹے تھے۔ وہ اپنی ماں کے ”تم کہیں غافل ہو جاؤ، ابھری ہو“ شاہ سکندر نے اُس کے تپے ہونے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔
 ”بس بھئی غصہ آ رہا ہے۔ یہ کوئی عرصہ ہے۔ چہرے میں دہ بے دہ بے غصہ ہیں۔ غصہ جہاں تک

میمونہ بھائی کے کمرہ بہت خود غرض ہوتا ہے۔ اُس کے پیش نظر صرف اپنی ذات ہوتی ہے اور بس اسے

کچھ بڑے پھیر پر بہت غصہ آ رہا تھا۔
 ”اب سارے مردوں کو ایک ہی تعداد میں تو مدت کھڑا کرو۔ پھر تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دور کے بعد تمہارے بھائی کو اب خوشیاں میسر آئی ہیں۔“
 ”ان خوشیوں میں نسل کا حصہ بھی ہونا چاہیے، وہ فوراً بولی تھی۔

”وہ اپنی ماں کے ساتھ خوش ہے، شاہ سکندر نے جس انداز میں بڑے بھائی کی بات سے وہ کچھ بھی کر وہ اس سونوے کو پسند نہیں کر رہا اور میوہ بھائی نے اسے بھجایا بھی تھا کہ اسے منے وہ شاہ سکندر کے سامنے بیان نہ کرے۔ اسے کوئی وجہ بھی نہیں ہوگی۔ اور وہ کچھ تو اسی وقت بس اس وقت نسل کے لیے کڑھتے ہوئے وہ کچھ جذباتی ہو گئی تھی۔ اور شاہ سکندر کی اکتاہٹ دیکھ کر کڑھے بدلنے کے بہانے ہاتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔“
 پھر اگلے دن وہ شاہ سکندر کے کہیں جانے کے انتظار میں تھی۔ اور وہ گیارہ بجے کے قریب تھا۔ تب جلدی سے دروازہ بند کر کے اس نے ہمید بھائی کے گھر فون کر ڈالا۔ دوسری طرف ملازمہ تھی، اس کے انداز سے پتہ چل کر وہ پوچھنے لگی۔

”نیلے بیگم ہیں؟“
 ”نہیں جی، آپ کون ہو؟“ جواب کے ساتھ ہی سوال ہوا۔
 ”میری بیبل سے بات کر دو، اس نے اپنے بارے میں قصداً نہیں بتایا۔“
 ”نیل تو جی اپنے کمرے میں ہے۔“ ادھر سے بڑے آرام سے کہا گیا۔
 ”تو بلاؤ اسے؟“ اس نے غصے سے کہا۔

”وہ نہیں آسکتا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جی۔“ ادھر سے معذوری ظاہر کی گئی۔
 ”اچھا دیکھو،“ وہ فوراً غصے پر قابو پا کر راسان سے بولی، ”میں نیل کی بھوپھو ہوں۔ وہ مجھے کر کے بہت خوش ہوگا۔ تم ایسا کرو۔ یہی فون سیٹ اس کے کمرے میں لے جاؤ جلدی کرنا اچھا ہی!“

آسیہ بڑی بے تابی سے انتظار کرنے لگی اور پھر اتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد نیل کی آواز اس کے آئینہ بے اختیار جھپک گئی تھی۔

”نیل، میری جان!“
 ”بھوپھو! آپ کہاں ہیں۔ مئی کہتی ہیں آپ بہت دور چلی گئیں۔ اب میرے پاس کبھی نہیں آئیں۔“

نیل کمزور آواز میں بولی رہا تھا۔
 ”اڈل گئی بیٹا آؤں گی۔“ وہ تڑپ گئی تھی، آپ ٹھیک تو ہو جاؤ کب سے یہاں بڑے ہو گیا؟

آپ کو؟
 ”شانہیں بھوپھو! میں چل نہیں سکتا۔ میڈ سے اترتا ہوں تو میری ٹانگیں کانپتی ہیں پھر میں گرجا نیل کے لیے کیے لیے کسی اُسے رلا رہی تھی۔

”تم دو انتہیں لے رہے؟“
 ”لے رہا ہوں اور آ میری ٹانگوں کی مالش بھی کرتی ہے۔“ نیل نے بتایا پھر اسے پکار کر پوچھو، میں اس کی کے پاس جاؤں گا۔ آپ مئی سے کہیں مجھے اس کی کے پاس چھوڑ دیں۔ میں نہیں کروں گا۔“

”ہاں ہاں بیٹا! میں کہوں گی آپ کی مئی سے۔“ وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر فوراً بولی پڑی۔
 ”مجھے اس کی بہت یاد آتی ہیں۔ اور سونیا، امرا اور بھوپھو وہ چھوٹا سا عمر، میرا بھی بھائی وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں بیٹا! آسہ نے بے اختیار ماڈھ پیس کو چوم لیا۔“
 ”مئی کہتی ہیں، میرا کوئی بھائی، کوئی بہن نہیں ہے اور باپ بھی۔“ وہ جانے کیا کہتے جارہا تھا یا شاید نے اپنی بات پوری کی تھی۔ لیکن آسیہ نہیں سن سکی کیونکہ اسے اچانک بڑی زور کا جھکرایا تھا اور نلے بھینٹنے بھی ریسورس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

شاہ جہانگیر نے پہلی سیر میں برآمدہ رکھا تھا کہ فون کی بل پر واپس پلٹ آئے، اور ریسورس اٹھا کر کان سے لے لیا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی تھاں رہی، جس سے وہ کچھ گئے کہ فون کرنے لگا۔ اور فون ان کا بھائی شاہ سکندر ہے۔ گزشتہ دو مہینوں سے یہی ہو رہا تھا۔ کوئی اور اگر ریسورس اٹھا لاکوئی تو ادھر شاہ سکندر فون بند کر دیتا۔ اور شاہ جہانگیر جانے کیوں اس سے کترا رہے تھے۔ بات یہ کہ شاہ جہانگیر نے فون ریسورس کرنے میں بہت احتیاط برت رہے تھے۔ کتنے بل خاموشی سے کرتے تھے۔ ادھر سے مہر انسائ کو آتے دیکھ کر شاہ جہانگیر نے اشارے سے اسے پاس بلایا اور ریسورس سے تمہا کر کوئی میں بولے۔

”سکندر ہے۔ بات کر لو اس سے۔“
 ”شاہ۔ شاہ کیسے ہیں آپ؟“ مہر انسائ بے اختیار ہو گئی تھی لیکن اگلے بل مایوسی سے شاہ جہانگیر کو دیکھنے

”کیا ہوا، بند کر دیا اس نے؟“ شاہ جہانگیر نے اس کے ہاتھ سے ریسورس کر کان سے لگایا۔
 ”کر ڈیڈل پر رکھتے ہوئے بولے۔“ لائن کٹ گئی؟“

”نہیں بھائی جی، انہوں نے فون پٹا تھا۔“ مہر انسائ نے فوراً بتایا کہ لائن کٹنے اور فون پٹنے میں فرق ہے۔

”اچھا! شاہ جہانگیر اب نظرس چرا گئے۔ اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ ناحق مہر انسائ کو بلایا۔“
 ”آپ سے کیا بات کی شاہ نے؟“ مہر انسائ پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں، میرا مطلب ہے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس ابھی تو فون آیا تھا اس کا اور میں نے نہیں بلایا۔“ شاہ جہانگیر گول مول جواب دے کر باباجان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

”السلام علیکم باباجان!“ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہ جہانگیر نے سلام کیا۔
 ”وسلام، کہاں سے آ رہے ہو؟“ جواب دینے کے ساتھ ہی باباجان نے پوچھا۔

”میں رحیم یار خان گیا ہوا تھا۔“ وہ باباجان کے سامنے موٹے بڑے بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔ ”ابو ظہبی سے مشائخ آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ آپ جانتے ہی ہیں انہیں شکار کا شوق ہی یہاں لاتا ہے۔“

”ہوں۔“ باباجان کتنی دیر تک اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب غائب کی بات پر ذہن میں اسی بات سے متعلق اور بھی بہت سے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں۔

”ابھی سکندر کا فون آیا تھا شاہ جہانگیر، باباجان کے منوچر ہوتے ہی کہنے لگے۔“ مجھے لگتا ہے باباجان کچھ پریشان ہے اس لیے جلدی جلدی فون کر رہا ہے۔“

”کچھ کہا اس نے؟“ باباجان سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
 ”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میں ملتا تب ناں۔ کیا کہتے ہیں آپ، اب مجھے اس سے لینا چاہیے؟“ شاہ جہانگیر نے پوچھا۔

”نہیں باباجان نے سختی سے منع کر دیا۔“ اب تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے کاؤنٹ میں میرے کوئی رقم جمع کرنا۔ اب ہم اس کے لیے واپسی کے راستے کھول رہے ہیں۔“ لیکن باباجان! وہ غالباً پریشان!

[illegible]

ہیں۔ انہیں خوار و خراج رکھ کر اپنے لیے رکھ دیا۔ انہی آپ ٹیل فون میرے پاس رکھ دیں۔ میں روزانہ پھونچوے
 اپنے ٹیل فون میں لاد دیتا تھا۔ انہی آپ ٹیل فون میرے پاس رکھ دیں۔ میں روزانہ پھونچوے
 ت کروں گا اور ان سے بھی یہ نہیں لے کر بات کا جواب دینے کے ساتھ التجا بھی کی۔
 نہیں، یہاں فون نہیں ڈر ب کرے گا۔ "نبیلہ اس کی التجا رد کرتے ہوئے لہولہی۔ "جب تمہاری
 نہیں، یہاں فون نہیں لاد دے گی۔"

جوجھون کر میں ہے آیا میں کون نہیں لا دے گی؟
 (الہ می) پھر کچھ کچھ دہی تھیں، وہ میرے پاس آئیں گی، میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں چل نہیں سکتا۔
 جیل بیت، سادگی اور معصومیت سے بول رہا تھا۔
 "میرا ہمسلا نے غصے سے دانت پیسے۔" کیا بتایا ہے تم نے پھوپھو کو؟

بیل کے سر پر چھب بویگا۔
 "دیکھو بابا! بیل ایک دم غصے پر قابو پا کر بولیں۔" اس طرح تو تمہاری جھوٹو پریشان ہوں گی، تمہیں
 لبتا چاہیے تھا کہ تم اب ٹھیک ہو جاؤ۔
 "سوری ممتی! اب میں جھوٹو کو پریشان نہیں کروں گا۔" بیل نے فوراً سوری کہا کہ کہیں ممتی اُسے
 جھوٹو سے بات کرنے سے منع نہ کر دیں۔
 "ہاں شاہاں! بیل نے جب کہ اس کا کمال تھکا چھر ملیں تو آیا کو کھڑے دیکھ کر اُس سے بولی

تھیں۔
 ”نیل سوچائے تو میرے کمرے میں آنا۔“
 ”میں بیچو بیچو آئیں گی ناں؟“ نیل نے عقب سے پکار کر پوچھا۔
 ”نیل! قصداً اُن کی کمرے میں آنا سے نکل آئیں۔ اصل میں وہ جس دعوے سے نیل کو لے کر
 آئے تھے کہ اُن سے ہوتا ہے کہ اُن کو کبھی نہیں کر سکتا تو اپنے دعوے کو وہ سچ ثابت نہیں کر سکتی تھیں بلکہ

اب میں کراں کے بہتر اس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا تو ایسے دھوکے کو وہ سچ ثابت کر دیا۔ اس نے شروع ہی سے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور شاید یہ اُن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے شروع ہی سے میل کو دوسرے الگ رکھا تھا۔ کبھی اُس کی خاطر اپنی اکیڈمی میں نہیں چھوڑی تھیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ جائیں، بلکہ طلاق کے بعد تو وہ اور بھی آزاد ہو گئی تھیں۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی، اُن کے ماں باپ اس عمر میں بھی کلب اور پارکسز کے دلدادہ تھے، اور کھتے تھے کہ اُن کی بیٹی اتنا غریب قیام باشت کاٹ کر آئی ہے۔ اس لیے اس سے ہمدردی کرنے کے ساتھ اسے مزید سچ چٹھا لیا تھا۔ اور جانتے تھے کہ اب وہ اپنے ہی جیسے لوگوں میں کہیں ایڈجسٹ ہو جائے۔ خود بنید ہی رہی جیسا ہی تھیں اس لیے اُن کا زیادہ وقت کلب اور پارکسز میں ہی ہونے والے فنکشنز میں گزرتا تھا۔ میل کا طوق تو انہیں سے توڑنا وہ کبھی اسے ڈال لیا تھا۔ جس پر اب بھارت رہی تھیں۔

اصل میں اس وقت بھی انہیں نیل کا خیال نہیں تھا۔ بلکہ چھوڑے ہوئے شوہر کو پریشان کرنا مقصود تھا۔ جیسے پہلے نیل کو بغیر تیسارے لکڑوں سے ہی اپنے ساتھ لے جا کر پریشان کر رہی تھیں، لیکن اس بار وہ خود پریشان ہو گئی تھیں، کیونکہ جس وقت وہ نیل کو لے کر آئی تھیں اس وقت وہ صرف بخانا کھا تھیں۔ اور یہاں ان کی المیہ روانی سے مغموم پختہ پولیو کا شکار ہو کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ گو کہ وہ زبردست اندھے کے علاج کے ساتھ بھی پورے روبرو سے وہ ٹھیک ہو سکتا ہے اور نیل کے دوسرے دن اس کو زبردستی لایا جاتا تھا۔ لیکن نتیجہ نادر داس کے لیے آیا کہ چھوڑی تھی، اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ تباہی کے ساتھ ٹھیک ہو جائے۔ تاکہ اسے اس کے دادا دادی کے پاس بھیج دیں۔ اس حالت

”پریشان مزاج تو یہاں آنے پر تیار ہو گا“ یا باجان فوراً بولے تھے: ”اور اُس کی اصل پریشان وقت شروع ہو گی جب اُس کا کافوق بائبل خالی ہو جائے گا۔ ہمارے اندازے کے مطابق دو“ لکھیں گے اور اتنا عرصہ ہم بائبل خاموش رہنا سمجھ رہے ہوں۔“

”جی۔ شاہ جہانگیر نے یونہی سر ہلادیا، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے: یوں تو باباجان آپ ہمیں پیر کے لیے وہابی کے راستے کھول سکتے تھے کیونکہ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔ شادی کرنا تو بڑا جاتا اور پرنس کرنا تو شادی میں دیر ہوتی، یعنی پریشان تو وہ اسی وقت تھا۔ آپ نے تو مزید رقم ایک طرح سے اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔“

باباجان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوئی چل گئی اور انہوں نے فاطمہ زحرا کی طرف سے کچھ دیر بعد ان کو دیکھ کر کہنے لگے:

اُس وقت اگر سکندر پریشان تھا تو اُس کے ارادے بھی مضبوط تھے، وہ اُس لوگ کے لیے جاگیر چھوڑ گیا تھا۔ وہاں اُس کی خاطر پتھر توڑنے کا عملہ بھی رکھا تھا۔ اور یہ عملے تب تک جوان ہیں جب تک زندہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں کر لیتا۔ اور حصول کے بعد تو مطمئن۔

ہے۔ اس وقت اگر ہم سکندر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے تو وہ معمولی کام کرنے میں بھی عار محسوس نہ
 اور پھر اس کی والدین واقعی نامکین ہو جاتے۔ اس لیے ہم نے اسے اتنی ذلیل دی۔ ہمارے ذریعے
 بھی اگر اس کے اس احساس کو زندہ رکھا کہ چھوٹا موٹا کام اس کے شایان شان نہیں ہو سکتا۔ اب
 پتھر توڑنا تو دور کی بات کسی کی مانتی میں اچھا عہدہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ کچھ میں آئی ہماری حکمت
 یا نہیں؟
 شاہ جہانگ جھوٹے سن رے تھے، مسکرا کر سنا سننے کے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

شاہ جالبیہ جمعوں کے قتل دے گئے مسافر کر رہا ہے اندریں مگر بدینا پھر ہے یہ
 "اس طرح مجبور ہو کر وہ یہاں آنے پر تیار ہو لو گاہے گا لیکن"
 "اوں ہوں یہ باباجان نوک کر لوئے، ہم نیکن کبھی کش نہیں چھوڑتے اُسے آنے دو بہ
 دیکھ لیتا"

”جی: اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اپنے اندر اٹھتے سوال کو روک کر کہا: اقدام پوچھا۔

”چند دن بعد سکندر کی بات سُن لیا۔ اور پھر کوئی بھی سبانا کر کے پیسے سے معذوری ظاہر اور باں ذرا اپنی بی بی جان کو مضبوط کر دیا وہ آجکل بہت سکندر سکندر کرتی ہیں۔ کہیں البتہ اُن سے رابطہ کرے اور یہ ہمدردی میں اُس کی مدد کرے۔ ان عورتوں کے پاس عقل نام کی نہیں ہوتی، سارے کیسے کرانے پر پانی پھیر دیتی ہیں، بابا بھان بولتے ہوئے اُنھ کو کھڑے ہونے شامہ جہانگیر نے فوراً اُن کی تقلید کی۔“

”میں سمجھا دوں گا بی بی جان کو۔“
 ”ٹھیک ہے اب تم آرام کرو، بابا جان نے انہیں جانے کی اجازت دی، شاہ جہانگیر اُن سے نکل آئے۔“

میرا لہو اپنے گول میٹوں نیچے کو بازوؤں کا جھولنا چلائے ہوئے اُس سے بائیں بھی کر کے باپ نے پیری آواز میں کہہ دیا۔ اب تو جلدی سے بڑا ہو جا آغا۔ آواز سننا تو گئی۔ بھڑکھڑکیوں کی کیسی فون بند کرتا ہے۔ شاہ جہانگیر نے رک کر ماں بیٹے کو دیکھا پھر آگے بڑھے ہوئے ان کے ہونٹوں پر مسکا۔

میں یوں نہیں بھیج رہی تھیں کہ بڑے دعوے سے لائیں۔ گو باہر لحاظ سے انہیں اپنا مفاد دیکھتا تھا اور ابھی نبیل سے آسیہ کے فون کرنے کا سن کر وہ سخت غصے میں آئی ہوئی تھیں کہ چٹا نہیں بنی۔ آسیہ کو اپنے بارے میں اور کیا کیا بتایا ہے۔ چاہتی تو نبیل سے معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن قصداً اس سے نہیں کر دیا کیونکہ ان کا غصہ ظاہر ہو سکتا اور نبیل کے سامنے اس کے دو خیال کا ذکر وہ اچھے طریقے سے کرتی تھیں تاکہ اسے واپس آن لگی۔ پاس بیٹھنے میں انہیں کوئی پرہیز نہ ہو۔ بہر حال جیت آیا ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چھوٹے پوچھنے لگیں۔

”نبیل فون نبیل کے کمرے میں کیوں لے کر گئی تھیں؟“
 ”وہ اس کی بھوبھی نے کہا تھا“ آنا ان کے غصے سے کچھ ڈر گئی تھی۔

”بھوبھی ہو یا دادی، کسی کے خالو بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہ بنیہ سخت لےجیے۔“
 ”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، کوئی بھی نبیل کا پوچھے کہہ دینا، وہ میرے ساتھ باہر گیا ہوا ہے۔“
 ”آپ کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے؟“ آیا منمنائی۔

”ہاں اور خیر دار نبیل کو نہیں بتانا کہ اس کی کسی بھوبھی، چاچا، دادی کا فون آیا تھا۔ وہ پوچھے بھی نہیں۔“
 ”جی ہاں۔“ وہ سارا غصہ اس پر نکال رہی تھیں۔
 ”جدا، اپنا کام کرو۔“ وہ آیا کو بھیج کر بھی کتنی دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔

”بل کی آواز پر اس کی سسکھ کھٹی تھی۔ اور پھر مجھوں“ اٹھنا بھی پڑا کیونکہ دروازہ تو کھولا تھا۔ بہت سستی سے آکر دروازہ کھولا۔ تو سامنے شاہ سکندر بے حد خستہ لایا ہوا کھڑا تھا۔
 ”سو رہی تھیں کیا؟“ اس کی آواز میں بھی جھجکا ہٹ تھی۔
 ”آسیہ کبھی اسے اٹھنے میں دیر ہو گئی ہے۔ جلتے کب سے وہ بل بجا رہا تھا۔
 ”ہاں بس نیند آگئی تھی۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔
 شاہ سکندر نے رک کر دیکھا اور پھر اس کا بازو تھام کر اپنے سانس لے کر لیا آنکھیں مٹائی۔
 چہرہ سستا ہوا۔ نیند کے باعث پس لگ رہا تھا جب ہی وہ تشویش سے بول چھنے لگا۔
 ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“
 ”ہوں، ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً اپنے چکر اگر کرنے کا جتنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور بات گئی۔

”کیا بہت دیر سے بل بجا رہے تھے؟“
 ”پورے دس منٹ۔“ شاہ سکندر نے گھڑی اس کے سامنے کی۔
 ”منٹ اور گھنٹے میں فرق ہوتا ہے شاہ سکندر حیات، دس منٹ یوں کہہ رہے ہیں جیسے گھنٹے کھڑے رہے ہوں۔“ وہ اس کی ٹان کیوں لکھا سا جھٹکا دے کر بولی۔
 ”جناب! جب بندہ کہیں سے تھکا ہارا آئے تب دروازے پر ایک بل رگنا بھی غذاب ہے۔ اور تمہیں ابھی بھی احساس نہیں۔ بھوکا پیاسا کھڑا ہوں۔“ شاہ سکندر نے پیٹ پر ہاتھ دیا۔
 ”اوہ۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ ”آئی ایم سوری سکندر! کھانا تو میں نے پکایا نہیں۔“
 ”کیوں، کچھ پکانے کو تھا نہیں یا۔“ شاہ سکندر نے تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گئے۔

”چاہتے ہیں پکانے کو تو موجود تھا۔ بس میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔“ اسے بتانا پڑا۔ ”پتا نہیں چاہتا تھا، میں جیگر کر رہی تھی پھر اندر جا کر لیٹی تو نیند آگئی، ابھی اٹھی ہوں۔“
 ”یا ہوا تھا، تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی، چلو ابھی ڈاکٹر کے پاس۔“ وہ ابھی بٹھا تھا فوراً کھڑا ہو گیا۔
 ”نہیں اب تو میں ٹھیک ہوں، بلکہ بہت بہتر ہوں۔“ آپ جب تک پہنچ کر رہیں میں اتنی دیر میں بیٹ پوچھنے کیلئے کچھ تیار کر دیتی ہوں۔ وہ غصت میں کہہ کر بچن میں جلتے لگی تھی کہ شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں کچن میں جانے کی۔ جاؤ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ کھانا بھی باہر کھالیں گے۔“
 شاہ سکندر نے اسے کہنے کی طرف دھکیل دیا۔

”وہ اس کی بھوک کے خیال سے کتنی رہ گئی کہ پہلے کھانا پھر ڈاکٹر لیکن وہ اسے پہلے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جہاں سے نئے بھان کی آمد کی نوید لے کر وہ اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا جہاں وہ اس کے ساتھ پہلی بار آئی تھی۔“
 ”یہ تو وہی جگہ ہے۔“ وہ بیٹھے ہی بے اختیار گنگنائی پھر جینپ کر بچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

”شاہ سکندر اس کموں میں شرارت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہونٹ دلکش سکڑا ہٹ کی گرفت میں تھے۔ اس طرح دیکھنا منع ہے۔“ اس کا چہرہ رنگین ہو گیا تھا۔
 ”شاہ سکندر نے اسے مار کر اسے مزید بول کھلا دیا تھا۔
 ”لگتا ہے آپ ہوش میں نہیں رہے۔ ایسی حرکتیں کریں گے تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی۔“ اس نے روٹھ کر کہا اور گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔

”اوں ہوں۔ کھانے سے ناراضگی بانٹ نہیں چلے گی۔ سنا نہیں تھا، ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں۔“ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا پھر ویٹ کے آنے پر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔
 ”ڈاکٹر نے اسے ریسٹ بھی بتایا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ وہ بانٹل لیٹر پر لیٹ جائے، بلکہ ہلکے کام کر سکتی تھی۔ اور وہ کرنا چاہی تھی۔ لیکن شاہ سکندر نے اسے یہ نہیں کروا دیا کہ وہ آرام سے بیٹھو، کہہ کر پریشان کر دیا تھا۔ آخر خرا بھہر کر وہ اس سے اٹھ پڑی تھی۔

”میں خود ڈاکٹر ہوں، بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ کچھ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، آپ براہ مہربانی خاموش رہا کریں۔ اور ہر وقت میرے سر پر سوار رہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“
 ”میرے ساتھ ساتھ رہنے سے؟“ شاہ سکندر نے جانے کس لہجے میں پوچھا۔
 ”نہیں، آپ کے ٹوکنے سے سیدھا سادہ کام خراب ہو جاتا ہے۔ جسیں کمرے میں جائیں میں یہ دہرزن دھوکا بھی آتی ہوں۔“ وہ اسے کچن سے نکلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”شاہ سکندر مصروفی نارا حکی کا اظہار کرتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر اندر آئی تو وہ فون پر بھانے کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کوئی دھیان نہیں دیا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”تھک گئی ہوں؟“ شاہ سکندر فوراً فون رکھ کر بول چھنے لگا۔
 ”نہیں۔“ وہ قصداً سکڑا پھر اچانک خیال آئے پر اس کی طرف کروٹ لے کر کہنے لگی۔ ”آج تھائی کا کھانا تھا۔ یوں باتوں میں عدیل بھائی کی شادی کا ذکر نکلا تو میں نے ٹال دیا۔“
 ”نہیں، کھانا تو میں نے پکایا نہیں۔“
 ”ہوں، کہا تو تھا۔“ پھر وہ شاہ سکندر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
 ”پھر یہ کہ وہ آٹا بنی کچن میں پسند ہے اور وہ کہہ رہی تھیں کہ میں عدیل بھائی سے بات کر کے دیکھوں۔“

اگر وہ نامی ہوں تو پھر ہم جلیں گے، آئی مین باقاعدہ پروپوزل لے کر۔ میں ناں "آخر میں اس خیال کا سر کرنے اُس کے پوچھتا ہے تو ادھر کی خبر ہے نہ ادھر کی" وہ اُس کی بیشانی پر آئی بالوں کی لہ انگلی پر لپیٹتے بیٹھے بولا۔

"آپ کو تو شاید اپنی خبر بھی نہیں ہے، آسیہ نے اپنے بال اُس کی انگلی سے نکال لئے ہ

"اب رکھیں پڑے گی، کیونکہ اب میں باپ بننے والا ہوں" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا، اور شوق سے پوچھنے لگا۔

"یہ بتاؤ، تمہاری کیا خواہش ہے بیٹا یا بیٹی؟"

"بیٹی؟ آسیہ نے سوچنے کا توقف بھی نہیں کیا فوراً بولی تھی۔

"کیوں؟" شاہ سکندر کی حیرت اُس کے فوری جواب دینے پر بھی۔

"آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا، اب کیوں کا کیا سوال۔؟" وہ اُس کی حیرت پر غلط فہم ہو کر "نہیں بتانا چاہتیں مت بتاؤ، ویسے میری خواہش بھی بیٹی ہے" شاہ سکندر نے کہا

بولی "کیوں؟"

شاہ سکندر کا بھرپور تہمتہ بے ساختہ تھا۔ پھر اُس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"پہلے تم بتاؤ؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میری کوئی بہن نہیں ہے شاید اس لیے مجھے بیٹی کی خواہش ہے اور بیٹیاں ابھی لگتی ہیں؟ آسیہ نے تیلے میں یوں جلدی کی کہ اپنے "کیوں" کا جواب سننا پڑا "ہاں، بیٹیاں ابھی لگتی ہیں" شاہ سکندر نے تائید کے ساتھ اُس کی بات دہرائی پھر کہا "میری خواہش میں ایک غریب پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ باباجان میری شادی کے لئے جب بیٹی کا نہیں گے تو ہمارے آئیں گے۔ ہیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے گئے

ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جائیں گی۔

آسیہ جو بڑے اشتیاق سے سننے لگی تھی اندر ہی اندر جزبہ زور کر رہ گئی۔

"ہاں اگر شادی شادی ان حالات میں نہ ہوئی یعنی اس کے برعکس میں ہمیں بیاہ کر جاتا تب یقیناً میں پہلے بیٹے کی آرزو کرنا شاہ سکندر نے اپنی بات پوری کی پھر آہستہ سے چھو کر بولا۔

"بیٹا ہو یا بیٹی! یہ بتاؤ نام کیا سوچا ہے؟"

"نام؟" وہ قدرے بے دھیانی میں اُسے دیکھنے لگی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے ایک نام بہت پسند ہے۔ اگر بیٹی ہوئی تو ہم اس کا نام مدیحہ رکھیں گے" نا۔

شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کس خیال کا عکس تھا۔

"مدیحہ اچھا نام ہے۔ آسیہ کے چہرے پر کیسی مسکراہٹ پھیل گئی پھر معنی خیز لگی "کون سی مدیحہ؟"

"ہاں، شاہ سکندر نے چونک کر اُسے دیکھا پھر سمجھتے ہی اُس کے ہاتھ کو زور سے "کیا سمجھتی ہو تم مجھے؟"

"اُف میرا ہاتھ۔" وہ تکلیف سے پیچ بڑی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو" شاہ سکندر نے اُس کے چہرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا

"بہت نیک، شریف۔ پارسا۔" وہ جو منہ میں آیا کہتی گئی۔

"ہاں۔" وہ اُس کا ہاتھ چھو کر بولا "تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور۔۔۔"

یہ بات آپ ایسے بھی کہہ سکتے تھے۔ ہاتھ توڑنا ضروری تھا کیا؟ "اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ سوری۔ سوری یاد؟ شاہ سکندر نے نادام ہو کر دوبارہ بہت نرمی سے اُس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں

کا ہاتھ دبا کر دیا تھا۔ آسیہ کو تسلی الٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو رکھنے کا نام نہیں تھا۔ کوئی چیز اُس اندر نہیں بٹھتی تھی۔ جس سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ کوئی کام بھی نہیں کر پاری تھی۔ کھانا پکانے کی ہونٹوں اُس کی ملک ناگوار لگتی تو فوراً چین سے نکل آتی۔ ایسی حالت میں شاہ سکندر کو مجبوراً اُسے کچھ ان کے لیے اسان بی کے پاس چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ وہ خود ایک انداز بھی فرائی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اسی ال سے آسیہ بھی جانے پر تیار نہیں تھی کہ اُسے کھانے کی برابری ہوگی لیکن پھر وہ بھی مجبور ہو گئی تھی۔ کیا حالت بنائی ہے تم نے اپنی "میمونہ" جہاں اُس پر خفا ہونے لگیں۔

"بی بی! بچہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے، تم نے اسے ڈاکٹر ہونے کے زعم میں سوچا ہوگا کہ سارے ملے خود ہی ملے کر کے پھر ایک دم بچہ ہمارے سامنے لا کر ہمیں سر پر ہنر دو گی"

آسیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"سر پر ہنر اپنے سسرال والوں کو دینا جنہیں کچھ خبر نہیں۔" اُس کے ہنسنے کے باوجود میمونہ جہاں ناگے تھیں، تم سے کہیں بے خبر نہیں ہو سکتے۔ جزشتہ بار جب تم آئی تھیں تب میں نے تم سے یہاں لے کر مکتا اصرار کیا تھا۔ اسی لیے کہ میں جانتی تھی۔ تمہاری یہ حالت ہونے والی ہے۔ اگر تم میری

تو مان لیتیں تو کم از کم یوں بولیوں کا دھماچھو تو نہ بنتیں؟

"جی نہیں میں کوئی دھماچھو نہیں ہوں۔" وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بولی "بس ذرا کمزوری ہے۔ دودھ پلے لیں گی ٹھیک ہو جاؤں گی؟"

"خالی ڈاکڑی نسخوں سے کام نہیں چلے گا؟"

جیسے اپنے کتے سے بھی آزمایا جائے گا۔ تین بچے پیدا کر کے بہت ایکسپرٹ ہو گئی ہیں ناں۔ اُس نے کہا اور

دل جہاں کوڑتے دیکھ کر میمونہ جہاں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عدیل جہاں نے اُن کے قریب کرسی کھینچے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔

"تم تمہاری شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں؟ میمونہ جہاں فوراً بولیں "نالہ کے لیے تو غالباً تم نے منع

دیا تھا اُس لیے ہم ایک اور؟"

"کیا، کب، میں نے کب منع کیا تھا؟" عدیل جہاں قدرے بولہلا کر بولے تو میمونہ جہاں بڑی زور

ہر نہیں اور ہنسی چلی گئیں۔

آسیہ پہلے کچھ کبھی نہیں پھر جب عدیل جہاں کو جھینپ کر سر کھاتے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پڑا۔

"دیکھا بھوکے کپڑا۔ بڑے چمڑے رہے تھے۔ میں نے اُسے اس انداز سے نہیں دیکھا، پتا

نہیں ہے سوچو گی؟" میمونہ جہاں ہنسی ہوئی اُن کے ایک ایک انداز کی نقل اُتار رہی تھیں۔

"آپ کو تو موقع ملے گا۔" عدیل جہاں انہیں اُن کے حال پر تھوڑا کر آسیہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "تم

ماؤ آسیہ شاہ سکندر آئے تھے؟"

"جی، شام میں آئے تھے۔" آسیہ میمونہ جہاں سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"روکا نہیں انہیں، کھانا وغیرہ کھایا یا یونہی چلے گئے؟"

"جی، کچھ جلدی میں تھے، غالباً کسی سے ملنا تھا۔"

"اب تک کوئی کام شروع نہیں کیا انہوں نے۔" مجھے اُن کا ارادہ کچھ ڈالوں ڈول سالگتا ہے۔ بتا نہیں

سک کہ طرف ان کا رجحان نہیں ہے یا کوئی برابری؟ عدیل جہاں کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا، پھر پوچھنے لگے۔

"نہیں بتاؤ نہیں انہوں نے کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

”جہانگیر جہان کے انتظار میں ہیں۔ غالباً وہی کہہ گئے تھے کہ وہ خود اگر کوئی بزنس سیرٹ
آسیہ نے سرتیری انداز میں بتایا۔

”تو اب تک تو انہیں آجانا چاہیے تھا کہ ان دنوں بلکہ مہینے ہو گئے ہیں۔ ذون وغیرہ آتا ہے
میں نہیں، عدیل جہان اس کے کو بہت سنجیدگی سے لے رہے تھے۔

”اس عرصے میں دو مائیں بار فون آیا ہے ان کا مجھ سے تو بات نہیں ہوئی۔ سکندر بتا رہ
ہے الیکشن کی وجہ سے نہیں آسکے پھر اپنی زمینوں کے کسی جھگڑے میں آگئے رہے۔ اب پتا
ہے آسہ کا انداز بتا رہا تھا جیسے شاہ سکندر نے اسے پورا اطمینان دلایا ہوا ہے کہ اس معا
نکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

عدیل جہان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر جانے کیا سوچنے لگے تھے۔
”بھئی شاہ لوگ ہیں انہیں کیا پروا؟“ میمونہ جہان اپنے مخصوص انداز میں ان کی جھنجھوٹا
ہوئیں ”شاہ سکندر بزنس کریں نہ کریں میرا خیال ہے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا
عدیل جہان نے اپنے خیال سے چونک کر میمونہ جہان کو دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولے تھے،
”شاہوں کو بھی پانی شہی قائم نہ کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا ہے۔“
آسیہ نے انہیں جانے ہوئے دیکھا پھر میمونہ جہان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”ٹھیک تو کہہ رہے ہیں عدیل جہان۔ تیا نہیں سکندر اتنے اطمینان سے کیوں ہیں، اور
کون بھی پوچھ رہی۔ جب طے کر کے گئے تھے کہ وہی اگر بزنس کا بتائیں گے تو سب سے پہلے
کرنا چاہیے تھا۔“

”سنو؟ میمونہ جہان اچانک کسی خیال کے تحت اس کا بازو ہلا کر پوچھنے لگیں: تم نے کہ
فون کیا ہے؟“

”نہیں، ایک دوبار سکندر سے کہا تھا کہ میری بی بی جان سے بات کر ادیں۔ لیکن
کر دیا۔ کہنے لگے جب سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا تب میں ساتھ لے کر جاؤں گا
سادہ سے انداز میں بتایا۔

”اس سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود بات کر لو۔ میمونہ جہان بڑے آرام سے مشورہ
بولیں ”ہر بات شوہر سے کہنے کی ضرورت ہی ہے خواہ اگر جانتے ہیں۔ سکندر کی بی بی
پر کتنے مخالف بھیجے تھے۔ بیچاری شوہر کی وجہ سے مجبور ہیں ورنہ ان کا دل تو جاتا ہوگا تمہارے
کو اور تیار ہی مجبوری بھی یہی ہے کہ جب شوہر سے جائے گا تب جاؤ گی۔ لیکن ان سے بار
خوش ہو جائیں گی وہ۔“

”ہوں۔“ آسیہ کتنی دیر تک برسرِ سوغ انداز میں سر ملاتی رہی پھر قدم سے مایوسی سے بولی
پاس ان کا منہ نہیں ہے۔

”میرا حائل کرنا کوئی مشکل بات ہے ڈائریکٹری دیکھ لو، میرا خیال ہے شاہ پور کے
ہوں گے وہ سب تمہارے سسرال میں ملیں گے۔“ آخر میں میمونہ جہان خود ہی غفلت ہو
”اور اگر سکندر کو پتا چل گیا تو اس نے خدشہ ظاہر کیا۔“

”چلتے دو۔ اس کی ماں کو فون کرو گی نا کہ کسی پرانے عاشق کو؟ میمونہ جہان کا جملہ
آسیہ نے پہلے گھورا پھر ہنس پڑی۔

شاہ سکندر نے گھر میں داخل ہوتے ہی ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ان کو دیا
آسیہ نہیں تھی تو اسے بہت شام ٹھوس ہوتا تھا۔ اور حقیقتاً اس کے بغیر اس کا دل بھی نہ

”اُسے کئے ابھی صرف تین دن ہوئے تھے۔ پھر وہ صبح شام اس کے پاس حاضری بھی دے رہا تھا۔
بھی گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی اور وہ سونے تک خود کو ٹیپ، اخبار
نہیں دغہ میں مبتلا نہ رکھتا۔ ابھی وہ ٹیپ آن کر کے کپڑے بدلنے واش روم میں چلا گیا تھا۔
کیونکہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگن نے لگاتار جیسی فون کی میل سنائی نہیں دی۔ جب واش روم سے
لاٹ جلدی سے پہلے ٹیپ بند کیا۔ پھر اگر ریسورٹا تھا۔

”ہلو۔“
”گھر میں نہیں تھے کیا؟“ ادھر سے شاہ جہانگیر کی آواز سنائی دی۔
”جہانگیر جہان! السلام علیکم! کہاں ہیں آپ؟“ وہ ان کی آواز سننے ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔
”وہ کیا کہے ہو؟“ شاہ جہانگیر اس کا سوال بکسر نظر انداز کر گئے۔

”ٹھیک ہوں، اب سب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ آکیوں نہیں رہے؟“ اس کے لیے سے
”شان پورا بھی اور جیسے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”میرا نام مشکل ہے سکندر کیونکہ ادھر بابا جان نے مجھے بہت سے کاموں میں اٹھا دیا ہے، بہت
شش کرتا ہوں کچھ وقت نکال سکوں لیکن، یقیناً سناؤ کوئی کام وغیرہ شروع کیا یا نہیں؟ شاہ جہانگیر اپنی
دہریا بات بدل گئے۔

”کیا کام کروں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس نہیں کرنا اور بڑے بزنس کے لیے
میں پاس پیسے نہیں ہیں۔ پہلے آپ نے جو رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرانی تھی وہ میرے علاج
الجے پر خرچ ہوئی اور اب

”خیریت نہیں کیا ہوا؟“ شاہ جہانگیر اس کی بات کاٹ کر بولنے لگے۔
”میرا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔ تقریباً دس دن ہاسٹل میں اس کے بعد ڈیڑھ دو مہینہ گھر میں میں بستر
پڑا رہا ہوں اس نے بہت غفلت میں بتایا۔

”ادھر۔ اب کیسے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے تشویش سے پوچھا۔
”اب ٹھیک ہوں۔ بس بیماری نے پریشان کیا ہوا ہے۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا جہان کہ آپ
دین میں بعد میرے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کر ادیں سبھے کچھ کرنا چاہیے۔“ اس نے اپنے تئیں انہیں
سنا دیا۔

”ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم خود کچھ کرو۔ لیکن مسئلہ پیسوں کا ہے، ادھر بابا جان نے سارا حساب
اب اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔“ شاہ جہانگیر بابا جان کے کہنے کے مطابق اس کے سامنے مزید پیسوں
معدودی ظاہر کرتے ہوئے بولے۔ ”میرے ساتھ ساتھ بزنس جہان کو بھی لگا بندھا خرچ دے رہے
یعنی ہم بالکل ان کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”پھر؟“ شاہ سکندر کچھ چلا سا گیا تھا۔
”پھر میں کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ کوئی بڑی رقم ہاتھ لگ جائے، تب پہلی فرصت میں تمہارے
ن آؤں گا تب تک تم کوئی جواب وغیرہ کر لو؟ انہوں نے قسلی کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ اور اس کی

”نہیں۔ کوئی جواب نہ پا کر قدرے وقت سے خود ہی کہنے لگے۔
”میرا خیال ہے تم جواب نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ ایک تو تم شہر کے ہر بڑے آدمی سے متعارف
”دوسرے سسرال میں جو اشج بنائے ہو اسے بھی قائم رکھنا چاہیے ہے نا؟“

شاہ سکندر کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔
”ایک اور راستہ ہے۔ شاہ جہانگیر اس کی خاموشی محسوس کرنے کے بعد کہنے لگے۔“ تم یہاں چلے آؤ،
”نہیں۔ وہ غصے سے کہہ کر ٹونٹ بیچ گیا۔

نہیں یا۔ آج تو نہیں اٹھتے ہی تیار سے پاس بھاگا آیا ہوں، بہت دن ہو گئے ہیں، بس اب چلو۔ کیوں اُداس ہو گئے ہیں؟ میمونہ بھابی چائے لے کر آرہی تھیں اُس کی آخری بات سن کر کہتے ہیں۔

”ہاں آنکھوں سے بھی لگ رہا ہے رات بھر کروٹیں بدلتے رہے ہیں شاید، چہ چہ مجھے آپ سے ہی مدد ملی ہے۔“

”شکر یہ اور یہ صرف چائے؟ وہ اُن کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے بولا۔

”بھابی! یہ ناشتا بھی کریں گے؟“ آسیہ نے کہا۔

”ابھی لاتی ہوں۔ میمونہ بھابی بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے والپس پلٹ گئیں۔

”اچھی خاتون ہیں، بس مکہ، زندہ دل اور اسمارت،“ شاہ سکندر نے چائے کا سپ لے کر ایمانداری میمونہ بھابی کی تعریف کی۔

”آپ واقعی رات میں نہیں سوئے؟“ آسیہ اُس کی آنکھوں کی سرفی دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے بغیر نیند کہاں آتی ہے، پھر رات میں جہانگیر بھابی کا فون آگیا تو؟“

”کیسے ہیں جہانگیر بھابی؟“ وہ درمیان میں بول پڑی۔

”ہاں ٹھیک ہیں، تمہارا بہت پوچھ رہے تھے؟ وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اور بی بی جان وغیرہ؟“ آسیہ نے اب سنبھل کر پوچھا۔ یعنی اور کسی کا نام نہیں لیا۔

”میں نے کسی کا نہیں پوچھا کیونکہ ایک تو جہانگیر بھابی بحالت میں تھے دوسرے اسلام آباد سے ان کر رہے تھے، وہ رات میں سوچ کر سویا تھا کہ اگر حال آسیہ کو اپنے شاہ پور جانے کا نہیں بتائے اس لیے اسلام آباد کا بتا کر کہنے لگا۔

”مجھے انہوں نے دیں بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے وہ بالکل وقت نہیں نکال پارہے لہذا میں ایک دن کے لیے وہاں آجاؤں۔ اور میں یہی سوچتا رہا کہ تمہیں ایسی حالت میں جو رُک کر کیسے جاؤں؟“

”یہی حالت کوئی ایسی کشمکش تو نہیں ہے؟ وہ اُس کی پوری بات سن کر کہنے لگی؟ اور یہ بھی دیکھ کر کہاں مجھے کہنے آرام سے رکھا جا رہا ہے، پھر دو دن کی توبت ہے آپ اطمینان سے ہو جائیں؟“

شاہ سکندر نے فوراً باہمی نہیں بھری اور یوں دیکھنے لگا جیسے اُس کی بغیر میں نہ آ رہا ہو کیا کرے گی میمونہ بھابی ناشتہ لے کر آگئیں، اور دونوں کو خاموش دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا مسئلہ ہے، اگر مجھے بتائے گا ہے تو بتاؤ، فوراً حل کر دوں گی۔“

”کوئی مسئلہ نہیں بھابی! آپ بھٹیں ناشتا کریں؟“ آسیہ نے کہا۔

”ہاں۔ کتنی بار ناشتا کروا دیتی تھے، اب تو میں اتنا ہی سے کھا سکتا کہ پوچھنے جا رہی ہوں۔ اور اگر میں کوئی خاص چیز کھانی ہو تو بتاؤ،“ میمونہ بھابی رٹے شاہ سکندر کے سامنے رکھ کر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

”نہیں جو کچھ کھا لوں گی۔“ آسیہ قصداً مسکرا کر بولی۔

”اور سکندر آپ؟“ میمونہ بھابی نے اخلاقاً اُس سے بھی پوچھ لیا۔ ورنہ جانی تھیں کہ وہ کھانے کے وقت موجود نہیں ہو سکتا۔

”نہیں، میں تو ابھی جا رہا ہوں۔ ناشتے کے لیے آپ کو زحمت دے کر شرمندہ ہوں۔“ شاہ سکندر دوپہر انہیں زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”بھئی ناشتا کریں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ میمونہ بھابی کہتے ہوئے چلی گئیں۔

”ہاں، کیا کہہ رہے تھے آپ، کب بلایا ہے جہانگیر بھابی نے؟“ آسیہ نے میمونہ بھابی کے جاتے ہی

”پہلے میری پوری بات سنو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔“ شاہ جہانگیر نے اُسے ٹوکا۔

”باباجان تمہارے منتظر ہیں۔ گوکہ ہم برطانوی نہیں کرتے لیکن انہیں اپنی غلطی کا احساس نے خود سنا ایک دن بی بی جان سے کہہ رہے تھے کہ انہیں تمہاری بات مان لین چاہیے؟“

دوری شدت سے غصے کرتے ہیں سکندر، بہت آزدہ رہتے ہیں۔ اگر اُن کا سوال نہ ہو، منانے ضرور آتے۔ بہت جیت کرتے ہیں وہ تم سے ہم سب سے زیادہ جانتے ہو ناں، میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ انہیں اپنے سامنے جھکانے کے بجائے خود اُن کے من سے معافی مانگ مان رہے جانتے گا، خوش ہو جائیں گے وہ پھر تمہارے لیے کون سا مسئلہ نہیں ہو گا۔“

”آپ بھول رہے ہیں بھابی! میں اکیلا نہیں ہوں۔ آسیہ میرے ساتھ ہے جیسے اگر مجھ کے ساتھ شادی کو علم ہو گیا تو وہ؟“

”ایک منٹ یا۔“ شاہ جہانگیر فوراً اُسے روک کر کہنے لگے: ”میں نے یہ کب کہا کہ اُسے لے کر آؤ، بلکہ اُسے یہاں لانے کی غلطی تو کبھی کرنا ہی نہیں، بس تم اگر باباجان کو خامی کر دو، اپنی ہر بات منوالینا۔“

”مثلاً؟“ اُس کے استفاد میں ہلکا سا استہزا تھا۔

”مثلاً یہ کہ تم شاہ پور کے بجائے آسیہ کے ساتھ کراچی میں رہو گے اور مہینے میں دو بار بھی اپنا فرم بھجائے آجاؤ گے؟“ شاہ جہانگیر مافی خیر انداز میں بولے تھے۔

”کیا مطلب؟“ وہ پٹٹا لگیا۔

”مرد ہو مار! دو کیا چار۔ یوں رکھ سکتے ہو؟ شاہ جہانگیر نے خود ہی قیمتہ لگایا پھر کہ مذاق نہیں کر رہا۔ تم بھی جذباتی ہو کر مت سوچنا۔ سنجیدگی سے غور کرنا۔ سب سے مناسب مہرہ لٹاؤ جاتا ہے کہ تم دوسری شادی کر چکے ہو اُس کے باوجود تمہاری راہ دیکھتی ہے۔ اور تم سے محبت کی انتہا ہے جس نے اُسے اسٹینڈ لینے سے باز رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے اُسے کبھی پسند نہیں کیا؟“ وہ جیسے اکتا کر بولا۔

”نہی، لیکن اُس کی محبت کو زندہ رکھو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا اور آسیہ کے لیے؟“

ان باتوں میں میں آسیہ کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ کسی ہے وہ؟ شاہ جہانگیر نے اچانک میمونہ ”اُس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اور میں ریسٹ نہیں مل رہا تھا اُسے اس لیے کہ وہ میں نے اُسے اُس کے والدین کے پاس چھوڑ دیا ہے، ایک دو دن میں لے آؤں گا۔“

”کیا کر رہے ہو مار! پہلے تمہارا ایکسڈنٹ ہوا اب وہ بیمار ہے، تم نے تو پریشان کر دیا اچھی خبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”اچھی خبر بھی سن لیں گے، شاہ سکندر اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔

”ہاں! فوراً جلدی سنا اور یہاں آکر۔ اُسے خدا حافظ؟“ شاہ جہانگیر نے سلسلہ متعلقہ کرا ریسور رکھتے ہوئے شاہ سکندر نے یوں سر بلایا جیسے اُن کی ساری باتوں کو فضول قرار جب سونے کے لیے لیا تو اپنے منے کا کون اور حل سوچتے ہوئے اُس کا ذہن بار بار بار بار باتوں میں الجھ رہا تھا۔ اور وہ پوری رات اُس کی یونہی سوچتے اُٹھتے گزری تھی۔ صبح کے قریب پہنچ کر وہ بس تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا پھر اُٹھتے ہی آسیہ کے پاس جانے کے لیے تیار؟

”آسیہ کو کسی وقت ڈاکٹر درپ لگا کر گیا تھا جسے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

”مریض کو چند گھنٹے مکمل آرام کروانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ خصوصاً تم جیسی خات

فضول کام کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔“

”جناب کوئی کام فضول نہیں ہوتا۔ وہ تمہی سیدھا کر کے سرو پنا کرتے ہوئے بولا

”کیا آپ نے یا نہیں؟“

پھر وہی بات چھیڑ دی۔
”یہ پوچھنا تو نہیں بھول ہی گیا کہ وہ اسلام آباد میں کب تک رہیں گے، پھر اسی حساب سے طے کر لیتا۔“ شاہ سکندر نے سرسری انداز میں کہا۔

”آپ کو جہانگیر جہانی سے ملنا تو ہے اور انہی میں یہاں ہوں تو آپ آرام سے جا سکتے ہیں۔“ جیسا نا سب سمجھیں۔ ”آسیہ پہلے فوراً بولی تھی پھر احساس ہوئے پراس کی مرضی۔“
”جہاں۔“ شاہ سکندر نے ناشتے میں مصروف رہ کر سر ہلایا۔
”ٹھیک کہتی ہو تم، اسے گھر میں پھر تیار سے اکیلے ہونے کا خیال ہو گا پھر واقعی میرا ہوجائے گا۔“ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں آج ہی کی فلائیٹ سے چلا جاتا ہوں۔ پرسوں کا آجافن کاگا۔“

آسیہ نے یونہی سر ہلادیا۔
”اور پھر اسی وقت تم میرے ساتھ گھر چلو گی، میرا وہاں تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔“
”پہلے میں کتنا غصہ اکیلا رہا ہوں۔ لیکن اب تو ایک ایک پل بھاری لگتا ہے اور سن لو! تمہیں ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ ناشتا چھوڑ کر بوسے لگا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جیت بھری دھولیں تھیں۔
آسیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھا اور پہلے اس کی ڈرپ چیک کی پھر جبک کہ اس کی پیشانی پر ”تم میری جیت میری زندگی ہو اس!“ تم سے ایک پل کی دوری میری جان پر بنا دی ہے۔
”دیکھا کرو یہ سوچ کر کہ میری سالنوں کی دور بہتار سے ساتھ بندھی ہے۔“
اس کی غمتوں کی شد میں یونہی آسیہ کی پکیں غم کر دیتی تھیں۔ چپ چاپ سر کے لمحوں میں لمحہ بہت چپکے سے ان ہنسی کیوں پر بسیرا کر گیا تھا۔

”دھوپ کنارہ، شام ڈھیلے
تلے میں ددونوں وقت جہاں
جورات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی ٹپک
بانہوں کی چٹک
یہ میل بہارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کا دن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر دروازے
اور راہی اپنی راہ لے گا



تقدیر بادریہ برس بعد شاہ سکندر کی گاڑی ہائی دے پر فرسٹ بھر دی تھی۔ آسیہ کے پاس آنے کے بعد اس نے ایک بار پھر تمام حالات کو سننے سے سو جا تو اس پر باباجان کی حکمت بری طرح واضح ہونے لگی تھی کہ کس طرح انہوں نے نظام برضا مویشی اختیار کر کے اسے ایک طرح سے مجبور بننے کی کوشش کی تھی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے کیونکہ اسے فی الفور واپس کے گاڑی سے اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اس نے واپسی کی تیاری کر لی لیکن اس طرح نہیں بیٹے باباجان چاہتے تھے۔
”اسے اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کی باری ہے۔ باباجان سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے نے پوری پلاننگ کے بعد اپنا سفری بیگ اٹھایا تھا۔“

وہی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس دوران وہ جہاں خود کو باباجان اور بی بی جان کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتا رہا، وہاں یہ خیال بھی تھا کہ اسے کسی طرح خود کو مجبور ظاہر نہیں کرنا بلکہ ان کی محبت میں وہ جے ملنے کا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی غرض نہیں۔ اس کے بعد باباجان کا رد عمل سوچتے ہوئے نے کئی مرتبہ بگاڑی تاڈی دو دونوں اطراف پھیلے کھیتوں میں کام کرتے مزارعوں نے حیرت و خوشی کے ساتھ تاثرات سے اسے دیکھا جبکہ اس کی نظرس جو پل پر بھی تھیں جس کے برے سے گیٹ پر موجود لے جانے تاثرات سے اسے دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح پورا گیٹ کھول دیتا تھا۔ اور وہ بھی رُکے بغیر گاڑی اندر لے آئے اس کی گاڑی سے آرتاب سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے اسے کس کے پاس جانا چاہیے۔ باباجان یا بی بی جان۔
”اور پھر کچھ طے کیے بغیر اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔“

دوہرا کا وقت تھا۔ ناکھانے سب کھانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ طویل راہداری بزرگراؤں میں آیا تو سانسے سے گزرتی جیران نے اسے دیکھ کر انتہائی بے یقینی سے پوری آنکھیں بالیں۔
”بی بی جان کہاں ہیں،“ شاہ سکندر پوچھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو جیران جواب دینے کے بجائے یہ جواب لیتی اور چلی گئی۔

”ناں سس“ جیران کی بدحواسی نے ناگواری سے سر جھکا تو نظر نیچے پر پڑی جو ٹیبل کا کوڑیگر ہوئے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ پوری طرح اس کچے کی طرف متوجہ ہو گیا جو دوڑیں کوشش کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ گیا پھر ٹھنوں کے بل ٹھینتا ہوا اس کی طرف آگے لگا۔ اور ایک قدم کے ہر تھکا کر دو باغوں نے بہت شغری سے اسے اٹھالیا۔ اور وہ جو بہت اشتیاق سے بچے کو دیکھ رہا تھا۔
”کونفرس“ اٹھائیں تو سانسے مہرا لٹا تھی۔ اس کے دیکھنے پر بچے کو سانسے میں چھپاتی لہرا کھینی اویسے نیازی پر جیساں پڑتے تھے۔ اس کے کلابی پاؤں سرخ کارپٹ پر نشان نہیں چھوڑ رہے تھے پھر بھی وہ اس نش پاؤں کے تیار کیا گیا۔

”اسے سکندر بگڑا ہے،“ شاہ جہانگیر کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا تھا۔
”ابھی۔“ بس ابھی آ رہا ہوں۔ وہ چونک کر بولا اور بڑھ کر شاہ جہانگیر کے سینے سے لگتا ہوا پوچھنے لگا۔
”بھیک ہے ناں۔“

”اے اے اے“ جو تو سب بھیک ہو گا بی بی جان سے ملے، پلو پہلے اُن سے مل لو۔ بہت یاد کرتی ہیں۔
”شاہ جہانگیر اس کی تندی آمد پر اندر ہی اندر جیران پور سے تھے اور بظاہر بہت خوش دلی کا برکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگائے بی بی جان کے کمرے تک آئے اور دروازہ کھول کر انہیں مخاطب نہ ہوئے۔

”بی بی جان،“ وہ کہیں کون آیا ہے؟
”نہ بی بی جان نے تیکے سے سنا تھا تو ان کے ساتھ شاہ سکندر کو دیکھ کر پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا۔
”میں تو کچھ نہیں کہتی اور دونوں بازو پھیلائے تو وہ بھی بے اختیار ہو گیا تھا۔ ماں جب تک نظروں میں تھی تو کبھی بولے بولے یاد آجاتی تھیں اور اب وہ اپنے آپ پر حیران ہو رہا تھا کہ اتنا غصہ وہ ان

سے زور کیسے رہا۔ بہت ستا بیٹے تم نے مجھے کوئی اس طرح بھی ماں سے ناراض نہ ہوتا ہے۔ بی بی جان اُس کا پرہیز میں تمام کر سکواؤ کرتے کیوں۔ وہ چپ چاپ منتظر ہا پھر ان کے رخساروں پر چپکتے آنسو انگلیوں پر پڑ کر بولا۔

”تو کیا ہوں بی بی جان۔ اور مجھے آپ کی محبت کیسے لانی ہے۔ ورنہ میں تو ہتھیہ کر کے گیا تھا کہ بی بی جان! تنہا ہوا آیا ہے اس سے کھانے وغیرہ کا تو پوچھیں۔“ اُس کے ہونٹوں پر اسیہ کا نام پہلے شاہ جہانگیر بول پڑے۔

”نہیں بس۔ اس وقت بھوک نہیں ہے۔“ اُس نے کھانے کا منع کر دیا۔
”تو کوئی چائے، ٹھنڈا بلکہ ایسا کرو پہلے شاد دلے اور شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔
”میرا خیال ہے پہلے میں با با جان سے مل لوں۔“

”با با جان تو فوراً نوکی طرف گئے ہیں۔ شام میں آئیں گے۔“
”خیریت۔ آپا نور چٹیک تو ہیں ناں؟“ اُس نے سوالیہ نظروں سے بی بی جان کو دیکھا۔
”ہاں ٹھیک ہے فوراً فوراً اور شہر با نو بھی۔ ابھی تو تم آئے ہو۔ دو چار روز میں جا کر بہنوں سے بی بی جان نے کہا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گیا۔

”جو کھر میں ہیں پہلے اُن سے ترمٹنے دیں بی بی جان اسنے۔“ شاہ جہانگیر کا اشارہ مہر النساء کی اور بی بی جان نے غالباً دھیان نہیں دیا۔
”ہاں ہاں جاؤ، بچا دو جوں کو سلام کرو۔“

وہ کن کیوں سے شاہ جہانگیر کو دیکھتا کہ اسے نکل آیا اور لاؤنج میں رک کر انتظار کرنے لگا کہ شاہ جہانگیر اُس کے پیچھے آئیں گے لیکن وہ جلد ہی قصداً بی بی جان کے پاس رک گئے تھے باروک لیے گئے وہ کچھ دیر انتظار کے بعد سیڑھیاں چڑھتا اور آیا تو اسے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر ایک بار بھڑک گیا۔

مہر النساء کی موجودگی نے شخص ورتج میں ڈال دیا تھا۔ غالباً اپنی پلاننگ میں وہ اس بڑی کھجور کا جب ہی سچ میں نہیں رہا تھا کیا کرے۔ جلدیوں وہ کچھ غافل سا ہو رہا تھا۔ ہشکل خود کو اس کا سامنا کرنے کر کے وہ کمرے کے دروازے تک آیا تو سامنے میڈیروہ پچھے کو گود میں لٹانے اُس پر بھی نظراتی تک پہنچے کے بارے میں اُس کے ذہن میں کوئی سوال نہیں تھا اور اب اچانک ذہن میں جھٹکا کہ

”وہ مہر النساء ممتی سکندر! میں نے اُسے ہاسپٹل میں دیکھا تھا۔ غالباً ڈیویری کے لیے آئی تھی۔“
”میں پتہ بھی تھا۔“

اُس وقت اُس نے چٹا کر اسیہ کو خاموش کر دیا تھا لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بے اختیار آگے آکر بولا۔
”یہ میرا بچہ ہے۔“

مہر النساء نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظروں کا زادیہ بدل گئی تو وہ اپنی بے اختیاری پر کمر بولا۔
”کیسی ہو تم؟“

مہر النساء نے سر تھکا لیا۔ جانے نہ تھا یا ناراضگی کا اظہار۔ وہ کچھ دیر رک کر دروازہ روپ کی طرف گیا اور اپنے کمرے نکال کر دوش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا تھا۔
”میں سو نا چاہتا ہوں۔ تم بی بی جان کے پاس چلی جاؤ۔“

شام آتر رہی تھی جب با با جان کے کپتے پر مہر النساء نے کمرے میں آکر پہلے کھڑکیوں سے پردہ پھیر دیکھ کر شاہ سکندر کا بازو دیا تو وہ دھند میں گر پڑا۔
”سوئے دو اس۔“

مہر النساء کے پورے وجود میں جنگاریاں بھر گئیں۔ ایک لمحے کو ہونٹ بیٹھے مچاس کا ہاتھ کھینچ کر لولی۔
”اُنھیں شاہ آپ کو با با جان بلاتے ہیں۔“
”ہوں۔“ شاہ سکندر نے اُسی آنکھیں کھولیں لیکن جب مہر النساء کا چہرہ نظر آیا تو فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا اور

”یوں باپوں کی انگلیاں باپوں میں پھینسا کر پوچھا۔
”کیا کہا تم نے؟“
”با با جان بلاتے ہیں۔“

”با با جان آگے۔“ شاہ سکندر نے کمرے میں مہر النساء کی ہونٹوں سے نکل گئی۔
”جی اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ مہر النساء کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
”کچھ دیر بعد شاہ سکندر نے با با جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو جواب میں وہ اپنی جگہ سے

”کر دو نوں بازو پھیلاتے ہوئے بولے۔
”ترجمہ کا بھولا لوٹ آیا۔“
شاہ سکندر کے اُن کی طرف بڑھتے قدم وہیں رُک گئے۔ اور اُن کے سینے سے گلے کی خواہش و باکر مضبوط

”پہلے میں بولا۔
”آپ غلط تھے با با جان! میں مہیلا نہیں ہوں۔“
”مہر نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی۔ بر خود دار اور نہ تھا اسے ارادوں کی مضبوطی ہم سے زیادہ کون

”جان سکتا ہے۔“ خیر رک کیوں گئے۔ آؤ گلے لگو ہمارے۔“ با با جان خوش ہوئی، فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھتے تو وہ فوراً درمیانی فاصلہ سمیٹ کر اُن کے سینے سے جالگا۔
”خوش تو ہونا۔“

”جی۔ دعا میں ہیں آپ کی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔
”مجھے رونا با با جان اُس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔ کہاں ہوئے ہوں؟“

”کراچی میں۔“ شاہ سکندر نے اُن کے انجان بننے پر بغور نہیں دیکھا پھر سر تھکا کر کہنے لگا۔ ”میں آپ کو ناراض کر کے نہیں مانا چاہتا تھا با با جان! اگر آپ اُس وقت میری بات مان لیتے تو میری خرابیوں میں آپ بھی شریک نہ ہوتے تھے۔“

”مجھے ختمی کمرے ہوئے۔ ہم تسلیم نہیں کرتے اور بہتر ہوگا جو تم ہمارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرو۔“
”با با جان نے واضح الفاظ میں نوک دیا۔
شاہ سکندر نے ہونٹ پیچھے لیے تو کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”اپنے پچھے سے اُسے قدرے توقف سے با با جان نے موضوع بدل کر بھی ایک طرح سے اُس پر چٹا یا کہ وہ مہر النساء کو تسلیم کرنے کا دعو نہیں کر سکتا۔
”جی۔“ بول خواہستہ جواب آیا۔

”خوش نہیں ہوئے۔“ وارث سے تمہارا با با جان کو اس کا انداز پسند نہیں آیا۔
”وارث۔“ وہ بیٹی سے گویا ہوا۔ ”میری کون سی جائیدادیں کھڑی ہیں جس کے لیے میں۔“
”مہر نے نہیں مان تو نہیں کیا۔“ با با جان فوراً بولے تھے۔

”مہر نے تو چاہتا تھا۔“ وہ سوچ کر رہ گیا اور مزید ملنے سے بچنے کی خاطر وہاں سے اُٹھنے کا بہانا ڈھونڈ رہا تھا۔
”ارشہ جہانگیر گئے۔ ایک نظر اُسے دیکھ کر با با جان سے پوچھنے لگے۔
”میں رشتہ پر چلنا سے با با جان۔“

”ہاں چلیں گے۔“ سکندر بھی جاتے گا ہمارے ساتھ۔“ با با جان نے کہا تو وہ چونک کر بولا۔
”میں۔“
”اُس میں تیراں ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا پہلے تم با با جان کے ساتھ نہیں جاتے رہے۔“ شاہ جہانگیر نے

اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”ابھی بھی جلنے کا۔ کیوں سکندر؟ بابا جان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا تو وہ دیر سوچنے کے بعد بولا ہوتا۔

”جی چلوں گا پھر اُن سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آیا۔

بی بی جان نے رات کے کھانے میں اُس کی پسندیدہ ڈشز بتوائی تھیں اور وہ کھانے کے لیے بیٹھا لیکن اُس کا ذہن تخیلت سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ مزید سب کے رویے حیران کر رہے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں اُسے یہاں آتے ہی پہلے بابا جان اور بی بی جان کی ناراضگی کا سامنا کرنا تھا۔ معافی مانگ کر انہیں منانے کا مرحلہ تھا لیکن یہاں اُس کے برعکس اُس کے اقدام کو کوئی اہمیت ہی نہیں جاری تھی گویا اُس کا جانا اور آنا معمول کی بات ہو۔ اور ظاہر ہے جب معافی کی لڑائی کا مرحلہ ہی نہیں وہ کس بنیاد پر اپنی شرائط بیان کرتا۔

”کیا بات ہے۔ دوپہر میں بھی تم نے کھانے سے انکار کر دیا تھا اور ابھی بھی کچھ نہیں لے رہے بی بی جان نے اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔

”جی بس میں کیا چکا، وہ کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جیراں سے چلنے کا کہہ کر باہر لان میں نکل حقیقتاً اُسے بہت گھٹن تھا احساس ہوئے لگا تھا۔ اپنوں کے درمیان ان کی محبتوں کے باوجود اسے رہا تھا جیسے وہ مہر کسی چکر میں پھنس گیا ہے۔

تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا
میں تیری دھوپ ہوں تو بے سایا میرا
زندگی کے عوض پیار یا تیرا
تو رہے ہمسفر تو یہ نہی ڈگر
بنی جانے کی پھولوں بھرا راستہ
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

آسیہ بڑی مگن سی گنگناتی تھی۔ آنکھوں میں جانے کس خیال کی چمک تھی۔ سبزی بناتی ہوئی میمونہ نے دو تین بار اُسے دیکھا لیکن ٹوکا نہیں۔ شاید اُس کے ہونٹوں پر چمکتا گیت انہیں اچھا لگ رہا تھا۔

رات دن کا جو یہ عجیب کھیل ہے
ہے خدائی کہیں اور کہیں بیل ہے
عمر فانی وہی یہ کہانی وہی
لوگ رکتے ہیں رگڑنا نہیں قافلہ
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

”واہ۔ کیا خوبصورت گیت ہے۔ میمونہ بھابی نے بے اختیار تعریف کی۔

”شکریہ اویسے میرا نہیں ہے۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”ارے جراتیجا کا دے اسی کا۔ اور تم سے اچھا۔“

”بس بس۔ زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے چاہیے میری آواز کیسی ہے۔“ وہ خود بخود کہہ بولی اور ہاسکٹ میں سے گارجا خاگر کھانے لگی۔

”اور بھی لے لو۔ میں اب پکانے جا رہی ہوں۔ میمونہ بھابی پھیلاوا سیٹھے ہوئے بولیں۔

”بس بس، کافی ہے۔ اور سلا میں کٹ دیجیے گا۔ بلکہ لائے میں کٹ دوں۔ یوں بھی ناراض نہیں ہوں۔“ اُس نے ہاسکٹ اپنی طرف پھینچ لی اور میمونہ بھابی باقی چیزیں اُٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

”آسیہ۔“ اماں جی نے اپنے کمرے سے نکل کر اُسے پکارا۔

”بی اماں جی۔“ اُس نے جواب دیا تو اماں جی قریب آ کر بولیں۔

”وہ۔ وہ تم نے نالہ کیا کیا تھا۔ عدیل سے معلوم کیا، کیا کہتا ہے وہ؟“

”انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ آبا جی سے پوچھ لیں پھر چلیں گے۔ وہ ہاسکٹ ہٹا کر اماں جی کے پیچھے کھینچتا ہوا بولے۔

”تھارے آبا جی سے تو پوچھ لیا ہے اور وہ سکندر کب آنے کا۔ وہ بھی ساتھ چلتا۔“

”سکندر۔ دو دن میں آنے کا کہہ گئے تھے۔“ اُس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”آج تیسرا دن ہے۔“ اماں جی نے کہا تو وہ جو بھنگ کر بولی۔

”جی۔ ہو سکتا ہے آج آجائیں۔“

”بس تو اس کے آنے پر چلیں گے۔ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ بڑے کی طرف سے تو اللہ کا شکر ہے

اطمینان ہو گیا ہے۔ ایک یہ عدیل رہ گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جائے تو پھر میں اور تھارے آبا جی بڑے کے پاس قہرہ جائیں گے۔“

”آج کے لیے؟“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹا، ذرا عار و قسمت میں رچ کھتا ہو۔ بڑی آرزو ہے مکہ مدینے جاؤں۔“ فرط عقیدت سے اماں

کی کانٹیں جھیک گئیں۔

”انشاء اللہ اماں جی آپ منور جائیں گی اور اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بڑے بیٹا وہاں ہیں۔

آرام سے آپ کو اور آبا جی کو جگہ کرائیں گے۔“ اُس نے اماں جی کے ہاتھ ختم کیے۔

”آسیہ! اہل خانہ فون ہے۔“ میمونہ بھابی پکار رہی تھیں۔ ”وہ“ سکندر کا ہوگا کہتے ہوئے بہت عجلت میں

اُٹھ کر بھاگی تھی۔

”جیت کسی ہے تمہاری؟“ ادھر سے شاہ سکندر نے پھوٹے ہی پوچھا۔

”بہت بہتر۔ آپ سنائیں، میرا تو خیال تھا آج آپ خود آئیں گے۔ اور ابھی اماں جی سے میں یہی

ہر رہی تھی۔“

”ہاں آنا تو تھا لیکن ادھر بابا جان! میرا مطلب ہے جہانگیر بھابی بابا جان کے کسی کام میں اُلجھے ہوئے

ہاں اندیشہ اُن کے ساتھ ہی آؤں گا۔“ شاہ سکندر بہت شہل کر بات بنا گیا۔

”کب آئے؟“ دونوں میں۔“ اُس نے خود پوچھا۔

”میں بھی بتا رہا ہوں، کچھ دن لگ جائیں گے۔ تم نگر نہیں کرنا۔ کوئی پر اہم قرین نہیں ہے تمہیں؟“

”نہیں۔ آپ بتائیں، ٹھیک بھابی کے ہاں گئے تھے۔“ اُس نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو وہ قدرے

لکڑ بولا۔

”ابھی تو نہیں گیا۔ موقع ملا تو جاؤں گا۔“

”اچھا سنیں۔ ابھی اماں جی نالہ کے ہاں جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ عدیل بھابی کے سلسلے میں کہہ

تی تھیں آپ آجائیں تو پھر میرا مطلب ہے آپ کو بھی ساتھ چلنا ہے۔“ اُس نے ایک طرح سے اُسے جلدی

سے لڑکھا۔

”یہ ضرورتوں کے معاملات ہیں یا راتم جلی جانا۔“ وہ گھریلو گفتگو سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔ ”سُنو کوئی

ضرورت کی بات کہو تو میری سماعتوں میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔“

”جیلے جی! ڈر نہیں۔“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ اور فوراً خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ادھر سے

”میرے تمہیں کسی آواز اُس کی سماعتوں سے نکلائی تھی۔ ایک لحڑک کر پوچھنے لگی۔ ”کون ہے سکندر؟“

”کہاں؟“ ادھر سے بے دھیانی میں کہا گیا۔

”آپ کے اس پاس“ وہ چہاٹگیر جانی کی۔ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔ تو وہ فوراً بولی تھی۔

”بھائی ہیں، میری بات کرائیں ان سے“
”نہیں، پھر کسی وقت، اچھا خدا حافظ“ شاہ سکندر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو وہ اس کی اتنی احتیاط پر ہنسنے لگی تھی۔

پھر اس نے اماں جی کو شاہ سکندر کی مصروفیات بتا کر اسی روز ان سے نالندہ کے ہاں پہنچے ہار کیا تو میمونہ بھائی نے بھی اس کی تائید کی۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ پہلے عورتوں کے درمیان بات اس لیے شاہ سکندر کا جانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ یوں شام میں جلتے کاسٹک کے اس نے ابا کی کمر پر نالندہ کی امی کو فون کر دیا تھا۔

نالندہ کی امی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی خاص مقصد سے آرہی ہے اس لیے انہوں نے نالندہ کو کوئی ہار نہیں دی تھی۔ جب تک کسی کو دیکھتے ہی وہ اپنے لالہ ابالی انداز میں بھاگ کر اس کے گلے لگتے ہوئے کہتا تھا: ”کہاں ہوتی ہیں آپ؟“

”نہیں، اسی شہر میں، اسیہ سیکرائی۔“
”لیکن اپنے گھر میں نہیں ہوتیں۔ پرسوں میں اور بھائی جان گئے تھے۔“
”ہاں میں آج کل اماں جی کے پاس ہوں، اسیہ نے اماں جی کی طرف دیکھ کر کہا تب نالندہ کو اماں اور میمونہ بھائی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ فوراً اسیہ سے الگ ہو کر بولی۔

”السلام علیکم“
”جیتتی رہو، اماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”میری طرف سے خوش رہو، میمونہ بھائی فوراً کھلی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”بیٹھیں پلیز، میں امی کو بلاتی ہوں،“ نالندہ کمرے سے نکل گئی۔

”اچھی لڑکی ہے۔ اپنے مزاج کی۔“ ہے ناں ماں جی، میمونہ بھائی بیٹھتے ہی اماں جی کو مخاطب کر کے بولے۔

”ہاں۔ اس کی ماں بھی اچھی عورت ہے۔“ اماں جی نے کہا تب ہی نالندہ کی امی آگئیں۔ اسیہ کے ساتھ بھائی نے بھی باجی جگہ سے اٹھ کر انہیں سلام کیا تو جواب کے ساتھ وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتی۔

”اٹا کے پاس جا بیٹھیں۔ اور ان کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

”بس موسم بدلتا ہے تو جڑوں کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ رات اسیہ نے دوا لکھ کر دی تھی۔ اس کا فیائدہ ہوا ہے۔“ اماں جی اپنا احوال سنارہی تھیں۔

”میں نالندہ کے پاس جا رہی ہوں، اسیہ نے سرگوشی میں میمونہ بھائی سے کہا اور اٹھ کر کمرے سے آئی۔ اس کے لیے یہ گھر اجینی نہیں تھا۔ لابی سے گزر کر کچن کی طرف جا رہی تھی کہ احمد حسن کو آتے دیکھ گئی۔

”ارے آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کی طرف سے ہو کر آ رہا ہوں! احمد حسن نے قریب آ کر کہا۔

”جی۔ نالندہ نے بتایا ہے پرسوں بھی آپ لوگ گئے تھے۔“
”تو کہاں ہیں آپ لوگ؟“ احمد حسن نے برجستہ پوچھا۔

”سکندر اسلام آباد گئے ہوئے ہیں اور میں اماں جی کے پاس ہوں، اس نے بتایا تو احمد حسن سے بولا۔

”اور کون ہے آپ کے ساتھ، عدیل بھائی؟“ احمد حسن نے لوازمات سے سہی ڈالی پر نظر ڈال کر اس سے پوچھا۔

”میں، اماں جی اور میمونہ بھائی ہیں۔ چلیں آپ بھی، اسیہ نے نالندہ کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ چلیں، میں پیچ کر کے آتا ہوں، احمد حسن اپنے کمرے کی طرف ڈھک گیا۔

وہ ڈرائیج روم میں آئی تو غالباً اماں جی اپنی آمد کا مقصد بیان کر چکی تھیں۔ جب ہی نالندہ کی امی نے اسے فوراً واپس جانے کا اشارہ کیا جسے دیکھ کر وہ عقب سے سرگوشی میں بولی تھی۔

”یہاں تمہاری شادی کی بات ہو رہی ہے۔“
”ہاں،“ نالندہ نے بول کر اسے دیکھا اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے گھر اگر بھاگ گئی۔

”میں،“ نالندہ نے سوچنے کو وقت مانگ کر ایک طرح سے نیم رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا۔ گھر احمد حسن کی امی نے سوچنے کو وقت مانگ کر ایک طرح سے نیم رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا۔ گھر آتے ہی میمونہ بھائی، عدیل بھائی کو بھیجتے ہوئے بولیں۔

”اف، تمہاری جھوٹی تقریریں کر کر کے میں نے اپنا نامہ اعمال خراب کر لیا۔ اللہ تو بہ۔ اللہ معاف کرے مجھے۔“

”کبھی معاف نہیں کرے گا اللہ آپ کو، عدیل بھائی چڑھ کر بولے۔

”ہاں تمہارے عیب چھپانے کا گناہ قابلِ معافی تو نہیں ہے پھر بھی اللہ بڑا مہربان ہے،“ وہ عدیل کے چڑھنے پر لکھنوا کر بولی تھیں۔

بابا جان سلسلہ شاہ سکندر کو اپنے ساتھ مصروف رکھے ہوئے تھے۔ تیسرے دن بمشکل اسیہ کو فون کرنے کا موقع ملا تھا اور اسے اپنے مزید چند دن اسلام آباد میں رہنے کا بتا کر وہ کسی حد تک اطمینان سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا اس کے حصول تک وہ بابا جان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے ان کی خوشنودی ضروری تھی۔

اس وقت وہ بابا جان کے کہنے پر شہر بانو کے ہاں یعنی اپنے سسے سسرال جانے کے لیے تیار ہو کر بیچے آیا تو بی بی جان کے پاس پوری سچ و صحت سے تیار کھڑی مہر النساء کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا تھا۔

”جاؤ سکندر، گیا۔ بی بی جان اُسے دیکھ کر مہر النساء سے بولیں۔

”یہ میرے ساتھ۔“ وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو کر اس کی ناگواری ظاہر کر گئی۔

بی بی جان نے نیکی نظر سے دیکھا تو وہ سر جھٹک کر پٹلا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا گاڑی کے پاس ڈرائیو موجود تھا اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم جاؤ۔“ وہ ڈرائیو کو بیچ کر خود فوراً ٹیوٹک پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مہر النساء چنے کو اٹھائے اس کے برابر آکر بیٹھی تو اس نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھانی تھی۔

مہر النساء اس کے پیچے سے پڑنا ناگواری اور اب کر خستگی دیکھ کر ہی خائف ہو گئی تھی۔ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اس کے گھر والوں کے سلسلے بھی اس طرح پیش نہ آئے۔ شادی کے بعد بی بی جان کے ساتھ جا رہا تھا اور وہ بھی اتنے عرصے بعد اس تمام عرصے میں وہ کس طرح سب کو اپنی طرف سے اطمینان دلانی رہی تھی یہ تو وہی جانتی تھی اور اب یہ خدشہ بجا تھا کہ کہیں مہر نہ لوٹ جائے۔

جب اس کے بابا کی تحویل نظر آنے لگی تب وہ بہت جنت کر کے بولی تھی۔

”نہیں شاہ،“ ماں نے بانو کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم کہ آپ شاہ پور چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ شاہ سکندر کچھ نہیں بولا۔ لیکن اپنے اعصاب پر قابو پالیا اور غصا پر سکون نظر آنے لگا تھا۔

ہندومت والوں کو آتی ہے، وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر دھیرے دھیرے چلتی اُس کے سامنے آکر کہنے لگی: ”ایک بات بتائیں شاہ! اُس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ یا آپ خود اسے چھوڑ آئے ہیں؟“ وہ ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال کر اُسے دکھانے لگا۔

”اے، جس کی خاطر آپ مجھے بلکہ سب کو چھوڑ چکے گئے تھے؟“ مہر النساء براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”میں نے کہا کہ اُس نے مجھے یا میں نے اُسے چھوڑ دیا۔“

”نہیں، آپ کی والدہ سے میں نے خود کچھ لیا۔“ مہر النساء نے کہا۔

”اچھا! وہ اُس کی کچھ پر ذرا سنا۔ پھر لائبریریاں کرا کر اُس کے منھ سے شعلے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”مہر النساء! تم اگر اُس کے بارے میں جان سنی ہو تو یہ بھی جان لو کہ وہ میری بخت میری زندگی ہے۔“

”اور میں؟“ مہر النساء کی بے اختیاری نے اُسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اور فوری جواب سے بچنے کی خاطر وہ سگریٹ الٹیں رٹے میں سلنے لگا۔ اس کے بعد بھی سوچ کر تولا تھا۔

”میں بھاری حقیقت اور اہمیت سے انکار نہیں کروں گا مہر النساء! کیونکہ تم میرے بچنے کی ماں ہو۔ مجھے اگر تم سے نفرت نہیں تو نفرت بھی نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم دنیا دکھا دے کو حق میرے نام کے سہارے زندگی کو مارو اور اس امید پر کہ کبھی میں اُسیہ کو چھوڑ کر تہذیبی طرف لوٹ آؤں گا۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں بابا جان نے ایسا کوئی یقین دیا ہو کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں بلکہ مسلسل اسی کو شش میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے مہر النساء! تم خود کو فریب مت دو، میں چند دنوں کے لیے آیا ہوں، واپس لوٹ جاؤں گا۔ میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے اپنے بارے میں جو مناسب سمجھو سوچ لو۔“

مہر النساء کم کم ہوا کر رہ گئی تھی۔

شاہ سکندر نے خاموش ہو کر اُسے دیکھا اور مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ لیٹ گیا۔ لیکن اب بند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

پھر صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شاہ سکندر واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا اور حجاجان سے اجازت لینے اُن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ شاہ جاگیر آگئے، انہیں بابا جان نے بھیجا تھا۔ لیکن شاہ سکندر کے سامنے وہ بابا جان کا نام لیے بغیر کہنے لگے۔

”میں فارم پر جا رہا ہوں، تم بھی چلو، ذرا فراغت سے بیٹھیں گے۔ شاہ سکندر خود بھی اُن سے تنہا نہیں فرست سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مہر النساء کا خیال آنے پر کہنے لگا۔

”مہر النساء بھی ساتھ ہے بھائی!“

”لو گیا ہوا، وہ بھی چلے گی۔“ شاہ جاگیر نے کوئی اہمیت نہیں دی۔

”لیکن اُس کی موجودگی میں؟“ مہر النساء کے آنے سے شاہ سکندر کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اب کب آئے بھائی بی؟“ مہر النساء نے شاہ جاگیر کو دیکھ کر پوچھا۔

”بس ابھی آ رہا ہوں۔ اصل میں فارم پر جا رہا تھا۔ راستے میں خیال آیا کہ تم لوگوں کو بھی ساتھ لیتا چلوں۔ ذرا کب شب رہے گی۔ وہ آغا کہاں ہے؟“ شاہ جاگیر نے آخر میں نیچے کا پلو چھو لو مہر النساء کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”شہر بالو کے پاس ہے۔“

”اچھا! تم اُسے لے کر آؤ، ہم جب تک چچا جان سے مل لیں۔ شاہ جاگیر نے شاہ سکندر کو چھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اپنے کسی خیال سے چونکا پھر سر جھٹک کر اُن کے ساتھ چل پڑا۔

پھر چچا جان کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں باہر آئے تو مہر النساء شہر بالو سے تھکے ساتھ

اور اُس سے بہت دوستی بھی تھی۔ جب ہاس کے گلے لگتے ہی وہ سب بھول گیا۔ پرانے بلکہ خون رشتہ اور عجیب حاوی ہو گئی تھیں۔

”تمہیں عید کا چاند بھی نہیں کہا جاسکتا سکندر کہ وہ بھی سال میں دو بار نظر آجاتا ہے۔ شاہ ہارون نے پُر خوش انداز میں اُسے بازوؤں کے حلقے میں پیچھتے ہوئے کہا۔

”شاہ سکندر کے پاس جواب نہیں تھا تو زوردار قہقہہ لگا کر گویا اُس کی بات سے غلطوچار۔ مہر النساء نے ایک لحظہ کو رک کر دیکھا پھر مدح کی آگے بڑھ گئی تھی۔

”کچھ دیر میں سارے گھر میں اُس کی آمد کی خبر ہوگئی تو سب اپنے اپنے کمروں سے نکلنے لگے۔ شہر بالو بے قراری سے جھانک رہی تھی۔

”کیسی بو شہر بالو! وہ شہر بالو کے سامنے کچھ چورسا بن گیا تھا۔

”اچھی بون بھائی! آپ سنائیں، آپ تو! شہر بالو ایک دم خاموش ہو گئی۔

”ہاں، تمہیں پتا ہے میں اس وقت چائے پیوں گا۔“ اُس نے خوبصورتی سے شہر بالو کی بار مقل کی۔

”اور وہ بھی میرے ہاتھ کی۔“ شہر بالو بات سن جانے پر شکر کرتی کمرے سے نکل گئی تو وہ چوہا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اُن کے پوچھنے پر اپنی مصروفیات بتانے لگا۔

”شاہ سکندر کا خیال تھا وہ شام سے پہلے گھر کی راہ لے گا لیکن رات کے کھانے تک تو اُسے وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا اس کے بعد چچا جان نے زبردستی روک لیا کہ بغیر کسی حفاظتی انتظام رات میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

”بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آج کل کے حالات تم جانتے ہو۔ اور یہاں تمہیں پریشان کیا ہے۔ گھر میں بڑا شاہ ہارون اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

”چلو اٹھو، سوئے کی بات کرو، غبار والی عید تو سوچا۔“

”بابا شاہ کہو۔“ وہ مہر کی گود میں ٹوٹے بچے کو دیکھ کر مسکرایا پھر اُٹھ کر شاہ ہارون کے راجیل پڑا۔ اُس کے پیچھے شہر بالو، مہر النساء سے سرگوشیوں میں جانے کیا کہی آرہی تھی۔ اُس نے اُن کی کوشش نہیں کی پھر بھی ایک سوچ جدا اُس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔

”اب قابو کر کے رکھنا اپنے شاہ کو!“

”مڈروم میں داخل ہوتے ہی اُس نے پہلے کوٹ اتار کر موف کی بیک پر رکھا پھر بیٹھ کر شہر لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سیدھا ہوا تو دفتر مہر النساء پر بڑھی، وہ بچے کو۔ بیٹھ پر لٹانے اُس کی فینڈر اور تھراس لے کر جا رہی تھی۔ اور اُس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ منہ ہاتھ دھو کر بچے کے ایک طرف لیٹا اور کچھ دیر سوئے ہوئے بچے کو دھینے کے بعد آنکھیں پر بازو رکھ اپنے گھر میں تو مہر النساء جہاں وہ کمرے میں داخل ہوتا وہ وہاں سے چلی جاتی تھی اور یہاں پہنچتی پھر بھی وہ ایک سانس سے چلی گئی تھی تو لا شعوری طور پر وہ اُس کا انتظار کرنے لگا شہر بالو اس کی اس کا آنا یقین تھا۔ تسلی ویر گزر گئی اُس کے انتظار پر نیند غالب آگئی، اور وہ جھلنے پھٹنے لگی۔

رات کے کسی پہر کڑوٹ بدلتے ہوئے شاہ سکندر کی آنکھ کھلی تھی تو کوئی کے پاس کھڑی ہو کر دیکھ کر وہ سیکلمنٹ بیڈار ہو گیا۔ اور کہنیوں پر وزن ڈال کر اونچا ہو کر میک سے میک بٹا بولا۔

”تم سوئیں نہیں۔“

مہر النساء بڑی طرح چونکی اور پھر اُس پر بس ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

”کیا بات ہے۔ نیند نہیں آرہی۔“ اُس نے کارز سے سگریٹ کا بیگ اٹھاتے ہوئے بڑا سرسری انداز میں پوچھا۔

کھڑی تیز تیز جلنے کیا بول رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی جبکہ اُس کی آنکھیں ابھی بھی کچھ کھولے ہوئے تھیں۔
 ”اچھی تو ہو شہر بانو؟“ شاہ جہانگیر نے آگے آکر شہر بانو کے سر پر ہاتھ رکھا۔
 ”جی“ شہر بانو کا دھیان مہر لساؤ کی طرف تھا اس لیے بس جی کہہ کر رہ گئی۔
 ”بارون نظر نہیں آ رہا؟“
 ”انہیں حیدر آباد جانا تھا۔ سویرے ہی نکل گئے۔ اور آپ اتنی جلدی کیوں جارہے ہیں۔ شاہ رکتے۔“
 ”بس، شاہ ایک کام ہے۔ پھر آؤں گا۔ چلو سکندر۔“ شاہ جہانگیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔
 ”اچھا شہر بانو، چلتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے شہر بانو کو خود اٹھا کر اپنے پیچھے بہت جلدت کا مظاہرہ کیا تھا۔

مہر لساؤ، لطافہ خاموش تھی۔ لیکن اُس کے ہر انداز سے متغیر ظاہر ہو رہا تھا۔ اور یہ یقیناً اُس کے کام آسیرے کی گہری وابستگی کے اظہار کا نتیجہ تھا جسے وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کہ کل تک تو وہ ایسی نہیں تھی اُس سے لائق ظاہر کرنے کے باوجود اپنے جذبات کو چھپا نہیں یاد رہی تھی۔ شاید اس خوش فہمی بنا پر کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اور حقیقت بتووم ہوئے پر اُس کا تاملنا لفظی تھا۔ تمام راستہ بھی نیچے کی معصوم شہزادوں پر اسے بڑی طرح جھڑکتی رہی تھی اور اب رلیٹ ہاؤم کے ملازمین پر برس برس مہی تھی۔
 ”اسے کیا ہوا ہے؟“ شاہ جہانگیر نے بہت آرام دہ انداز میں بیٹھے ہوئے شاہ سکندر سے پوچھا تو اُس نے کندھے پر اٹکا کر لاعلمی کا اظہار کر دیا۔
 ”کیا تم اسے خاموش نہیں کر سکتے؟“ شاہ جہانگیر کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کیسے مدد پر ”چلائے دیں بھائی، آخر وہ بھی انسان ہے۔ گھٹ گھٹ کر تو مر جائے گی تو وہ اپنی ناکواری پر کر بولا۔

”اس کے مرنے سے تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔“ شاہ جہانگیر نے مذاق کہا اور سمجھنے کے باوجود بڑی طرح سلگ کر بولا۔
 ”اب میں اتنا خود غرض بھی نہیں ہوں جہانگیر بھائی، کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کی جان ہی لے لوں۔“

”بابا بابا۔“ شاہ جہانگیر کا استہزائیہ قہقہہ زور دار تھا۔ وہ بمشکل ضبط کرتا ان کے پاس سے اٹھ کر باہر نکل آیا تھا۔
 چہلے تھی وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ کہیں باباجان کے کام سے اور کہیں یوہنی تفریح کی غرض سے۔ فیض آباد جب یہ دیوں کی آمد ہوتی اور بالٹوں سے یلوا بارش ملبہ رہا ہوتا۔ ابھی تو ہر طرف خشک تھے کچھ پڑے تھے۔ جنہیں وہ پیروں تلے روندتا بڑی دور نکل گیا۔ عجیب سی سبے بس تھی۔ وہ شان و شکرت جو اس کی ذات کا خاصہ تھی۔ جاتے کہاں کو کئی بھی کر خود اسے اپنا آپ اجنبی سالک رہا تھا۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا۔ جب وہ باباجان سے اپنی ہر بات متوالی کرتا تھا۔ اور اُس وقت تک میں بھی نہیں تھا کہ کبھی زندگی میں یہ مقام بھی آئے گا کہ باباجان اُس کی بات سننے پر ہی آمادہ نہیں ہوں گے اور اسے بھائی کا سہارا لینا پڑے گا، کتنا فریب تھا اس سہارے میں۔ وہ پہلے جان ہی نہ پاتا تھا۔
 ”کاش جہانگیر بھائی ہی میرے ساتھ فیئر ہوتے، کچھ نہ کرتے میرے لیے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیتے تو اپنی زندگی گزارتا۔“ اُن کے ہاتھوں میں کچھ پتی تھیں۔ جن میں کس قدر بے مایا ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی

میں اس قدر غمو تھا کہ گاڑی کا ہارن بھی سنائی نہیں دیا۔

”کہاں بنے جا رہے ہو یار۔“ شاہ جہانگیر نے تھوڑی اُس کے قریب لاکر کہا تو وہ رک کر کچھ نا سنجی کے عالم میں بھٹک گیا۔
 ”میرے کسی بات سے ناراض ہوئے ہو؟“ شاہ جہانگیر گاڑی سے اتر کر اُس کے قریب چلائے۔
 ”نہیں۔“ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ”وہ گہری سانس لینے کے بعد۔“ فقط مسکرایا۔
 ”پھر یوں خفا خفا سے کہاں جا رہے تھے۔“
 ”گپیں نہیں، بس کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے نکل آیا۔ آپ کو یاد ہے ایک بار منہر کے اُس طرف خانہ بدوشوں کا قافلہ ان کے گھر آگیا۔ وہ ایک دم سے یوں ہو گیا تھا جیسے اُس وقت سے واقف ان ہی پرانی یادوں کو سوجھتا رہا ہو۔
 ”ہاں۔“ درجے اپنی زندگی میں پہلا عشق اسی قافلے کی ایک لڑکی سے ہوا تھا جس کا مجھے اب نام بھی یاد نہیں، شاہ جہانگیر نے بڑے محفوظ انداز میں کہا۔
 ”پہلا عشق۔“ اس کا مطلب ہے نہرت طول ہے؟ اُس نے فوراً گرفت کی۔
 ”لیکن قریب ہی طرح اسیر لیس میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا کہ گھر بار چھوڑنے کی نوبت آجائے۔“

شاہ جہانگیر بھی فوراً بولے تھے۔
 ”تو انہیں آپ عشق تو نہ کہیں، دل لگی ہو سکتی ہے۔“
 ”تو جی نہیں، یوہنی۔“ شاہ جہانگیر نے اس بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر گاڑی میں بیٹھے گا اشار کیا تو وہ واپس کے راستے پر نظر لگتے ہوئے بولا۔
 ”کہیں اپنی دور تک آیا ہوں۔“

”ہاں، کبھی کبھی خود کو بھی یاد نہیں چلتا۔“ شاہ جہانگیر کہتے ہوئے ڈرامائی سیٹھ کی طرف بڑھنے لگے کہ اُس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔
 ”بھائی، سیرے میری بات سن لیں۔“
 شاہ جہانگیر کو یوہنی پر اسے دیکھنے لگے تھے۔

”میں آپ کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔“ وہ بغیر کسی تہد کے گویا ہوا۔ ”آپ نے تو کہا تھا کہ باباجان سے معافی مانگنے کے بعد سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو وہی اول روز والی صورت حال ہے۔“

باباجان کو اس کا ذکر تک سننا گوارا نہیں۔
 ”تو تم نے کس نے کہا ہے کہ ان کے سامنے آسیر کا ذکر کرو۔ تم ہمیشہ جلد بازی میں حماقت کر جاتے ہو سکندر، پہلے نہیں غلی طور پر ان پر یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہیں مہر لساؤ کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا آسیر کا۔ اس کے بعد ہتھارہی کوئی بات سنی جائے گی۔“ شاہ جہانگیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”اس میں بہت وقت لگے گا بھائی، اور میں اتنا عرصہ آسیر سے غافل نہیں رہ سکتا۔ مجھے ایک دو دن میں اس کے پاس جانا ہے۔“ اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے مزید رکتا تا ممکن ہو۔
 ”کے کس یوہنی میں بائیں کر رہے ہو، اس طرح تو تم بھی باباجان کو آسیر کے حق میں ہموار نہیں کر سکو گے۔“ وہ دن تو نہیں یہاں رہنا پڑے گا، شاہ جہانگیر رنج ہو کر بولے تھے۔

”میں آسیر سے صرف دو دن کا کچھ کر آیا تھا۔“
 ”تو کیا ہوا؟“ وہ ماشاء اللہ بڑے سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”وہ دو کسے ہی آئے۔“ وہ جاہل عورتوں کی طرح تھکے جرح تو نہیں کرے گی۔
 ”وہ جرح نہیں کرے گی لیکن آپ نہیں سمجھیں گے کیونکہ آپ نے بھی عشق کیا ہی نہیں۔“ اُس کے بچے کی طرح نے شاہ جہانگیر کو خاموش کر دیا تھا۔

رات کا بھٹنے کو ن سہا رہا تھا۔ جب اچانک وہ نیند میں سے ہٹ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا

کہیں کوئی آواز نہ کوئی آہٹ نہیں تھی، اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل کی آواز اُسے صاف سنائی رہی تھی، کتنی دیر تک بیٹھے پر ہاتھ رکھ کر مدھمسی روشنی میں وہ چاروں طرف نظر میں کھانکھا کر دیکھتا رہا۔ اپنے قریب سونیا کو دیکھا کہ شاید اس کی میند لوٹنے کا سبب سونیا ہو۔ لیکن وہ بے اثر تھی، پھر بھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے دیر سے سے پکارا تو سونیا بس ذرا سا کر رہ گئی۔

تب کچھ حیران ہوتی وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن میند یوں اُٹا ہوتی تھی جیسے وہ سر سے سر نہ ہو۔ کچھ دیر کر وہیں بدلتے کئے بعد اس نے زبردستی سونے کی کوشش ترک کر دی تو ذہن شاہ کو سوچنے لگا۔ آج سارا دن بھی وہیں اُسی کی طرف رہا تھا اور ابھی شاید حوالوں کی رائیڈز پر بھی وہ بہ حال وہ جو دودن کا کہہ کر گیا تھا تو پورے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ اور بس وہی ایک بار فون کیا تھا کہ اُسے آنے میں کچھ دن لگیں گئے۔ گو کہ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اب تک منظم ہی تھی۔ لیکن اب چانگ اس کے اطمینان میں درازیں پڑنے لگی تھیں۔ شاہ سکندر کی طرف سے بدگمانی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے بھائی شاہ جہانگیر کچھ پراسرار سے لگنے لگے تھے، جو شادی کے بعد ہونے کے پھر پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اور ابھی بھی شاہ سکندر ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اسے وہ قصداً شاہ سکندر کے کام میں دیر کر رہے ہوں۔ پتا نہیں وہ چاہتے ہی نہیں یا کوئی اور مدد سوچتے سوچتے صبح کے قریب جا کر سوئی تھی۔ اس لیے میند کے مطابق اُنھنے کا سوال ہی نہیں تھا، بھائی نے ناشتے کے لیے اُٹھایا تو اس وقت ذرا سی آنکھیں کھول کر اس نے نہ صرف ناشتے کو بلکہ بعد بھی اُٹھانے کو منع کر دیا تھا۔

پھر گیارہ بجے کے قریب شاہ سکندر کے فون پر میمونہ بھائی کو مجبوراً اُسے بھٹو ٹا پڑا۔
 ”میتھارے سراج کا فون ہے، سن لو پھر سو جانا“ میمونہ بھائی نے اُس کے کان کے قریب اوچی آواز میں کہا کہ وہ فوراً اُٹھ لی، اور کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے روٹھے لیجے میں بولی۔
 ”یہ اُٹھانے کا لون سے طریقہ ہے؟“

”جیسے روٹھنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے سراج کی خبر لو جو ایک پل صبر نہیں کر رہا، سکندر آگئے کیا؟“ اُس کا اشتیاق پھانے نہ چھوڑا۔
 ”جی نہیں، اُن کا فون ہے۔“ میمونہ بھائی نے کہا تو وہ اُٹھ کر لال میں آگئی۔ فون آج ہی کے تھا اور وہ سکندر سے بات کر رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے شاہ سکندر کو اس کی آمد کا بتا اُسے تھا دیا۔

”خیریت، کیا رات میں نہیں سوتی تھیں؟“ شاہ سکندر نے چھوٹے ہی پوچھا۔
 ”بس رات کچھ سوئے جا گئے تھیں۔“ اُس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

”آپ سائیں ایک آرہے ہیں؟“ شاہ سکندر کی غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔
 ”میں بس دو چار دن میں آ رہا ہوں۔“ شاہ سکندر نے غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔
 بات بھی بدل گیا۔

”سنو لے آجی خیال آیا تھا کہ آج تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ تم میمونہ بھائی کے ساتھ نہیں، آج میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔ کل چل جاؤں گی یا جب آپ آئیں گے؟“ اُس نے سستی سے کہا۔

”تم اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہو اس، اس طرح کروں تو میں“
 ”خندوں میں ڈوٹی آواز کی گھنیرا جاناک خاموش ہو گئی۔ شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اُس نے کرپٹل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر مایوسی سے ریسپورڈر کو کہہ کر قدرے سست روی سے برآمد آ پٹی۔

”ناشتا کرو گی؟“ میمونہ بھائی نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔
 ”نہیں، صرف چائے پیوں گی اور وہ بھی نہانے کے بعد“ اُس نے اس خیال سے منع کر دیا کہ میمونہ بھائی اپنا کام چھوڑ کر اس کے لیے ناشتا نہانے نہ کھڑی ہو جائیں۔ اس کے باوجود جب وہ باگرننگی تو پورے میں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی موجود تھے۔ اور ابھی وہ جائزہ لے رہی تھی کہ سونیا اور امراٹھوں سے آگئے۔

”جی بھی چھوڑیں گی ناشتا کروں گی؟“ سونیا نے اپنا بیگ اُتار کر تخت پوش پر پھینکے ہوئے کہا تو اصرار نے ذرا اُسے ٹوکا۔

”بھوک نہیدی! صبح ناشتا کیا نہیں تھا؟“
 ”ہوں، بری بات۔ تم بیٹھو سونیا، یہ میتھارے ہی لیے ہے۔“ اُس نے اصرار کو ٹوک کر سونیا کو ٹھایا پھر کھڑی دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”آج تم لوگ جلدی کیسے آگئے؟“

”آج چار باباں ڈکے تھا، تھری فرسٹ ہے ناں؟“ سونیا نے حسبِ عادت قابلیت بتائی۔
 ”اچھا ناں۔ خیر تم دونوں ناشتا کرو، میں اسات جی کے پاس جا رہی ہوں اور دیکھو لڑنا نہیں؟“ وہ نرمی سے دونوں کو تنبیہ کرتی اسات جی کے پاس چلی آئی۔
 ”کیا کہہ رہا تھا سکندر؟“ اسات جی نے اُس کے بیٹھے ہی پوچھا۔

”بات کہاں ہوئی اُن سے۔ لائن ہی کٹ گئی تھی۔“ وہ سرسری انداز میں جواب دے کر عمر کو گدگد لانے لگ گئی۔
 ”ابھی سونیا اور امراٹھ کی آواز آئی تھی۔ اسکول سے آگئے کیا؟“

”جی، اور میرے کمرے میں ہیں، خیر اب تو وہ میرا کمرہ نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔
 ”کیوں نہیں، ابھی بھی میتھارے، تم جب آؤ گی اسی میں رہو گی۔“ اسات جی کی فبت کے سامنے وہ غامض ہو رہی تھی۔

پھر دوپہر کے کھانے کے بعد جب میمونہ بھائی عمر کو لے کر اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تب دریت سے پچھلے کی خاطر وہ سونیا اور امراٹھ کے ساتھ لڑو کھینچنے بیٹھ گئی۔ لیکن پہلے مرحلے پر ہی اُسے نیل آد گیا۔ اور اُس کی خالی جگہ کو دیکھتے ہوئے شدت سے اُس کی نمی محسوس ہونے لگی۔
 ”تھیں ناں چھو پھو، آپ کی باری ہے۔“ اصرار نے اس کا ہاتھ ہلا کر متوجہ کیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”نہیں بس، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“
 ”خیر تم کو پورا کر سن“ اصرار نے اصرار کیا۔
 ”رات میں کھیلیں گے، جب میتھارے عدیل چاہا بھی آجائیں گے۔“
 ”عدیل چاہا میرے پارٹنر نہیں گے، سونیا خوش ہو کر بولی۔

”اور میں پھر پھو کا۔“
 ”ہاں ٹھیک ہے، جاؤ اب تم دونوں کچھ دیر آرام کرو۔ شام میں اُٹھ کر پہلے ہوم ورک کرنا، پھر کھیلیں گے۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولی پھر دونوں کو سونے کے لیے اسات جی کے پاس بھیج کر لالائی میں نرمی سے بھائی کے بڑ بڑائی کرنے لگی۔

”خیر اب جب اُس نے فون کیا تھا تو نیل سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اُس کی ملازمنے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کہیں باہر گیا ہو ہے۔ اور ابھی بھی اُس کے پوچھنے پر ملازمہ نے وہی بات دہرائی۔
 ”اُسے کچھ جیسے پہلے بھی اور ابھی بھی اُس سے جھوٹ لولا گیا ہے۔ اور ملازمہ خود سے تو جھوٹ بولی نہیں سکتی تھی۔ یقیناً بنیڈیکٹ کے کہا ہو گا۔ وہ کتنی دیر تک سوچتی اور کھتی رہی کہ آخر بنیڈیکٹ ایسا کیوں

کر رہی ہیں۔ حالانکہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ نبیل اس سے کتنا مانوس ہے۔ اور جانے نبیل سے کیا گی، ہم سب سے متنفذ کرنے کی کوشش اور وہ ابھی نا کچھ بچتے ہی تو ہے۔

وہ یونہی سوچتے ہوئے لانی بی میں ادھر سے ادھر ٹپل رہی تھی۔ دو بہر کا وقت تھا۔ سب تھے۔ اور وہ کیونکہ دیر سے اٹھی تھی، اس لیے اب جھلکا بھر رہی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہیں تھا۔ اور تو کوں سامیونہ بھائی کرنے دیتیں۔ وہ سخت بور ہو کر شل فون کو گھومنے لگی۔ صبح شاہ سکندر سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اور اس کا کچھ بتا ہی نہیں تھا کہ کہاں بٹھا ہوا ہے۔ ورنہ وہ خود اسے فون اسے فون کرنے کے خیال کے ساتھ ہی اسے میونہ بھائی کی بات یاد آئی جو انہوں نے اسے شاہ پورہ بی بی جان سے بات کرنے کو کہا تھا۔

کس ایسی وقت اس نے ڈاکٹر کیڑی کھول کر شاہ پور کے منہ تلاش کیے اور شاہ حیات ٹھکانہ کے منہ داخل کرنے لگی۔ کچھ ملی جلی سی کیفیت تھی اس کی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اور بی بی جان سے بات کر خوشی بھی تھی۔ دوسری طرف میل جا رہی تھی۔ بھر لیسور اٹھنے کے ساتھ ہنکارا بھرنے کے انداز کی آواز سنائی دی۔ تو وہ بہت سنبھل کر بولی۔

”وہ بی بی جان ہیں؟“
”آپ کون؟“ خامشی بارعب آواز تھی۔ وہ پہچانتی نہیں تھی، پھر بھی کچھ گئی باباجان ہوں گے نہیں تو کئی لینی کبھی تو ان سے بات ہوتی ہی تھی پھر انھی کیوں نہیں۔ اس نے سوچا اور پھر غصے جانتے کے لیے قدرے جتا کر بولی۔

”جی میں آسمیہ ہوں۔ آسمیہ سکندر حیات۔“
”یعنی سکندر حیات کی۔“ سوچتے ہوئے انداز میں بس اسی قدر کہا گیا۔
”بی بی۔“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو کر بولی جیسے ان کی ایک انگ جنبش محسوس کر رہی ہو۔
”کون سی بی بی، دوسری، تیسری، چوتھی۔“ اٹنے آرام سے پوچھا گیا کہ وہ سنبھل گئی۔

”جی!“
”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بی بی کو جانتے اور مانتے ہیں۔ جیسے سکندر پوری شان و بیاہ کر لایا تھا۔ اور وہ ہے مہر النساء۔“ باباجان نے اس کے سر پر اٹیم ہم دے مارا تھا۔

”نہیں، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“
”اپنی حیثیت جان کر بات کر ورنہ! شاہ سکندر حیات نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا معاوضہ بھی دیا تو بگاڑنا باباجان نے انتہائی شفا کی سے اس کی عزت وقار کی دھیماں اڑا دی ہیں اس کا پورا وجود جھٹکے کھانے لگا۔

”اور ایک رکھیل کی اتنی جرأت کہ وہ جاری بات کو غلط کہے۔ شاید تم جاری حیثیت و مز نہیں ہو یا پھر تمہیں بلیک میل کرنا چاہی ہو، کہہ دیا جائے تمہیں، لیکن ٹھہرو، مانگتے ہوئے نہیں جاری حیثیت رکھنا۔ ہم اپنے بیٹے کا ہدف دینے میں تاخیر نہیں کریں گے، باباجان کی سماعتوں سے گزرنی روح میں لشت پھیر رہی تھی۔
اس کے ہاتھ سے ریسور جھٹ گیا اور دوسرے پل اس کی دل در پیچ درو دیار ہلا گئی تھی

خاموشی کو چیتی ہوئی آسمیہ کی چیخ نے سوتے میں سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے میمونہ بھا بھی تھیں۔ ”نالی!“ اس کے کمرے میں کئی تھیں پھر ان ہی پیروں ڈرائنگ روم کی طرف بھاگ رہی تھیں کہ وہ فرش پر پڑنے لگی۔ دوہری ہوتی نظر آئی۔

”اسیوں نے لپک کر اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو وہ ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔
”جی، جلدی آئیں۔“ میمونہ بھا بھی نے گھبرا کر اماں جی کو پکارا، ”معا“ نظر ریسور پر پڑی، جو اسٹینڈ سے نیچے اٹھا انہوں نے فوراً تھام کر کان سے لگا کر سیلو کا تاوا دھر سے جیسے اعلان دی گئی۔
سکندر شاہ پور پہنچ چکا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”ابا بیا!“ ابائی اور ان کے پیچھے اماں جی بے حد گھرائی ہوئی تھیں۔ آسمیہ کی چیخ پر ہی ان کے ہاتھ پاؤں تھے تھے اور اب اسے فرش پر پڑے دیکھ کر تو رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔
”ابا بیا میری بی بی کو؟“

”وصلہ۔“ ابائی نے انہیں آسمیہ کے قریب نہیں جانے دیا اور پہلے بڑھ کر اس کے سر کے نیچے ہاتھ میمونہ بھا بھی کو ادھر سے اٹھانے کا اشارہ کیا اور بے مشکل تمام اسے کمرے میں لا کر لٹاتے ہی بولے۔
”بی بی میمونہ! خلیل یا عدیل کو فون کرو، جلدی ڈاکٹر کو لے کر آئیں۔“

”ہون بھا بھی پوری بات سے بغیر فون کرنے دوڑ گئیں تو اماں جی، آسمیہ کے قریب بیٹھ کر اس کی ہتھیلیاں ملنے ان کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

”ابائی! آپ بیٹھ جائیں۔“ میمونہ بھا بھی واپس آئیں تو ابائی کو بے بسی سے ٹپکتے دیکھ کر کرسی ان کے سامنے لڑوئیں۔ پھر گلاس میں پیانی ڈال کر آسمیہ کے قریب آئیں اور اس کے منہ پر ہلکا سا چھینٹا مار کر گلاس اماں جی کو

”عدیل بھائی ڈاکٹر کے ساتھ آئے اس وقت تک سارے گھر یونٹے آزمائے جاتے تھے پھر بھی اس کی نئی ہونگی۔ اماں جی کی حالت کے پیش نظر عدیل بھائی کے اشارے پر میمونہ بھا بھی انہیں وہاں سے اٹھا کر باہر لے گئیں۔ تب ڈاکٹر اسے چیک کرنے لگا۔

”ڈی پکنسٹ؟“ ڈاکٹر کینس چیک کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔
”جی۔“ عدیل بھائی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بمشکل ڈاکٹر کو جواب دے سکے۔

”نڈیڈ شک۔“ ڈاکٹر نے آسمیہ کو انجکشن لگانے کے بعد کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں میڈیسن لکھ کر باہر آؤں اگر آؤں گے میں انہیں ہوش آجائے تو یہ دوائیں ٹھیک رہیں گی۔ دوسری صورت میں ہاسپٹل لے

”جی۔ ابھی لے جاؤں؟“ عدیل بھائی نے فوراً ”پوچھا تو ڈاکٹر کندھے اچکا کر بولا۔
”آپ کی مرضی اگر آپ آؤ گئے انتظار نہیں کر سکتے تو ضرور لے جائیں۔“

”یہاں پلٹ کر ابائی کو دیکھا۔ ان کے ساتھ خلیل بھائی کھڑے تھے اور انہوں نے ذرا سانس فی میں سر ہلا کر گویا ”فورن ہسپٹل لے جانے سے منع کر دیا۔ تب عدیل ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گئے۔

”میں نہیں دواؤں میں لے کر واپس آئے تو ابائی خلیل بھائی کو تار رہے تھے۔
”میں نہیں معلوم، ہم سب سو رہے تھے۔ پتا نہیں آسمیہ کو کیا ہوا؟ بہت زور سے چیخی تھی اور ہمارے آنے پر ہوش ہو چکی تھی۔“

”اس سے پہلے میرا مطلب ہے کھانا وغیرہ کھایا تھا اس نے“ عدیل نے پر سوچ انداز میں پوچھا۔
”نالی۔“ اسے ساتھ کھانا کھایا اور اس وقت بالکل ٹھیک تھی بلکہ کھانے کے بعد سوینا اور احمر کے ساتھ لٹو



”جی۔ راستہ خراب تھا۔“ عدیل بھائی بھانج کے چروں پر اطمینان دیکھ کر اُلجھ گئے۔
 ”تم نے جانے میں جلدی کی۔ میرا خیال ہے ابھی تم شاہ پور پہنچے بھی نہیں ہو گئے کہ سکندر کا فون آگیا تھا۔ ہم
 سب کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا البتہ آسیہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئی ہے۔ شاید بھرپور نیند
 کے بعد صبح تک اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ خیر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آرام کرو۔“ خلیل بھائی نے
 ان کی تحن کے خیال سے بات مختصر کر دی۔
 ”کھانا کھاؤ گے یا چائے؟“ میمونہ بھابی نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ عدیل منع کر کے فوراً ”اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔
 * ☆ * ☆ *

”آس آس!“
 ایک پکار بھی جو اونچے برتوں سے ٹکرا کر باز گشت کی صورت بننے پاتال تک گونج رہی تھی۔ بہت خوفناک
 نظر تھا۔ کمری نیند میں اس کے دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے سینہ چر کر باہر نکل آئے گا اور پھر ایک دم اس کی آنکھ کھل
 گئی۔
 ”میرے خدا!“ بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اماں جی کو دیکھا جن کے خراٹوں کی آواز خاموشی
 میں زبردست پیدا کر رہی تھی۔ پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ ذہن خوفناک خواب کی گرفت میں تھا
 درساتوں میں ابھی بھی اس کے نام کی پکار گونج رہی تھی۔ اور اتنی شدتوں سے پکارنے والا وہی ایک شخص تھا جو
 اس کے دل میں اس مقام پر قابض تھا جسماں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی اور ہو سکتا تھا۔
 ”شاہ سکندر!“ زبان کی ذرا سی جنبش کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں اور یکبارگی ذہن کے
 مارے درپے ایک ساتھ وا ہو گئے تھے۔
 ”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بیوی کو جانتے اور مانتے ہیں جسے سکندر پوری شان و شوکت سے بیاہ کر لایا تھا
 وہ ہے مہر النساء۔“
 ”نہیں!“ اس نے سختی سے جھٹلانے کی کوشش کی تھی کہ ذہن کہیں پیچھے ہٹک گیا۔
 ”مہر النساء!“ اسے یاد آیا، پہلی بار یہ نام اس نے شاہ سکندر ہی سے سنا تھا اور پھر مری میں اس کے دوست، محسن
 لیوی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔
 ”اوسو! تم میرے ساتھ آ جاؤ۔“ گویا وہ جانتی تھی کہ سکندر کی بیوی کا نام مہر النساء ہے اس لیے اتنے یقین سے
 اس نام سے پکارا تھا اور وہ کس کس کو جھٹلانے کی کوشش کرتی۔ بہت مایوس ہو کر وہ مہر النساء کے ساتھ اپنا
 زندہ کرنے جاری تھی کہ بابا جان کی سفائی یاد آئی۔
 ”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“
 ”نہیں۔“ شاہ سکندر میرے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل نہیں کھیل سکتے۔ غلط کہتے ہیں اس کے بابا جان وہ انہیں
 دیکھا ہے بلکہ سب کو۔ اور جاگیر میں بھی ٹھکرا آیا ہے صرف میری خاطر۔ اور بابا جان کا اس پر بس نہیں چلا تو
 نیاس سے متفرک کرنا چاہتے ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا، کبھی نہیں۔“
 وہ بڑے یقین سے بابا جان کو جھٹلا رہی تھی، لیکن جانے کیوں دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور آنکھوں کے
 نادرے سے جھٹکتے آنسو جب چاپ تکبے میں جذب ہو رہے تھے۔
 ”بنا خیال رکھا کرو اس۔“ یہ سوچ کر کہ میری سانسوں کی دُور تمہارے ساتھ بندھی ہے۔“ محبتوں کی شدتیں
 ”سکندر!“ اس نے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگی تھی۔
 اذان کی آواز پر اماں جی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور حسب عادت مؤذن کے ساتھ ساتھ اذان کے الفاظ زیر لب

”کیا ہوا ہے مجھے؟“
 ”کمزوری۔ غالباً“ کمزوری کے باعث تمہیں چکر آگیا تھا۔“ لودودہ پو۔“ انہوں نے فوراً ”گلاس افوا“
 ہونٹوں سے لگا دیا۔
 ”میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ اس نے ذرا سا دودھ پی کر سر بیک پر نکا دیا۔ ”میں لگ رہا ہے جو
 میں جکڑا ہوا ہوں۔ اماں جی کہاں ہیں؟“
 ”میں بلاتی ہوں انہیں۔ تم پہلے یہ دودھ ختم کرو۔“ میمونہ بھابی نے زبردستی اسے دودھ پلایا پھر دوا
 جا کر اماں جی کو پکارا تو وہ فوراً ”آئی تھیں۔“
 ”آپ آسیہ کے پاس بیٹھیں اماں جی! میں بچوں کو دیکھ لوں۔“ میمونہ بھابی کمرے سے نکل گئی
 جیسے ہی اس کے پاس آنکھیں کھلیں اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا اور ہاتھ تمام کر گال سے لگائی ہوئی
 ”آپ مجھے جھوڑ کر تو نہیں جائیں اماں جی!“
 ”میں تمہارے پاس ہوں بیٹا!“ اماں جی کو وہ بالکل چھوٹی بچی کی طرح لگی۔ جبکہ کراس کی پیٹیاں
 دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اٹکیاں پیچھرنے لگیں تو بہت پرسکون ہو کر اس نے پلکیں موند لیں۔
 ”میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں ناں؟“
 ”کہاں تنگ کرتی ہو۔ اللہ نے مجھے بہت نیک اور سعادت مند اولاد دی ہے۔ مجھے کبھی کسی نے
 کیا۔“ فرط محبت سے اماں جی کی آواز بھرائی تھی۔
 ”میں تو پریشان کرتی ہوں آپ کو۔“ وہ بچوں کی طرح بول رہی تھی۔
 ”جان بوجھ کر تو نہیں کرتیں اور اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو سوجاؤ۔“
 آہستہ سے ہٹھکنے لگیں۔
 جب میمونہ بھابی بچوں کو ہوم ورک کروا کر سنانے کے بعد دوبارہ آسیہ کے کمرے میں آئیں تو انہ
 پر بہت رحم آیا جو بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں جبکہ ان کی گود میں سر رکھے آسیہ بے خبر سو رہی تھی۔ میمونہ
 آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھا پھر سارا دے کر اماں جی کو اٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولیں۔
 ”آپ یہ آرام سے سوئے گی، چلیں آپ بھی سو جائیں۔“
 ”مجھے ابھی عشاء بردھنی ہے، پھر میں بیس سوؤں گی آسیہ کے پاس، یہاں ایک چارپائی ڈال دو۔“
 پھر خیال آنے پر پوچھنے لگیں۔
 ”عدیل کچھ بتا کر نہیں گیا۔ کہاں گیا ہے؟“
 ”ابھی آتا ہو گا، پوچھ لیجیے گا۔“ میمونہ بھابی دامن بچائی، نیبل اور کرسی بنا کر چارپائی بچھانے
 بنانے لگیں۔
 اماں جی نماز پڑھنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
 میمونہ نے شوہر کو بلا کر ان کی مدد سے چارپائی رکھوائی پھر اس پر بستہ لگا کر اماں جی کے آنے تک صبر
 کر رہی تھیں کہ عدیل کی گاڑی کی آواز سن کر بھاگ کر باہر آئیں لیکن برآمدے میں خلیل کو کھڑا
 رک گئیں۔
 ”خیریت؟ کہاں رک گئے تھے؟“ عدیل کے قریب آتے ہی خلیل نے ان سے پوچھا۔
 ”بس وہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔“ عدیل بے حد مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔
 ”ہے؟“
 ”ہاں ابھی کچھ دیر پہلے سوئی ہے۔“ میمونہ بھابی آگے آکر بولیں۔ ”تم ہو آئے شاہ پور سے،“
 ہو؟“

”مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“ صورت حال سے بے خبر میمونہ بھابی محض عدیل کو چھیڑنے کی غرض سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔
 ”ہاں تم بتاؤ آسیہ!“ عدیل ان کے بیٹھنے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے سابقہ انداز میں آسیہ سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ شاہ سکندر شادی شدہ اور بچے کا باپ ہے؟“

”نہیں، میمونہ بھابی اچھل پڑیں۔“
 ”نہیں، بخدا نہیں۔ مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا اور یہ معلوم کرنا آپ کا کام تھا۔“ وہ ہاتھوں میں چرا چھپا کر پھوٹ کر رونے لگی۔ ”جی جی اس کا نام نوٹ کیا تھا۔“
 عدیل بھابی کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پر کمزور پڑنے لگی اور پھر ایک دم انہوں نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے میں چھپایا۔

”رو! نہیں میری بہن! تمہاری قسم تمہارے ایک ایک آنسو کا حساب لوں گا۔“
 میمونہ بھابی ششدر کھڑی تھیں۔
 اماں کی مابائی، آسیہ کے رونے کی آواز سن کر خلیل کو پکارتے ہوئے آئے تھے۔
 ”کیا ہوا ہے؟“ خلیل نیند میں سے اٹھ کر آئے تھے۔ ایک ایک کی شکل دیکھنے لگے پھر گرم صم کھڑی بیوی کا کندھا ہلاتا وہ چونکنے کے ساتھ ہی عدیل پر بگڑنے لگیں۔

”عدیل! تم نے صبح صبح کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“
 ”ہاں!“ عدیل کے ہونٹوں سے کمری سانس خارج ہوئی پھر آسیہ کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”خلیل بھائی! کیا آپ بھی آئیے؟“
 جانے کی بات تھی کہ اماں جی بھی روتی ہوئی بیٹی کو چھوڑ کر ان تینوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی تھیں۔

* ☆ * ☆ *

شاہ سکندر کی تمام رات سوتے جاگتے گزری تھی گو کہ کل خلیل بھابی کی باتوں سے کہیں بھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ عدیل شاہ پور آئے ہیں اور تیز رفتاری کے باعث خود اس نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کی گاڑی وہ بچاتا تھا اور اس وقت سے اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کئی بار جھٹلانے کی کوشش کی کہ اسے دھوکا ہوا ہے۔ عدیل یہاں کیوں آئیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں شاہ پور چھوڑ چکا ہوں اور ابھی بھی میری یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں! یہاں تک کہ آسیہ بھی نہیں جانتی پھر ان کا یہاں آنا؟
 ”نہیں۔ وہ عدیل بھابی نہیں ہو سکتے۔“ وہ بار بار جھٹلاتا اور ہر بار دھول اڑاتی گاڑی اس کی نظروں کے سامنے نہایت تھی۔

پھر صبح ناشتے کے بعد اس نے اچانک واپسی کا سوچ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا ہونے والی تھی جو اس کی فحش الامور بجانے لگی تھی۔ وہ بہت عجلت میں تیار ہو کر سب سے پہلے بابا جان کو اپنے جانے کا بتانے کی نیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔
 ”جس کام سے تمہیں کراچی جانا تھا وہ یہیں ہو گیا۔ اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اسلام علیکم بابا جان!“ اس نے سلام کیا تو شاہ جہانگیر کچھ بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ بابا جان نے چونک کر سیدھا اوروں سے بل مسکرا کر بولے۔

”اے! تو ابھی ہم تمہارا بی ذکر کر رہے تھے۔ آؤ یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔“
 اس نے بیٹھتے ہوئے پونہ بی بی شاہ جہانگیر کو دیکھا تھا۔
 ”بہنو! آؤ فارم سے؟“ بابا جان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

دہرانے لگیں۔ آخر میں قدرے اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے، پھر چارپائی سے اتر آسیہ کو دیکھا تو زیر پاؤں کی مدد میں وہ انہیں سوئی ہوئی نظر آئی۔ اس کی خرابی طبع کے باعث اسے نماز کے لیے نہیں اٹھایا بلکہ جلنے میں بھی احتیاط کی کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ کمرے پر آمدے میں آئیں تو عدیل کو غصے دھجھ کر پوچھنے لگیں۔
 ”تم اتنی جلدی اٹھ گئے؟“

عدیل چونک کر رے بھر بڑھ کر لاسٹ آن کر دی۔
 ”رات کہاں چلے گئے تھے؟“ اماں جی نے پوچھا۔
 ”آسیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ وہ ان کا سوال نظر انداز کر گئے۔
 ”بہتر ہے۔ رات بھر آرام سے سوئی رہی۔“

”چلیں۔ آپ نماز پڑھ لیں، میں ذرا آسیہ کو دیکھ لوں۔“ عدیل کہتے ہوئے آسیہ کے کمرے میں آئے۔
 میں انہیں بھی وہ سوئی ہوئی لگی لیکن جب قریب گئے تو سسکنے کے باعث اس کا وجود جھٹکنے کا ہوا تھا۔
 عدیل کے دل پر ایک اور قیامت بیت گئی۔ ان کی نازوں بی بی، من کی زندگی میں یہ کونسا مقام آگیا تھا۔
 ”آسیہ!“ دھیرے سے پکارتے ہوئے انہوں نے اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچ لیا تو بے حد پریشان ہوا ہاتھ چہرے پر رکھنا چاہتی تھی کہ وہ فوراً اس کی کلاٹیاں تھام کر بولے۔
 ”رونا اور منہ چھپانا اس وقت جب ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے۔“

”عدیل بھائی!“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ ”اللہ کرے میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔“
 ”سب کو اپنی زندگی آپ جینا ہے۔ سمجھ رہی ہوں؟“ عدیل کا لہجہ اچانک گہیر ہو گیا تھا۔
 وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ گھنے بال بے زہر پیشانی پر جھول رہے تھے اور چہرے پر کسی قیامت کے گزرنے کے واضح اثرات تھے۔
 ”کیا ہوا ہے عدیل بھائی آپ کو؟“ وہ اپنا دکھ بھول گئی۔

عدیل بھائی نظریں چرا گئے۔
 ”بتائیے ناں عدیل بھائی! آپ کو میری قسم۔“ اور وہ جن کی تمام شب خود کو سنبھالنے اور یہ یاد رکھنا پڑا تھا کہ انہیں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ان کی بہن کا حال اس وقت بھی وہ ضبط کرتے کرتے اچانک ٹوٹ گئے تھے۔
 ”ہماری عزت وغیرت کوئی کھلو نا نہیں ہے آسیہ! جسے کوئی امیر زادہ اپنی دل بستی کے لیے خرید سکے یہاں سوالی بن کر آیا تھا۔ جانتی ہوں ناں پھر اس کے باپ نے تمہیں اور ہم سب کو گالی کیوں دی؟“

آسیہ کا پورا وجود سن ہو گیا تھا۔
 ”میں اگر اسے زندہ چھوڑ کر واپس آیا ہوں تو صرف یہ جاننے کے لیے کہ کہیں تم نے قصداً توڑ کھایا۔ شاہ سکندر کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر۔ مجھے بتاؤ آسیہ! ورنہ میں خود کو کوئی مار لوں گا۔“
 نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”خدا کے لیے عدیل بھائی!“ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑی۔ ”مجھے گولی ماریں لیکن وہ کوئی الزام نہ لگائیں۔“
 ”کیا ہوا ہے؟“ سچن میں جاتے ہوئے آواز سن کر میمونہ بھابی اس طرف آئی تھیں۔ آسیہ کو پریشان ہو گئیں۔
 ”کچھ نہیں، آپ جائیں اپنا کام کریں۔“ عدیل بھائی کو ان کی مداخلت سخت ناگوار گزری۔

”جی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ پرانی بات بھی نہیں تھی۔ ایک دم اجاڑو ایران لگتا ہے آپ! اراضی سے دلچسپی نہیں رہی؟“ اس نے اپنے تئیں بابا جان کو احساس دلانا چاہا کہ عدم توجہی کے باعث زمین ناکارہ ہو رہی ہے۔

”وہ زمین تمہاری ہے سکندر! اور تم ہی اسے آباد کرو گے۔“ بابا جان نے کہا اور پھر فوراً ”موضوع بدرا اچانک یاد آنے کا اثر دیتے ہوئے بولے تھے“ اور ہاں کل تمہارا کوئی دوست آیا تھا۔“

”کون؟“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو گیا۔

”وہ کیا بھلا سا نام بتایا تھا اس نے۔“ بابا جان ذہن پر زور ڈالنے لگے۔

”عدیل۔“ وہ اتنا صبر نہیں کر سکا۔

”ہاں شاید یہی نام تھا۔ ہم نے اسے رکنے پر مست اصرار کیا کہ ایک دو روز میں تم آجاؤ گے لیکن جلدی تھی۔ پتا نہیں کس کام سے آیا تھا۔ وہ بھی نہیں بتایا۔“

بابا جان اپنی کسے جارہے تھے جبکہ وہ عدیل بھائی کی آمد کی تصدیق ہونے پر بے حد پریشان ہو کر شاہ دیکھنے لگا تھا۔

”کیا کیا کہہ رہا تھا؟“ شاہ جہانگیر نے اس سے نظریں چرا کر بابا جان سے پوچھا۔

”ہم سے تو کوئی خاص بات نہیں کی اس نے۔ بس سکندر کا پوچھ کر چلا گیا۔“ بابا جان اب بہت سر میں بول رہے تھے۔

”میرے بارے میں آپ نے کیا بتایا؟“

”یہی کہ تم فارم برگئے ہوئے ہو۔ ایک دو روز میں آجاؤ گے۔ اگر ہمیں معلوم ہو تا کہ تم اسی وقت آ رہے ہو تو ہم اسے ہرگز نہ جانے دیتے۔“ بابا جان بڑے آرام سے اس کے اندلیشوں کو ہوا دے رہے تھے۔

وہ سخت مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا اور شاہ جہانگیر کو چلنے کا اشارہ کرتا ہوا بابا جان کے کمرے سے نکل آیا۔

شاہ جہانگیر کافی دیر بعد اس کے پاس آئے تھے۔ اس وقت تک اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے پھر دیکھ کر وہ چیخ مڑا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے جہانگیر بھائی؟“

”دیرجن سے۔ دیرجن سے۔“ شاہ جہانگیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھاتے ہوئے بولے۔

”یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”شاید انہیں تمہارے بارے میں انکوائری کرنے کا خیال اب آیا ہو۔“ شاہ جہانگیر نے پرسوج انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟ کیسی انکوائری؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کہ تم واقعی شاہ پور کے زمیندار ہو یا۔“

”نہیں۔“ اس نے شاہ جہانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مسترد کر دی۔ ”انہوں نے اپنی ہر میری یہاں کی حیثیت کو سوچ کر نہیں کھی جو اب انکوائری کرنے آئیں گے۔“

”پھر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”میں آئیہ سے معلوم کرتا ہوں۔“ وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

شاہ جہانگیر خود کو نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے میں لگ گئے جبکہ ان کی

تھے۔

”کون میمونہ بھابی! السلام علیکم!“

”پلیز زرا آئیہ کو۔“

”سوری، رنگ نمبر“ کھٹناک سے فون بند ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر کتنی دیر بے یقینی کی حالت میں کھڑا رہا پھر ریسورسز کر شاہ جہانگیر کی طرف پلٹا تو انتہائی دکھ اور غصے بولا۔

”آپ میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں پھلا لگتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

دند بھابی کا فون بند کر دینا اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا کہ سبب صرف اس کا شاہ پور آنا نہیں ہو سکتا بلکہ یقیناً ”بابا“ نے عدیل بھائی سے اور بھی بہت کچھ کہا ہو گا، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عدیل بھائی یہاں کس سلسلے آئے تھے کیا انہیں اس پر کوئی شبہ ہوا تھا یا کوئی اور بات۔ اور بات کوئی بھی ہو، اس کے لیے اب صورت کو سمجھانا مشکل ہو گیا تھا۔

یہ کس بارے میں سوچنے لگا کہ اس کے پہلے سے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ جو اس نے آپ سے بڑھ کر اعتبار کرتی تھی، کس بری طرح ٹوٹی ہوگی۔ اور جانے اب وہ دوبارہ اس کا اعتبار حاصل کیے گی یا نہیں۔ معاہدے بابا جان کی بات یاد آئی، خود ابھی کچھ دیر پہلے شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔

”نہیں جس کام سے کراچی جانا تھا وہ یہیں ہو گیا اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے بابا جان اور جہانگیر بھائی نے پوری حکمت عملی سے میرے لیے جال بنا ہے اور میں ایک بار۔“ وہ بری طرح چلر اٹھا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

بند کمرے میں جانے کیا باتیں ہوئی تھیں کہ ناشتے کے بعد اب کھانے کی بھی کسی کو پروا نہیں تھی۔ میمونہ می ایک ایک کمرے میں جھانکتی پھر رہی تھیں۔

باندھ کر لپٹے بڑے تھے۔

بانی شمع کے دانے گن رہی تھیں۔

وہ سچے جو گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی تو اب تک اسی حالت میں تھی ذہن میں شاہ سکندر کے سنگ ارا ایک ایک پل اپنی تمام تر جزئیات سمیت ایک تسلسل سے ابھر ابھر کر مٹ رہا تھا اور وہ کہیں گرفت نہیں رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود سے نہیں سوچ رہی تھی، بس اپنے آپ فلم سی چلنے لگی تھی جس کا دورانیہ بہت لمبا بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا ایک سال جو اس کی زندگی ہی بدل گیا تھا۔ اپنی محبتیں اتنی چائیں جن میں ہر کہیں کھوت نہیں تھی اور وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جن محبتوں پر وہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی ہے شاہ سکندر پہلے ہی کسی کو دان کر آیا ہے۔ اس کے بعد بھی اتنا زعم۔

میں تمہارے دل میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں، جہاں مجھ سے پہلے کوئی تھا نہ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔“ یہ بخت اپنی جگہ مسلم تھی لیکن اس کے دل اور زندگی سے کھیلنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔ وہ اتنی نادان اتنی۔

نستو بھی نہیں تھی پھر اتنی آسانی سے اس کے جال میں کسے پھنس گئی۔

”آئیہ!“ میمونہ بھابی دیر سے اس کا کندھا ہلکا کر بولیں ”سارے گھر میں ایسی خاموشی چھائی ہے کہ اب غدار لگے گا۔ خدا کے لیے تم ہی کچھ بولو۔“

مضمون پر سے ٹھوڑی اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آئیہ نے دست دیکھو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“ میمونہ بھابی اس کے سامنے ٹھٹھے ہوئے بولیں ”کچھ بولو اور تمہیں شاہ سکندر کو گالیاں ہی دو۔ کم از کم تمہارا جود تو تو نے اور یہ بہت ضروری ہے ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

”کیا تمہیں ذرا سی سٹھی نہیں جیسے کہہ رہی ہو اور کیا نقصان۔“

”نہیں مجھے بالکل نہیں معلوم کہ صبح اماں جی کے کمرے میں ان سب کے درمیان کیا طے پایا ہے۔ خلیل

آفس جاتے جاتے مجھے صرف اتنا بتا گئے ہیں کہ شام کی فلائٹ سے ٹھیک بھائی اسلام آباد سے آ رہے ہیں۔ مطلب ہے، انہیں اباجی نے فوراً بلوایا ہو گا اور میں چاہتی ہوں ان کے آنے سے پہلے پہلے تم اپنے آپ کو لوٹا کر تمہارے اور شاہ سکندر کے بارے میں جو بھی باتیں ہوں۔ تم ان میں شریک ہو سکو۔ میری بات سمجھو۔ ”میمونہ بھابی نے بہت سنجیدگی سے اسے آنے والی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ بولے۔ ”اب کیا باتیں ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف تھا۔

”شاہ سکندر کے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس سے تمہارا ناتا ٹوٹ تو نہیں گیا میری جان! ابھی تو تم امتحان اور بھی ہیں۔“

”میری عزت نفس داؤ پر لگی ہے بھابی! میں سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی۔“ وہ رو پڑی۔

”اور آپ چاہتی ہیں میں بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر اس شخص کی حمایت کروں جس نے انہیں یہ گالی دی اگر وہ سامنے ہوتا تو خون خرابائی تھی۔“

”کیا اس نے خود۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا کہا ہے اس نے؟“ ”میمونہ بھابی نے پوری توجہ سے اسے دیکھا۔

”پہلے یہ بتائیں، عدیل بھائی کو سکندر کے شادی شدہ ہونے کا کیسے پتا چلا؟“ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”عدیل کل شاہ پور گیا تھا۔ اصل میں تمہاری بے ہوشی سے ہم یہی سمجھے کہ خدا نخواستہ شاہ سکندر کو کوئی حادثہ وغیرہ ہو گیا ہے اس لیے عدیل فوراً اس کی خبر لینے روانہ ہو گیا تھا اور شاید وہیں سے معلوم ہوا یہ سب کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا بلکہ مجھے تو یقین بھی نہیں آ رہا۔“ ”میمونہ بھابی نے اس کی بات کا جواب کے ساتھ کہا۔

”میں بھی خود کو فریب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید سکندر کے بابا جان نے مجھے اس سے متفرک لیے ایسی باتیں کیں لیکن۔۔۔“

”تمہاری اس کے بابا جان سے کہاں بات ہوئی؟“ ”میمونہ بھابی درمیان میں بول پڑیں۔

”میں نے شاہ پور فون کیا تھا بی بی جان سے بات کرنے کے لیے۔“ اس نے اپنے فون کرنے کا بتا کر بابا جان ہونے والی گفتگو بھی کہ سنائی تو میمونہ بھابی بھی چکر اُگتی تھیں۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ اور مجھے لگتا ہے عدیل سے بھی انہوں نے ایسی ہی باتیں کی ہوں گی جب ہی تو وہ اتنا ہو رہا ہے پتا ہے رات جب وہ آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر رڑ گئی تھی۔“ ”عجب وحشی سالک رہا تھا۔“

”میمونہ بھابی تاسف کے اظہار کے ساتھ بولیں تو وہ سہم کر پھر رونے لگی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بھابی! میری وجہ سے میرے بھائی خدا نخواستہ اگر کسی کو کچھ ہو گیا تو میں کب معاف نہیں کروں گی بلکہ میں نہیں چاہتی کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“ ”وہ روتی ہوئی بے ربط بول رہی تھی۔

”میمونہ بھابی ایک دم پریشان ہو گئیں۔ ”بمشکل اسے چپ کرایا پھر بڑی سستی اٹھا کر واش روم میں لے گئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی کٹی تو اس کے لیے کھانا لے آئیں اور خاصے رعب سے کھنے لگیں۔

”دیکھو، کھانے سے انکار مت کرنا۔ مجھے پتا ہے اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ ان فونوں! بھوک زیادہ لگتی ہے۔ چلو کھاؤ شاباش۔ میں جب تک چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے خاموشی سے جاتے ہوئے دیکھا پھر بڑے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شام تک گھر میں ایسی ہی خاموشی اور کشیدگی تھی۔ جانے کیوں اماں جی اور اباجی بھی اس کے کمرے ٹہ آئے تھے اور وہ خود بھی ان کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی گو کہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں

وہ مجرم سی بنی ہوئی تھی۔ شاید اس کا جرم محبت تھا جس نے اسے رسوا کر کے اس کی ہستی کا غور جھین لیا تھا۔ وقت کی بات ہے، کبھی اسی محبت نے اسے اتنا اعتماد بخشا تھا کہ وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی جس کی اب تک کی زندگی میں کہیں کسی دکھ، کسی محرومی کی پرچھائیں تک نہیں بھی پھرا جائے کسی کی ٹہنھی کی وہ اندر ہی اندر نوٹی جا رہی تھی اور کوئی سارا دینے والا نہیں تھا۔

قلیل بھائی کی آمد پر خاموشی میں قدرے پلچ بچ گئی۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میمونہ بھابی نے کھانا کھانے کا دعوت دی تھی کہ جہاں اس واقعے کو چھیڑا گیا، کھانا رہ جائے گا۔ اس لیے کھانے کے دوران بھی وہ ٹھیک اسے سہا بھابی کی خیریت اور ان کی دیگر مصروفیات کے بارے میں پوچھ کر ایک طرح سے سب کا دھیان دیتی رہی۔ آخر میں کہنے لگیں۔

”میں اور بچوں کو بھی لے آتے تو کچھ رونق ہو جاتی۔“

”باقاعدہ پروگرام کے تحت آتا ہے اسے لے کر آتا۔“ ٹھیک بھائی کہنے لگے۔ ”وہ تو صبح اباجی نے فون کر کے بس آئے گا کہ تم کچھ پریشان کر دیا۔ اباجی ایسی کیا بات تھی۔ اس طرح کیوں بلایا مجھے؟“

”بس وہ تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ خیر پہلے تم کھانا کھاؤ۔ آرام سے پھر بات کریں گے۔“ اباجی اس وقت سے طے حال رہے تھے۔

بھائی نے باری باری سب کو دیکھا۔ کسی کے چہرے پر وہ پہلے جیسا اطمینان نظر نہیں آتا۔ اور ٹھنک تو وہ اسی تھے۔ ”جب اباجی نے فون پر انہیں فوراً آئے کو کھانا اور کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ اگر کبھی بھی وقت فارغ نہ تو کچھ نہ کچھ ضرور قیاس کرتے لیکن سارا دن آفس میں اس قدر مصروفیت رہی کہ اس طرف دھیان ہی آیا تھا، ہر حال اب ان سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے کیا مشورہ کرنا ہے اباجی! اب پتا بھی رہتا ہے۔“

”نئے ٹھیل اور عدیل کے بعد اماں جی کو دیکھا تو وہ ایک دم رو پڑیں۔

”بیٹا! ہم نے آج ہی شادی میں بڑا دھوکا کھایا۔ وہ سکندر پہلے سے بال بچوں والا ہے۔“

”جی نے بہت واضح انکشاف کیا تھا پھر بھی ٹھیل بھائی یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچھ نہ پائے ہوں۔ کتنی دیر بعد بولے۔

”پھر میرا مطلب ہے، کیسے معلوم ہوا آپ کو؟“

”لیکن باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔“ اباجی بہت مضبوط سے گویا ہوئے۔

”وہ تو ٹھنک ہے لیکن شاہ سکندر کیا کہتا ہے؟ کیا جواز بتاتا ہے اپنی دوسری شادی کا؟ پہلی بیوی مر چکی ہے یا اس وقت جلائے کے قابل نہیں۔“

”خوار کوئی بھی ہو ٹھیل بھائی! ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔“ عدیل کے اندر پکٹا لاوا پھٹنے لگا تھا کہ اباجی انہیں روک دیا۔

”تم خاموش رہو عدیل! جذباتیت کا مظاہرہ ہمارے اپنے حق میں بہتر نہیں ہو گا“ اس لیے کہ ہم بیٹی والے

میں ہماری عزت و ناموس گروی نہیں رکھی۔“ عدیل دبے لہجے میں چیخ پڑے۔

”نہیں ٹھنک کر رہا ہے۔“ ٹھیل بھائی ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹی والے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بیٹی عزت و قیمت کو گہری نیند سلا کر کھ پکٹی بن کر رہ جائیں۔ آپ ٹھیل بھائی کو صاف صاف بتائیں کہ

”میں نے بتا دیا ہے۔“ ”تم مجھے بات تو کرنے دو۔“

”سننا تو بہت ہو کر ٹھیل کو دیکھا پھر قدرے رک کر ساری بات کہ سنائی جس کے بعد طویل خاموشی تھی۔

اماں جی چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔
میسونہ بھابی بیٹوں بھائیوں کے چہرے دیکھ کر اندر ہی اندر رسمی جاری تھیں۔

اور اباجی کی بوڑھی آنکھوں میں التجا تھی۔ (کوئی ایسا صلہ سوچو کہ تمہاری غیرت کے ساتھ میری بیٹی کا سلامت رہے۔)

”آسیہ کہاں ہے؟“ کتنی دیر بعد ٹھیل بھائی کی سوچوں میں ڈوبی آواز نے خاموشی کا سینہ چاک کیا۔

”اپنے کمرے میں۔“ میسونہ بھابی کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ بمشکل سنائی دی۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ ٹھیل بھائی کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہتے ہوئے اٹھ کر آسیہ کے کمرے کی چل پڑے تو ان کے پیچھے غلیل اور عدیل نے فوراً تقلید کی جب کہ اباجی، میسونہ بھابی اور اماں جی کو دیریں اشارہ کرتے ہوئے اٹھ آئے تھے۔

”آسیہ!“ ٹھیل بھائی نے دروازے میں رک کر گم صم بیٹھی آسیہ کو پکارا تو وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ اٹھ نہیں سکی۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بیٹا! خدا انخواستہ کوئی۔“ ٹھیل بھائی نے آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو آنکھوں کے پائے لبریز ہو گئے جس پر وہ فوراً ”نوتے ہوئے بولے۔

”خبردارو نا تمہیں؟ تم بہت ہمار لڑکی ہو اور مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ کیا تم شاہ سکندر کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو؟“ ان کی زبان رکھیں کہنے سے قاصر تھی۔

آسیہ کے لبریز پائے پھٹک گئے۔

”تم از کم ہم بھابیوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی آسیہ! اثبات میں سر ہلانے سے پہلے ہم سب کوڑھ دیتا۔“ عدیل کسی طرح خود پر قابو نہیں رکھ پارے تھے۔

”نہیں۔“ وہ ٹھیل بھائی کے بازو سے پیشانی ٹکا کر سسک پڑی

”خدا کی قسم نہیں۔ میں زندہ رہوں گی تو اپنے ازل و قار کے ساتھ۔“

”یہی تمہارا حق ہے بیٹا۔“ ٹھیل بھائی نے بیٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگایا پھر اباجی کو بیٹھنے کا اشارہ ہوئے کہنے لگے۔

”اباجی! گو کہ شاہ سکندر نے ہمیں دھوکا دیا ہے پھر بھی اگر وہ آسیہ کے ساتھ فہو ہے تو اس کے کھوپڑیاں لٹکایا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہماری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو لے کر آئے۔“

”ہاں جب تک شاہ حیات محمد خود آکر آسیہ کو اپنی بہو تسلیم کر کے لے جانے کی بات نہیں کریں گے یہاں سے نہیں جائے گی۔“ غلیل بھائی نے بھی فوراً ”تائید کر کے فیصلہ سنایا۔

اور عدیل کے اندر رجتے لاؤ پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینے پڑنے لگے تھے۔ اباجی نے پر سوچ انداز میں ہارٹی تپوں بیٹوں کو دیکھا پھر اسی انداز میں اثبات میں سر ہلایا، تب ٹھیل بھائی آسیہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے لگے۔

”بیٹا! تم بڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ رونے دھونے سے مسئلہ حل ہوتے۔ شکر کرو ابھی حقیقت سامنے آگئی ہے، بہر حال مجھے یقین ہے شاہ سکندر آج کل میں ضرور تم سے ملے گا اور تمہیں اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

اس نے دھیر سے سر جھکا لیا تھا۔



”بی بی جان! میں کچھ دنوں کے لیے کراچی جانا چاہتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے بہت سوچ کر ”کچھ دنوں کے

نہاں ہو کہ اب حالات اسے سب کشتیاں چلانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔
”کیوں؟“ بی بی جان کے منہ سے انداز پر وہ چیخ کر بولا۔

”میں جانتی ہوں وہاں میرا گھر ہے بیوی ہے۔“

”میں جانتی ہوں لیکن باقی نہیں ہوں۔ باقی میں صرف مہر النساء کو ہوں اور بار بار اسے چھوڑ کر جانا تمہارے حق ٹھیک نہیں ہے۔“

”مجھے تو اب کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا، یہاں وہاں دونوں طرف لگتا ہے زندگی میرے لیے تنگ ہو گئی۔ بہ اور نے کبھی اپنی ٹھکان برداشت نہیں کی۔ آپ جانتی ہیں پھر آپ سب ایسے حالات پیدا کر کے میری موت کا کیا کر رہے ہیں؟ کیا واقعی میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں اگر ایسی بات ہے تو میں خود اپنے آپ کو لیتا ہوں۔“

”بکیرہ خاطر ہو کر اتنے ٹھوس لہجے میں بولا کہ بی بی جان ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”میں چاہتا تو آپ کو بتائے بغیر بھی جاسکتا تھا لیکن میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ آپ بے شک آسیہ کو

انہ کریں لیکن مجھے اس کے پاس جانے سے روکیں بھی نہیں۔ مجھے اس کے وجود سے زندگی کا احساس ملتا ہے۔ اتنے دن اس کے بغیر میں پتا نہیں کیسے رہا ہوں۔ مجھے جانے دیں۔“ وہ روٹنے اور ضدی لہجے میں بول رہا تھا۔

”بی بی جان سے پوچھ لیا ہے؟“ بی بی جان کو اس پر رحم آیا بھی تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں آپ بتا دیتے گا۔“

اور آگے کہہ کر؟“ بی بی جان نے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”آہ ہوں گا۔“ اس نے ڈیوٹی اختیار کی۔ ”میں اسے چھوڑ سکتا ہوں نہ آپ کو، اور آپ کی خاطر میں

ماء کے حقوق بھی تسلیم کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ ماں ہو کر میں بہر حال مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ میں آپ کی تجویزی سمجھتا ہوں، یہاں سیاہوسفید کی مالک ہو کر

جان کے سامنے بالکل بے اختیار ہیں آپ؟“

”ہاں کچھ نہیں بولیں خاموشی سے دیکھتی رہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔“ وہ ان کی طرف جھک کر بولا اور جب تک بی بی جان نے اس کے سر پر

ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ پھر جلد آنے کا کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تو اس کے قدموں میں تیزی سے راہدار کی اختتام پر اچانک مہر النساء نے سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تو وہ کسی طرح اپنی ناگواری

میں نکلا۔

”یاد بات ہے؟“

”تیزی میں کہاں جا رہے ہیں؟“ تنفر سے بھری مہر النساء نے اس سے زیادہ ناگواری کا اظہار پیشانی پر بے نیس ڈال کر کیا۔

”میں اس سے کیا میں کہیں بھی جاؤں۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”بی بی جان! آپ کی بوجھنے کا حق رکھتی ہوں۔ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں اور۔۔۔“

”آسیہ!“ وہ ٹھکانا کر پڑا۔ ”ہٹو سامنے سے۔“

”اس کا راستہ سے بنائیں گے شاہ! میں تو ہر راستے پر ملوں گی۔ بتاؤ نا اس حرامزادی کو بھی۔ مہر النساء کوئی

”میں۔“ وہ انتہائی طیش میں آکر اس پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گئی اور اسے دیکھ کر

”یہ فتنہ لگانے لگی۔“

”یقیناً“ پاگل ہو گئی ہو؟“ وہ نفرت سے کہہ کر بہت تیزی سے باہر نکلا تھا۔

جب اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں قدم رکھا، اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ تمام لائٹیں آن کر کے لیے ساری کھڑکیاں کھول کر اس نے پردے سمیٹ دیے۔ اتنے دن بند رہنے کے باعث کمروں میں محض کچھ ناگوار سی منک میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بالکونی میں نکل کر ٹھنکے لگا۔ ساتھ ساتھ گہری سوجن تھا جب اس کے خیال میں آسیر نماز سے فارغ ہو چکی ہوگی تب اندر آکر اس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے اندر بہت خائف ہو رہا تھا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی ریسپونڈ اٹھا تو اس نے فون رکھ دیا۔ شاید راگن جو حوصلہ نہیں تھا۔ کتنی دیر خود کو سمجھانے کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیے تو دھڑلے سے حسب سابق میسج بھجوا کر سنائی دی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مجرا نہ سے انداز میں سلام کیا تھا۔
”وعلیکم۔“ جواب مختصر سی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ فون بند نہیں ہوا تھا۔



”کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر نے بہت چاہا کہ اپنے اسی پرلے انداز میں بات کر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سنو کہاں ہوتے ہو آج کل؟ میمونہ بھابی کا مقصد اس وقت کچھ جانا تھا بلکہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اور اپنی دھن میں بول رہی تھیں۔

”ہمیں ہوں۔ آپ کے ٹھہرے، فیملی مطلب ہے بس ابھی پہنچا ہوں۔ آسیر کہاں ہے؟ میمونہ اچھے موڈ سے حوصلہ پا کر اس نے فوراً آسیر کا پوچھا۔

”آسیر۔ اپنے کمرے میں ہے۔ بلاؤں؟“

”جی، بڑی مہربانی ہوگی۔“ وہ بے تابی سے بولا اور پھر اسی بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ گھڑی کی گھم کے ساتھ اس کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جانے کتنے بیل۔ بیت گئے۔ وہ اس کی آواز چاہتا تھا لیکن اس کے برعکس دوبارہ میمونہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔ شاہ سکندر!“

”جی!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”وہ آسیر نہیں آ رہی۔ کیا کر رہی ہے؟“

”کیوں؟ کیوں نہیں آ رہی۔ کیا کر رہی ہے؟“

”کچھ نہیں اور بہتر ہے کہ ابھی آپ اسے نہ جھجھیں۔ میمونہ بھابی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر ریسپونڈ کو دیکھتا رہا پھر کڑل پر سوج کر اُدھر سے اُدھر ٹھنکے لگا تو دھیرے دھیرے اندر کا زہم بدمار ہو کر تمام خدشات پر حاوی ہوئے لگا تھا۔

”کوئی گناہ کیا ہے میں نے جو منہ چھپا کر پھروں۔ اگر اسے میری پہلی شادی کا معلوم ہو گیا ہے تو ہونا چاہیے کہ کن حالات میں ہوئی۔ اور اسے میری ہر بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کے ماتہ نہیں کی، نہ دھوکا دیا ہے۔ اس کی ناراضگی بھائی میں اسے منانے کا حق رکھتا ہوں۔“

اس نے رُک کر ریسٹ واپس پر نظر ڈالی۔ پھر ایک پل میں فیصلہ کر کے گاڑی کی چابی اٹھالی۔

میں شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ واپسی میں آسیر بھی اس کے ساتھ پھر اسی احساس میں گھر کر اس نے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور بیل کا مین دیا یا تھا۔

گیٹ کھولنے آجاتی آئے تھے اور اسے دیکھ کر فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خوش آمدید

روسی۔ ”اس نے اپنے بیٹہ والے انداز میں سلام کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا آیا تو تاجی

”جی!“ اس نے رُک کر دیکھا پھر ان کی تقلید میں ڈرائنگ روم میں آتے ہی پوچھا۔

”آسیر کیا کام ہے؟“ تاجی کے بھنبے ہوئے چاٹ بچے پر وہ نظر میں پڑا گیا۔

”میں بیٹے آیا ہوں اسے۔ بہت دن رہ گیا اس نے آپ کے گھر طبیعت کیسی ہے اس کی؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہے۔ تم بیٹھو۔ کیا پیو گے۔ چائے یا؟“

”جی شکریہ۔ بس آپ جلدی سے آسیر کو بلا دیں بلکہ میں خود لاؤں اس کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھا

تاجی ایک دم سامنے آکر بولے۔

”آسیر! میں آ رہی ہے۔“

”جی۔“ وہ جیل سے باہر فوراً ایٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور تاجی کے کمرے سے نکلنے کے بعد دروازے کی

دیکھنے لگا جہاں سے کچھ دیر بعد جیسے ہی آسیر اندر داخل ہوئی وہ اٹھتے ہوئے بے تابی سے بولا۔

”آسیر۔ کیسی ہو؟“

”آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کی بے تابی کیسے نظر انداز کر گئی۔

”یہ گھر چل کر تباہی لگا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ تیاری کیا کرنی ہے بس کہہ آؤ اماں جی اور تاجی

اور اپنے گھر جا رہی ہو۔ وہ یوں بولا جیسے وہ سچ سچ اسی انتظار میں کھڑی ہو۔

وہ بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ، جو بھی بات ہے، ہم گھر چل کر کریں گے۔ میں تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ سچ

بتاؤں گا۔ اس کے بعد تم خود فیصلہ کرنا۔“ وہ ایک طرح سے ہتھیار ڈال گیا۔

”فیصلہ ہو چکا؟“ آسیر کے بے تاثر بچے پر وہ ٹھنک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ جھوٹ نہ سچ۔ اس کے باوجود میں آپ کے گھر جانے کو تیار ہوں لیکن

اور نہیں پہلے آپ کو اپنے بابا جان اور بی بی جان سے نہ صرف اجازت لی جانی ہے بلکہ وہی اگر مجھے یہاں

سے ہاسٹے ہیں تو اس کا جتنی لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہ گیا پھر قدرے جھجکا کر بولا۔

”ابھی اگر ناہوتا تو پیٹل آئے اور میں نے تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ وہ میری تم سے شادی پر قطعی رضی

نہیں۔ اسی لیے میں سب کر چھوڑا تھا۔“

”اور ساتھ میں یہ عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ مجھے تسلیم نہیں کریں گے آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“ وہ

تو قہر سے دہاں جانے سے خفا ہو گیا۔

”نہیں۔ میں ایسی کسی بات پر خفا نہیں ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں آپ خوشی سے وہاں نہیں گئے ہوں گے

اور میری ہی آپ کو لے گئی ہوگی اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے سر

پر کھائے ہوئے اور نہ ہی اپنی عزت و وقار کو کھو سکتی ہوں۔ میری انا خود داری مجھے اس بات کی اجازت نہیں

کیا۔ یہ محبت میں سب کچھ داؤ پر لگا دوں۔“ وہ بہت مضبوط سے منہ پر ہنسنے لگی۔

”کچھ نہ کہہ رہی ہیں کہ میں محبت میں شکست کھاتا رہا رہی ہوں۔ مجھے مہر النساء کی سوکن بننا منظور ہے لیکن

نہ راب تو شاہ سکندر۔ اگر آپ کے بابا جان نے مجھے سزا خانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں اپنی نظروں میں گر گئی

اور اب تو شاہ سکندر۔ اگر آپ کچھ بھی دے دیں گے کہ زندگی بھر شاہ پور اور اس کے مکینوں سے آپ

معاذ اللہ نہیں رکھیں گے تب بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مجھے لے جانا ہے تو بابا جان کو لے کر

آئیں۔ میرا مقصد انہیں اپنے یا اپنے گھر والوں کے سامنے جھکا کر نہیں ہے۔ میں تو بس بقیہ زندگی جیسے کا حق اور مان چاہتی ہوں۔ اگر آپ انہیں لاکھیں تو ٹھیک ہے ورنہ مجھ لیں آسیر مرگئی یا وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی تو وہ جو۔ سناٹے میں گھبراہٹا ایک دم جیسے عورتوں میں آکر اکر لپکاتا لیکن وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

آسیر! آسیر! میری بات سنو! وہ اس کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ اور لمحہ بہ لمحہ اس پر دھوا مار رہی ہو رہا تھا۔ اگر اپنے گھر میں ہوتا تو دروازہ توڑ ڈالتا۔

آسیر نے جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔

”تم غلطی کر رہی ہو آس! بابا جان نے اگر تمہارے لیے ناز کیا الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس کی عزت مت دو۔ تم میرے اور میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہم مل کر کچھ سوچ سکتے ہیں۔ میری باز رہی ہوتاں؟“ وہ اسے مانے کیا باور کراتا چاہ رہا تھا۔

”وہ آپ کی بات نہیں سننے لگی شاہ سکندر!“ عتب سے عدیل بھائی نے اسے مخاطب کیا تو وہ ان کی طرف پلٹ کر بولا۔

”کیوں نہیں سننے لگی؟“

”اس لیے کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ عدیل بھائی جو اول درجہ بہت اہمیت دیتے آئے تھے۔ آج انہی نے کھڑے کھڑے۔“

وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر قدرے طنز سے پوچھنے لگا۔

”یہ صرف اس کا فیصلہ ہے یا؟“

”ہم سب کا۔ عدیل بھائی کوئی رعایت رستے کو تیار نہیں تھے۔“

”پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ لوگ اپنی بہن کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ والدین یہاں نہیں آئیں گے۔“ اس کا زعم عود کر آیا۔

”اور آپ کب تک بہن کو اپنے پاس بٹھائے رکھیں گے۔ سال دو سال۔ دل بھر جلنے تو میرے دہرچھوڑ جائیے گا کہ میں اس پر اپنے دروازے بند نہیں کر رہا۔“

عدیل بھائی کی پیشانی پر شگفتوں کا جال بچھ گیا اور ابھی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن وہ جیتر قدموں سے ہار

”میں نے عدیل کو منع کیا تھا شاہ سکندر کے سامنے نہیں جلنے لیکن اس نے میری بات نہیں مانا۔ بتاؤ معاملہ اور بگڑ گیا کہ نہیں؟“ آبا جی بہت فکر مندی سے آماں جی سے کہہ رہے تھے۔ ”وہ صاف ہے کہ اس کے ماں باپ یہاں نہیں آئیں گے اور ایسا اس نے صرف عدیل کی ضد میں کہا ہے۔“

”کیا کرے عدیل، اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ جوان خون ہے۔“

”برداشت تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ ہم میں سے کسی کی مداخلت شاہ سکندر کو ضد دلا سکتی ہے۔ بڑا میاں بیوی کا معاملہ نہیں ہے۔ پھر بھی ابھی حرف آسیر کو بات کرنے دو۔ وہی اسے غصے سے بچا۔“

”طرح سمجھا سکتی ہے اور وہ عدیل کہاں ہے۔ عدیل!“ آبا جی نے آماں جی کو سمجھاتے ہوئے کہا پھر عدیل کو پکارا تھا۔

”جی آبا جی! عدیل ان کی پہلی پکار پر آئے تھے۔“

”تم نے اچھا نہیں کیا بیٹا! انہیں شاہ سکندر سے معافی مانگنی ہوگی۔“ آبا جی نے چوہوتے ہی کہا تو وہ کمر بولے۔

”کس بات کی؟“

”اپنے رویے کی۔“

میں نے ایسا کوئی بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا آبا جی۔ پھر بھی میں معافی مانگ لوں گا لیکن اس وقت وہ اپنے ماں باپ سے آسیر کی حیثیت تسلیم کر دیا کہ اسے ساتھ لے جلنے کا۔ اس سے پہلے معافی مانگنے کا وہ اپنے آپ کو اپنی شرط واپس لے لی جو کہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ صرف ان دونوں میاں بیوی کا ہے۔ عدیل بھائی بہت رसान سے بولے کہ کیا انہوں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اور ابھی وہ کچھ غلط نہیں ہے۔ تھے جیسی آبا جی نے ان سے اختلاف نہیں کیا لیکن ان کی تشریحات اپنی جگہ تھی۔

”مہر ہے جیسا بنا، ہمیں بہت سنبھل کر چلنا ہے۔ ضد میں تو معاملہ مزید بگڑتا جائے گا۔“

”مہر بھی بنا، ہمیں بہت سنبھل کر چلنا ہے۔ ضد میں تو معاملہ مزید بگڑتا جائے گا۔“

”ہماری ضد نہیں ہے آبا جی اور اگر شاہ سکندر نے اسے۔“ آسیر کے آنے سے انہوں نے بات وہیں ہی رکھ دی اور سوائے نظروں سے دیکھنے کے تو وہ آماں جی کو مخاطب کر کے بولی۔

”آماں جی! کھانا لنگ گیا ہے۔“

”ہاں ملو۔ پہلے کھانا کھا لیں۔“ آبا جی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مقصد اس پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہاں کسی دھڑکنے پر بات نہیں ہو رہی۔

”مہر کھانے کے دوران عدیل بھائی نے میمونہ بھابی کے ساتھ مذاق شروع کر کے ماحول کو خوشگوار بنایا تھا۔“

”نظر میں آماں جی کا رنگ بدل گیا۔“

”نہت اترائے گئے ہو۔ آماں جی اب اس کی جلدی سے شادی کر دیں۔ نا ملکی اتنی انتظار میں ہوں گی کہ وہ ہم گئے نہیں۔“ میمونہ بھابی نے۔

”عدیل کو چھوڑتے ہوئے آماں جی کو یاد دلایا تو وہ بگڑ

”رک رہی ہیں انتظار! ہمیں اب نہیں جانا ان کے ہاں۔“

”کیوں آماں جی! وہ آسیر نے بے اختیار پوچھا تھا۔“

”انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ جانے کس جھوٹا بدلہ لیا۔ بیٹی رکتے ہوئے بھی انہیں خیال نہیں آیا کہ۔“

”بس کون آماں جی! آسیر نے پریشان ہو کر کہیں ڈکا پھر کہنے لگی۔“ میرا نہیں خیال کہ انہیں شاہ سکندر بدلے میں زیادہ کچھ معلوم ہو گیا کہ ان کے گھر سے سبھی کوئی شاہ پر نہیں گیا۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو نہیں ہی پکڑوں گی کیونکہ وہی سکندر کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ آماں جی غصے سے شامی تھیں۔“

”ہم کسی کو الزام نہیں دے سکتے عدیل کی ماں! یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ تم بے شک عدیل کی دواں سے ختم کر دو لیکن یہ جواز مت رکھنا۔ آبا جی نے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا تو عدیل بھائی ان کی رکتے ہوئے بولے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آبا جی! ہم اپنا بدلہ ان سے کیوں لیں جن کی شاہ سکندر سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ پھر جتنا نہیں سکندر نے انہیں کیا کہا فی سانی ہے۔ اور آماں جی آپ خود سے تو کوئی بات نہیں کی تھیں۔ ہوسکتا ہے انے والے وقت میں ہمیں یہ ساری باتیں چھپانی پڑیں کیونکہ سکندر بہر حال آسیر کو دلا دیا ہے اور داماد کیسا بھی خود ڈنبا کے سامنے اس کی تعریف ہی کی جاتی ہے۔“

”آسیر کو اپنے دل کی بات میں پہلے سنائے گا شدت سے احساس ہوا۔ بہت خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ میں فی آماں جی غلطی سے بولیں۔“

”یہ کیا باتیں ہے مجھے بوم لوگ۔ ختم کرو۔ میری بیٹی پریشان ہو جاتی ہے۔“

”پریشان تو ہوئی لیکن اسے یہ سب کچھ خود فیس کر ملے۔ اس لیے کوئی بات اس سے چھپانی نہیں جاسکتی۔“

”جی جی! کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد آماں جی اور ان کے چچے آبا جی اٹھ کر چلے گئے تو میمونہ بھابی برتن لے کر بولیں۔“

”بہت بڑبڑ ہوگی۔ یعنی اب جب تک آسیر کا معاملہ سیٹ نہیں ہوگا تمہاری بات آگے نہیں بڑھے گی۔“

وہیے اگر تمہیں جلدی ہو تو میں تمہارے لیے کوئی اور لڑکی دیکھوں گا۔
 ”کوئی نام نہ نہیں۔“ عدیل بھائی ان کی شریر مسکراہٹ سے قدرے جھینپ کر بولے۔
 ”کیوں؟“
 ”اس لیے کہ شادی میں آسہ کی سینک کے بعد ہی کروں گا۔“ انہوں نے کہا تو میمونہ بھالیہ
 دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔
 ”جکی بات ہے۔“
 ”جناب۔“

”میرزا ند ہی ٹھیک ہے۔ میمونہ بھائی ان کے دل کی بات کہہ کر اُن کو کھڑی ہوئیں۔ پھر مارتا
 کر پوچھنے لگیں۔ ”تمہاری کبھی نام نہ سے بات ہوئی ہے؟“
 ”کیوں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”نہیں ہوئی تو فون کر لیا کرو۔ انڈر اسٹینڈنگ ہو جانے کی یہ میمونہ بھائی نے ان کا کیوں نوا
 مشورہ دیا تو وہ ہنس پڑے۔
 ”خلیل بھائی سے آپ کی اسی طرح انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی؟“
 ”تو یہ کرو۔“ میرزا ند گنتی کے بعد سے شادی ہونے تک سارا وقت اسی انتظار میں گزارا کہ میمونہ
 بھلیکی ہی فون کر دیں لیکن یہ تو جیسے قسم کھا کر بیٹھ جیتے کہ شادی ہونے پر ہی بات کریں گے۔ میمونہ
 بڑا سامنے بنا کر بولیں اور ان کے مزید ہنسنے پر چرچا لگیں۔
 ”سارے بھائی ایک جیسے ہوتے۔“

شاہ سکندر بالکل عام مردوں کی طرح سوچ رہا تھا کہ اُس کی بیوی نوا ان سے جو بھائیوں
 میں آگئی ہے (حالانکہ اُس کی ذہانت کا وہ ہمیشہ سے معترف رہتا تھا) اور یہی مردوں کا شیوہ ہے۔
 بند کر کے ہر بات کا اعتبار کرتی رہے تو یہ اس کا اپنا عمل، جہاں کسی بات پر گرفت کی سارا الزام
 والوں پر آتا ہے۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اُس کی طرح بھی اُس سے متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر
 اُس کی دل بھنی یاد آزاری کیسے تو وہ اُس کے سامنے افسوس کا اظہار کرتی لڑتی جھکوتی اور میرزا
 زیادہ آئندہ اُسے شاہ پور جانے سے روک دیتی لیکن بابا جان کے آنے کی شرط وہ بھی نہیں رکھتی
 کے خیال میں کسی مقام پر اُسے جھکا نا یا بے بس کرنا اُس لڑکی کے اعتبار ہی میں نہیں ہے اور اب
 کے سامنے وہ مجبور ہو گئی ہے لیکن زیادہ دل نہ یہ مجبوری کی ذبح نہیں ہیں نہیں بے شک کیونکہ اُس
 مضبوط اور زور آور اُس کی محبت ہے جس کے کھینچنے سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور اُس
 پر میرزا وساطت نہیں تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اور بھی غم ہیں زلمے میں محبت کے سوا۔ بہر حال اگ
 اُس نے مشکل خود پر جرح کیا۔ اس کے بعد دل تو جا کا خود جا کر اسے سب کے درمیان میں ہے
 لے آئے لیکن عدیل بھائی کو وہ جو جواب دے کر آیا تھا اُس کے بعد دوبارہ جانے کے خیال سے
 اپنی جھک محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے مجبوراً فون کا سہارا لینا پڑا۔ اور پھر سارا دن وقفہ وقفہ
 نمبر ڈائل کرتا رہا۔ اُدھر سے ایک ہی جواب ملتا۔ ”وہ بات نہیں کرنا چاہتی۔“ جس سے پہلے وہ مجھ
 طاری ہوئی۔ آخر میں انتہائی غصے میں آکر اُس نے لیلی فون سیٹ اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اُس
 تک منفی سوچیں اُسے کسی انتہائی اقدام پر اکساتی رہیں۔

”کیا حیثیت ہے عدیل خلیل کی میرے سامنے۔ ابھی تین حرف بکہ کر بیچ دوں تو سزا کھائیے
 ہمیشہ کے لیے ان کے اندر دفن ہو جانے کی۔ منہ چھپاتے پھر میں گے لوگوں سے۔“
 معاذ و ربیل کی آواز نے جہاں اُس کی سوچوں کو منتشر کیا وہاں پہلا خیال آسہ کا آیا تھا۔ وہ
 گھر میں سے کوئی جو اپنے دوست پر نام ہو کر آیا ہو۔ اس خیال نے اُس کے ہونٹوں پر فاختہ

بھری اور پھر قصد اُس نے اٹھنے اور دروازہ کھولنے میں دیر لگائی لیکن جب سامنے احمد حسن کو دیکھا تو
 بھڑپ میں خفی سا ہو کر رہ گیا تھا۔
 ”خپ میں ہو بار! میں تو اب تمہارے بارے میں اخبار میں اشتہار دینے والا تھا۔“ احمد حسن اُس کے گلے لگے۔
 ”نہیں بھئی۔“ میرزا ند ہمیشہ کی طرح گرم جوش کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ اور اُس سے الگ ہو کر پوچھنے لگا۔
 ”کس غلن سے تمہارا کشیدہ یا مفرد مجرم؟“

”احمد حسن کا قبیلہ ہے۔“ میرزا ند نے اپنے ہاتھ پر اُدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ”بھائی سے پوچھنا پڑے گا کہ وہ تمہاری تصویر
 نے اور مفرد مجرم کھانا پسند کریں گی یا نہیں۔“ کہاں میں بھائی نہ گم؟
 ”نہیں ہیں۔“ میرزا ند مطلب ہے وہ سینے کی ہوتی ہیں۔ ”آؤ بیٹو! وہ اسے لے کر لاؤں میں آگیا۔
 تم نہیں گئے بھائی کے ساتھ؟“ احمد حسن نے پوچھتے ہوئے پوچھ لیا۔ جیسی وہ بھی جواب گول کر گیا۔
 ”اور ساؤ گھر میں سب خیریت ہے۔“ اُنکی سناملہ۔
 ”ہاں اللہ شکر ہے۔“ نہیں بتایا ہوگا بھائی نے کہ وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ آئی تھیں ہمارے ہاں۔
 ”لکے لیے؟“ احمد حسن نے اُن کی آمد کا مقصد بھی بتایا تو وہ قدرے پُرسوج انداز میں بولا۔

”ہوں۔“ ڈر کر تھا آسہ نے مجھ سے۔ پھر کیلے پایا؟
 ”آئی جلدی کیلے پائے کا بار۔“ ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔ پھر مجھے تم سے بھی مشورہ کرنا تھا۔ کیسے
 بدل صاحب اور سب ٹوٹ؟“ احمد حسن نے اُنجانے میں غلط وقت پر اہم موضوع چھیڑ دیا تھا۔ وہ متنبز بیٹھا
 پوچھ رہا تھا لیکن جانے کیسے دامن بچا گیا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا احمد حسن۔“ مجھے درمیان میں مت لاؤ۔ تم اور انہی جو مناسب سمجھیں کریں۔“
 ”اس کا مطلب ہے تم نام کو بہن نہیں سمجھتے؟“ احمد حسن نے اُس کے جواب سے مایوس ہو کر کہا۔
 ”اس کیوں کہا تم نے؟“ وہ بگڑ گیا۔ ”وہ میری بہن ہے اسی لیے میں خود کو اس معاملے سے الگ رکھ رہا
 کیونکہ خدا خواست زندگی میں کہیں اوج بیچ ہو جانے تو تم نے نہ کہو کہ سسرال کی طرف لڑائی میں نہیں لے ہن کا
 ل نہیں لیتا تھا؟“

”ہی نہیں۔“ تم اس معاملے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ امی کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم سے مشورہ کرنے کے بعد
 اب جواب دیا جائے گا۔ کیونکہ تم زیادہ جانتے ہو۔“ احمد حسن نے اُس کے مذکر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔
 ”اور میں تو تعریف ہی کروں گا۔ اچھے لوگ ہیں۔ شریف، عزت دار اور غیرت مند۔“ وہ قصداً مسکرایا۔ ”اور
 سنا چاہتے ہو؟“

”اور یہ بتا دو کہ بھائی کب آئیں گی؟“ اُن کے بغیر تم کچھ خبیلی لگ رہے ہو۔“ احمد حسن شریر مسکراہٹ
 ساتھ بولا تو وہ نظریں چڑا کر اُن کو کھڑا ہوا۔
 ”پلور باہر میں چل کر جانے بیٹے ہیں۔“

”احمد حسن اس کے نظریں چلنے سے کچھ ٹھٹھا اور اُس کی تقلید میں اٹھنے کے بجائے آرام سے گریٹ نکال
 سگئے لگا پھر دھڑوں کے مڑخوں میں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔
 ”کیا بات ہے۔“ بھائی سے ناراضگی ہو گئی ہے۔ یہ وہ خاتون ایسی تو نہیں ہیں کہ کسی مجبوری بات پر رد و فتح کر
 جائیں۔ مفرد تمہاری طرف سے کوئی؟“ احمد حسن نے قصداً بات اوصوری چھوڑ دی تو وہ ہنسنے لگا۔
 ”ہاں کہیں سے کوئی بہت بڑا ظلم کیلے؟“

”خوش آگئے تھیں۔“ بولیں کبھی اُنجانے میں بھی غلط ہو جاتا ہے جو خود کو بتا نہیں جلتا لیکن مقابل شدت
 سے کھڑا کرنا ہے۔ بتاؤ کیا بات، ہوئی ہے بڑا احمد حسن نے دھیرج سے اور اتنی اپنائیت سے پوچھا کہ وہ
 کے سامنے کھڑا گیا۔ جس روز سے اُسے آسہ سے شادی کا اظہار کرنے پر پناہ فتنوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اُس
 سے اب تک کے تمام حالات اُس کے سامنے بیان کر دیے اور پھر وہ درمیان میں مہر النساء سے

شادی کا ذکر بھی کیا اور وہیں سے احمد حسن سلسلے میں بیٹھا تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے کمر
احمد حسن خود کو بولنے پر آمادہ کر سکا تھا۔

”تم نے بہت غلط کیا۔ کم از کم بھابی سے اتنی رازداری نہیں برتنی چاہیے تھی۔ جب جان ہمد
اس طرف سے مسلسل تمہارے خلاف سازش ہو رہی ہے تب تو بھابی کو جانا اور بھی ضروری
وہ ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اور اب تو ظاہر ہے
ان کا اعتماد محجوب ہوا ہے بلکہ عزت نفس پر بھی گہری جرح پڑی ہے۔ اس لیے ان کا مطالبہ بنا
تبیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ احمد حسن نے چند لمحے رک کر اسے دیکھا پھر کہنے لگا۔

”اسیہ بھابی کوئی جاہل گنوار عورت نہیں ہیں۔ پڑھی لکھی محمد خاتون ہیں جو آج اپنے پیسوں
ہو جائیں تو ڈاکٹر اسیر کے نام سے معاشرے میں ان کا مقام ہو گا۔ انہیں تمہارے بابا جان نے ج
پکا لادو تو کوئی معمولی عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر تم ان سے کیسے توقع کر رہے ہو
کی شرافت ہے اور تم سے محبت کی انتہا کہ وہ تمہاری ساری خطا میں معاف کر رہی ہیں۔ یعنی کو
نہیں اٹھا رہیں۔ اس کے برعکس بن کیسے تمہارا یقین کر رہی ہیں کہ پہلی شادی کرنے میں بھی تمہارے
مجبوری ہوگی اور شاہ پور جلسے پر بھی تم مجبور ہو گے۔ درہ پہلے تو تمہارا محاسبہ ہونا چاہیے تھا۔ کیا
کہہ رہا ہوں؟“

شاہ سکندر نے ذرا سانس میں سر ہلایا تھا۔

”اور ایک بات جو تم معمول رہے ہو وہ یہ ہے کہ جب عزت و وقار پر بات آتی ہے تو جو
کوئی کھدروں میں جا چھٹی ہے۔ پھر اسیہ بھابی جیسی لڑکی تو اپنی اور خاندان کی ناموس پر جان سے
محبت کیا چیز ہے۔ نہیں اگر واقعی ان سے محبت ہے تو ان کے حق کے لیے لڑنا ہو گا۔ جھلے ا
اور ان کے خاندان سے متنفر ہونے کے غیر جانبداری سے سو جو۔“
”میں کیا سوچوں احمد حسن! جب مجھے معلوم ہے کہ بابا جان کسی قیمت پر اسیہ کو تسلیم نہیں کریں گے
مابوی سے کہا تو احمد حسن زور دے کر بولے۔
”تم کو شش تو کرو۔ اپنی بات منوانے کے لیے کئی حربے استعمال کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہیں ا
ہو جائیں۔“

”میں سارے حربے پہلے ہی آزما چکا ہوں۔ انہیں اگر ماننا ہوتا تو اس وقت مان لیتے۔ شاید
غلطی ہو گئی۔ مجھے پہلی شادی کے وقت یہ شرط رکھنی چاہیے تھی کہ اس کے بعد بابا جان خود میرے
کے گھر والوں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے۔“

”جو وقت ہاتھوں سے نکل گیا اس پر مت بچھتاؤ۔ آگے کی سوچو۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی صورت
ہو گی۔ احمد حسن نے اس کا کندھا ٹھیک کر تسلی دی۔ پھر گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بہت دیر ہو
چاہیے۔ تم بھی چلو۔ یہاں نہیں کھانے وغیرہ کی پرالیم ہوگی۔“
”نہیں کوئی پرالیم نہیں۔ ایک دو دن کی بات ہے پھر میں شاہ پور چلا جاؤں گا۔ وہ بہت س
کھڑا ہوا تھا۔

”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا کرے تم بابا جان کو لسنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور ہاں جا
پہلے مجھے فون ضرور کر دینا۔“

”اوکے۔ وہ احمد حسن کو رخصت کر کے دوبارہ اندر آیا تو شاہ پور جلسے سے پہلے اسیہ سے ملنے کا
سوچنے لگا تھا۔

شاہ سکندر سوچی ہوئی ترکیب کے مطابق اسیہ کے چچا کے گھر جا پہنچا جن سے اس کی پہلے دا

ملاقات ہو چکی تھی۔ آخری بار اس۔ رز تب بڑے بھتیجا اور ساڑھ بھابی تہہ جارہے تھے۔ تب ان کی بیٹی طاہرہ
سے یہ بات ہوئی تھی۔ اس وقت طاہرہ ہی نے گیت کھولا اور اُسے دیکھ کر خوشی کے ساتھ حیرت کا اظہار
کرتے ہوئے بولی۔

”آپ کیسے راستہ معمول گئے اور سب باقی کہاں ہیں؟“
”آپ کیسے راستہ چائے؟“ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔
”چچا جان ہیں یا آفس چائے؟“ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔
”کیا مطلب؟“ ان کے پرہیزگار ہونے کو اب اندہ نہیں آئیں گے۔
”میں نے قریب پڑی پوچھ لیا تھا۔ وہ اندر آتے ہوئے لولا اور سامنے چچی جان کو دیکھ کر
”اے نہیں۔“
”میں کیا تو انہیں بھی اس کی آمد پر زبردستی نہیں انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دی۔“
”پھر رجو۔“

”نہیں ہیں آپ اور چچا جان۔ میں اور مرے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“ وہ اپنی آمد کے بہت
سے عجز سوچ کر آیا تھا لیکن وہی نام سا جھک سکا۔
”اچھا کیا، بہت خوشی ہوئی۔“ انڈر جیل کر بیٹھو۔ چچی جان نے کہا۔
”جی نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے تلفظ کیا لیکن طاہرہ اسے ڈرانگ روم میں لے آئی اور بیٹھنے کا
اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”الڑا بھی کچھ دیر پہلے آفس کے بے نکلے ہیں۔ آپ کو ان سے کوئی کام تھا؟“
”جی نہیں۔ اصل میں میں ابھی شاہ پور سے آ رہا ہوں۔ ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ اُسے ہمیں قریب
ڈرا کیا۔ پھر آپ کے گھر پر نظر پڑی تو مجھے چپ چاپ نکل جانا چھاپہ نہیں لگا۔ سوچا کھڑے کھڑے تحریرت
ہی معلوم کروں۔“ اس نے بہت سہج کر بات بنائی جس پر یقین کرتے ہوئے طاہرہ بولی۔

”اے اسیہ باقی آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ خیرہ جیسے ناشتا کریں گے۔“
”جی ٹھیک رہے۔ ناشتا ہم نے راستے ہی میں کر لیا تھا۔ البتہ ایک کپ چائے پینے میں کچھ مضائقہ نہیں اور اس
سے پہلے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسیہ کو فون کروں۔“ وہ خوبصورتی سے اصل مقصد کی طرف آیا تھا۔
”بہت تلفظ کر رہے ہیں آپ سکندر بھابی۔ مہلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے؟“ طاہرہ نے فون
پٹ اٹھا کر اس کے قریب کارڈز رکھ دیا پھر جانے لگی کہ وہ ٹوک کر لولا۔

”ایسا کریں۔ آپ بلا میں اسیہ گھر پہنچا رہے ہیں۔“
”اچھا۔“ طاہرہ اپنے طور پر جانے لگا تو اسیہ پھر نیچے گھٹنے ٹیک کر بوجھنے لگی۔ کہاں کے نمبر
لاؤں؟

”ادھر آبادی کے گھر ہیں اسیہ۔ اس نے بتا کر انبار اٹھایا اور بظاہر اُسے دیکھنے میں معروف لیکن سارا
دعائیں طاہرہ کی طرف تھا۔

”اسلام علیکم بھابی۔ میں طاہرہ ہوں۔“
”جی ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“
”ادھر اسیہ باقی سے کام تھا۔ پلیر انہیں بلا دیں۔“
”ٹھیک رہی میں آؤں گی کسی دن۔“

”پھر پھر دیر کی خاموشی کے بعد جیسے ہی طاہرہ کی آواز سنائی دی وہ ایک دم اُسے دیکھنے لگا تھا۔

”میں اسیہ باقی؟ کیا کر رہی تھیں؟“
”یہیں میں آپ کی بوریت دور کر رہی ہوں۔“ طاہرہ نے ہنستے ہوئے ریسور اُسے تمنا دیا اور اٹھ کر چلی گئی تب
”کیا تم کو ظہن ہے کہ اپنی بیوی سے بات کرنے کے لیے مجھے دوسروں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔“

”آپ نے آسید کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔
 ”بہت ظلم کر رہی ہوں مجھے پراور اپنے آپ پر بھی۔“
 ”میں فون بند کر رہی ہوں۔ وہ روٹے بچے ہیں بولی۔“
 ”میں دوبارہ رنگ کر لوں گا۔ یہیں سے اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک تم نہیں سنو گی۔“

”کیا بات؟“ آسید نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے۔

”میرا یہاں بیٹھ کر بات کرنا مفید نہیں ہے کیونکہ یہ ہمارا گھر ملو معا ملہ ہے۔ اور میں وہاں ہر تمہارے آٹا جی کے گھر بھی نہیں آنا چاہتا۔ اس لیے تمہیں آنا پڑے گا۔ اگر تم گھر نہیں آنا چاہتیں تو پھر یہ بیڑ گہرات کر سکتے ہیں۔ وہ بہت احتیاط ہے اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ مبادا ظاہر یا چچی جان کے آسے اذھور کی رہ جائے۔“

”سن رہی ہو اس۔ شام میں تیار رہنا۔ میں تمہیں گھر کے گیٹ سے ہی ایک کر لوں گا اور میرا فون تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میرے بارے میں کچھ غلط خیال کرنا کیونکہ میں تمہیں کچھ چکا ہوں اور اس سلسلے میں تم سے سہولت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر تمہارے گھر والوں کو نہیں ہونا چاہیے۔“

”اچھا۔ شام میں ملیں گے۔ تمہارے فون پر اس نے فون بند کر دیا اور خود کو خاصا ریلنگ لگا تھا۔“

”حیران ہو رہی ہوں گی آسید باجی، ظاہر نہ جانے کی ٹرے ٹیل پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”جی۔ چچی جان کہاں ہیں؟“ وہ مختصر جواب دے کر موضوع بدل گیا۔

”آری ہیں اتنی۔ آپ چائے پیجیے۔ ظاہر نہ کپ اس کی طرف بڑھا یا جسے تمام کراس نے سے لگایا۔“

اس کا مقصد بولا ہو چکا تھا اس لیے چلنے کے بعد کچھ دیر ہی وہ مڑتا ہوا تھا پھر وہاں سے نکلنا اور مختلف سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا تھا۔ شام کوئی اتنی دور نہیں تھی لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے گیا ہو۔ ایک ایک بل بھاری ہوتا تھا اور مسلسل ڈرائیو سے زیادہ ذہنی انتشار نے اسے متکا کرنا تھا۔ لیے کچھ دیر سونے کی غرض سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں آ گیا۔ اب تو یہ گھر بھی کانٹے کو دوڑتا ہے۔ جیہ ویرانی اور وحشت در آتی تھی۔ وہ جوتے مونے اتار کر لیٹا تو بیٹے ٹھوں کی خوبصورتیاں جیسے اس کی آنکھیں تھیں، اس نے مکمل طور پر خود کو انہی ٹھوں کے حوالے کر دیا اور ابھی انھیں بند کی تھیں کہ فون کی آواز آئی۔
 ”ہیلو! آس کے پیچھے میں جی مدد درجہ ناگواری تھی۔“
 ”سوری۔ میں نے شاید آپ کو ڈسٹرب کیا۔ دوسری طرف آسید نے اس کی ناگواری محسوس کیے کہا لیکن کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔“

”یہ بتاؤ تم کب ڈسٹرب نہیں کرتیں۔ پاس ہوتی ہو جب بھی اور۔“
 ”سکندر۔ وہ ٹوک کر بولی۔“ یہ بتائیں آپ کو کیا بات کرنی تھی۔“
 ”بہت ساری باتیں ہیں۔ وہ موڈ میں آ گیا تھا۔“

”میں سن رہی ہوں۔“
 ”ابھی نہیں یا۔ شام میں کہیں کھلی فضا میں بیٹھیں گے تاکہ تمہارا موڈ خوشگوار ہو پھر میں تم سے سواری۔ میں کھلی فضا میں نہیں بیٹھ سکتی۔ آپ کو جو بات کہی ہے ابھی کہیں وہ اس کی ہوسنے سے پہلے بول پڑی تو وہ ایک دم ہونٹ بیچھ گیا۔ پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔“

”مجھ سے ملنے سے کس نے روکا ہے؟“

”میں نے خود اپنے آپ کو پابند کیا ہے اور سبب آپ جان چکے ہیں۔ شادی سے پہلے وہ بنے تھے۔ میں نے اعتدال سے بات کرتی تھی ابھی بھی اس کا وہی جذبہ تھا۔
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔
 ”اسکندر مجھ گیا اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“
 ”میں نے اس وقت اسے اپنی رفاقتوں کی قسم دے کر بھی نہیں منایا جاسکتا۔“

دیکھنے لگی۔

”پھوپھو! اشعار و رسمیت آئے ہیں!“

”سیما بھائی! عدیل بھائی کی گاڑی سے سیما بھائی کو اترتے دیکھ کر وہ بے خیالی میں عمر کا ہاتھ کے استقبال کو بڑھ گئی تھی۔“

سونیا کی آواز پر سیما بھائی اٹھاں جی کمرے سے نکل آئی تھیں۔ اور پھر سارے گھر میں ایک قورق مچ گئی۔

”میں نے اسلام آباد سے پلٹتے ہوئے عدیل کو فون کر دیا تھا کہ یہاں ہیں ریسٹو کمرے اور یہ یاد رہا ورنہ مجھے خاصی پریشانی ہوتی۔“ سیما بھائی نے اٹاں جی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”خیر عدیل بھائی کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے جو انہیں آپ کو ریسٹو کمرے نہ یاد دلا دے۔“

”میں نے ایک بار انہیں بازار میں نہیں مبول آیا تھا۔“

”جناب مبول! انہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر چھوڑ آیا تھا۔ کیونکہ آپ لوگوں کی شاپنگ ختم ہوئے رہی تھی۔“ عدیل بھائی اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے غصہ ہو کر بولے تھے۔

”یو جی بلی پھنگی باتوں میں چلنے کا دور چلا۔ پھر کھانا۔ اس کے بعد وہ سو گیا اور میرے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ سیما بھائی، اٹاں جی کے ساتھ اسی کے مسئلے پر بات کرنے لگی تھیں اور وہ ہرٹ ہوئی تھی حالانکہ کسی نے اس پر جتا یا نہیں تھا کہ شاہ سکندر اس کی پسند تھا۔ بس اپنے آپ ہرٹ تھا کہ اس نے اگر غلطی نہیں کی تب بھی سب کو مشکل میں ڈالنے کی سزا وار ضرور ہے۔“

”آسیہ! میمونہ بھائی نے اس کے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔“ چائے پیو گی؟“

”جہیں بھائی۔ ایسے ہی بہت کھیل بیٹھ ہوئی ہے۔“

”چلو جہیں ہوئی“ میمونہ بھائی اندر آگئیں اور کرسی کی پیچ کرا رام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”چڑھیں تمہارا سر کھڑا رہی ہیں۔“

”ہائے بھائی! یہ تو میری شہزادیاں ہیں! اس نے دائیں بائیں سونیا اور سمیتہ کو اپنے بازوؤں اور باری باری دونوں کے گال چومنے لگی تو میمونہ بھائی چھیر کر کہنے لگیں۔

”بس کچھ وقت ہے۔ جب تمہارا اپنا آجائے گا تو انہیں پوچھو گی بھی نہیں۔“

”جی نہیں۔ یہ تو میری جان ہیں۔“

”کون کس کی جان ہے۔“ سیما بھائی سنتی ہوئی آگئیں۔

”آئیے بھائی! آپ ہیں بھی اپنا حال احوال سنائیں! وہ اپنے قریب ان کے لیے گدہ بناتے ہوئے ہیں تمہارا احوال سننے آئی ہوں۔ کہاں ہیں آج کل شاہ سکندر! سیما بھائی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بہت سنبھل کر بولی۔

”صبح ان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے شاہ پور جا رہا ہوں۔“

”اپنے اٹاں! آتا کو لینے؟“

”جی۔ مجھ سے تو یہ بھی کہہ رہے۔“ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”چلو اپنے آئے تو اچھا ہے۔ ویسے تمہارے بھائی جان بہت مایوس تھے۔ کہہ رہے تھے اگر شاہ والدین اب بھی گئے تب بھی آسیہ کا سوکن کے ساتھ گزرا مشکل ہوگا۔“ سیما بھائی نے کہا۔

”یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔“ وہ ہاری ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”نہیں آسیہ! یہ ساری باتیں بھی ابھی سوچ لو تو اچھا ہے۔ ورنہ بعد میں تو تمہارے پاس سونے کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“ میمونہ بھائی نے ناصحانہ انداز میں کہا تو سیما بھائی ان کی تائید کرتے کہنے لگیں۔

”میونہ شک کہہ رہی ہیں۔ تمہارے بھائی جان نے مجھے اسی مقصد سے بھیجے کہ آسیہ کو سمجھا دینا تمام

لوگوں پر غور کرنے کے بعد شاہ سکندر کے ساتھ جانے کی بات کرے۔ اور یہ کہ آیا آئندہ زندگی میں تم اس

ساتھ خوش رہ سکتی ہو کہ نہیں۔ انہوں نے سمجھوتہ کرنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ چند دنوں کا نہیں ساری

رک کا معاملہ ہے۔ تم بھی کبھی اس اور سمجھاؤ کہ ہو۔ میرا خیال ہے یہ ساری باتیں خود بھی سمجھ سکتی ہو شاہ

زندگی پہلی بیوی جتنی نہیں جیسی عورت ہے۔ جہیں کھنے دے گی یا نہیں۔

”ہاں۔ میں نے گاؤں کی عورتوں کے بارے میں بڑی باتیں سنی ہیں۔ جادو لوگوں کے ذریعے سونکوں کو دوا

دی ہیں۔ اللہ تو بہ! میمونہ بھائی جہر جہر لے کر گاؤں کو ہاتھ لگانے لگیں۔

”وہ سر جھانکے سن رہی تھی۔ ذرا سی پکلیں اٹھا کر میمونہ بھائی کو دیکھنے لگی۔

”وہ زبان باتوں میں اگر صداقت جو تب بھی ہم یقین نہیں کرتے۔ میں سکندر کی بیوی کے مزاج کی بات

یہ بھی اور یہ کہ وہ سکندر کو آسیہ کے خلاف بہکا بھی سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سارا خاندان ہوگا اور یہ

میرا بیٹا بھائی نے اپنا رشتہ میمونہ بھائی کی طرف موڑا تو دونوں جھاد جیں آپس میں بات کرتے ہوئے

دیر گزرا اس کی موجودگی فراموش کر گئیں۔

”پھر تازہ شکل ہوگی۔“ اُن جاہل عورتوں کے ساتھ یہ کہاں متاثر ہو سکتی ہے۔“

”اسی لیے ٹیکس نے کہا ہے کہ ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد سکندر کے ساتھ جانے کا سوچے۔“

”وہ بھائی! کتنا دھوکا دیا ہے سکندر نے۔ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایمان سے میرا تو دل چاہتا ہے وہ

انے لے اور میں شوٹ کر دوں اسے۔“ میمونہ بھائی ایک دم جذباتی ہو گئیں پھر چانک آں پر غور پڑی تو

نق ہو کر بولیں۔ ”سوری۔ سوری آسیہ۔ تم مائدہ نہیں کرنا۔ ویسے میں یہ سب تمہاری محبت میں کہہ رہی ہوں۔“

”اور کیا۔ میں نے تو جس دن سے سنا ہے انہیں کہہ رہی ہوں۔ بھلا کیا کیا تھی آسیہ میں ایک سے ایک

بار رشتہ موجود تھا! سیما بھائی نے کہا تو وہ اندر ہی اندر جزبہ ہو کر بولی۔

”خوبی قسمت میں تھا وہی ملا۔ اور جانے آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔“

”بس جہاں آدمی مات کیسا تا ہے اسے قسمت کا لکھا کہہ کر خود کو ہلانے پر مجبور کر تا ہے۔“ سیما بھائی نے

منہ سے کہا تو وہ اچانک۔ ”مرا کھٹا کر بولی تھی۔“

جسے دیکھ کر اپنے آپ ہونٹوں پر مسکراہٹ درآئے۔
 "چلو غافلہ! ہر انسان اپنے کام سے خارج ہو کر اپنے کو اس کے سینے پر سے اٹھائے لگے تم
 میں اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 "کس کے دھوکے میں میرا ہاتھ پکڑا ہے شاہ! میں مہر النساء کے بھتیجے ہوں
 کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم اس کے ہاتھ کو یوں جھٹکا کہ وہ بھٹکتے بھٹکتے بھی اس کے قریب
 "ایک بات پوچھوں مہر النساء! ایمان داری سے جواب دینا! وہ اس کی محفوظ انگلیوں کو دھرتا
 "آپ بے ایمانی کرتے ہو شاہ اور مجھ سے ایمان داری کی توقع رکھتے ہو۔ خیر! جو کچھ چاہو کیا بلو
 کی مسکراہٹ بڑی دلغزب تھی۔
 "کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟" شاہ سکندر نے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔
 "یہ سوال اگر آپ اولین شب کرتے تو میں محبت میں جان دینے کی بات کرتی! مہر النساء
 سے جواب دے کر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تو وہ بے صبری سے بولا۔
 "اور اب۔ میرا مطلب ہے میں اب بھی کی بات کر رہا ہوں۔ اب کتنی محبت کرتی ہو؟
 "اب تو محبت میں دکا نداری شامل ہو گئی ہے۔ دو اور لوگوں کو کہہ کر زور سے ہنسی پھرنے
 میں بھرتے ہوئے ہوئی۔
 "کیوں آغا خشک ہے ناں۔ کوئی ہم سے محبت کرے گا تو ہم بھی کریں گے ورنہ ہمارا ہوا
 مقدری ہیں کر یونہی لٹاتے پھریں! شاہ سکندر کراؤں کے بیٹھے کھلکھلانے اور اٹھلانے پر غصہ آ رہا تھا لیکن بڑے ضبط سے بیٹھا
 بچنے کو فوراً ہر طرف سے دیکھتے ہوئے بولی۔
 "بس یا اور کچھ؟
 "ایک بات اور۔ اگر میں اسیر کو یہاں لے آؤں تو تم۔"
 "نہیں! وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ وہ یہاں نہیں آ سکتی کسی قیمت
 کہیں غلطی سے بھی اسے یہاں لے کر آئے تو میں آپ کے سامنے اس کا گلا دبا دوں گی!
 "اس سے پہلے میں تمہیں شوٹ کر دوں گا! وہ سختے سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور قہراً اس
 بھاری جوتے تلے دبا کر آگے بڑھا تھا۔
 "ہائے ظالم! مہر النساء تکلیف سے بلبلا کر اپنے پاؤں پر جھکی تھی۔ وہ یکسر نظر انداز کرتا کرے
 لاؤنگ میں بی بی جان بڑی بہو کے ساتھ جانے کہاں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بچنے
 "تم چلو گے سکندر؟
 "کہاں؟ وہ رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
 "شہر بانو کو لینے جا رہے ہیں۔ خیر سے اس کی گود بھرنے والی ہے۔ بی بی جان نے خوش
 اسے ایک دم اسیر کا خیال آیا۔ فوراً آگے آ کر بی بی جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا
 "اسے کی بھی ایسی ہی حالت ہے بی بی جان! اسے بھی لے آئیں!
 "تم اپنے حواس میں نہیں ہو سکندر۔ جس لڑکی کا ذکر بھی اس گھر میں منور ہے تم اسے لے
 رہے ہو۔ چلو لوہین دیر ہو رہی ہے۔ بی بی جان ناگواری سے اس کے ہاتھ ہٹا کر چل پڑیں۔
 وہیں کھڑا اس کے بعد بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔ غالباً اس پر جنون سوار تھا۔ جو کوئی کوئی
 تھا اور چاہتا تھا ہر کام اس کی حسب منشا آنا غافلہ ہو جائے۔ بھی بی بی جان کا جواب سن کر بھی
 جان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 "مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے بابا جان!"

ہاں کہو! آبا جان نے ستر پا اسے دیکھا۔
 "اب جانتا ہوں آپ اسے کو اپنی بہو تسلیم کر کے یہاں لے آئیں! اس نے بغیر کسی تہید کے کہا تو بابا جان
 میں جا رہا ہوں میں نمودار ہو گئیں۔
 "نانی جیسے شہزادہ کی من موہ رہی تھیں۔
 "نہ نے شاید پہلے بھی نہیں منع کیا تھا کہ ہمارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرنا!
 جس طرح اس نے ذکر کے بغیر میری کوئی بات ممکن نہیں ہو سکتی اسی طرح اس کے بغیر میں خود
 نہیں۔ بات کیوں نہیں سمجھتے آپ کیوں اسے میری زندگی سے نکلنے کے درپے ہیں۔ لہجہ جھوٹی
 باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں بابا جان۔ کم از کم اپنی حیثیت و فرتے کا خیال کیا ہوتا تو وہ ان کی ناگواری
 اٹھانے کے باوجود جتا گیا کہ وہ سب جان چکے۔
 "اب کہنا چاہتے ہو تم؟"
 "اب میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ اور مزید سن لیں۔ اسے کو آپ کسی بھی نام سے پکاریں وہ کہلانے
 کی ہے۔ جو غمخیز پیر ایک اور وارث پیدا کرنے والی ہے۔ کیا آپ اس سے رشتہ توڑ سکیں گے۔
 نہیں گئے اپنے خون کو۔ ہرگز نہیں۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ ابھی اسے یہاں لے آئیں۔ یا اگر
 ناکی وجہ سے یہاں نہیں ہے تو میں اسے فارم یا دیوں کہ اپنی میں کھلے دل کا اور اس سے پہلے آپ
 سے تسلیم کرنا ہے!
 "اگر نام نہیں اس کے سامنے جھکا نا چاہتے ہو! بابا جان جیسے ساری بات سمجھ کر مطمئن سے ہو گئے۔ جی
 ہاں اس کے بولے تھے۔
 "نہیں۔ میں اب بھی بروی کو اس کا جائز مقام دلانا چاہتا ہوں تاکہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی میری اولاد
 احساس کمتری کا شکار نہ ہو! اس نے اپنے طور پر نہیں احساس دلانے کی سعی کی۔
 "بہت دور کی سوچنے لگے ہو سکندر! اچھی بات ہے۔ بابا جان جلتے کیوں محفوظ ہو رہے تھے جبکہ وہ
 رہی اندر تھمتے ہوئے مشکل بلجے کو داخل رکھ کر بات کر رہا تھا۔
 "پھر کب چل رہے ہیں! کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تو بابا جان نے چونک کر اسے دیکھا۔
 "کہاں؟"
 "اگر اسے پاس! اسے لینے! اس نے فوراً کہا تو بابا جان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلے گئے
 اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
 "بچو! اس گھر کی بہو کہلوانا اگر اس لڑکی کا خواب ہے تو کہہ دو اس سے کہ اس کا خواب بھی شرمندہ تعبیر
 میں ہو گا۔ تم برس کا جا دو چل سکتا ہے تم پر نہیں۔ اور تم کیسے ہو سکندر جو اس کے کہنے پر چلے آئے۔
 "اب تو سوچا ہوتا کہ جسے تم نے پہلے تسلیم نہیں کیا اسے اب کیونکر مانیں گے!"
 "میں اس کے کہنے پر نہیں آیا بابا جان۔ اب غلط سمجھ رہے ہیں۔ اور اس لڑکی نے کہیں اس گھر کا خواب نہیں
 بھلا۔ وہیں چوتھے سے گھر میں میرے ساتھ خوش تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ آپ اسے تسلیم کرتے ہیں
 نہیں اور اب کوشا ہے یہی بات ناگوار گزری جو میرے ہنسنے سے کمر کوڑھ
 "افسوس کو اس نہیں کرو سکندر! بابا جان نے دھاڑ کر اسے خاموش کرا دیا ایک معمولی لڑکی کی خاطر تم ہم سے
 ستا کر رہے ہو!
 "وہ معمولی لڑکی نہیں میری بیوی ہے جس کی عزت و آبرو کی حفاظت میرا فرض ہے۔ وہ بھی دبے لیجے۔
 "خیر! وہ اس نے روکا ہے تمہیں تمہارے فرض سے۔ جاؤ کرو اس کی چوکیداری!"
 "اب تو یہاں موجود ہے اس کی چوکیداری کون کرے گا؟ اس نے بہت طنز سے مہر النساء کی طرف اشارہ
 کیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
 ”مطلب یہ کہ میں بیک وقت دو جگہوں پر فرائض نہیں دے سکتا۔ یا تو آپ آسیہ کو یہاں لے آئیں یا پھر مہر النساء کو طلاق دے کر“
 ”سکندر حیات“ بابا باہان نے زوردارہ تعجب سے پرسید کر کے اسے چکرا دیا تھا۔ ”تم مہر النساء کو طلاق دو؟“
 ”سے پہلے ہم تمہارا جنازہ اٹھوا دیں گے۔ بہت لحاظ کر لیا ہم نے تمہارا۔ جس کی کمین کے لیے تم مہر النساء سے ہو، ہم اس کے پر سے غافلان کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ورنہ جو غافلان نے مہر النساء کے لیے کہا وہ ابھی اس لڑکی کے لیے لکھ کر دو؟“
 ”نہیں۔ وہ آئے پیروں کی پیروی ہی نہیں لگا۔“

۱۰ تا سوا چار سو صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ہو گا تو وہی جو اللہ جلے گا اور اللہ سے ابھی امید دہاتا ہی نے اپنے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اُس کی آنکھوں میں نمی اثر آتی تھی۔ چنانچہ کیوں آماں جی دل بیٹھا جاتا ہے شاید مجھ سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ ڈرتی ہوں یہی کیوں بات گرفت میں نہ آجائے۔ نہیں بیٹا! تمہاری کیا غلطی ہے، جس کی غلطی سے وہی جُکے گا۔ آماں جی نے کہا تو وہ پریشان کرنے لگی۔

۱۱ تا پکا اشارہ شاہ سکندر کی طرف سے تو وہ مجھ سے الگ تو نہیں ہیں وہ پریشان ہوں گے تو میں آرام سے رہوں گی۔ نہیں آماں جی یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے اُن کا خیال کرنا چاہیے۔ وہ ٹھیک کہہ چکے کہ کم دل کر ہی اس معاملے کو سمجھا سکتے ہیں۔ ایکلہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں وہاں انہیں نے غافلوں کا سامنا ہے اور یہاں ہم نے بھی وہی محاذ بنایا ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ اباجی نے جواب دینے سے پہلے سوال اٹھایا۔
 ”کہہ رہے تھے اُن کے بابا جان کل آئیں گے اور اس وقت اُن کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔“
 شاہ سکندر کی بات دہرائی۔
 ”کوئی مضائقہ نہیں چلی جاؤ۔“

اباجی نے اجازت دے دی تو وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آکر کھڑے نکالنے لگی۔
 دونوں بھانجروں کو پہرے کھانے سے فارغ ہوتے ہی شاپنگ کے لیے جلدی چلی گئی۔
 بڑے تینوں بچے بھی ابھی کے ساتھ تھے صرف چھوٹا عمر آماں جی کے پاس سو رہا تھا، اس لیے
 سے تیار ہو گئی اور پھر جیسے ہی شاہ سکندر کی گاڑی کا مارن سٹائی دیا وہ کھڑے کھڑے آماں جی سے
 باہر نکل آئی۔

”السلام علیکم“ اُس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے شاہ سکندر مبہم سا مسکرایا تھا۔
 ”وعلیکم السلام، جو اب امیر کی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔
 ”تھیں کس گاڑی، تہاے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔“
 اُس نے تشکر کا اظہار کیا پھر اسپید سے گاڑی رہائشی ایریا سے نکال کر مین شاہراہ پر آیا
 کہنے لگا۔

”میرا خیال تھا تم نے میرا اعتبار نہیں کیا ہو گا اُس لیے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوگا
 زبردستی کرنا پڑے گی۔“

”کس بات کا اعتبار؟“ اُس نے پوچھا تو وہ ہر میں اُسے دیکھ کر بولا۔
 ”وہی جو میں نے کہا کہ میں کل بابا جان کو لے کر آؤں گا۔“

”یہ جھوٹ ہے یا سچ اس کی بابت میں بعد میں پوچھوں گی پہلے یہ بتائیں آپ کو یہ خیال کیوں
 میں آپ کا اعتبار نہیں کروں گی۔“

”کیا میں تمہارا اعتبار کھو نہیں چکا؟“ وہ اُنٹا اُس سے پوچھنے لگا۔
 ”جیتا نہیں ابھی تک تو میں نے کچھ بھی نہیں سوچا میں نے کیا کھویا، کیا پایا سا سے سو دو زبانیہ
 میں اپنے گھر کی چھت تلے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کروں گی اور اس وقت میں آپ سے بہت لڑوں

لڑوں گی سکندر۔“ وہ اچانک ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔
 ”اُس... اُس...“ وہ پریشان ہو گیا۔

”رووگی تو میں گاڑی کسی ٹرک سے چسے ماروں گا۔“
 اُس نے تھیلیوں سے اُنھیں روک کر ہاتھ نیچے کر لیے۔

”اب گزرتے کل اور آنے والے کل کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بس آج کے دن کو ہم یاد گار بنا
 اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کھٹکھٹا کر ہنسو۔ ایسی ہنسی جس کی جلتیرنگ زندگی کی آخری سانسوں تک

سماعتوں میں گونجتی رہے۔“
 شاہ سکندر نے نظام ہر یکے چٹکے انداز میں کہا تھا۔

”سکندر! وہ ٹرپ کر بولی
 ”ایسی باتیں کریں گے تو میں چپٹی گاڑی سے کوڈ جاؤں گی۔“

”اور میں تمہیں کوڈ دے دوں گا۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھام لیا پھر پوچھنے
 ”اُس کریم کھاؤ گی؟“

”نہیں۔“ وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔
 ”چلو تو پھر یہ کھانا سنو اُس نے ٹیپ کا بٹن آن کر دیا۔“

”جب کوئی پیار سے بلائے گا
 تم کو ایک شخص یاد آئے گا۔“

”اسی نے فوراً اُٹھ کر ٹیپ بند کر دیا۔
 ”اے بندیکوں کر دیا؟“ وہ وہلہ اسکرین سے آگے کہیں بہت دور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں سننا، وہ دھٹے بچے ہیں۔“
 ”سننا نہیں، کہنا نہیں کچھ نہیں پھر کیا کرنا ہے؟“

”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے لے کر آئے ہیں۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آگئی۔
 ”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے لے کر آئے ہیں۔“ وہ اُس کے حال پر چھوڑ کر شیشے

لیکن وہ اُن کی کر کے ٹنگلنے لگا۔ پتا نہیں کس موڈ میں تھا۔ وہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر شیشے
 سے باہر دیکھنے لگی۔ ساحل سے آتی تم ہوا سرگوشیوں میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔ پھر لہروں کا شور سنائی
 دینے لگا تو وہ سے دیکھ کر بولی۔

”میں پانی میں نہیں جاؤں گی۔“
 ”کیوں؟“ وہ ایک سوالیہ نظر دیکھ کر گاڑی پارک کرنے لگا۔

”بس نہیں دل چاہ رہا نہیں جاؤں گی۔“
 ”گاڑی سے اُترو گی یا یہ بھی نہیں؟“ شاہ سکندر نے اُس کی ہر بات میں نہیں کو جتایا تو وہ جلدی سے اپنی

طرف کا دروازہ کھول کر اُتر گئی۔
 ”آؤ! وہ گاڑی لاک کر کے اُس کے قریب آیا تو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے خیالی میں بولا تھا۔

”یہ لہریں ہمیں ساتھ دیکھ کر خوشی سے چلتی ہوئی ہماری طرف آتی ہیں۔ آج آخری بار ادا نہیں چلنے دو
 پھر تو یہ بھی تم سے میرا امداد مجھ سے تمہارا پتا پوچھیں گی۔“

”اسی نے چونک کر دیکھا تھا۔
 ”چلو اُدھر ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔“ جب شام اُترنے لگی تب لہروں کا تعاقب کریں گے۔“ وہ اُس کی پوری

کھلی آنکھیں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرایا پھر اس کا کندھا دبا کر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح چلنے لگی تھی۔
 ”آپ۔“ آپ نیچے پریشان کر رہے ہیں۔“ وہ اُس بات میں الجھی تھی۔ بیٹھے ہی کہنے لگی۔ ”جو بھی بات ہے

صاف صاف کہہ دیں۔“ میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ یہ بھی کہ بابا جان نے اُسے انکار
 کر دیا ہے۔“

”فرق کرو ایسا ہو تو تم کیا کرو گی؟“ شاہ سکندر نے اُس کے چہرے پر نظر میں جما کر پوچھا تو وہ ایک دم خاموش
 ہو گئی جبکہ دل انجانے اندیشوں سے کانپنے لگا تھا۔

”ارے!“ شاہ سکندر ذرا سا ہنسا۔ ”ابھی تو کہہ رہی تھیں ہر بات کے لیے تیار ہو۔ چلو جانے دو اب کوئی
 مذاق نہیں ہوگا۔“ موڈ ٹھیک کر دیا۔ میں ڈرنکس لے کر آتا ہوں۔“

وہ اسی خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔
 شاہ سکندر اپنی مدد آپ کے تحت ٹرے اٹھا کر اُس میں ڈرنکس کے ساتھ لوازمات بھرے لگا۔ پھر کچیر

کاؤنٹر پر رک کر اُس کے پاس آ کر بیٹھنے ہی کہنے لگا۔
 ”بتاے، پچھلے دو دن میں بہت معروف رہا ہوں۔ اتنا کہ کھانے کا وقت بھی نہیں نکال پایا۔“

”اُس کی کیا معرفت تھی؟“ وہ پھیلی پر غور فرماتا ہوا کہ اس کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”میں نہیں گفت دینا چاہتا تھا، وہ کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بھاری لفافہ نکال کر اُس کے سامنے

رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“ جس پارکٹ میں ہم رہ رہے ہیں وہ میں نے تمہارے نام سے
 خریدایا ہے۔ اس میں اس کے کاغذات ہیں۔ اور تمہارے کلینک کے لیے ایک پلاٹ کے کاغذات بھی ہیں۔“

”آپ نے سب۔“ وہ قدرے الجھی تھی۔
 ”کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب سب ٹھیک ہو جانے کا جب میں تمہارے کام میں رکاوٹ

نہیں بنوں گا بلکہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ چلو یہ لغاف بیگ میں ڈالو اور کھانے میں میرا ساتھ دو۔ میں بہتر ہوں نہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں آخر میں بیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
 ”اس کا مطلب ہے کل بابا جان آ رہے ہیں نہ وہ اچانک اندیشوں سے نکل کر مسکرائی پھر لغاف ہاتھ بندھ گئی۔“ میں اسے کہاں رکھوں۔ آپ اپنے پاس رہتے دیتے جب میں گھبراؤں گی جب کہ
 ”اوں ہوں نہ وہ ٹوک کر بولا۔“ اچھی بابا جان کو لینے جانامے۔ کہیں ادھر ادھر رکھ کر معمول جانوں
 بھی یہ اب تمہاری چیز ہے صرف تمہاری نہ
 ”تھینک ہو“ اس نے لغاف پیرس میں ڈال لیا پھر چلو چنے لگی۔ ”صرف بابا جان آئیں گے؟“
 ”کیا چاہتی ہو تم؟ پوری بات لے کر آؤں۔“
 وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ بڑی خوبصورت ہنسی تھی۔ آنکھوں میں ننھے ننھے دیپ جھلنے لگے تھے۔
 گھونٹ گھونٹ پیسی حلق سے آتارے ہوئے بہت احتیاط سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 پھر یہاں سے نکل کر سیدھا گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ اس کا بازو حلق کر بولی۔
 ”سکندر! ہمیں یہیں رکا رہی ہیں۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی باز
 ”اُن سے کہو جانے والوں کو نہیں پکارا کرتے۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی باز
 دروازہ کھول دیا۔
 آسیر خوش اور ممکن سی تھی۔ اُس کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا اور نہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایسی کا تمام راز
 بولتی آئی ہے۔ ادھر سے بس ہوں ہاں میں جواب تھا۔ جب گھر کے سامنے گاڑی رکی تب وہ اسے دیکھ
 ”اینا خیال رکھنا۔“
 ”کتنی؟“ وہ غمراہ سے ہنسی۔
 ”اتنا کہ ہمارے درمیان جو ایک رات کا فاصلہ ہے تو اگر اس رات کی سحر ہونے میں صدیاں بیت

تب بھی تم۔“
 ”سکندر!“ وہ بے اختیار اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ گئی۔
 ”وقت بڑا غلام ہے اُس۔“ محبت کرنے والوں کی آزمائش مطلوب ہو تو پھر جاتاہے۔ جاؤ خدا حافظ
 کا ہاتھ جو کمر کر بولا۔
 ”خدا حافظ!“ وہ دھیرے سے اُس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر گاڑی سے اتری تھی کہ شاہ سکندر
 سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ حیران ہو کر دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر اندر آگئی۔
 ”تو پاس مل کر آئی ہے۔“ میوز بھائی اسے دیکھتے ہی گنگنائے لگیں۔
 ”آپ کو بس موقع چاہیے۔“ وہ قدرے چھینپ گئی۔
 ”کیا ہوا سکندر اندر نہیں گیا؟“ میا بھائی نے گیت کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔
 ”کل آئیں گے اپنے بابا جان کے ساتھ۔“ وہ بنا کر محض میوز بھائی کے شروع جملوں سے بچنے کی فاد
 اپنے کمرے میں آگئی۔ پرس اور دوپٹا اتار کر بیٹھ کر ڈال پھر الماری میں سے کمرے سے نکال کر واش
 کیا۔ منہ ہاتھ دھوئے اور پیچھے کرنے سے بعد دوبارہ کمرے میں آئی تو پیرس اٹھا کر الماری میں رکھتے ہو
 خیال آئے پر اس نے شاہ سکندر کا دیا ہوا لغاف اُس میں سے نکال لیا اور بیٹھ کر کھانا کھا
 کر عدیل بھائی دروازے میں آکر کہنے لگے۔
 ”آسیر! نہیں آج ہی بلا رہے ہیں۔“
 ”جی!“ وہ کچھ کاغذات جو ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ اور لغاف وہیں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”یہ کاغذات کیسے ہیں؟“ عدیل بھائی نے دو قدم آگے آکر پوچھا۔
 ”آپ دیکھیں میں آبا جان کی بات سن کر آئی ہوں۔“ وہ عجلت میں کہتی کمرے سے نکل آئی

آبا جان اور اماں جی دونوں یہ سننے کے لیے بے چین تھے کہ شاہ سکندر سے اپنے بابا جان کے ساتھ
 آئے کیا ملے گی۔ آیا اُن کی طرف سے کوئی شرائط تو نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آسیر کو نہیں کراچی میں رکھنے کا
 اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا۔ وزیر دروازہ۔ ظاہر ہے وہ ماں باپ تھے۔ جہاں بیٹی کا گھر آباد رکھنا چاہیے
 تھے وہاں سکون کا خوف بھی تھا۔
 نہیں آج ہی اُن کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شرط نہیں ہے۔ وہ آرام سے بیٹھ کر ماں باپ کو اطمینان
 دلانے لگی۔ نہ ہی شاہ سکندر نے مجھ سے شاہ پور چلنے کی بات کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں جو پارٹمنٹ
 ہے۔ وہ میرے نام سے خرید لیا ہے اس کا مطلب ہے کہ ہم نہیں رہیں گے۔ باقی کل وہ انہیں گے تو آپ خود
 بات کر لیجئے گا۔“
 ”کون۔“ اس سے بات کرنے کو کہہ رہی ہو؟“ عدیل بھائی جہلنے کب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
 ”شاہ سکندر سے۔“ وہ اسی روان میں بولی تھی۔
 ”شاہ سکندر اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ تنہا بیچ اور کھینا کہ اپنے باپ کی دی ہوئی گالی کو بھائے غلط
 ثابت کرنے کے اس پر پھر مثبت کر کے تیار ہے اور ہم سب کے منہ پر مار گیا ہے۔“
 ”تو کیا سنا اور غصے کی انتہائی کیفیت میں عدیل بھائی نے وہ سارے کاغذات اُس کی طرف اچھال دیئے
 تھے۔
 وہ بھی بیٹھی آنکھوں سے اپنے اظرف اڑتے کاغذات کو دیکھنے لگی جبکہ ذہن پر اچانک بابا جان
 کے الفاظ پھوٹے پر سہلنے لگے تھے۔
 ”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکیل بنا کر رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“



”تو کیا یہ سب۔“ آسیر نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے ادھر ادھر بکھرے کاغذات میں ملنا شروع کیے تو اسے
 اچھے اس کی عزت وقار۔ نا خودداری بحرے بازار میں بیٹھ گیا۔ بہت ضبط کرتے کرتے بھی اس کے آنسو
 رخسار پر چھٹک گئے جنہیں فوراً ہی اس نے دوپٹے کے پلوں میں جذب کر لیا اور ایک آخری کاغذ جو اباجی کے
 ہونٹوں کے پاس پھڑپھڑا رہا تھا اسے اٹھا کر کھن ہوئی تو کہنے لگی۔
 ”بابائی۔“ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا جس پر شرمندہ ہوں۔ اور اپنی زندگی میں میں نے کسی کے ساتھ برائی کی
 نہ کی کہ برائی سوچی جو میں سمجھوں کہ مجھے اسی کی سزا ملی ہے۔ اس کے برعکس آزمائش ہو سکتی ہے۔ اور آپ ہی
 دیکھا کرتے ہیں کہ آزمائشوں سے گھر کر قیمت کو کتنا الزام دیتا صرف بڑی ہی نہیں ایمان کی کمزوری کی علامت
 ہے اور مجھے اپنے قسمت سے کوئی گناہ نہیں۔ میں اگر آنسو بہاؤں گی تو اس خیال سے کہ میں آپ سب کے
 لیے کھانا کھا رہی ہوں۔“ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
 ”ابا جان! جو پچھلے عدیل بھائی کے غصے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ وہ اب اس کی باتوں سے الجھ رہی تھیں۔
 اُن کی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ انہیں شاہ سکندر کی طرف سے اطمینان دلا رہی تھی پھر اب کیا
 ہوئے پور دہری ہے۔“

”ننھے مجھے تو بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیوں تم مین بیٹی کے پیچھے بڑے ہو عدیل؟“
 ابا جان نے اپنی سمجھ کے مطابق عدیل بھائی کو ٹوکا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ کمرے سے نکل آئی اور
 کمرے میں آئے ہی اس نے تمام کاغذات لغاف میں ڈال کر الماری میں رکھے پھر واش روم میں بند ہو گئی۔
 ”ننھے پچھلے کی طرح غم و اندوہ کی تصویر بن رہے سب کو اپنے لیے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کہاں ممکن

تھا۔ وہ تو خود پر بے حسی کا خول چڑھانے میں بھی ناکام ہو گئی تھی۔ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ لیا مگر آنسو سارے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

کتنی دیر تک وہ دروازے کے ساتھ بیٹھانی نکا کر روتی رہی۔ اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ وہ بچ کا حق قیامت لگا گیا تھا۔ گویا سب کچھ پہلے سے طے تھا اور وہ اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آکر اپنا سب کچھ ہار چکی تھی۔

”آسیہ!“ میونہ بھابھی شاید کمرے میں آکر پکار رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دواش میں داخل کھول کر پانی کے چھینے مارے پھر وہ پٹے سے چہرہ چھپتپاتی ہوئی نکلی تو میونہ بھابھی اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر افسوس بولیں۔

”تم اس شخص کے لیے رو رہی ہو جو باقاعدہ پلان کے تحت تمہاری زندگی سے کھیل گیا اور صرف تمہارا نہیں اور بھی جانے کتنی اس کے فریب میں آئی ہوں گی۔“

”دروں کامیں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر اپنے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں انمول ہوں۔“ اس کے لیے کچھ میونہ بھابھی کو تڑپا گیا۔

”تم ابھی بھی انمول ہو۔ اور تمہیں اپنے ہر عمل سے ثابت کرنا ہے کہ شاہ سکندر جیسا لیر اپنے مقدر کا مایاب ہو کر بھی تمہارا کچھ نہیں لگاؤ سکا۔“

اس کے ہونٹوں پر دکھ بھری مسکراہٹ نے ذرا دیر کو چھب دکھائی تھی جس سے میونہ بھابھی نظر پر ہنس بولیں۔

”خیر دفع کرو، میں یہ کہنے آئی تھی کہ تم سیماء کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہو۔ صبح آٹھ بجے کی فلائیٹ ہے یا کر رہ گئی۔“

”یہ اچانک میرے جانے کا۔“ وہ کچھ الجھ کر دیکھنے لگی۔

”ابا جی نے کہا ہے اور میرا خیال ہے، یہی ٹھیک ہے۔ ایک تو تمہاری آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔ یہاں کے حالات پر قابو پانے میں بھی کچھ آسانی ہوگی۔“ میونہ بھابھی نے کماؤ وہ قدرے تشویش سے پوچھے

”یہاں کے حالات سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”عدیل اور خلیل۔ تم جانتی ہو خصوصاً عدیل کو، جنہیں روتے ہوئے دیکھے گا تو جانے جوش جذبات مٹا ڈالے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ابھی سیماء کے ساتھ چلی جاؤ کیونکہ اپنے اس دکھ کے ساتھ سمجھو اگر کہ تمہیں بھی کچھ وقت لگے گا۔ تم اپنے آنسو چھاسکتی ہو لیکن تمہاری آنکھوں میں جو وحشت اتر آئی ہے کہ

کر عدیل کسی طرح بھی شاہ سکندر سے بدلے لینے سے خود کو نہیں روک سکے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو میونہ بھابھی نے اسے کم صدمہ دیکھ کر پوچھا۔

وہ سب سن رہی تھی لیکن حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ کوشش کے باوجود ذرا سا اثبات میں سر نہیں میونہ بھابھی اس کا سر ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگیں۔

”سنو۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور اتنے پیار کرنے والوں کے ذرا کبھی تنہا نہیں ہوگی۔ یہ میں تمہیں یقین دلائی ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ میونہ بھابھی کے ہاتھوں پر گرنے لگا تھا۔

شاہ سکندر جب حویلی میں داخل ہوا تو تقریباً نصف شب بیت چکی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑا رہا اور دیوار کو خود پر ہنسا دیکھا پھر بھلے انداز میں اپنے کمرے میں آیا تو مہرا النساء کو بچے کے ساتھ بے خبری کی نیند سوتے دیکھ کر اچانک بھج کر چمکا۔

”مہرا النساء!“

ہند میں بڑا کرانٹھ بیٹھی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں تو تم بھی نہیں نکل جاؤ یہاں سے اسی وقت۔“ شاہ سکندر کا اب شاید اسی پر بس چل سکتا تھا۔

”کہاں جاؤں؟“ وہ سوئے ہوئے بچے پر نظر ڈال کر پوچھنے لگی۔

”جنم میں۔“ وہ دھاڑا پھرواش روم کا رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”دو منٹ میں میرا کمرہ خالی کر دو اور خبردار آئندہ

نی اجازت کے بغیر یہاں آنے کی جرأت نہ کرنا۔“

”جلی بھی اتنا! تیرا باپ تو لگتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔“ مہرا النساء اس کے دواش روم میں بند ہوتے ہی فوراً اٹھی

جلدی جلدی بچے کی فیزر تھما اور دوسری چیزیں سمیٹ کر باسکٹ میں ڈالیں پھر ایک بازو میں بچے کو اٹھا کر

رے سے نکل گئی۔ حالانکہ وہ اس سے خائف ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اسے سب کی حمایت حاصل تھی۔

اس وقت شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کیسی وحشت تھی جس نے حقیقتاً اسے سہا دیا تھا اور اسے لگا کہ

اس کی بات سے ذرا بھی اختلاف کیا تو وہ پیچھے اس کا خون کر دے گا۔

کچھ دیر بعد شاہ سکندر دواش روم سے نکلا تو پہلے ادھر ادھر دیکھ کر مہرا النساء کے چلے جانے کا یقین کیا۔ پھر رومہ کر

رے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے پاس سوچنے کو کچھ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہو گیا تھا۔

جہاں سے چلا تھا واپس اسی مقام پر آکر اس کے اندر غم غصہ اور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے اب زندگی اسے گزارے گی کیونکہ ساری امانتیں، آرزوئیں اور زندہ رہنے کی خواہش تو وہ آسیہ کے ساتھ

پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب آگے کی زندگی اس کی نہیں ہوگی۔

وہ سڑتے سڑتے کمرے میں نکل آیا۔ تاریک رات میں دور دور تک کہیں کوئی روشنی نہیں تھی نہ کوئی آواز،

ہوا بھی ساکت تھی اور اس کے اندر ہولناک سناٹا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بھی ٹھہر گیا ہو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس

نے دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہا تھا کہ اچانک اندر شور مچ گیا۔ جس سے گھبرا کر وہ کمرے میں آیا اور ٹکیوں میں منہ

مکھو کر لٹا لیکن مختلف آوازیں تمام رات اسے مسلسل جھجھوٹی رہی تھیں۔

جب سارے گھر میں زندگی بیدار ہو گئی تب وہ بہت بڑھال ہو کر سویا تھا اور بس دھگھگنے اس کے بعد بابا جان نے خواہ اس کے کمرے میں آکر اسے اٹھا دیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بہت ناراض ہوتا اور ناراض تو ابھی

”جی۔“
 ”بیٹا! خوش رہا کرو۔ زندگی میں کرائسٹس آتے ہیں۔ ان پر رونے کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سمجھتا کہ تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے کیونکہ تم خود بہت ذہین ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، بھول جانا ممکن نہیں ہے، لیکن یہ تو کر سکتی ہو کہ اسے خود پر طاری مت کرو اور یہ سوچ لو کہ اس میں تمہارے ہونے کی ہلکی سی بات شری سے بات شروع کی تھی کہ سیمابھائی چائے لے کر آئیں۔“

”جھٹھو سیمابھائی! تم بھی بیٹھو، میں آئیہ سے بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے رُے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر کھینچ لیا۔
 ”جو کچھ ہو گیا، میں اس پر بات نہیں کروں گا کیونکہ مجھے پلٹ کر دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اتنا تو تم آئیہ! آخر میری بہن ہو۔“
 اس نے چائے کی پیالی میں سے اٹھتی بھاپ سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا اور بس ذرا سا مسکرائی تھی۔
 ”اور میں تمہارے گزرے کل کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ البتہ آنے والے کل کو ضرور اور تمہیں بھی اسی کی فکر کرنی ہے۔ کیا عمر ہے تمہاری۔ بائیس تیس سال، اور آگے پہاڑی زندگی ہے۔“
 ”ایک سال بھی میں تمہیں شاہ سکندر کے نام پر گنواؤں کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ اتنے سارے دن قصداً تمہیں نہیں چھیڑا کہ اپنے لیے یہ تم جتنا رو سکتی ہو رو لو۔ آج کے بعد تمہاری آنکھوں میں ایک اس شخص کے نام کا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ مرا نہیں ہے۔“ شلیل بھائی کے کھمرے ہوئے لہجے میں۔

”اس کے ساتھ سیمابھائی بھی کپ گئی تھیں۔“
 ”تمہیں میں نے اسی لیے اپنے پاس بلا لیا ہے کہ وہاں امان جی ہر وقت رونا دھونا چاکریہ احساس ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا، قسمت خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں۔ اس پر اس سے جانے کا سوچنا بھی نہیں۔ چاہو تو ہمیں کسی ہاسپتال میں جاب کر لو بلکہ ابھی کچھ عرصہ آرام کرو۔ اچانک خیال آیا تھا جو آرام کا کہہ کر غالباً اس کی ڈیوری تک ٹال دیا۔ تو سیمابھائی اسے دیکھ کر بولیں۔“
 ”ہاں ابھی تو یہ خود مریض لگ رہی ہے۔“
 ”پھر بھی تم اس کا خیال نہیں کر رہیں۔ کتنے دن ہو گئے اسے یہاں آئے ہوئے، ایک بار بھی ڈاکٹر نہیں لے گئیں۔ صبح پہلا کام یہی کرنا۔ ڈاکٹر جہاں آرا کا کلینک قریب ہی ہے۔“ انہوں نے بیوی کو ٹوکا۔

”جناب میں کئی بار اس سے کہہ چکی ہوں۔ یہ صاف منع کر دیتی ہے۔“
 ”اب منع نہیں کرے گی۔“ شلیل بھائی کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر گھڑی دیکھ کر بولے۔
 ”صبح میں چھٹی کروں گا۔ مجھے جلدی مت اٹھانا۔“
 ”خیریت؟“ سیمابھائی نے خالی کپ رُے میں رکھتے ہوئے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتے کرتے۔

”آپ بھی سوئے جا رہی ہیں؟“ اس نے سیمابھائی سے یونہی پوچھ لیا۔
 ”کو تو نہیں سوئی۔“
 ”نہیں نہیں، آپ سوئیں۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر بیڈ کی چادر ٹھیک کر کے بھا بھی جاتے جاتے رہ گئے۔
 ”مسو، تمہارے بھائی جان نے جو کہا۔ ٹھیک کہا تمہیں ان کی باتوں پر عمل کرنا ہے۔ اور ہاں ایک بار سیمابھائی کو جانے کیا یاد آیا، ہاتھوں میں پکڑی رُے دوبارہ نیل پر رکھ کر اس کے قریب چلی آئیں اور

”اس کے ساتھ بھاتے ہوئے کہنے لگیں۔“
 ”نکھو میں جو بات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“
 ”جی۔“ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر انتہائی تاسف سے انہیں دیکھا تو وہ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بھاتے ہوئے کہنے لگیں۔
 ”میرا یہی مشورہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی، لیکن سوچنا ضرور کہ آئندہ زندگی میں اس آنے والے بچے کا کیا کردار ہوگا۔ نیل کا حال تم نے دیکھا ہے۔ ماں باپ یا دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے بھی بچہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً ماں باپ کی علیحدگی سے۔ پھر تم اپنے بارے میں سوچو، ابھی تم کہہ سکتی ہو کہ تمہاری زندگی میں اب کوئی موڑ نہیں آئے گا لیکن دو تین سال گزرنے دو۔ تم خود اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکو گی اور اس وقت یہی بچہ تمہارے لیے سب سے بڑی پرالیم ہوگا۔ تمہارے دروازے پر خوشیاں دستک دیں گی اور تم بچے کو دیکھو گی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم ابھی۔۔۔“ اپنے ہاتھوں پر اس کے آئو گرتے دیکھ کر سیمابھائی خاموش ہو گئیں پھر گھڑی سانس کھینچ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔
 ”یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں تھا۔ لیکن آنے والے وجود سے کیونکہ اسی وقت چھکارا ممکن ہے کہ آپ مجھے تمہارے سامنے کچھ حقائق رکھنے پڑے اور ان سے نظریں چرانے کی حماقت مت کرنا، پھر شاہ سکندر کی جب تمہارے ساتھ لیٹو نہیں تھا تو اس کی نشانی کو گلے لگا کر کیا کر سکتی؟“ سیمابھائی نے رک کر اسے دیکھا اور اپنی بات کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر شب بخیر کہتی ہوئی رُے اٹھا کر چلی گئیں۔
 اس کی آنکھوں سے جھری لگ گئی تھی۔ کتنی دیر وہ اسی جگہ بیٹھی اپنی ہتھیلیاں ترکرتی رہی جبکہ اس کا ذہن کسی ایک بات کو بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔
 اور اگلے روز ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے سیمابھائی نے راستے میں اس سے پوچھ لیا تھا کہ اس نے بچے کے بارے میں کیا سوچا ہے تو وہ رمان سے بولی تھی۔
 ”میں اس بچے کا خون نہیں کر سکتی بھائی! جس کا خیال ہی مجھے زندہ رہنے پر آسکتا ہے۔ میری زندگی اسی کی ہون منت ہے۔ اگر میں نے اپنے وجود کے اندر اسے محسوس نہ کیا ہو تا تو خدا کی قسم اسی روز مرگی ہوتی جس روز سکندر کے کپانے گالی دے کر میری عزت و وقار کی دو جھیاں اڑا دی تھیں۔
 اور آپ تو خود ماں ہیں بھائی! آپ نے ایسی بات کیوں کی۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ میری تاریک راہوں میں یہی ایک کرن ہے جس کے لیے مجھے سارے دکھ بھلا کر نئی زندگی جینا ہے۔“
 ”تو بے گویا، تمہیں نئی زندگی جینا ہے۔“ سیمابھائی نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔
 ”ہاں اور اس نئی زندگی میں میرے ساتھ میرا بچہ ہوگا۔ میں نے شلیل بھائی کی بات مان لی ہے۔ میں اب کبھی پلٹ کر نہیں دیکھوں گی۔ خود روؤں گی نہ اپنے ساتھ کسی اور کو رلاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ وہ بڑے نرم سے بول رہی تھی۔ سیمابھائی کچھ حیران ہو کر اسے دیکھ گئے۔ ایک ہی رات میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔

~~*

سیمابھائی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں حصہ لینے لگی تھی اور اشعر سمیہ کے لیے بھی وہ ان کی پہلے والی پوچھ بچھ مانتی تھی۔ انہیں ہوم ورک کروانی پھر چھوٹے موٹے گیمز اور رات میں سمیہ کو اپنے ساتھ سلا کر اسے بیڈ کی کمائیاں سناتی۔ یوں بہت حد تک اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ اور جو وقت تنہائی کا ہو تا اس میں وہ اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ گزرے کل سے اس کا بالکل ناٹوٹ گیا تھا۔ وہ تو اس کی زندگی کی ایسی چٹائی تھی جس کا اس کے خیال میں گزرتا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ بس وہ خود ہی پلٹ کر

دیکھنے سے گھبراتی تھی کہ کہیں پتھر کی نہ ہو جائے۔

بہر حال اسے اسلام آباد آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران کراچی سے جب بھی فون آیا۔ ٹھیکر بھائی سہما بھائی نے اس کے کہنے پر بھی اسے کسی سے بات نہیں کرنے دی تھی۔ خود ہی اس کی خرید و بیعت تھانے کے کام کی طرف سے پورا اطمینان دلا دیتے تھے۔ یہ احتیاط انہوں نے صرف اس لیے کی تھی کہ کہیں اماں جی انہوں میں اس کے زخموں کو نہ چھیڑ جائیں۔ جنہیں بھرنے میں وقت سے زیادہ ان کی کوششوں کا دخل تھا۔ اسی کی بناء دونوں میاں بیوی نے اپنی وہ تمام سرگرمیاں ترک کر دی تھیں جن میں وہ شامل نہیں ہو سکتی تھی اور زیادہ اس کے ساتھ یوں گزارتے کہ اسے یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس آئے۔ اس کے باوجود اب اسے اماں جی اور ابائی کی یاد آنے لگی تھی۔ جن سے وہ بھی اتنے دن دور نہیں رہی تھی۔ شام وہ ٹھیکر بھائی کے پاس بیٹھ کر بہت عاجزی سے بولی تھی۔

”بھائی! میں اماں جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے بہت سیاد آ رہی ہیں اور ابائی بھی۔“

”یاد آ رہے ہیں تو فون کر لو جانا ضروری ہے کیا؟“ انہوں نے بڑے آرام سے مشورہ دے کر پوچھا۔ ”مگر آپ ضروری نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے فون کر لیتی ہوں۔“ اس نے کچھ اتنی مایوسی سے کہا کہ ٹھیکر بھائی اس پر رحم آ گیا۔

”فون منع نہیں کر رہا بیٹا! اصل میں میرا ارادہ اماں جی اور ابائی کو کچھ دنوں کے لیے یہاں بلانے کا ہے۔ فوراً جاؤ گی تو پھر وہ آنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ اس نے فوراً کہا تو ٹھیکر بھائی اسے دیکھ کر سنجیدگی پوچھنے لگے۔

”میں اپنے جانے کی بات کیوں کرتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟“ وہ جانے کیا جانا چاہتے تھے۔

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس رہوں؟“ اس نے بہت ہمت کر کے ان سے سبب پوچھا تو وہ در خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر رہے ہوں پھر مدد مطمئن ہو کر بولے۔

”اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جو میں ابھی بتانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اللہ اور ابائی آجائیں تو میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ تمہیں یہیں رہنے دیں۔ اور بیٹا یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ خلیل بھائی اور عدیل ہیں تو یہاں میں ہوں یا تمہیں ان بھائیوں سے زیادہ محبت ہے؟“ آخر میں ان کے بھلے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

پھر تیسرے دن ہی اماں جی اور ابائی آگئے تو ایک تو وہ پہلے ہی کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ان کے سامنے خود کو مطمئن اور پرسکون ظاہر کیا۔ اس کے باوجود اماں جی اسے دیکھتے ہی رونے لگی تھیں۔ جس پر ٹھیکر بھائی خاصے انجان بن کر اس سے پوچھنے لگے۔

”آسیہ! یہ اماں جی کو کیا ہوا ہے کیوں رو رہی ہیں؟“

”پتا نہیں بھائی۔“ وہ سٹپٹا گئی۔ ”میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔“

”اماں جی! آسیہ بہت خوش ہے۔ آپ اس طرح نہیں کریں ورنہ میں اسے یہاں سے بھی دور بڑے بھلا پاس بھیج دوں گا۔“ ٹھیکر بھائی نے قدرے خشکی سے کہا تو اماں جی اپنے آنسو دھپے میں جذب کرتے ہو بولیں۔

”کہیں نہیں جائے گی یہ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

ٹھیکر بھائی نے اس وقت کوئی تکرار نہیں کی اور اٹھ کر چلے گئے۔ تب وہ اماں جی کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے

بولے۔ ”آپ روئیں نہیں اماں جی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن ابھی آپ ٹھیکر بھائی کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کریں، وہ ناراض ہوتے ہیں اور ٹھیک ہی ناراض ہوتے ہیں جب اللہ نے آپ کو ان جیسے لائق و فرمانبردار بیٹوں سے نوازا ہے تو پھر آپ کو رونے اور فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں یہی بات تکلیف دیتی ہوگی کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ پریشان ہوتی ہیں۔“

”آسیہ ٹھیک کہہ رہی ہے اماں جی۔“ سہما بھائی اس کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

”روئے وہ ہیں جنہیں آگے اندھیرا نظر آتا ہے۔ آپ کو اللہ نے ماشاء اللہ بہت نوازا ہوا ہے۔ آپ کو آسیہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بھائی کبھی اس سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”میں جانتی ہوں بھائی اس کا بہت خیال رکھنے والے ہیں لیکن۔“ اماں جی جانے کیا کہنے جاری تھیں کہ اسے کچھ کر ایک دم خاموش ہو گئیں اور اس نے اپنے آپ سوچ لیا تھا۔

”لیکن وہ مان نہیں دے سکتے جو ایک عورت کو اپنے گھر پر شوہر ہوتا ہے۔“

یوں کہتے بہت سارے دن گزر گئے۔ ابائی کچھ دن بعد ہی واپس چلے گئے تھے اور اماں جی اس کے لیے وہیں رک گئیں کیونکہ ٹھیکر بھائی کسی طرح اسے کراچی بھیجنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے اس کے لیے کیا سوچ لیا تھا اور جانے اماں جی سے کیا کہا کہ اب وہ بھی یہی کہتی تھیں کہ اسے یہیں رہنا چاہیے۔ اور اس نے ابھی تک کسی سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ سب سن کر خاموش رہتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

وہ اپنے بارے میں بہت کچھ سوچتی رہتی تھی اور خاموش یوں تھی کہ ابھی اپنی کسی سوچ پر عمل کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈیوڑھی قریب تھی۔ اور ان دنوں وہ اپنے آپ کو چھپائے پھرتی تھی۔ خصوصاً ٹھیکر بھائی کے سامنے جانے سے بہت کتراتے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس کے اندر خاصی بے چینی تھی۔ یعنی جانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں جو اس کے کراچی جانے کا تہی تیغی سے منع کر دیتے ہیں۔ کئی بار اس نے اماں جی سے پوچھا لیکن ان کے جواب اسے مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ جس سے وہ سمجھ گئی کہ انہیں بھی اصل بات معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اب زیادہ دن نہیں تھے اس نے سوچ لیا ڈیوڑھی کے بعد وہ خود ٹھیکر بھائی سے بات کرے گی۔

~~*

شاہ سکندر نے جس زندگی سے فرار کی خاطر گھر بار چھوڑا تھا۔ شاید وہی اس کا مقدر تھی۔ اور اس بات سے سمجھو مارتے ہوئے اگر اسے کچھ تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ اس لڑکی کو اجاڑ آیا تھا۔ جس نے اپنے دل کی ہستی کی عمرانی اور تمناؤں سے سوچنی تھی۔ اس کے لیے وہ خواب و خیال نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی سنگت میں لڑکا ایک لمحہ اس کے دل پر رہ گیا تھا۔ اور اس نے اپنے جینے کے لیے یہی سزا تجویز کی تھی کہ باقی ماندہ حیات انہی لمحات کے سارے تمام کرے گا، لیکن یہاں مر النساء تھی۔ جس روز اسے معلوم ہوا کہ وہ دوسری عورت شاہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دی گئی ہے تو نہ صرف وہ مطمئن ہو گئی بلکہ اس خیال سے کہ اب شاہ صرف اس کا ہے۔ اس کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔

پہلے وہ اس کی ہر بات پر تامل کر جھٹھک دیتی اور کسی طرح اپنے تنفر کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ لیکن اب وہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ شروع کے دو مہینے اس نے شاہ سکندر کو بظاہر اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے روز و شب سے غافل نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ ٹھیکت خورہ ہے اور کسی بھی وقت نوٹ کر

اس کی بانہوں میں اُگرے گا۔ اس وقت اسے سہارا دے کر وہ اگر اسے اپنا نہتا سکی تب بھی اس کی توہین نہ کی گئی۔ یعنی اس کی وہی سوچ تھی۔ جیتوں تو تجھ پاؤں ہاروں تو پتا تیری۔

پھر بڑی بھابھی نے اسے سمجھایا تھا کہ موز زیادہ عرصہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے بھی وہ زیادہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ کسی اور راستے پر نہ چل نکلے۔ کہ ایک عورت کے چنگل سے نکلنا تو بابا جان کے لیے ہو سکتا تھا لیکن غلط راستے پر نکلے ہوئے قدموں میں وہ بھی زخمی نہیں ڈال سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے حال پر چھوڑنے کے باوجود وہ اس کے روز و شب پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔

گو کہ شاہ سکندر نے آتے ہی اسے اپنے کمرے سے بے دخل کر دیا تھا پھر بھی رات میں جب تک وہ سو رہی کسی نہ کسی بہانے اس کے کمرے کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ کبھی اس کے پریش کیے ہوئے ٹکڑے المار پر رکھنے کے بہانے، کبھی بیڈ کی چادر تبدیل کرنا۔ کسی وقت بچے کو اس کے دروازے پر چھوڑ کر پھر اسے اٹھا کر بہانے آجاتا اور آخر میں دودھ کا گلاس رکھنا تو بہت ضروری تھا۔

اس وقت وہ بچے کو اس کے پاس بھیج کر خود شہر بانو کے پاس آ بیٹھی تھی۔ جس کی دواہ کی پچی جانے کس تا کے باعث درود کر بیان ہو رہی تھی۔

”اٹاؤ مجھے دو۔“ اس نے شہر بانو کی گود سے پچی اپنی گود میں لے لی اور ادھر ادھر سے چیک کرنے کے بعد گئی۔

”اسے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ جیڑاں سے کھو، جلدی سے تیل گرم کر کے لائے۔“

شہر بانو فوراً ”اٹھ کر چلی گئی اور جیڑاں سے کہہ کر فوراً واپس بھی آئی تو وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”میشٹر کہاں گیا اس کمرے کا؟ اتنی سردی میں تم نے پچی کو بغیر ہٹ کر سلا یا ہوا ہے۔“

”خراب ہو گیا تھا۔ میں نے غلام علی سے کہا بھی کہ آج ہی آج ٹھیک کرالے آتا لیکن۔۔۔“ شہر بانو دہرایا۔

جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”غلام علی تو بس۔۔۔ مہرا لہنا نے سر جھٹکا پھر جیڑاں کے آنے پر پچی اس کی گود میں دے کر بولی۔ ”اس کے پر اچھی طرح مالش کر کے لیٹ دو۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے اسے۔“

شہر بانو کچھ دیر جیڑاں کو بچی کی مالش کرتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”تمہارا آغا کہاں ہے؟“

”اپنے باپ کے پاس۔“ مہرا لہنا اپنے اوپر لحاف کھینچتے ہوئے بولی۔ ”اب تو شاہ خود بھی اسے بلانے ہیں۔“

”اور تمہیں؟“ شہر بانو نے شوق و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تو وہ آہ بھر کر بولی۔

”میری ایسی قسمت کہاں، مجھے تو دیکھتے ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔“

”ارے ایسے ہی تمہیں ستانے کو کرتے ہوں گے ورنہ تم سے منہ موڑا جاسکتا ہے بھلا۔ تمہاری صورت ہی تو انہیں کھینچ لاتی ہے۔“ شہر بانو نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

”اچھا۔“ وہ ذرا سانس ہی پھرنے کی گود کھ کر کہنے لگی۔

”تمہاری بیٹی اب سکون سے سو گئی ہے۔ اسے کبیل کے اوپر لحاف بھی اوڑھا دیتا۔ میں صبح غلام علی کی طرف

گئی۔ کوئی کام کر کے نہیں دیتا۔“

”حالات میں نے اسے بہت تاکید کی تھی لیکن شاید وہ بابا جان کے کسی کام سے چلا گیا تھا۔“

”یہ کام زیادہ ضروری تھا۔ خود غلام علی جاسکتا تھا تو کسی اور سے کہہ دیتا۔“ مہرا لہنا کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چھائیں چلتی ہوں، آغا کو دیکھوں سو یا کہ نہیں۔ بہت شرارتی ہو گیا ہے۔“

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

دیکھنے کے بجائے پلکیں موند لیں۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا کوئی عکس دیکھ لیں۔
 ”آسیہ!“ سیمابھابی نے اس کا چرواخی طرف موڑا۔
 ”تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ کوشش سے مسکراتی تھی۔

”مگر تم سب نارمل ہو گیا۔ بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ گڑیا جیسی بیٹیاں ہیں۔ میں اماں جی کو بتاتی ہوں۔
 پریشان بیٹھی ہیں۔“ سیمابھابی اس کا گال تھپکتے لیبروم سے نکل گئیں تو وہ پھر بچیوں کو دیکھنے لگی جنہیں
 نکلانے کے ساتھ جانے کون سی زبان میں کیا کیا بولے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے
 پر مسکراہٹ پھیل چلی گئی۔

”آج کا زمانہ میں بلی اچھا ہے۔“ سسڑا سے اپنی طرف دیکھتے پتا کر کے گئی۔
 ”بہت سکھ دیتا ہے اور بابا لوگ خالی پریشان کرتا ہے۔ ساری زندگی مدراس کے لیے دکھ جھیلتا رہا اس
 نہیں ہوتا۔ بے بی لوگ بہت احساس کرتا اور پتا بھی بہت کرتا۔ لو تمہارا بیڑ تیار ہو گیا۔ ان کا
 ہے؟“ آخر میں سوال غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن اچانک تھا۔ جب ہی اسے جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔
 ”وہاں ہر ہوتے ہیں۔“

”پھر تو ہمارا انعام کیا۔ اتنا بار انون بے بیڑ کا خوشخبری سنا کر ہم تمہارے پسینہ بہت انعام لیتا۔“
 ”وہ تم مجھ سے لے لیتا، سہلے مجھے کرے میں تو پچھاؤں۔“ اس نے کہا تب ہی سیمابھابی آگئیں ان کے
 جہاں آرائشیں اور ان کے کمرے پر سسڑا سے اسٹریچر پر ڈال کر کمرے میں لے آئی۔
 وہ بیڈ پر لیٹی تب اماں جی کو دیکھنے لگی جو کونے میں جا نماز پر بیٹھی تھیں اور جب فارغ ہو گئیں تب
 کہیں آئیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پہلے پھونک ماری پھر کہنے لگیں۔

”تمہاری پیدائش پر میں بہت خوش ہوئی تھی اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ میری بیٹی کو بہت
 سعادت مند بناتا۔ تم واقعی نیک اور سعادت مند ہو۔ مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی نہ تمہارا
 سے کبھی میرا دل دکھا بلکہ تمہاری ذات سے میں نے بہت سکھ پائے ہیں اس کے باوجود میں تمہاری
 لیے ایسی دعا نہیں مانگوں گی کیونکہ نیکی اور سعادت مندی میں صرف تمہارے لیے سکھ ہے۔ انہیں کیا۔
 اسے اپنے وجود پر بھی نصیبی چوینیاں رہتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جانے اماں جی کیا کہنے جا رہی
 ”دعا میں بھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ ضرور قبول ہوئی ہیں۔“ قدرے توقف سے اماں جی پھر گویا ہو۔
 ”کل تک میں اپنی دعاؤں کی قبولیت پر بہت خوش ہوئی تھی کہ تمہارے لیے میں نے جو مانگا وہ
 اب احساس ہو رہا ہے کہ پورا تو بے شک ہوا لیکن اس میں تمہارے لیے کیا تھا۔ سارے سکھ تو میرے
 آگئے۔ تم تو۔“ اماں جی کی آواز حلق میں کہیں انک گئی۔

”اماں جی۔“ سیمابھابی جانے کب ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ دھیرے سے ان کے کندھوں
 کر بولیں۔
 ”آسیہ کو آرام کرنے دیں۔“
 ”تمہاری بیٹیوں کے لیے پتا ہے میں نے کیا مانگا ہے؟“ اماں جی سیمابھابی کو رکنے کا اشارہ
 لگیں۔

”اللہ ان کے نیک نصیب کرے۔ ساری زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولیں۔“
 ”آمین۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔
 ”بے بیڑ آگئیں۔“ سسڑوں بانڈوں میں بچیاں دبائے اندر آتے ہوئے بولی۔
 ”ان کا دادی کہاں ہے؟ ہم بے بیڑ اس کو دے گا اور اپنا انعام لے گا۔“

”یہ ان کی مانی اماں ہیں۔“ سیمابھابی فوراً ”اماں جی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔
 ”بے بیڑ ان کی گود میں دو اور انعام مجھ سے لو۔“

”ہم اللہ۔“ اماں جی فوراً دوسرے بیڈ پر جا بیٹھیں اور دونوں بیٹیوں کو گود میں بھر کر بہت شوق سے باری باری
 دیکھنے لگی تھیں۔

”کوئی فرق نہیں ہے اماں جی! بالکل ایک شکل ہے۔ سیمابھابی! سسڑ کو فارغ کرنے کے بعد اماں جی کے پاس
 بیٹے ہوئے کئے لگیں۔

”دراسارنگ میں ہی فرق ہوتا وہ بھی نہیں ہے۔ آسیہ تک پہچانے میں غلطی کرے گی۔ ہے ناں۔“
 ”ہاں ابھی تو ایک جیسی لگ رہی ہیں بڑی ہوں گی تو شاید ایک ایک ماں پر اور دوسری۔“ اماں جی ایک دم خاموش
 رہیں تو سیمابھابی بات بدلتے ہوئے کہنے لگیں۔

”آسیہ کو کھوکھو بھی لگ رہی ہوگی۔ میں نے شکیل کو فون کر دیا ہے، وہ اشعر اور سمیدہ کو اسکول سے لیتے ہوئے
 دھری آ رہے ہیں۔ ان سے میں نے سوپ اور بسکٹ وغیرہ لانے کو کہا ہے باقی پھر میں ابھی ان کے ساتھ کھرجاؤں
 اپنا نظام کروں گی۔“

”کتنے دن رہے گی آسیہ یہاں؟“ اماں جی نے پوچھا۔
 ”اکڑ چھ دن کہہ رہی ہیں، خیر کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ گھر قریب ہے، میں پیدل آ جا سکتی ہوں۔ میرا
 رہنے بچے آگئے۔“ سیمابھابی کو ریڈور میں اشعر کی جھلک دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر اشعر
 کا رونا سنا۔ ”ہی اشعر اور سمیدہ بھاگتے ہوئے آگئے۔“

”آرام سے آرام سے، شور بالکل نہیں۔“ سیمابھابی نے پلٹ کر انہیں تنبیہ کی پھر شوہر کے ساتھ اندر آئی
 شکیل بھائی نے بیٹھے ہی پہلے اس کا حال احوال پوچھا پھر بچیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
 پائی گی۔ خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوئے۔
 ”مجھے تو کل کی بات لگتی ہے۔ آسیہ اتنی سی تھی۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں بھائی! جیسے مجھ سے بہت بڑے ہوں۔“ کتنی دیر بعد اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔
 ”بڑا تو ہوں ناں اور مجھے یاد ہے، میں تمہیں ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اب میرا بیٹا دیکھ رہا ہے۔“ انہوں نے نصی
 دہانہ پٹھے اشعر کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! اسے ہم گھر لے جائیں گے۔“ سمیدہ کی خوشی دیدنی تھی۔
 ”ہاں بیٹا، دونوں کو لے جائیں گے ایک آپ کے لیے۔“
 ایک مری۔ ”اشعر بول پڑا تو سیمابھابی ہنسنے ہوئے کہنے لگیں۔

”ہلو! کھانا فائدہ تو ابھی سامنے آگیا، ورنہ اشعر اور سمیدہ میں ابھی لڑائی شروع ہو جاتی۔“
 لاہر خاموشی سی ہو کر ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ سب خوش تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے بچتے
 بچوں کی پیدائش پر خوش ہوتی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے اندر گہری خاموشیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ دل چاہا ہر
 نرسے آنکھیں اور کان بند کر لے۔ نہ شوق کھکھلائی نہ کسی کی آواز سنائی دے، نہ کھلنے چرے نظر کے سامنے

”آسیہ! سیمابھابی اچانک اسے پکار کر بولیں۔
 ”نہی بی بی کا نام تم نے تجویز کیا تھا، تمہاری ایک بی بی کا نام میں تجویز کروں؟“
 اس نے اثبات میں سر ہلایا تو سیمابھابی نے پہلے اپنے پالوں سے پن نکال کر سمیدہ کی آنکھوں سے ذرا سا

جی جی بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پٹنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“
 میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ نیبل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔
 بی۔ سب کچھ موجود ہے۔“

...

”اب بہت رہ لیا میں نے یہاں“ اب آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کہہ دیجئے شکیل بھائی سے کہ مجھے نہ اور جلدی ہمارے جانے کا انتظام کر دیں۔“ وہ جیسے جانے کا تہیہ کرنے لگی بولی تھی۔
تو تین دن سے کہہ رہی ہوں شکیل سے ”روز کل پہ ملتا ہے۔ صبح کہہ رہا تھا۔ تمہارے اباجی آکر لے لے“ اب دیکھو وہ کب آتے ہیں۔“

نہ اسے اٹھنے میں دیر ہوگئی۔ ٹھیکیل بھائی آفس جا چکے تھے۔ جس پردہ ابھی خود کو شام تک صبر کرنے کی رشتہ تھی کہ اباجی کی آمد سے اس کی ساری ناراضگی اور غصہ دور ہو گیا۔ قدرے ہچکچا کر ان کے سینے سے بے ہوئے۔

”ابا جی آگے بڑھ گئے۔ سیما بھابھی بھی ابھی اماں جی کے پاس تھیں۔ اس لیے وہ کچن

218

”آپ کہاں پریشان ہوں گی بھائی! میں دیکھ لوں گی، نوپرا اہلم۔ بس آپ اماں جی کے سونے کا انتظام کروں۔“ اس نے کہا۔

لگ رہا تھا۔ البتہ دن میں اماں جی سے وہ وقفے وقفے سے کہتی رہی کہ اسے بھی جانا ہے اور ہاں جس "چچا" کر کے رہ جائیں۔

شام میں سردی کی شدت میں اضافے کے باعث لاؤنج میں بیٹھنا محال تھا۔ ٹھیکل بھائی آتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیما بھابی نے اس کے کمرے میں بیٹھ کر کراشعر اور سمیٹھ کولالہ میں بیٹھا دیا اور اسے بھی کمرے سے نکلنے سے سختی سے منع کیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ ان کے پیچھے اور ان کے ٹوکنے سے پہلے کہنے لگی۔

"مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم سب خانوں میں بیٹھیں اور آپ کھانا پکائیں۔ ہمیں رہا ہوں۔"

"اب میں تم سے کیا کہوں۔" سیما بھابی سمجھ گئیں۔ وہ ایک نہیں سنے گی "اس لیے چلے گئیں۔"

"مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ٹھیکل بھائی سے کہیں کہ آپ کو خانا سالہ کا اچھی پوسٹ پر ہیں۔" وہ روٹی پیلے ہوئے بولی۔

"جناں! وہ کہتے ہیں تم کرتی کیا ہو سارا دن" ایک صرف کھانا ہی تو پکاتی ہو۔ حالانکہ چھٹی کے کہ کس طرح کام کرنے والی کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ بس ان مردوں کو عادت ہوتی ہے۔ دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ تو ہے" ادھر خلیل بھائی بھی ایسے ہی ہیں۔ حالانکہ میونہ بھابی سارا دن مصروف رہتی ہیں کچھ نہیں کرتیں۔" وہ بڑی فراخ دلی سے بھائیوں کے مقابلے میں بھادوں کی طرف اشارہ کرنا پکڑنے سے فارغ ہو کر کسی اور کام کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ سیما بھابی کہنے لگیں۔

"بس اب اور کچھ نہیں کرنا سب تیار ہے۔ تم ٹھیکل سے پوچھ کر آؤ کھانا کہاں کھاؤ گے اماں جی اور بچوں کے لیے کھانا نکال دوں۔"

"نہیں بھی اماں جی کے ساتھ کھاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے کبھی سے نکل آئی اور ٹھیکل بھائی کھولنے لگی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی۔ ٹھیکل بھائی کہہ رہے تھے۔

"آسیہ کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ یہیں رہے گی۔ آپ اس کی طرف سے بالکل بے ساری بات طے ہوتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور اس کی بیٹیوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

چھوڑ دیں۔ ایک آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہاں خلیل بھائی کے بچوں میں مل جائے گی۔"

"میرے خدا۔" وہ اگرچہ ساری بات سمجھی نہیں تھی تب بھی چکر اگئی تھی۔



بڑی مشکل سے اس نے خود کو سارا دے کر اندر جانے سے روکا اور پورے دھیان سے خاموشی کے بعد اباجی کی آواز آئی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے۔ تم نے اس کی بیٹیوں کا بتایا ہی نہیں۔"

"بتایا ہے اباجی، ہر بات بتائی ہے۔ کچھ نہیں چھپایا۔ آپ جانتے ہیں میں بہت کھرا بندہ ہوں نہ دھوکا دینے والے کو پسند کرنا ہوں۔ اور میں آپ کو بتاؤں اگر شاہ سکندر، آسیہ کو چھوڑ کے چنگل سے نکال لیتا۔ یہ میں نے اسی روز سوچ لیا تھا جس موز مجھے کراچی بلا کر اپنے

بانت مصل آپ کی خاطر میں نے ایک تیسرا راستہ نکال لیا تھا۔ ہر حال یہ اچھا ہوا کہ جلد ہی اس کی بات کی اور وہ خود چلا گیا اور نہ مجھے اسینڈ لیتا بڑتا۔"

بات کر رہا تھا آسیہ کی۔ اس کے لیے اصفنان علی بے حد مناسب ہیں۔ میں کل رات کے کھانے پر لیا ہوں۔ آپ بھی مل لیں اس کے بعد میں چاہوں گا کہ دو مہینے کے اندر آسیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔"

بات سموت سے بول رہے تھے۔

اب انھوں کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔

فیکہ بے پناہ لیکن پہلے آسیہ سے بھی تو پوچھ لو۔" اباجی کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

بے پوچھا نہیں سمجھتا ہے اسے اور میرا خیال ہے وہ خاصی حقیقت پسند لڑکی ہے جلد سمجھ جائے گی۔" نے نانا نے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ ایک دم دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور بے حد سانسف سے کی کو کہنے لگی تو وہ سمجھ گئے کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے اس پر بھی بڑے آرام سے بولے۔

اسے میں تمہارے متعلق ہی بات کر رہا ہوں۔"

ٹھیکل بھائی! جتنا کہ بچہ اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہے گا۔ کیونکہ آپ کے سامنے آپ کی بہن یہ اور صحبت کی ماں کھڑی ہے۔" وہ ساری ہمتیں لیجا کر کے شاید زندگی میں پہلی بار بڑے بھائی کے ٹرک کی ہو گئی تھی۔

آپ خود کہہ رہے تھے کہ میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ ہاں یہی سچ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی بڑی بیٹیاں ہیں۔ میرے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے پہلے آپ اور اماں جی آپ بھی سن لیں کہ میں اپنے غم سے غمے نہیں ہونے دوں گی۔ ایسی کوئی بھی کوشش میری موت ہوگی۔"

تخم کرتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل آئی اور اماں جی کے پاس آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ نہیں کیا ہوا؟۔" اماں جی پریشان ہو گئیں۔ "ارے ابھی تو اچھی بھی گئی تھی۔ بھائی نے کچھ کمایا نہ بتاؤ؟۔"

بے کچھ نہیں کمایا اگر کہیں گے بھی تو انہیں حق ہے۔" وہ اسی طرح جڑتے ہوئے بولی۔

بھائی نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سنی تھی اور برہنہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

نہیں رلائے کا تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔"

لی ہے۔"

"ٹھیکل بھائی ذرا سا مسکرائے پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ "آئی ایم ساری" میں نے شاید انا غلط استعمال کر لیا یا شاید وقت سے پہلے تم پلیز آنسو پونچھ لو ورنہ اباجی مجھے بچوں کے سامنے بہت

بیویوں سے آنکھیں رگڑ کر سیدھی ہو بیٹھی تو ٹھیکل بھائی اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اماں جی کو رکے بولے۔

جی! ذرا بتائیے تو آسیہ میری بہن پہلے سے یا ان بچیوں کی ماں؟۔"

”میں جانتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں آپ سے کہ جب بھی میں نے اپنے لیے ایک گھر کی ضرورت
سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گی۔ ابھی تو مجھے ہر طرف فریب سی فریب نظر آتا ہے۔ اور مزید کسی فریب
دل اور ذہن دونوں ہی تیار نہیں ہیں۔ مجھے اپنی زندگی جینے دیں۔ کوشش تو کرنے دیں۔ ہو سکتا ہے
لیے بہتری کی صورت ہو۔“ وہ کچھ رک رک کر بول رہی تھی۔

”ہوں!“ ٹھیک بھائی نے ہر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”تمہیں اپنی زندگی
اور تم سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم کیس بھی اپنی ذات اور اس کے
انداز مت کرو کیونکہ تمہارے لیے زندگی ختم نہیں ہو گئی۔“
”زندگی شروع ہی اب ہوئی ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
”یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ اماں جی بھی سمجھیں کوئی ایسا مسئلہ ہے
نہیں ہو رہا۔

”کچھ نہیں اماں جی! یہ آسیر کراچی جانے کی بات کر رہی ہے۔“ ٹھیک بھائی اٹھتے ہوئے بوسا
پھر میں کل ٹکٹ لیتا آؤں گا۔ برسوں دن کی فلائٹ ٹھیک رہے گی۔ اسی حساب سے تم تیاری کر لیں۔
”شکر ہے بھائی! آپ میری کسی بات سے ناراض تو نہیں ہوئے؟“ اس نے اندر ہی اندر مطمئن
ٹھیک بھائی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا پھر کمرے سے نکل گئے۔

وہ جانتی تھی۔ بھائی، بھابھیاں سب اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ان کی محبت ہے کہ
کوئی خاص صورت موڑے کر چاہتے ہیں کہ وہ فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے لیے کو فراموش
زندگی گزارے اس میں ان کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہے، لیکن وہ کیا کرتی! اپنے لیے کو فراموش کر
اس کے لیے یہ ساری باتیں سوچنا ہی الجھن، بہت مشکل تھا۔ جو ٹھیک بھائی چاہتے تھے اور جو چاہتے
بار بار سمجھاتی رہی تھیں اور وہ جانتی تھی آگے خلیل بھائی، میمونہ بھابھی اور عدیل بھائی بھی ایک
گئے اس کے لیے اس نے خود کو اسی وقت سے تیار کرنا شروع کر دیا تھا جب جہاز نے فضا میں بلند
کو دھندلا دیا تھا۔

پورے چھ مہینے بعد وہ گھر آئی تھی۔ میمونہ بھابھی کے ساتھ بچے بھی شدت سے منتظر تھے
بیٹیوں کو دیکھنے کا اشتیاق زیادہ تھا۔

”مجھے سہما بھابھی نے فون پر ہی بتایا تھا کہ بہت ساری بیٹیاں ہیں اور بالکل ایک جیسی۔“ ہم
کبل میں لیٹی بچی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ پھر اماں جی کی گود میں سوئی بچی کو دیکھ کر کہنے لگیں۔
”لیکن شکر ہے ایک کے گال پر تلے بے زور نہ بچانا مشکل ہوتا۔“

”نفل نچل نہیں ہے۔ سیما بھابھی روزانہ کاجل سے بنا دیتی تھیں اور مجھے بھی ابھی تو اس سے
صباحت ہے۔“ اس نے قہرے کمرے کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔
”چلو ہمیں بھی پتا چل گیا کہ یہ صباحت ہے اور یہ۔“

”مدرجہ۔“
”ماشاء اللہ دونوں نام اچھے ہیں۔“ میمونہ بھابھی تعریف کے ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز میں
”اب ایسا کرو۔ دونوں کے گلے میں ناموں کے تعویذ ڈال دو تاکہ کسی دن اگر ٹل لگنا بھول جاؤ تو
جانے دیے آپس کی بات ہے۔ ایک سے ہی کام چل جاتا۔“

”تو یہ“ اماں جی کا تو خیال کریں۔ اس نے ان کے بازو میں چٹکی کاٹ گھورا پھر بھی وہ باز نہیں
بازو سلاتے ہوئے بولیں۔
”دو اکٹھے مانگتے تھے تو ایک بیٹا مانگ لیتیں۔ کیوں ہلائی؟“

”ماں جی ان کی طرف متوجہ نہیں تھیں بس بیٹے کا سن کر جواب دے دیا۔“

”اباں جی نے تو بات ہی ختم کر دی۔“
”اباں جی اب بھی اٹھ جائیں مدتیں ہو گئیں آپ کے ہاتھ کی چائے پئے ہوئے۔“ اس نے کہا۔
”بلکہ کہہ کر تو تم نے خلیل کی بہن ہونے کا کیا کافایت دے دیا ہے۔“ میمونہ بھابھی برا مانے ہوئے اٹھ
”ہاں۔“ ”تمہارے بھائی صاحب ہر ایک گھنٹے کے بعد کی بات نہ کر چائے مانگتے ہیں۔“
”ہاں۔“ ”آپ تو ناراض ہو گئیں۔“ چلیں میں مدتوں بعد آپ کو اپنے ہاتھ کی چائے پلائی ہوں۔“ وہ اٹھنے
ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“
”ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔“

انہوں نے گلے لیا تو وہ چونک کر بولی۔
 ”بس ٹھیک بھائی نے نہیں آنے دیا۔ ابھی بھی روک رہے تھے۔“
 ”کیوں؟“ ”میمونہ بھائی نے کھوجی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔“
 ”بناؤں گی کسی وقت اطمینان سے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلیں اماں جی کے پاس، بچے تنگ کر رہے ہیں۔“
 ”تم چلو۔ میں سالن چڑھا کر آتی ہوں۔“ ”میمونہ بھائی نے کمرے سے نکلتے ہی کچن کا رخ کیا اور وہاں پاس چلی گئی۔

شاہ سکندر پہلے کی طرح اپنے کسی کام سے کراچی آیا تھا۔ اور گوکہ آئیہ کی زندگی سے نکلتے ہی اس پر عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا نہ اس کے بارے میں جاننے کی سہ کرتے ہوئے اس کے پیش نظر اپنے نہیں آئیہ کا مغاڑ تھا کہ وہ اسے خواب سمجھ کر بھول جائے اور اسے تلاش کر لے اور اس کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن تھا کہ وہ اس کی فضاؤں تک سے نا تاؤ را ثابت کر دے۔ ورنہ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ اسے محسوس کرتی رہے گی۔ پتا نہیں اسے یہ یقین کہ کبھی اس سے نفرت نہیں کر سکے گی اور اس یقین میں جانے اس کا وہی زعم تھا یا اس لڑکی کے دل کی نہ گہرائی سے چھو آیا تھا۔ کچھ بھی تھا یہاں بہر حال وہ خود غرض نہیں ہوا تھا کہ وہ ساری زندگی اس کے سارے گزار دے۔ اس کے برعکس جیسے وہ خود مرنساء کے ساتھ کچھ دما تر کر کے زندگی کی گاڑی اس کے لیے بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔

اس لیے اپنے آپ کو کبھی اس نے خاصا پابند کر لیا تھا۔ گو کہ اس تمام عرصے میں تڑپتے چلتے دل کو قرار نہیں آیا تھا اور کسی کسی وقت تو دل چاہتا کہ ساری ہند میں توڑ کر بس اس کی ایک جھلک دیکھ لے۔ راستوں سے ہی اس کا احوال پوچھ آئے جن پر کبھی وہ اس کے ساتھ تھی لیکن خود پر جبر کر کے اب عہد پر قائم تھا۔ اور شاہ پور سے چلتے ہوئے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ اپنا کام مٹا کر فوراً واپسی کی راہ کراچی کی حدود میں داخل ہوتے ہی وہ سب بھول گیا۔ یہ بھی کہ کس کام سے آیا ہے۔ بس مختلف براؤں میں اس کے اندر کا اضطراب تھا جو اسے کیسے نہیں دے رہا تھا۔

یہاں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی وہ دل میں اترتی تھی۔
 یہاں میں اسے پہلی بار لے کر آیا تھا اور اسی وقت اسے دل کا احوال سنا کہ میں نے اسے یہ یقین اس کے مقصد کی راہ میں جاہل ہونے کی بجائے ہمیشہ اس کے ساتھ چلوں گا۔

وہ ایک ایک راستے پر رک کر ان لمحات کو آواز دے رہا تھا جس کے بارے میں اس نے گمان بھی نہ تھا اتنی جلدی ایسی یادوں گرورہ جائیں گے جو ہمیشہ اسے تڑپاتی رہے گی۔ عجیب بے قراری کے ساتھ اسے اور ایسی حالت میں اس نے کلفٹن کا رخ کیا تھا کہ راستے میں احمد حسن کا آفس دیکھ کر گاڑی وہیں دو تمام عرصے میں اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا جب ہی احمد حسن نے اسے دیکھتے ہی سخت اظہار کیا۔

”خبردار مجھ سے کلام نہیں کرنا میں تمہاری دوستی پر فاتحہ پڑھ چکا ہوں۔“
 شاہ سکندر یہی سمجھا کہ وہ اس کے انتہائی اقدام سے واقف ہو کر ایسا کہہ رہا ہے۔ جب ہی اس کے سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہر سزا کے لیے تیار ہو۔
 ”آخر کن چکروں میں الجھے ہو۔ کیسے ملتے ہی نہیں۔ تمہارے گھون کر کے تھک چکا ہوں۔“
 آئیہ بھائی کو لے کر نہیں آئے۔ ”احمد حسن کی آخری بات پر وہ سراوچا کر کے اسے دیکھنے لگا۔“

”کیا بات ہے؟“ ”احمد حسن ٹھٹھک گیا۔“ ”آئیہ بھائی تو ٹھیک ہیں ناں اور تم تو غالباً بابا جان کو منانے گئے۔“
 ”ابھی تک اسی کوشش میں لگے ہو۔؟“
 ”نہیں راجی تم نہیں جانتے۔؟“ ”اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔“
 ”کیا نہیں جانتا؟“ ”احمد حسن جلد جانے کو بے چین ہو گیا۔“
 ”ہاں بار زندگی کا وہ سفر جو میں نے آئیہ کے ساتھ شروع کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ حالانکہ میں کمزور نہیں تھا۔ مڑا تھا۔ لیکن اس لڑائی میں بابا جان نے آئیہ کو گھٹیت کر کچھ میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے تھے اور اگر میں زندہ نہ رہتا تو آئیہ کے ساتھ اس کے گھروالے بھی بابا جان کے ظلم سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔“ وہ بہت دل رنہ لگ رہا تھا۔

احمد حسن سانے میں آگیا تھا۔
 ”میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ میں آئیہ کو لے کر کہیں بہت دور نکل جاتا۔ جہاں تک بابا جان کی رسائی نہ ہوئی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس کے گھروالے بے موت مارے جاتے اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ آئیہ تو اس درے ہی مر جاتی پھر تباہ کیا رہ جاتا۔“
 وہ اپنی نظروں کے سامنے پیروٹ کو گھماتا ہوا بول رہا تھا۔
 ”راؤ باب بھی کچھ نہیں، لیکن کچھ نہ ہونے میں کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ وہ اپنی زندگی میں آج نہیں توکل میں ایڈجسٹ ہو جائے گی کیونکہ وہ جذباتی لڑکی نہیں ہے جو یادوں کے سارے عمر بتا دے بلکہ شاید وہ توروں کے بنے میں بھی وقت ضائع نہیں کرے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے دکھ نہیں ہوگا۔ یہ دکھ وہ اسی طرح حال کر رہے گی جیسے خوشیاں۔ اور اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کرے گی وہ انہیں ساتھ لے کر چلے گی لیکن بارہا میں جاں نہیں ہونے دے گی۔“

”انتا جانتے ہو اسے؟“ ”احمد حسن سانے میں ہی بولا تھا۔
 ”شاید اس سے بھی زیادہ۔“ ”اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ چلی تھی۔
 ”تو در خواستی چھانی رہی۔ جب احمد حسن سانے سے نکلتا بھی کچھ نہیں بولا۔ چاہنے کے باوجود اسے تھم بھی نہیں کر سکا کیونکہ وہ بہت نوتا ہوا لگ رہا تھا۔
 ”تم۔“ شاہ سکندر ایک دم خیال آنے پر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں اسے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔ ”تمہیں احمد ناں ساری باتوں کی خبر کیوں نہیں ہے؟ کیا ان کی طرف سے کسی نے نہیں بتایا؟“
 ”ملاقات ہی نہیں ہوئی کسی سے۔“ ”احمد حسن نے سمجھ کر بھی سرسری انداز میں کہا۔
 ”کیا مطلب ہے جو نالہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا؟“

”جی اسی وجہ سے تو میں بھی فون وغیرہ کرنے سے رہ گیا۔ ورنہ تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے میں یہ بھی یا عدل صاحب کو فون کر سکتا تھا۔ کئی بار سوچا پھر اس خیال سے رہا کہ نالہ کیسے وہ نہ سمجھیں کہ اس نے میں نالہ کے سلسلے کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور ادھر سے بھی دوبارہ کوئی نہیں آیا جس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔“ احمد حسن احساس ہونے پر کندھے اچکا کر رہ گیا۔
 ”میں کہہ چکے تھیں۔ لیکن احمد حسن اس میں تم سب کا کیا دلش؟“
 ”تمہارا پرہیزگار لے کر تو ہم ہی گئے تھے۔“ احمد حسن نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور ہنسا بھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا دل بھڑک رہا تھا۔
 ”میں ان بار نالہ کے لیے کوئی کی نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو۔“ احمد حسن اسے جزیرہ تو دیکھ کر بولا تھا۔
 ”میں تو واقعی نہیں ہے لیکن۔“ ”خیر یہ بتاؤ کیسی ہے نالہ اور آئیہ؟“ ”وہاں بہت بدل گیا۔“
 ”میں تو خود ہی دیکھ لو۔“ احمد حسن فوراً ”کہہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔“
 ”میں اس وقت میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا بلکہ شاید کبھی جی نہ کر سکوں۔“

”دکس کس کا سامنا نہیں کرو گے؟“ احمد حسن بے اختیار کہہ گیا پھر فوراً اپنی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
 ”تمہارا جرم واقعی بہت بڑا ہے سکندر! لیکن قابل معافی یوں ہے کہ اس میں تمہارا بھی اتنا ہی نقصان
 آسیہ بھائی کا۔ میں نے اسی کو تمہارے حالات بتا دیئے تھے اور وہ خفا ہوئی تھیں تو اس بات پر کہ تمہیں
 انہیں کیوں نہیں بتایا تھا۔ مجھے بھی تم سے یہی لگہ ہے۔ سخت غلطی کی تمہ نے یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ہم
 راستہ نکال لیتے لیکن تم نے غیرت برت کر خود پر ظلم کیا۔ بہر حال اب تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ تمہاری فکر
 ”میں قسمت کو دوش نہیں دیتا۔“ اس نے ٹوک دیا۔
 ”چاہو باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔“ احمد حسن اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود زبرد
 بھی اٹھالے گیا تھا۔

* * *

احمد حسن کے گھر آکر اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے اپنے دل کا بوجھ بھارنے کا موقع ملا تھا۔ جس
 احساس ہوا کہ اتنا عرصہ اس نے اتنے اچھے دوست سے کوئی تعلق نہ رکھ کر ایک اور غلطی کی ہے۔
 کئی ایک فرد ایسا نہیں تھا جسے اس سے ہمدردی ہوتی۔ جب ہی وہ ایک دم سے تنہا ہو گیا تھا۔ اگرچہ
 دکھاوے کو ہی اس سے لگاؤ کا مظاہرہ کرتے جیسے پہلے کرتے آ رہے تھے تو ان سے بھی کس نہ کس
 اس کے دل کا غبار نکل سکتا تھا لیکن وہ بھی اس مقام پر اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے شاید اس لیے کہ ان
 چور تھا۔ بہر حال احمد حسن کے گھر آکر اسے بہت سکون ملا تھا۔ بس کچھ دیر آگئی نے خفگی کا اظہار کیا اور
 نئے سرے سے اسی کی زبانی اس کی رام کہانی سن کر کتنی دیر تک افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔
 ”تمہارے ماں باپ کو اتنی انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خود بیٹیوں والے ہیں اور وہ
 کا ذرا احساس نہیں کیا۔ بے شک اسے شاہ پور نہ بلاتے۔ میں کہتے دیتے اور انہوں نے تو تمہارا بھی
 کیا۔ بہر حال بہت افسوس ہوا۔ گھر نہیں اجڑنا چاہیے تھا۔ آسیہ اپنے ماں باپ کی ایک بیٹی ہے۔
 ہوگا انہیں۔“

”مجھے تو آسیہ باجی کا خیال آ رہا ہے۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی۔“ نائلہ مچ جی رونے
 شاہ سکندر اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔
 ”نائلہ! یہ کیا حقاقت کر رہی ہو۔“ احمد حسن نے اسے ٹوک دیا۔ ”سکندر پہلے ہی بریشان سے تمہارا
 ”یہ ہوش بریشان رہیں گے۔ لکھ لیجئے آپ کہیں سکون نہیں ملے گا انہیں۔“ نائلہ کسی طرح خود
 پاسکی۔ چچ کر کتنی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”سوری یا رادھ!“ احمد حسن نام ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ روک کر بولا۔
 ”نہیں۔ مجھے برا نہیں لگا۔ بیاتیں سننے کے لیے تو مجھے بہت پہلے یہاں آنا چاہیے تھا۔“
 ”میں چائے لاتی ہوں۔“ اتنی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر اس سے پوچھنے لگیں۔ ”تم آج ہی شاہ پور جاؤ
 ”جانا تو آج ہی تھا لیکن میرا کام رہ گیا ہے۔ اب کل جاؤں گا۔“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
 ”ٹھیک ہے پھر ہمیں رک جانا۔ ہو مل وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اتنی کہہ کر چلی گئیں
 کو دیکھ کر بولا۔

”رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یا رادھ! اتنی نے خواہ مخواہ۔“
 ”کوئی خواہ مخواہ نہیں۔ بس آرام سے بیٹھو اور ہاں وہ اپارٹمنٹ تو چھوڑ دیا ہو گا تم نے؟“ احمد حسن
 خیال آنے پر پوچھا۔
 ”ہاں۔ میں نے چھوڑنے سے پہلے آسیہ کے نام سے خرید کر اسے گفٹ کر دیا تھا۔“ جواب دینے
 نظروں میں اس شام کا منظر تھا جب اس نے آسیہ کو لغافہ تھمایا تھا۔
 ”یہ تم نے اچھا کیا۔ لیکن میرا خیال ہے وہاں کوئی ہے نہیں کیونکہ اس تمام عرصے میں میں وہاں

یاد اور کسی نے رسیو نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کرائے پر بھی نہیں دیا گیا۔“
 ”ہوں۔“ اس نے غائب غامفی سے سر ہلایا تھا۔

پھر اس رات کھانے کے بعد وہ کتنی دیر تک احمد حسن کے ساتھ آسیہ کی باتیں کرتا رہا۔ ماضی سے زیادہ اس کا
 خشن موضوع تھا۔ جس پر احمد حسن نے اسے ٹوک دیا کہ اسے اب اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا
 دل اپنا نہیں رہا۔
 ”نائلہ! ماں بے احمد حسن! وہ میرے بچے کی ماں ہے۔“ اس نے جتا کر کہا تو احمد حسن اپنی جگہ اچھل پڑا۔
 ”واقعی۔ تم نے پہلے نہیں بتایا، عجیب آدمی ہو یا رادھ۔ سوچ سوچ کر انکشاف کر رہے ہو۔ ارے اس بچے کے
 جے تو تم ان سے مل بھی سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں میری کسی بھی قسم کی مداخلت اسے دکھ دے گی اور
 یہ وہ دے گا تو میں نے پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مقام پر پچھ اس کے لیے براہم ہو
 رہا ہو خوشی سے اسے مجھے سونپ دے۔ میں خود سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ بچے کی
 اطرواہی زندگی تباہ کر دے۔ پتا نہیں احمد حسن میں اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔“ وہ اپنے جذبول
 واپ کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔
 ”ہاں کو یا رادھ! تو اب تمہاری فکر ہو رہی ہے کہ کسی دن کپڑے پھاڑتے ہوئے ویرانوں میں نہ نکل جاؤ۔“
 ”حسن پکارا کراٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”جواب بخیر!“ اس نے بیک پر سر نہکا دیا اور یونہی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔
 ”جی احمد حسن کے ساتھ ہی گھر سے نکلا تھا۔ اسے ایک تو پورٹ جانا تھا۔ دوسرے کھاد کی ایجنسی میں مینجر سے
 ہر تھا اور کیونکہ مینجر کا لیکارہ بچے سے پہلے ملنا متوقع نہیں تھا اس لیے وہ پہلے پورٹ چلا گیا۔ جہاں سے اس کی
 اپنی لیکارہ بچے کے قریب ہی ہوئی تھی۔ پھر مینجر سے وہ دس منٹ بات کر کے فارغ ہو گیا تو دوسرے کھانے تک
 گھر پہنچے کا سوتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس شہر کی رونقیں دیکھ ہی تھیں۔ مناسب اسپڈ سے گاڑی دوڑاتے
 ہوئے پھر ایک ایک بات یاد آنے لگی تو نڈاسکرین پر بس اس کی نظریں جمی رہ گئی تھیں۔ ذہن کے پردوں پر
 پانی فلم نے شہر کی رونقوں کو دھندلا دیا تھا۔ اور وہ اپنے راستے سے بھی ہٹ گیا تھا۔ کبھی اس سڑک بھی اس
 سڑک اور اسے احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں تو شاید وہ شاہ پور پہنچ جاتا جبکہ ابھی شہر سے بھی نہیں نکلا
 تھا اور جانے کب تک اسی طرح بھٹکتا رہتا اگرچہ قریب سے گزرتے دوپٹے کل ٹرک کے زوردار ہارن سے اس کے
 ذہن کو جھٹکانے لگتا۔ وہ بری طرح چونکا تھا اور عین وقت پر کہ سامنے روڈ کراس کرتی ٹرکی جس طرح ملن ہو کر چل
 رہی تھی وہ اگر بروقت بریک نہ لگاتا تو ایکسپلنڈ ٹیٹنی تھا۔

”گاڑی!“ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر اس نے سر کو زور سے جھٹکا پھر جھکے ہوئے اعصاب کو
 سکون کرنے کی خاطر وہ گاڑی پہنچ سڑک سے نکال کر کنارے لے آیا اور سیٹ کی بیک سے سر نہکا تھا کہ نظروں
 کے عین سامنے سڑکیوں کی چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی آسیہ پر پہلے تو اسے دہم کا کمان ہوا لیکن دوسرے بل نعین
 ہوتے ہی وہ بے اختیار گاڑی سے اتر کر اس کے پاس گیا اور اسی بے اختیار سے پکارنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔
 ”تمہارا رشتہ سے پہلے لڑکیوں کو گاڑی سے ہراساں کر کے بے ہوش کرنا پھر اٹھا کر ہسپتال لے جانا۔ آپ تو
 ہائے غلاڑی ہیں پھر وہ لڑکی بچ کیسے گئی؟“ اس کا طنز آمیز لہجہ سیدھا دل میں تازہ ہو گیا تھا وہ اپنی جگہ یوں جم گیا
 جیسے پتھر ہو گیا ہو۔

”شاہ سکندر حیات! آپ کے گاؤں میں بھی تو لڑکیاں ہوتی ہوں گی پھر کھیل کا انتخاب آپ شرعاً کریں کرتے
 نہ ہو مگر محبت کا قریب دے کر۔ ہونہ بظاہر اعلیٰ شخصیت کے اندر کتنا گھناؤنا انسان چھپا ہے۔ کاش میں جج
 یا رادھ دیا کو بتا سکتی۔“ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور بچے میں حد درجہ نفرت
 سر آتا تھا۔

”تم جتنی چاہو مجھ سے نفرت کرو لیکن میرے کردار سے“ وہ بمشکل بولنے پر آمادہ ہو کر ابھی اسی قدر کہ وہ غصہ سے بولی۔

”کیا کردار ہے تمہارا“ یہی کہ شکار کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ اور یہ تم نے غلط کہا کہ میں تر کرتی ہوں۔ سچ ہے کہ تم میری نفرت کے بھی قابل نہیں ہو۔ اور ایک بات اچھی طرح سن لو کہ اگر دیکھ کر رکنامت خواہ غلطی سے میں تمہاری گاڑی کے سامنے کیوں نہ آجاؤں بے شک روندتے ہوئے اگر یہ نہ کر سکو تو اس شہر میں آتا چھوڑ دو۔“

”تم کو تو میں جینا چھوڑ دوں؟“

”مثبت اپنی ایسے ٹھٹھا مکالے کسی اور کے سامنے بولنا۔“ وہ پیر بختی مخالف سمت تیز قدموں سے تھی۔

شاہ سکندر نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا اور سوچنے کی حد تک تو یہ سب بہت اچھا تھا کہ وہ اس کے دیکھ کر مزہ موڑے اور اپنی زندگی جتنے وغیرہ وغیرہ لیکن اب حقیقت میں اس اظہار نے اس کا دل ہلایا تھا۔ مزید اس کے طرز تخاطب پر وہ تامل رہا تھا۔ کتنی دیر وہیں کھڑا اس کے پیچھے دیکھتا رہا پھر گاڑی میں بیٹھنے سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ اس کے بارے میں اپنی گزشتہ تمام سوچوں کی نفی کر رہا تھا۔



وہ گھر آتے ہی واش روم میں بند ہو گئی۔ کیونکہ خود پر قابو پانے کی وہ ساری کوششوں میں ناکام ہونا اسے لگا جیسے ہی اماں جی یا اباجی کا سامنا ہوا وہ پھوٹ پھوٹ کر رون شروع کر دے گی۔ گو کہ وہ ان سے نہیں چاہتی تھی۔ لیکن شاہ سکندر کے ذکر کے ساتھ رو کر وہ خود کو کمزور بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر نکلی اور ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی اماں جی کے کمرے میں آکر پہلے صابحت کو دیکھا پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”دو بجیوں کی دیکھ بھال آپ کے لیے مسئلہ ہو گئی اماں جی! میں جلد ہی کسی آیا کا انتظام کروں گی۔“

ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب نے کل سے بلایا ہے۔“

”مے بے شک نوکری کرو۔ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے کیا میں نے دو دو بچہ سنبھالا۔ جب سیمپاں بھی تو سمیٹا اور سونیا دونوں میرے پاس ہوئی تھیں۔“ اماں جی کو ایک تو اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی دوسرے اس کی بات بھی ناگوار گزری تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے اماں جی! لیکن ان کے اوپر کے کام کرنے کے لیے تو کوئی ہونی چاہیے۔ آپ منہ نہیں اپنی روئین سیٹ کر لوں پھر سہلہ کام کی کروں گی۔“

”اچھا جاؤ۔ پہلے کھانا کھاؤ۔“ اماں جی انھیں کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”آپ نے کھانا؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سب نے کھالیا۔“ وہ جواب سن کر ان کے کمرے سے نکلی اور کچن میں جاتے ہوئے میمونہ کمرے میں بھاٹک کر دیکھا۔ وہ عمر کو ٹھیک رہی تھیں اس پر نظر پڑتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کیا رہا؟“

”وہی جو میں کہہ کر گئی تھی کہ ڈاکٹر وہاب کے کلینک میں اگر جگہ نہ بھی ہوئی تب بھی وہ مجھے اپائنٹ کل سے میری ڈیوٹی شروع۔“ اس نے بہت نارمل انداز میں بتایا۔

”ایک بات کہوں۔ یہ مرحلہ یعنی تمہیں جاب ملنے کا اگر تمہاری زندگی میں پہلے آیا ہوتا تو تم دروازہ چلاتی ہوئی آئیں۔ اب تمہیں خوشی نہیں ہوتی یا اظہار کرنا بھول گئی ہو؟“ میمونہ بھابھی نے بڑے شاک میں کہا تو وہ دروازہ چھوڑ کر ان کے پاس آئی بھی اور ایک نظر سوئے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بعد کہنے لگی۔

”میں آج بھی چلاتی ہوئی آتی مگر جو راستے میں شاہ سکندر نہ ملا ہوتا اسے دیکھ کر میرا مود خراب ہو گیا“

”جس شاہ سکندر ملا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟“ میمونہ بھابھی حیران اور کچھ پریشان بھی ہو گئی تھیں۔

”خاص طور پر مجھ سے۔ ملنے نہیں آیا تھا۔ بس اتفاق سے سامنا ہو گیا۔ اور وہ بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے ختم دیا۔ اختیار کیا کہ وہ ایسے ہو گیا جس سے مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ ایسا اتفاق بھی نہیں ہونے لگا۔“

”اب کوئی بات نہیں ہو سکتا ہے میرا گھر سے لگنا ہی بند کر دیں اور میں اس کے دُور سے چھپ کر کہیں بیٹھ سکتی۔“

”ہر حال میں کچھ کرنا ہے۔“

”لیکن اس نے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو؟“ میمونہ بھابھی کا دل ایسے ہی بہت کمزور تھا۔

”اب اور کیا نقصان پہنچائے گا۔“ اس کے لہجے میں دکھ بولنے لگا تھا کہ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”بہر حال یہ کوئی خائف نہیں ہوں۔“

”لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”میں پیش سے ڈر پک ہیں۔“ وہ کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔

ہرات میں کھانے کے دوران اس نے اباجی اور خصوصاً بھائیوں کے سامنے جاب ملنے پر قصداً خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ان کے نزدیک صرف اس کی خوشی اہم ہے اور واقعی اسے خوش دیکھ کر بے چہروں پر اطمینان آتا تھا۔

”ابا! تمہیں کیا ہے؟“ عدیل بھائی نے پوچھا۔

”میں بے شامیج بچے تک۔“ اس نے بتایا۔

”بچوں تمہیں خود ہی جانا پڑے گا البتہ واپسی میں میں تمہیں پک کر سکتا ہوں۔“ عدیل بھائی نے کہا۔

”تو ابراہیم بھائی! میں آج سکتی ہوں۔ بس آپ اماں جی کو سمجھا دیں۔ یہ ذرا سی دیر سویر پر پریشان ہو جاتی ہیں۔“

ابوعلی بھی اماں جی کو کن انھیں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آپ کو ہوتا ہے ایمر جس سبب کی صورت میں کتنی ہو سکتی ہے اور میں اگر فون کر کے بتا بھی دوں گی تب بھی یہ ہوتی رہیں گی۔“

”بہت بہت خود ہی سمجھ جائیں گی بیٹا! ان کی تم فکر نہیں کرو۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔“ اباجی نے اس کا سر ہلکا ہاتھ مارا تھا۔

”میرا ہاتھ تھامنے سے پہلے سوچ لیجئے شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خواب، میری میں صرف ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی ہے اسے بہرہ نہیں ڈال سکتی۔ میرے نزدیک یہ سراسر دہم دہم ہوگی۔“

جب پہلی بار شاہ سکندر نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اس کا ہاتھ مانگا تھا تب اس نے کہا تھا۔ اور اس وقت حقیقتاً اسے مستقبل بہت خوبصورت، بہت روشن نظر آتا تھا۔ گو کہ وہ بہت دور تک نہیں سوچتی تھی لیکن بہت ساری بات کو سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بہت واضح تھیں اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا مستقبل بس ایک ہاتھ میں تھا جس تک اسے واضح نظر آتا تھا اس میں سے بھی کتنا کچھ دھندلا گیا تھا۔ اور وہ دھند میں دیکھنا نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مدیجہ اور صابحت تھیں۔ جن کے نام اپنی زندگی کے اس نئے باب کو انتخاب سے ہوئے اپنی ذات کی نفی کر رہی تھی۔

”میں اب اس خیال سے میمونہ بھابھی سے پہلے کچن میں جا پہنچی کہ اس وقت کا سارا کام وہ نمٹا جائے گی، لیکن میمونہ فوراً اسے اس کے پیچھے آگئی تھیں۔“

”میں تو اب! آج ہسپتال جانا ہے پھر یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ اپنی تیاری کرو۔“

”میں تو اب! میں کوئی وقت نہیں لگتا پھر مجھے اتنی جلدی بھی نہیں جانا لہذا آپ مجھے کام کرنے دیں اور اپنے گھر چلی جائیں۔“ وہ بیٹنی چولے پر رکتے ہوئے سکون سے بولی۔

”گورنار سے پوچھئے؟“ میمونہ بھابھی ”بچے“ کہتے ہوئے محظوظ ہوئیں۔

”نہیں اماں جی اذان کے وقت ہی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پتا نہیں رات میں ان کے بغیر سوتی کیسے ہو
لگتا ہے اسی انتظار میں جاتی رہتی ہیں کہ جلدی صبح ہو اور بچیوں کو اپنے پاس لے جائیں۔“

”جناب ہم نے بھی صرف بچے پیدا کیے ہیں۔“
”مجھے پتا ہے۔ میں کوئی باہر سے نہیں آئی۔“ وہ مڑے اتار کر اس میں کپ رکھتے ہوئے بولی۔

میمونہ بھاٹی نے دو سرا چولہا جلا کر اس پہ توار رکھ دیا اور یونہی باتوں میں ناشتیاں ہو گیا۔ اور جب
بھابھی نے سب کو ناشتا پہنچایا اس نے اپنی ابا لے کر تھرا میں ڈالا اور فیروز دھو کر امال جی کے کمرے میں
سو کر انہیں بچیوں کے بارے میں کچھ کہنے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ بھی جانتی تھی اس
جب گھر سے نکلنے لگی تو بدایات دینے سے باز نہیں آئی۔ ٹھنڈا دودھ نہیں پلانا۔ جب تک دھوپ نہ
سے نہیں نکالنا فیروز گر مہائی سے دھوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میمونہ بھابھی زور زور سے ہنسنے لگیں تب وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل کر آئی تو اسے ہلا
کہ بہت ساری اور بہت محبت کرنے والی ہستیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا ہوئی ہے۔ جانے دو
باقی تمام عمر پر بھاری کیسے ہو گیا تھا کہ اسے اپنا آپ نہ صرف خالی بلکہ غیر محفوظ بھی لگنے لگا تھا۔ پھر لڑیہ
اس خیال کی نفی کرنے میں لگی رہی تھی۔

”ڈاکٹر آسہ شاہ“ ڈاکٹر عبدالوہاب نے بقیہ اشاف سے اس کے تعارف میں ابھی اس قدر کہا تھا کہ
پڑی۔

”اصلاح الدین۔ آسہ اصلاح الدین۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر وہاب نے کچھ چونک کر دیکھا پھر کہنے لگے۔ ”یہ میری اسٹوڈنٹ بھی رہی ہیں۔ اور
اسٹوڈنٹ تھیں مجھے یقین ہے اس سے اچھی ڈاکٹر ہوں گی۔“
”تھینک یو سرا! آپ کے یقین کو ج ثابت کرنے کے لیے میں پوری ایمانداری سے اپنی صلاحیتوں
کروں گی۔“ اس نے کہا۔

”گڈ! اب آپ ڈاکٹر حارث سے چارج لے کر انہی کے ساتھ سکینڈ فلور پر چلی جائیں وہاں ڈاکٹر
کے ساتھ ہوں گی۔“ ڈاکٹر وہاب نے ڈاکٹر حارث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ ایک بار پھر
کر کے ڈاکٹر حارث کے ساتھ چل پڑی۔

اور پھر دن بھر کی مصروفیت نے اسے تھکا نہیں تھا بلکہ کسی نامعلوم شے سے نکل کر کتنے عرصے
نے ہاتھ پاؤں پھیلائے تھے تو بس کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد آرام ہی آرام تھا۔ اور اس آ
اسے اسی طرح مصروف رہنا تھا۔ ورنہ وہی تکلیف وہ شے اسے گرفت میں لینے کے لیے اس ہاسپٹل
جگہ موجود تھا۔ جب شاہ سکندر کا ایکسپینڈنٹ ہوا تھا تو وہ اسی ہاسپٹل میں بھی رہا اور یہیں اس
بھی دیکھا تھا یہ خیال اسے پہلے مرحلے پر ہی آیا تھا۔ اور بس وہی کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد
کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

”سنو جیم کیسے جاو گی؟“ ڈوہلی آف ہوئے پڑ ڈاکٹر یا سمین نے اس سے پوچھا تو وہ گھڑی دیکھتی ہوئی
”میرا خیال ہے میرے بھائی آئیں گے۔“

”اگر ان کا آنا مفہوم نہیں ہے تو میرے ساتھ چلو میں تمہیں ڈراپ کروں گی۔ بلکہ ایسا کوئی
منع کروں گا کیونکہ تمہارا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔ صبح آتے ہوئے بھی میں تمہیں پک کر لیا کروں
یا سمین کی پیشکش پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا تمہارے گھر والوں کو اعتراض ہو گا میرے ساتھ آنے جانے پر؟“ ڈاکٹر یا سمین نے اسے
پوچھا۔

”نہیں انہیں تو اعتراض نہیں ہو گا البتہ تمہیں زحمت ہوگی۔“

”زحمت کیسی۔ میرا راستہ ہی وہی ہے اور تمہارا وزن بھی کوئی منوں کے حساب سے نہیں ہے جو

”جینے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔
”جینے کا اندیشہ ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”جینے کا اندیشہ ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”صرف جاؤں گی نہیں۔“ بچے پوئے تم مجھے اپنے گیت پر کھڑی ملانا۔ اوکے خدا حافظ۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”میرا خیال ہے میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

غالباً! ابھی وہی دو تین ماہ کا تھا۔

”بیٹا! عمر سے چھوٹی دو گڑیاں اور ہیں۔ آپ جلدی سے ٹھک ہو جاؤ پھر وہ دونوں ہم آپ کو دے دیں گے۔“

ہیں ہی آپ کی۔ ”عدیل بھائی نے اسے اشتیاق دلاتے ہوئے کہا۔

”جچ پھو پھو!“ وہ شروع سے ہر بات کی تصدیق اسی سے کرواتا تھا۔

”ہاں بیٹا اور اب آپ آرام کرو۔ گھبرانا بالکل نہیں، ہم روزانہ آپ کے پاس آئیں گے۔ اور میں تو پرم

شام تک یہیں رہوں گی ٹھیک ہے اب ہم جاؤں؟“

بچوں کے ذکر پر وہ کچھ بے چین سی ہو گئی تھی جب سی نبیل کو تسلی دے کر عدیل بھائی کو اشارہ کرتی ہوئی

سے نکل آئی۔

راستے میں عدیل بھائی اور اس نے یہ طے کیا تھا کہ فی الحال گھر میں نبیل کا نہیں بتائیں گے کیونکہ شہ

پوتا ہونے کے ناتے وہ اماں جی کو سب بچوں میں زیادہ باراتھا۔ اور یہ بتا کر وہ ہاسپٹل میں ہے اماں جی کو

پاس جانے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اور اسے دیکھ کر اماں جی کی جو حالت ہوئی تھی اس کے پیش نظریہ

یہ طے کیا تھا۔

”آج پہلے دن ہی ایمر جنسی لگ گئی تھی کیا؟“ میمونہ بھابھی نے اس کی دیر سے آمد پر کہا تو اس سے پلے

بھائی بول پڑے۔

”نہیں! ہم لوگ ذرا گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ برا مزہ آیا۔ آپ نہیں تھیں ناں اس لیے۔“

آسیہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتی اماں جی کے کمرے میں آئی۔ ایک بچی ان کی گود میں

دوسری اس نے بازوؤں میں بھر کر سینے میں چھپالی۔ برا خوبصورت احساس تھا جو زندگی کی ساری تلویروں

چھیدے دھیل دیتا تھا۔



شاہ سکندر ایک بار پھر احمد حسن کے سامنے بیٹھا تھا اور اس بار اس کے لیے اور انداز میں وہ بے اعتبار

تھی۔ پہلے کے برعکس بہت سنبھل کر بول رہا تھا۔

”میں آسہ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن بچے کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا اب میرے لیے بڑ

ہو گیا ہے۔ آخر وہ میرا خون ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ احمد حسن اس کی اتنی جلدی بات سے پھر جانے پر حیران تھا۔ ”وہیے میرا

تمہیں اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہارا پہلا بچہ تو نہیں ہے۔“

”پہلا اور دوسرا کیا۔ ہر بچے کی اپنی محبت ہوتی ہے۔“

”مجھے ابھی تجرہ نہیں ہے بہر حال تم اگر اتنی ہی اسے دیکھنے اور سینے سے لگانے کو بے چین ہوتو ناں

سیدھا سادا راستہ اختیار کرو یعنی آسہ بلکہ نہیں ان کے والد کو فون کر کے کہو کہ تمہاری پدرانہ شفقت جا

ہے اور تم بچے کو دیکھنا چاہتے ہو۔“ احمد حسن نے بظاہر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو؟“ وہ احمد حسن کا معقول مشورہ رد نہیں کر سکا تو جرح پر اتر آیا۔

”یہ تم پہلے سے کیوں فرض کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اعتراض نہ کریں۔“ احمد حسن نے رمان

وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بولا۔

”تم نہیں جانتے“ انہوں نے مجھے آسہ سے بھی نہیں ملنے دیا تھا۔ اگر اس وقت وہ اپنے روئے میں

پیدا کر دیتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ میرا کیا گیا اپنی بیٹی کا کھرا اجازت انہوں نے۔ ”وہ اب سارا الزام انہیں دے

”ججائے اسے سمجھانے کے مزید داغ خراب کر دیا تھا اس کا۔ ورنہ وہ ایسی نہیں تھی۔ کبھی مجھ سے

ہو سکتی تھی۔ انہوں نے برکایا اسے“ ابھی بھی برکایا میں گئے۔ اور میں اس معاملے میں کوئی رعایت نہ

گا۔“

”دھیرج سے سکندر! میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس معاملے کو ابھائیں گے۔ تم خود پر قابو رکھو اور یہ لو

۴۰ احمد حسن نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ان سے کہیں کی بات کروں گا میری تو آواز سنتے ہی ادھر سے فون بند ہو جائے گا۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوا۔

میں کا مطلب ہے۔ پہلے کو شش کر چکے ہو۔“

۴۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

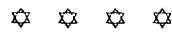
۷۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۸۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے



سنائی زندگی کے نئے باب کو مدھیہ اور صباحت کے نام انتشار کیا تھا اور اس سے اگلے روز ہی اس نے

ان کے ساتھ نیل کا نام بھی لکھ دیا تھا کہ اس بچے کی اس حالت کا ذمہ دار وہ صرف اس کی ماں کو نہیں تھی۔ کچھ قصور ان سب کا بھی تھا اور خصوصا "اس" کا کہ جب وہ شروع ہی سے اس سے اتنا مانوس تھا کہ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اپنی حد درجہ غفلت پر اب وہ اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاری تھی۔ جب سے ہی اس نے ڈاکٹر وہاب سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی تھریٹور پر کرائی تھی۔ جہاں سب بچوں کے احساسات و جذبات ایک جیسے تھے۔ بس جب فارغ ہوئی تب نیل کے پاس جا بیٹھتی اور اس کی اپنے بہت پر اس کا دل بھر آتا۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے ہسپتال جوائن کیے ہوئے اور اس دوران نیل سے ملنے اس کی ممی اور باپا کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کئی بار اس نے نیل سے پوچھا تو جواب میں اس نے بس "چتا نہیں" کہا۔ اور سے پوچھتے ہوئے اب اسے خود عجیب سا لگ رہا تھا۔ کہ بات صرف نیل کی ماں کی غیر ذمہ داری پر ختم اس کے باپ کا نام بھی آئے گا؟ اور وہ خود تسلیم کر رہی تھی لیکن وہی بات کوئی دوسرا کے تو جانے کی محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت وہ نیل کے پاس آکر بیٹھی تو بلی پھٹکی باتوں کے دوران پوچھنے لگی۔

"یہ بتاؤ بیٹا! آپ کو یہاں ہسپتال میں کون چھوڑ کر گیا ہے؟"

"ڈیڈی۔" نیل نے کہا تو وہ سمجھ گئی وہ اپنے نانا کو ڈیڈی کہہ رہا ہے۔

"اور آپ کی ممی کہاں ہیں؟"

"ممی جلی گئیں ڈیڈی نے انہیں پیلا کے پاس بھیج دیا ہے۔"

نیل کا جواب بظاہر سیدھا سا دکھائی دیا لیکن اسے سوچ میں مبتلا کر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا دوسری شادی کر چکی ہیں۔ اور اس سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا اس لیے وہ موضوع بدل کر مچی پڑی۔ نیل کو ایک سرساز کر دینے آتی تہ وہ کمرے سے نکل کر آئی اور اسی وقت نیل کے بیگم کے کھڑون ڈالے۔

"کمرے میں صاحب یا بیگم صاحبہ جو بھی موجود ہیں انہیں بلاؤ۔" کہو ہسپتال سے فون ہے۔" اور ہرے آواز سن کر اس نے کہا تھا۔

"ہیلو۔" کچھ دیر بعد مردانہ آواز نیل کے نانا کی تھی۔

"جی السلام علیکم امیں ڈاکٹر آسیہ بول رہی ہوں اور اس وقت میں ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ نیا کی حیثیت سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ پورے اعتماد سے بول رہی تھی۔

"جی فرمائیے۔"

"آپ لوگوں کے پاس اگر نیل کے لیے وقت نہیں تھا تو اسے شروع ہی میں ہمارے پاس کیوں نہ یا جب ہسپتال میں لاوارثوں کی طرح ڈال گئے تھے تب ہمیں اطلاع کر دیتے تو کم از کم بچے کی یہ حالت آپ کو بتا ہے بیمار سے زیادہ اس پر تھمائی اثر انداز ہوئی ہے۔ بچہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔"

"تو اب جوڑنے والے مل تو گئے ہیں اسے۔" خاصے مسخرے کہا گیا جس پر وہ سگ کر بولی۔

"جی ہاں۔ یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے میں نے کہ آپ کو تو اس کی فکر خیر پہلے بھی نہیں ہوئی دوسری کسی ذمہ داری سے بھی میں آپ کو آواز کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ اطیمینان بھی دے رہی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسپورنٹ دیا اور ان کی بے بسی پر کڑھ رہی تھی کہ معا "اسے اپنی بیچو اس کے ساتھ ہی سیما بھائی کی باتیں ذہن پر دستک دینے لگیں۔

"ڈرا سوچو۔ آئندہ زندگی میں اس آنے والے بچے کا کیا کردار ہوگا۔ نیل کا حال تم نے دیکھا ہے دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے بھی بچہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ خصوصا "ماں" کی جگہ "نہیں۔" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسی وقت سے خود کو باور کرانے لگی تھی کہ صرف ماں ہی نہیں باپ بھی ہے۔ انہیں زندگی میں وہ بھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دے

ان کی قسمت میں لکھی گئی ہے اس کا بھی نہیں۔
ت میں بچوں کو سنانے اور ان کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بستر میں گھٹنوں کے گرد بانو بیٹھی جب ابائی نے اس کے دروازے میں آکر پوچھا۔

"سو تو میں رہیں بیٹا؟"

"وہ چونک کر بولی تھی۔

"بیابائی! آئیے۔" وہ چونک کر بولی تھی۔

"یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔" ہوا آتی ہوگی۔"

"نہ نہ کرو جی ہوں۔"

در تھمارا کام میں دل لگ گیا۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوتی۔" ابائی اصل بات سے پہلے غالباً "اسے ہمارے

میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ سارا دن بچوں سے دور رہنا پڑتا ہے خیر بھی تو انہیں احساس نہیں اور جب تک انہیں سمجھ آئے گی تب تک میں انشاء اللہ اپنا کینک سیٹ کر کے دن کا زیادہ وقت ان کے رہوں گی۔" وہ شاید کچھ دیر پہلے یہی سوچ رہی تھی۔

بول۔" ابائی نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔ "میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا! رف تم سے اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔"

با کا جو حرف ہونے لگا تھا اور نظریں ابائی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

نہ شاہ سکندر کا فون آیا تھا وہ اپنے بچے سے ملنا چاہتا ہے۔" ابائی نے جانے قصداً "یا انجانے میں اپنی سفید

ناک دونوں ہاتھوں سے چھو کر کہا۔ جیسے شاہ سکندر خیال نہیں کر رہا م اس کی لاج رکھنا۔

یہ نے پہلے نظریں چھکا میں پھر پریشانی گھٹنوں پر رکھ لی تھی۔

و نہیں رہی تھی لیکن اسے دکھ ہو رہا تھا کہ بہت چاہتے اور کوشش کے باوجود وہ اپنی زندگی کی ناؤ کو طوفانی

لہ سے محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ تم سے بات کرنے کے بعد جواب دوں گا۔" ابائی قدرے رک کر بولے

"اب بتاؤ کم کیا کہتی ہو؟"

میں کیا کہوں ابائی! آپ جانتے ہیں۔ اسے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا مقصد محض ہمیں تنگ کرنا

جیسے۔ جیسے نبیلہ بھائی نے کیا تھا۔" وہ گھٹنوں سے پیشانی اٹھا کر عاجزی سے بولی۔

ہوں میں سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا کریں۔ صاف منع بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح وہ اور ضد میں آجائے گا اور

واہات برہ جائے گی۔ اور میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں نے طیل اور عدل سے نہیں کہا۔ پھر

و بھی چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات اور مسائل کو کم خود بینڈل کرنا سیکھو کیونکہ اب یہ ایک دو دن کی

نیل ہے۔" ابائی نے رساں سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

باب۔ بھائی بھی کب تک میرا ساتھ دیں گے۔" اس نے سوچا پھر ابائی کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "آپ نے شاہ

رو کو بے جواب دینے کو کہا ہے؟"

نہ کہہ رہا تھا۔ کل ہی فون کرے گا۔"

نہ کہہ رہا تھا۔ کل ہی فون کرے گا۔"

نہ کہہ رہا تھا۔ کل ہی فون کرے گا۔"

”ہاں بچہ اسے معلوم ہی نہیں کہ بیٹا نہیں دو بیٹیاں ہیں، آسیہ کی خود کھامی سن کر اباجی بھی اپنے آپ سے تھے اور اپنے پیچھے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کلاٹ کے پاس کھڑی ہو گئی اور دو کھیل سرکار ایک ساتھ دو معصوم بچوں کو دیکھنے لگی، جبکہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو کر اس نے مسئلہ کو سوچنے لگا تھا۔

”ہمارے ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جاتیں۔“ شاہ سکندر کی اس بات سے وہ اب بھی خائف تھی کہ کو دیکھ کر وہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے اس سے بیٹیاں چھین نہ لے جائے۔
”نہیں!“ اس نے بے حد ریشاں ہو کر بچیوں پر دوبارہ کھیل بول ڈالا جیسے انہیں ساری دنیا سے چھاپا لینا چاہتا تھا۔ اسی عالم میں ادھر سے ادھر ٹپکنے لگی۔

سڑیوں کی خاموش رات کا سفرست روی سے جاری تھا اور اس کی صبح بہت دور تھی جب وہ کسی نتیجے پر نہ تھی۔
صبح وہ معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ نماز کے بعد روزانہ کی طرح میسونہ بھابھی کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر اپنا پہلے اماں جی کے کمرے میں آکر کھنے لگی۔

”اماں جی! صباحت کو تیار کر دیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کیونکہ رات اس کی طبیعت ٹھیک ہا سبیل میں اس کا چیک اپ کروالوں گی۔“
”پھر سارا دن کیا کرو گی؟“ اسے سنبھالو گی؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بس آپ تیار کر دیں۔“ اس نے بہت عجلت میں کہا اور اباجی کو اپنی طرف دیکھنے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اباجی فوراً ”ہی اس کے پیچھے آگئے تھے۔“
”کیا ملے کیا ہے تم نے؟“

”بس سکندر کا فون آئے تو اس سے کہہ دیجئے گا کہ ہا سبیل آکر بچے کو دیکھ لے اور آج ہی کیونکہ میں روز ساتھ نہیں لے جاسکتی۔“ وہ بہت نارمل انداز میں بول رہی تھی۔

”اور مدیہ؟“ اباجی کچھ حیران تھے۔
”نہیں اباجی! اسے مدیہ کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی نہیں۔“ وہ ایک دم اباجی کے سینے سے لگ گئی

کا پتے وجود کو دھیرے دھیرے تھکنے ہوئے اباجی کچھ گھٹنے کہ وہ اندر سے کتنی خوفزدہ ہے اور اسی خوف کے باعث ہمیشہ کے لیے شاہ سکندر سے چھپا رہی ہے۔

”دروم! بیٹا! تم سے تمہارے بچے کوئی نہیں لے سکتا۔ چلو تیار کرو۔ وہ تمہاری ڈاکٹر یا سمین آنے والا جی نے اسے وقت کا احساس دلایا تو وہ ان سے الگ ہو کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

پھر صباحت کا فادر اور دودھ وغیرہ بیگ میں رکھنے تک یا سمین کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا تھا۔ ادھر اماں جی مسلا رہی تھیں۔ انہیں شاید بچی کو ہا سبیل لے جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب وہ خود آؤں گے اسے چیک کرکے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ان کی ساری باتوں پر بس ہوں ہوں کرتی رہی اور پھر صباحت کو ان کی گود سے نکل آئی۔

”ارے! بچہ کس کا ہے؟“ اس کے پیچھے ہی یا سمین نے اشتیاق سے پوچھا۔
”میری بیٹی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو یا سمین اچھل پڑی۔

”ہائیں! اہم میڈیو! مکمل ہے۔ میں اب تک تمہیں۔“ موڑ کاٹنے کے لیے مخالف سمت دیکھتے ہوئے یا سمین ادھر رہ گئی۔

”وہ ہا سبیل میں میرا بیٹہ ہے ناں، نیل وہ بہت ضد کر رہا تھا کہ میں اسے لے کر آؤں، وہ کھیلے گا اس سے فوری بچی کو ساتھ لے جانے کا جواز سوجھ گیا تھا۔

”تمہارے بیٹے کے ساتھ بڑی نرینڈی ہوئی ہے۔ مجھے اس کی ماں پر غصہ آتا ہے۔ کیسی ظالم عورت ہے۔“

”اے سنی قربانیاں دیجی ہیں۔“ یا سمین تاسف سے کہہ رہی تھی ”اس بات سے بے خبر کہ اس کی باتوں سے اس ماں کے دل پر کیا اثر رہا ہے۔“

پھر سارا وقت وہ بہت بے کل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر اس کی دھڑکنیں کبھی بہت تیز ہو جاتیں اور کبھی رکنے لگتیں۔ وقفے وقفے نیل کے کمرے میں جا کر صباحت کو دیکھتی اور اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

”کاش وہ میاں سے بہت دور جاسکتی۔ جہاں تک شاہ سکندر کی سوچ کی بھی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ جانے وہ شخص اسے نے پرکھتے کیوں تھا۔ وہ تو سبیل ہی بہت ٹوٹ چکی تھی۔

نیل پر کمرے کی بات اتم اگر مجھے اپنے سامنے گزرا نا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو میں تمہارے سامنے صرف ہاتھ ہی نہیں دیتا، تمہارے قدموں پر سر رکھ دوں گی، بس تم ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں اپنی انا خودداری اور اپنی ہستی کا غرور بڑی سی تمہارے سامنے منادوں کی بس ایک وعدے پر کہ تم میری متا کوڑک نہیں پہنچاؤ گے۔

میں جانتی ہوں، تم احساس برتری کا شکار ہو اور اس روز میرے تلخ رویے نے شاید تمہارے اس احساس کو چیلنج کیا ہے تم مجھ سے جینے کا ہانا بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں سکندر حیات! لیکن تم مجھے نہیں مجھ۔“

”اماں! فون کی نیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ گہری سانس کے ساتھ اس نے ریسیور اٹھا کر بیلو کہا تو دوسری لفٹ اباجی تھے اس کی آواز سنتے ہی کھینے لگے۔

”بیٹا! شاہ سکندر تمہارے پاس آ رہا ہے۔“
”جی! وہ اسی قدر کہہ سکی۔“

”تم پریشان تو نہیں ہو بیٹا؟“
”نہیں نہیں اباجی! میں پریشان نہیں ہوں۔ فیس کر سکتی ہوں اسے“ آپ فکر نہیں کریں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”اچھی بات ہے۔“ اباجی نے فون بند کر دیا تو وہ اٹھ کر نیل کے کمرے میں آ گئی۔
نیل سو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس رک کر سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر صباحت کو اٹھا کر دوبارہ اپنے رے میں آ گئی۔

”کوچک دار سے وہ پہلے ہی کہہ آئی تھی کہ کوئی اس کا پوچھے تو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ زیادہ دیر نہیں رہی تھی کہ شاہ سکندر کا وجہہ سرا پر دروازے میں نمودار ہوا تھا۔

”اے آئی کم ان ڈاکٹر!“ شاہ سکندر نے انگلی موڑ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تو دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا تھا۔

”السلام علیکم!“ شاہ سکندر چند قدم آگے آگیا اور وہ بہت کچھ سوچ کر بیٹھی تھی۔ کوئی ایک بات نہیں کہہ سکی۔
”اے انداز میں اٹھ کر نیل کے پاس گئی اور کھیل میں لپٹی صباحت کو اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔

”یہ واقعی میرا بچہ ہے؟“ شاہ سکندر نے اس کے ہاتھوں سے صباحت کو لیتے ہوئے کہا۔ اس کے کسی انداز میں بے یارمی نہ تھی۔

”میرا مطلب ہے میں نے بیٹی کی خواہش کی تھی اور اس معاملے میں میں بہت خوش نصیب ہوں کہ میری ہر بات سنی ہوئی ہے، خواہ اس کے لیے۔“

”واکیم! ہونٹ پیچھے کر مشغول ہو گئی۔ تب شاہ سکندر اس پر سے نظریں ہٹا کر بچی کو دیکھنے لگا۔ کتنی دیر کے لیے خاموشی نے ان کو گھیر لیا تھا۔

”میرا خیال تھا۔ تم مجھے بچے سے نہیں ملے دوں۔“ خاموشی میں شاہ سکندر کی آواز نے بہت باک سار تعارض پیدا کیا تھا۔
”میرا خیال کر سکتی تھی اگر جو مجھ میں بار بار آپ کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہوتا حالانکہ اتنی کمزور تو میں کبھی نہیں تھی۔ لیکن

میرا خیال انسان کو ایسا ہی بزدل بنا دیتی ہے۔ میں بہت ٹوٹ چکی ہوں شاہ سکندر حیات! مجھے اپنے سر پر آسمان ملتا ہے نہ رستہ نہیں۔ اگر کوئی سہارا ہے تو ان خوب صورت لمحوں کا جس میں رفاقتوں کا ماں تھا۔ رفاقتیں ٹوٹ گئیں لیکن ماں“

جائے کیوں سلامت ہے اور اسی کے بھروسے پر میں آپ سے التجا کر رہی ہوں۔“
اس نے بہت دھیرے دھیرے شاہ سکندر کی طرف رخ موڑا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور بندھے بازو ساکت ہو گیا تھا۔

”مجھے بار بار ٹوٹنے سے بچالیں شاہ سکندر! یہ بچی مجھے بخش کر ہمارے لیے اجنبی ہو جائیں۔ شاید اس طرح میرا ورنہ آپ کی بار بار آمد مجھے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مہمہ میں بچی لینے تو نہیں آیا۔ میں تو صرف۔“
شاہ سکندر کے اندر دیکھنے والا پر جیسے قطرہ قطرہ شبنم ٹپکنے لگی تھی کہ اس روز سر راہ اس کے غور کو پیرول نہ جانے والی اس وقت ہاتھ جوڑے اپنی کمائی کی کم ہمتی کا اعتراف کر رہی تھی۔

”میں تمہارا مان نہیں توڑوں گا آسیہ! وہ رفاقتیں جو خواب ہو گئیں ان کی ایک زندہ حقیقت یہ بچی تمہارا پیشہ والی برکت چال سے اس کے قریب آیا اور بچی اس کے بازوؤں میں تھما کر کہنے لگا۔ ”اس کے لیے تم چاہو لے سکتی ہو۔ اسی وقت۔“

”بس ایک وعدہ۔“ وہ ہینگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
”میں تمہارے لیے بنا وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اگر تمہارے راستے میں رکنے اور تمہیں پکارنے کا ہرگز کو تمہارے سامنے شوٹ کروں گا۔ ہاں اگر تمہیں کبھی اس بچی کے لیے میری ضرورت پڑے تو پکار لینا۔“

”لیے پلانا پھر ایک خیال کے تحت اچانک رک کر کہنے لگا۔ ”یہ وعدہ تو تمہارے لیے ہے اور بچی۔“
”بچی کی بستی اسی میں ہے والدین کے درمیان کش مکش بچوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور میں نہیں چاہتا۔“
”اس نے فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ ”آپ یقیناً ”میری بات“

کے میں اسے مکمل دیکھنا چاہتی ہوں۔“
شاہ سکندر نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر خدا حافظ کہہ کر ہار نکل گیا تو اپنی پر جہاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی وہاں اندر دھیروں اطمینان اتر آیا تھا۔

”میری بچی، میری گزیا!“ اس نے صباحت کو اپنے سینے میں پیچھ لیا تھا۔
* ☆ * ☆ *
”بس میمونہ بھابھی! اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ شاہ سکندر اب کبھی میرے راستے میں آئے گا نہ بچوں کے بار کرنے کی کوشش کرے گا۔“ رات میں وہ میمونہ بھابھی کو اپنا کارنامہ بتا کر کہنے لگی۔ ”میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنے توجہ کا بدلہ لینے کے لیے مجھے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے اور میں نے پہلے ہی مقام پر اس کے سامنے ہاتھ کو تسکین پہنچا دی۔“

”ہاتھ جوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ”میمونہ بھابھی کو بہت برا لگا۔
”ضرورت تھی بھابھی! اور نہ وہ ساری زندگی ہمارے درمیان موجود رہتا۔ گو کہ وہ کبھی کر کے بھی بار جانا نہ ملنے رہنے کا حق حاصل کر سکتا تھا اور ظاہر ہے ہمیں کورٹ کا فیصلہ ماننا پڑتا پھر میرے لیے یہ مسلسل نیند ہفتے وہ بچوں سے ملنے آ رہا ہے اس لیے میں نے بہت سوچ کر اس کے سامنے خود کو بہت مجبور اور بے بس لگا چاہا تھا جب ہی رہے آرام سے وعدہ کر گیا ہے کہ آئندہ کبھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“

اس نے کہا تو میمونہ بھابھی نے یوں سر جھکا جیسے انہیں شاہ سکندر کے ذکر سے کوئی لچھنی نہ ہو پھر مضمون ”اچھا سنو وہ عدیل کی شادی کا کیا پروگرام ہے؟“ اماں جی نائلہ کے لیے تو نہیں مان رہیں۔“

”میں بھی نہیں مان رہی۔ میرا مطلب ہے میں بھی نہیں چاہتی کہ عدیل بھائی کی شادی وہاں ہو۔ ہم کو لیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو کیوں کی کمی نہیں ہے لیکن۔“
”لیکن! لیکن کچھ نہیں بھابھی! ہم بس کوئی اور لڑکی دیکھیں گے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ مجھے

اوپر سے کوئی بغض ہے بلکہ صرف اس لیے کہ شاہ سکندر کا وہاں بہت آنا جانا ہے وہ نائلہ کی شادی میں بھی ضرور آئے رہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی میل جول رکھتی جو کہ عدیل بھائی بھی پسند نہیں کریں گے اور خواہ مخواہ کی بد مزگی ہوگی۔“

”خلاف توقع میمونہ بھابھی نے فوراً اتفاق کر دیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”اور کوئی لڑکی؟“
”نہان میں تو کوئی ہے نہیں اور آس بڑوس کا مجھے نہیں پتا۔ ایک تو میرے بھائی سارے بس ایسے ہی ہیں ساری نناناں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“ اس کی بات پر میمونہ بھابھی اچھل پڑیں۔

”کہاں بہن کی خوش فہمی۔ اتنے شریف نہیں ہیں تمہارے بھائی سب کا پتا ہے مجھے۔“
”اچھا! وہ میمونہ بھابھی کے اچھلنے پر بے ساختہ ہنسی بھی۔ ”کیا پتا ہے؟“
”جی کہ بس میں سے ایک کوماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”دیکھتی ہی نہیں۔“ اس نے فوراً ”ان کی بات ایک لی۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جانتی ہوئی الماری کھول کر صبح کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔ پھر ایک سوٹ ہاتھ میں لے کر پلٹی تو اپنے آپ سے کہنے

”کپڑوں کی بہت پراہم ہو گئی ہے۔ سارے تو وہیں چھوڑ آئی تھی۔“
”ہاں میں بھی بیک دیکھ رہی ہوں کہ کچھ مخصوص جوڑے ہیں تمہارے پاس وہی بہن کر باقی ہو اور بنانے سے بہتر ہے اپنا سوٹ کیس لے آؤ بلکہ اور چیزیں بھی۔“ میمونہ بھابھی نے اس کی بات سن کر کہا تو وہ بے دھیانی میں انہیں دیکھنے

”غلط تو نہیں کہہ رہی میں تم اپنا ضروری سامان لے آؤ۔ چالی تو دو گئی تمہارے پاس۔“
”ہی لیکن میں وہاں جانا نہیں چاہتی۔“ اس نے چونک کر کہا۔
”میں ہاں ٹنٹ تمہاری ملکیت ہے اور وہاں کی ہر چیز بھی۔ میں تو کہتی ہوں۔ سارا سامان اٹھو الو اور اپار ٹمنٹ کرائے

”وہ ہر مہینے کچھ پیسے ہی مل جایا کریں گے۔“ میمونہ بھابھی کی بات ٹھیک تھی۔ جب ہی اس نے اختلاف نہیں کیا۔
”خوش ہو رہی تھی۔“
”اب تم پر اے استری کرو گی؟“ ”میمونہ بھابھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی آپ کو کوئی کام ہے؟“ اس نے رک کر پوچھا۔
”نہیں میں اب سوئے جا رہی ہوں۔ صبح عمو کا ڈیوٹیشن کروانے جانا ہے۔“
”ماشاء اللہ! تین سال کا ہو گیا۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔ عدیل بھائی نے نئے بھتیجے کی

”خجری سالی تھی۔“
”ہاں ہونے والا ہے۔“
”میمونہ بھابھی کہتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں تو اس نے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کو دیکھا پھر کرسی پر ڈال کر لائٹ

”نہ کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ شاید عمر کی پیدائش کے ساتھ ہی اسے وہ حادثہ یاد آیا تھا جس نے اس کی زندگی کو خوب صورت بنادیا تھا۔ اس وقت وہ خوب صورت موڑی لگتا تھا۔ سیدھی سیٹ زندگی میں رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔ کتنا اچھا

”مقام تھا۔ وہ کتنی دیر اپنے دل کی بستی کو ٹوٹتی رہی جس میں ہر روز اس کے نام کے پھول کھلا کر اس نے یقین سے کہا تھا کہ

”میں بھی کو جاننے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے اس سے اس کی زندگی سے پیار نہ ہو۔“
”تو شاہ سکندر حیات! تمہیں کبھی مجھ سے پیار تھا ہی نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو کر کناروں سے راستہ

”نہ تیکے میں جذب ہو رہے تھے۔ بہت مضطرب ہو گئی تھی وہ رات کے جانے کس پہر نیند میں نہ ہوئی تھی۔
”رات کا اضطراب باقی تھا جو وہ اپنی ڈیوٹی سے انصاف نہیں کر پا رہی تھی۔ کافی ست سی تھی۔ ڈاکڑ وہاں رات اندر آئے تو

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو گھر پر آرام کرتیں۔ کیوں چلی آئیں؟“

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس رات میں بچپوں کی وجہ سے نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے کچھ ہوں۔“ اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”چائے منگواؤں یا ایسا کرو اپنے نتیجے کے کمرے میں جا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو جاؤ۔“ یاسمین اس نے سہولت سے رد کر دیا۔

”نہیں۔ میرا خیال ہے چائے پینے سے میں فزیش ہو سکتی ہوں۔“

یاسمین نے دروازے تک جا کر ماسی سے چائے کا کما پھرواپس اپنی جگہ آکر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کتنے بچے ہیں تمہارے۔؟“

”دو بیٹیاں ہیں۔“

”جہاں تم رہتی ہو، وہ غالباً تمہارا میکہ ہے اور تمہارے میاں کہاں ہوتے ہیں۔؟“

یاسمین کے انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ بلکہ وہی عام سی باتیں عام سا انداز۔

”مجھے طلاق ہو چکی ہے اس لیے اب میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہوتا ہے کے بارے میں کوئی اور بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔“

اس نے سچ بول کر یاسمین کو مزید سوال جواب سے روک دیا تو وہ حلق کا سن کر حیران ہو رہی تھی قدر لگی۔

”افسوس کا اظہار تو کرنے دو یا وہ بھی نہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے کمری کی پشت پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں تو کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے پھر باہی چا تب اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور فوراً ”چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔“

”مجھے تم بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو۔“ یاسمین سے رہا نہیں گیا۔ ”کیا اسی سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے شخص کی طرف سے۔؟“ اس نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”پھر کیا بات ہے۔؟“

”کوئی بات نہیں ہے یا راسب ٹھیک ہے۔“ وہ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نیل ہوں ڈاکٹر ذہاب پوچھیں تو بتا دیتا۔“

”اور ڈاکٹر احسان پوچھیں تو کیا کہوں۔“ یاسمین کے معنی خیز انداز پر وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”کیا مطلب۔؟“

”مطلب یہ کہ انہیں تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد آکر پوچھتے ہیں کہ تم کہاں ہو گیا کروغیر۔“ یاسمین کا انداز ہنوز تھا جس سے اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں اور کچھ دیر سوچنے کے ”اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو اب ان کے پوچھنے پر تیار نہ بننا کہ میں اپنے بچے کے پاس ہوں۔“

”یعنی!؟“ سوالیہ انداز میں یاسمین کی ابروؤں نے جنبش کی تھی۔

”نیل میرا بیٹا ہے۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

نیل کو سسرال میں سسرال کو راضی تھی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر توجہ سے دیکھنے لگی۔ وہ اب پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ اس کی صحت اچھی ہو رہی تھی اور سسرال کے کھڑے بھی ہو جاتا تھا لیکن چل نہیں سکتا تھا۔ شاید گرنے کا خوف تھا۔ جو قدم اٹھانے سے ڈرتا تھا ابھی بھی وہ یہی دیکھ رہی تھی کہ سسرال میں اس کا پیرا اٹھا کر کانپنے لگتا۔

”بیٹا! بہت سے کام لو۔ آپ تو بہت بہادر ہو۔ آؤ میرے پاس آؤ۔“ وہ اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر

ہوئی۔

”نہیں بھوپو! میں نہیں چل سکتا۔“ نیل نے بہت بے بسی سے کہا تو اس نے بروہہ کرا سے کندھوں سے

”بہت ساتھ چلو“ میں آپ کو گرنے نہیں دوں گی۔“

”نیل! اپنے دونوں بازو اس کی کمر میں ڈال کر اس سے چپک گیا۔“ میری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے، مجھے بید پر لٹا۔“

”چند ہی کریں پھر پتھو! میں گر رہا ہوں۔“

”اے بیٹا! اؤکے۔“ اس نے سسرال کی دستانے سے بید پر لٹا یا پھر سسرال کو جانے کا کہہ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اے بیٹا! اؤکے۔“ اس نے سسرال کی دستانے سے بید پر لٹا یا پھر سسرال کو جانے کا کہہ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اے بیٹا! اؤکے۔“ اس نے سسرال کی دستانے سے بید پر لٹا یا پھر سسرال کو جانے کا کہہ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

* * * * *

بہت ہی صبح ہی میمونہ بھا بھی ہے کہا تھا کہ آج وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ چلیں۔ وہ اپنا سوٹ پہنا چاہتی ہے اور انہوں نے منع تو نہیں کیا تھا لیکن گھر کے کاموں سے نکل ہی نہیں پاری تھیں۔ موگھر ہوں تو می بیٹھتے جاتے ہیں۔ دپہر کے کھانے کے بعد بھی خلیل بھائی ان کے سر پر سوار تھے۔ تب اباجی سے اجازت لے کر وہ بھائی سے ان کی گاڑی لے کر نکلی۔ احمد اور سونیا کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

انہیں کتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی جسے کبھی وہ اس زمین پر اپنی جھوٹی سی جنت کہا کرتی تھی۔ اپنی جگہ اسی طرح موجود تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ایک ایک قدم پر رک کر دیکھتی رہی یوں لگ رہا تھا جیسے خواب لڑ رہی ہو جبکہ اس کے اندر سناٹوں کا راج تھا۔

پتھر پتھر دوازہ کھول دیں۔“ احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

”خواب۔ کرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھ نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔“

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔“

میں دونوں سے کہہ رہی ہوں اور اگر تم دونوں آرام سے بیٹھو گے تو میں واپسی میں تمہیں بہت اچھی آکس کریم لگاؤں۔“ اس نے آکس کریم کا لالچ دے کر دونوں کو خوش کر دیا۔ پھر اندر آکر پہلے اپنا سوٹ کیس اتارا اور اس میں مارت بھر لیا۔ کپڑے نکال کر الماری میں ڈالے اور وہاں سے سادے سوٹ نکال نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

میں اسے غصہ بھ لگ گیا اور اتنی دیر میں احمد اور سونیا میز سے اٹھا کر کمرے میں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش میں لگ گئے تھے اور اس نے انہیں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں نہ ہی کسی چیز کو پھینکنے سے باز نہ آیا۔ ساری باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں کسی کے سامنے وہی کا خدشہ ہو اور وہ ایک تو ان خدشات سے بوجھ کر ہی دوسرے برہنہ اس کی نظروں میں اپنی پہلے والی اہمیت کھو چکی تھی، پھر وہ کیوں منع کرتی۔ پورے دھیان سے کام میں مصروف رہی۔ کپڑوں کے بعد سینڈل بھی نکال کر رکھیں پھر دوسری چیزیں سوچ رہی تھی کہ سونیا آکر

پتھر پتھر دوازہ کھول دیں۔“ احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

”خواب۔ کرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھ نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔“

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔“

میں دونوں سے کہہ رہی ہوں اور اگر تم دونوں آرام سے بیٹھو گے تو میں واپسی میں تمہیں بہت اچھی آکس کریم لگاؤں۔“ اس نے آکس کریم کا لالچ دے کر دونوں کو خوش کر دیا۔ پھر اندر آکر پہلے اپنا سوٹ کیس اتارا اور اس میں مارت بھر لیا۔ کپڑے نکال کر الماری میں ڈالے اور وہاں سے سادے سوٹ نکال نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

میں اسے غصہ بھ لگ گیا اور اتنی دیر میں احمد اور سونیا میز سے اٹھا کر کمرے میں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش میں لگ گئے تھے اور اس نے انہیں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں نہ ہی کسی چیز کو پھینکنے سے باز نہ آیا۔ ساری باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں کسی کے سامنے وہی کا خدشہ ہو اور وہ ایک تو ان خدشات سے بوجھ کر ہی دوسرے برہنہ اس کی نظروں میں اپنی پہلے والی اہمیت کھو چکی تھی، پھر وہ کیوں منع کرتی۔ پورے دھیان سے کام میں مصروف رہی۔ کپڑوں کے بعد سینڈل بھی نکال کر رکھیں پھر دوسری چیزیں سوچ رہی تھی کہ سونیا آکر

پتھر پتھر دوازہ کھول دیں۔“ احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

”خواب۔ کرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھ نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔“

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔“

جو بالکل جاہل عورت تو نہیں تھی لیکن ضد میں اس کی ہر بات کا الٹ ضرور کرتی تھی۔ اور وہ کافی حد تک اس لیے شخص اپنا موڈ خراب ہونے کے خیال سے خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔

پھر صبح ناشتا کرتے ہی وہ آٹا کو لے کر کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں سے دس بجے اسے اسلام آباد کی تھی۔ اس سے پہلے وہ جمنا تیکر بھائی کی چھوٹی بیٹی کے ایڈمیشن کے سلسلے میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ تو تمام راستے رہا تھا کہ اتنی سی بچی کو آپ ہاسٹل میں چھوڑ دیں گے۔ اور اب اپنے بچے کو چھوڑتے ہوئے بھی اس کی بیٹی مرانساء سے تو کہہ دیتا تھا کہ بچوں کی سہری کے لیے ان کی عارضی دوری سہری پڑتی ہے۔ لیکن خود کو یہ بات اسے کچھ وقت لگا تھا کہ وہ بوس بھائی اور جمنا تیکر بھائی کے بچے بھی وہیں تھے اور بڑے والے تو انھیں غاصے سے تھے پھر بھی واپسی کا تمام راستہ وہ بہت بے کل رہا تھا۔ جیسے چھوٹے سے بچے کو کہیں تنہا چھوڑ آیا ہو۔ یہ اس کی تھی جو اسے بے چین کرتی رہی تھی۔ اور اتفاق سے کوئی ساتھ بھی نہیں تھا جس کے ساتھ باتوں میں رہا ہوں بہر حال جب کراچی ایرپورٹ سے باہر نکلا تو ڈرائیور کو اپنا منتظر دیکھ کر کافی متعجب ہوا کیونکہ مرانساء سے اس دن واپسی کا طے ضرور کیا تھا لیکن خود اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق آسکے گا۔ اس نے اس نے ڈرائیور کو بھی تاکید نہیں کی تھی کہ وہ اسے لینے پہنچ جائے۔ جب ہی یہ ان تھا اور بظاہر سرسرا پوچھنے لگا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”بڑی بیگم صیب نے۔ وہ ادھر اسپتال میں ہیں۔“ ڈرائیور نے بتایا تو وہ متوحش ہو گیا۔

”خیریت تو ہے ناں؟“

”جی صیب۔“ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس اس قدر کہا تو اس نے ہنسنے سے انکار کیا۔

”اور کون سے ان کے ساتھ؟“

”جی آپ کی بیگم صیب۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ چلو ادھر ہی چلو۔“ وہ سارا معاملہ سمجھ کر اطمینان سے ہو گیا اور بیٹھتی ہی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس وقت جب ڈرائیور نے ہاسپٹل کے سامنے گاڑی روک کر اسے مطلع کیا تو اخبار رکھنے دیکھنے لگا جبکہ ذہنی رو ہٹک گئی تھی۔

”سکندر راہوہ مرانساء تھی میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید ڈیوری کے لیے آئی تھی اس کی گودیں بچہ بھی تھا۔“ شٹ اپ آئیہ۔ اس وقت اس نے چلا کر اسے خاموش کر دیا تھا اور اب اس کا سامنا ہونے کا خیال اسے آیا، حالانکہ اس کی بیوی اور بچے کے بارے میں وہ جان چکی تھی پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس نے ہوگا، کتنی دیر بعد وہ گاڑی سے اتر کر اندر آیا اور بہت محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑا مرانساء کا پوچھا تو وہ ہنس دیکھ کر بتانے لگی۔

”مرانساء۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ایئر مٹ ہوئی ہیں۔ ان کا پہلا کیس بھی نارمل نہیں تھا اور ابھی بچہ آپریشن آپریشن کے بارے میں آپ ڈاکٹر فرزانہ حسین سے معلوم کریں۔“

”ڈاکٹر فرزانہ حسین؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کے عقب میں اشارہ کر کے بولی۔

”ادھر رائٹ ہینڈ روم نمبر فور میں ملیں گی۔“

”تھینک یو۔“ وہ جاتے جاتے پلٹا تھا۔ ”اور مرانساء کہاں ہیں اس وقت؟“

”روم نمبر ایون۔“

”تھینکس اگین۔“ وہ بے آواز مگر تیز قدموں سے پہلے روم نمبر ایون میں آیا تو وہاں صرف بی بی جان اسے دیکھتی ہی کھٹکتی گئیں۔

”اچھا ہوا تم آگئے ڈاکٹروں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بتائیں کیا کیا بولتی ہیں۔“

”آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیس گھر پر بھی ہو سکتا تھا۔“ وہ خفا ہوئے لگا۔

”منع کر دیا تھا ڈاکٹر نے کل اتنی تھی مرانساء کو دیکھنے۔ کہہ رہی تھی گھر پر نہیں ہو سکتا۔ آپریشن ہو گا۔“

بہر حال وہاں سے لے کر آئی تھی۔ آٹا نہیں ہوا ہے، اچھا اسپتال ہے میں نے سوچا۔“

”وہ ان کی تفصیل سے آٹا کر بول پڑا۔“

”ابھی نرس نے کر گئی ہے۔ بتائیں کیا کرنا ہے بی بی جان سوچنے میں لگ گئیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کرتا ہوں۔“

”جی ہاں سے نکل کر ڈاکٹر فرزانہ حسین کے کمرے کا رخ کیا پھر ان سے مرانساء کی کنڈیشن اور آپریشن کا وقت معلوم کرنے کے لیے وہ کمرے کے پاس آ بیٹھا کیونکہ ڈاکٹر نے پندرہ منٹ بعد آپریشن بتایا تھا اور اتنی دیر کے لیے وہ کہیں بیٹھ سکتا تھا۔ عجیب شکل تھی۔ اسے لگا جیسے ہر موڑ پر اس کے لیے امتحان رقم کیا گیا ہے۔ وہ آئیہ سے وعدہ کر کے کہ اس کے راتے میں نہیں آئے گا۔ اور تقدیر کی ستم ظریفی کہ پھر وہیں لے آئی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر بھی اسے ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔

بی بی جان اس کی خاموشی سے یہی سمجھیں کہ وہ مرانساء کے آپریشن کا سن کر پریشان ہے جب ہی اس کا دھیان بنانے کو دینے لگیں۔

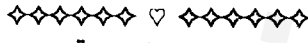
”اچھا کو چھوڑ آئے؟ تو نہیں رہا تھا؟“

”جی جی نہیں۔“ اس نے جو تک کر دونوں باتوں کا جواب دیا۔

”تو بچوں کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں اسکول نہیں ہیں جو بچوں کو اتنی دور بھیج دیتے ہو۔ لڑکے تو لڑکے۔ بچیاں تو بچیاں۔ یونس اور جمنا تیکر کی بیٹیاں ماشاء اللہ سمجھ رہی ہیں۔ اتنی عمر میں میں نے شہر مانو پوچھنے میں بٹھا دیا تھا۔“

”جی ہاں اتنی بڑھانے آئی تھی۔“

”اب وہ وقت نہیں ہے بی بی جان! لڑکا ہوا لڑکی تعلیم دونوں کے لیے ضروری ہے۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اس کا دیکھنے سے بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا اور بی بی جان کو نوک بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مرانساء کا پتا کرنے کے بہانے سے نکل کر راپارڈی میں شلنے لگا تھا۔



نیل کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے کھڑکی سے باہر کچھ چمچ پھل دکھا رہی تھی۔ تاکہ اس کے اندر کچھ شوق پیدا ہو کہ وہ بھی بس گودوں کی طرح باہر آجائے اور وہیں سے اس نے شاہ سکندر کو ہاسپٹل کے گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تھا جس کا اس کا سارا اطمینان میں بے رخصت ہو گیا۔

”کتنی اچھی ہوں میں جو اس کے وعدے کا اعتبار کر لیا کہ اب کبھی مجھے تنگ کرنے نہیں آئے گا۔“ وہ نیل کو بید پر بٹھا دیکھ کر ادھر سے ادھر منسلک ہو گئی تھی۔

”وہ پھر آیا اس پر میرے ہاتھ جوڑنے، میری عاجزی کا کچھ اثر نہیں ہوا۔“ اس نے کہا کہ اس نے کہاں جاؤں۔“ اس پر بے وفائی ہوئے لگی اور انجانے خدشات میں گھر کو کچھ خوفزدہ بھی ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ابھی وہ سارے میں اسے پکار رہا ہوا۔ گاؤں پر چڑھنے کا مطالبہ کرے گا، سب کے سامنے تماشا بننے کا خیال ہی روح فرساتھا۔ وہ اس صورت حال سے نمٹنے کا پتہ نہ لگتی۔

”پھر پوچھا۔“ نیل کے پکارنے پر یہ وہ اچھل پڑی۔

”تھانکس۔“

”نیل نے۔“ نیل نے نیٹ بکٹ اس کی طرف بڑھایا تو اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔

”آپ خفا ہوئے۔“ تھینک یو۔“ وہ اس کا گال تھپک کر کمرے سے نکل کر آئی اور کاؤنٹر پر رک رکھتا ہر سرسری انداز میں اسے دیکھتی ہی کھٹکتی گئیں۔

”منع کر دیا تھا ڈاکٹر نے کل اتنی تھی مرانساء کو دیکھنے۔ کہہ رہی تھی گھر پر نہیں ہو سکتا۔ آپریشن ہو گا۔“

”نیل نے؟“ ”عقب سے ڈاکٹر یا سمین نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تو وہ ہنسنے کا پوچھا کہ بولی۔“

”وہ... نبیل کے گھر سے کوئی آنے والا تھا۔ اس کے نانانی یا شاید اس کی مہی۔“
 ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔
 ”نہیں تو، میں پریشان کیوں ہوں گی البتہ نبیل پریشان ہو جاتا ہے انہیں دیکھ کر اوکے۔ میں ذرا وارڈ کا چکر لگاؤ
 اسے یا سمین سے اپنی کیفیت چھپانا مشکل ہو رہا تھا جب ہی سامنے سے چلی آئی۔
 احتیاج وارڈ میں کل چھ بیڈ تھے۔ اس نے ایک ایک بچے کے پاس رک کر چیک کرنے کے ساتھ اس کا حال
 پوچھا اور وہی روزانہ والی باتیں دہرائیں جو وہ بچوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کرتی تھی۔ پھر نبیل کے کمر
 آکر اسے اپنے جانے کا بتایا کیونکہ بائچ بننے والے تھے۔
 ”چھو پھو! اگلے پھر صباحت کو لے کر آئے گا۔“ نبیل نے شوق سے کہا تھا۔
 ”بیٹا! ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ بس اب کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں آپ کو گھر لے جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی کو
 قریب آئی اور ذرا سا پردہ ہٹا کر پیچھے کھینچنے لگی غیٹ کے سامنے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور کیونکہ اس نے شاہ
 گاڑی سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ موجود ہے یا جا چکا ہے۔

”شاید چلا گیا اور اگر نہیں بھی گیا تو...“ اس نے قدرے الجھ کر سر جھٹکا پھر نبیل کو خدا حافظ کہہ کر اپنا پرس
 اپنے کمرے میں آئی تو یاسمین موجود نہیں تھی۔
 ”سسر! ڈاکٹر یاسمین کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے سے نکلنے ہی نرس سے پوچھا۔
 ”جی انہیں ڈاکٹر وہاب نے بلایا ہے، کمرہ دہی تھیں۔ آپ نیچے چلیں وہ ابھی آتی ہیں۔“ سسر کا جواب سن
 کی طرف بڑھ گئی۔
 اس کے اندر غالباً ابھی بھی خوف موجود تھا جب ہی یاسمین کے انتظار میں کہیں رکنے کے بجائے وہ فوراً
 جانا چاہتی تھی تاکہ جانے پہچانے لوگوں کے سامنے کوئی بد مزگی نہ ہو۔ اس لیے لفٹ سے نکلنے ہی تیز قدموں
 عبور کر رہی تھی کہ عقب سے بھگتے قدموں کی آواز کے ساتھ ایک پکار بھی۔
 ”اس! اس!“

”میرے خدا!“ اس کے قدم اپنے آپ رک گئے۔ بے تحاشا دھڑکنے والے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ لٹی تھی کہ اسی بل
 ہی بچی اس کی ناگوں سے لپٹ گئی اور اس کے پیچھے آتا شخص رک کر بولا۔
 ”سوری، یہ بچی بہت شرارتی ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں۔“ اس نے دھیرے سے بچی کا گال چھو کر کہا۔
 ”اس! اچلو بیٹا! آپ بھی سوری کرو۔“ اس نے بچی کو بازوؤں میں اٹھا کر کہا تو وہ گہری سانس کے ساتھ ذرا سا
 ”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟“
 ”آصفہ!“

”گڈ۔ گڈ نیم۔ اوکے ناٹی گرل سی ہو۔“ اس نے بچی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ذرا سا ہلایا پھر جانے
 بڑھائے تھے کہ کچھ فاصلے پر شاہ سکندر کو ٹھٹھٹے دیکھ کر وہ پھر اسی حالت میں آگئی۔
 شاہ سکندر ٹھٹھٹا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اور اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے اس شغل
 ہے، بظاہر بہت بے نیاز سا اسے دیکھا بھی یوں جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو، لیکن ہونٹوں میں دہی میم مسکراہ
 کی غماز تھی کہ کچھ دیر پہلے کی صورت حال سے وہ اس کی کیفیات جان کر ایک انتہائی خوشی محسوس کر رہا ہے۔
 آصفہ کا دل چاہا اسے روک کر پوچھے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اتنی جلدی اپنا وعدہ کیوں بھول گیا۔ لیکن
 سے وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس سے وہ بس اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ لپٹ
 قدموں سے باہر نکل آئی اور یاسمین کی گاڑی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔
 ”سوری۔ تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا۔“ یاسمین کی آواز نے ہی اسے سوچوں کے بھنور سے نکالا تھا۔
 ”کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر وہاب؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتی ہی پوچھا۔

”یہ مسئلے پر ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔
 ایک ایسی عورت کو میں جانتی ہوں، کم تو ابھی اس کے پاس لے چلتی ہوں اگر تمہاری تسلی ہو جائے تو بات کر لیتا اس
 لیے یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تمہاری آفر قبول کرے گی یا نہیں۔“ یاسمین نے کہا تو اس نے قدرے پر
 ملازمین پوچھا۔
 ”ون ہے؟“
 ”یہ ام جہاں رہتے تھے۔ وہ وہیں رہتی تھی۔ یعنی میں نے اسے بچپن سے دیکھا ہے۔ دو میاں بیوی تھے۔ کوئی اولاد
 نہیں آتے جاتے بچوں کو بلا کر کبھی مانی دیتی بھی نہ تھی۔ پھر ہم یہاں شفٹ ہو گئے تو کبھی کبھار امی سے ملنے آ جاتی تھی
 جب سے اس کے میاں کا انتقال ہوا ہے، نہیں آتی۔ پتا نہیں ابھی بھی وہیں رہتی ہے یا کہیں اور چلی گئی۔ معلوم
 نہیں۔ شاید وہیں ہو۔ کیا خیال ہے۔“ یاسمین نے آخر میں اسے دیکھا تو وہ فوراً بولی۔
 ”ہاں جلد ابھی چلو۔“

”نہیں نے ڈاکٹر وہاب آٹ سے گاڑی واپس موڑی اور تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہ مطلوب گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔
 ”ون!“ وینک کی جواب میں دروازہ کھلنے کے ساتھ جو عورت سامنے آئی اسے دیکھ کر یاسمین اسے ”یہی ہیں“ کا
 اٹکی ہوئی اس سے بولی۔
 ”ہیں ہوں بولا۔ یاسمین! پچھانا نہیں آپ نے؟“
 ”نیل نہیں پہچانوں گی۔ او اندر آؤ۔“ انہوں نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔
 ”یہ ممکن دوست ہے آئیہ۔ یہ بھی ڈاکٹر ہے اور خاص طور سے آپ سے ملنے آئی ہے۔“ یاسمین نے اندر داخل
 تناس کے تعارف کے ساتھ کہا تو وہ بے اختیار بولی۔
 ”صرف ملنے نہیں لینے آئی ہوں۔“
 ”مجھے لینے آئی ہو۔ کیوں؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یاسمین کو دیکھنے لگی۔
 ”وہاں۔ میں اسے آ جاتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یاسمین بھی کچھ سٹپا گئی تو
 سنبھاری باری دونوں کو دیکھا پھر آئیہ سے بولیں۔
 ”جی اے! ہو۔“

”اسے اندر چمن سے کوئی چیز لوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے
 اسے اس حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب
 ”نہیں! کوئی نہیں! میں ہوا اور گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔ پھر بھی یہ چاہتی ہے کہ اگر آپ اس کی بچیوں کے پاس رہنا
 نہ چاہیں گے۔“ اس نے کوئی اعتراض نہیں۔ ”وہ کچھ کچھ اس کا مسئلہ سمجھ کر کہنے لگیں۔

”یہ روری ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے مہرا النساء کی آنکھوں سے بازو ہٹایا تو گھٹی سیاہ پلکوں کے درمیان سے جیسے سارا جادو ان ہی آنکھوں میں ہے۔

”رونے کی کیا بات ہے بیٹا! ایک دودن کی تکلیف ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ اسے تسلی دینے کے ساتھ اسے چپکے کرنے لگیں پھر اسے مخاطب کر کے بولیں۔ ”دیکھنا آئیہ! ادھر بیٹوب ہوگی۔“

اس نے جلدی سے کارنر نیپل سے بیوب اور کاٹن اٹھا کر ڈاکٹر فرزانہ کو کھمبادی لیکن فوراً ”احساس ہر جسم“ طرف سے آکر ان کی مدد کرنے لگی۔

نہیں کہ وقت شاہ سکندر کمرے میں داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر دروازے کے پاس ہی رک کر جو شاپازہ ”ہاں جان کی طرف دھبھاتا ہوا بولا۔

”کون سی بی جان آئیہ لے لیں۔“

آواز پر وہ چونکی ضرور لیکن سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور جیسے ہی فارغ ہوئی، واش روم میں جا کر ہاتھ دھو دوبارہ کمرے میں آئی تو مہرا النساء کو دیکھ کر بولی۔

”اگر آپ پہلے اپنا خیال رکھتیں تو یہ تکلیف نہ سہنی بڑی آپ کو۔ اب کم از کم بیس دن مکمل آرام کرنا“ ہاں اور اس دوران کوئی بد پریمیزی بھی نہیں کرنی۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے اس کی تائید کے ساتھ کہا۔

”بچے کو دودھ تو پلایا سکتی ہوں یا نہیں؟“ مہرا النساء نے پہلی بار لب کشائی کی تو وہ بے اختیار اس کے ہر جنبش دیکھنے لگی تھی۔ اور چونکی اس وقت جب شاہ سکندر اسے مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا۔

”ہیکسکسیوزی ڈاکٹر! کوئی پراہم تو نہیں ہے آئی میں میری مسز کے ساتھ؟“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر فرزانہ موجود نہیں تھیں۔ وہ اپنے آپ میں غجل سی ہوا۔

”نو بیٹی! ایسب کھاؤ۔“ بی بی جان نے پلٹ اس کے سامنے کی۔

”شکریہ۔ میں سیب نہیں کھاتی۔“ وہ انکار کر کے آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازے پر رک کر پورے اعتماد کر بولی تھی۔

”مسز سکندر! میں آپ کو مبارک باد دینا تو بھول ہی گئی۔ بیٹے کے ساتھ نئی زندگی کی بھی۔“ نئی زندگی! اشارہ شاہ سکندر کی اس کی طرف واپسی تھی۔ جسے مہرا النساء سمجھی یا نہیں وہ سمجھ گیا تھا۔ اور محض اسے دیکھنے کی خاطر پوچھنے لگا۔

”میں کب تک انہیں گھر لے جا سوں گا؟“

”موری۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس بارے میں ڈاکٹر فرزانہ ہی بتائیں گی۔“ وہ براہ راست اس کی

میں دیکھ کر بولی تھی۔

اور یہ اس کی شاہ سکندر سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد کبھی سامنا ہوا بھی تو وہ اپنے وعدے کے اجنبیوں کی طرح نکل گیا۔ اور وہ اول تو پلٹ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی، اگر کبھی دل میں کوئی درد جاگڑنے مہلت نہیں دی تھی۔

یہ نہیں تھا کہ وقت بہت تیزی سے بھاگا تھا۔ اس کی وہی اپنی رفتار تھی لیکن آئیہ نے اپنی زندگی کا جو مرتب کر لیا تھا اس کے مطابق چلنے کے لیے اسے اپنی ساری توجہ ادھر ہی مرکوز رکھنی پڑی تھی۔ وہ بیباک صباحت کی بہترین تعلیم و تربیت کر کے انہیں کامیاب زندگی گزارنے کے قابل بنانا چاہتی تھی جس کے ضروری تھا کہ وہ انہیں کسی محرومی کا احساس نہ ہونے دے۔ اور اپنی طرف سے اس نے کوئی نہ کمر نہ کیا تھا۔

خوابی ذات کو فراموش کر کے اس نے ان تین بچوں کی آبیاری کی تھی۔

بغیر کسی سارے اور کسی کی مدد کے۔ یہ نہیں تھا کہ کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا سب تھے سالہا

بڑھ سکھ میں شریک لیکن اس نے جس طرح اپنی زندگی کے سبب کو ان تین بچوں کے نام انتساب کر کے کسی اور کی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ جبکہ زندگی کے باقی سارے معاملات اسی طرح چلتے

جس میں بس تھوڑی بہت تبدیلی آتی تھی۔ پہلے اوپر کا پورشن بڑے بھیا کے پاس تھا اور ان کے باہر بعد دو سال تک تو ان ہی کے انتظار میں خالی رکھا گیا پھر جب عدیل بھائی کی شادی ڈاکٹر آسمین کے ساتھ

یہ اس ایک سال پہلے سے۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کینڈا چلے گئے۔ تب آئیہ نے اپنا ٹھکانا اوپر

یہ اس کی ضرورت تھی۔ گو کہ اس کا اپنا پارٹمنٹ بھی موجود تھا۔ لیکن وہاں رہنے کا اس نے کبھی نہیں

پلے اپنا سامان اٹھا کر اسے کرائے پر دے دیا تھا۔ ہر حال کافی وقت گزر گیا تھا۔ سترہ سال۔

اول میں بچے نو جوانی کی دہلیز پر آکر جہاں جوانوں کے حوصلے بلند کر رہے تھے وہاں ماں جی اور اباجی کے

اپنی شوخیوں، شرارتوں اور خدمتوں سے سہارا دے کر ان کی دعا میں سمیٹ رہے تھے۔

میں صرف خلیل بھائی اور آئیہ کے بچے تھے۔ باقی خلیل بھائی جو شروع سے اسلام آباد میں مقیم تھے

وہیں مستقل ٹھکانا کر لیا تھا۔ لیکن باپ سے غافل کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ہر تہوار کے علاوہ چھٹیوں

ماں بچوں سمیت ان کی آمد تینی ہوتی تھی۔ ان کے وہی اپنے اشعار اور مسیحا تھے۔

یہ چھ ماہ دو سال کا کہہ کر جدہ گئے تھے پورے بعد بس لوٹے تو اپنا الگ گھر لے لیا تھا۔ ساتھ سے ان کی

ہاں تھیں۔ رجا، مریم اور میر۔ یہاں آکر انہوں نے نے نیپل کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن وہ

باقی اور آئیہ سے الگ ہونے پر تیار ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ ویک اینڈ پر ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ جبکہ

ہاں آسمین ابھی تک کینڈا ہی میں تھے اور ان برسوں میں دو تین بار یہی آئے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں

اب بیٹیاں بڑی ہو رہی تھیں تو شاید اسی لیے انہوں نے جلد مستقل واپسی کا ارادہ لکھ بھیجا تھا۔ لیکن

نے کے بعد بھی ان کا اس گھر میں رہنا مشکل لگ رہا تھا، کیونکہ شروع سے الگ تھلگ رہنے والے سب

ایڈجسٹ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہوشہ ساتھ رہنے والے الگ ہونے کے خیال سے پریشان ہو جاتے

، کیونکہ بھابھی۔ اس عرصے میں دو بار خلیل بھائی ٹرانسفر ہو کر دوسرے شہر گئے تھے لیکن میوندہ بھابھی نے

اتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے پاس محسوس ہوتا تھا کہ اس کو ان کے بچوں میں

نی تو یہ کاغذات ہوا تھا جو کہ مدیہ اور صباحت سے دو سال چھوٹی تھی۔

نیل کو اس بر فوقیت دے جاتی تھی۔ اور ہمیشہ جائز بات پر ہی ایسا ہوتا تھا لیکن مدیحہ اپنی ناجائز کو بھی کھاتے میں ڈالتی تھی اور دوسرے کی جائز کو ناجائز کے

اگر عموماً میں زیادہ فرق نہ ہوتا تو اس کی نیل کے ساتھ باقاعدہ ٹھنی رہتی۔ ابھی بھی ڈائریکٹ ڈائریکٹ کبھی کبھی ان کی تبدیلی اور دل آزاری کر جاتی تھی۔ جس پر سوائے ان کے باقی تمام کنزرویٹو تھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور اسی کی جزواں، حسن صحبت تھی۔ رنگ روپ، ناک، نونہ میں بالکل مدیحہ اگر ذرا سا فرق تھا تو اس تل کا جسے پہچان کے لیے سب سے پہلے سہا بھائی نے اس کی دائیں طرف لگا تھا۔ پھر ایک عرصہ تک میمونہ بھائی اور اماں جی اسی پر نشان لگاتی رہی تھیں اور جہر گئیں تو قدرت کی طرف سے اپنے آپ میں تل نکل آیا تھا۔ جو اس کے شفاف چہرے کی دلکشی میں باعث تھا۔ اور کیونکہ پہلی نظر اسی پر پڑتی تھی اس لیے دونوں کی پہچان میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ پھر عمر سے نکلنے ہی مدیحہ نے جانے اپنے چہرے کی دلکشی میں اضافے کی خاطر یا سب کو مشکل میں ڈالنے ہی مل بنانا شروع کر دیا تھا۔

جس سے صرف ایک شخص دھوکا نہیں کھاتا تھا اور وہ نیل تھے۔ انہوں نے کبھی اس تل کے دھوکے صحبت نہیں پکارا تھا۔ جبکہ باقی سب دھوکا کھاتا جاتے یہاں تک کہ آسیہ بھی۔ بہر حال شکل و صورت لیکن عادات میں صحبت اس کے برعکس تھی۔ حد درجہ نرم خو، جیسے مدیحہ کے رویوں کی عکاسی ہی تھی۔ سب سے زیادہ اسے اپنے نیل بھائی کی فکر رہتی تھی۔ کہ باقی سب تو پھر بھی مدیحہ سے کہہ سکتے لیکن وہ بے چارے بالکل خاموش ہو جاتے، ابھی ایسا بھی ہوتا کہ مدیحہ نیل کی دل آزاری کرتی تو پھر صحبت خود کو ان کے سامنے مدیحہ ظاہر کر کے معافی مانگتی اور اس وقت انہیں اس پر بے طرح ہار آتے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی بات رکھنے کی خاطر بعد میں اسے بتاتے کہ مدیحہ نے اپنے رویے کی معافی مانگ اور وہ اپنی تدبیر پر خوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال آسیہ نے ان تینوں کو ایک سی محبت، ایک سی توجہ دی تھی اس کے باوجود ان کے مزاجوں میں یہ نہیں مل سکتی تھی کیونکہ ہر بچہ اپنی فطرت کے لپیٹا ہوتا ہے جسے جب تک وہ خود نہ بدلنا چاہے کوئی سکادور نہ ہر بچہ اپنے ماں باپ کی خواہشوں کا پرتو ہوتا۔

→ → → →

آسیہ ابھی کلینک سے لوٹی تھی۔ روزانہ کی طرح کچھ دیر اماں جی اور اماں جی کے پاس بیٹھ کر ان کا حال پھر اوپر آئی تو اب جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں فوراً "کتنی ہوئی بولیں۔"

"جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔ مدیحہ بہت دیر سے بھوک بھوک کر رہی ہے۔"

"تو آپ نے کھانا لگنا تھا ہوا! میرے انتظار میں کیوں بیٹھائے رکھا اسے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں نے تو کتنی بار کہا اس سے لیکن اس کی اپنی ضد تھی کہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

"اچھا۔ چلیں آپ کھانا لگا میں اور ان تینوں کو بھی بلائیں۔ میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔"

اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد آسیہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تینوں نے ایک ساتھ اسے سلام کیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام،" بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو۔" وہ اپنی کرسی کھینچتی ہوئی بولی۔

"آج آپ نے بہت دیر کر دی ماما! مدیحہ نے بیٹھنے ہی کہا تو اس نے کھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد تعبہ دیکھا۔"

"ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں اور میں روزانہ اسی وقت آتی ہوں۔"

"آپ تو اپنے وقت پر آتی ہیں ماما۔ لیکن مدیحہ کو بھوک وقت سے پہلے لگ گئی تھی۔ اس لیے اسے

"صباحت نے سائن کا ڈونگا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"صباحت نے بتایا ہے مجھے۔ اور تمہیں بھوک لگی تھی ماما! تو کھانا کھا لینا تھا۔ آئندہ اس طرح میرے انتظار میں بیٹھنا۔ اور شروع کرو۔"

"اس نے مدیحہ کی پلیٹ میں سائن ڈالا پھر ڈونگا نیل کو تھما کر پوچھنے لگی۔

"نیل بھوک رہے کے لیے ایسا کی کیا تھا۔ کوئی جواب آیا؟"

"نیل بھوک رہی تھی۔ تو نہیں آیا۔"

"نیل نے کہا تھا کہ مدیحہ فوراً بولی۔

"نیل نے کہا تھا کہ مدیحہ فوراً بولی۔"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

"یوں؟"

"آسیہ نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔"

”مدحیہ مجھے ہے وقوف لگتی ہے۔“

”آپ شاید مذاق کر رہی ہیں یا پھر میرے سامنے آپ۔“

”نہیں میں مذاق نہیں کر رہی، وہ واقعی ہے وقوف ہے، تمہاری طرح۔“

”جناب! میں ابھی بھی بے وقوف نہیں تھی۔“ آسیہ نے ہوں سر جھکا کر جیسے انہوں نے کوئی ہاتھ ہاں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تم نے۔ بچوں کو بہانا بنا کر ایک دھوکے باز ہرجائی کے ہاتھوں اور نہ! ”میمونہ بھابھی سخت سے بولیں۔“

”اب یہ میری قسمت کہ اس جیسا پھر کوئی اور ملا ہی نہیں۔“

وہ بظاہر ہر تسکراتی تھی۔

میمونہ بھابھی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”مدحیہ! اور صبا کو بھیج دیں، اور آپ کو چوکیداری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان دونوں کی۔“ وہ ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئی پھر کھلی چھت پر ٹھننے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد مدحیہ اور تو وہ رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ماما۔ آپ سو نہیں رہیں۔“ مدحیہ نے پوچھا۔

”تم دونوں کو صبح کانچ جانا ہے کہ نہیں ہے؟“ وہ مدحیہ کی بات یکسر نظر انداز کر گئی۔

”جانا ہے ماما۔“

”تو اب تک نیچے کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر سوؤ۔“ آسیہ قدرے رعب سے بولی۔

”ابھی تو دس بجے ہیں نہیں بچے ماما۔“ مدحیہ نے صاحت کو کہنی مارتے ہوئے کہا کہ وہ بھی کچھ بول۔

کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ آسیہ نے ایک بار پھر ٹھٹھانا شروع کر دیا تھا۔

✦ ✦ ✦ ✦

کالج سے آکر کھانے وغیرہ فارغ ہونے کے بعد نبیل کے کمرے کی بجائو پونچھ کی غرض۔ ان کے کمرے کا رخ کیا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ گوکہ نبیل چیریں نہیں پھیلاتے تھے لیکن پند کرنا ہمیشہ بھول جاتے۔ جہاں سے دھڑوں گردان کے کمرے اور خصوصاً ”رائٹنگ ٹیبل“ پر ہوا تھی۔ اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ان کے کمرے کی صفائی اپنے ذمے لے لی تھی۔

چیریں ادھر کر دیتی تھیں جس سے نبیل کو خاصی پریشانی ہوتی تھی۔ بروقت کام کی چیز ملتی ہی نہیں انہوں نے بوکا اپنے کمرے میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ اور شروع میں تو انہوں نے اسے بھی منع کیا مانی اور دھیرے دھیرے اپنا معمول ہی بنالیا تھا۔ اس وقت اس نے پہلے بند کی چادر بھاڑ کر دوبارہ صوفوں کی گرد بھاڑی اس کے بعد رائٹنگ ٹیبل کے پاس آئی تھی کہ نبیل کی اسٹک کی آواز سن کر اس سے برہہ کر دروازہ کھولا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ نبیل نے اندر آتے ہوئے پوچھا تو وہ دوبارہ ٹیبل کے پاس جا کر بولی۔

”صفائی!“

”اگر تمہیں صفائی کا اتنا ہی شوق ہے تو شام میں کر لیا کرو، کتنی بار کہہ چکا ہوں میں تمہیں۔ اس تھکی ہوئی آتی ہو آرام کیا کرو۔“

”کوئی ایسا جان جو کھوں کا کام تو نہیں ہے نبیل بھائی! منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں اچھا لگتا کا کمرہ گند اڑا رہا ہے۔“ وہ جلدی جلدی نبیل صاف کر رہی ہوئی بولی۔

”اچھا دیکھو۔ دراز میں نیلے رنگ کی ڈائری ہوگی۔ وہ مجھے دے دو۔“

انہوں نے بیڈ پر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا تو اس نے دراز کھول کر ڈائری نکالی اور انہیں تھما کر پوچھا۔

”آپ نے کھانا کھالیا؟“

”ہاں، نیچے اباجی کے پاس تھا۔ ان ہی کے ساتھ کھایا ہے۔ اب براہ مہربانی تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے کچھ کام رہا ہے۔“

انہوں نے ٹھٹھانا شروع کیا۔ تب ہی ادھر مدحیہ نے حسب عادت زور سے الماری بند کی تھی جس سے آواز اڑھو گئی تھی۔ اور نبیل غالباً عادی ہو چکے تھے۔ جب ہی ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا جبکہ وہ غصہ نہ کیا۔ مدحیہ جو کبھی نہیں سدھرے گی۔ نبیل بھائی آپ اسے ڈانٹتے کیوں نہیں۔“

”نبیل! کیا ہے اس نے؟“ انہوں نے تجاہل عارفانہ سے دیکھا۔

”ہاں! یہ ابھی آپ کا پورا کمرہ ہل گیا اور آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں تب دراز نکلا۔

”نبیل خیر پتا تو چلا ہے کہ مدحیہ اس وقت کسی بات پر تلملائی ہوئی ہے۔ جاؤ دیکھو کہیں غصے میں تمہاری چیریں ڈال کر نہ بیٹھ گئے۔“

”اب غصے میں اسے میری ہی چیزیں ملتی ہیں۔“

وہ بھال کر اپنے کمرے میں آئی اور سارے میں نظریں دوڑانے کے بعد مدحیہ کو دیکھا۔ وہ آرام سے لیٹی تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ مدحیہ نے ٹوکا۔

”میرا خیال تھا۔ تم سوچتی ہو۔“ اس نے کہا تو مدحیہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

”تو پتا سوچ لی تھی لیکن نبیل بھائی کی ٹنگ ٹنگ نے ساری غنیمت اچاٹ کر دی ان سے کہو! اپنی اسٹک کے پرے پر رکھ لو!۔ اس کی آواز مجھے زہر لگتی ہے۔“

”پوچھو خدا کا خوف کرو مدحیہ! نبیل بھائی شوق سے اسٹک لے کر نہیں چلتے۔“

اس نے تاسف سے ٹوکا تو وہ مزید چڑ گئی۔

”مجھے پتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ دوسروں کی نیندیں خراب کریں۔ اچھی بھلی سو گئی تھی۔ تم پتا نہیں کہاں سے۔ ماما کو بھی بس شوق ہے یہی پالنے کا۔“

”الہ!“ صاحت نے وہاں سے دیکھا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ نہ کرے جو کوئی یتیم ہو۔ اللہ سلامت رکھے بڑے ناموں کو اور۔“

”ابا! کو! اور ہمارے باپ کو۔“ اس کے خاموش ہونے پر مدحیہ نے چیخ کر کہا تھا۔

”تم بہت بد تمیز ہو گئی ہو مدحیہ۔ ماما نے اگر سن لیا تاں تو بہت ماریں گی تمہیں۔ یہ خیال بھی نہیں کریں گی کہ تم بڑی ہو گئی ہو۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

”کیوں ماریں گی۔ باپ گالی تو نہیں ہے۔ گالی ہوتے تو میرے اور تمہارے ناموں کے ساتھ ان کا نام نہ لگا ہوتا۔“ مدحیہ تیز سے میں بول رہی تھی۔ اچانک آواز دبا کر کہنے لگی۔ ”سنو! کسی دن ماما سے سکندر حیات کے بارے میں پوچھیں گے۔ ان کا اتنا تامل کیا تو مل بھی آئیں گے۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم۔“ صاحت کچھ پریشان ہو گئی۔

”جیک کیہ رہی ہوں۔ آخر وہ ہمارا باپ ہے۔“

”باپ کو تو کبھی خیال نہیں آیا ہم سے ملنے کا۔ پھر ہم کیوں ملیں۔ ویسے بھی وہ یہاں نہیں رہتے۔ ایک بار میں پوچھا تھا ماما ہی سے۔“ صاحت نے کہا۔

”بابی کو کیا پتا۔ ان کی دنیا تو بس اسی چار دیواری کے اندر ہے۔ البتہ ماما کو ضرور پتا ہوگا لیکن وہ بتائیں گی۔“ مدحیہ نے دراز اور بڑا ہونے دو پھر دیکھنا کیسے معلوم کرتی ہوں۔“ مدحیہ بڑے آرام سے بول رہی تھی جیسے کوئی نہ سنا رہا ہو۔

”مدحیہ! جو بات ماما کو پسند نہیں۔ وہ ہمیں سوچتی بھی نہیں چاہیے۔“

صبا نے خاصے ناصحانہ انداز میں کہا۔ تب ہی دستک کے بعد ذرا سادرواڑہ کھول کر عمر اندر بھانک کر
 ”سنو پھوپھو سو رہی ہیں کیا؟“
 ”ہاں۔ کیوں؟“ ”مدیحہ جواب کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ اندر آتا ہوا بولا۔
 ”اباجی بلا رہے ہیں انہیں لیکن انہوں نے نہ بھی کہا ہے کہ اگر سو رہی ہوں تو مت اٹھانا۔“
 ”نہیں اٹھائے۔“ ”مدیحہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔
 ”شاباش۔ اب ذرا ایک گلاس پانی پلا دو۔“ ”عمر کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا تو مدیحہ نے فوراً ”ٹوکا۔“
 ”بیٹھنا مت۔“

”کیوں؟“ ”عمر کرسی ہلا کر دیکھنے لگا۔
 ”کرسی مضبوط ہے۔ اسے جھوٹا اور میاں سے نکل کر بائیں ہاتھ چند قدم جلو پھروائیں ہاتھ مزید
 بائیں ہاتھ پر رکھیں۔ وہاں فریج رکھا ہو گا۔ اسے کھولو ایک ٹھنڈی بوتل نکالو پھر گلاس اٹھا کر خود بھی
 لیے گی ہے تو۔“

مدیحہ نے بڑے آرام سے اسے پانی کا راستہ بتا کر تکیے کے ساتھ ٹیک لگا لیا۔ تو وہ بیٹھتے ہوئے ملامت
 ”چہ چہ“ اتنی دیر میں تمہاری لے آئیں خیر چھوڑو۔ مجھے کوئی ایسی پیاس نہیں لگی۔“
 ”توبہ۔ کتنے کاہل ہو تم لوگ۔ پانی نہیں لی سکتے۔“ ”صباحت اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”چار بج گئے ہیں۔ بوا اسے چائے کا بھی کہہ دینا۔“ ”مدیحہ نے جھٹ دوسرا کام بھی کہہ دیا۔
 ”صبح اس کی کاہلی پر تاسف سے سر جھٹکتی کمرے سے نکل گئی۔“

♥ ♥ ♥ ♥
 عدیل بھائی کی آمد کی اطلاع نے سارے میں ہلچل مچادی تھی۔ اماں جی اور اباجی خوشی میں بوکھا
 تھے۔ روزانہ ایک ایک کلو گرام کراس کے سیر دو کوئی نہ کوئی کام کرتے اس کے بعد خود بھی سر پر جا کھڑے ہو
 ”اباجی! وہ کچھ جھنڈیاں وغیرہ بھی لے آؤں۔ لال پیکلی؟“
 عمر بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کی بھونڑا آنکھوں میں چمکتی شرارت دیکھ کر صباحت
 ساختہ نہیں۔ جبکہ مدیحہ اس کے ساتھ مل گئی۔
 ”ہاں اباجی! پورے گھر کو جھنڈیوں سے سجائیں گے۔ شاندار استقبال ہونا چاہیے عدیل باو
 جیسے کوئی راجہ مندر آ رہا ہو۔“ ”حصر نے فکڑا لگایا۔
 ”کون آ رہا ہے۔“ ”اماں جی سمجھیں نہیں۔“

”وزیراعظم اماں جی! وزیراعظم۔“ ”عمر زور دے کر بولا۔
 ”ہاں! وزیراعظم اپنے گھر آ رہے کیوں؟“ ”اماں جی ایک ایک شکل دیکھنے لگیں۔
 ”کیا اصول بائیں لے کر کھڑے ہو گئے ہو تم لوگ۔ جاؤ فائنٹ کا نام معلوم کرو۔“ ”اباجی نے بوبہ۔
 ”اباجی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ ”مدیحہ نے کہا تو احمد لالی کی طرف جاتے جاتے پلٹ
 ”جی نہیں۔ خواتین سب گھر پر رہیں گی۔ صرف مرد حضرات جائیں گے۔“
 ”میں آپ سے تو بات نہیں کر رہی۔“ ”مدیحہ کو اس کی مداخلت سخت پر ہی لگی۔
 ”میں بھی اباجی سے کہہ رہا ہوں۔ اباجی! خواتین کو لے کر جانے کی غلطی نہیں کیجئے گا کیونکہ
 سے نکلنے میں دیر لگے گی اور اتنی دیر یہ لوگ وہاں کیا کریں گی۔“
 ”آخر نے مدیحہ کے پیچے ہوئے چہرے سے نظریں ہٹا کر اباجی سے کہا۔
 ”کہہ تو تم تھک رہے ہو لیکن بچیوں کو شوق ہے۔“ ”اباجی مدیحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے
 ”کرو سب چلیں گے۔“
 ”تھینک یو اباجی! وہاں کو جڑاتی۔“ ”انی بیٹھیاں چڑھ گئی۔“

مقررہ وقت پر سب ایر پورٹ پہنچے تو آگے بڑے بھیا اپنے بال بچوں سمیت موجود تھے۔ جنہیں دیکھ کر اماں جی کو
 نیل بھائی کی کئی محسوس ہونے لگی تھی کہ دو بیٹے پاس کھڑے تھے۔ تیسرا آنے والا تھا جب ہی ان کا دھیان ٹھیک
 نیل کی طرف چلا گیا تھا۔
 ”آپ کیا سوچنے لگیں اماں جی! ادھر دیکھیں عدیل بھائی آ رہے ہیں۔“ ”آسیہ نے ایک ہاتھ ان کے کندھے پر
 رکھ کر اشارے سے بتایا پھر ہاتھ ہلانے لگی۔
 ”اے! اٹھو اور روٹی کتنی بڑی ہو گئی ہیں۔“ ”میمونہ بھابی عدیل کی بیٹیوں کو دیکھ رہی تھیں۔
 پھر ایمین تو بیٹیوں کے ساتھ جلد ہی ان تک آن پہنچی جبکہ عدیل بھائی کو کچھ دیر لگی تھی۔ اور سب سے ملنے
 آئے جب مدیحہ اور صباحت کے پاس رکے تو خاصے مظلوظ انداز میں باری باری دونوں کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”آپ دونوں میں مدیحہ کون ہے اور صباحت کون۔“
 ”آپ بتائیں۔“ ”مدیحہ فوراً بولی۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایک بچی کے چہرے پر تل تھا لیکن یہاں تو دونوں کے چہروں پر نظر آ رہا ہے۔“
 ”نیل بھائی نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر پلٹ کر ایمین سے بولے۔ ”تم پہچان سکتی ہو؟“
 ”نہیں۔“ ”ایمانین دیکھیں وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”کوئی نہیں پہچان سکتا چاچو، سوائے نیل بھائی کے۔“ ”عمر نے کہا تو عدیل بھائی کچھ حیران ہو کر نیل سے
 الب ہوئے۔
 ”واقعی۔ تم پہچان لو گے نیل؟“
 ”نیل سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر گھبرا گئے تھے جب ہی نفی میں سر ہلا دیا۔
 ”کوئی سوال کریں بھائی! مدیحہ پہلے جواب دے گی۔“ ”عقب سے آسیہ نے سرگوشی میں کہا جسے سن کر عدیل
 اب بپوچھنے لگے۔
 ”کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“
 ”انٹر! مدیحہ نے بتایا تو انہوں نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر بولے۔
 ”میں نے دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ مدیحہ ہو۔“
 ”آپ کو نیل بھائی نے بتایا ہے۔ گویا وہ بھی جانتی تھی کہ اسے نیل ہی پہچان سکتے ہیں۔
 نیل نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔“

♥ ♥ ♥ ♥
 جب تک عدیل بھائی بزنس اور گھر کی سٹیجنگ نہ کر لیتے انہیں یہیں سب کے ساتھ رہنا تھا۔ اور اب کیونکہ
 پتہ بڑے ہو گئے تھے اس لیے جگہ کم لگ رہی تھی۔ لیکن کسی نے جگہ کی تنگی پر کوئی آواز نہیں اٹھائی تھی اس کے
 دودھ آ کر پائے آپ احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ اگر یہاں نہ ہوتی تو عدیل
 مائی آرام سے رہ سکتے تھے۔
 ”میں کس حساب سے یہاں قبضہ جمائے بیٹھی ہوں۔ اماں جی اور اباجی کی خواہش ہو گی کہ عدیل طویل عرصہ
 بزنس والا بنے اب ان کے پاس رہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ عدیل بھائی بھی یہی چاہتے ہوں۔ میری وجہ سے وہ
 فائوٹ ہوئے لیکن مجھے خیال کرنا چاہیے۔“
 ”آسیہ کھانے کے بعد یونہی چمکتی ہوئی ٹیبل پر آکر بیٹھی تھی کہ ان سوجوں میں گھر کا اٹھنا ہی بھول گئی تھی۔
 ”چھو پھو! نیل نے پکارا تب وہ چونکی جبکہ اس سے پہلے ان کی اسٹک کی آواز بھی مست واضح تھی۔
 ”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“
 ”نیل! کوئی۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“ ”آسیہ نے گہری سانس کے ساتھ پوچھا۔
 ”ٹوٹی نے بلایا تھا۔ شام میں ان کی طرف چلا گیا۔“ ”نیل نے آگے آکر اس کے سامنے کرسی سنبھال لی تو اس

نے پونہی پوچھ لیا۔

”کوئی کام تھا بڑے بھیا کو؟“

”جی کہہ رہے تھے۔ سمیر کو بڑھادیا کروں اس کے انگیزام قریب ہیں۔“

نیل کے جواب پر اس نے کچھ بے دھیانی میں سر ہلایا پھر لابی میں نظر ڈال کر بولی۔

”ان دونوں کی آواز نہیں آرہی۔ سو گئیں کیا؟“

”نہیں نیچے ہیں۔ اتنے عرصے بعد چاچو آئے ہیں اس لیے کچھ دن تو ہلا گلا رہے گا۔“ نیل نے اس پر

کہا کہ کہیں وہ مدیجہ اور صاحت کو بلا کر ان پر پابندی نہ لگا دے۔

”ہاں بہت عرصے بعد آئے ہیں عدیل بھائی اور میں سوچ رہی ہوں اب انہیں یہیں رہنا چاہیے۔“

انداز میں بولی۔

”تو کیا وہ تھوڑے دنوں کے لیے آئے ہیں؟“ نیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ آئے تو مستقل ہیں۔ یہیں رہنے سے میرا مطلب ہے اس گھر میں امان جی اور اباجی کے

ہماری وجہ سے شاید وہ یہاں نہ رہ سکیں۔ اور میں سوچ رہی ہوں ان کے بجائے ہمیں اپنے لیے الگ گھر

کرنا چاہیے۔ ہم انور ڈیو بھی کر سکتے ہیں اور میرا خیال ہے مجھے اب کسی بات کی کوئی فکر نہیں ہوگی کیونکہ

ماشاء اللہ جو ان ہو گیا ہے۔“

آخر میں نیل کو دیکھتے ہوئے آسیہ نے مسکرا کر سر اٹھایا تھا۔

”سوچ تو آپ ٹھیک رہی ہیں پھوپھو! لیکن پتا نہیں اباجی مائیں گے کہ نہیں اور شاید عدیل چاچو بھی نہ

نیل نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ ہی اباجی سے بات کروں گی اگر انہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا تو پھر عدیل بھائی کو وہ خود ہی دیا

کو کہہ دیں گے۔ دیے بھی بیٹا! ہمارے لیے گھر کو کوئی مسئلہ نہیں ہے اپنا اپارٹمنٹ ہے اسے فوری طور

ہم وہاں شفٹ ہو سکتے ہیں۔ میرا کلینک بھی وہاں سے قریب پڑے گا اور مدحو صبا کو بھی زیادہ پر اہم نہیں

دونوں ابھی تک نیچے ہیں؟“

آسیہ کو ان کا نام لیتے ہی خیال آگیا تھا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں۔ پڑھائی سے دونوں بھاگنے لگی ہیں۔

ڈانٹتے کیوں نہیں ہو۔ بڑے بھائی ہو رعب میں رکھا کرو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے پھوپھو! پڑھنے میں دونوں اچھی ہیں۔“ نیل نے ان کی طرف داری کی۔

”خاک اچھی ہیں۔ میٹرک میں کسی ایک نے پوزیشن نہیں لی۔“ آسیہ کو واقعی اس بات کا افسوس تھا

کے معاملے میں ایک بھی اس پر نہیں گئی تھی۔ اور ابھی وہ مزید انہیں نالائق اور لا پرواہ جیسے خطاب سے

زینے سے ان کے ہنسنے اور بھاگنے کی آواز آنے لگی جس پر وہ قدرے غصے سے بولی۔

”دیکھو یہ حال ہے ان کا۔“

”پھوپھو! آجی عمر بننے کھنسنے کی ہے، پلیز ڈانٹنے گا نہیں۔“ نیل نے پہلے سے ان کی سفارش کر دی۔

”میں تمہیں ڈانٹوں گی اگر جو یہ امتحانوں میں میل ہو میں تو۔“ آسیہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں ہوں گی۔“ نیل نے یقین سے کہا اور جیسے ہی وہ دونوں سامنے آئیں۔ قدرے رعب

ہوئے۔

”کیوں فصول باتوں میں وقت گنوا رہی ہو، کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اب اگر میں پڑھنے کے لیے کہا

آئے گی کہ تمہیں۔“

”مجھے پہلے سے آرہی ہے۔“ مدیجہ نے فوراً لمبی جمالی۔

”اور تمہیں؟“ نیل نے صاحت کو دیکھا تو وہ سنسنائی۔

”بارہن بچکے ہیں نیل بھائی اور صحت کالج بھی جانا ہے پھر بھی اگر آپ کہتے ہیں تو ہم ایک دو گھنٹے

ہم نہیں صرف تم۔“ مدیجہ فوراً ٹوک کر بولی۔ ”میں تو دو منٹ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ سخت نیند آرہی ہے۔

نیل بھائی۔“

”پہلے سن لو کہ کل سے تم دونوں کو ٹھیک نو بجے میرے کمرے میں موجود ہونا ہے کتابوں سمیت۔

چنانچہ اس کی سخت تنبیہ پر دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

آسیہ نے اباجی کے سامنے اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے کی تجویز رکھی تو نہ صرف انہوں نے بلکہ عدیل

نے بھی مسترد کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آسیہ کو ہم نے ایک بار اس گھر سے رخصت کیا تھا اگر دوبارہ گھر

نے پر تانا ہو تو ہم پھر اسی طرح رخصت کر سکتے تھے لیکن اس طرح اس گھر سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہو سکتا اور آسیہ میں یوں بھی من مانی کی عادت نہیں تھی۔ اس نے شروع سے اپنے حق میں والدین اور بھائیوں

کو تسلیم کیا تھا۔ اگر خود سے کوئی فیصلہ کیا بھی تو اس میں والدین کی رضامندی شامل تھی۔ اس لیے بھی

نیل اس سے ناراض نہیں ہوا۔ سب خوش تھے۔ اور سب کی خوشی میں وہ پتا نہیں خوش تھی کہ نہیں لیکن یہ

مذہب تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بہر حال جب یہ طے ہو گیا کہ اسے یہیں رہنا ہے تب اس نے اپنے

ازدحام میں ایک بیکر رکھا اگر وہ عدیل بھائی کی دونوں بیٹیوں نمرو اور روبی کے حوالے کر دیا تھا۔

مدیجہ ان دونوں کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی بات کر رہی تھی کہ نیل بھائی دروازے میں آکر پکار کر

مدیجہ کو بلا کر ہوا ہے۔“

مدیجہ نے وال کاک کی تلاش میں سرگھا گھا کر چاروں اور نظر دوڑائی پھر اپنی خالی کلائی

نے کر کے بولی۔ ”سوری نیل بھائی میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ ایسا کریں لابی میں سامنے کاک ہے وہاں

کر۔“

مدیجہ چکا ہوں۔ چلو اٹھو۔ کتابیں لے کر میرے کمرے میں جاؤ۔“ وہ اس کے انجان بننے کو یکسر نظر انداز کر

انہوں میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ چلیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ بس دو منٹ شمرے۔“

”تو کہیں نہیں جا رہی۔ تم اس سے دو منٹ نہیں دو گھنٹے باتیں کرنا لیکن پڑھنے کے بعد۔ چلو اٹھو۔“ وہ ذرہ

رعایت دینے کو تیار نہیں ہوئے تو وہ اٹھتی ہوئی شمرے سے بولی۔

”بہت ظالم ہیں یہ۔ ان سے کبھی دوستی نہیں کرنا۔“

نیل خاموش کھڑے رہے اور جب وہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے قریب سے نکل گئی تب وہ شمرہ اور روبی کو دیکھ کر

تھیں آپ کو بھی پڑھاؤں گا لیکن جب آپ کا ایڈمیشن ہو جائے گا تب۔“

”تو کہیں نہیں تو نہیں ہوں گے نیل بھائی۔“ روبی نے کہا۔

”میں بھی ہو۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

انہوں نے جیسے ہی اپنے ان کی اسٹک کارٹ میں الجھ کر یا تھ سے نکل گئی اور اس سے پہلے کہ وہ جھک کر اٹھاتے

انہیں تیزی سے آکر اسٹک اٹھا کر انہیں تھمائی تھی جس سے ان کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ شاید اس طرح کی

بیانات محرومی کا احساس دلاتی تھی بہت کوشش سے وہ شکریہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئے تو مدیجہ جانے

”تو کہیں نہیں تو نہیں ہوں گے نیل بھائی۔“ روبی نے کہا۔

”میں بھی ہو۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

انہوں نے جیسے ہی اپنے ان کی اسٹک کارٹ میں الجھ کر یا تھ سے نکل گئی اور اس سے پہلے کہ وہ جھک کر اٹھاتے

انہیں تیزی سے آکر اسٹک اٹھا کر انہیں تھمائی تھی جس سے ان کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ شاید اس طرح کی

بیانات محرومی کا احساس دلاتی تھی بہت کوشش سے وہ شکریہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئے تو مدیجہ جانے

”تو کہیں نہیں تو نہیں ہوں گے نیل بھائی۔“ روبی نے کہا۔

”میں بھی ہو۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

انہوں نے جیسے ہی اپنے ان کی اسٹک کارٹ میں الجھ کر یا تھ سے نکل گئی اور اس سے پہلے کہ وہ جھک کر اٹھاتے

انہیں تیزی سے آکر اسٹک اٹھا کر انہیں تھمائی تھی جس سے ان کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ شاید اس طرح کی

عمر نے اچھے بھلے شعر کی آخر میں ریڑھ لگا دی۔ جس پر سب بے ساختہ ہنسے لیکن صبا کو بالکل اچھا نہیں لگا۔
 ”عمر! یہ ایسے نہیں کرو۔ ٹھیک سے سنو۔“
 ”ٹھیک ہے اچھا۔ ٹھیک سے سنو۔“
 اچالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دے
 نجانے کس کھلی میں کتوں سے پیلا پڑا جائے
 ”بس کریں“ صبا حجت چڑی۔ جس سے اس کی شاعری سے وابستگی ظاہر ہو رہی تھی۔
 نبیل نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا پھر مسکرائے تھے۔



فکیل بھائی کی اسلام آباد سے آمد کا مقصد ایک تو عدیل سے ملاقات دوسرے اپنے بیٹے اشعر کے لیے سونیا کو
 لانا تھا۔ کہہ لو کہ ابھی اشعر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا لیکن ادھر سونیا گریجویشن کر چکی تھی اور کیونکہ فکیل بھائی
 ریسا بھائی کا پہلے سے ارادہ تھا اسے ہونٹانے کا اس لیے انہوں نے ابھی بات کر لینی مناسب سمجھی تاکہ اور کوئی
 بول نہ ہو تو اسے صاف منع کر دیا جائے۔ یوں بھی پہلا حق قریبی رشتوں کا ہی ہوتا ہے۔ جب فکیل بھائی نے اپنی
 انہیں کا اظہار کیا تو خصوصاً اماں جی اور اباجی بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ ماں باپ کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ ان
 باولاد آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور محبت کرنے والی ہوں۔ بہر حال طے یہ پایا کہ ابھی منگنی کر دی جائے
 رہاں دو سال بعد جب اشعر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب شادی ہوگی۔
 منگنی کی باقاعدہ تقریب کی کوئی ایسی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گھر کی بات تھی لیکن اتنے عرصے بعد اباجی کی
 ادنیٰ اولاد آپس اکٹھی ہونی تھی تو انہوں نے باقاعدہ تقریب کا کہہ کر سب میں پھیل چادی تھی۔ کیونکہ وقت کم
 اور روز بعد فکیل بھائی کو واپس جانا تھا۔ اور ایک دن میں سارا انتظام۔ لڑکے باہر کے کاموں میں اور لڑکیاں گھر
 رہاں پھر رہی تھیں۔ شام سے پہلے سب کام ہو گئے اس کے بعد سب کو اپنی اپنی تیاری کی فکر۔
 ”صبا! تمہارے پاس ایسا دوشہ ہے۔“ ”تو یہ پرل کٹر کا سوٹ لیے صبا حجت کے پاس آکر پوچھنے لگی تو وہ جواب دے
 ”پڑے پیر کر رہی تھی۔ چھوڑ کر سوچنے کھڑی ہوئی۔“
 ”ایسا دوشہ ہاں مدحو کے پاس ہو گا۔ اس سے لے لو۔“
 ”ماں! بعد خود؟“

”ابھی تو نہیں تھی۔ اچھا ٹھہرو، میں دیتی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں پر استری پھیری پھر پلنگ
 تل کر ڈوشہ سے سوٹ لے کر الماری میں اس کا ہم رنگ دوشہ تلاش کرنے لگی۔
 ”صبا! میرے پڑے استری ہو گئے۔“ ”مدحہ غالباً“ بیڑھیاں پھلا لٹی ہوئی آئی تھی۔ سانس پھول رہی تھی۔
 ”اے! اس نے الماری کے اندر سے جواب دیا۔“ ”وہاں رکھے ہیں لے لو۔“
 ”کم کیا تلاش کر رہی ہو؟“ ”مدحہ نے پوچھا۔
 ”تو یہ دوشہ نکال کر پلٹی پھر ڈوشہ سے پوچھنے لگی۔“ ”استری کر دوں؟“
 ”میں میں کر لوں گی“ ”شکریہ“ اس کے ہاتھ سے دوشہ اور کپڑے لے کر چلی گئی۔ تو اس نے مدحہ کو دیکھا
 ”اچھا! کتنے کس بات پر ہنسے لگی تھی۔“
 ”کم کیل بس رہی ہو؟“ ”اس نے پوچھا۔
 ”وہ! تم کو بھائی پتا ہے کیا کہہ رہے ہیں تم کہ وہ بھی اشعر بھائی کے ہم عمر ہیں اس لیے ان کی منگنی بھی ہونی چاہیے۔“
 ”یہ سناں جی سے اچھ رہے ہیں۔“ ”مدحہ نے اسی طرح ہنسنے ہوئے بتایا۔
 ”اچھا! ویسے کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔ جب اشعر بھائی کی ہو رہی ہے تو ان کی بھی ہونی چاہیے۔“ ”صبا حجت نے
 ”تو تو خود غلو حیرت کے بعد سنجیدگی سے کہا۔

”تو تو ابھی کی کہہ رہی ہو۔“ ”مدحہ نے یوں سر جھکا جیسے واقعہ ہو۔

رہنا نے کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی احمر سونیا، عمر اور ثوبیہ نے آکر ان کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ وہ سب
 کچھ دیر تم لوگ تھوڑا روٹی کھیاں بس پھو لیکن عمر جا کر ان دونوں کو بھی ادھر ہی لے آیا تھا۔
 ”آپ لوگ ذرا پہلے آجاتے۔“ ”مدحہ جلدی جلدی کتابیں سمیٹتی ہوئی بولی۔
 ”ہمیں کیا پتا تھا کہ یہاں تم پر ظلم ہو رہا ہے پھر بھی دعا میں دو ہمیں کہ جلدی چھٹی ہو گئی۔“ ”احمر، نہرا
 برابر بیٹھتا ہوا ہوا۔
 ”اصل میں نبیل بھائی! صبح چھٹی ہے ناں۔ اور ہاں فکیل بچا آ رہے ہیں کل فیملی کے ساتھ۔ ابھی
 آیا تھا۔“ ”عمر نے بتایا تو مدحہ کچھ افسوس سے بولی۔
 ”کل کیوں آ رہے ہیں۔ ہمارے امتحانوں کے بعد آتے تب میں فارغ ہوتی تو ان کے ساتھ اسلام
 ایمان سے مجھے بہت شوق ہے۔ اسلام آباد، مری سوات وغیرہ جانے کا۔“
 ”لاؤ ہاتھ دکھاؤ، اسلام آباد جانے کی لکیر ہے کہ نہیں۔“ ”عمر نے اس کی کلائی جھپٹتے ہوئے کہا تو سب
 ہنسے۔

”آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے عمر بھائی؟“ ”روٹی نے بہت شوق سے پوچھا۔
 ”سارے کام آتے ہیں اسے۔“ ”عمر سے پہلے مدحہ اس کی تعریف میں شروع ہو گئی۔“ ”لیکن آج تک
 ایک کام بھی نہیں کیونکہ ایک تو بے چارے کو بھولنے کی عادت ہے، دوسرے گھر سے نکلتے ہی اس کی
 جاتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ کہیں جانے کی غلطی مت کرنا۔ تمہیں راستہ ہی میں کہیں چھوڑ آئے گا۔“
 ”یہ۔ یہ۔ سراسر بے ایمانی ہے مدحو۔“ ”عمر نے احتجاج کیا۔“ ”روٹی! اس کا یقین نہیں کرنا یہ
 ہے۔“
 ”ہاں یہ بھی جھوٹ ہے کہ۔“ ”مدحہ کوئی واقعہ سنانے جاری تھی کہ وہ چیخ پڑا۔
 ”بس چپ ہو جاؤ۔“
 ”اوں ہوں!“ ”نبیل نے ٹوکا۔“ ”چلاؤ نہیں عمر! اور مدحہ یہ کیا حرکت ہے؟“
 ”میں کوئی جھوٹ ٹھوڑی بول رہی ہوں اور آہستہ آہستہ تھوڑا اور روٹی بھی جان جائیں گی مدحہ عمر کو
 تو اس نے یوں منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے جھوڑوں کا نہیں تمہیں۔
 ”ایک بات بتاؤ۔“ ”عمر نے مدحہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔“ ”تمہیں اور صبا کو ایک جیسی شکل کی بد
 پر اہم بھی ہوتی ہے۔“

”ہمیں کیوں ہوگی پر اہم؟ دوسروں کو ہوتی ہے۔“ ”صبا حجت نے فوراً کہا تو مدحہ اسے دیکھ کر بولی۔
 ”کیوں ہمیں نہیں ہوتی کیا۔“ ”پھر عمر سے کہنے لگی۔“ ”پہلے اسکول میں اور اب کالج میں بھی لڑکیاں
 ہیں۔ روک روک کر پوچھتی ہیں۔ سنو تم مدحہ ہو کہ صبا حجت۔ خواہ مخواہ میں ہی نہ کوئی اور بات کہنا۔“
 ”کوئی کام ہوتا ہے بس یہی پوچھتی ہیں۔“
 ”تمہاری غلطی ہے ناں۔ تم اگر صبا حجت جیسا قتل بنانا چھوڑ دو تو کوئی بھی نہیں پوچھے گا۔“ ”سونیا۔
 انگوٹھے سے اپنا نل مٹاتی ہوئی بولی۔
 ”میں ہمیشہ تو نہیں لگتی۔“

”یہ کیا اصول باتیں لے بیٹھی ہو تم لوگ۔“ ”احمر ٹوکتے ہوئے بولا۔“ ”نبیل بھائی بھی بور ہو رہے ہیں۔“
 ”میں ابھی بوریت دور کرتا ہوں۔ نبیل بھائی ایک شعر منجیے۔“ ”عمر فوراً ”موڈ میں آ گیا۔“ ”اجازت
 ”ارشاد ارشاد! لڑکیوں نے کورس میں کہا۔
 ”وہ کیا ہے کہ ہاں۔“

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
 مجھے روک روک پوچھا ابے کدھر جا رہا ہے

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“
 ”مگر تم ٹھیک کہہ رہی ہو تو پھر نیل بھائی کیوں خاموش ہیں۔ احتیاج تو انہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ بڑے ہیں۔ پہلے ان کی ہونی چاہیے لیکن ان سے شادی کون کرے گا وہ تو لنگ۔“
 صباحت نے فوراً ”مدیحہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ آسیہ کے ساتھ نیل کو اندر آتے ہر تھک۔
 نیل کا چہرہ یکبارگی سیاہ پڑ گیا تھا۔ اور آسیہ نے انتہائی غصے میں مدیحہ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔
 ”اوں اول۔“ مدیحہ نے جھٹک کر صباحت کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا اور جیسے ہی پلٹی آسیہ کوڑ گئی۔
 ”دیکھا کہہ رہی تھیں تم؟“ آسیہ کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور غالباً ”اسے مار دے اٹھایا تھا کہ عقب سے نیل نے اس کی کلائی تھام لی۔“
 ”نہیں پھوپھو!“



”چھوڑو نیل! میں اس کی زبان کاٹ دوں گی۔“ آسیہ اپنی کلائی چترانے کی سعی کرتے ہوئے بولا
 ”پھوپھو پلیر! آپ کو میری قسم۔“ نیل نے فوراً ”اپنی قسم دی جس سے آسیہ کے کھولنے دوہرا تھی۔
 ”آپے چلیں اپنے کمرے میں چلیں۔“
 آسیہ مدیحہ کو گھورتی ہوئی فوراً ”کمرے سے نکل گئی تو صباحت کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ نیل کوڑ سے معذرت کرے یا پہلے مدیحہ کو دیکھے جو آسیہ کے جاتے ہی بیڈ پر اوندھی گر گئی تھی۔ خود کو انتہائی محسوس کرتے ہوئے اس نے بے بسی سے نیل کو دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر مدیحہ کی طرف اشارہ کیا پھر تھام کر چلے گئے۔
 ”مسنو حوا! اگر تم اپنی غلطی پر نادم ہو کر رو رہی ہو تب تو ٹھیک ہے؟“
 اس نے مدیحہ کو مخاطب کر کے اسی قدر کہا تھا کہ وہ جھٹکتے سے سیدھی ہو کر بولی۔
 ”کوئی غلطی کی ہے میں نے جس پر نادم ہو کر روں گی۔“
 ”ایک تو تم اپنی غلطی بھی تسلیم نہیں کر سکتی، آخر چھوڑو۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔
 سے تیار ہو جاؤ۔ پھر نیچے چلتے ہیں۔“ اس نے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں کوئی تار نہیں ہو رہی اور نہ نیچے جاؤں گی۔“ مدیحہ ضدی لمبے لمبے میں کستی دوبارہ اوندھی ہو گئی۔
 ”دیکھو خوشی کا موقع ہے اس طرح مت کرو۔ بہت بری بات ہے۔ چلو اٹھو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑا
 اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کچھ لمبی جلی آوازوں نے اس کی توجہ مبذول کرائی۔
 ”سب لوگ یہاں آ رہے ہیں کیا؟“ وہ مدیحہ کو چھوڑ کر کمرے سے نکل کر آئی تو دیکھا۔ میونہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں اور ان سے پہلے پتا نہیں کون کون اندر گیا تھا۔
 ”ہاں جی!“ اس نے بے ساختہ پکارا۔ اور میونہ بھابھی کے پلٹ کر دیکھنے پر پوچھا۔ ”کون آیا ہے؟“
 ”کوئی نہیں۔“ میونہ بھابھی نے کہا اور آسیہ کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تو اسے لگا۔ کچھ دیروں کھڑی اپنے آپ قیاس کرتی رہی پھر نیل سے پوچھنے کے ارادے سے ان کے کمرے کہ وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔
 ”نہیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں مدیحہ کی نادانیوں کا برا نہیں مانتا۔“

”جی ہاں! آپ نادانی کہہ رہے ہیں نیل بھائی! آخر اس وقت میں اس کی طرف سے معذرت کرنے نہیں آئی۔
 ”پوچھنے آئی ہوں کہ ماما کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔“
 ”پوچھنا ہوا ہے؟“ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں نیل نے الناس سے پوچھا۔
 ”جی نہیں پتا۔“ میں نے ابھی ماما جی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے اور بھی پتا نہیں کون کون ہے اور انہوں نے
 ”ابھی بند کر لیا ہے۔“
 ”اس میں بریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہوگی کوئی ایسی بات جو بچوں کے سامنے کرنے کی نہیں ہوگی۔“
 ”اس نے کچھ انداز میں کہہ کر گویا اسے تسلی دی۔
 ”نیل بھائی! مجھے تو کوئی گنہگار مسئلہ لگتا ہے۔ آپ جا کر معلوم کریں ناں۔“ اس نے بے صبری کا مظاہرہ
 ”جی ہاں! اور دروازے تک آکر نیل سے بولیں۔“
 ”ہاں! ام کو آسیہ بی بی بلارہی ہیں۔“
 ”کہاں بوا! آپے کمرے میں؟“ اس نے فوراً ”بوا سے پوچھا تو نیل ٹوک کر بولے۔
 ”جا! اسیں کیا ہو رہا ہے۔ جاؤ نیچے سو نیا وغیرہ کے پاس جاؤ۔“
 پھر اسے ساتھ لیے ہوئے کمرے سے نکلے اور آسیہ کے دروازے پر رک کر اسے آگے جانے کا اشارہ کیا تو وہ
 ”تم! اگر قدرے ست روئی سے بیڑھیاں اتر کر نیچے چلی آئی۔“
 ”بڑے بھائی! پہلے تصدیق کر لیجئے۔“
 ”وہی کر رہا ہوں۔“ آخر پہلے بے دھیانی میں بولا۔ پھر ایک دم سٹپٹا گیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں کیا پچانتا
 میں ہوں۔ یہ صابے صابیری بیماری بہن۔“
 ”بیماری بہن! تمہاری بیماری بہن کہاں ہے؟“ ”عمر نے اس کے قریب آکر مدیحہ کے بارے میں پوچھا تو وہ جو
 ”دونوں کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی اسی عالم میں بولی۔
 ”وہ دروہی ہے۔“
 ”ہاں! یہ رونے کا کون سا وقت ہے، مطابعا موقع ہے۔ کچھ دیر پہلے تو یہاں ٹھیک ٹھاک کھڑی تھی۔ پھر کیا
 ہوا؟“
 ”مرو پوچھ اس سے رہا تھا اور دیکھ احمر کو رہا تھا نیچے مدیحہ کے رونے کا سبب وہی ہو۔“
 ”کس وہ۔“ ماما نے ذرا سا ڈانٹ دیا تو وہ رونے لگی اور یہ آپ دونوں اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں۔“ وہ باری
 باری دونوں کو دیکھنے لگی۔
 ”میں نیل صرف احمر بھائی۔ بے چارے بڑے صبر آزمائے حالت سے گزر رہے ہیں اس لیے کچھ بوکھلا گئے
 ہیں۔“ ”عمر نے کہا تو اسے ایک دم مدیحہ کی بات یاد آئی۔ ہنسنے ہوئے بولی۔
 ”ہاں! مدحوتاری تھی کہ آپ بھی متکلی کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”کیا اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ یہ اسی سے کرنا چاہتے ہیں۔“ ”عمر نے فوراً ”کہا تو خوشگوار حیرت کے باعث
 اس کا پورا منہ چل گیا۔
 ”مسنو کرو! مچھی چل جائے گی! اور جلدی سے تیار کیا طے پایا؟“ ”عمر نے ٹوک کر پوچھا۔
 ”تو کیا ماما کے کمرے میں ہی طے پڑا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“
 ”تیزی سے پلٹی اور دو بیڑھیاں پھلاعتی ہوئی اوپر آئی تو آسیہ کے کمرے کے بند دروازے پر بس ایک لحظہ کو
 ”ہاں! کمرے میں آئی اور اوندھی بڑی مدیحہ کے برابر کرتے ہوئے بولی۔
 ”مسنو! احمر بھائی اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یعنی اشعر بھائی کے ساتھ ان کی متکلی کا پروگرام بھی
 سب رہا ہے۔“

”میں کیا کروں؟“ مدیحہ کا غصہ اور ناراضگی ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم تو بڑے آرام سے دلمن بن کر بیٹھ جاؤ گی۔“ اس نے کہا تو مدیحہ اکیڑ کر کے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ تمہارے کمرے میں سب جمع ہیں اور نیچے احمر بھائی بے چارے بڑی بے صبری سے انتظار میں کہ ماما کیا فیصلہ کرتی ہیں۔“

اس نے شرر مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تو مدیحہ کے چہرے پر نہ صرف رنگ اترے بلکہ وہ گھبرا بھی کیونکہ ابھی وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوئی تھی جہاں پہلی دستک ہر حال میں اثر دکھائی ہے اور دستک بڑی زوردار تھی۔ پتا نہیں احمر کب سے اس کے بارے میں اس انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اس پر تو نہیں کیا تھا یا ہو سکتا ہے وہ نہ سمجھی ہو۔

”سنو۔ کبھی احمر بھائی نے تم سے۔“ بات ابھی صباحت کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً ”نفی مر بولی۔“

”نہیں۔ مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا انہوں نے۔“

”پھر تو بڑے جیسے رسم ہیں۔ ممکن ہو جائے پھر پوچھوں گی ان سے۔ ارے یہ تو ماما جی کی آواز ہے سب لوگ نیچے جا رہے ہیں۔ چلو تم جلدی سے اٹھ جاؤ کیونکہ ماما اب ادھر ہی آئیں گی۔“

صباحت آوازوں پر کان لگا کر جلدی جلدی بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو مدیحہ بھی فوراً ”اٹھ کرواؤ بند ہو گئی۔“

کچھ دیر بعد آسیہ ان کے کمرے میں آئی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس سے پوچھنے لگی۔

”مدحہ کہاں ہے؟“

”واش روم میں۔“ اس نے بتایا اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ ”ماما! شادی کر رہی ہیں؟“

”شادی نہیں اچھا۔ جنت احمر کے ساتھ۔ مدحہ کو بتا دو اور اسے تیار کر کے نیچے سونیا کے پاس لے جا کرو۔ سمیہ کو بلا لو وہ اسے تیار کر دے گی، تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ اس وقت سے کیا کر رہی تھیں۔“

”اے تو کا تو وہ کچھ سٹٹا گئی۔“

”وہ ماما۔ میں مدحہ کو موڈ ٹھیک کر رہی تھی۔ اس وقت آپ نے ڈانٹا تھا تو وہ رو رہی تھی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں سمیہ کو بھیجتی ہوں۔“ آسیہ چلی گئی تو اس نے پہلے واش روم کا دروازہ بجایا جلدی نمائے گا ماما پھر الماری کھول کر اس کے لیے دوسرے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔

رات بہت دیر تک خاصا بے لگام رہا تھا۔ تین بجے کے قریب سب اپنے اپنے کمروں میں گئے تھے۔ آگئی۔

وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں اور آسیہ کا انہیں اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس دیکھنے چلی آئی رات مدیحہ کی منگنی کر کے جہاں وہ خوش تھی وہاں اس کے اندر عجیب سی بے چینی سما گئی تھی۔ شاید زندگی کی ناکامی نے اسے خائف کر دیا تھا۔ حالانکہ احمر اس کے سامنے پروان چڑھا تھا۔ بہت مختصر کا وار لڑکا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ بہت ترقی کرے گا، پھر کوئی غیر بھی نہیں تھا۔ یعنی

موزوں اس کے باوجود اگر وہ مکمل اطمینان سے نہیں ہو رہی تھی تو یہ یقیناً اس کے اپنے اندر کا خوف برسا برس کی گرد بھی دھندلانے میں ناکام رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بیٹیوں کی ماں تھی۔

میں چائے ختم ہونے تک وہ وہیں کھڑی چپ چاپ۔ دونوں کو دیکھتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے کمرے میں آئی۔ نیل کو جاتے دیکھ کر آہستہ آواز میں پکار کر پوچھنے لگی۔

”ہاں جا رہے ہو؟“

”آپ کو ہی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”جی۔ آپ سب خوش ہیں تو میں کیوں نہیں خوش ہوں گی۔ بس یہ ہے کہ شادی جلدی نہیں کی اے کرے گی تو اس کے بعد سوچوں گی اور اس سے پہلے دعا کریں۔ نیل کی جاب ہو جائے گا پڑ لے آئیں۔“ اس نے کہا تو ماں جی ہاتھ پھیلا کر بولیں۔

”میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں۔ اللہ اسے روزگار دے پھر اس کا گھر بے۔ اس کے سر پر سرائیکو ہے میری۔“

”اللہ آپ کی آرزو جلد پوری کرے گا۔ انشاء اللہ۔“ اس نے صدق دل سے کہا اور میڑھیاں دیکھنے لگی۔

♥-♥-♥

”مذحو! کہیں جانے کے لیے تم ہمیشہ سب سے پہلے تیار ہوتی ہو۔ آج تمہیں کیا ہوا ہے۔ اب نہیں بدلے۔ وہاں نیچے سب تیار کھڑے ہیں۔“

صباحت جس حالت میں اسے بیٹھا چھوڑی تھی اسی حالت میں دیکھ کر جھنجھلا گئی۔ ”اگر نہیں پڑا کہ دو سرول کا پروگرام تو نہ خراب ہو۔“

”ارے واہ۔ میں کیوں نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ چونک کر بولی تھی۔

”تو پھر تیار کیوں نہیں ہو رہیں؟“ اٹھو جلدی کرو۔“ صباحت نے اس کے کپڑے اٹھا کر اس کے تھمے تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”میں کیا کروں صبا! مجھے احمد بھائی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔“

”ارے!“ صباحت بے ساختہ ہنسی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری متکلفی ہوتی تو تمہیں شرم نہ آتی۔“ مدحیہ بسورتی ہوئی بڑے مختلف لگ رہی تھی۔

”ایک دو دن کی بات ہے پھر پہلے کی طرح احمد بھائی کے ساتھ لڑتی جھگڑتی نظر آؤ گی۔“ صباحت نے روم کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”سنو۔ خبردار جو کسی سے کچھ کہنا تو میرا مطلب ہے یہ شرم والی بات۔“

”نہیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“ صباحت نے بمشکل اپنی ہنسی ہونٹوں میں چھپائی تھی۔

”کرو۔“

پھر جیسے ہی مدحیہ تیار ہوئی، عمر شور مچاتا ہوا آگیا۔

”اب کیا تم دونوں کے لیے باقاعدہ پانکی لائی جائے گی۔ اگر پہلے سے کہا تو میں انتظام کر سکتا تھا۔“

”لاؤں۔ میرے بازوؤں میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے ورنہ اٹھا کر لے جاتا۔ احمد بھائی کو بلاؤ۔“

شرارت سے مدحیہ کو دیکھا تو وہ جو پہلے ہی احمد کے سامنے جانے سے گھبرار رہی تھی مزید سنبھل کر بولی۔

”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیر سے ملے گا۔“

”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیر سے ملے گا۔“

”عمر! اب تم زیادہ مت بولو۔ چلو، ہم چلتے ہیں۔“

صباحت اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی نیچے لے آئی جہاں سب انتظار میں کھڑے تھے اور ان دونوں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے چلو چلو کہتے ہوئے سب چل پڑے۔

نیل اپنے ڈیڑی سے گاڑی لے آئے تھے اور احمد نے عدیل چاچو سے لے لی تھی اس لیے لگے ہوئی۔ دو گاڑیوں میں سب آرام سے سما گئے تھے۔

ساحل پر اترتے ہی نیل کے سب سے پہلے مدحیہ کو تنبیہ کی کہ اسے پانی میں دور تک نہیں ڈالنا۔

تو قیاس کے احتجاج نہ کرنے پر بے حد حیران ہوئے اور نوکے بغیر بھی نہیں سکے۔

”بھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”صباحت نے شرارت سے لے لی جب بھی منع کرے طبیعت اس کی ہانک ٹھیک ہے نیل بھائی! بس در اسے۔“ صباحت نے شرارت سے لے لی جب بھی منع کرے طبیعت اس کی ہانک ٹھیک ہے نیل بھائی! بس در اسے۔“

”نیل کی جاب ہو جائے گا پڑ لے آئیں۔“ اس نے کہا تو ماں جی ہاتھ پھیلا کر بولیں۔

”میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں۔ اللہ اسے روزگار دے پھر اس کا گھر بے۔ اس کے سر پر سرائیکو ہے میری۔“

”اللہ آپ کی آرزو جلد پوری کرے گا۔ انشاء اللہ۔“ اس نے صدق دل سے کہا اور میڑھیاں دیکھنے لگی۔

♥-♥-♥

”مذحو! کہیں جانے کے لیے تم ہمیشہ سب سے پہلے تیار ہوتی ہو۔ آج تمہیں کیا ہوا ہے۔ اب نہیں بدلے۔ وہاں نیچے سب تیار کھڑے ہیں۔“

صباحت جس حالت میں اسے بیٹھا چھوڑی تھی اسی حالت میں دیکھ کر جھنجھلا گئی۔ ”اگر نہیں پڑا کہ دو سرول کا پروگرام تو نہ خراب ہو۔“

”ارے واہ۔ میں کیوں نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ چونک کر بولی تھی۔

”تو پھر تیار کیوں نہیں ہو رہیں؟“ اٹھو جلدی کرو۔“ صباحت نے اس کے کپڑے اٹھا کر اس کے تھمے تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”میں کیا کروں صبا! مجھے احمد بھائی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔“

”ارے!“ صباحت بے ساختہ ہنسی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری متکلفی ہوتی تو تمہیں شرم نہ آتی۔“ مدحیہ بسورتی ہوئی بڑے مختلف لگ رہی تھی۔

”ایک دو دن کی بات ہے پھر پہلے کی طرح احمد بھائی کے ساتھ لڑتی جھگڑتی نظر آؤ گی۔“ صباحت نے روم کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”سنو۔ خبردار جو کسی سے کچھ کہنا تو میرا مطلب ہے یہ شرم والی بات۔“

”نہیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“ صباحت نے بمشکل اپنی ہنسی ہونٹوں میں چھپائی تھی۔

”کرو۔“

پھر جیسے ہی مدحیہ تیار ہوئی، عمر شور مچاتا ہوا آگیا۔

”اب کیا تم دونوں کے لیے باقاعدہ پانکی لائی جائے گی۔ اگر پہلے سے کہا تو میں انتظام کر سکتا تھا۔“

”لاؤں۔ میرے بازوؤں میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے ورنہ اٹھا کر لے جاتا۔ احمد بھائی کو بلاؤ۔“

شرارت سے مدحیہ کو دیکھا تو وہ جو پہلے ہی احمد کے سامنے جانے سے گھبرار رہی تھی مزید سنبھل کر بولی۔

”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیر سے ملے گا۔“

”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیر سے ملے گا۔“

”عمر! اب تم زیادہ مت بولو۔ چلو، ہم چلتے ہیں۔“

صباحت اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی نیچے لے آئی جہاں سب انتظار میں کھڑے تھے اور ان دونوں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے چلو چلو کہتے ہوئے سب چل پڑے۔

نیل اپنے ڈیڑی سے گاڑی لے آئے تھے اور احمد نے عدیل چاچو سے لے لی تھی اس لیے لگے ہوئی۔ دو گاڑیوں میں سب آرام سے سما گئے تھے۔

ساحل پر اترتے ہی نیل کے سب سے پہلے مدحیہ کو تنبیہ کی کہ اسے پانی میں دور تک نہیں ڈالنا۔

تو قیاس کے احتجاج نہ کرنے پر بے حد حیران ہوئے اور نوکے بغیر بھی نہیں سکے۔

”جی۔ آپ سب خوش رہتے رہیں۔ بہت رونق ہوگی۔“ عمر نے اپنے تئیں سمیٹھ کو مشکل سے نکالا لیکن جی اے کرے گی تو اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔

”آئیے بیٹے، میں بچوں کی دلچسپیاں ہوں گی۔ ہم کیا کریں گے۔“
 ”جناب صرف چھوٹے بچوں کے لیے نہیں اسی سال تک کے بچوں کے لیے تفریح ہی تفریح ہے۔ بھائی؟“ عمر نے تصدیق کے لیے نیل کو دکھا تو انہوں نے مسکرا کر یوں کندھے اچکائے جیسے کہتے۔

”آپ بھی نیل بھائی! بس ایسے ہی ہیں۔ ہاں کہہ دینے میں کیا حرج تھا۔“ عمر ناراضگی سے کہہ جا بیٹھا۔
 ”ارے یہ تو بالکل بچوں کی طرح روٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔“ سمیٹھ اسے دیکھ کر ہنسی۔

”مجھ ہی ہے۔“ نیل کے لیے ابھی بھی وہ چھوٹا سا عمر تھا۔
 ”ناراض نہ ہو۔ نیل بھائی تمہیں بچہ کہہ رہے ہیں۔“ صبا نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ: ”انہیں اپنے سامنے سب بچے لگتے ہیں۔ کبھی اباجی کے ساتھ بیٹھ دیکھا ہے انہیں ان سے شفقت سے پیش آرہے ہوتے ہیں۔“

سب کی بے ساختہ ہنسی میں نیل جھینپ کر رہ گئے تھے۔ یوں ہنسی مذاق میں وہیں بیٹھنے اتنی دیر اور جانے سے نیل نے منع کر دیا اور سیرھا گھر کی راہ لی۔
 میمونہ بھابھی، سیما بھابھی اور یاسمین کھانا تیار کر چکی تھیں اور اماں جی، اباجی کے ساتھ۔ کو بھی کھلا چکی تھیں۔ البتہ خود ان سب کے انتظار میں تھیں۔ آسیہ کلینک سے لوٹی تو وہ بھی وہیں برآمدہ میں بیٹھ گئی تھی۔
 ”آسیہ! بیچھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا ایک اور بیٹا نہیں ہے۔“ سیما بھابھی نے اچانک آسیہ کو اس نے کچھ تعجب سے دیکھا۔
 ”کیوں؟“

”تم سے صبا مت لگتی۔“ سیما بھابھی کے لہجے میں صبا بھرتی کے لیے بڑا پیار تھا۔
 ”اچھا! وہ ذرا سا ہنسی۔ پھر کہنے لگی۔ ”آپ نے اور یاسمین نے بھی بس دو بچوں پر اکتفا کر تمہیں بیٹے کی خواہش نہیں تھی جو تمہیں مزید بچے پیدا کرنے پر اکساتی۔“
 ”مجھے تو بھی لیکن شاید عدل کو نہیں تھی۔ خیر البتہ کا شکر ہے۔ بیٹیاں بھی بڑی نعمت ہیں۔“ یاسمین نے کہا تو سب تائید میں سر ہلانے لگی تھیں۔
 تب ہی باہر گاڑی رکنے کے ساتھ سب کی آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر بعد ساری رونق پورے آگن میں ہنسی قہقہے گونجنے لگی۔ میمونہ بھابھی نے بمشکل اٹھتے ہوئے سب کو خاموش ”جلدی سب ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ تم لوگوں کے انتظار میں ہم۔“

”آسیہ! تم بھی نہیں رکتا۔“
 ”تمہیں بھابھی! اب کھانا بنا چکی ہوں گی۔“ آسیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو نیل! دو صبا اور جی جی ماما! چلیں۔“ مدیحہ اور صبا فوراً ”سیڑھیاں پھلانگ گئیں۔ آسیہ نیل کے ساتھ اگلیں۔“
 ”کہاں کہاں گئے تم لوگ؟“ کھانے کی نیل پر آسیہ نے باری باری متوں کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”بس ساحل پر۔ اس کے بعد سمیٹھ کی خواہش تھی کہیں اور جانے کی، لیکن دیر ہو گئی تھی۔“

آگے ”صبا نے بتایا۔“
 ”پریشان تو نہیں کیا تھا نیل! ان دونوں نے تمہیں؟“ آسیہ نے نیل سے پوچھا تو مدیحہ نے فوراً ”غما! آپ کو ہمیشہ یہ خیال کیوں آتا ہے کہ ہم نیل بھائی کو پریشان کرتے ہوں گے۔“

”جی۔ آپ سب خوش رہتے رہیں۔ بہت رونق ہوگی۔“ عمر نے اپنے تئیں سمیٹھ کو مشکل سے نکالا لیکن جی اے کرے گی تو اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔
 ”آئیے بیٹے، میں بچوں کی دلچسپیاں ہوں گی۔ ہم کیا کریں گے۔“
 ”جناب صرف چھوٹے بچوں کے لیے نہیں اسی سال تک کے بچوں کے لیے تفریح ہی تفریح ہے۔ بھائی؟“ عمر نے تصدیق کے لیے نیل کو دکھا تو انہوں نے مسکرا کر یوں کندھے اچکائے جیسے کہتے۔

”آپ بھی نیل بھائی! بس ایسے ہی ہیں۔ ہاں کہہ دینے میں کیا حرج تھا۔“ عمر ناراضگی سے کہہ جا بیٹھا۔
 ”ارے یہ تو بالکل بچوں کی طرح روٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔“ سمیٹھ اسے دیکھ کر ہنسی۔
 ”مجھ ہی ہے۔“ نیل کے لیے ابھی بھی وہ چھوٹا سا عمر تھا۔
 ”ناراض نہ ہو۔ نیل بھائی تمہیں بچہ کہہ رہے ہیں۔“ صبا نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ: ”انہیں اپنے سامنے سب بچے لگتے ہیں۔ کبھی اباجی کے ساتھ بیٹھ دیکھا ہے انہیں ان سے شفقت سے پیش آرہے ہوتے ہیں۔“

سب کی بے ساختہ ہنسی میں نیل جھینپ کر رہ گئے تھے۔ یوں ہنسی مذاق میں وہیں بیٹھنے اتنی دیر اور جانے سے نیل نے منع کر دیا اور سیرھا گھر کی راہ لی۔
 میمونہ بھابھی، سیما بھابھی اور یاسمین کھانا تیار کر چکی تھیں اور اماں جی، اباجی کے ساتھ۔ کو بھی کھلا چکی تھیں۔ البتہ خود ان سب کے انتظار میں تھیں۔ آسیہ کلینک سے لوٹی تو وہ بھی وہیں برآمدہ میں بیٹھ گئی تھی۔
 ”آسیہ! بیچھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا ایک اور بیٹا نہیں ہے۔“ سیما بھابھی نے اچانک آسیہ کو اس نے کچھ تعجب سے دیکھا۔
 ”کیوں؟“

”تم سے صبا مت لگتی۔“ سیما بھابھی کے لہجے میں صبا بھرتی کے لیے بڑا پیار تھا۔
 ”اچھا! وہ ذرا سا ہنسی۔ پھر کہنے لگی۔ ”آپ نے اور یاسمین نے بھی بس دو بچوں پر اکتفا کر تمہیں بیٹے کی خواہش نہیں تھی جو تمہیں مزید بچے پیدا کرنے پر اکساتی۔“
 ”مجھے تو بھی لیکن شاید عدل کو نہیں تھی۔ خیر البتہ کا شکر ہے۔ بیٹیاں بھی بڑی نعمت ہیں۔“ یاسمین نے کہا تو سب تائید میں سر ہلانے لگی تھیں۔
 تب ہی باہر گاڑی رکنے کے ساتھ سب کی آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر بعد ساری رونق پورے آگن میں ہنسی قہقہے گونجنے لگی۔ میمونہ بھابھی نے بمشکل اٹھتے ہوئے سب کو خاموش ”جلدی سب ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ تم لوگوں کے انتظار میں ہم۔“

”آسیہ! تم بھی نہیں رکتا۔“
 ”تمہیں بھابھی! اب کھانا بنا چکی ہوں گی۔“ آسیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو نیل! دو صبا اور جی جی ماما! چلیں۔“ مدیحہ اور صبا فوراً ”سیڑھیاں پھلانگ گئیں۔ آسیہ نیل کے ساتھ اگلیں۔“
 ”کہاں کہاں گئے تم لوگ؟“ کھانے کی نیل پر آسیہ نے باری باری متوں کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”بس ساحل پر۔ اس کے بعد سمیٹھ کی خواہش تھی کہیں اور جانے کی، لیکن دیر ہو گئی تھی۔“

آگے ”صبا نے بتایا۔“
 ”پریشان تو نہیں کیا تھا نیل! ان دونوں نے تمہیں؟“ آسیہ نے نیل سے پوچھا تو مدیحہ نے فوراً ”غما! آپ کو ہمیشہ یہ خیال کیوں آتا ہے کہ ہم نیل بھائی کو پریشان کرتے ہوں گے۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“
”نکتہ ظالم ہیں آپ لوگ۔ سب جانتے ہیں اور ہم دونوں سے چھپاتے ہیں۔“ مدحیہ پھٹ پڑی۔
”کیوں چھپایا ہم سے؟“

”کیا۔ کیا کہہ رہی تھیں کیا چھپایا تم سے۔“ نیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”یہی کہہ ہم دونوں سیکم ہو چکی ہیں۔ ہمارا باپ۔۔۔“
”شٹ اپ مدحوایہ فضول کو اس کس نے تم سے؟“ وہ قدرے سختی سے ٹوک کر بولے۔
”آپ۔۔۔ ابھی آپ ہی نے تو کہا ہے کہ آپ ان کے مزار پر کبھی نہیں گئے۔ دیکھیے نیل بھائی ہم نے
نیل چھپائے ورنہ میں ابھی جا کر ماما سے پوچھوں گی۔“ مدحیہ ان کے سخت لہجے سے خائف ہوئے بغیر
بولنے لگی تھی۔ نیل نے کچھ دیر غور کیا پھر ساری بات سمجھ کر کہنے لگے۔

”بہت نکمے ہو تم دونوں۔ پتا نہیں دھیان کہاں رستا ہے۔ میں شاہ بھائی کی بات کر رہا تھا اور یہ تم
حیات کو درمیان میں کہاں سے لے آئیں۔“
”تو کیا شاہ سکندر زندہ ہیں؟“ مدحیہ نے خوش ہو کر کہا تو صباحت بھی جلدی سے آنسو پونچھ کر
بیٹھی۔

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ انہوں نے کہہ کر فوراً ”موضوع بدل دیا۔“
”چلو آج تم دونوں کا واقعی بڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ اٹھاؤ کتابیں اور کل سے پوری تیاری کے ساتھ بنو
“ بالکل نہیں۔ جب تک آپ میری بات کا جواب نہیں دیں گے میں کل تو کیا ابھی نہیں پڑھوں گی۔
ضدی لہجے میں بولی۔

”کون سی بات کا جواب چاہتی ہو؟“ انہوں نے مدحیہ سے پوچھنے کے ساتھ ایک نظر صباحت
اشارے سے اسے منع کر رہی تھی لیکن وہ باز نہیں آئی۔

”میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ نے شاہ سکندر کو دیکھا ہے یعنی ہمارے پاپا کو؟“
”ہاں۔ لیکن مجھے وہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہیں یعنی اگر اب ابھی سامنا ہو جائے تو شاید میں انہیں
سکوں گا یا ہو سکتا ہے پہچان بھی لوں۔“ نیل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا پھر یاری باری لاؤں
پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور۔“

”اور اگر آپ کو ان کا تاپتا معلوم ہو تو وہ بتا دیں۔“ مدحیہ نے کہا تو وہ کچھ ٹھنک سے گئے۔
”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اور شاید یہاں کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جس اپارٹمنٹ میں ان
تھی وہ انہوں نے پھوپھو کے نام کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب تعلق ختم ہو گیا تو پھر ظاہر ہے کسی کو ان کا
کرنے کے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔“ نیل نے بہت سنبھل کر دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
”انہیں تو معلوم ہے ناں کہ ہم یہاں رہتے ہیں پھر انہوں نے ہم سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔
سوال مدحیہ اٹھا رہی تھی۔ جبکہ صباحت بالکل خاموش تھی لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی اتنی
ہے۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جب انہیں کبھی تمہارا خیال نہیں آیا تو تم بھی ان
میں مت سوچو۔ اگر وہ فیئر ہوتے تو پھوپھو خود تمہیں ان کے بارے میں بتاتیں اور اب تمہیں پھوپھو
چاہیے۔ تمہارے لیے سب کچھ وہی ہیں، خود میرے لیے بھی وہ میرے ماں باپ سے بڑھ کر ہیں۔ بہت
محبت سے انہوں نے ہم تینوں کی تیاری کی ہے۔ ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے انہ
ہو۔ سمجھ رہی ہوں ناں؟“

بہت نرمی سے سمجھاتے ہوئے انہوں نے دونوں کو تنبیہ بھی کی اور ان کے سر جھکانے پر اٹھے ہو
”چلو جاؤ اب سونے کی تیاری کرو۔ صبح کالج بھی جانا ہو گا اور سن لو، کل سے پڑھنے کے اوقات میں مدحیہ

”نہ۔ اپنی کتابیں سنبھالیں اور انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آئیں۔“
”بے نیل بھائی! لاٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹتے ہی مدحیہ نے نیل کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ “انہیں پاپا
نے ہیں نیل بھائی۔ لیکن صاف مکر گئے۔“

”شٹ اپ۔ نیل بھائی جیسے نہیں ہیں، بلکہ تمہارا دماغ خراب ہے جو ان سے ہمیشہ شکاری رہتی ہو۔“
”نیل۔ بہت برا کا تھا۔ انتہائی ناگواری سے بولی۔
”بہت برا تو صبا! تمہارا بھجہ سے زیادہ قریبی رشتہ ہے یا نیل بھائی سے؟“ مدحیہ سلگ کر اٹھ بیٹھی۔
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نہیں۔ ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

ساہوکر صحبت کو پکارنے لگا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

”صبا نیچے ہی ہے۔ ابھی ماما کے ساتھ تو اتری تھی۔“

”اور نیل بھائی کہاں ہیں؟“ احمر نے گردن موڑ کر نیل کے طرف کی کھلی کھڑکی سے اندر کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ غالباً“ بڑے ماموں کی طرف گئے ہیں۔ آپ چائے پیئیں گے؟“ اس نے جواب کے ساتھ ”ضرور پیوں گا۔ تم بناؤ گی؟“

”نہیں بوا!“ اس کے ساتھ ہی اس نے بوا کو پکار کر چائے کا کما پھرا سے دیکھ کر بولی۔ ”وہ بتا رہی تھیں کہ آپ ایم اے کے لیے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ہاں۔ دعا کرو۔ اس کا رشپ مل جائے۔“ احمر نے سامنے نیل پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولی۔

”میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“

”دل سے مانگو گی تو ضرور قبول ہوں گی۔ اب یہ مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس دل ہی نہیں اچانک اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کچھ نروس سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میں چائے لاتی ہوں۔“

”بوائے آئیں گی، تم بیٹھو۔“ احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا تھا کہ اسی وقت بوا چائے نے فوراً نیل پر سے ٹانگیں ہٹالیں اور بوا کے ہاتھ سے ٹرے لے کر نیل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کب کس کے لیے ہے بوا؟ آپ بھی پیئیں گی؟“

”نہیں۔ میں تو صبا کے لیے لاتی تھی۔“ بوا نے صحبت کی تلاش میں اوہرا اوہر دیکھتے ہوئے کہ ”صبا نیچے ہے اماں جی کے پاس۔ چلیں آپ پی لیں۔ اس کے آنے تک تو ٹھنڈی ہو جائے ایک کپ اٹھا کر بوا کو تھما دیا اور ان کے جانے کے بعد اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ایک بات پوچھوں احمر! سچ بتائیں گے؟“

”ہوں۔“ احمر چائے کا سب لے کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آپ نے صبا کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے سب لوگ اسے زیادہ پسند کرتے سونیا جی تبھی اسی کے گن گاتی ہیں۔ حالانکہ ہماری شکلیں ایک جیسی ہیں لیکن اسے زیادہ پیار

نے اس کے بجائے۔“ اس نے غالباً شروع سے یہ بات کھٹک رہی تھی اور اب پوچھتے ہوئے بچھا ”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ احمر اس کا مطلب سمجھ کر خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوا۔

”سب صبا سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی عادات ہیں۔ صلح جو، فرمانبردار، لحاظ کرنے والی۔ دوسری بڑی وجہ اس کا ہر ایک پر جان چھڑکنا ہے۔ بالکل نیل بھائی کی طرح“

”کیوں؟“ اس کے چہرے پر قدرے الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

”اس لیے کہ اس کے اندر ہم سب کے لیے محبت کا ایک ہی رنگ ہے۔ کچھ شفیق سا، بھو بچی لگتی ہے اور کبھی ہماری آپاجا بن جاتی ہے۔ تو بدلے میں ہمارے دلوں میں اس کے لیے ایہ اس سے ہٹ کر اس کے بارے میں کچھ اور نہیں سوچا جاسکتا۔ کم از کم میں اور عمر بھی نہیں

لیے وہ بالکل ثوبیہ کی طرح ہے۔“

احمر نے پوری ایمان داری سے وضاحت کر کے اسے دیکھا تو اس نے گہری سانس کے ساتھ اکتفا کیا پھر اٹھ کر گرل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور نیچے جھانکنے لگی۔

”سنو“ نیل بھائی کب تنگ آئیں گے؟“ احمر نے اسے متوجہ کر کے پوچھا۔

نہیں۔ صبا سے پوچھ لیں، شاید اسے بتا کر گئے ہوں۔“ اس نے کما پھر آگے آکر ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”بوا! آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے، بچپن میں بوا سے بات کر رہی ہے۔ میں بھیجتی ہوں اسے۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔“ احمر اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”بچپن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مدیہ کے ساتھ احمر کو دیکھ کر پہلے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ پھر بے عصبے پوچھنے لگی۔

”بہن! کیا کر رہے ہیں؟“

”میرے یہاں آنے پر پابندی ہے یا مدحو سے بات کرنے پر۔“ احمر نے اس کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

”نیل خبر پابندی تو کسی بات پر نہیں ہے۔ البتہ نیچے بتا کر آیا کریں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ماما جی اس وقت سسل ایک ہی جملہ بول رہی ہیں کہ احمر کو ابھی تو میں نے یہیں دیکھا تھا کہاں گیا۔“ صحبت نے کہا تو وہ سر

ہونے لگا۔

”ابھی بس۔ ان کے سامنے تو میں بیڑھیاں چڑھا تھا۔ خیر یہ بتاؤ نیل بھائی کب آئیں گے؟“

”وہ تو بچے آنے کا کہہ گئے تھے لیکن میں ابھی فون کر رہی ہوں انہیں کہ جلدی آئیں آپ کو بھی کوئی کام ہے؟“

”صحبت کی بات سن کر مدیہ اس سے پوچھنے لگی۔

”نہیں کیا کام ہے؟“

”ہاں تو میں بس۔“ صحبت نے اسی قدر کہا تھا کہ احمر غلت میں بولا۔

”فک ہے ماما! انہیں فون کرو تو کہنا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”جی بات ہے۔“ صحبت جانے کس بات پر خوش ہو رہی تھی۔ احمر کو جاتے ہوئے دیکھا پھر لابی میں آکر پہلے کے کینک کے نمبر ڈائل کیے تو دوسری طرف سسٹر نے ریسپونڈ کیا تھا۔

”سر! میں صبا ہوں۔ ماما سے کہیں۔ دو منٹ میری بات سن لیں۔“ چند لمحوں بعد آسیہ کی آواز آئی تھی۔

”ہاں! کیا بات ہے بیٹا؟“

”لڈنڈو ماما! وہ خوشی سے کھٹکتی آواز میں بولی۔ ”ابھی نیل بھائی کا اپنا نمٹ لے لیا ہے اتفاق سے میں نے

یو پیاتے اور ابھی کسی کو نہیں بتایا۔ میں نیل بھائی کو سربراہ بنانا چاہتی ہوں۔ سب کے سامنے اور سلیویشن مانتے۔ لیکن ماما! بوا کہہ رہی ہیں ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں کیک وغیرہ کہاں سے منگواؤں۔“

”تو تمہیں پیسے چاہئیں؟“ آسیہ نے اس کی ساری بات سن کر پوچھا۔

”جی۔“

”افوہ“ تم بہت جلدی برامان جاتی ہو۔ اچھا میں تمہیں بتا دوں گی پہلے نیچے جا کر سب سے کہہ دو کہ وہ اور آجائیں۔ میں جب تک پیسے نکال لوں۔ اس نے فوراً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور جانے لگی۔

”سنو کیا کھانے کا انتظام کرو گی؟“

”نہیں تمہانا تو سب جلدی کھا رہے ہیں جو بچے ہم چائے کے ساتھ کچھ لوازمات رکھیں گے۔ لیکن بس تم جلدی سے کہہ دو پھر ان چیزوں کی لسٹ بنا کر ہاؤس منگوا لیں گے۔“

وہ کہتی ہوئی مدیہ کے ساتھ کمرے سے نکلی تو اسے بھیج کر خود آسیہ کے کمرے میں آگئی اور بیڈ کے سے چلی نکال کر الماری کھول لی۔ آسیہ کی الماری کھولنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا البتہ اس کی سیف میں ہاتھ ڈال رہی تھی۔ ایک طرف زیورات کے مٹھلیں ڈبے ایک دوسرے کے اوپر بچے تھے۔ دوسری طرف ٹیک بیسے سی اس نے سیف کے اندر کھول کر ایک پانچ سو کا نوٹ نکالا تھا کہ اس کے ساتھ ایک تصویر ہاتھ میں آگئی۔ جس پر نظر پڑتے ہی اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً ”تصویر دے دینے میں الماری بند کر کے کچھ بدحواسی کے عالم میں کمرے سے نکلی تو آگے نیل سے ٹکرا گئی۔

”خیال سے۔“ نیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر غالباً ”خود کو سارا دیا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں۔ میں ماما کے کمرے میں پیسے لینے گئی تھی۔ خود انہوں نے کہا تھا۔ اصل میں۔ میں وہ بھلا نے لگی۔“

”ایک منٹ میرے ساتھ آؤ۔“ نیل اسے نوک کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ اور بٹھانے کے بعد بولے۔ ”تم نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی نہ کبھی جھوٹ بولا۔“

”میں ابھی بھی میں چھپا رہی۔ بس یہ۔۔۔ اس نے فوراً ”دوبنے میں سے نکال کر تصویر نیل کردی۔“ میں نے جان بوجھ کر نہیں نکالی۔ روپے لیتے ہوئے یہ خود خود میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔“

نیل کی نظریں تصویر پر تھیں۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولے نہ ہی اسے دیکھنا سمجھی۔

”میرا یقین کریں نیل بھائی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ماما کی اجازت سے میں نے ان کی الماری کھلا پیسے لیتے ہوئے یہ۔“

نیل نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھا۔ تو اس نے سر جھکا لیا پھر قدرے انہیں پکار کر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی! یہ ماما کے ساتھ پایا ہیں ناں؟“

”ہیں۔“ نیل جو کہ پھر ذرا سادگیاں میں سر ہلا کر بولے۔ ”جاؤ یہ جہاں سے اٹھائی ہے اسے نو آؤ۔ ورنہ اگر پھو پھو کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔“

”پہلے مدعو کو دکھا دو پھر رکھ دوں گی۔“ اس نے کہا تو نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر جھین لی۔

”تیس صبا! مدعو کو دکھانے کی غلطی نہیں کرتا۔ تم جانتی ہو اسے۔ سارے شرم میں اس شخص پھرے گی۔ اس کے اندر عجیب سی ضد ہے۔ جس بات کو منع کرو وہ ضرور کرے گی اور تم بھی بھول جا تصویر دیکھی ہے۔“ نیل کے قدرے سخت لہجے پر وہ سر جھکا کر بولی۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میرے اندر انہیں دیکھنے ان سے ملنے کی خواہش نہیں ہوگی۔“

”ضرور ہوگی۔ لیکن میں جانتا ہوں تم پھو پھو کو دکھ دینے والی کوئی بات نہیں کرو گی۔ یا کر سکتی ہو؟ اس کے جتنے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ تو اس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا پھر آہستہ سر ہلانے لگی۔

”انہم اچھی لڑکی ہو۔“ نیل مطمئن ہو کر مسکرائے۔

”بچے اسے دین رکھ دوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جہاں شاہ جلدی کرو۔“ نیل نے تصویر اسے تھمائی تھی کہ مدیہ کی آواز آنے لگی۔

”جیسا اچھا! میں نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

”نیل نے جواب اسی طرف آ رہی تھی۔

”نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

”بے وقوف لڑکی!“ نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنے ٹیکے کے نیچے کھکا دی پھر اٹھ کر اس کے

”انہوں نے کمرے ہو گئے کہ اگلے پل مدیہ دروازے میں آئی تو اسے وہ نظر نہیں آئی۔

”ہاں! ایسا کیا بھی نہیں ہے۔“ مدیہ نے حیرت سے اپنے آپ سے کہا۔ ”کہاں چلی گئی۔“

”میں ہے۔ تم ٹھیک سے دیکھو تو نظر آئے۔“ نیل غیر محسوس طریقے سے اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے

”نیل نے کچھ نہیں ہو گا صبا! تمہیں مجھے ابھی بتانا پڑے گا ورنہ میں سارا پروگرام خراب کر دوں گی۔“ مدیہ

”کیا تم کو گرام؟“ نیل نے پوچھا تو صبا نے فوراً ”ان کے پیچھے سے نکل کر مدیہ کے پاس جا کھڑی ہوئی اور

”نیل کا ہاتھ چھو کر جلدی سے بولی۔

”پروگرام یہ ہے نیل بھائی! اگر رات نو بجے میں اور مدعو آپ کو زبردست سر پرانزدیں گے۔ چلو مدعو۔“ اس

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

”نیل نے مدیہ کو بھیج دیا۔“ نیل نے ان کے کمرے سے نکل گئی۔

ہوئے کہا۔
 ”۲۰ نئی جلدی میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ خیر پھر کسی دن ان کے لیے بھی کوئی پروگرام رکھ لیں گے“ مہاجر
 نمکو کی پلیٹ درمیان میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اس پروگرام میں ایک نئی خوش خبری ہونی چاہیے، یعنی نیل بھائی نے ایک عدد لڑکی پسند کر لیا۔“
 شرارت سے نیل کو دیکھا لیکن انہوں نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا۔
 ”فضول بکواس نہیں کرو۔“
 ”یہ فضول بکواس نہیں ہے نیل بھائی! عمر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پتا ہے اماں جی ہر وقت کیا دعا کرتی ہیں؟
 صباحت عمر کی تائید میں بولنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”بس میں نے سب سن لیا ہے۔ اب تم لوگ چاہو تو محفل جمائے رکھو۔ میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ مجھ
 اٹھنا ہے۔“
 ”آپ کے بغیر محفل کیا جے گی۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“ حرم بھی اٹھ گیا تو باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

♥-♥-♥

مدیجہ اور صباحت امتحانوں سے فارغ ہوئیں تو دونوں کپاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ صباحت تو گھر کے
 میں دلچسپی لیتی تھی۔ اسے کچھ مطالعے کا شوق بھی تھا۔ کبھی نیل بھائی کوئی کتاب لادیتے بھی رہا
 منکوا لیتی۔ اس لیے وہ زیادہ بور بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مدیجہ کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر کے کام کا
 ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے کمرے کی صفائی بھی اس سے نہیں ہوتی تھی، البتہ کپاس جانے
 ہوتی تو وہ سب سے پہلے تیار ہوتی تھی، لیکن ان دنوں کپاس جانے کا بھی کوئی پروگرام نہیں بن سکا تھا کیونکہ
 احمد دونوں کے امتحان قریب تھے۔ وہ نیچے جا کر بھی بور ہوتی تھی۔ اس روز ناشتے کی ٹیبل پر وہ آئیہ سے کئے
 ”مما! آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے ٹیلیکاموں کے کپاس اسلام آباد بھیج دیں۔“
 ”کیوں؟“ آئیہ نے ناشتے سے ہاتھ روک کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کا یہ اچانک پروگرام اس کی بے

آیا ہو۔

”چھٹیاں ہیں ممما! اور مجھے اسلام آباد دیکھنے کا شوق ہے۔“ اس نے کہہ کر صباحت کو دیکھا کہ شاید وہ
 ہاں میں ہاں ملائے گی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔
 ”چھٹیاں ہیں تو کچھ گھرواری سیکھو اور جہاں تک شوق کی بات ہے تو سمیجہ کی شادی پر لے چلوں گی۔
 لینا اسلام آباد۔“

آئیہ نے اس کی بات مانی نہیں تو رد بھی نہیں کی اور اس کی اس حکمت عملی پر وہ برا سامنے بنا کر بولی۔
 ”سمیجہ جی کی شادی پتا نہیں کب ہوگی اور اس وقت ممما! ہماری چھٹیاں بھی نہیں ہوں گی۔ آپ
 ہمیں واپس لے آئیں گی۔“

”تو تم کتنے دن رہنا چاہتی ہو وہاں؟“ آئیہ نے پیشانی میکر کر اسے دیکھا۔
 ”کم از کم دس دن۔“ وہ آئیہ کی پیشانی کا بل نہیں دیکھ رہی تھی، جب ہی بڑے آرام سے بولی۔
 صباحت نے بو کھلا کر آئیہ کو دیکھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”تم بھی جانا چاہتی ہو؟“

”جی ممما! ہم دونوں جائیں گے۔“ صباحت سے پہلے مدیجہ بول پڑی۔
 ”تم خاموش رہو۔ میں صبا سے پوچھ رہی ہوں۔ کیوں صبا؟“ آئیہ نے مدیجہ کو ٹوک کر اسے دیکھا
 سے بولی۔

”نہیں ممما۔ میں آپ کے ساتھ سمیجہ کی شادی میں جاؤں گی۔“
 ”ہاں یہی مناسب ہے۔ ہم سب سمیجہ کی شادی میں چلیں گے۔“ آئیہ حتمی انداز میں ایک طرح

کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی کمرے سے نکلی۔ مدیجہ صباحت پر بگڑ گئی۔
 ”میں نہیں میری بات سے اختلاف کرنا ضروری تھا۔ جانے کی ہائی بھرتیں تو کیا ہو جاتا۔ آرام سے اسلام آباد

مردم آئے۔“
 ”ہاں۔ میرے کہنے سے تو مجھے بھیج دیتیں نہیں۔“
 ”انکل بھیج دیتیں۔ انہوں نے تم سے پوچھا ہی اس لیے تھا۔ میری بات تو وہ کبھی مانتی ہی نہیں۔ تمساری مانتی
 ”انکل بھیج دیتیں۔ تم دونوں ان کی سگی اولادیں ہونا، میں تو بس۔“
 ”نیل بھائی صالی کی۔ تم دونوں میں آیا کے جاری تھی کہ نیل ٹوک کر بولے۔

مدیجہ نے میں جو منہ میں آیا کے جاری تھی کہ نیل ٹوک کر بولے۔
 ”مدیجہ! یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ پھوپھو نے کہا تو سے سمیجہ کی شادی میں لے چلیں گی۔“
 ”مدیجہ! یہاں سے گاشادی میں، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ خامسے جارحانہ انداز میں کرسی دھکیلتی کھڑی
 ”اب ہی جاؤں گے۔“ تو صباحت برتن سمیجہ کی ہوتی بولی۔
 ”جی اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ کی ہوتی بولی۔

”نہج سارا دن میری شامت آتی رہے گی۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں نیل بھائی! جو اس کا موڈ جلد ٹھیک
 ہو جائے۔“

”ہاں اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“ نیل کو کالج سے دیر ہو رہی تھی اس لیے اختصار سے کام لیتے اٹھ گئے۔
 صباحت نے برتن لے جا کر کچن میں رکھے پھر بوا کے کہنے پر آئیہ سے دوپہر کے کھانے کی بابت پوچھنے اس کے
 کمرے میں آئی تھی کہ اس کے پیچھے میمونہ بھابی پکارتی ہوئی آگئیں۔
 ”آئیہ بھابی! آئیہ نے انہیں پیچھے کا اشارہ کیا تو وہ بجائے میں بولیں۔

”پیچھے نہیں آئی۔ یہ پوچھنے آئی ہوں کہ مدحو اور صباحت کیا کر رہی ہیں؟“
 ”کچھ نہیں مای جی! آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“ صباحت نے فوراً ”متوجہ ہو کر کہا۔
 ”وہ تو یہ کو کالج جانا ہے فارم جمع کروانے۔ سونیا کورات سے کچھ حرارت ہے۔ اگر تمہا مدحو تو یہ کے ساتھ چلی
 جاؤ تو۔“ انکل جانے ہوئے وہ گھبرا رہی ہے۔ ”میمونہ بھابی نے کہا تو آئیہ اس سے بولی۔

”تم چلی جاؤ صبا! اور بھابی سونیا کا آب نے مجھے رات میں کیوں نہیں بتایا۔ چلیں، میں دیکھتی ہوں اسے۔“
 آئیہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر میمونہ بھابی کے ساتھ نیچے چلی گئی۔
 صباحت کو تیار ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ اس دوران وہ اپنے آپ بول کر مدیجہ کو سناتی رہی کہ وہ تو یہ کے
 ساتھ کالج جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا، شاید بوریت سے نکلے کی خاطر وہ بھی ساتھ چلنے کو کہے گی لیکن اس نے کوئی
 توجہ نہیں دی۔ تب وہ اسے خدا حافظ کہہ کر نیچے آئی تو تو یہ تیار کھڑی تھی۔ وہیں سے اونچی آواز میں اپنے جانے کا
 ٹاکر لڑنا باہر نکل آئیں۔

”تو یہ کے لیے کالج نہ تھا۔ لیکن وہ یہاں دو سال مکمل کر چکی تھی اس لیے لائن میں کھڑے ہونے کے بجائے
 مدیجہ کی آواز میں چلی گئی اور تو یہ کی فیس کے ساتھ فارم جمع کروا کر جلدی فارغ ہو گئی تو تو یہ کہنے لگیں۔
 ”اب مجھے میری کلاسز بھی دکھا دو تاکہ میں فول بننے سے بچ جاؤں۔“

”ہاں چلو۔ کلاسز کے ساتھ لا سبریری اور کینٹین بھی دکھا دیتی ہوں۔“ وہ کلاسز کا رخ کرتی ہوئی بولی۔ ”ویسے
 ایک بڑھ مینے کی بات ہے۔ ہمارا رزلٹ آجائے گا تو پھر ہم ساتھ ہی آئیں گی۔“
 ”لیکن مدیجہ تو کہہ رہی تھی وہ آرزو کرے گی اور اب یونیورسٹی جائے گی۔“ تو یہ نے کہا تو اسے حیرت ہوئی
 کیونکہ مدیجہ نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اور وہ اپنی حیرت چھپا بھی نہیں سکی۔

”جہاں مدحو نے مجھے تو نہیں بتایا۔“
 ”رات ہی تو بات ہو رہی تھی۔ تم اس وقت اوپر تھیں۔ زبردست بحث ہوئی تھی مدحو اور احمر بھائی میں۔“
 ”ک بات پر؟“ وہ قدرے الجھ گئی۔

”اسی بات پر۔ مدحو کہہ رہی تھی آرزو کرے گی اور احمر بھائی کا کہنا تھا کہ تمہیں اسی کالج میں گریجویشن کرنا

”یار! تمہارے پاس کوئی اور کیسٹ نہیں ہے۔ صبح سے اسی کو ریو اینڈ کر کر کے من رہے ہو۔“

پک گئے ہیں۔“

عازم نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونکتے ہوئے کہا تو علی نے چونک کر اسے دیکھا پھر کیسٹ اٹھ کر ”سوری“ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم بھی یہاں موجود ہو۔“

”ایسا اس وقت ہوتا ہے ڈیئر کزن جب خیال میں کوئی اور ہو۔ کون ہے؟“ آخر میں عازم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی تھی۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ ادھر کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک تھا دوسرے نظریں بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے۔ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم جاکر گھر زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ”ٹوکا۔“

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔“

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جاناگیر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہیں گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا شام سے پہلے نمنا دو پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہے ان کی فلائیٹ۔“ عازم ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً ”شاہ پور“ میں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں رکھنا احتیاطاً ان کے لیے گرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور آکر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں سر ہلا کر بولا۔“

چاہے تال تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی بجیر و ہے۔“ عازم اپنی بی بجیر و پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے خوشامد کرتا تھا۔

”اے“ تمہاری بجیر و کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اری پورٹ ملے گی۔“

”چچی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جاناگیر پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے، اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے

شرارت پھیلی تھی۔

”بہ دوں گا۔“

”بڑا بڑا اور کچھ دیر سوئے کی غرض سے بیڈ روم میں آیا تو بے تحاشا آنسو بہاتی ہوئی لڑکی کا قصور ساتھ

دور ڈھٹ دلوں کی طرح نیند آنے تک وہ اسے سوچتا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار کر بول رہا تھا۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ ادھر کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک تھا دوسرے نظریں بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے۔ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم جاکر گھر زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ”ٹوکا۔“

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔“

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جاناگیر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہیں گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا شام سے پہلے نمنا دو پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہے ان کی فلائیٹ۔“ عازم ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً ”شاہ پور“ میں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں رکھنا احتیاطاً ان کے لیے گرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور آکر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں سر ہلا کر بولا۔“

چاہے تال تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی بجیر و ہے۔“ عازم اپنی بی بجیر و پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے خوشامد کرتا تھا۔

”اے“ تمہاری بجیر و کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اری پورٹ ملے گی۔“

”چچی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جاناگیر پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے، اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے

والپس کرو۔ میں نیل بھائی سے منگوالوں گی۔“ وہ اسے مزید چڑاتا ہوا بھاگ گیا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کہ: ”کیا ہوا عمر تمہیں لے کر نہیں گیا؟“ نیل نے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا: ”بولی۔“

”کہاں؟“

”ہاں ہری جانے کی بات کر رہی تھیں تم۔“ انہوں نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”ہاں وہ عمر ابھی اپنے کسی کام سے جا رہا تھا۔ کہنے لگا کل لے جاؤں گا۔ کوئی بات نہیں۔ کل ہر سڑاٹھا کے ان کی نیل صاف کرنے لگی۔

”مگر کہاں ہے؟“ سوڈا ٹھیک ہوا اس کا کہ نہیں؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نیل نے پوچھا: ”جی اب تو ٹھیک ہے۔ کل اباس جی سے ممائی شکایتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال چکی ہے۔“

”پتا ہے کیا کہہ رہی تھی کہ مماس سے بالکل ہمارا نہیں کرتیں۔ اس کی کوئی بات نہیں ہانتی آپ کی ہر بات مان لیتی ہیں۔ میں نے کہا ہم اس کی طرح ایسی کوئی بات کرتے ہی نہیں ہیں جو نہ لے لے اے ایسا لگتا ہے کہ مماس ہمارا بات مان رہی ہیں۔ اس پر اس نے مجھے بے نقط سنا لیا ہیں لیکن میں خاموش رہی۔“

”اچھا کیا وہ بے وقوف ہے۔“ نیل نے کہا۔

”نیل نیل بھائی! مجھے لگتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتی ہے جن سے اختلاف اختلاف ہوتا ہے تو ابھی ہے پھر اپنے آپ شکا ہو جاتی ہے۔ اس روز تو یہ بتا رہی تھی اہم رہی تھی۔“ وہ حدیہ کی عادات پر تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔

”کس بات پر؟“ نیل نے اس کی تشویش محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے نیا شوشہ چھوڑ دیا کہ آنرز کرے گی۔ اس پر اہم بھائی نے کہا کہ اسے ان ہی سبب کرنا چاہیے جس اس بات پر دونوں میں کافی دیر ٹکرا رہی تھی پھر حدیہ کہتی ہوئی آئی کہ اس کی مر آپ بتائیے یہ کوئی اچھی بات ہے۔ مماسیں گی تو وہ بھی ناراض ہوں گی پھر یہ کہے کے کہا کرتیں۔“

”ہوں۔“ نیل نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر قدرے توقف سے کہنے لگے: ”وہ آنرز کر نہیں ہے۔ اگر وہ حدیہ کو اپنی شوق ہے تو اہم کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔“

”نیلیجے آپ بھی اس کی سائڈ لے رہے ہیں۔“ وہ اچھل کر بولی۔

”اس لیے کہ یہ کوئی ناجائز ضد نہیں ہے اگر اسے پھوپھو کی طرح ڈاکٹر بننے کا شوق ہو تو کیا جاتا۔ نہیں ناں تو اس پر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں خوب بات کروں گا پھوپھو سے اور اہم انہوں نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ نیل نے اس کے خاموشی سے دیکھنے پر پوچھا تو اس نے یوں ٹی ٹی ہی سونیا اسے پکارتی ہوئی آگئی۔

”صبا۔! مارکیٹ تک چل رہی ہو۔“

”کون کون جا رہا ہے؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس میں اور تم چلیں گے۔ لے جاؤں نیل بھائی اسے؟“ سونیا نے اسے جواب دے اثبات میں سر ہلایا کر بولی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ عمر تو لے نہیں گیا۔ تم لے جاؤ۔“

”چلو چلیج کرو گی تو کرو۔“ سونیا نے غلت کام ظاہر کیا۔

”اس نے اپنے حیلے پر نظر ڈال کر کہا۔ پھر نیل سے پوچھنے لگی: ”آپ کو کچھ منگوانا ہے۔“

”نیل نے اپنے ارد گرد حوکے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر کہتی ہوئی سونیا کے ساتھ ان کے کمرے سے نکل آئی۔

”نیل نے دو اسٹاپ کے فاصلے پر بھی اور عموماً وہ اپنی شاپنگ کے لیے یہیں آتی تھیں۔ سونیا کو لے لان کے سوٹ خریدنے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں تھیں اور اس کے ساتھ میں ہوئے وہی پانچ سو روپے تھے جو پہلے مرطے پر ہی یوں خرچ ہو گئے کہ لان کے اکتھے پرنٹ دیکھ کر اس نے لے لے۔ اس کے بعد وہ سونیا کو خریداری کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”نیل نے سوٹ لیتا ہے۔ یہاں تو سارے کمرے رنگ ہیں چلو آگے دیکھتے ہیں۔“ سونیا ہاتھ میں پکڑا کے لے لے سوٹ ڈال کر آگے چل پڑی۔

”ہیں سارے پرنٹ نظر آ رہے ہیں۔“ اس نے سونیا کا بازو کھینچ کر متوجہ کیا۔

”جی ایسے ہی پسند کرتی ہیں۔“

”نیل داخل ہو گئی تو اس کے سامنے والی دوکان پر باہری سے ڈیکوریشن پیسز دیکھتے ہوئے اسے لگا کہ سوٹ خریدنے میں جلدی کیوں کی اپنی پانٹ مٹی سے جمع کیے ہوئے میسے بھی لے آئی۔ کے مازک سے گلہ ان اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ایک نظر سونیا پر ڈال کر وہ اس دوکان میں گلہ ان اٹھا کر دوکاندار سے اس کی قیمت پوچھی تو وہ معذرت کے ساتھ بولا۔

”ایک ایک جگہ ہیں۔ ان کے بس دوپیس تھے۔“

”نیل۔“ گلہ ان واپس رکھتے ہوئے اس کا دھیان سونیا کی طرف چلا گیا۔ جانے اس نے پکارا تھا یا بے اختیار ادرہ مڑی تھی اور ادرہ گلہ ان شوئیں پر جانے کے بجائے نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا۔

”ایک دیریشان ہو گئی۔“

”پو نظر نہیں آتا اتنا قیمتی گلہ ان میں ان صاحب کو کیا جواب دوں گا جو۔“ دوکاندار بری طرح اس پر

”میں آپ کو اس کی قیمت۔“ یوں بے عزت ہونے پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”نیل نہیں انہیں ادا کیجیے۔“ دوکاندار نے دوسرے شوئیں کے پاس کھڑے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”ایکس کیو زی سر ایک منٹ۔“

”نیل نے اٹھ کر اپنے پلٹنے ہی اسے دیکھا اور بے اختیار اس کے قریب آیا تھا۔ ”آپ؟“

”نیل۔“ وہ مزید گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”نیل نے آپ کا گلہ ان تو دیا۔“ دوکاندار نے فوراً اسے مطلع کیا۔

”ایک سو ری نہیں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا، میں آپ کو اس کی قیمت ادا کر دوں گی۔“ وہ پلکیں جھپک کر ادا کر دی تو وہی بولی تو علی جمالی نے پہلے دوکاندار کو ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے وہ اپنا معاملہ خود نمٹائے گا اور اسے بعد اس سے کہنے لگا۔

”نیل تو آپ کو ادا کر رہی ہے۔“

”اس نے گھر کر سونیا کو مدد کے لیے پکارنے کی نیت سے پلٹ کر دیکھا اور اسے سامنے والی دوکان پر موجود نہ دیکھ کر اس نے زمین کھسکنے لگی تھی۔

”نیل۔“ دوکاندار نے اس کی پریشان سمجھ گیا یا آئندہ ملاقات کا بہانہ مل گیا تھا۔ جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بولا: ”آج ہی کے دن اس پتے پر پہنچا دیجیے گا۔“

”اس نے کارڈ لے کر اپنے پیروں میں بٹھرے کاغذ پر نظر ڈالی۔“ مجھے افسوس ہے اتنا خوب صورت

گلدان۔ کیا قیمت تھی اس کی؟

”نہ بہت زیادہ نہ بہت کم۔ یاد رکھیے گا آج ہی کے دن۔“

وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کتاؤ کان سے نکل کر جانے کس سمت غائب ہو گیا۔ وہ اس نے گئی۔

”جی بی بی! آپ نے انہیں قیمت ادا کر دی؟“ دوکاندار نے دوبارہ اس کی طرف آکر پوچھا تو وہ بڑا ارادہ اثبات میں سر ہلادیا۔

”پھر یہ وہ سراپس آپ کا ہوا۔“ دوکاندار نے جلدی سے ایک گلدان بیک کر کے اس کے سر اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

”کیا پر اس بھی ان کی؟“

”بارہ سو انہوں نے آپ سے۔“

”اتنے ہی لیے ہیں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر دوکان سے نکل آئی اور سونیا کی تلاش میں گردن مگر طرف دیکھنے لگی۔ ایک جگہ وہ پرس خریدتی نظر آئی تو وہ تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”مجھے کہاں چھوڑ دیا آپ نے؟“

”میں نے کہاں چھوڑا۔ تم ہی غائب ہو گئیں۔ یہ پرس دیکھو، اچھا ہے ناں۔“ سونیا کا دھیان تھا۔

”جی اور کیا خریدتا ہے۔“ وہ جیسے اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”بس اور کچھ نہیں۔ سونیا نے پرس کی قیمت ادا کی پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”تم شاید تھک گئی ہو؟“

”نہیں بس اب چلیں۔“ اس نے منع کیا لیکن سونیا نے جیسے سنا ہی نہیں زبردستی اسے آؤس کر رکشہ میں لے کر آئی تھی۔



گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے علی جمائیکر کا دیا ہوا کارڈ الماری میں اپنے کپڑوں کی تولی اس کے بعد اپنی جمع شدہ رقم نکال کر گنتی تو کل چار سو تھے۔ وہ واقعی پریشان ہو گئی کہ بانی آٹھ سو کہ آسید یا نیل سے لینے کا مطلب تھا انہیں ساری بات بتانی پڑی اور جانے کیوں وہ اس شخص کے بار ہوئے ڈر رہی تھی۔ شاید اس کے اندر خوف تھا کہ کہیں اس واقعے کے ساتھ وہ پہلا واقعہ بھی ما جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ گو کہ اس کے دل میں کوئی جو نہیں تھا لیکن کچھ مہما اتنی سخت گہری تھی کہ مجبوری بھی تسلیم نہیں کرتی تھی (یہ اس کا فطری رد عمل تھا) اس لیے اس پہلے اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کلینک کیسے پہنچی۔ بہر حال اب یہ نئی مصیبت گلے بڑ گئی تھی۔ کئی بار چاہا کہ وہ کون سا پیسے لینے یہاں تک آجائے گا لیکن ہر بار اسے وہ اپنے دروازے پر دستک دیتا محسوس گہری شام سیاہ آچل اور بھری تھی اور اسے اپنی پریشانی میں لاسٹ جلانے کا خیال ہی اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ جب نیل نے دروازے میں آکر پکارا۔

”صبا!“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں! لاسٹ کیوں نہیں جلائی۔“ انہوں نے کہا اور برہہ کر ٹیوب لاسٹ کایشن آن کر دیا تو اس آنکھوں پر رکھ لیے۔

”وہ۔“ نیل بھائی! سر میں درد ہو رہا تھا۔“

”تو مجھ سے کہا ہوتا یا بوا سے وہ چائے ہی بنا دیتیں۔ مدد کو کہاں ہے؟“ انہوں نے قریب آکر۔

نیل نے آئی تھی وہ توبہ کے ساتھ کیرم کھیل رہی تھی۔ ”اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے

بہت جلدی لڑی ہے۔ جاتی ہے تو گھنٹوں کے حساب سے وہیں جم جاتی ہے۔ کوئی کام ہو تو بات بھی ہے۔ چلو

بے نیل بوا سے چائے کا ہوتا ہوں۔ کچھ کھانا ہو تو وہ بھی بنا دو۔“

”جی نہیں۔“ چائے بھی نہیں پوں گی، آپ کو چینی ہو تو میں بنا دیتی ہوں۔“ وہ نیل کو پریشان ہوتے دیکھ کر

”نہیں۔“ سر کا دروایا بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ نیل اسے ساتھ لے کر کمرے سے نکل آئے کھلی چھت پر اس نے پانگ پانگ نازہ ہوا میں چل کر بیٹھو۔ ”نیل اسے ساتھ لے کر کمرے سے نکل آئے کھلی چھت پر اس نے پانگ

در نیل کے لیے کرسی بھی بچھنے لائی تب ہی عمر خلاف عادت بہت خاموشی سے آیا اور خاصے بجرمانہ انداز

کا کر بیٹھ گیا جس پر نیل نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

”بت لیا ہوا ہے؟“

”اسے تو نہیں۔“ عمر نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا تو نہ صرف اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا بلکہ وہ

مٹی ہو گئی تھی۔

”نیل پوچھیں مجھ سے میں نے کیا کیا ہے۔“

”اس نے پیسے نہیں دیئے تھے مجھے خوشبو لانے کے لیے۔“ عمر یوں بولا جیسے اس نے کوئی بڑا جرم کیا ہو۔

”اسے اپنا جرم سمجھ میں نہیں آیا۔“

”کیوں دیے تھے۔“ جبکہ کہیں پتا تھا میری جیب کٹ جاتی ہے۔ انڈر وائیم ٹری کسی نے ہاتھ کی صفائی

نے دھو لے اسے اپنی لاپرواہی اس کے سر تھوپ لی لیکن اس کی جان میں جان آگئی تھی دھڑ دھڑ کرتے دل پر

کے اختیار کر بولی۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھی۔“ اس نے ایک دم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تو نیل جو اسے ہی

ماں رہتی ہیں۔“ آخر میں ان کے سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔

”جی۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی تو مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا۔

”سنو، تم نے بھی کچھ خریداری کی؟“

”ہاں، نیل بھائی نے پیسے دیئے تھے میں نے دو سوٹ لے لیے۔ ایک تمہارا، ایک اپنا، کھانا تمہارے بیڈ پر رکھے ہیں۔“ وہ ٹیبلر کربول رہی تھی لیکن انداز سے غلٹ عیاں تھی۔

”تم کہاں بیچے جارہی ہو؟“

”نہیں۔“ اس بار وہ انحصار سے کام لے کر فوراً وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں آکر مٹھ فرما رکھنے کی خاطر کتابوں کا شتاف صاف کرنے لکھڑی ہو گئی۔

”کچھ دیر بعد مدحیہ آئی اور شارپ میں سے دونوں سوٹ نکال کر پوچھنے لگی۔

”میرا کون سا ہے؟“

”جو تمہیں پسند آئے، وہی لے لو۔“ وہ اپنے کام میں مصروف ہوئی۔

”اور اگر مجھے دونوں پسند آئیں۔“

”دونوں لے لو۔“ اسے اس وقت کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”اے ہوئے۔ اتنی فراخ دلی۔“ مدحیہ نے بڑے محظوظ انداز میں نعوں گا یا تب ہی نیل نے دروازے پر اصرار کیا۔

”مدحو! چائے بناؤ گی۔“

”میں۔“ جیسے کوئی بہت برا کام کہا گیا ہو۔ ”ہوا سے کہہ دیں ناں۔“

”جو اکو اماں جی نے بلایا ہے۔ ویسے بھی میں چائے کے لیے ان سے نہیں کہتا۔ چلو دو منٹ کے کا گھنٹے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہری اب۔“

نیل قدرے رعب سے کہتے وہیں سے پلٹ گئے۔ تو وہ ہڑوانے لگی۔ جس پر صباحت نے اپنا کام ”فضول کو اس بند کرو“ میں جارہی ہوں۔“

”چائے بنانے۔“ مدحیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

صباحت نے تاسف سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ اور منٹوں کر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے انہیں بتا تھا چائے وہی لائے گی۔

”آپ نیل بھائی! یا تو مدحو سے کام لےنا ہی نہیں کریں یا پھر زبردستی اس سے کروایا کریں کیونکہ؟ کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ان کے سامنے نیل پر کپ رہتی ہوئی بولی۔

”اس نے منع تو نہیں کیا تھا۔ خیر، تم اگر کوئی کام نہیں کر رہیں تو یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ نیل کب اٹھاتے ہوئے کہا تو ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ کارپٹ پر ٹھٹھکی بیٹھتی ہوئی بولی۔

”نیل بھائی! میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے اب ہو گیا ہے۔ جسے پورا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

نیل نے کتنا بھی قیاس کیا، یہ نہیں سوچا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔

”میں سوینا جی کے ساتھ بازار گئی تھی ناں وہاں ڈیکوریشن بیسوز دیکھتے ہوئے ایک قیمتی گلدان ہم گر کر ٹوٹ گیا۔ بارہ سو روپے کا تھا اور جو خاتون خرید چکی تھیں انہوں نے مجھ سے اتنی رقم کا مطالبہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں تھا اور ابھی بھی صرف چار سو، میں باقی آٹھ سو۔ آپ پلیر ماما کو نہیں بتائیں؟ اس نے صرف صنف میں جھوٹ سے کام لیا۔ باقی ساری حقیقت بتا دی تو نیل کچھ دیر خام

دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”تمہیں آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پریشان ہوتی رہیں۔ اس طرح مسئلے حل خیر اس وقت تو میرے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہیں۔ کل شام تک انتظام کروں گا۔ کب دینے؟“

میرا مطلب ہے، وہ اسی دوکان پر آئیں گی۔ کل آپ انتظام کر دیں گے تو پرسوں صبح میں ٹوبہ کے ساتھ جا رہے ہوں گی۔“

”اس خدشے کے تحت کہ کہیں نیل ساتھ چلنے کا نہ کہہ دیں نہ صرف ٹوبہ کا نام لے دیا بلکہ ایسا وقت کا ہوئے تھے۔“

پھر بات ہے اب تم ریلیکس ہو جاؤ اور جا کر کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی لیکن پھر رک

پہنچے۔“

پہنچے۔“

”میں۔“ جیسے کوئی بہت برا کام کہا گیا ہو۔ ”ہوا سے کہہ دیں ناں۔“

”جو اکو اماں جی نے بلایا ہے۔ ویسے بھی میں چائے کے لیے ان سے نہیں کہتا۔ چلو دو منٹ کے کا گھنٹے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہری اب۔“

نیل قدرے رعب سے کہتے وہیں سے پلٹ گئے۔ تو وہ ہڑوانے لگی۔ جس پر صباحت نے اپنا کام ”فضول کو اس بند کرو“ میں جارہی ہوں۔“

”چائے بنانے۔“ مدحیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

صباحت نے تاسف سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ اور منٹوں کر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے انہیں بتا تھا چائے وہی لائے گی۔

”آپ نیل بھائی! یا تو مدحو سے کام لےنا ہی نہیں کریں یا پھر زبردستی اس سے کروایا کریں کیونکہ؟ کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ان کے سامنے نیل پر کپ رہتی ہوئی بولی۔

”اس نے منع تو نہیں کیا تھا۔ خیر، تم اگر کوئی کام نہیں کر رہیں تو یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ نیل کب اٹھاتے ہوئے کہا تو ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ کارپٹ پر ٹھٹھکی بیٹھتی ہوئی بولی۔

”نیل بھائی! میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے اب ہو گیا ہے۔ جسے پورا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

نیل نے کتنا بھی قیاس کیا، یہ نہیں سوچا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔

”میں سوینا جی کے ساتھ بازار گئی تھی ناں وہاں ڈیکوریشن بیسوز دیکھتے ہوئے ایک قیمتی گلدان ہم گر کر ٹوٹ گیا۔ بارہ سو روپے کا تھا اور جو خاتون خرید چکی تھیں انہوں نے مجھ سے اتنی رقم کا مطالبہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں تھا اور ابھی بھی صرف چار سو، میں باقی آٹھ سو۔ آپ پلیر ماما کو نہیں بتائیں؟ اس نے صرف صنف میں جھوٹ سے کام لیا۔ باقی ساری حقیقت بتا دی تو نیل کچھ دیر خام

دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”تمہیں آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پریشان ہوتی رہیں۔ اس طرح مسئلے حل خیر اس وقت تو میرے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہیں۔ کل شام تک انتظام کروں گا۔ کب دینے؟“

”جی۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی تو مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا۔

”سنو، تم نے بھی کچھ خریداری کی؟“

”ہاں، نیل بھائی نے پیسے دیئے تھے میں نے دو سوٹ لے لیے۔ ایک تمہارا، ایک اپنا، کھانا تمہارے بیڈ پر رکھے ہیں۔“ وہ ٹیبلر کربول رہی تھی لیکن انداز سے غلٹ عیاں تھی۔

آسیہ بس اس کا خیال کر کے شعلہ بار نظروں سے مدحہ کو گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو اس نے آسمان
آنکھوں سے مدحہ کو دیکھا جو آسیہ کے مقبض سے خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس کے ہر انداز سے بغاوت
رہی تھی۔

”اب تم میرے سامنے گڑگڑاؤ گی کہ میں اپنے باپ کا نام نہ لوں۔ کیوں نہ لوں بتاؤ۔“ اس کے کومرے
پہلے ہی مدحہ اس پر چڑھ دوڑی۔ ”اگر ماما کو اتنا ہی ناگوار گزرتا ہے تو اپنے کان بند کر لیا کریں ماما
اختیار یوں برہند نہیں باندھوں گی۔“
”ایسا نہیں کہو مدحہ! خدا کے لیے۔ تم اس شخص کے لیے ماما کو دکھ دے رہی ہو جس نے کبھی ہماری ذرا
لی۔“ صابحت نے عاجزی سے کہا۔

”یہ میں اسی شخص سے پوچھوں گی کہ اس نے ہماری خبر کیوں نہیں لی۔“
مدحہ پھر سختی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو اس کے آنسو اور روانی سے بننے لگے مدحہ کے پیچھے جانے
ہی نہیں ہوئی۔ وہیں گھنٹوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ ”وہ شروع ہی سے کچھ بزدل ہی تھی۔ ذرا آگئی تو
بات کرنا ڈر جاتی جب ہی اس کی طرف سے سب کے درمیان صلح کے جھنڈے گاڑی رہتی تھی اور اب وہ
بے بس محسوس کر کے رو رہی تھی۔

”صابا“ نیل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یکارا تو وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔
”بیوقوف“ تم کیوں رو رہی ہو؟“ نیل اس کی اس بیٹھ گئی۔
”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے نیل بھائی۔ مدحو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح کیوں کرنے لگی ہے۔“
کے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔ ”اسے کسی کی پروا نہیں ہے۔ ماما کی بھی نہیں۔“
”ہو جائے گی“ سب کی پروا ہو جائے گی۔ ابھی نا سمجھ ہے۔“ نیل نے بظاہر سرسری انداز سے کہا
حقیقتاً اس صورت حال سے وہ بھی پریشان تھے۔

”نہیں وہ نا سمجھ نہیں ہے۔ میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرے گا
کو پریشان کرتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں“ اس نے اگر شاہ سکندر کو دیکھ لیا تھا تو اسے چلانے کی کیا ضرورت
خاموشی سے بھی تو سمجھتا سکتی تھی۔ شخص ماما کو جانے کے لیے اس نے اتنا شور مچایا اور ماما کے ٹوکنے
نہیں آئی۔“

وہ مسلسل آنسو بوجھتی ہوئی دکھ سے بول رہی تھی۔ ”اس روز آپ نے شاہ سکندر کی تصویر یہ کہہ
دکھانے سے منع کیا تھا ان کی وہ اس شخص کو سارے شہر میں ڈھونڈتی پھرے گی کیونکہ اس میں عجیب سی مذ
پھر آپ اسے نا سمجھ بھی کہہ دیتے ہیں۔ کیوں۔“
”کیونکہ ایسی باتیں نا سمجھی ہی میں ہوتی ہیں وہ اگر سمجھ دار ہوتی تو ہماری طرح سوچتی۔“ نیل اس کا
ذرا سا سکرائے۔

”آپ کو کیا تپا میں کہا سوچتی ہوں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔
”میں نے تمہیں پالنے میں کھلایا ہے سچی۔ چلو اب روٹنا بند کرو۔ تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف
ہیں اور دیکھو اس وقت مدحو کو بالکل نہیں چھینٹا۔ اٹھو شاباش۔“ نیل نے اٹھتے ہوئے اسے بھی اپنے
گھبراتا تھا۔

”وہ نیل بھائی ماما“ نہیں مدحو کی باتوں سے دکھ ہوا ہو گا۔“ اسے اب آسیہ کی فکر ستانے لگی۔
”ضرور ہوا ہو گا اور تمہیں اس وقت ان کے پاس بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی اپنے کمر
جاؤ اور چپ چاپ سو جاؤ۔“ نیل نے سمجھانے کے انداز میں ہلکی سی تنبیہ کی تھی۔

سترہ سال پہلے اپنی بیٹیوں کی خاطر اس نے شاہ سکندر حیات کی انا کو تسکین پہنچانے کی خاطر اس کے ما
انا خودداری اور اپنی بہتی کا غور ماما کر اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جا

تھکت عملی کے بعد وہ یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کے اندر کوئی خدشہ رہا ہی نہیں تھا اگر کبھی
چھنے خیال آیا بھی تو اس نے یقین سے سوچا تھا کہ جب بچیاں ہی اسے قبول نہیں کریں گی تو وہ اپنا حق کیسے

میں بھی نہیں کہتا تھا کہ کوئی موڑا یا بھی آئے گا جب اس کی ساری تپشیا یوں دھری رہ جائے گی کہ
میں نے متاثر آن لکھی ہوں گی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بے خبری میں۔ وہ نوں بیٹیوں کے مزاج اور عادات کو
میں نے متاثر ہی میں اس نے مدحہ کے اندر اس کے باپ جیسی ”میں“ کو محسوس کر لیا تھا
نہ سے خائف نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسے اپنی تربیت پر بھروسہ تھا۔ پھر شاید فطری طور اسے یہ خیال بھی
نہ سے جیسے بری ہوں گی انہیں صرف اس کا احساس ہو گا کہ ان کی ماں نے تنہا ان کی یوں پرورش کی
بچاں کی نہیں ہونے لگی اور ایسے میں بھی انہیں باپ کا خیال آیا بھی تو وہ سخت سے سر جھٹکیں گی۔
نہ اس سے نہیں کو تابی ہوئی تھی یا خون نے جوش مارا تھا جو سترہ سال پہلے اس نے جس بچی کو شاہ سکندر
سے بیٹے کے لیے چھپانے کی خاطر اس کے کس تک سے محروم رکھا تھا وہی اس کی طرف لپک رہی تھی۔
نہ سے ماما وہ میرا باپ ہے۔“ مدحہ کی آواز مسلسل اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ”میں
یہ جانتی ہوں اور بتاؤں گی کہ میں مشر شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہوں۔“

یہ موڑا تھا کہ وہ اپنے زمنوں پر جی کھنڈ خود اپنے ناخنوں سے نوپنے لگی تھی اور وہ ساری رات اس کی خود
نہ سے میں گزر گئی۔

بہنوں کے پر کیف لمحات۔
نیل کی بستی میں ہر روز اس کے نام کا اک پھول کھلاتا۔
میں نے کبھی کا پر فریب جال۔
میں نے شگت میں ستاروں کی کھشاؤں میں قدم رکھنے لگی تھی۔

نہ اچانک جیسے اس کی آنکھ کھل گئی تھی یا اس کی روح میں شرچہ جو کراٹھا گیا تھا۔
نہ سکندر حیات نے ہمیں اپنی رھیل بنایا ہے تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“
اس کی روح پر وہ گھبراہٹ تھی بیٹیوں کے سامنے بے نقاب کرنے کا خیال ہی جان لیوا تھا اور اسے لگ رہا تھا
نہ اس کے باپ کا خیال نکالنے کے لیے اسے یونہی جاں سے گزرتا ہو گا۔

میں یہ بھی گزر رہی تھی اس نے بہت بڑھال ہو کر تیکر سر رکھا تھا اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔
نہ عمل کے مطابق بونا شتا نیل پر لگا کر سب سے پہلے آسیہ کو مطلع کرنے اس کے کمرے میں آئیں اور
نہ عمل اسے سوتے دیکھ کر پہلے کچھ حیران ہو کر اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کے پاس پر ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھنے پر یوں جا کر نیل کو بلا لائیں۔
نہ بوجھ۔ ”نیل نے آسیہ کا چہرہ ماما میں لے کر یکارا تو وہ ہم بے ہوشی میں بڑبڑانے لگی۔

نہ مدحو کو روکو وہ جارہی ہے۔“ نیل سمجھ تو پہلے ہی رہے تھے۔ اس کی بڑبڑاٹ سن کر انہیں دکھ کے
نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے
نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے

نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے
نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے

نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے
نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے

نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے
نہ بڑبڑاٹ سے اٹھ کر آیا۔ ”نیل ضبط کرتے ہوئے بوا کو آسیہ کے پاس بٹھا کر صباحت کو پکارتے ہوئے اس کے

میں رک کر پہلے یا سمین کو فون کیا پھر آسیہ کے کمرے میں آئی تھی۔

تقریباً "میں منٹ بعد یا سمین آئی تو اس کے ساتھ میونہ بھابی اور اباجی بھی اوپر آگئے تھے۔ رات جب کلینک سے آئی اس وقت تو ٹھیک ٹھاک تھی پھر ایک دم سے اٹنا بخار کیسے ہو گیا۔ نظروں سے نیل کو دیکھنے لگے۔

"چائیں اباجی! میں نے تو خود ابھی دیکھا ہے۔" نیل نظروں سے چلا گئے۔

"بہت تیز بخار ہے۔ صابینا! جلدی سے برف کا پانی اور کپڑے لے کر آؤ اور یہ میڈسن نیل دے۔ باکس میں ہوں تو رو نہ فوراً "منکو آؤ۔" یا سمین پرچہ نیل کو تھما کر انجکشن تیار کرنے لگی۔ پھر جہاں بازو میں گئی وہ کراہ کر بڑبڑانے لگی۔

"مدحو رو رو کو" سے مت جانے دو۔"

"کہاں ہے مدحو؟" میونہ بھابی نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نیل سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں چچی یہ میڈسن تو نہیں ہیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

نیل اگلے کسی سوال سے بچنے کی خاطر میڈسن کے بہانے فوراً "چل پڑے۔ پھر اچانک کسی دنیا مدحہ کے کمرے میں جھانک کر بولے۔

"مدحہ! چلو پھو پھو کپاس جا کر بیٹھو اور انہیں یقین دلاؤ کہ تم کہیں نہیں جا رہی۔"

مدحہ کچھ کچھ بھی نہیں اور نہ ہی سمجھنے کے لیے کوئی سوال اٹھایا چپ چاپ ان کے قریب سے گزر کرے میں داخل ہو گئی تھی۔

دوپہر تک آسیہ بے ہوشی کے عالم میں جانے کیا کیا بولتی رہی تھی جو صرف وہ تینوں ہی سمجھ رہے تھے۔ سب سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ کبھی صحبت کو دیکھتے تو آسیہ کے سرانے کے پاس سے ہٹ جاتی اور کبھی مدحہ کو جو مسلسل آسیہ کے پیروانے میں لگی ہوئی تھی اور کسی کسی وقت سب کی نظر بھاگرا سے پھلتے آتو بھی صاف کر رہی تھی۔

پھر دوپہر میں کچھ بخار کا زور ٹوٹا تو یا سمین نے خصوصاً "اماں جی اور اباجی کو اطمینان دلا کر نیچے بھجا۔ صحبت کو زبردستی وہاں سے اٹھا کر اپنے ساتھ کھانا کھلایا پھر انہیں تسلی دیتی ہوئی بولی۔

"اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ شام تک آسیہ سکون سے سوئے گی۔ تمہاری اس کپاس مہہ نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ شام میں دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہوگی اور یہ تم دونوں اتنا دبا کیا اس سے پہلے اس گھر میں کبھی کوئی بیمار نہیں ہوا۔ بیٹا! جہاں تندرستی ہے وہاں بیماری بھی نہ کمرے میں جاؤ۔ آسیہ کے پاس میں ہوں۔"

"آپ بھی تو تھک گئی ہوں گی ماما جی۔ آپ آرام کریں۔" صحبت نے یا سمین کا احساس کر کے گال تھک کر بولی۔

"میں آسیہ کے پاس آرام ہی کروں گی، چلو جاؤ شاباش۔" یا سمین دونوں کو ان کے کمرے میں بٹھ کرے میں لگتی تھی۔

شام میں آسیہ کا بخار تقریباً "اتر چکا تھا۔ لیکن جس ذہنی اذیت سے وہ گزری تھی اس کے اثرات اٹھ کر بیٹھ توئی لیکن بہت کم قسم تھی۔ یا سمین نے زبردستی اسے دلیہ کھلایا اور اس کے اندر مٹا اس کے ساتھ مسلسل اس کی دلجوئی بھی کر رہی تھی پھر میونہ بھابی بھی آگئیں لیکن ان کی گفت و بات نہیں بہلا پارہی تھیں۔

جب عدیل یا سمین کو لینے آئے تو وہ اباجی اور خلیل بھائی کو ساتھ لے کر آسیہ کے کمرے میں جنہیں ایک ساتھ دیکھتے ہی اس کا ذہن پھر کہیں پیچھے جھٹک گیا تھا۔

دنت جب ان سب نے آکر اس سے پوچھا تھا کہ کیا تم شاہ سکندر کے نام کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو۔ عدیل نے ہنسنے سے انکار کیا۔ "میں نے پوچھا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا۔ جی ہاں ایساں! بیٹھیں۔" میونہ بھابی نے کھڑے ہو کر اپنی جگہ پر اباجی کو بٹھایا اور خلیل کے لیے کرسی کے قریب کی۔ عدیل خود ہی یا سمین کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

زینب کو بیٹھنے ہوئے دیکھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ جس پر اباجی بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔

"تو سمجھتا بیٹا کہ اب تمہیں کسی بات سے خائف ہونے کی ضرورت ہے۔ تمہاری بچیاں ماشاء اللہ بڑھ چکی ہیں۔ پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے؟"

نیل کی آنکھوں میں یکبارگی پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے اپنے ہاتھوں پر گرنے لگا۔

اباجی نے غلط تو نہیں کہا۔ یہ شاہ سکندر کی منشری سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔ "عدیل نے اسے روتے اپنی بات کی تصدیق ہونے پر فوراً "اباجی سے کہا۔

نیل اور میونہ بھابی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں میں یوں اشارا کیا جیسے کیا معاملہ ہے۔

یہ تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اسے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ "اباجی نے زور دے کر کہا تو وہ ہتھیلیوں نہ صاف کرنے کے بعد کہنے لگی۔

شاہ سکندر یا اس کی منشری سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ اس کے سامنے آنے سے پریشان ہو گئی ہوں جیسے لڑکی پر دیکھ کر دیکھ کر اور جب انہیں خوشی سے بے قابو ہو کر ایک دوسرے کو بتایا تھا کہ وہ ان کا باپ ہے۔ "اس نے کس گفتگو کے تحت مدحہ کے ساتھ صحبت کو بھی شامل کر لیا۔

نیل کہے پتا چلا کہ وہ ان کا باپ ہے۔ کیا اس ساری دنیا میں شاہ سکندر حیات نام کا ایک ہی شخص ہے۔" ماما نے ناگوار سی سے کہا تو وہ جڑ بڑ ہو کر بولی۔

نیل نے غلطی ہوئی جو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ اگر ہوش میں رہ کر بات کرتی تو آرام ملا سکتی تھی کہ وہ ان کا باپ نہیں ہے اور میرے ڈانٹنے سے اپنے آپ تصدیق ہو گئی۔ اب بتائیے میں کیا باب تک میں بھی آپ کی طرح سوچتی رہی ہوں کہ میری بیٹیاں بڑی اور سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ مجھے اب کوئی

ہاں۔ رات سارا اطمینان چھین لیا ان دونوں نے۔"

نیل کہہ رہی تھیں۔ "میونہ بھابی نے پوچھا۔

نیل نے نہیں نیکیں تجسس ضرور ہو گئی ہیں اور اب جب ہر روز اس کے بارے میں ٹی وی پر یا اخبار میں کوئی خبر ملے گی تو ان کے اندر مزید جاننے کی خواہش ہوگی۔ "اس نے کہا تو عدیل پر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے

یہ تو غلطی کی بات ہے۔"

نیل بات نے مجھے پریشان کیا ہے۔ میں شاہ سکندر تو کیا اس کے پورے خاندان سے لڑ سکتی ہوں لیکن بیٹیوں

میرے اس فطری جذبے کو نکال پھینکنا مجھے اپنے اختیار میں نہیں لگ رہا۔ کتنی سختی کروں۔"

نیل نے کئی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ "اباجی ٹوک کر کہنے لگے۔ اس طرح تو ان کے اندر ضد بھی سما جائے۔ تو یہ ہو گا کہ تم انہیں ان کے باپ کی اصلیت بتا دو۔"

نیل نے ایسے بھی اب وہ سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ انہیں اصلیت معلوم ہونی چاہیے۔ ورنہ باپ کی ظاہری شان و شوکت ہو کر کہیں ایسا نہ ہو وہ تمہیں قصور وار سمجھنے لگیں۔ "خلیل بھائی نے اباجی کی تائید کرتے

یہ تو اب کی باتوں میں مدحہ کی آواز گونجنے لگی۔

نیل نے بھی نہیں ان کے بارے میں نہیں بتایا جس سے میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ کوئی آوارہ اوپاش شخص ہو

یہ وہ شاہزادہ ہے کہ میں ہیں اور اب منشر بھی۔"

نیل نے گہرا سانس لیا۔ اگر تم نہیں بتا سکتیں تو میونہ بھابی بتا دیں گی۔ "عدیل نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ گہری

سانس سینے کے اندر روک کر بولی تھی۔ ”نہیں میں بتا دوں گی۔“



علی جمالیگر، بابا جان اور شاہ سکندر حیات کو رخصت کر کے عازم کے ساتھ واپس اندر آیا تو بھگ کر اس نے ریسیور اٹھایا تھا لیکن پھر بہت عجلت میں بات کر کے بے دلی سے ریسیور بجا تو عازم پر گرا تا ہوا کہنے لگا۔

”یار! میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں۔ تم ہر تیل پر بھگ کر ریسیور اٹھاتے ہو پھر مایوس ہو کر کٹھنہ مطلب ہے، تمہیں کسی خاص فون کا انتظار ہے۔ ایم آئی رائٹ؟“

”رائٹ۔“ اسے جیسے اب کسی ساتھی کی ضرورت تھی جب ہی ہتھیار ڈال دیے۔

”کہیں وہی تو نہیں۔“ عازم فوراً ”سیدھا ہو بیٹھا۔“

”وہی ہے۔“ وہ اعتراف کر کے مسکرایا تو عازم یکدم انجان بن گیا۔

”وہی کون، میرا مطلب ہے اس کا پورا یا سو ڈانٹاؤ۔“

”بائو ڈانٹا معلوم ہوتا تو میں یوں انتظار میں بیٹھا ہوتا خود نہ رنگ کرتا۔“ وہ اپنی بے بسی پر گویا ”چہ چہ۔ تمہیں معلوم نہیں ہے اور اسے معلوم ہے“ عازم نے افسوس کے ساتھ اس کا ہاتھ سلگ کر بولا۔

”اے ابھی معلوم نہیں ہے۔ بس صرف میرا کارڈ ہے اس کے پاس جو پرسوں اتفاقاً ”سرراہ لاکار“ اسے ہتھایا تھا۔“

”اور یہ اتفاقاً ”سرراہ کون سی ملاقات تھی۔“ عازم نے نظا ہر سنجیدگی سے پوچھا۔

”دوسری۔ کیوں؟“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو عازم کندھے اچکا کر بولا۔

”یونی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ لیا۔ کوئی گناہ کیا۔“

”تکو مت یہ بتاؤ اس نے فون کیوں نہیں کیا۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”یہ تمہی اس سے تیسری سرراہ ملاقات میں پوچھا۔“ عازم اسے مزید چڑا کر زور سے ہنسا اور اس ہونٹ جھپٹے پر فوراً ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”مذاق میں مذاق کر رہا تھا۔ اب سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم اس نے فون کیا کیونکہ تم نے حماقت کی۔ اپنا کارڈ اسے تھمانے کے بجائے اس کا نمبر وغیرہ لینا چاہیے تھا تمہیں۔“ ”چونکہ یہی کچھ ایسی تھی۔“ علی جمالیگر نے کہا پھر اپنے آپ اس سے دونوں ملاقاتوں کی پوری دی۔ جیسے سن کر عازم پر سوچ انداز میں کہنے لگا۔

ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہے کہ آیا وہ لڑکی تم سے متاثر ہوئی بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہوئی بھی نہیں کہ فوراً ”تم سے رابطہ کرے۔“ اس کے ساتھ کوئی پراہم بھی ہو سکتی ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہو۔ لہذا صبر سے انتظار کرو۔ اگر وہ مقررہ دن آئی تو یہ ساری باتیں اسی سے پوچھ لیتا۔“

”صبر سے انتظار کروں پانچ دن۔“ علی جمالیگر نے یوں کہا جیسے پانچ صدیاں۔

”اس چکر میں ایسا ہی ہوتا ہے بھائی۔ ویسے میری مانو تو اس چکر کو میں ختم کر دو۔ ایسا نہ ہو سکتا تمہیں بھی کوئی روک لگ جائے۔“ یہ عازم نے کہا تو اس نے بے نیازی سے جھکا۔

”میں چاہا چاہا میں کی طرح بزدل نہیں ہوں۔“

”بزدل تو جرح چاہا چاہا میں بھی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ یقیناً ”بابا جان“ نے سیاست چلی ہوگی۔“ ”بابا جان اور اب دیکھنا سکندر چاہا ہے کسی سیاست کروائیں گے۔ ان کا تو بس نام ہو گا سارے جان کے چلیں گے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ان کے ہاتھوں کھٹ پٹی نہیں بنوں گا۔ مجھے اپنی زندگی جینا۔“

بت پہلے طے کر لیا تھا۔ اس لیے اب کی خواہش اور اصرار کے باوجود میں ان کے ساتھ زمینداری کے کاموں میں نہ لگا۔ مجھے بہت اذیت ضرور کرتے ہیں لیکن میں مستقل وہاں رہ نہیں سکتا ہو کہ شاہ پور میں کم و بیش تمام میں سولیات موجود ہیں پھر بھی وہ شہر نہیں لگتا اس لیے کہ وہاں بسنے والے اپنی سوچ نہیں بدلتے۔ اپنے ہاں کی باتیں کو دہرائے۔ ہمارے ساتھ کانوینٹ میں بڑھی ہیں۔ پھر یہاں سے اچھے کا بجزے گر کیویشن کیا لیکن ان کی بیٹی دی جا کر دارنیوں جیسی ہے۔ اپنے سے کمتر کو انسان ہی نہیں سمجھتیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں بے غرض نہیں۔ بس ان کے پاس سب کچھ ہے وہ خوش ہیں مگر ہیں۔“

وہ اپنے ماحول پر بہت تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

”تو اور کیا کریں۔“ عازم اس کی طویل گفتگو سے اکتا کر بولا۔

”کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن کچھ کرنے کو وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ جبکہ میں زندگی کو متحرک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک آئیڈیل ہے۔ صبح جب میں انھوں کو آفس جانے تک میرے ہر کام میں میرے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ اور شام میں گھر آنے پر بھی اپنے استقبال میں اسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں نہ کہ ملازم بھگ کر میرا بیٹھنا۔“

”یہ ساری باتیں پہلے سے اسے بتا دینا۔“ عازم پھر شونہ سے باز نہیں آیا۔

”تسے؟“ اس نے اپنے خیال سے چونک کر پوچھا۔

”ہی گلہ والی کو، پیسے یا رقم نے اس سے پیسے مانگ کر اچھا نہیں کیا۔ کہہ دیتے، ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی ہے وہ نہ متاثر ہونے والی بھی متاثر ہو جاتی۔“

”تو میں کون سا اس سے پیسے لے لوں گا۔ مجھے اگلی ملاقات کا بہانا چاہیے تھا اور فوری طور پر یہی ذہن میں آیا کہ طرح طرح کے آئے گی تو اس سے بہت ساری باتیں کر لوں گا۔“ اس نے لگتا۔

”ایک نہیں یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔“ عازم نے پوچھا تو وہ پر یقین انداز میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا۔

”ضرور آئے گی اور اب میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ صبح بونی جوان کنی ہے۔“

”لوں! ایس ڈی ایم صاحب کو پہلے ہی دن لیٹ نہیں ہونا چاہیے اور سنو، تم تو پھر شام میں ہی آؤ گے اور میں رنگ نکل جاؤں گا۔ کوئی کام ہو تو ابھی بتا دو، میرا مطلب ہے شاہ پور میں کسی کے لیے کوئی پیغام وغیرہ۔“ آخر عازم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ چلی تھی جس سے وہ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اس کی طرف ہے اور اس سے ہی اس کی پیشانی پر ناگوار کی لکیریں سمٹ آئی تھیں۔



کئی کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔ ناؤ گڈ ٹائٹ۔ ”وہ فوراً“ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا چھٹا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے صبح عازم کے اٹھنے سے پہلے ہی آفس روانہ ہو گیا۔ اور شام میں اس کے خیال سے خوش تھا کہ عازم جا چکا ہو گا اور وہ تو واقعی جا چکا تھا۔ لیکن اس کے لیے کوئی لطفہ چھوڑ گیا تھا اس نے غصے سے اسے دھجکا کا تھا۔

”تو بڑا بڑا۔“ تمہارا انتظار ختم ہوا۔ سرراہ ملاقات والی نے جانے کس کے ہاتھ یہ بارہ سو روپے بھجوائے ہیں۔“ ”بہت شاد سے شغل فرما رہا تھا وہ نہ آنے والے سے یہ ضرور پوچھتا کہ بھائی تم کون ہو۔ اس کے کیا لگتے ہو۔“ ”اے بے ہوش مال وہ جو کوئی بھی تھا کرم دین کو یہ لطفہ تھا کر چلا گیا۔“ ”کن لو پورے بارہ سو روپے۔“

”اے بڑا۔“ اس نے لطفہ نیبل پر پیچینک کر کر مہین کو پکارا تھا۔

میرزا بیچو جاری ہوں، کیونکہ مجھے ابھی غم نہیں آ رہی۔“
 نہیں آ رہی بیچو انوں کو تو آ رہی ہوگی۔ ان کی غم کیوں خراب کرتی ہو۔“ صبا نے ٹوکا لیکن وہ ان
 کے بازوؤں میں سے بھاگتی ہوئی بیڑھیاں اتر گئی۔
 ”صبا نے سرجھکا اور اپنے کمرے کے دروازے تک آئی تھی کہ نیل کی اسٹک کی
 پٹ کر دیگیا۔“

”جہ میں چائے کا پلے آرہے تھے۔
 ”نیل نے چائے آپ نے خود پانی ہے۔“ اس نے حیرت سے کہا تو نیل ذرا سا مسکرائے۔
 ”نیل نے کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے۔“
 ”اے کچھ سے کہنا چاہئے تھا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آگئی۔
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“
 ”نیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔“

مدیہ اور صبا نے سرجھکائے بیٹھی تھیں۔
 ”آسیہ نے اپنی زندگی کا وہ باب جو سبیل کر دیا تھا، اسے احتیاط سے کھول کر ان کے سامنے حرف بہ حرف
 تھا۔ اس کے بعد بغور ان کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں۔“

صبا نے چہرے پر دکھ کا تاثر بہت واضح تھا۔ اور مدیہ کے چہرے پر محسوس کیا جانے والا تنفر
 کتنی دیر کی خاموشی کے بعد آسہ بھرا پتے ابولنے لگی تھی۔
 ”یہ مت سمجھنا کہ میں نے محض ضد میں تمہیں تمہارے باپ سے دور رکھا۔ بلکہ میں تم دونوں کو یہ
 بے وقعت نہیں ہونے دینا چاہتی۔ تم اس کے سامنے جاؤ اور وہ تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دے تو
 اپنی نظروں میں تمہاری کیا وقعت رہ جائے گی۔ بس اسی خیال سے میں تمہیں روکتی ہوں۔ اور یہ غلط نہیں
 جب شاہ سکندر کے باپ نے مجھے اس کی بیوی تسلیم نہیں کیا تھا تو تمہیں بھی اپنے خاندان کا نام نہیں دے
 میری بیٹیاں ہو صرف میری۔ میں تمہیں ہر اس راستے پر جانے سے روکوں گی، جہاں شاہ سکندر کی پرچھاؤ
 کا شائبہ ہو گا اور اگر تم میری مرضی کے خلاف چلنے کی کوشش کی تو۔“

آسیہ نے ہنٹ ہنٹ بچھڑے تھے لیکن اس کا ٹھہرا ہوا سر لہجہ ان دونوں کی رگوں میں لہو منجمد کر گیا تھا۔
 ”تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے۔“ قدرے توقف سے آسیہ نے موضوع بدل دیا۔
 ”جانتا نہیں! شاید اگلے ہفتے،“ کنفرم نہیں ہے۔“ صبا نے کو بولنے میں ساری توانائیاں صرف کرا
 تھیں۔

”ہوں۔ دو مہینے تم لوگوں نے بیکار وقت ضائع کیا۔ کوئی کورس ہی کر لیتیں۔“ آسیہ کو اب افسوس ہوا کہ
 اسے پہلے کیوں نہیں آیا۔ ”خیر اب رزلٹ آجائے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ گریجویشن کے بعد پھر کمپیوٹر
 کر لیتا۔ فیکری نما ضرور پڑھا کرو۔ اس کی برکت سے باقی نمازیں بھی وقت پر ادا ہو جاتی ہیں۔“ چلو اب
 دو۔“

”مما! آپ کی طبیعت تو ٹھیک سے ناں۔“ صبا نے اٹھتے ہوئے مدیہ کو کہنی ماری تھی۔
 ”ہاں بہت بہتر ہوں۔ کل سے کلینک جاؤں گی۔“ آسیہ نے کن اکھیوں سے مدیہ کو دیکھا جو قدرے
 سی ہو گئی تھی۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”مما! آپ کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے ناں۔ آئی ایم سوری ممما۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر
 سکندر کا نام نہیں لوں گی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ کے نام کے ساتھ سرائیگا کر چوں گی۔“
 آسیہ نے اس کا سراپے سینے سے لگایا تو اس کے ساتھ صبا کی پلکیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

”مما! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔“ مدیہ اس کے سینے میں منہ چھپائے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں بیٹا! میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ تم صبا اور نیل میری کل کائنات ہو۔“ آسیہ نے
 ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی پھر ایک بازو پھیلایا کہ صبا کو دیکھا تو وہ بھی اس کی آنکھوں میں ساک
 ”میری جان، تو تم میری زندگی میرا غرور میرا مان اور تم میرا مان بھی نہیں توڑنا۔“ آسیہ دونوں کو ہانڈ
 بچھ کر بولی پھر ان کے سر جوڑ کر انہیں خود سے غلطیہ کیا تو مدیہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”مما! ابھی آپ کچھ دن آرام کریں۔ کلینک جا میں گی تو۔“
 ”بس بیٹا بہت آرام کر لیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آسیہ نے مسکرا کر انہیں اپنی طرف سے اطمینان
 پھر اپنے پیچھے تکیہ سیدھا کرنے لگی تو صبا احتیاط سے اس کے بولی۔
 ”چلو خود جواب ممما کو سونے دو۔“
 ”گڈ نائٹ ممما!“ مدیہ نے زیر و چور کا بلب جلا کر ٹیوب لائٹ آف کر دی اور صبا کے پیچھے کمرے
 کر آئی تو آہستہ آواز میں بولی۔

لیٹ گئی تھی۔

*. ☆. *. ☆. *

تھے ہی اس سے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ عمراور ثوبیہ کی شوخ نظروں سے بچنے کی خاطر ”اس میں سمجھنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ وہ لاپرواہی سے کہہ کر بائیک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”صرف تمہارے لیے۔“ اصرارے بایک اشارت کرتے ہوئے کہا پھر اسے اشارہ کیا تو
صباحت میسر پر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جواباً وہ مسکراتی تھی کہ اصرار نے جھٹکے
آگے بڑھادی۔

”مین روڈ پر آکر احمر نے پوچھا۔

”ماں پھول، یہی ہے۔“ وہ مود میں آکر نولی۔

”اگر مطلب ہے۔؟“ حمر سمجھا نہیں۔

مطلب سارے شہر میں گھما دیں بغیر کہیں رکے۔ کیونکہ میں بینک پر پہلی بار بیٹھی ہوں اور مجھے بہت اچھا

۴۳۔ تم بائیک دیکھ کر چیخ پڑو گی اور اس پر بیٹھنے سے منع کر دو گی۔ ۴۴۔ حمر کو واقعی یہ خدشہ

ہوئے آج آپ اتنے موڈ میں کیسے آگئے۔؟ وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔

”میں نے میری بات جو مان لی“ اصرار نے کہا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

”ہاں کے ساتھ گریجویشن کرنے کی۔“ چمدو اگر تم اپنی مرضی کرتیں تو میں سمجھتا، تمہیں میری بالکل پروا نہیں۔ اور ہاں اتنے دنوں سے میں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ کیسے تم اپنی مرضی کر کے میری محبت کا مذاق نہ اڑاؤ۔“ احمد صاف گوئی سے اپنے خدشے کا اظہار کر رہا تھا۔

یابا کہ ہم چپ سی ہو گئی تھی۔
 ”نھنے اپنے بہن بھائیوں کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑتا۔ گو کہ کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ
 کا اتنا خجیسے سب یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ آیا تم میری بات مانتی ہو کہ نہیں۔“

”گورمیل نے آپ کی بات مان لی۔“ وہ اپنے کعبے میں استسرا چھپا نہیں سکی لیکن ٹریفک کے شور نے لاج رکھ لی۔

”اُس خوشی میں پہلے آؤں کریم۔“ احمر نے بانیک روکتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں رکو میں لے کر آتا ہوں۔ کون

”ٹھیک اور صبا کے لیے بہت۔“ اس نے صبا کو کالیوں کہا کہ وہ اس سے کہہ کر آیا تھا۔

”مہاکے لیے ابھی کیوں۔ ابھی پورا شہر گھومنا ہے۔ واپسی میں گھر کے قریب سے سب کے لیے لے لیں۔“ امر کھتا ہوا اگے بڑھ گیا اور فوراً ”ہی دو آس کریم لے کر آگیا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنی چاکلیٹ لیتی ہوئی

”مختصر اور اشرع نمبر“

”پسوں تم کو کس طرح میں ہو مٹا۔“
”پسوں تم کو کس طرح میں ہو مٹا۔“

نہیں۔ شوق کے شور نے دماغ ہلا دیا ہے۔ انتہائی ادبیات سواری ہے۔ آئندہ کبھی اس پر نہیں

چاہے باغیچہ خرید لے گا خیال ہو تو فوراً دل سے نکال دیں۔ وہ ایک باغیچہ سے اپنی پتی دباؤ ہوئی

میں نے زیادہ یعنی گاڑی خریدنے کی حیثیت نہ ہوئی تب تو مجبوری ہوگی۔“

زلزلہ کے بعد مدیہ نے بہت خاموشی سے صاحت کے ساتھ دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی جانے کے شوق میں آنرز کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اس پر قائم رہنے کے لیے اسے آسے سے اسے اب بھی کچھ رنجش بقی تھی۔ اور اب شاید وہ اسے کچھ دیر کے لیے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آنرز کا خیال چھوڑ کر سابقہ بیجیکٹ سے ہی سمجھوٹا کر لیا تھا۔ جس سے گھر کی فضا کو شاید وہ سنبھال سکتی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ کیونکہ یہ بات اس کے مزاج میں ہی نہیں تھی کہ خویر جبر کر کے جائے۔ اس کے برعکس خلاف مزاج بات پر وہ شروع ہی سے احتجاج کرتی تھی۔ لیکن اب مجبوراً نے ابھی کچھ دن پہلے اپنے رقوم کو بے نقاب کیا تھا جس سے اٹھنے والی میسیں وہ محسوس کر رہی تھیں۔ اس میں مزید اپنی طرف سے اضافہ کرنا فی الحال ممکن نہیں تھا۔ فی الحال یوں کہ وہ زیادہ عرصہ تک کیبا طاری نہیں رکھتی تھی۔ اور ایسا اس لیے تھا کہ اس کے نزدیک سب سے اہم اس کی اپنی ذات تھی۔

اور یہ طے ہے کہ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والے بھی خوش نہیں رہتے نہ بھی مطمئن رہتے ایک سے شاکي بھی رہتے ہیں۔ بہر حال مدیحہ کے کالج جانے پر جہاں صباحت اور نیل حیران تھے وہاں طور پر یہ سمجھ کر خوش تھا کہ مدیحہ نے اپنی مرضی کرنے کے بجائے اس کی بات مان لی ہے۔ اور اس روز وہ اپنے کسی دوست سے بانیگ لے آیا اور آہستہ سے اجازت لینے کے بعد اس کے پاس آکر کھنے لگا۔ ”سنوئیں آج بڑے موزمیں ہوں۔ چلو تمہیں بھی سیر کراؤں۔“

”صرف مجھ۔“ ”مذہب اپنی طرف اشارہ کرتی ہوئی استہزاء سے کہی۔ ”مما سے پوچھا ہے۔“
 ”کیوں وہ منع کریں گی۔“ ”حرفہ قصداً! ”نجان بن کر پوچھا کہ وہ کندھے اچکا کر بولی۔
 ”شاید۔۔۔۔۔۔“

”جی نہیں۔ یہ میری پھوپھو ہیں۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ ہے اور انہوں نے بخوشی اجازت دے کر فافٹ تیار ہو جاؤ۔“ اصرار نہ کر کہا کہ وہ جیسے یقین کر بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔ الماری کی طرف رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کم آن یا رامیں مذاق نہیں کر رہا۔ اچھا جاؤ خود پھلو سے پوچھ آؤ۔ جلدی جاؤ۔ وہ نیچے اتر گئی جہاں نہیں سیدھی نکل جائیں گی۔“ اور اترنے اس کی بے یقینی محسوس کر کے کہا۔
 ”میں نہیں جا رہی۔“ اس نے قدرے جھنجھلا کر الماری کھول لی۔

”مہماے پوچھنے ہمیں جارہی۔ آپ نے پوچھ تو لیا ہے، وہ بیگن اتار کر اسکی طرف پٹی تھماتا آگئی۔ اور اسے دیکھ کر مہنی خیز شرر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”جناب آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“
”تو آپ دونوں باہر جا رہے ہیں۔؟“
”اے! اور اسے دیکھ کر ہی میرے سر پر سڑاہٹ سے ساہم ہوں۔“

”جی نہیں۔ میں کہوں اعتراض کروں گی جب ممانے اجازت دے دی۔“ صاحت کی بات سننے
واش روم کا رخ کیا اور کپڑے تبدیل کر کے نفی تو جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر بولی۔
”میں تیار ہوں۔“

”ویری گند او کے جباہتمارے لیے آکس کریم لیتا آؤں گا۔“ احر نے مدحیہ کے جلدی تیار ہو کر پھر صباحت کو یا تھ ہلا تا کمرے سے نکل گیا تو مدحیہ بھاگ کر اس سے پہلے سیڑھیاں اترتی ہوئی بغیر سے باہر آئی۔

”تمہارا بھانگنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔؟“

”مجبوری۔ نہیں میں مجبوری سے بھی کمپروماز نہیں کروں گی۔ آپ کی ایک بات مان لی ہے میں یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر بات مان لوں گی۔“ اس نے ذرا بھی مروت نہیں برلی۔

”پھر تو مجھے ہر صورت باہر جانا پڑے گا۔“ اصرار نے اس کی صاف گولی کا بارمانے بغیر کہا۔ پھر ٹنک سے نکل کر کلفٹن روڈ پر آیا تو ریڈ سگنل دیکھ کر جھنجھلا گیا۔

”الحوالہ۔ میں سوچ رہا تھا یہاں سے اسپڈ سے بھگاؤں گا۔“

”آپ ابھی بھی بھگا سکتے ہیں۔ کوئی دیکھ تھوڑی رہا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بڑے آرام سے

”اللہ دیکھ رہا ہے۔“ اصرار نے جس بے ساختگی سے کہا ویسے ہی اس کی ہنسی بھی بے ساختہ بھی تر

لینڈ کروزر بائیک کے قریب آن رکھی بھی مدیجہ نے ہونسی ہنستے ہوئے سرسری نظر سے دیکھا تھا اور فوراً

کراچیا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی جہاں اگر بائیک رہے کھڑے

تب بھی لینڈ کروزر اور اس میں موجود علی جمائیکر اپنی تمام تر وجاہتوں کے باوجود اسے متاثر نہیں کر سکتا

لے اس کی زندگی میں آچکے تھے اس کے بعد علی جمائیکر کی گہری نظروں پر اس کا رد عمل فطری تھا۔

سگنل آن ہوتے ہی اصرار نے اسپڈ سے بائیک بھگائی اور پیچھے علی جمائیکر دیکھتا رہ گیا کہ ایک بار تو وہ

دیکھے گی لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

* ☆ * ☆ *

علی جمائیکر اپنی تسخیر کر لینے والی پر سنالشی سے بخولی آگاہ تھا لیکن اس کے اندر اپنے پچاشاہ سکندر

اپنی وجاہتوں کا زعم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کی سوچ ان جیسی تھی کہ جو چیز پسند آجائے اسے ہر قیمت

پر۔ جب ہی اس نے اول روز بھی صباحت نے جہاں کہا وہیں اسے ڈراپ کر دیا تھا اور دوسری بار

آپ منوانے کے بجائے ایک طرح سے اختیار اسے دے آیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کچھ پیٹ

کرے گی لیکن اب مدیجہ نے جس طرح اس کے دیکھنے پر ناگواری سے منہ موڑا تھا۔ اس سے حقیقت

دھچکا لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی زعم میں اس کے تعاقب میں نہیں گیا۔ سوچا بھی نہیں بلکہ وہیں

مخالف سمت موڑ لی تھی۔ لیکن اس کا دل جانے کیوں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ

منہ موڑ سکتی ہے۔

”ایک لحظہ کو بھی اس کے چہرے پر شناسائی کا تاثر نہیں لہرایا۔“ وہ مسلسل الجھ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی پرابلم ہو یا وہ کیسے انجیج ہو۔“ معاً عازم کی بات یاد آنے کے

اس نوجوان کا خیال آیا جس کی طرف اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اس کا دھیان نہیں گیا تھا حال

ہی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ بائیک پر جس کے ساتھ بیٹھی تھی وہی اس کی طرف سے منہ موڑنے کا سب

بہر حال اب سب سمجھ میں آیا تھا تو اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی جو اوا

تک ایک لمحہ کو بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی وہ اس آنے سے پہلے ہی بہت دور گئی تھی

نے بس تھوڑی سی کوشش کی بھی اس لڑکی کے خیال کو جھٹکنے کی اور کامیابی سے پہلے ہی یہ کوشش

کیونکہ اس کا تصور ایسا نرم جھوٹا تھا جو ترستی آنکھوں میں جہاں پر سکون نیند لاتا وہاں آگے ایک

لے جاتا تھا۔ جس میں رنگ خوشبو، باہل، ہوا جانے کتنی خوبصورتیاں تھیں۔

کبھی کبھی ازان حقائق کی تگنیوں کو خیل کی شیرمنوں میں بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ

کوئی نوعمر لڑکا نہیں تھا اور نہ ہی اس کی زندگی میں آنے والی وہ کوئی پہلی لڑکی تھی۔ لیکن جسے دیکھ

جانے کو بل چاہتے وہ صرف وہی تھی اور وہ بار بار جاتا تھا۔ یوں کہ اس کے بعد لگتا تھا زندگی بس یونہی گز

رتی تبدیلیاں آئیں اس کے اندر کی دنیا نہیں بدلے گی۔

اس بیک اینڈ پر وہ آس سے نکلا تو ایک دم سے شاہ پور جانے کا پروگرام بنالیا۔ گزشتہ دو مہینو

اس کی وجہ سے اپنا جانا ملتوی کر رہا تھا کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں اس کا فون آئے یا وہ خود او

دی تھی اس لیے گھر آکر اس نے بہت غلٹ میں شاور لیا اور گرم دین کو اپنے جانے کا بتا کر اسی

رات کے کھانے تک شاہ پور پہنچ جائے۔ لیکن کراچی کی ٹریفک الامان۔ ایک گھنٹہ تو اسے صدر

گھاٹ اس کے بعد بھی راستہ صاف نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے دوسرا روٹ اختیار کیا۔ جو خاصا طویل

۔ ٹریفک میں پھنس کر جو وقت ضائع ہونا تھا اس کی نسبت یہ طویل راستہ بہتر تھا۔ تاہم آباد سے

رہچڑاؤ سب کے راؤنڈاؤٹ سے اس نے ٹرن لیا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ آگئی۔

اس کا خیال جھٹکنے کی اس نے بس تھوڑی سی سعی کی تھی اور وہی ہی تھوڑی سی کوشش اس نے

یعنی اسے نظر انداز کر کے آگے نکل آیا۔ لیکن اگلے راؤنڈاؤٹ سے اس نے گاڑی واپس اسی

سے اور چند منٹوں بعد ہی گاڑی سے اتر کر لائبریری میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں وہ اسے آخری

الماری کے قریب کھڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا جب ہی وہ بڑے آرام سے اس

بول۔

نے چونک کر دیکھا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہو کر ایک

غم ہو گئے تھے۔

گاڈ۔ آپ نے بچا نا تو۔“ وہ ذرا سا مسکرایا تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر الماری میں دیکھتی ہوئی بولی۔

داشت اتنی کمزور نہیں ہے۔“

سا اور تیر بھی کہ کبھی کبھی انسان کو مصلحتاً انجان بنانا پڑتا ہے اس نے اپنے تئیں اس روز کی اس کی

روہ کیا سمجھتی۔ خاموشی سے اپنی مطلوبہ کتابیں تلاش کرنے میں لگی رہی۔

نے اس روز کے بعد پھر فون نہیں کیا۔“ علی جمائیکر نے اس کی نظروں کے سامنے سے کتاب کھینچتے

لیں بار رٹائی کر چکی ہوں لیکن آپ کے ہاں سے کسی نے ریسو نہیں کیا۔“ اس نے کہا تو وہ حیران ہو کر

”مجھے وہی پیسوں کا کٹھنر ملے گا تا کہ آپ کو مل گئے؟“ وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو فوراً

پچھن خاطر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر اس پر نظر پڑی پس تو دل حیدر رہا پر چلنے لگا۔

طلب ہے آپ کو نہیں ملے۔“ وہ اس کی خاموشی سے خود ہی نتیجہ اخذ کر کے بولی۔ ”ٹھیک ہے میں

لگی۔“

ما۔“ وہ فوراً بولا۔ ”میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

نہ ہو لیکن مجھے ہے کیونکہ میں کسی کا قرض نہیں رکھتی۔“ وہ بھی فوراً بولی تھی۔

پاسے قرض سمجھتی ہیں تو پھر آپ کو خود آکر مجھے لوٹانے ہوں گے۔ دوسری صورت میں میں واپس

لے بنا لارہا ہی اس کے آنے کی شرط رکھ دی تو وہ کچھ پریشان ہو گئی۔

میں بسے آسکتی ہوں۔“

ہاں آئی ہیں۔“

پشتہ تر آئی میں میرا بھائی چھوڑ کر گیا ہے اور لینے بھی آئے گا۔ میں اکیلی تو سوری۔“ اس نے الجھ کر

کہا مسئلہ ہے کہ آپ کیسے آتی جاتی ہیں۔“ وہ قدرے لا پرواہی سے کندھے اچکا کر کہنے لگا۔ ”اور میرا

دلہ میں اپنے معاملے میں کسی تیسرے شخص کو انوالو نہیں کرنا۔“ آپ کے علاوہ کوئی بھی آیا۔ میں پیسے

سامنے نہیں آں۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔ میں نہیں آرڈر کر دوں گی۔“ وہ ناراضگی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
 ”میںی آرڈر واپس نہیں لے سکتا کیا۔“ اس نے فوراً ”بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا تو وہ زنج ہو کر رہ گیا۔“
 ”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“
 ”اس بات کا جواب جب آپ آئیں گی تب دوں گا اور ہاں یا در کہیے گا پانچ بجے کے بعد اس سے پہلے نہیں ملوں گا۔ اے کے سی پو۔“

وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فوراً ”پلن“
 مگر تیز قدموں سے باہر نکل آیا اور گاڑی میں بیٹھنے ہی ایک بار پھر شاہ پور جانے کا ارادہ متوی کر دیا تھا۔
 * * * * *

”نبیل بھائی! رات میں یہ نبیل کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو انہیں مصروف لگی۔“ میں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔؟“
 ”ہاں بیٹھو۔“ نبیل نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر کہا تو اس نے چائے کا گام ان کے قریب رکھ دیا۔
 ”پھر ان کے پاس بیٹھی ہوئی بن۔“
 ”آپ آنا یہ کام تو بند کریں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ نبیل نے سراونچا کر کے اسے بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔
 ”باتیں کرنے کے لیے نہیں یہی وقت کیوں ملتا ہے۔ شام میں کہاں تھیں۔؟“
 ”شام میں، میں عمر کے ساتھ لا بیریری گئی تھی۔ پتا ہے اتنی اچھی کتابیں لائی ہوں۔ پڑھنے کے لیے۔“

”اچھا! یہی بتانا تھا۔“ نبیل نے چائے کا گام اٹھائے ہوئے کہا۔
 ”نہیں یہ میں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جو خاتون تھیں ناں گلو تک میس نہیں پہنچے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ مزید ایک پیسہ میں انہیں نہیں دوں گی۔“ اس نے اُم اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تو نبیل چائے کے دو سب لینے کے بعد پوچھنے لگے۔
 ”میں نے فون کیا تھا اور مجھے لگتا ہے، نبیل بھائی وہ جھوٹ بول رہی تھیں، انہیں ضرور پیسے ملے۔“
 ”نہیں بھی ملے تو اس میں میری تو غلطی نہیں ہے۔ میں نے تو بھجوا دیئے تھے دوبارہ تو مجھے نہیں ناں۔“
 ”جیسے زبردستی انہیں ہم کو لینا چاہتی تھی۔“
 ”توصاف کہو۔“ عمر نے اس سے پوچھا۔ ”خواہ مخواہ انہیں کیوں جھوٹا بنا رہی ہو؟“ نبیل نے سر دھنسا کر کہا تو وہ منہ پھللا کر بولی۔
 ”میں واقعی نہیں دینا پاہتی، کیوں دوں! ایک بار بھیج تو چکی ہوں اور کوئی تھوڑے سے پیسے بھی نہی سو۔“

”نمیک ہے، جب تم نہ دینے کا تہیہ کر چکی ہو تو پھر مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ ان ہی سے صاف لفظ کر۔“

”ان سے تو میں کہہ دوں گی۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔
 ”پہلے آپ باتیں، میں نے نمیک سوچا ہے ناں۔؟“
 ”یعنی تم یہ چاہ رہی ہو کہ تمہاری غلط بات کو بھی میں نمیک کہہ دوں۔“ اسحق فوراً ان کا انڈر لیر کل میں نہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ نبیل نے قدرے غصے سے ڈانٹ کر کہا تو وہ ایک دم سہجائی ہو گئی۔
 ”آپ۔ آپ چلیں گے۔؟“

”ہاں اور تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔“ نبیل کے حتمی انداز پر وہ مزید بول کھلا گئی لیکن بولی کچھ نہیں ”جاؤ اب مجھے کام کرنے دو“ نبیل نے دوبارہ اپنی فائل اٹھائی تو اس نے اس وقت ان کے پاس ہی میں عافیت سمجھی اور فوراً ”انھہ کر اپنے کمرے میں آئی تو مدحیہ اسے دیکھتے ہی بولی۔“

”ہم آج کیسے استری کرو گی ناں، میرے۔۔۔ بھی کر دینا۔“
 ”میں کوئی استری و استری نہیں کر رہی۔“ وہ بری طرح سلگ کر بولی۔
 ”میں مدحیہ نے اس کے سکلنے پر حیرت سے دیکھا پھر اپنے آپ سمجھ کر کہنے لگی۔“ نبیل بھائی نے ڈانٹ کر ہاں اچہ کیا۔ ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتی ہو۔“
 ”نہیں۔ انہوں نے نبیل ڈانٹا۔ مجھے تمہاری کابل پر غصہ آ رہا ہے۔ اس وقت سے کیا کر رہی تھیں جواب کہہ کر۔“ نبیل استری کر دینا بھی تم نے بھی میرا کام کیا ہے۔“ اس نے فوراً ”اپنے سکلنے کا ذمہ دار مدحیہ کو ٹھہرا دے سخت ست کرنا شروع کر دیا۔“
 ”میں کام کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔“ مدحیہ کے آرام سے کہنے پر وہ مزید چیخ گئی۔
 ”انہم کو نواب زادی ہو۔“

”اگلے ہوں۔ جا کر مدھیو۔ میرے باپ کے ہاں کتے ملازم ہوں گے۔“ مدحیہ کے منہ سے پھر باپ کا سن کر وہ غصہ ہو کر پھر تاسف سے سر جھٹک کر بولی۔
 ”ختم غلطی کی ممانے۔ تمہیں شاہ سکندر کے حوالے کر دیتیں تو اچھا تھا آج حویلی والوں کی خدمت میں کرتی پھر توین۔“
 ”میں خدمت میں کر رہی ہوتی۔“ مدحیہ بہت زور سے ہنسی انداز ایسا تھا جیسے یہ کام تم تو کر سکتی ہو۔ میں نہیں۔ اور ہر کھٹلائی۔“
 ”نہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔؟“ مدحیہ اسی طرح ہنستی رہی تب وہ بڑبڑاتی ہوئی لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آ

”ابیں استری نہیں کرو گی۔ صبح کالج سے دیر ہو جائے گی۔“ مدحیہ نے ہنسی روک کر کہا۔
 ”نہ کوئی جواب نہیں دیا۔ مزید اس کی طرف سے کوٹ بھی بدل گئی۔ اگلی شام نبیل اسے اپنے ساتھ لے گیا۔“
 ”اوتار تھے لیکن اسے ہناسا سوچ گیا تھا۔ خود کو ناجائز ظاہر کرتی ہوئی کہنے لگی۔“
 ”یا کہوں نیل بھائی! ان کا انڈر لیرس ہی نہیں مل رہا جب سے کالج سے آئی ہوں تلاش کر رہی ہوں۔ ساری پانچ ماہ رہی۔ پتا نہیں کہاں چھو گیا۔“
 ”نہ۔“ نبیل کچھ کہتے کہتے رہ گئے پھر گہری سانس کھینچ کر بولے۔ ”آرام سے تلاش کرنا جب مل جائے تو

”نہ وہ فوری خطرہ مل جانے پر اطمینان سے ہو گئی تھی لیکن اس کا اطمینان بس دو دن کا تھا۔ اس کے بعد نبیل ڈانٹ کر کھانا شروع کیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ نبیل کے ساتھ وہ کسی صورت نہیں جانا چاہتی بلکہ جانتی تھی کہ وہ خود خاتون سے مل کر رُم ان کے ہاتھوں میں دینا چاہیں گے اور اکیلے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔“
 ”ختم غلطی کی میں نے نبیل بھائی کو بتا کر۔“ اس وقت وہ ان کے ٹوکے پر اپنے آپ پر جھنجھلا رہی تھی کہ ٹوبیہ

”نہ اپنے آپ پر۔“
 ”میں نے تمہاری سانس کی کھشری کے ٹوکے میں۔ فرسٹ ایئر کے۔۔۔“
 ”میں نے تمہیں دے تو دیے تھے۔“ وہ اپنی پریشانی میں بھی ”اس لیے ٹوبیہ کو جواب دیتے ہوئے اس کے لیے“
 ”نہ اپنی سب کے لیے تھے۔ کیسٹری کے تم نے کہا تھا بعد میں لے لینا۔“ ٹوبیہ نے یاد دلایا تو وہ اکتا کر بولی۔
 ”نہ اپنے آپ پر۔“

”نہ اپنے آپ پر۔“
 ”میں نے تمہیں دے تو دیے تھے۔“ وہ اپنی پریشانی میں بھی ”اس لیے ٹوبیہ کو جواب دیتے ہوئے اس کے لیے“
 ”نہ اپنی سب کے لیے تھے۔ کیسٹری کے تم نے کہا تھا بعد میں لے لینا۔“ ٹوبیہ نے یاد دلایا تو وہ اکتا کر بولی۔
 ”نہ اپنے آپ پر۔“

نہیں ہوں، تمہیں اگر بہت ضروری چاہیں تو خود جا کر میرا ریک کھنگال لو۔“ وہ ٹیرس کی طرف جاتی ہوئی۔
 ”ریک تو میں تمہارا کھنگال لوں گی پتہ ہے، بتاؤ تمہیں ہوا کیا ہے اور وہ دو کماں ہے؟“ ثویبہ نے میز پر
 اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا تو اس نے آخری بات کا جواب دیا۔
 ”مدحو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماما سے آرام کرنے کا کہہ گئی ہیں، لہذا وہ آرام فرما رہی ہیں۔“
 ”ابو، بتاؤں کمو۔ تمہیں اس کا آرام فرمانا مائل رہا ہے۔“ ثویبہ ہنسنے ہوئے بولی۔
 ”نہیں، اس وقت وہ کوئی ہانا نہیں کر رہی۔ واقعی میں طبیعت خراب ہے اس کی جا کر دیکھ لو۔“
 ہوئے بائیک کی آواز پر نیچے دیکھا پھر ثویبہ کا بازو ہلا کر پوچھنے لگی۔
 ”یہ سونیا آپلی کماں کی تھیں۔؟“
 ”کسی دوست کے ہاں، ثویبہ جواب دے کر مدحیہ کو دیکھنے اس کے کمرے میں چلی گئی تو اس نے اچھی

یونی پوچھ لیا۔

”کماں جا رہے ہیں۔؟“
 ”چلو گی؟“ ”آخر نے کما تو وہ سمجھی اسے مدحیہ سمجھ کر ہلار رہا ہے جب ہی ہنستی ہوئی بولی۔
 ”مدحو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“
 ”میں غم سے کہہ رہا ہوں۔“ ”آخر نے کھور کر کما تو اس نے اپنی طرف اشارہ کیا پھر چانک کسی خیال
 اسے رکنے کا کہہ کر ہنسنی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھول کر اپنا پرس سمجھ لیا۔
 ”توئی میں ذرا اصرار بھیانی کے ساتھ جاری ہوں۔ میرے آنے تک تم مدحو کے پاس بیٹھنا۔ میں بس اس
 دیر میں آجاؤں گی۔“ وہ بہت عجلت میں ہنستی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔
 * ☆ * ☆ *

وہ آفس سے لوٹا تو آگے عازم کے ساتھ باباجان موجود تھے۔
 ”السلام علیکم باباجان! اس نے سلام کے ساتھ فوراً ”برہہ کر باباجان کے پیر چھوئے تو انہوں نے
 کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔
 ”خوش رہو۔ مصروف زیادہ ہو گئے ہو یا شاہ پور کا راستہ بھول گئے ہو؟“ باباجان نے وعادینے کے لہ
 اتنے مہینوں کی غیر حاضری کو ختم کیا تو وہ سر کھاتے ہوئے بولا۔
 ”کھ کر راستہ کون بھولتا ہے باباجان! بس نئی نوکری ہے، سوچتا ہوں اچھی طرح جم جاؤں پھر تو گھر ہی
 ویسے فون تو میں ہر دوسرے دن کرنا ہوں۔“
 ”ہاں پتا چلتا ہے ہمیں۔“ باباجان نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپکا پھر عازم سے مخاطب ہوئے۔
 ”ہو عازم آجاؤ بابا، پیچہ صاحب اسی وقت ملیں گے۔“
 ”جی باباجان جا رہا ہوں۔“ عازم اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اور دیکھو۔ سات بجے سے پہلے آجاتا۔“ باباجان نے تاکید کی۔
 ”جی۔“ عازم اسے آنکھوں آنکھوں میں جانے کیا اشارہ کرتا ہوا نکل گیا اور وہ ابھی سمجھنے کی کوشش
 کہ باباجان نے اسے مخاطب کر لیا۔
 ”تمہیں اکیلے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“
 ”جی نہیں، بہت آرام سے ہوں۔ اور اپنی جانب سے مطمئن۔ گھر میں اور آفس میں بھی کُل
 ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے پورا اطمینان دلایا۔
 ”لیکن ہم تمہارے اکیلے رہنے سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ جلد تمہاری شادی
 ویسے بھی اب ماشاء اللہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہو اور شادی کی عمر بھی یہی ہے۔“ باباجان جیسے
 رہے تھے وہ اسی قدر بے چین ہو رہا تھا۔

”اس روز تمہارے اماں بابا بھی اسی سلسلے میں بات کر رہے تھے۔ جمائیکر کو شہر مانو کی بیٹی پسند ہے اور تمہاری
 ”بیل کی آواز پر باباجان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے محض اس موضوع سے بچنے کی خاطر اٹھ کر جانا چاہا
 اس سے پہلے ہی کہ ”میں باہر نکل گیا تھا۔“
 ”ہم کیا کہہ رہے تھے۔؟“ باباجان نے اسے دیکھا تو وہ اندر ہی اندر جڑبڑہو کر بولا۔
 ”ابا، ابا، میرے بارے میں غلط سوچ رہے ہیں۔ پہلے انہیں بیٹیوں سے فارغ ہونا چاہئے۔“
 ”کی سا ساتھ ساتھ ہی کر دیں گے۔“ باباجان نے کما تب ہی کرم دین اگر اس سے بولا۔
 ”ابا، کوئی مصاحبت لی لی آئی ہیں۔“
 ”ایک لفظ کو اپنی جگہ سناکت ہوا غالباً“ باباجان کی وجہ سے ورنہ شاید اٹھ کر کھانا پھر بہت سنبھل کر بولا تب
 ”باباجان۔ میری مہمان۔“

”بابا، یہاں کھڑا رکھا ہے مہمان کو۔ جاؤ کرم دین! اندر لے آؤ۔“ انہیں باباجان کرم دین سے کما پھر اسے دیکھا
 ”بابا بولا۔“
 ”میں لے کر آتا ہوں ابھی مہمان کو۔ آپ اگر کچھ دیر آرام کرنا چاہیں تو۔“
 ”نہیں بہت آرام کر چکے، ہم تمہارے آنے سے پہلے۔“ باباجان نے کما پھر گلاس ڈور سے داخل ہوتی لڑکی کو
 لگے جو بہت نروس لگ رہی تھی اور کافی فالصے پر رنگ کر بولی۔
 ”سلام علیکم۔ علی جمائیکر سے آواز پر فوراً پلٹ کر اسے دیکھا اور ایک پل کو باباجان کی موجودگی فراموش کر
 شہ سے مسکرا کر گیا ہوا۔
 ”علیکم السلام، کیسی ہیں آپ۔؟“

”میں یہ۔“ وہ جلدی سے اپنا پرس کھولنے لگی۔
 ”بہت بعد میں۔ پہلے آپ تشریف رکھیں۔“ اس نے کما تو مصاحبت جانے کس خیال کے تحت پلٹ کر
 ”ہال سے باہر دیکھنے لگی۔
 ”ابا، اور بھی سے آپ کے ساتھ۔؟“ اس نے سمجھ کر پوچھا۔
 ”جی نہیں، وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔
 ”بچہ جاؤ پچی، آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔ اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔“ باباجان نے نرمی سے کما تو وہ ایک بزرگ
 ”کچھ کر سکون ہو گئی اور ان کے قریبی صوفے کا انتخاب کر کے وہیں جا بیٹھی۔
 ”ابا، مہمان پچی کے لیے کوئی۔“ باباجان نے اسے مخاطب کر کے اسی قدر کما تھا کہ وہ بول پڑی۔
 ”نہیں شکریہ۔ بس آپ اپنے۔“

”جمائیکر نے ہنسون پر اتنی رگھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر غالباً ”چائے وغیرہ کا کہنے کے لیے فوراً“
 ”سے نکل گیا تھا۔
 ”انت نے ایک نظر باباجان کو دیکھ کر سر جھکا لیا کیونکہ وہ بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے اور
 ”کرم دین نے پوچھنے لگے۔
 ”ہم تمہارے؟“

”بابا۔ مصاحبت شاہ۔“ اس نے بہت سنبھل کر جواب دیا۔
 ”بابا، پڑھتی ہو۔؟“ باباجان جانے بوجہی بات کرنے کی غرض سے سوال کرنے لگے یا باتوں باتوں میں
 ”یہ قصداً اور علی سے تعلق جانا چاہتے تھے۔
 ”کرم دین میں ہوں۔“
 ”تمہارے والد کیا کرتے ہیں۔؟“

”وہ۔۔۔“ پھر زور سے ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے اور بابا جان اپنے طور پر سمجھ کر اٹھ بولے۔

”اوہ نہیں پس۔۔۔“

صباح کے دل کو دھچکا سا لگا۔ فوراً بول پڑی تھی۔

”جی نہیں، میرے والد بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔ شاہ سکندر حیات فرہیاتہ مشرق۔“

بابا جان کی آنکھوں میں اچانک بے پناہ تحیر سمٹ آیا تھا اور ساتھ میں کچھ یقین اور کچھ غیر یقین کی لہر تھی۔ پھر اسی عالم میں بولے۔

”تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہو۔“

”جی۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ میں اپنی ماما کے ساتھ رہتی ہوں۔ میری ماما ڈاکٹر ہیں۔ اور انجانے میں ان پر بڑے انکشاف کر رہی تھی۔“

”ہوں۔“ بابا جان نے پر سوچ انداز میں ذرا سا سر ہلایا پھر پوچھنے لگے۔ ”علی کے ساتھ کب سے دوستی ہے جی نہیں۔ میری کوئی دوستی نہیں ہے۔ میں تو انہیں پیسے دینے آئی ہوں۔ آپ انہیں بلائیں۔“

وہ بولنے کے ساتھ اپنا پرس نکالنے لگی تھی۔ تب ہی وہ خود ڈرائی دھکیلا ہوا آیا تو بابا جان اسے دیکھ لگے۔

”علی! یہ جی تمہیں کس بات کے پیسے دینے آئی ہے؟“

”وہ انہوں نے میرا گھدا ان تو دیا تھا بابا جان!“ وہ سمجھ گیا کہ وہ بابا جان کو اپنی آمد کا مقصد بتا چکی ہے؛ چونکہ بغیر کئے لگا۔ ”اسی کے پیسے دینے آئی ہوں گی۔ ایک بار پہلے بھی بھجوا چکی ہیں جو کرم دین کے نہ تھے۔“

”ہائیں!“ وہ اچھل پڑی۔ ”یہ کرم دین کون ہے؟“

”میرا ملازم اور میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ کی امانت واپس کر سکوں نہ کہ مزید پیسے لینے لے لے۔“ علی جمائیکر نے اس کا پہلے سے بھجوا ہوا الفافہ جیب سے نکال کر اس کی طرف برہمائی لے کر گئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”معاف کیجئے گا، آپ بہت۔“ وہ ایک دم ہونٹ بھیج گئی پھر خامسے جا رہا نہ انداز میں سامنے سے ہوئی تیز قدموں سے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

علی جمائیکر نے کچھ بوکھلا کر بابا جان کو دیکھا پھر اس کے پیچھے آیا تھا لیکن برآمدے ہی میں رک گیا کیونکہ وہ بایک برتن بھٹی نظر آئی تھی اور پھر فوراً ہی بایک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”مائی گاؤ!“ علی جمائیکر اس صورت حال سے خاصا بد دل سا ہو کر مزید آگے بابا جان کا سامنا کرنے پریشان ہو گیا۔ دل چاہا میں سے کہیں باہر نکلا۔ اے اور پھر بابا جان کے جانے کے بعد ہی واپس لوٹے کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں وہ کس طرح دخلت کر کے فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اپنے تایا شاہ یونس حیات کے بیٹے کی آنا ”فانا“ شادی وہ بھولا نہیں تھا اور ابھی با آنے سے پہلے اس کے بارے میں بھی تو کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر پھو شہرانا کی بیٹی یا پھر۔

”اوہ نو!“ اس نے فوراً ”سر جھکا پھر بہت ہمت کر کے اندر آیا۔ بابا جان کسی گہری سوچ میں تھے۔ ابھی نہیں دیکھا۔“

”آپ کے لیے جائے بناؤں بابا جان؟“ اس نے بیٹھنے کے ساتھ کچھ ڈرتے ڈرتے انہیں مخاطب کر کے ساتھ انہوں نے گہری سانس ڈھینچی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”کچھ کہا تم نے؟“

”جی چائے۔“

”ہاں ناؤ، ہم بی بی لیتے ہیں۔ وہ بچی تو ناراض ہو کر چلی گئی۔“ بابا جان نے کہا تو وہ نظریں چرا کر بولا۔

”ہاں وہ میری غلطی ہے۔ مجھے اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔“

”جس سے جانتے ہو اسے؟“ بابا جان کے ہلکے پھٹکے انداز سے وہ ٹھٹھک گیا۔

”میں میں زیادہ نہیں جانتا بابا جان! بس ایک دو باری ملاقات ہوئی ہے۔“

”مجھی لڑکی ہے تمہیں پسند ہے؟“ بابا جان نے اس کے جواب کو یکسر نظر انداز کر کے پوچھا۔

”جی! اس کا جی نہ سمجھنے والا تھا جس پر بابا جان براہ راست اسے دیکھ کر بولے۔“

”مگر نہیں پسند تو پسند کر لو کیونکہ ہم اسے تمہارے لیے پسند کر چکے ہیں۔“

”جی! اس کا تجیر انتہا کو چھو گیا تھا۔“

”ہاں جی جی نگار ہے ہو، ہماری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ وہ لڑکی صبح شاہ اسے ہم جلد سے جلد اس گھر میں لانا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں تمہارا اکیلا رونا پسند نہیں۔“

بابا جان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کما تب بھی اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تمہاری اور صبح کی شادی کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے؟“



”نہیں لیکن میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ علی جمائیکر نے ایک طرح سے اس کے اتنے پتے سے اعلیٰ کا اظہار کیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں اور جتنا جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔“ بابا جان نے کہا تو وہ مزید جرات نہ ہوا۔

”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”ہمارا خون ہے وہ ہمارے سکندر کی بیٹی، سکندر نے تو ہمیں نہیں بتایا لیکن دیکھ لو قدرت نے کیسے ہمارے خون کو ہم سے ملا دیا۔“ بابا جان کی آنکھیں جانے کس خیال سے چمکنے لگی تھیں پھر ایک دم جیسے اپنے اس خیال سے کل کرتے لگے، یہ بات ابھی تم کسی سے نہیں کہو گے۔ خاص طور سے اس لڑکی پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا یعنی اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا تعلق شاہ پور سے ہے۔ سمجھ۔“

”میں کچھ کہیں سمجھ رہا۔“ وہ واقعی الجھ گیا تھا۔

بابا جان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”یہ بات تو ضرور تمہارے علم میں ہو گی کہ سکندر نے یہاں شہر میں بھی شادی کی تھی۔ یہ لڑکی صبح اس کی بیٹی ہے۔ ابھی اس نے ہمیں اپنے باپ کا نام شاہ سکندر حیات بتا دیا ہے اور یہ کہ وہ ہیاتہ مشرق ہیں اس کے بعد کسی نمائندگی کی تلاش نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ سکندر کو اپنی اس بیٹی کے بارے میں علم ہے کہ ہمیں یہ ہم نہیں ہوتا کیونکہ اس نے ہمیں یہ تو بتایا تھا کہ یہاں اس کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ اس کے بعد کبھی کوئی ذکر نہیں کیا ہوتا ہے اس عورت نے چالاکی کی ہو اور سکندر سے بیٹی چھپائی ہو یا بیٹی صورت میں وہ اپنی بیٹی کی صورت میں نہیں دے گی اور ہم ہر قیمت پر اسے حاصل کریں گے۔ تم ہماری بات سمجھ رہے ہو نا۔“

”وہ تو غور سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔“

”بس تو جب تک صاحت اس گھر میں نہیں آجاتی تب تک اس پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا پاتا۔
گے کہ اس کی ہاں تک کیسے پہنچا جائے۔“ بابا جان نے کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔
”اور بچا جان، میرا مطلب ہے، انہیں آپ بتائیں گے یا بے خبر رہیں گے۔“
”ابھی تم کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم بس شادی کی تیاری کرو۔“
بابا جان نے اس کا کندھا تھپکا تو وہ سر جھکا کر کسی خیال سے ہنسکر آیا تھا۔

صاحت واپس آئی تو برآمدے میں بیٹھے نبیل اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔
”تم کہاں گئی تھیں؟“

”احمر بھائی کے ساتھ گلدان والی خاتون کے گھر۔“ وہ کرسی ان کے قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
”میے دے دیے؟“

”نہیں، میرا مطلب ہے میں پیسے دینے ہی گئی تھی لیکن آگے انہوں نے بتایا کہ پہلے میں نے جو
وہ انہیں مل گئے ہیں۔ اصل میں ان کے ملازم نے وصول کیے تھے اور شاید انہیں دینا بھول گیا تھا۔
معدرت کر رہی تھیں۔“ وہ اس صورت حال کے لیے پہلے سے تیار تھی بغیر جھجکے بول گئی۔
”چلو تمہاری بچت ہو گئی اور سنو، آئندہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتانا۔“ نبیل کی تاکید پر
اثبات میں سر ہلایا پھر ایک دم ہاد آتے پر پوچھنے لگی۔

”مدھو کی طبیعت کیسی ہے؟ تو یہ ہے اس کے پاس یا چلی گئی۔“
”کیا وہ مدھو کو؟“ نبیل نے چونک کر دیکھا۔

”دوپہر میں گلے میں تکلیف کی شکایت کر رہی تھی پھر سو کر اٹھی تو بخار بھی تھا۔ ممدو ادے گئی؟
نے گرم پانی سے غرارے کرنے کو بھی کہا تھا جو شاید مجھے کرنے نہ دیں گے۔“ وہ بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو
”کرتے نہیں کروانے۔“ نبیل کے تصحیح کرنے پر وہ ہنستی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔

مدحہ اور ثویہ لڈو کھیلنے میں مصروف تھیں۔ اس نے فوراً ٹوکنے کے بجائے پہلے اپنا پرس المار
کھڑکی سے برآمدے میں لٹکے ہوئے لئے لگی۔

”مغرب کا وقت ہو رہا ہے، کچھ دیر کے لیے کھیل بند کرو۔“

”آگئی بڑی بی۔“ مدحہ اپنی گوٹ چلتی ہوئی بڑی دانی تو ثویہ بے ساختہ ہنسی جس پر وہ اسے دیکھ کر پوچھ
”تم نے اپنے ٹولس تلاش کر لیے؟“

”نہیں یہ گیم ختم ہو جائے پھر کروں گی بلکہ تم دیکھ لو۔“ ثویہ نے کہا۔ تو اس بار مدحہ زور سے ہنس
”کیا ہوا۔“ ثویہ کو اس کی ہنسی سمجھ میں نہیں آئی جبکہ وہ سمجھ گئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عمر کے
کا دھیان ادھر منتقل ہو گیا وہ برآمدے میں نبیل بھائی سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا۔

مدحہ اور ثویہ بھی لڈو چھوڑ کر سننے کی کوشش کرنے لگی تھیں پھر مدحہ اسے دیکھ کر بولی۔
”دیکھو تو صابا! کون آیا ہے؟“

”عمر ہے، پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔“ اس نے کہا پھر جانے لگی تھی کہ عمرو ہیں آگیا۔
”احمر بھائی نہیں ہیں یہاں کہاں گئے؟“ عمر نے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دوست کی پائیگ واپس کرنے گئے ہیں۔ خیریت کیا ہوا۔“ اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔
”ان کا رزلٹ آیا ہے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے انہوں نے۔“ عمر نے خاصے پر جوڑ

توتیوں خوشی سے چیخ پڑیں۔
”وائفی کہاں رہ گئے احمر بھائی، ہم ان سے ٹریٹ لیں گے۔“

”ڈبل ٹریٹ کیونکہ اس کا لڑشپ پر ان کا امریکہ جانے کا خواب بھی سمجھو پورا ہو گیا۔“

نے کہا تو اس بار خوشی کے اظہار میں مدحہ شریک نہیں تھی۔ خاموشی سے صاحت اور ثویہ کو دیکھنے لگی پھر
نے عمر اس کے پاس آ بیٹھا اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”ابھی فوراً تو نہیں جا رہے جو آپ اداس ہو سکیں۔“

”کیوں اداس ہوں گی۔“ مدحہ نے اسے گھور کر دیکھا تب ہی احمر اندر آتے ہوئے بولا۔

”دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔“

”اب نہیں ہے۔“ صاحت نے کہا تو عمر فوراً بولا۔

”صرف اداسی ہے۔ ایک منٹ کے لیے سب خاموش ہو جائیں۔ ذرا مدھو کو گانے دیں ہاں مدھو کیا گاؤ

بانے والے رے شہر ذرا رک جاؤ۔“

نیا قاعدہ گانا شروع کیا تو مدحہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

”رے رے کیا ہو رہا ہے۔“ احمر نے عمر کی جوابی کارروائی سے پہلے ہی اس کا بازو پکڑ کر وہاں سے اٹھا دیا۔ پھر

لب لب کو دیکھ کر بولا۔ ”نہیں تم لوگوں کو خوش خبری سنانے آیا تھا لیکن اب ہمیں بتاؤں گا۔“

”ہائیں۔ ہم پھر بھی ٹریٹ ضرور دیں گے۔“ ثویہ نے کہا تو احمر نے چونک کر اسے دیکھا پھر کرسی کھینچ کر بیٹھتے

”ایک خبر پہنچ گئی۔“

”بہت بہت مبارک ہو اور اب جلدی سے بتائیں، ٹریٹ کب دے رہے ہیں۔“ صاحت نے

نے ساتھ فوراً ٹریٹ کا مطالبہ کیا۔

”جی میں دوں۔“ احمر نے بول دیکھا جسے اس نے الٹی بات کہہ دی ہو۔

”نہیں تو تیار ہو دیں گے۔ جی نہیں، آپ کو دینی ہوگی اور زبردست قسم کی، ابھی پروگرام بنائیں۔“ صاحت

نے شور مچایا تھا۔

شور سن کر کمرے میں آئے اور دونوں کو خاموش کرانے کے بعد پوچھنے لگے۔

”حاصل ہے؟“

”سپاس ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔“ احمر نے کہا تو صاحت پھر چیخ پڑی۔

”میں ہمہما قاعدہ خوشی منانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”جیب خرچ پر۔“ احمر نے غلڑا لگایا تو نبیل بے ساختہ مسکرائے پھر آگے آکر مدحہ کے بیڈ پر بیٹھتے

”وائفی زیادتی ہے۔“

”کیوں نبیل بھائی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے احمر بھائی نے تو کیا اس خوشی میں ہمیں ٹریٹ

”بس۔“ صاحت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو نبیل نے اس کی بھی تائید کر دی۔

”اچھا ہے۔“ پھر مدحہ کی خاموشی محسوس کر کے اسے ٹوکا۔ ”کیوں مدھو! تم کیوں خاموش ہو کیا تمہیں احمر

”خوش نہیں ہوئی۔“

”بہن! سن کر تو بہت خوش ہوئی تھی۔“ مدحہ سے پہلے عمر بول پڑا۔ ”لیکن جب احمر بھائی کے باہر جانے کا

”بہن! سن کر تو بہت خوش ہوئی تھی۔“

”چونکہ کر مدحہ کو دیکھا تھا جو عمر کی بات سن کر انجان بننے کی کوشش کرنے لگی تھی اور جب کامیابی

”بہن! سن کر تو بہت خوش ہوئی تھی۔“

”بہن! سن کر تو بہت خوش ہوئی تھی۔“

”بہن! سن کر تو بہت خوش ہوئی تھی۔“

ہے کہیں تم اسے بھی کمزور بنا دو۔“ عمر نے لڑنے کے انداز میں کہا۔
 ”بس، اب لڑنا مت شروع کرو۔ نیل بھائی منع کریں انہیں۔“ صاحت نے بد مزگی کے ذرا غفلت کی تو نیل نے تنبیہ کرنے میں دیر نہیں کی۔
 ”ہاں، بھی یہ لڑنے کا موقع نہیں ہے، آرام سے بات کرو۔“
 ”میں آرام سے ہی بات کر رہا تھا اور کوئی غلط بات بھی نہیں کی آپ خود دیکھ لیں مدحو کے چہرے
 ”باس۔“ نیل نے ہاتھ اٹھا کر عمر کو بولنے سے روک دیا پھر کہنے لگے۔
 ”بات ہو رہی تھی باقاعدہ خوشی منانے کی اور وہ بھی احمر کے خرچ پر۔ اب احمر سے پوچھنا یہ نہ
 کرنے پر اعتراض کیوں ہے۔“
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نیل بھائی! آپ جب چاہیں مجھ سے ٹیٹ لے لیں۔“ احمر نے
 باری باری سب کو دیکھ کر بولے۔
 ”لو احمر تو تیار ہے۔ اب تم لوگ پروگرام سیٹ کر لو۔ لیکن کوئی لمبا چوڑا پروگرام مت بنالیا!
 پارٹی ٹھیک رہے گی۔ کیوں مدحو؟“ آخر میں انہوں نے بلا ارادہ مدحیہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ کندھے
 سے بولی۔

”مجھے کیا پتا۔“
 ”مدحو کو نہیں چھینس نیل بھائی! آپ کو پتا تو ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ صاحت
 کہ کوئی محسوس نہ کرے فوراً بات بناتے ہوئے بولی ”ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ مدحو کسی پروگرام میں
 نہیں چلو مدحو! تم آرام کرو اور ان تم نے دوائی کہ نہیں۔“
 مدحیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”بہت اے کچھ کھلا دو پھر دیتا۔“ نیل اٹھتے ہوئے بولے تو ان کی تقلید میں احمر بھی کھڑا ہوا
 بچا کر مدحیہ کو جانے کیا اشارہ کیا کہ اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا تھا۔

* * *

رات کے کھانے کے بعد شاہ سکندر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ ان کی بیٹی الماس
 کے بولی۔

”ماما! آپ کو بابا جان یاد کر رہے تھے۔“

”جی ہاں! آپ انہوں نے رک کر پوچھا۔“

”جی کہہ رہے تھے کھانے کے بعد آپ ان سے مل لیں۔“ الماس نے کہا تو انہوں نے خواہ
 جان کے کمرے کا رخ کیا کیونکہ اس وقت وہ سیاسی حالات پر باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں
 جان کے پاس جب سے وہ فشر بنے تھے ہی ایک موضوع تھا۔

”السلام علیکم بابا جان!“ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کرنے کے ساتھ پوچھا
 ہے؟“

”اب تو ہم تمہیں یاد ہی کرتے ہیں۔ ملاقات تو کبھی کبھار ہوتی ہے۔ آؤ بیٹھو۔“ بابا جان کا
 تھا۔

شاہ سکندر خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئے تو بابا جان نے پہلے وہی سیاست کا موضوع چھیڑ
 لگے۔

”ہر دوسرے دن کی آمد و رفت سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کراچی ہی میں رہائش اختیار کرنا
 وہیں لے جاؤ۔“
 ”نہیں بابا جان! اول تو یہ آمد و رفت کوئی مسئلہ نہیں ہے دوسرے مرنساء بھی کراچی؟“

”شاہ سکندر نے کہا تو بابا جان قصداً ”تعب کے اظہار کے ساتھ بولے۔
 ”میں مرنساء آمادہ کیوں نہیں ہوگی۔ کیا اسے ابھی بھی کوئی خدشہ ہے۔؟“

”خدا خدشہ۔؟“ شاہ سکندر فوراً ”سمجھ نہیں پاتے۔“

”دو جو تم نے ایک غلطی کی تھی۔ ہمارا مطلب بے شادی۔“ بظاہر بابا جان کا انداز سرسری سا تھا۔

”شاہ سکندر ہونٹ بھیج کر دوسری سمت دیکھنے لگے، وہ بھولے نہیں تھے، لیکن اتنے برسوں بعد بابا جان نے ذکر
 کے انہیں اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔

”اب تو مرنساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”میں متوجہ کیے بغیر کہا پھر جیسے یاد کرتے ہوئے بولے۔ ”اس سے بھی تو تمہاری اولاد تھی۔ وہ کیا نام تھا اس ڈاکٹری
 بابا آئیہ۔“

”شاہ سکندر نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ کسی
 م مقصد سے یہ موضوع لے بیٹھے ہیں اور انہیں اپنی طرف دیکھتے یا کر بابا جان پوچھنے لگے۔

”ہاں اسے اس کے پاس بیٹھا بیٹی۔“

”مجھے نہیں معلوم، جب میں نے اسے طلاق دی تھی۔ اس وقت وہ ماں نہیں بنی تھی۔“ شاہ سکندر نظریں چرا
 روئے تھے۔

”بعد میں بھی تم نے معلوم نہیں کیا۔؟“ بابا جان کی کھوجتی ہوئی نظریں ان کے چہرے پر جم گئیں اور وہ بہت
 رنے کے بعد بولے تھے۔

”نہیں اور کیوں معلوم کرتا جب آپ اسے اپنا، اپنے خاندان کا نام دینے پر تیار ہی نہیں تھے پھر اس کے لیے
 تر تھا کہ وہ صرف اپنی ماں کو بچانے اور بس۔“

”وہ بے شک اپنی ماں کو بچانے لے لیکن خود اسے اپنی بچان کے لیے کیا باب کے نام کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بے
 کے نام کی اولاد کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا سکندر۔ فرض کرو اگر کوئی بیٹی ہوئی تو کون شادی کرے گا اس سے۔؟“ بابا

نے ایک بار پھر ان کی شہرہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کہ وہ چکر لگے۔

”ایکایک کرنا چاہتے ہیں آپ۔؟“

”ہی کہ اپنی اولاد کو لاوارثوں کی طرح مت چھوڑو۔ اگر بیٹا ہے تو اسے اس کا حق دو تاکہ وہ اپنی زندگی سنوار سکے
 لڑتی ہے تو اسے یہاں لانے کی تدبیر کرو۔ اپنا اپنے خاندان کا نام دے کر اسے رخصت کرو گے تو ساری زندگی
 بارے کی وہ دور نہ۔“ بابا جان نے قصداً ”بات ادھوری چھوڑ کر انہیں دیکھا تو وہ بمشکل سنبھل کر کہنے لگے۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے بابا جان! لیکن ہمارا اب کوئی اختیار نہیں کیونکہ میں نے آئیہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں
 لی زندگی میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اس کے بعد بھی اگر میں ان کے در پر سوالی بن کر جاؤں تو یہ بھی وہ کسی
 نہ پر اپنی اولاد کو یہاں بھیجے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اس بات کو یقیناً ختم کر دیں۔

”بچی کبھی ذہین خاتون بنتیں انہوں نے یقیناً ”اولاد کی اچھی پرورش کی ہوگی اور آئندہ بھی اس کے لیے دینی
 نیک کر سکیں گی۔“

”تو بھی اچھی پرورش کرے باپ کا نام دے بغیر اولاد کو کہیں بھی باعزت مقام نہیں دلا سکتی۔ خصوصاً بیٹی
 بابا جان نے کہا تو شاہ سکندر نے یوں ہونٹ بھیجے جیسے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا ہو۔

چند منٹ خاموشی چھائی رہی۔ پھر بابا جان ہنکارا بھر کر بولے۔

”یوں تم اگر خود کو آئیہ سے کہے وعدے کا پابند سمجھ کر اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے
 یہ معاملے سے دور رہو، ہم خود کوئی تدبیر کر لیں گے۔“

”نہیں بابا جان! اب آپ کچھ نہیں کریں گے۔“ شاہ سکندر فوراً ”بولے تھے۔ ”میں نے آپ کے کہنے پر آئیہ
 نکلنے کی شرط پڑی تھی کہ آپ بھی اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے اور آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”یاد ہے ہمیں، بھولے نہیں ہیں۔ ہمیں اس عورت سے کوئی سروکار نہیں، ہم صرف تمہاری اولاد کی سوچ رہے ہیں۔ تمہیں بھی سوچنی چاہیے۔ اگر کہیں ہے تو اس کے لیے اسی جوتلی میں رشتے موجود ہیں۔ جاگیر کے بیڑوں میں سے تم جس کے ساتھ کوئے ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ اس طرح تمہاری بیٹی کی شادی قریب رہے گی لیکن مسئلہ وہی ہے کہ وہ عورت آسہ نہیں مانے گی۔“ بابا جان نے دھیرے سے بات کرتے ہوئے آخر میں کچھ شغریں کما تھا۔

شاہ سکندر پر سوچ انداز میں انہیں دیکھے گئے بولے کچھ نہیں۔

”اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہیں بیاہی جاتیں، ہم آسہ کے ساتھ کوئی کرنے نہیں جا رہے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو اسے بیٹی بیاہنی ہوگی۔ ساری زندگی اپنے پاس تو نہیں بٹھا رہے گی۔ پھر کیوں نہ اس بیٹی کو اس کا اصل گھر اصل مقام مل جائے۔ ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں۔“

بابا جان نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے شاہ سکندر کو سوچوں کے بھنور سے نکالا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن۔“

”تم صرف ہائی بھرو۔“ بابا جان فوراً بول پڑے۔ ”باقی سارے کام ہمارے اور ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ آسہ سے بیٹی چھین کر نہیں لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جمائیکر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے۔“

شاہ سکندر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ان بات میں سر ہلایا پھر محض اپنی بات رکھنے کی خاطر کہنے لگے۔

”اب تا نہیں بابا جان“ آسہ کے پاس بیٹی ہے یا بیٹا۔“

”ہم معلوم کر لیں گے۔ بیٹا ہوا تب بھی ہم اس کے لیے بہت کچھ کریں گے۔“ بابا جان نے اندر ہی اندر منہ ہمو کر کہا تھا۔

”اچھی بات ہے اب آپ آرام کریں۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے اور شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکلے ان کے ذہن پر اپنی ہی بات دستک دینے لگی تھی۔

”جیسے آسہ آئیں گے کیا سوچا ہے اگر ہماری بیٹی ہوئی تو ہم اس کی شادی علی جمائیکر کے ساتھ کریں گے۔“ علی جمائیکر کے لیے یہ انکشاف بڑا خوش کن تھا کہ صحبت اس کی عمر زاد ہے اس کے بعد بابا جان نے اس کے ساتھ اس کی شادی کا طے کر کے تو گویا اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی ہو۔ کیونکہ اس کے پیش نظر صرف اپنی خوشی نہیں تھی۔ وہ اس سے بھی اس کی فزونی معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس پر اپنا آپ ظاہر کرے۔ وہ اپنے اسی پرانے شام لاہوری جانے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس روز یہاں سے وہ جو کتابیں لے گئی تھیں۔ وہ واپس کرنے آئے گی اور وہ انہی بھی تو آپس میں نہیں تھیں اس کے ساتھ دوسری لڑکی کو دیکھ کر وہ خاصا جڑ بڑھا پھر نظر ہار اٹھا۔ سارا دھیان اس پر رکھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب آسہ تو وہ دوسری لڑکی ادھر ادھر ہوگی۔

وہ دونوں کتابیں دیکھتی ہوئی اس کی پشت پر الماری کے پاس آکھڑی ہوئیں تو اس کا دل چاہا ساری دامن چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے اور بغیر کسی تہدید کے پوچھنے کہ وہ اسے کیسا لگتا ہے اور ابھی وہ اسے نہ جانتا کہ گزرنے سے باز نہ کھینے کی سعی کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی دوسری لڑکی آگے بڑھتی نظر آئی فوراً ”کرسی دھکیل کر اٹھا اور اس کے برابر کھڑا ہوا کہ سابقہ انداز میں اسے متوجہ کیا۔

”ہیلو۔“

صحبت نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً ”نظر انداز کر کے ٹوبہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی تو وہ مجھ اگلی شخص سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔

”آپ کی دوست ادھر جا رہی ہیں، جانے دیں یا اگر پکارنا چاہیں تو بے شک پکاریں گی کیونکہ مجھے جو کتابیں...

نے بھی کہہ سکتا ہوں۔

”یہ کتابیں آپ کو؟“ صحبت کچھ گھبرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”جیت کچھ ہے لیکن اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کی طرف سے یہ باتوں کے آپ مجھے نا پسند نہیں کرتیں۔“ وہ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر سوالیہ نشان بن گیا۔

”کابل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا تھا بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔

”آر میں یہ یقین نہ دوں تو؟“

”مجھوں گا آپ کے دل کی ہستی میں پہلے ہی کوئی اپنے نام کے پھول کھلا چکا ہے جس کی محبت میں آپ نے نکل چکی ہیں کہ۔“

”نہیں۔“ وہ بے اختیار اس کی بات کاٹ گئی۔ پھر احساس ہونے پر نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو بارے میں کچھ قیاس کرنے اور مجھے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”نہیں مجھے یہ حق میری محبت نے دیا ہے جس کا میں پوری ایمانداری سے اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ی کر رہا ہوں اور جب تک آپ جواب نہیں دیں گی میں یونہی قیاس کرتا رہوں گا اور ہر دوسرے موڑ پر ہلوں گا بھی ضرور۔“ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

نت نے ذرا سی پللیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر ٹوبہ کو دیکھنے لگی جو شیشے کی الماریوں میں باقی آخری سرے تک چلی گئی تھی۔

”کیس کی نہیں آپ؟“ اس نے ٹوکا تو صحبت نے ٹوبہ کی طرف سے دھیان ہٹا کر پھر اسے دیکھا اور نفی دیا تو وہ یوں کا سوال اٹھانے کے بجائے پوچھنے لگا۔

”نہیں گنجیج ہیں۔“ صحبت نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا تو وہ بہت مطمئن سا ہو کر بولا۔

”ایک آخری بات میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔“

”نا افسوس۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تو اس کے لیے کو دیکھتے ہوئے علی جمائیکر دھیرے سے مسکرایا تھا

”اس کے چہرے پر اتنے رنگوں کی قوس قزح دیکھ چکا تھا۔

”یوں کہاں چلی گئی تھیں۔“ وہ ٹوبہ کے ساتھ کھرمیں داخل ہوئی تھی کہ مدیجہ نے چلا کر پوچھا۔

”نہیں۔“ ٹوبہ نے مختصر جواب دے کر وہیں پر آمدے میں بیٹھ گئی تھی۔

”میں جاسکتی تھیں۔“ مدیجہ نے اس کی طرف سے نمونہ انداز ہنوز تھا جو اسے سخت ناگوار گزرا پھر بھی طے سے بولی۔

”میں نے پوچھ لیا تھا اور تم سو رہی تھیں ورنہ جاتے ہوئے تمہیں بھی ضرور بتا کر جاتی گو کہ یہ کوئی ایسا شخص کیا۔“ عمر سنتا ہوا آگیا اور اس کی تائید کرنے کے بعد مدیجہ کو دیکھ کر بولا۔ ”تم کیا اس کی دادی ہو جو بدعرب جاتی ہو۔“

”میں حق میں مت بولا کرو۔“ مدیجہ نے اسے ٹوکا تو وہ لڑنے کے انداز میں کہنے لگا۔

”صرف تمہارا نہیں ہے سب کا ہے ایسا میرا کیا غریب سب جاسکتے ہیں وہاں کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔“

”تو بے ساختہ ہنس اٹھی تھی۔

”مدیجہ نے نکتہ سے سر جھکا کر کہا۔“ تمہاری فضول باتوں پر فضول لوگ ہی ہنستے ہیں۔“

”مطلب ہے ایک تمہیں چھوڑ کر باقی سب یہاں فضول ہیں بابا باب۔“ عمر خاصے بے دھتکے انداز میں ہنسا

”یہ مزید سبک کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ صحبت فوراً بول پڑی۔

”ایسا کوئی مطلب نہیں ہے عمر! یہ صرف تمہیں اور مجھے فضول سمجھتی ہے اور میرا خیال ہے غلط بھی ہے۔“

”تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔“ عمر نے کہا۔

”اچھا اچھا اس وقت نہیں پھر کبھی فرصت سے ثابت کرنا ابھی تو مجھے اور بہت کام ہیں۔“ صاحبزادہ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آئی اور پہلے لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں اپنے کمرے میں رکھیں پھر باہر پوچھنے لگی۔

”مدحو کو کیا ہوا ہے بوا۔؟“

”بوا اسے کیا پوچھ رہی ہو مجھ سے پوچھو۔“ عقب سے مدحیہ نے کہا تو اس نے فوراً پلٹ کر دیکھ کر

”ہاں تم ہی بتاؤ۔“

”تمہیں یاد نہیں ہے، دوسرے میں ہم نے کیا پروگرام بنایا تھا پھر تم ٹوبہ کے ساتھ کیوں چلی گئیں۔؟“

”کما تو وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔“

”وہ سواری سواری مدحو مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا، چلو ابھی چلتے ہیں۔“

”جی نہیں، تمہارے ساتھ تو اب میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ نے غصے سے کہا۔

”تمہاری مرضی ویسے پرمانے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں انسان ہوں، بھول ہو گئی مجھے بھی کر رہی ہوں اس کے بعد بھی تمہارا غصہ نہیں جاتا۔“ وہ تاسف سے کہتی کچن میں داخل ہو گئی اور چائے کا پانی رکھ کر بوا سے پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی کہاں گئے ہیں بوا۔؟“

”پتا نہیں بیٹا۔ ابھی تمہارے بڑے ماموں کا فون آیا تھا، وہ بھی پوچھ رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ بہت دنوں سے ان کی طرف نہیں گئے۔“ بوا نے کہا تو وہ خاصی متعجب ہوئی۔

”ہائیں، نیل بھائی بڑے ماموں کے ہاں نہیں گئے تو پھر روزانہ کہاں جاتے ہیں۔“

”کہیں بھی جاتے ہوں، تمہیں کیا۔“ دروازے کے پاس کھڑی مدحیہ نے ٹوٹنا ضروری سمجھا، اندر چلی گئی تو وہ کچھ بے خیالی میں بوا کو دیکھنے لگی۔

”تھک تو ہے بیٹا، تم کیوں پریشان ہوئی ہو۔ نیل میاں کوئی بچہ تو نہیں ہیں۔“ بوا نے اپنی کچھ، اسے تسلی دی تو وہ چونک کر بولی۔

”میں پریشان نہیں ہو رہی بوا۔ خیر چھوڑیں، یہ باتیں آپ چائے پیئیں گی۔“

”نہیں اور مدحو کے لیے بھی نہیں بنانا۔ وہ ابھی پی کر نیچے گئی تھی۔“

”اس کے لیے تو میں ویسے بھی نہیں بناؤں گی۔“ اس نے کہا پھر صرف اپنے لیے ایک گلاس ملے، ٹیس کی طرف نکل آئی۔

ابھی شام پوری طرح نہیں اترتی تھی۔ وہ ریٹنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور چائے دھیرے دھیرے پینے لگتا۔ یہ بھی لگی تھی۔ کوئی خوبصورت سا گیت تھا۔ جس کے بولوں میں ہونٹوں کی بیگانہ ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ شام گہری ہو چکی تھی۔ بوا نے آکر لائٹ جلائی تب وہ بری طرح جھجھکی۔

”یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو بیٹی۔؟“ بوا نے غالباً ”یونہی پوچھ لیا تھا جب ہی جواب کا انتظار کیا۔“

”گئیں۔“

اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سرو اٹھا لیا تو نظروں کے عین سامنے شام کا پہلا ستارہ جھلک رہا تھا۔ اس کے ہونٹ آپ آپ مسکراتے لگے تھے کہ لگا ستارے کی جگہ اس چہرے نے لے لی جس نے تلے تلخ کر لینے والی آنکھیں بولنے لگی تھیں۔

”مجھے یہ حق میری محبت نے دیا ہے۔ جس کا میں پوری ایمان داری سے اعتراف کرتے ہوئے کر رہا ہوں اور جب تک آپ جواب نہیں دیں گی۔ میں یونہی قیاس کرتا رہوں گا اور ہر دوسرے

ملوں کا بھی ضرور۔“

”خبر اگر سیکھیں، جیکس پھر دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہی آنکھیں تھیں۔“

”آخری بات کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں۔“

”اگر کوئی خوبصورت جواب سوچنے لگی تھی کہ نیل کی اسٹک کی آواز نے ایک لحظہ اس کے ذہن کو خاموشی میں تنگ ملک کی آواز بہت واضح تھی۔ وہ سنبھل کر یوں بیٹھ گئی جیسے ان کی آمد سے بے خبر ہو۔“

”ابچہ انھوں نے نیل کے پکارا تھا۔“

”اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔“

”نیل نے گئے تھے آپ؟ بتا کر بھی نہیں گئے۔“

”نیل نے مدحو سواری بھی اور تم۔“ ابھی بات ان کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ بول پڑی۔

”مدحو کے ساتھ لائبریری گئی تھی۔“

”نیل نے بولے بتایا تھا تم نے اور اب مدحو کہاں گئی ہے۔؟“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل نے بولی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”کیوں نہیں بھائی، اس میں اتنی رازداری برتنے کی کیا بات ہے۔“

”ہے یا نہیں، یہ بتاؤ احمر کے دیزے کا کیا ہوا۔؟“ نیل نے فضول بحث چھوڑ کر کام کی بات پوچھ کر ایک لٹ بدل گیا۔
”مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے نیل بھائی، ان ہی سے معلوم کیجئے گا۔“
”اچھا آئے تو بھیجنا اسے میرے پاس۔“ نیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر اپنے کمرے کی طرف ہوئے رگ کر بولے۔

”صبا! پھوپھو آئے والی ہوں گی کھانا لگا دو۔“
”جی اچھا۔“ وہ انہیں جواب دے کر عمر کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”سنو کھانا ہمارے ساتھ کیا رہا تمہارے پسندیدہ کو فٹے بنائے ہیں۔“
”ساتھ میں کیا ہے روٹی یا چاول۔؟“

”دونوں، چلو اٹھو ماما آ رہی ہیں۔“ اس نے ریڈنگ سے آسیر کی گاڑی دیکھ کر کہا پھر بھاگ کر کچن کا رخ کیا بابا جان نے شاہ جہانگیر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور ایک طویل عرصے بعد ان کے انداز میں وہی راز جیسی شاہ سکندر کو آسیر کے حصار سے نکالنے میں انہوں نے برتی تھی۔ جسے شاہ جہانگیر نے ان کے داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا اور مست انجان بن کر بیٹھتے ہی اپنی مصروفیات جو محل سے سننے کے بعد بابا جان بولے تھے۔
”تم نے ہمیں اتنا بے خبر کیسے سمجھ لیا جہانگیر! ہم صرف اپنی اولاد ہی کی نہیں اولاد کی اولاد کی بھی خبر جو تم نہیں رکھتے۔“
”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں بابا جان! ہم از کم میں اپنی اولاد سے بے خبر نہیں ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”اچھا پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ شہر میں تمہارے بیٹے علی نے جو لڑکی پسند کی ہے وہ کون ہے۔“ نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چلا گئے۔
”علی نے شہر میں۔۔۔ نہیں بابا جان، آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہوگی۔“
”ہمیں کسی نے اطلاع نہیں دی جہانگیر! خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں اس لڑکی کو اور اس میں جاننے کے بعد یہ فیصلہ بھی کر چکے ہیں کہ علی کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔“
بابا جان نے حتیٰ انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر شاہ جہانگیر سے اختلاف کا حق ہی جیت لیا البتہ ان کے سوال اٹھ رہے تھے جنہیں سوچنے کے بعد وہ کہنے لگے۔
”میں نہیں سمجھتا بابا جان! کہ آپ نے یہ فیصلہ علی کی محبت میں کیا ہو گا کیونکہ محبت کو آپ نے نہیں بنے دیا۔ اگر ایسا ہو تا تو آج سکندر کی دوسری بیوی یہاں موجود ہوتی۔ آپ اسے طلاق نہ دلاؤ گے۔“
”بابا جان نے ان کی بات سکون سے سن کر بکا راز بھرا پھر کہنے لگے۔
”ٹھیک سمجھتے ہو تم ہمارے فیصلوں میں محبت کی کمزوری شامل نہیں ہوتی اور ابھی بھی ہم نے علی کو نہیں سوچا بلکہ وہ لڑکی جسے علی پسند کرتا ہے اسے اس حویلی میں لانا مقصد ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا خون سکندر کی بیٹی۔“

”آپ کا مطلب ہے۔“ شاہ جہانگیر اس انکشاف پر بس اسی قدر کہہ سکے۔
”ہاں اسی شہزادی ڈاکٹری کی اولاد جس کے بارے میں سکندر کو بھی معلوم نہیں تھا ہم نے بتایا ہے بھی کہ اس کی بیٹی کو ہم علی کے ساتھ بیاہ کر لیں گے۔“ بابا جان اسی سکون سے بول رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بابا جان لیکن آسیر، وہ اپنی بیٹی ہمیں دینے پر کیونکر آمادہ ہوگی۔“ شاہ جہانگیر نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا جو ادرہ پہلے سے موجود تھا۔
”یہ سوچنا ہے ہمیں کہ اس سے بیٹی کس طرح حاصل کی جائے۔ سکندر سے ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ آسیر سے بیٹی لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جہانگیر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے اور ہم اپنے وعدہ سے پھر تے۔ تم کوئی ایسی تدبیر کرو کہ آسیر اس رشتے پر راضی ہو جائے۔“ بابا جان نے کہا تو ان کی آخری بات جہانگیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”ناممکن۔“
”یہاں کچھ ناممکن نہیں ہے جہانگیر! ہمیں ہر قیمت پر اس لڑکی کو حاصل کرنا ہے اور سکندر سے کیے وعدے کا پتہ۔“ بابا جان نے ان کے ناممکن کہنے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ کہا تھا۔
”جہانگیر خاموش ہو کر سوچنے میں لگ گئے۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت پوچھنے لگے۔
”ابا! لڑکی جانتی ہے کہ علی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔؟“

”نہیں اور ہم نے علی کو حتیٰ سے منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ اس پر اپنا آب ظاہر نہ کرے اور نہ اس کے سامنے اپنی شاہ پور کا ذکر کرے۔“ بابا جان نے کہا تو شاہ جہانگیر فوراً ہٹوئے تھے۔
”پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے بابا جان، ہم کسی اور کے ذریعے سے یہ رشتہ طے کروا لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہمارے خاندان کا کوئی اور فرد کیونکہ آسیر اور اس کے گھر والے سکندر کو جانتے ہیں یا پھر انہوں نے مجھے دیکھا۔“

”ہوں۔“ بابا جان کتنی دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔ ”تم اپنی بیگم اور بیٹی کو علی کے پاس لاؤ اور انہیں سارا معاملہ سمجھا کر بیگم سے کہو کہ وہ آسیر سے راہ و رسم بڑھا کر اس سے بیٹی مانگے، ہمیں یقین ہے علی یہاں فائق لڑکے کے لیے انکار نہیں ہوگا۔“
”غرض آسیر کو شہ نہ ہو تو۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”اں کے لیے سب سے زیادہ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی، سمجھتے تم۔“ بابا جان کے لہجے میں تنبیہ۔
”بالکل سمجھ گیا بابا جان اور اب مجھے عارفہ (بیگم) کو سمجھانا ہے۔“ شاہ جہانگیر جیسے نئی مہم کے لیے تیار ہو کر بیٹھے۔

مزید کی غیر معمولی طویل خاموشی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے احمر اپنی ساری باتیں کا کام ہو کر آخر میں جھنجھلا گیا تھا۔
”تو اس کے لیے مددجو! کچھ بولو ورنہ میں سمندر میں کود جاؤں گا اور یہ صرف میری دھمکی نہیں ہے میں جو کہتا ہوں اسے عمل کرنا ہوں۔“

”میرا ذہن سورج سے نظریں ہٹا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کیا پولوں اور وہ سمجھ کر کہنے لگا۔
”تو مجھے مشلا۔“ یہ کہ تم میرے جانے سے اواس ہو اور یہ کہ باہر جا کر میں تمہیں بھول نہ جاؤں۔ روزانہ خط لکھ دو۔“

”کیا۔“ وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”میں کوئی روزانہ دو زانہ نہیں لکھوں گی۔“
”پوچھنے میں ایک۔“ احمر نے اس کی خاموشی ٹوٹنے پر دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے کہا۔
”جواب دینے میں ایک خط لکھنے میں پورا ایک ہفتہ لگتا ہے اس کے بعد پوسٹ کروانے میں آج کل، آج کل کے پتے پر پہنچنے میں دن بھر لگتے ہیں۔ اس حساب سے آپ کے پندرہ خطوں کے جواب میں میرا ایک خط آپ پہنچے گا۔“ مدحیہ نے بغیر کسی عذر کے کہا۔

”کیسی لڑکی، میرا دل رکھنے کی خاطر ہی کہہ دیتیں کہ روزانہ خط لکھو گی۔“ امر کے لیے میں ہلکا سا ہنسی
 ”چلیں اب کہہ دیجیے ہوں روزانہ لکھوں گی۔“ اس کے نروٹھے سے انداز پر وہ گہری سانس کھینچ کر بولا
 ”تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔“
 ”زبردستی رکھو آئیں گے تو ایسے ہی رکھوں گی ناں۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو احرام لیا
 ساختہ ہنسا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”کیا چاہتی ہو تم؟ سارا وقت تمہاری خوشامد کرتا رہوں۔ پہلے دو گھنٹے تم نے خاموشی میں گزار دی
 ناراض ہو رہی ہو۔ اگر اسی طرح کرنا تھا تو آئی کیوں نہیں میرے ساتھ۔“
 ”یہ آئی تو آپ ناراض ہوتے۔“ وہ اسی طرح منہ پھلا کر بولی تھی۔
 ”اگر میری ناراضگی کی پروا ہے تو فوراً اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ ورنہ میں جانے کے وقت تک تم سے کوئی
 کروں گا۔“ امر کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ کچھ خائف سی ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”آپ بہت خراب ہیں ایک تو مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“
 ”ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا۔“ وہ فوراً بولا تھا ”اور پھر تمہارے لیے ہی جا رہا ہوں، تمہیں بائیکس
 ہے۔“
 ”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہاں سے گاڑیاں لے کر آئیں گے۔“
 ”خریدنے کے قابل تو بن کر آؤں گا ناں اور پھر تم جس گاڑی پر ہاتھ رکھو گی وہی تمہاری بس تم میر
 کرتی رہنا۔“ کوئی ناں۔“ امر نے جھٹک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے فوراً اپنا چہرہ دوسری
 لیکن اس کی آنکھوں میں تیرتی ہی وہ دیکھ چکا تھا۔
 ”تم آج بدحو! اگر اس طرح کرو گی تو میں اپنا جانا کینسل کر دوں گا۔ بے وقوف لڑکی! دو سال کی تو باند
 یوں گزر جائیں گے۔“ امر نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتی تو وہ مزید سر جھکا کر پلکوں تک آنکھ
 پر میٹھے لگی۔
 ”چلو اب یہاں بیٹھنا خطرناک ہے۔ لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ احرام کا دھیما
 خاطر اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”پانی میں چلو گی؟“
 وہ نفی میں سر ہلا کر اپنا دوشہ سنبھالنے لگی جسے تیز ہوا اڑائے لیے جاری تھی بس ایک سر اس
 تھا۔
 امر نے برہم کر دوپٹے کا دوسرا سر اٹھام لیا اور اس کی گردن میں لپیٹ کر آگے بڑھ گیا تو وہ قدرے س
 اس کے پیچھے چلنے لگی۔
 ”آؤں گے تمہیں کچھ اور۔“ بائیک کے قریب رک کر امر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تو اس
 دل رکھنے کی خاطر قصداً ”مسکرا کر بولی۔
 ”کچھ اور۔“ لیکن میں کچھ نہیں بتاؤں گی یعنی جو آپ کا دل چاہے۔“
 ”اچھی بات ہے چلو۔“ امر نے بائیک اشارت کر کے اسے اشارہ کیا کہ اس کے بیٹھے ہی اسپیڈ
 دی تو وہ چیخ پڑی۔
 ”آہستہ۔ میں گر جاؤں گی۔“
 امر پر اس کے چیخنے کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مظلوظ ہو رہا تھا جب ہی بائیک کو دائیں بائیں لہرا
 اپنے فیورٹ ریٹورنٹ کے سامنے رکا تو وہ فوراً اچھل کر اس سے دور جا کھڑی ہوئی اور خوشوا
 گھورتے ہوئے بولی۔
 ”بس میں آج آخری بار آپ کے ساتھ آئی تھی۔ آئندہ کبھی کہیں نہیں جاؤں گی اور مجھے کچھ
 ہے میں جاری ہوں۔“

”رے۔“ امر بایک بند کر کے اس کے قریب آیا۔ ”کہاں جا رہی ہو۔؟“
 ”جاؤں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔
 ”جاؤں گی ہو چلو گھر ہی چلتے ہیں۔“
 ”نہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آپ جائیں اپنی بائیک پر میں پہنچ جاؤں گی کسی نہ کسی طرح۔“ وہ
 کہتی تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑی تو امر بوکھلا کر چند قدم اس کے پیچھے چلا پھر خیال آنے پر واپس
 ایک اشارت کر کے اس کے قریب لے گیا۔
 ”ایک لکھا بن سے بدحو! چلو نیٹھو۔“
 ”نہیں! کہاں آپ کے ساتھ نہیں جانا تو نہیں جانا۔“ اس نے ایک طرف رک کر حتی انداز میں کہا پھر
 ”آجی بات نہیں ہے بدحو! ذرا سی بات پر غصے میں آجاتی ہو۔ چلو اب میں بہت آرام سے چلاؤں گا۔“
 ”زی سے نوکتے ہوئے کہا لیکن اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔
 ”انہیں تم نے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اکیلی جاؤ گی تو پھوپھو کو کیا جواب دو گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ وہ گھر پر ہی
 اصرار ہے اسے اسے غصے سے خائف کرنا چاہا تو یہ ایک دم رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”اچا بھجے جان سے مار دیں۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“
 ”بک بے جاؤ اور۔“ امر نے وارننگ کے انداز میں انگلی اٹھائی تھی پھر ایک دم ہونٹ بھیج گیا تو وہ سر جھٹک کر
 پڑی اور جیسے ہی خالی رکشہ نظر آیا اس میں بیٹھ گئی۔
 ”پتہ در پتہ رک کر جاتے ہوئے رکشہ کو دیکھتا رہا پھر اپنی بائیک اس کے پیچھے لگادی اور تمام راستہ اپنے
 جھنڈا تارہا کہ وہ کیوں اسے آسے کے عتاب سے بچانا چاہتا ہے۔
 بے سامنے مدید جیسے ہی رکشہ سے اتری امر بایک اس کے قریب لے آیا اور جیب سے والٹ نکالتا ہوا
 اندر جاؤ۔“ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی لیکن اندر نہیں گئی تو امر نے پہلے رکشہ فارغ کیا پھر اسے دیکھ کر
 مڑے بولا۔
 ”بڑیوں رہی ہو، جا کر بتاؤ پھوپھو کو اپنا کارنامہ بہت طرم خان بنتی ہوناں، کسی دن میرے ہی ہاتھوں سے
 دھاؤں گی۔ بخدا پھوپھو کا خیال کرتا ہوں ورنہ۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے گیٹ دھکیلتی ہوئی اندر
 ریدھی اور جانے کے لیے تیزی سے صحن عبور کر کے برآمدے تک آئی تھی کہ عمر راستے میں آگیا۔
 ”رے رے یہ آمدھی طوفان کی طرح کہاں جا رہی ہو۔ میں یہاں کب سے تمہارے انتظار میں آئیں
 بے رنگے بیٹھا ہوں اور وہ پرس آف ویلز کہاں ہیں۔“
 ”اے آف ویلز بیٹھا سنے کی بائیک واپس کریں گے پھر آئیں گے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا۔
 ”اٹھو بڑے بھائی نے تمہاری موجودگی میں کسی اور کو لفٹ کرا دی ہے جب ہی تمہارا موڈ۔“
 ”ہمت۔“ وہ عمر کو دھکا دے کر میڑھیاں پھیلاتی اور آئی تو سامنے آسے کو دیکھ کر قدرے جھجک گئی۔ گو کہ اس
 انت سے ہی امر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی اور آسے نے محسوس
 ”شام صعدا“ اس کی طرف سے دھیان ہٹایا تھا کہ وہ فوراً ”اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور بیڈ پر گر گئی ہوئی
 پستے بولی۔
 ”میں تمہیں کسے ممتا سے پوچھ لیتے ہیں۔“
 ”پوچھ لیتے ہیں۔“ صاحبت نے اس کی خود کلامی سن کر پوچھا تو اس نے چونک کر آواز کی سمت گردن موڑی
 ”نہیں! اتنی کرسٹے دیکھ کر بولی۔
 ”میں تم سے تو کچھ نہیں کہا۔“

”میرے علاوہ اور کون ہے یہاں“ اچھا سمجھ گئی اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔“

صباحت شرارت سے ہنسی اور اس کے خاموش رہنے پر استری کا پلگ نکالنے ہوئے بولی۔ ”سورڈ! مداخلت نہیں کروں گی۔ تم اپنا شغل جاری رکھو میں جاری ہوں۔“

”سنو!“ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت صباحت کو پکار لیا۔ ”کیا واقعی احرامی ہفتے جا رہے ہیں؟“

”ہاں کیوں؟“ صباحت سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بس پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے۔“ وہ اپنے ہی خیال میں گم رہ کر جانے کیا کہتے ہوئے خاموش رہی۔

کچھ دیر تک صباحت اس کے پاس آٹھنٹی اور دھیرے سے اس کا ہاتھ مارا کر بولی۔

”تم کچھ زیادہ محسوس کر رہی ہو مدحو! کوئی بہت لمبے عرصے کے لیے تو نہیں جا رہے احمر بھائی جلدی گے۔“

”اے ہاں۔“ اس نے چونک کر خود کو سنبھالا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو ماما اکیلی پتا نہیں ہمارے بارہ سوچ رہی ہوں گی۔“

”یہی کہ تم مجھے احمر بھائی کی شہادت میں گزرے لمحات کی روداد سنارہی ہوگی۔ ویسے کہاں لے گئے تمہیں۔؟“

”ساحل پر لیکن پتا نہیں کیوں آج مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا اور میں نے احمر کو ناراض بھی کر دیا۔ لیکن میرا کوئی تصور نہیں ہے وہ بایک اتنی اسپڈ سے چلا رہے تھے کہ مجھے غصہ آگیا اور واپسی میں میں نے پکارنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔“

پھر چند دن بڑی افرا تفری میں گزرے جس شام احمر کو جانا تھا اس روز صبح ہی سے گھر میں چل پل شروع تھی۔ یاسمین، ثمرہ اور روبی کے ساتھ آگئی اور بڑے بھیا بھی آفس جاتے ہوئے اپنے بال بچوں کو ادھر چھو تھے اور کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے سب کزنز احمر اور مدحیہ کو پیچھے لے کر ہوتے تھے۔ جس سے جتنا منظور ہو رہا تھا مدحیہ اتنی ہی بوکھلائی جاری تھی۔ کیونکہ بہت کوشش کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح کسی کو جواب نہیں دے پاتی تھی اور جب عمر حد سے بڑھنے لگا تب وہ سب کے درمیان سے نکل کر اور آگئی تو سب کے بلانے پر بھی نہیں گئی۔ احمر جانتا تھا کہ وہ مذاق میں کسی بات کو بھی ضد نہایتی ہے اس لیے وقت وہ خود ہی اس کے پاس آگیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم یہاں کیوں آگئیں۔ اس لیے ناں کہ۔“ شرر مسکرا ہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے احمر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”اف ماما آ رہی ہیں۔“

”تو جلدی سے مسکرا کر خدا حافظ کہہ دو ورنہ جب تک کوئی بلانے نہیں آئے گا میں اسی طرح کھڑا گا۔“ احمر نے کہا تو مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا جسے چھپانے کے لیے اس نے چاہا تھا کہ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

”خدا حافظ۔ پھر آہستہ سے اسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ گم صم کھڑی رہی پھر ایسے ہی عالم شہر دھیرے چلتی ہوئی تیسرے پر آکر نیچے دیکھنے لگی۔ سب بڑے ہی احمر کو چھوڑنے جا رہے تھے بانی کزنز کیسے تھے سب سے مل کر جب وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تب سرواچھا کر کے اسے دیکھ کر مسکرایا تو ذرا سا ہاتھ اٹھا ساتھ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جیش کی تھی۔

”خدا حافظ۔“

چند لمحوں میں آگے پیچھے تینوں گاڑیاں روانہ ہو گئیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا شور، ہنگامہ اور ساری افرا تفری تھم گئی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر سو کر دی۔ پھر کھڑکی سے پردے سمیت رہی تھی کہ صباحت کے ساتھ حمزہ اور روبی آگئیں۔ جنہیں دیکھ کر

سترانی پھر صباحت کو مخاطب کر کے پوچھنے لگی۔

”سنا ہمارا پورٹ گئی ہیں یا کینٹک۔“

پورٹ پھر کمرے میں نہیں آئیں وہیں سے کینٹک چلی جائیں گی۔“ صباحت جواب دے کر واش روم میں چلی گئی۔

”کیوں نہیں آئیں احمر بھائی کو کسی آف کرنے نہیں تو ساتھ جانے سے کوئی منع نہ کرتا۔“ سونے پوچھا تو اسے کندھے اچکا کر بولی۔

”یہاں تو۔“

”جہاں نے بھی اصرار نہیں کیا۔؟“ روبی کو جانے کیوں حیرت ہو رہی تھی۔

”جہاں میں جب دیکھا کہ لڑکیوں میں سے کوئی بھی نہیں جا رہا تب انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا اور ظاہر ہے میں ہی اسی لیے جانے پر اصرار نہیں کیا۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر مسکرائی تب ہی صباحت واش روم سے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے چائے کے لیے بوا سے کسے کی زحمت بھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔“

”نہ زرا ہی زحمت تم کرو۔ باقی پینے کی زحمت ہم کر لیں گے۔“ مدحیہ نے فوراً ”تکیے سے کمر کا کرنا لگیں“

”جیسے تم تو موم بستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”ارے نہیں تم بیٹھو میں جاری ہوں۔“ صباحت ثمرہ کو بٹھا کر کمرے سے نکلی تھی کہ فون کی بیل پر وہیں سے پکار کر جانے کا کہا پھر بڑھ کر ریسور اٹھا لیا تھا۔

”صباحت شاہ کیسی ہیں آپ۔؟“ ادھر سے بہت دلکش لمبے میں پوچھا گیا۔

”فون علی جا لگی۔“ اس نے بے حد گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا پھر آواز دبا کر بولی۔ ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے؟“

”میں ایک عزیز سے جو اتفاق سے آپ کی ماما پشٹ ہے۔“ علی جا لگی کہ آواز تارہی تھی جیسے اسے غصے کا لہرہ منظور ہو رہا ہے۔

”ماما پشٹ لیکن ماما۔“

”جینس کو نہیں دیکھتیں، یہی ناں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس بحث سے دامن بچا کر قدرے منت سے بولی۔ ”آپ پلیز آئندہ یہاں فون نہیں کیجئے“

”نہ کہاں کروں۔؟“ وہ غالباً ”موڈ میں تھا۔“

”یاد طلب ہے آپ کا۔؟“ وہ بشکل اپنی آواز پر قابو پا کر ناگواری سے بولی۔ جسے محسوس کر کے وہ ایک دم شہید ہوئی میں کچھ غلط کہہ گیا۔ آپ خفا تو نہیں ہیں۔؟“

”نہ فون بند کریں۔ پھر کسی وقت میں خود آپ کو رنگ کروں گی۔“ ثمرہ کے پکارنے پر وہ جلدی سے بولی تو اس نے فوراً ”پوچھا۔“

”نہاں ہے ناں آپ کے پاس۔؟“

”اے میں انتظار کروں گا۔“ ادھر سے سلسلہ منقطع ہوا تو اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لی پھر ریسور رکھ کر کمرے کا رخ کیا تھا۔



بات ہے کیا پھر بدحو اور عمر میں کوئی تکرار شروع ہو گئی ہے۔
 میں بچہ چلو۔ شکیل پچا آئے ہیں۔ سمیعہ آپ کی شادی ہے۔“ ثوبیہ نے خوش ہو کر بتایا تو وہ بھی خوش ہو

بات ہے شادی؟“
 میں تو صرف شادی کا سن کر ہانگی آئی ہوں۔“ ثوبیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
 میں ہوں ایک منٹ روکو میں دوپٹہ چینیج کر لوں یہ کچھ میلا ہو رہا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی ہاتھ پھڑا کر اپنے
 میں ہانگی آئی اور چند لمحوں میں دوپٹہ بدل کر ثوبیہ کے ساتھ نیچے آئی تو شکیل مدحیہ سے اس کا پوچھ رہا ہے

جی ہاں جی! السلام علیکم۔“ وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب جا کر جھک گئی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر

نہر السلام کیسی ہو بیٹا؟“
 کلی ٹھک آپ اکیلے آئے ہیں ماما جی نہیں آئیں؟“ اس نے اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
 میں بیٹا! نہیں کام بہت تھ۔ بس اب آپ سب وہیں چل کر ان سے مل لینا۔“
 بلائے جواب دے کر اماں جی کی طرف متوجہ ہو گئے۔“ اماں جی آپ اور اماں جی تو میرے ساتھ ہی چلیں گے
 دیکھ لیتا ہوں باقی سب اپنی سہولت دیکھ کر آجائیں گے۔“
 وہ۔ اماں جی نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا تھا کہ مدحیہ بول پڑی۔
 ماما جی آپ کے ساتھ چلوں گی اماں جی۔“
 ہاں تم اپنا تیلے جا کر کیا کرو گی؟“ عمر کے نوکنے پر وہ چڑ کر بولی۔
 میں کیا۔“

اب پہلے تم دونوں لڑو پھر کوئی بات ہو گی۔“ اماں جی نے کہا تو شکیل تعجب سے پوچھنے لگے۔
 جی نہیں لڑتے ہیں۔“
 صرف یہ دونوں پچا جان! اور کوئی نہیں۔“ ثوبیہ فوراً بولی تھی۔
 بلاں اس کی طرف سے ہوتی ہے ماماں جی! یہ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑانا ضروری سمجھتا ہے۔ ابھی دیکھ لیں
 ٹاس سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔“ مدحیہ نے بھی فوراً اپنی صفائی پیش کر کے الزام عمر کے سر رکھ دیا۔
 پھر اس ٹھک سے اب تم سب جاؤ۔ اپنے کام کرو۔ ہمیں بات کرنے دو۔“ اماں جی نے کہا تو صباحت
 اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اماں جی! احقانہ باتیں کیوں کرتی ہو۔“ اوپر آتے ہی صباحت مدحیہ کو ٹوکتے ہوئے کہنے لگی۔ جب ماماں جی
 سے تھے کہ وہ اماں جی اور اماں جی کی شکلیں لیتے ہوئے آئے ہیں پھر تم نے اپنے ساتھ جانے کی بات کیوں

نہیں کیا میری نکٹ ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی؟“ مدحیہ نے تنک کر کہا۔
 بات نکٹ کی نہیں ہے مدحیہ تمہیں پہلے ماما سے پوچھنا چاہیے۔ پتا نہیں وہ کیا پروگرام بناتی ہیں۔“ صباحت
 بیٹن سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہنوز اسی انداز میں بولی۔
 پروگرام مجھے پتا ہے۔ صرف تین دن کا ہو گا اور میں اتنے کم دنوں کے لیے نہیں جاؤں گی۔“
 ماماں مرضی۔“ صباحت نے یوں کندھے اچکائے کہ اس سے الجھنا فضول تھا۔
 مدحیہ شاید الجھنے کے موڈ میں تھی اس سے تو نہیں رات میں جیسے ہی آئیہ نے نیل کے سامنے ذکر چھیڑ
 کر دیا۔ وہ بول پڑی۔
 میں دنوں کے لیے نہیں جاؤں گی ماما! آپ اماں جی اور اماں جی کے ساتھ بھیج دیں۔“
 بول جا رہے ہیں جبکہ شادی میں ابھی پندرہ دن ہیں۔ اتنے دن تمہارے کالج کا ناغہ نہیں ہو گا۔“ آئیہ نے

جب دل بے اختیار ہو جائے تو ساری احتیاطیں دھری رہ جاتی ہیں اور صباحت شاہ جتنی محتاط رہے
 راستے پر چلنا نہیں چاہتی تھی وہی سامنے نکلتا تھا۔ پھر بھی اس پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے اسے بلکے
 کی بہت کوشش کی، لیکن ایسے عالم میں دل کیسے ہر بات کا جواب پہلے سے موجود ہو سکتا ہے اور پھر
 کوری زمین پر چاہت کے قطرے ٹپکنے والا کوئی عام شخص بھی تو نہیں تھا وہ اگر اب تک اس سے
 تھی تو صرف آئیہ کے خوف سے جو ابھی بھی موجود تھا۔ لیکن علی جمالیہ کی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ
 کی عجائباں اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ جب ہی تو دل سارے اندیشوں کے جواز گھر رہا تھا۔
 ”ضروری تو نہیں جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا میرے ساتھ بھی ہو۔“

”وہ اگر شاہ سکندر کی طرح فراڈ ہو تا تو پہلے ہی مقام پر مجھے پر پوزیوں کرتا۔“
 عجیب موڈ آ گیا تھا جہاں سارے موسم ایک ساتھ اترتے ہیں اور صباحت شاہ نے بار بار اس پر رائے
 رکھتے ہوئے بھی دل کو یہ یاد کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اس کے پاس
 دو صورتوں میں دل کو اس کا فیصلہ ماننا ہو گا۔ اور یہی بات علی جمالیہ سے کہنے کے لیے اس نے اس کا ہاتھ
 کرتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ ساڑھے پانچ ہو رہے تھے۔
 پتا نہیں وہ گھر پر ہو گا کہ نہیں؟“ اس نے سوچا تھا کہ ادھر دوسری تیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ اس
 سنائی دی۔

”نیل! علی جمالیہ! اسپیکنگ۔“
 ”جی میں ہوں صباحت۔“ اگرچہ اس نے بہت سنبھل کر کہا پھر بھی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
 ”کیسی ہیں صباحت؟ میں ابھی آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ علی جمالیہ کو جیسے اچانک مدت
 مل گئی تھی۔

”کیا کیا سوچ رہے تھے؟“
 ”میں یہ پتا نہیں آپ کتنا انتظار کروائیں گی۔“ علی جمالیہ نے کہا تو اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔
 ”آپ کتنا انتظار کر سکتے تھے؟“
 ”میں نے فضول سا جملہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ زندگی کی آخری سانچوں تک۔ پتا نہیں زندگی کتنی ہے۔“
 کل نہیں۔ ویسے آپ کیا سننا چاہتی ہیں؟“
 ”کچھ نہیں میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔“ وہ قدرے شینا گئی تھی۔
 ”چلیں اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے تو میں پوچھ لیں۔“ اس کی ذرا سی ہنسی کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گئی۔
 توقف سے اس نے کریڈل پر ہاتھ مار کر پکارا۔
 ”ہیلو صباحت! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟“
 ”وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے کہوں۔“ اس کے سوچتے ہوئے انداز پر وہ فوراً بولا۔
 ”کوئی خاص بات ہے یا کوئی پر اہم۔“

”میرے لیے تو خاص بات ہے۔ اب پتا نہیں آپ اس کو اہمیت دیتے ہیں کہ نہیں۔“
 ”صباحت شاہ! وہ بہت سنجیدہ لمحے میں گویا ہوا تھا۔“ آپ کی عام بات بھی میرے لیے خصوصی اہمیت
 ہو گی۔ ابھی ایسا گمان بھی نہیں کیجیے گا کہ میں۔“
 ”ایک منٹ۔“ اس نے ٹوک کر کہنے کی کوشش کی۔ ثوبیہ کی آواز آ رہی تھی شاید وہ اس کے بارے میں
 تھی۔ تب وہ جلدی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔
 ”سینس علی! میں پھر بات کروں گی۔“
 ”اوکے خدا حافظ۔“ علی جمالیہ نے سمجھ کر کہا تو وہ آہستہ سے ریسیور رکھ کر باہر نکل آئی اور عقبہ
 کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھٹائی ہوئی پوچھنے لگی۔

اسے یوں دیکھا جیسے وہ بھول رہی ہو لیکن جواب میں اس نے آسیدہ کو یاد دلایا۔
 ”یہ تو آپ کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب میں نے آپ سے چھٹیوں میں کہا تھا۔“
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا، تم اسلام آباد میں اتنے دن کیوں رہنا چاہتی ہو۔“ تمہاری سمجھ سے کوئی
 نہیں ہے اور اگر گھومنے پھرنے کا شوق ہے تو وہ بھی دو دن میں پورا ہو سکتا ہے۔“ آسیدہ اس کی بے کار فرما
 آکر بولی تھی۔

”مجھے صرف اسلام آباد نہیں گھومنا مری، سوات اور۔۔۔“

”یہاں اور وہاں اسلام آباد میں بھی کوئی اتنا فارغ نہیں ہے جو تمہیں گھماتا پھرتا رہے۔“ آسیدہ نے
 قدرے ناگواری سے کہنے لگی تمہیں یہ فضول بات کہنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ میں نے تمہیں چو
 کیوں نہیں بھیجا۔ اس لیے کہ میں پسند نہیں کرتی۔ یہیں اس شہر میں تمہارے بڑے ماموں اور عہد
 ہیں بھی ان کے ہاں میں نے تمہیں ایک رات رہنے کی اجازت دی ہے؟ تم میرے ساتھ جاؤ گی اور میر
 ہی تو کی سمجھیں۔“

”جی! مدھیہ نے بہت جزیرہ ہو کر سر جھکایا تھا۔



چھٹی کا دن تھا۔ خلاف معمول آدھا دن علی جماعت گھر نے سو کر گزارا۔ جس سے اس کی طبیعت بوج
 تھی۔ شاور لینے کے بعد بھی سر بھاری تھا۔ وہ کرم دین سے چائے کا کمرہ کراؤن میں آ بیٹھا اور لیوی آ
 چھیل بدل بدل کر دیکھنے لگا، کسی چھیل پر کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا جسے دیکھ کر ذہن فریٹ ہو تا جب ہی
 اس نے لیوی بند کر دیا پھر اٹھ کر ریک میں کوئی اچھی کیسٹ تلاش کر رہا تھا کہ شاہ جماعت کی بیوی اور بیٹی
 ساتھ آگے جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی ہوا۔ ماں باپ سے ملنے کے بعد رابعہ کی طر
 ہوا تو شرات سے بولا۔

”شاپنگ کرنے آئی ہو گی ناں۔ تمہارا دل نہیں بھرتا۔“

”نہیں اور اب تو روز شاپنگ ہو گی کیونکہ اب ہم ہمیں رہیں گے آپ کے ساتھ۔“ رابعہ نے کہا تو وہ
 کو دیکھنے لگا۔

”ہاں بابا جان نے بھیجا ہے ہمیں تمہاری شادی کے سلسلے میں۔“ عارفہ بیگم تصدیق کرتے ہوئے ہنسا
 بولیں۔ ”وہ جو یہاں تم نے لڑکی پسند کی ہے اس کے ساتھ۔“

”او فوہ! یہ باتیں آرام سے بیٹھ کر کرنے کی ہیں۔ تم آتے ہی شروع ہو گئیں۔“ شاہ جماعت گھبرنے قدر
 بیوی کو ٹوکا پھر اس سے بولے۔ ”علی بیٹا کوئی چاہے پانی۔“

”جی! آپ آرام سے بیٹھیں بلکہ ادھر بیڈ روم میں چلیں، میں وہیں چائے بھجواتا ہوں۔“ اس
 جماعت گھبر بیڈ روم میں پہنچ کر کرم دین کو پکارا اور اس سے انتظار چائے کا کہنے کے بعد عارفہ بیگم کے
 ہوئے بولا۔

”تو آپ کو بابا جان نے بھیجا ہے۔“

”ہاں اور بڑی تاکیدیں کی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، ڈاکٹر! تو انہوں نے گھر میں گھسنے نہیں
 اس کی بیٹی کے لیے اتنے بے چین ہو رہے ہیں۔ پھر بیٹا بھی میرا ماں! میں۔ یوں بھائی کے بھی تو لڑکے؟
 میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں بیاہ لے جاتے اسے۔“ عارفہ بیگم نے سخت سے کہا تو وہ خاصا جزیرہ ہوا۔
 ”لا حول ولا قوہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بابا جان کوئی زبردستی تو نہیں کر رہے۔ صباحت پہلے میری
 اس کے بعد بابا جان کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً اس سے میری شادی پر تیار ہو گئے ورنہ شاید
 چچا سکندر کی طرح ایک جنگ لڑتی رہتی۔“

”ہو نہ۔۔۔“ عارفہ بیگم سر جھٹک کر رہ گئیں۔

”آپ اس طرح نہیں کریں۔ جب یہ طے ہے کہ میری شادی صباحت کے ساتھ ہی ہو گی تو بابا جان
 اور میری پسند کو دل سے قبول کریں۔ تب تو ہی آپ اعتماد کے ساتھ ڈاکٹر آسیدہ کی پاس جا سکیں گی۔“ اس
 نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تو رابعہ اس کی تائید کرتی ہوئی بولی۔

”جب کہ رہے ہیں بھائی۔ آپ کا یہ رویہ تو سارا کام خراب کر دے گا گی۔ بقول بابا جان کے ڈاکٹر آسیدہ بہت
 عزت ہے۔۔۔“ آپ جانتی ہیں۔ اگر اسے ذرا ساسی شبہ ہو گیا کہ آپ اس کی
 ہونانے پر مجبور کی گئی ہیں تو وہ صاف انکار کر دے گی اور بابا جان انکار نہیں سنا چاہتے۔“

پھر ابھی اسی کو آرام کرنے دو۔“ اسے اپنی شادی کا موضوع اس انداز سے اچھا نہیں لگا تو رابعہ کو ٹوکے ہوئے
 ”ایک تو سفر کی تھکان اور سے تم اُمی کو پریشان کر رہی ہو۔“

”رابعہ! پوری آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کے
 بارے میں کچھ کونڈر کر کے جانے کا اشارہ کیا۔

”میں امی دیکھیں ہمارے لیے کون سا کمرہ ٹھیک رہے گا۔“ رابعہ ماں کو اٹھا کر لے گئی تو وہ یونہی ٹھلنے کے
 بلانے کا ایک چکر کاٹ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد رابعہ واپس آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”نانی! مجھے تو بس آپ فوراً اس لڑکی سے ملو امیں۔ ایمان سے جب سے سنا ہے میں تو اسے دیکھنے کو مری جا
 دن کیا بات خوب صورت ہے؟“

”بات نہیں تمہاری نزدیک خوب صورتی کیا ہے۔“ اس نے فوراً ”صباحت کے بارے میں کچھ کہنے سے
 رتے ہوئے کہا۔“ اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز مجھے پسند ہو وہ تمہیں بھی اچھی لگے۔“

”میں نہیں۔ خوب صورت چیز دیکھنے میں سب کو خوب صورت ہی لگتی ہے۔ جیسے سکندر رچا کی بیٹی الماس۔ کیا
 س جیسی ہے۔“ رابعہ کا اشتیاق فطری تھا۔

”بل۔“ سوچتے ہوئے انداز میں اس کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔ ”مالبا! الماس اور صباحت کا موازنہ
 لگا تھا۔ الماس ہو یا اپنی ماں کی تصویر بھی سوائے آنکھوں کے جن پر شاہ سکندر کی مہر لگی تھی اور ادھر
 کے کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب دونوں چہروں کو ایک
 دیکھتے ہوئے وہ اس واضح مشابہت پر اسے آپ مسکرایا تھا۔

”رے! میں نے آپ سے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں پوچھی جو آپ گہری سوچوں میں ڈوب گئے۔“ رابعہ
 نے ہر روز راسا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”ابو جھٹھا تم نے؟ ہاں وہ صباحت وہ بالکل تو الماس جیسی نہیں ہے بس تھوڑی سی مشابہت ہے دونوں میں۔
 ”وہ کیہ لیتا۔“

”ب! کب ملو امیں گے اس سے؟“ رابعہ نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”خود کہاں ملتا ہوں اس سے جو تمہیں ملو اؤں گا۔ وہ خاصی بزدل لڑکی ہے یا شاید بہت محتاط۔ مجھے فون تک
 سے منع کر چکی ہے اور خود اسے جب کبھی موقع ملتا ہے تو رنگ کر لیتی ہے اور اب جب بھی اس کا فون آئے
 تمہاری بات کر دوں گا، ٹھیک۔“

”ٹھیک نہیں۔ میں اتنا لبا اتنا قرار نہیں کر سکتی۔ آپ بس ابھی میری بات کر امیں اس سے۔“ رابعہ کی بے
 ”مسکرا کر لکھی میں سر ہلانے لگا تو وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”اس کیوں نہیں؟“
 ”کیونکہ وہ منع کر چکی ہے۔“

”میں نے آپ کو منع کیا ہے کیونکہ آپ مزہ ہیں اور ابھی تو میں بات کر رہی ہوں۔ ادھر کسی اور نے ریسور اٹھایا
 ”میں آرام سے کہہ سکتی ہوں کہ صباحت کو یاد دے۔“

”نہ! کہا تو اس کا مطلب سمجھنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اسے ٹیلی فون سیٹ اٹھا لانے کا اشارہ کیا

تھا۔

راجہ فوراً اٹھی اور ٹیلی فون سیٹ لا کر اس کے قریب رکھ دیا۔ تو چند لمحے توقف سے اس نے ریسیور راجہ کو تھما دیا پھر نمبر ڈائل کرنے کے بعد پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔
”ہیلو السلام علیکم۔“

”صباحت ہے!“

”جی میں اس کی دوست ہوں راجہ۔“ پھر آؤ تھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھ کر شریر مسکراہٹ کے ساتھ
”آری ہے۔“

”لاؤ مجھے دو۔“ اس نے فوراً ریسیور جھپٹ کر کان سے لگایا تو دھڑ سے صباحت پوچھ رہی تھی۔

”ہیلو کون؟“

”میں ہوں علی۔“ اس نے بڑے آرام سے سامنے نیپل پر یوں ٹانگیں سیدھی کیں جیسے اب اس۔
گفتگو ہوئی۔

”میرے خدا! آپ نے میرا مطلب ہے میرے بھائی سے آپ نے۔“ صباحت گھبراہٹ میں ٹھیک۔
بھی نہیں باری تھی۔

”ریلیکس صباحت! آپ کے بھائی سے میری سسٹر نے بات کی تھی۔“ اس نے سمجھ کر اطمینان دلایا؛
لگا۔ ”صل میں میری سسٹر بہت دنوں سے کہہ رہی تھی کہ آپ سے ملاقات کرادوں اور میرے مسلسل با
اس وقت ناراض ہو گئی تو میں نے سوچا آپ سے بات کرا رہی ہوں۔ اگر آپ خود کو مشکل میں محسوس کر رہے
میں فون بند کر دیتا ہوں۔“

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے میں خود آپ کو رنگ کرنے والی تھی یہ بتانے کے لیے کہ میں اسلام
رہی ہوں اپنی کزن کی شادی میں۔“

”چھانٹو میں گی کب؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”میرا خیال ہے تین چار دن میں واپسی بھی ہو جائے گی۔“ اس کے جواب پر وہ مطمئن سا ہو کر بولا۔
”اچھی بات ہے اور یہ میری سسٹر سے ذرا ہیلو ہائے کر لیں تاکہ اس کی ناراضگی دور ہو۔“ اس کے ما

اس نے ریسیور راجہ کو تھما دیا۔

”جی! میرا نام راجہ ہے ابھی دو مینٹ پسلٹی اے کا امتحان دیا ہے۔“

”یہاں نہیں دینی میں ہم لوگ عرصہ دراز سے وہیں مقیم تھے۔ بلکہ میرے فادر تو ابھی بھی وہیں ہیں۔ آپ
بھائی نے نہیں بتایا؟“

راجہ سکھایا ہوا سبق اتنی سہولت سے دہرا رہی تھی کہ وہ بھی حیران ہو کر سن رہا تھا۔

♥♥♥

صباحت سوٹ کیس بند کر رہی تھی کہ مدیہ روک کر بولی۔

”ٹیک منٹ پہلے مجھے دیکھنے دو۔ میرے کون کون سے سوٹ رکھے ہیں؟“

”اوہ! اب تم ساری اپنی خراب کرگوئی کوئی ضرورت نہیں اسے کھولنے کی تمہارے وہ سارے سوٹ
ہیں جو تم نے کئے تھے۔“ صباحت اس کا ہاتھ جھٹک کر سوٹ کیس لاک کرنے لگی۔ لیکن اس نے پھر
جھپٹ لی۔

”خدا کے لیے مدحو! صبح سے استری کر کر کے میری کرا انگری ہے۔“

”تم میں کون سا ایک ایک کپڑا نکال کر دیکھوں گی۔“ مدیہ سوٹ کیس کھولنے ہوئے بولی۔ پھر اس پر
اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ عمر اسے پکارنا ہوا آگیا۔

”مدحو! کہاں ہو مدحو؟“

”کیا ہے؟“ اس نے سوٹ کیس میں سے سر نکال کر اسے دیکھا۔

مدیہ سے اچھی سی چائے پلاؤ وہ بھی اپنے ہاتھ کی تباہیوں گا گیا ہے۔“ عمر نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے بیڈ پر
بٹن بھلا میں جیسے واقعی اس کے حکم کی تعمیل ہوگی۔

تباہیوں کے کئی شوق نہیں ہے سننے کا۔ کیا ہوا ہے کیا نہیں۔“ مدیہ نے حسب عادت کوئی نوٹس نہیں

نہاری مرضی۔“ عمر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیب سے لفافہ نکال کر لہراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوئی بڑی
باؤ نہیں کی بس ایک کپ چائے۔“

نہ کا خط ہے؟“ مدیہ نے چلانے کے ساتھ لفافہ جھپٹنے کی کوشش کی لیکن عمر نے پھر سے ہاتھ پیچھے کر

نہیں کیا۔

بہر عمر اگر میرا ہے تو فوراً مجھے دے دو ورنہ۔“ مدیہ کے دھمکی آمیز انداز پر وہ لا پرواہی سے کندھے اچکا کر

نہا رہی ہے، لیکن ملے گا چائے کے بعد۔“

بڈا کی ایک نہیں دس کپ پہلے خط دو۔“

اب مجھے تمہارا اعتبار نہیں۔ پہلے چائے۔“ عمر کو جانے کب کب کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ مزید لفافہ
رولا۔ ”آؤ کیا شوبہ لگتا ہے بڑے بھائی نے سارے جہیزوں کو نچوڑ دیا ہے۔“

ن کتنے کینے ہو تم۔ میں ماموں جی سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور آخر کو بھی لکھوں گی کہ تم مجھے بلیک میل
ہو۔“

ب کرگوئی لیکن چائے نہیں بناؤ گی۔ چہ چہ۔ ایک نمبر کی کام چور۔“ عمر نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے
بڑھچک دیا اور جانے لگا کہ وہ پکار کر بولی۔

نہا رہی ہے چائے بناتی ہیں۔ اگر بلی لینا۔“

ہے کھڑی میں تو جیسے چائے کا کال پڑا ہے۔“ عمر بری طرح تلملا گیا تھا۔

نہا عمر! ہمیں بتاؤ ہے اس کا۔ چلو تم نیپل بھائی کے کمرے میں میں وہیں چائے لے کر آتی ہوں۔“

نت جو خاموشی سے دونوں کی تکرار دیکھ اور سن رہی تھی، بیہوش کی طرح صورت حال کی نزاکت کا احساس کر
نہا لے کر کمرے سے نکل گئی تو مدیہ نے بیڈ پر سے لفافہ اٹھا کر بے اختیار ناک کے ساتھ لگایا اور خود ہی ہنس

بہر بیڈ پر گر کر لفافے میں سے خط نکالا تھا۔

نہا نام سے پکاروں، کیا نام ہے تمہارا۔“

نہا میں میرا کوئی قصور نہیں، یہاں آکر میں اپنے آپ کو بھی بھول گیا ہوں نہ نہ۔ یہ مت سمجھنا کہ بڑھائی کی
ہے بلکہ حسین نظاروں اور جلووں نے میرے ہوش بھلا دیئے ہیں۔ کہاں کہاں سے اور کس کس کی طرف

غیر ہواؤں! ادھر نیلا سمندر ہے ادھر نیلی آنکھیں۔ میں دونوں میں فرق کھوجنے لگتا ہوں۔ پھر اوپر دیکھتا
پڑے آسمان پر صرف ایک اکیلا چاند اس کے آس پاس دور دور لکیریں کوئی ستارہ نہیں۔ شاید سارے

سائنس پر اترا آئے ہیں۔ جب ہی تو انہی جگہ گھاٹ ہے۔ مدحو میرا کیا ہو گا۔ اگر میں اپنے مقصد سے ہٹ گیا تو
نہا واپس آؤں گا۔ دیکھو میرے لیے دعا کرتا۔ کوئی ناں؟“

طرے کے ساتھ اس کا دل دوتا گیا تھا۔ یہ نہیں اصرار ہے کچھ لکھا تھا یا اسے ستانے کو محض مذاق۔ کچھ بھی تھا۔ وہ
نہا جس صحت و حرکت پوری رہی۔ کیونکہ کسی بھی ضدی اور خود سرسی، تھی تو بہر حال لڑکی جس کی آنکھوں

نہا بچائے گئے تھے اور سچانے والا خود ان کا دشمن ہو رہا تھا۔

نہا مذاق نہیں کرتا چاہیے۔“ کتنی دیر بعد اس نے سب مذاق سوچ کر خود کو سہارا دینے کی کوشش کی
نہا تنک اس میں کامیاب ہو کر خط دوبارہ لفافے میں بند کیا پھر اسے اپنی الماری میں چھپا کر گھر سے اٹھی

پتہ در سے مایہ جی کے پاس ہوں اور اس سے پہلے لان میں تھی۔ اماں جی نے صبا سے کہا ہو گا۔
 صبا نے کہیں تو ان کا کام ہو چکا ہوتا۔ آسہ نے بیٹھے ہوئے کہا۔
 ”زندہ ہونے کا مطلب آپ نے سمجھ لیا کہ۔“ وہ منہ پھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

صبا نے کیا سمجھ لیا بیٹا! جا کر اماں جی سے پوچھو، وہ بار بار تمہارا نام لے کر کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے تم سے
 ہر کام کا تھا۔ آسہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرج سے کہا تو چادر کے ساتھ ہی اسے اماں جی کا کام یاد آ گیا لیکن
 انجان ہی غنا تھا۔

صبا مظلوم کر رہی ہوں اماں جی سے۔ وہ بظاہر سادگی سے کہہ کر کمرے سے نکلی تو اپنی بھول پر بجائے شرمندہ
 کے ہنسی ہوئی اماں جی کی چادر تلاش کرنے لگی جسے انہوں نے استری سے سکھانے کو کہا تھا اور اس نے
 کے مطابق جانے کس کوئے میں ڈال دی تھی۔

اچھا ہے؟“ شعر نے اسے اپنے کمرے میں آتے ہی متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے پا کر پوچھا تو وہ بے
 ہوش ہوئی۔

”ہرے رنگ کی؟“ شعر نے شرارت سے کہا۔
 ”وہ چونک کر اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔“ نہیں اشعر بھائی! اماں جی کی چادر۔ وہ غالباً براؤن کلر کی
 اپنے دیکھی ہے۔“

”کیا صبح ملکہ دو روز سے رنگ پر پھیلی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بھی وہیں ہوگی لیکن میرا خیال ہے ابھی تک
 نہیں ہوگی۔“

”کھانے ہی کے لیے اماں جی نے مجھے دی تھی اور میں پتا نہیں کہاں رکھ کے بھول گئی۔ خیر چھوڑیں۔“ وہ
 صبا کا چھوڑ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سنا ہے آپ بھی باہر جا رہے ہیں۔“
 ”نہیں ہے۔“

”میں میرا مطلب ہے، آپ کو تو یہاں اچھی جا ب مل گئی ہے پھر کیوں جا رہے ہیں۔“
 ”اچھا جا رہا ہوں آؤں کی طرف سے ایک سال کی ٹرننگ کے لیے اس کے علاوہ وہاں کچھ اور کرنے کا
 ارادہ میں ہے اور نہ ہی ٹرننگ کے بعد وہاں مزید قیام کا خیال ہے۔“ اشعر نے بہت سیدھے سادے انداز
 میں بات کا جواب دیا تھا۔

”یہ تو آپ یہاں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں ناں وہاں جاتے ہی آپ کے ارادے بدل جائیں گے۔ ایک سے دو سال
 پہلے کا امر ہے؟“ شعر نے اس کی بات کا ٹوہ بھی فوراً بولی تھی۔

”میں کچھ نہیں پتا۔ میں تو بس سنی سنائی کہہ رہی ہوں کہ باہر جا کر لوگ گھریا کر کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاتے
 ہیں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن تمہیں امر پر بھروسہ ہونا چاہیے۔“ اشعر اس کا سر ہلا کر مسکرا دیا تو وہ کچھ
 مایوس ہو کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔

”میں نہیں لوگیاں ڈھولک پینے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ٹوپیہ چلائی۔
 ”وہ آئی ڈھولک اسے دو۔ آؤناں مدحو۔“

”دو سے اچھی میں بجا لیتا ہوں۔“ ادھر سے گزرتے عمر نے وک کر فوراً مداخلت کی تو مدحہ اسے دیکھ کر
 ہنس کر لوٹ کر گئی۔

”تو تو لوگیاں کوئی غیر تھوڑی ہیں سب اپنی ہیں۔“ عمر دھڑلے سے سب کے درمیان بیٹھ گیا اور ڈھولک پر

”کیا امر بھائی نے ہر ایک پل کا احوال لکھ بھیجا ہے۔“ صبا نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا تو وہ بس ذرا ہنس
 سکی۔

”تم از کم مجھے تو دھواؤ۔ دیکھو تو امر بھائی نے اپنے جذبات کو کس طرح۔“
 ”جکو موت۔“ وہ فوراً ٹوک کر بولی۔ ”امر کوئی دنیا سے نرالے تو نہیں ہیں جو ان کی تحریریں بھی انوکھی ہیں
 وہی باتیں جو سب لکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی لکھی ہیں۔“

”سب کیا لکھتے ہیں، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔“ صبا اس کی اندرونی کیفیات سے بے خبر خوشی سے باز رہ
 آئی۔

”تمہیں کیا کروں؟“ وہ چڑ گئی تھی۔ بری طرح جھڑک کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تو صبا نے جوں
 کر اسے دیکھا پھر موضوع بدلنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

”اچھا سو، تم نے سوٹ کیس بند کر دیا تھا یا ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا ہے۔“
 ”پتا نہیں جا کر دیکھ لو۔“ اس نے جیسے بادل ٹھوسہ جواب دیا تھا۔ اصل میں اب اس کا کسی بات میں دل نہ
 لگ رہا تھا۔ امر کے خط نے حقیقتاً اسے دکھ پہنچایا تھا۔ حالانکہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ ایسی دل جلانے والی بات
 اس نے کبھی مذاق میں بھی نہیں کی تھی۔ پھر اسے کہا ہو گیا تھا۔

”کس سچ بچ تو وہ۔“ اس کا ذہن ان ہی باتوں میں الجھ رہا تھا۔ جب ہی صبا کی مداخلت ناگوار گزر رہی تھی
 اپنے کمرے میں بند ہونے کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ آسہ آنے والی تھی اور اس کے آتے ہی سب نے یہاں
 روانہ ہونا تھا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ وہ کوئی بہانہ کر کے اسلام آباد جانے سے منع کرے لیکن اس خیال سے کہ یہاں
 پر خواتین کا موڈ خراب ہو گا۔ اس نے اپنی سوچ جھٹک دی پھر امر کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش
 وہ کچھ بھگتی گئی تھی۔ اس کے بعد اسلام آباد جا کر ہی اس کا موڈ ٹھیک ہوا تھا۔ اب پتا نہیں جبکہ کی تبدیلی
 کا دھیان بنا دیا تھا یا کوئی اور بات جس سے وہ اپنے اصل رنگ میں آ گئی تھی۔

”اللہ مایہ جی! آپ کا گھر کتنا خوب صورت ہے۔“ سارا گھر دیکھنے کے بعد وہ سیما بھائی کے پاس آئی
 ”پتا ہے میں نے چھٹیوں میں ممتا سے کہا تھا کہ مجھے اور صبا کو آپ کے پاس بھیج دیں لیکن ماما ہی نہیں
 وقت آکر میں آتی تو اتنے بہت سارے دن آپ کے گھر رہتی۔ سچ مجھے تو یہاں آکر بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”تم ابھی بھی بہت سارے دن رہنا۔“ سیما بھائی نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ مایوس سے بولی۔
 ”اب نہیں رہ سکتی کیونکہ کالج مکمل ہیں اور اگلے مہینے سمسٹر بھی ہونے والے ہیں“ البتہ آپ ممتا سے کہ
 کہ وہ اس بار ہمیں چھٹیوں میں ضرور بھیجیں۔“

”سہلے بھی آسہ کو منع کرنا چاہیے تھا۔ خیر اس بار میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔“ سیما بھائی نے
 خوش گردیا۔

”جی مایہ جی! بس جیسے ہی چھٹیاں ہوں گی میں آپ کو فون کر دوں گی اور آپ لینے آئیں گی تب تو ماما
 نہیں کر سکیں گی۔“

”ہوں! اصل میں آسہ تم دونوں کے بغیر رہ نہیں سکتی۔“
 ”ہم دونوں نہیں، تینوں، نیل بھائی کو بھی وہ کہیں نہیں جانے دیتیں۔“ اس کے یاد دلانے پر سیما
 ساڈتہ مسکرائیں۔

”ہاں تم تینوں۔“

”اور پتا ہے مایہ جی میں۔“ آسہ کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔
 ”مدحو! تم یہاں بیٹھی ہو بیٹا! اماں جی نے تم سے کوئی کام کہا تھا۔“ آسہ نے اسے دیکھ کر کہا۔
 ”ججھ سے۔“ اپنی طرف اشارہ کر کے اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا پھر نفی میں سر ہلایا۔

ہاتھ مارنے کے ساتھ شروع ہو گیا۔

”بہناو بہنا! تیری ڈوبلی میں سجاؤں گا۔“

لڑکیاں تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگیں تو وہ بھی رہ نہیں سکی فوراً ”بیٹھ کر سب کے ساتھ شام تھی۔“

♥♥♥

اگلے روز مسجد رخصت ہو کر چلی گئی تو کچھ دیر رخصتی کے بعد کی فضا قائم رہی یعنی محسوس کی جانے لگی تھی۔ خواہ کتنے لوگ ہوں پھر بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک چلا گیا ہے۔ ایسے ہی ساری افزائشی اچانک ختم۔ شام میں کپڑے بدلنے کے لیے جتنا شور اور جوش تھا۔ اب اتنی ہی خاموشی اور کالی۔ مدیہ نے کپڑے لیے لیکن اتارے ہوئے کپڑوں کو تمہ کر کے سوٹ کیس میں رکھنے کا کام صبا کے سر ڈال دیا اور اس احتجاج سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر آئی تو آگے سیما بھاگتی چائے کے کمرے سے اسی صبا کی۔

”بیٹا! اپنے ناموں جی کے کمرے میں دے آؤ اور دیکھنا کپڑے تمہارے آکر اور لے جانا۔“

”جی اچھا!“ وہ رے لیے خشک بھائی کے کمرے میں آگئی اور آئیہ کے سامنے نیپل پر رے رکھ کر پوچھا: ”مما اور کپڑے چائیں؟“

”چائے دو کی سب کو تو پتا چلے گا۔“ آئیہ کہہ کر بڑے بھائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پہلے بھی وہ ان کی بات رہی تھی۔ پتا نہیں کیا موضوع تھا اور وہ جتنا کام سے بھاگ رہی تھی اتنی پتھر لگتی تھی۔ ایک ایک کپڑے ڈال کر باری باری سب کو تھما لی گئی۔ آخر میں نیپل اور اشعرہ گئے اور ادھر کھڑا خالی ہو گیا تو وہ اشعرہ کو دے بولی۔

”آپ تو چائے نہیں پئیں گے ناں۔“

”تم نہ پلانا چاہا ہو تو اور بات ہے۔“ اشعرہ نے کہا۔ ساتھ ہی اسے چائے لانے کا اشارہ بھی کیا تو وہ اے گ ہوئی تھوڑا سا لے کر کچن میں آگئی۔

”مائی جی، کپڑے تو کم نہیں ہوئے، چائے کم ہو گئی ہے اور اب آپ کسی اور کے ساتھ بھجوا دیں کیونکہ مجھے بلا رہی ہیں۔ وہ کھڑا سیما بھاگتی کو کھڑا کر فوراً ”کچن سے نکل کر کمرے میں آگئی۔ جہاں صبا کے اور جوڑے جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ دوسری طرف روٹی۔ مریم اور رجا کے ساتھ مصروف تھی۔ عمار اور وہیں موجود تھے لیکن ان سب کی طرف ان کی پشت تھی اور کھڑی سے باہر جھانکتے ہوئے پتا نہیں کس چیز پر تھے اور دھڑکی بھی آن تھا اور غالباً ”سب بیوی دیکھ رہے تھے، لیکن درمیان میں خبریں آجائے سب کی توجہ اس سے ہٹ گئی تھی۔“

”اس بے چارے کو نہیں سنا تو بند ہی کر دو۔“ وہ کہتی ہوئی ٹی وی بند کرنے کے ارادے سے اس کی بڑھی تھی کہ روٹی جیج پی۔

”نہیں خود اپنے نہیں کرنا۔ ابھی پروگرام کا بقیہ حصہ آئے گا۔“

”کوئی خاص پروگرام آ رہا تھا؟“

اس نے پوچھا لیکن روٹی پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئی تھی اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ رے اچکا کر اپنے پیچھے کے لیے جگہ دیکھنے لگی تھی کہ شاہ سکندر کے نام پر اس کی نظرس فوراً ٹی وی اسکرین پر کسی سینار کی جھلکیاں تھیں اور اب یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اکثر ہی خبراتے میں نہیں شہ جھلک نظر آ جاتی تھی۔ جسے وہ اور صبا کے اگر اس کی ہوتیں تو شوق سے دیکھتی تھیں اور سب کی موجودگی انجان بن جاتی۔ اس وقت سب موجود تو تھے لیکن اتفاق سے کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ دیکھنے بھی لگی تھی۔ پھر جیسے ہی منظر دلا اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا۔

”شاہ سکندر، یہیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔“

”کیا بات ہے، تم ابھی سوئیں نہیں؟“ خشک بھائی کے کمرے سے نکلتے ہوئے آئیہ نے اسے دبا

کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”یہ سوا گیارہ ہوئے ہیں ماما اور میں اکیلی تو نہیں جاگ رہی، اندر سب بیوی دیکھ رہے ہیں۔“

”جتنے نہیں ہو تم لوگ۔“ آئیہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ تو وہ بونہی ٹپکتی ہوئی گلاس والے کے قریب آکھڑی برابر لان میں جلتے جلتے تھے رنگ برنگے قمقموں کو دیکھنے لگی، شادی کا ہنگامہ سر پڑنے کے ساتھ جانے کی روٹی بھی ماند پڑ گئی تھی۔

”اما، یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عقب سے نیپل کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا تو وہ ایک لحظہ کو

ختم ہو کر جوابات سے یہاں کیوں کھڑی ہو اور باقی سب لوگ کیا سو گئے؟

”نہیں بیوی، پروگرام آ رہا ہے، شاید بیوی دیکھ رہے ہیں۔“ وہ جواب دے کر دوبارہ رخ موڑ گئی۔ تو

”تو ف سے نیپل اس کے قریب آکر پوچھنے لگے۔

”مما کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟“

”اپنے آپ سے“ اب خدا را مطلب مت پوچھنے کھڑے ہو جائے گا۔“ اس کے لمحے میں اچانک تنفر

پانچا جیسے محسوس کر کے نیپل خاموش ہو رہے کیونکہ جانتے تھے کہ وہ بہت جلدی ضبط کا دامن چھوڑ کر

”نیل بھائی!“ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی انہیں نکارا۔ ”ایک بات مانیں گے۔“

”ہوں۔“ نیپل بغور اسے دیکھ رہے تھے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو

”وعدہ کر رہی۔“

”بل فوراً“ کچھ نہیں کہہ سکے، کیونکہ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کبھی اس طرح ان کے ساتھ راز

انداز میں باتیں نہیں کی تھیں نہ کبھی اپنا کوئی مسئلہ انہیں بتایا تھا۔

”یہی جگہ اگر صبا ہوئی تو آپ فوراً“ اس سے وعدہ کر لیتے۔ میری بات کیوں ماننے لگے آپ؟“ وہ ان کی

پاس سے ہٹ کر بولی۔

”میں تم سے بھی وعدہ کر رہا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“ نیپل نے چونک کر فوراً ”کہا تو اس نے پہلے ادھر

بھاگتا ہوا آواز میں جلدی جلدی بولنے لگی تھی۔

”شاہ سکندر سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں، وہ یہیں اسلام آباد میں ہیں۔ میں

لنڈن میں انہیں دیکھا ہے۔“

”اے کچھ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔“ یہ لڑکی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی نہ جگہ دیکھتی تھی نہ

”کس جب جس وقت جو بات دماغ میں سما جائے اور اسے سمجھنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ حقیقتاً ”اند رے

پٹان ہو گئے تھے بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔

”یہ شاہ سکندر کوئی عام شخص نہیں ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے پہلے اپنا نمٹ لینا پڑے گا اور یہاں اسلام

بان کا مستقل قیام نہیں ہے، کسی تقریب میں آئے ہوں گے اور ضروری نہیں کہ اب تک یہیں موجود

ان کی مجلس میں ہوتی ہے شام نہیں۔ اتنا تو تم بھی جانتی ہو گی۔“

”ماجائی مجھی آپ اسی طرح مجھے تالیں گے۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

”مما جو اہم مجھے کی کوشش کرو اور میرا یقین کرو، میں نے تم سے وعدہ کیا ہے ناں تو کراچی جا کر میں اپنی سی

”میں کون گا کہ کسی طرح تمہیں ان سے ملوا سکوں۔ بس اس وقت تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو۔“

”مکے مضبوط لمحے بڑھ چھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر جیسے احسان کرتے ہوئے بولی۔

”بہنہ! میں آپ خالین کر رہی ہوں لیکن اگر آپ نے کراچی جا کر مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو۔“

نیک پانچ بجے اگر میں وہاں نہیں پہنچی تو سمجھ لیجیے گا کہ بہت چاہئے اور بہت کوشش کے باوجود نہیں آجائے کسے کچھ تنگ میں کہ گئی پھر فوراً "کریڈل پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ اس کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے وہ مسکراتی تھی۔

روز کالج سے آتے ہی اسے شام کی فکر ہو گئی تھی۔ گو کہ لائبریری کے نام پر ٹویہ فوراً "ساتھ چلنے کو تیار ہو لیکن اس کی موجودگی میں وہ علی جمائیکر سے بات نہیں کر سکتی تھی جبکہ عمر اسے لائبریری تک چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ لیکن پانچ بجتا تھا اس لیے اس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا پھر پچھلے چلی آئی تاکہ کسی طرح کر سکے۔

سینئر ٹیوشن بڑھانے کس وقت جاتے ہو۔" اس نے عمر کے میک میں جھانکتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں اس کی بات کی۔ وہ بھی ایک کایاں تھا فوراً "بولا۔

نہیں میں نے کہاں جانے کی بات کی ہے۔" وہ ریک چھوڑ کر اس کی طرف گھومی تو وہ نہیں رہا تھا۔

ب سمجھتا ہوں میں۔ اس وقت سونا چھوڑ کے میرے پاس آنے کا مطلب یہی ہے کہ تمہیں نہیں جانا ہو تو نہیں لے جاؤ گے۔" اس نے اس انداز سے کہا جیسے سوچ لو تمہیں بھی کام پڑیں گے۔

جانا کہاں ہے؟ عمر نے بھی سمجھ کر فوراً "ہتھیار ڈال دیے کیونکہ ضرورت کے وقت وہی اس کے کام آتی ہے۔

بلا جاؤ گے یا نہیں۔" لے جاؤں گا۔" افتخار اس کی بار کوگی تو وہاں بھی لے جاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔

میں تو جانتے ہوئے مجھے پکار لیتا۔ کتنے بچے جاؤ گے؟" وہ خوش ہو کر بولی۔

میرے چار اور ایسا کرنا ہوں میں ایک ٹھنڈے سویتا ہوں تم آکر مجھے اٹھاؤ نا اور یہ ذرا پردے برابر کرو۔" عمر بولتی رہی۔

اس لیے اس نے نیبل کو عمر کے ساتھ لائبریری جانے کا تیار اور ٹھیک ساڑھے چار بجے عمر کے گھر پہنچی۔ اس نے اس کے منٹ کا راستہ تھا یوں اپنے تئیں وہ علی جمائیکر سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ لیکن اسے موجود دیکھ کر اس نے ہلکا سا ہنسی پر نظر ڈالی تو وہ مسکراتی رہی۔

اس نے اس کے منٹ سے نکل آئی۔

بہن بوری تھی اس لیے اس نے نیبل کو عمر کے ساتھ لائبریری جانے کا تیار اور ٹھیک ساڑھے چار بجے عمر کے گھر پہنچی۔ اس نے اس کے منٹ کا راستہ تھا یوں اپنے تئیں وہ علی جمائیکر سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ لیکن اسے موجود دیکھ کر اس نے ہلکا سا ہنسی پر نظر ڈالی تو وہ مسکراتی رہی۔

اس نے اس کے منٹ سے نکل آئی۔

بہن بوری تھی اس لیے اس نے نیبل کو عمر کے ساتھ لائبریری جانے کا تیار اور ٹھیک ساڑھے چار بجے عمر کے گھر پہنچی۔ اس نے اس کے منٹ کا راستہ تھا یوں اپنے تئیں وہ علی جمائیکر سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ لیکن اسے موجود دیکھ کر اس نے ہلکا سا ہنسی پر نظر ڈالی تو وہ مسکراتی رہی۔

اس نے اس کے منٹ سے نکل آئی۔

بہن بوری تھی اس لیے اس نے نیبل کو عمر کے ساتھ لائبریری جانے کا تیار اور ٹھیک ساڑھے چار بجے عمر کے گھر پہنچی۔ اس نے اس کے منٹ کا راستہ تھا یوں اپنے تئیں وہ علی جمائیکر سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ لیکن اسے موجود دیکھ کر اس نے ہلکا سا ہنسی پر نظر ڈالی تو وہ مسکراتی رہی۔

اس نے اس کے منٹ سے نکل آئی۔

بہن بوری تھی اس لیے اس نے نیبل کو عمر کے ساتھ لائبریری جانے کا تیار اور ٹھیک ساڑھے چار بجے عمر کے گھر پہنچی۔ اس نے اس کے منٹ کا راستہ تھا یوں اپنے تئیں وہ علی جمائیکر سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ لیکن اسے موجود دیکھ کر اس نے ہلکا سا ہنسی پر نظر ڈالی تو وہ مسکراتی رہی۔

"توبہ کرو۔ تمہیں کون چکروے سکتا ہے۔" نیبل نے فوراً "کان کو ہاتھ لگایا پھر اسے سونے کی تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو وہ بجائے ان کی بات عمل کرنے کے پھر گاؤں والے سے باز دیکھنے لگی تھی۔ اصل میں احمد کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں جھونکا تھا اور بہت کوشش کے بعد بس کچھ دیر کو ہی وہ اپنا دھیان ہٹا پائی اس کے بعد پھر اسے ہی سوچنے لگی۔ اس کے اندر تو جیسے ایک احساس انگڑائیاں لینے لگا اور یہ اس کے اپنے احساسات تھے اپنی سوچ تھی اور شاید لا شعور طور پر وہ فرار بھی ڈھونڈ رہی تھی۔

پھر اگلے روز سہ پہر کے ولیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے واپسی کی رٹ لگا دی۔ حالانکہ یہ سماج بھی کتنے اصرار پر آسید مزید دو تین روز قیام پر آمادہ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی خدمت سے باز نہیں آئی اور منوا کر رہی تھی۔

اسلام آباد سے آنے کے چوتھے روز صاحت کو فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ مدحیہ سونیا کے ساتھ اس کی دوست کے ہاں گئی ہوئی تھی اور نیبل ابھی ٹکے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ آکر علی جمائیکر کے گھر پہنچ گئی۔ دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے بولی۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔ "آپ کیسی ہیں اور یہ آپ نے آنے میں اتنے دن

دیئے۔" "نہیں، آٹو میں تین چار روز پہلے ہی گئی تھی لیکن خیر چھوڑیں یہ بتائیں آپ کی سسٹر کیسی ہیں؟" وہ فوراً "ہاں

بل گئی۔" بالکل ٹھیک اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں بتائیں کیا کروں؟ اسے سیدھا آپ کے گھر لے آئے۔

یا۔" "اف نہیں۔" وہ گھبرا کر فوراً "بولی تھی۔" گھر آنے کی بات نہیں کریں پلیز آپ کی سسٹر اگر میری کالی

ہو تیں تب تو بات بن سکتی تھی۔" میں نے اپنی والدہ اور بہن کو دینی سے بلایا، یہی اسی مقصد کے لیے ہے کہ

"پھر آئی مین بات کیسے بنے گی۔" میں نے اپنی والدہ اور بہن کو دینی سے بلایا، یہی اسی مقصد کے لیے ہے کہ

سلسلہ آگے بڑھے اور میری والدہ صبح شام مجھے نوکرتی ہیں کہ میں کب انہیں آپ کے گھر لے کر جاؤں گا۔" علی جمائیکر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مزید پریشان ہو گئی اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہہ تو قدرے توقف سے

کر پوچھنے لگا۔

"بیکلو صاحت! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟" "نہیں مجھے کچھ بتائیں۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"کیا بتائیں؟" "جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ کی والدہ اور بہن اس طرح کیسے آسکتی ہیں میرا مطلب بغیر کسی گارنٹی

کے ماما تو فوراً "مجھ سے پوچھیں گی تب بتائیں میں کیا کہوں گی ان سے۔" اس نے ابھی اس سنجیدگی سے

تھا۔ جب ہی اتنی پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ اتنا ڈر کیوں رہی ہیں۔ پر پوزل آنا کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے یا آپ کی ماما

پر پابندی لگا رکھی ہے۔" علی جمائیکر نے دھیرے دھیرے کہا۔

"جانتی ہوں۔" وہ جڑبڑی ہو گئی تھی۔ لہجہ بھی روٹھا ہوا تھا۔

"ارے آپ تو برا مان گئیں۔ چلے جانے دیں۔ میں خود ہی کوئی ایسی راہ نکالوں گا جس میں آپ کی

پہلی نہیں؟“ عمر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”جو بھی سمجھ لو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہہ کر الماری کھولی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔
 میں کیوں سمجھ لوں۔“ مجھے والے تمہیں نہ سمجھے۔“ عمر خط اس کی طرف پھینک کر کمرے سے نکل گیا تو اس
 ذرا الماری بند کر کے اپنے پیروں کے پاس سے لفافہ اٹھایا پھر بھاگ کر عمر کو پیچھے سے پکارا۔

”سنو عمر!“

عمر نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے انداز میں لفافہ لہرا کر ہنستی ہوئی بولی۔

”غیبیٹ یو“
 عمر نے رہا تھ پھر تباہوا سیزھیاں اتر گیا تو اس نے دوبارہ کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا اور لفافے کو انٹ پلٹ
 رکھنے لگی جیسے کھونا بھی چاہتی ہو اور نہیں بھی کیونکہ گزشتہ خط سے وہ ابھی تک تپتی ہوئی تھی اور اب پتا نہیں
 نہ کیا لکھا تھا۔“ تجھس ہونے کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کھول کر پڑھے۔ شاید اس لیے کہ
 نہ بے ہوش خود کو تسلیم کروایا تھا اور اب اپنی ذات کی ذرا سی نفی بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کتنی دیر
 نہ ہوئے اور اوروہ سے ادھر ٹھلنے کے بعد اس نے لفافہ چاک کیا تھا۔

”سلے میں نے تمہارے جواب کا انتظار کیا مدحو! لیکن پھر تمہاری بات یاد آئی کہ تمہیں ایک خط لکھنے میں کتنا
 دیر لگے گا۔ ویسے میں نے کوئی جواب طلب بات لکھی بھی نہیں تھی۔ بس اپنی کیفیات بیان کر ڈالیں جنہیں
 نہ کہتا نہیں تمہاری کیا کیفیت ہوئی۔ تم نے میرا مذاق اڑایا یا مجھ پر غصہ آیا۔ یہ ضرور لکھنا تاکہ آئندہ میں محتاط
 رہاؤں۔“

اور بال ٹویہ نے مجھے سمیٹ کی شادی کی تصویریں بھیجی ہیں ان میں تمہاری دو تصویریں ہیں۔ دونوں میں صبا اور
 ساتھ ساتھ ہو۔ اور میں تم سے یہ کہوں گا مدحو کہ تم مصنوعی کے بجائے چاہے صبا کا اصلی مل نوج کر اپنے چہرے
 پہاڑ بھی صبا نہیں بن سکتیں۔ آئندہ ایسی کوشش نہیں کرنا اور اگر تمہیں صبا بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔

”ٹالی فٹ۔“ میں کیوں صبا جیسی بننے لگی۔ میسنی جی حضوری کرنے والی۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔“
 اس نے بے حد تھلا کر خط بھاڑ ڈالا اور لکھتی دیر اپنے آپ کو ہنسی رہی پھر اسے آپ نارمل بھی ہو گئی اور خط کے
 مدحو کہ ریکل جیران پھر پریشان سی ہو کر اہمیں چوڑے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ دروازے پر دستک کے
 صاحت کی آواز آئی۔ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

مدحو دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے۔“
 اس نے جلدی سے سارے ٹکڑے اکٹھے کر کے لفافے میں ڈالے اور لفافہ الماری میں چھپانے کے بعد
 دھکوتے ہوئے بولی۔

”نڈہ ہوں، مری نہیں ہوں۔“

”میں تمہارے دشمن۔“ صباحت اندر آتے ہوئے بولی۔

”جانی ہو۔ میرے دشمن کون ہیں؟“ اس نے قدرے شوخی سے دیکھا تو صباحت چیخ پڑی۔

”نہو! جو اس گھر کے کسی فرد کے نام لیا تو۔“

”اُہا۔“ وہ ہنستی ہوئی بیڈ پر جا گری۔ پھر کتنی کھڑی کر کے ہتھیلی پر سر نکاتی ہوئی صباحت کو متوجہ کر کے پوچھنے

”سنو! کبھی تم نے یہ خواہش کی ہے کہ تم میرے جیسی ہو تیں۔ یعنی تمہاری سوچیں، تمہاری عادات سب مجھ

جیسی۔“

صباحت نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تو وہ ایک دم بھر کراٹھ بیٹھی۔

”مجھے بھی ایسا کوئی شوق نہیں ہے کہ میں مدحیہ کے بجائے صباحت نظر آؤں اور تمہاری طرح ہر ایک کی خوشی

لے کر پروا کر لی پھروں۔“

”کچھ کر رابعہ کو ٹوکتے ہوئے بولا۔
 ”رابعہ! میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ اکیلی کہیں نہیں جاتیں۔“

”ہمارے ساتھ اکیلی کہاں ہوں گی؟ کیوں صباحت۔“ رابعہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ اندر ہی اندر ہنسی

بولی۔

”آپ سمجھیں نہیں۔ اصل میں مجھے لائبریری کے علاوہ اور کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے اور میرا

بھی میں بھائی کے ساتھ آتی ہوں۔“

”چلو تم وہاں جا کر بیٹھو۔“ علی جنانگیر نے آکر رابعہ کو ٹیبل کی طرف دھکیل دیا پھر اسے دیکھ کر بولا۔

اس کی باتوں کو مانڈ نہیں کیجیے گا۔“

”آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ آپ کی سسٹر بھی ساتھ ہوں گی۔“ وہ اس کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھ

بولی۔

”کل تک ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس ابھی آتے ہوئے سوچا۔“ اسے آپ سے ملوایں دوں۔ برت

رہی تھی اگر آپ کو اس کا آنا اچھا نہیں لگتا تو۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”بس میں اچانک کسی بات کو فیس نہیں کر سکتی۔“

”چلیں آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”غیبیٹ یو۔“ وہ دوسری رو میں مڑ کر ریک دیکھنے لگی اور پھر جس کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ اس

ہی علی جنانگیر نے پچھچلی اور کھول کر اوپر سے نیچے تک پورے صفحے پر نظر ڈالی پھر دھیمی آواز میں پڑھتے ہو

کے چہرے پر بہم سی مسکراہٹ تھی۔

”کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
 مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو۔ تجھے اپنا کوئی پتا نہ ہو
 کبھی دھوب دے کبھی بدلیاں دل و جان سے دونوں قبول ہیں
 مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو
 تیرے اختیار میں کیا نہیں۔ مجھے اس طرح سے نواز دے
 یوں دعائیں میری قبول ہوں میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

♥--♥--♥

عمر پھر اتر کا خط لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

مدحیہ نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ پہلے وہ چائے کا مطالبہ کرے گا اس کے بعد بھی بہت عاجز کر کے خدا

گا۔ اس لیے پہلے ہی بول پڑی۔

”سنو! مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ میں چائے تو کیا تمہیں پانی بھی نہیں پلاؤں گی۔ بے شک ذ

رکھو۔“

”یعنی تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ عمر جھل سا ہو گیا تھا۔

”بالکل نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”یہ سراسر زیادتی ہے مدحو کہ بڑے بھائی تو تمہیں اتنا مانتے ہیں اور تمہیں کوئی پروا ہی نہیں

اجتناب کیا۔“

”تم مجھے ایک میل نہیں کر سکتے۔ سمجھے۔“ وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”خط دینا۔“

یہاں سے کیونکہ میں اس وقت کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”میں کوئی بحث نہیں کر رہا، بس اتنا بتا دو کہ محض چائے پلانے کے ڈر سے تم ایسا کہہ رہی ہو یا دوا

”تو تم سے کس نے کہا ہے ایسا کرنے کو۔“ صباحت نے الجھ کر پوچھا۔

”کسی نے نہیں لیکن چاہتے سب یہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“
 ”کوئی نہیں۔“ بیٹھے تو بھی کسی نے نہیں کہا۔ تم پتا نہیں کیوں اپنے آپ سب سے شامی ہو جاتی ہو۔
 سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ابھی بھی نیچے تمہارا ذکر ہو رہا تھا پتا ہے مائی جی کیا کہہ رہی تھیں کہ نہ
 بھی وہ تمہارے جیسی لڑکی ڈھونڈیں گی۔“ صباحت کے سیدھے سادے انداز پر وہ مزید چڑھ کر بولی۔

”تم اسے میری تعریف سمجھ رہی ہو۔“
 ”تعریف ہی کر رہی تھیں مائی جی کہ مجھے مدد جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

”ہو نہ!“ اس نے نخوت سے سر جھٹکا تو صباحت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔
 ”ویسے اس وقت تمہیں کس بات کا غصہ ہے۔ نیچے تو تم کہیں نہیں پھر ٹیل بھائی نے کچھ کہا ہے۔“
 ”ٹیل بھائی ہوتے کہاں ہیں آج کل۔“ مجھے تو کس کھانے پر ہی نظر آتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر کچھ بولا۔
 ”ہوں اب سمجھی۔ مجھ سے کتنا رہے ہیں ٹیل بھائی۔“

”کیوں؟ تم سے کیوں کتنا رہیں گے؟“ صباحت کو اس کا ٹیل بل بدلتا موڈ سمجھ میں آ رہا تھا نہ اس کی بات پر۔
 ”بس ہے ایک بات، تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں آج ٹیل بھائی سے نمٹ لوں۔“ وہ پہلے بڑا
 دیکھ کر بولی پھر اپنے آپ جانے کیا بڑبڑانے لگی تھی۔

علی جمالیہ بہت خاموشی سے رابعہ کی باتیں سن رہا تھا جو وہ صباحت کے بارے میں اپنی ماں سے کہہ رہی
 ”ہے تو پاری لیکن کچھ مغرور سی لگتی ہے اب پھر میرے سامنے پوز کر رہی تھی زیادہ بات ہی نہیں کی اور
 بھی مجھے ٹوک کر ایک طرف ٹھادیا تھا ورنہ میں اس سے اس کی ماں کی عادات اور مزاج کا ضرور پتا چلا جیتے۔
 ”کہوں اس کی والدہ کے مزاج سے تمہیں کیا لینا دینا۔“ علی جمالیہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا تو رابعہ
 پہلے عارفہ بیگم بول پڑیں۔

”کیوں نہیں نے؟ پہلے تو ہمارا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ بقول بابا جان کے بڑی چالاک عورت ہے۔
 تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ بس بڑھی نکاحی سمجھ دار ہے جیسے شہر کی دوسری عورتیں نظر آتی ہیں اور اس کے
 بھی عام ہے۔“ عارفہ بیگم کچھ ناگوار سی سے کہہ رہی تھیں کہ فون کی ٹیل پر خاموش ہو گئیں۔
 علی جمالیہ نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف بابا جان تھے۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جی ابا کافون آیا تھا؟“ انہوں نے امی کو ساری بات سمجھا دی ہے۔“

”میں بس ابھی لے جا رہا ہوں امی اور رابعہ کو بھی۔“

”جی جی اچھا۔“

”خدا حافظ!“ اس نے ریسیور رکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”چلیں امی، ڈاکٹر آئیے آجی ہوں گی۔“

عارفہ بیگم اپنی چادر سنھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر رابعہ کے ساتھ آگے بڑھی تھیں۔
 کچھ دیر بعد علی جمالیہ کی گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی آئیے کے کینٹک کے گیٹ پر رکی تھی۔
 ”تم ہمیں رک کر انتظار کرو گے ما؟“ عارفہ بیگم نے اترتے ہوئے علی جمالیہ سے پوچھا۔
 ”اب پتا نہیں آپ کو کتنی دیر لگے۔ اگر جلدی فارغ ہو گئیں جب۔“ علی جمالیہ خود نہیں سمجھا بآ
 کرنا چاہیے۔

”تھک ہے پھر تم ہمیں روکو۔“ عارفہ بیگم خود انتظار کی زحمت سے بچنے کے لیے اسے انتظار میں چھ
 کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئیں پھر برآمدے سے آگے راہداری اس کے بعد کا سترے نمبر لے کر آ
 میں اطمینان سے دھنسن کر بیٹھ گئیں اور بہت تیکھی نظروں سے ہر طرف کا جائزہ لینے لگیں۔ جبکہ ر

پوچھتی تھی۔ اس کے اندر ایک تجسس سا جاگ اٹھا تھا۔ گلاس وال سے اندر آئیے کو دیکھ کر فوراً ”عارفہ بیگم
 لا کر سرگرمی میں بولی۔

”وہ دیکھیں ڈاکٹر؟ کیا یہی سکندر چاچا کی؟“

”عارفہ بیگم نے بری طرح اسے گھورا تو وہ بسور کر بولی۔

”ابن ساس رہی ہیں۔“

”ابھی سکتی ہے اور تم اگر چہ نہیں بیٹھ سکتیں تو جاؤ بھائی کے پاس۔“ عارفہ بیگم نے اسے مزید ڈانٹ بھی
 نہ روہ خاصی ناراض سی ہو کر آبی باری کا انتظار کرنے لگی، اور کافی دیر بعد ان کی باری آئی تھی۔
 رابعہ اپنے تدریج بھائی وجود کے ساتھ کھڑی ہوئیں اور پھر پہلے رابعہ کو آگے کر کے اس کے پیچھے آئیے کے
 میں داخل ہوئی تھیں۔

”نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں دونوں ماں بیٹی کو دیکھتے ہوئے رابعہ کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے
 تھی ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تو رابعہ اس کے قریب بیٹھ کر عارفہ بیگم کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی
 کے بارے میں وہی بتاؤں گی۔

”اب آئیے بھی عارفہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میری بیٹی ہے۔ کچھ کھائی پیتی نہیں ہے۔ دیکھیں، کتنی کمزور ہو رہی ہے۔“

رابعہ بیگم نے خاصی تشویش کے ساتھ کہا تو آئیے رابعہ کو دیکھ کر ڈاکٹر اسٹمسکرائی پھر اس کی کھائی تھام کر اپنے
 رانداز میں پوچھنے لگی۔

”یوں ناشتا کیوں نہیں کرتیں؟“ آئیے کے نرم لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اس لیے کہ میں ابھی ہی بارہ بجے ہوں اس وقت اگر ناشتہ کروں گی تو دوپہر کا کھانا رہ جائے گا پھر امی کو یہ فکر ہو
 میں کھانا نہیں کھائی۔“

”آپ کی یہ روئین کیوں ہے۔ پڑھتی نہیں ہو۔“

”پڑھ لیا اس نے بی اے کا امتحان دیا ہے اور اب تو اس کی شادی کریں گے۔“ رابعہ کے بجائے عارفہ بیگم نے
 دیا تو آئیے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”نوپرا تم اسے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ نیچے جہاں پڑھائی ختم ہوئی اپنی روئین خراب کر لیتے ہیں۔
 اسے دیر تک سونے سے باز رہیں پھر یہ خود ہی سب کھائے پیے گی اور بیٹا! آپ خود سمجھ دار ہو، آپ کو اپنی
 پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“ آئیے نے آخر میں رابعہ کو دیکھا تو وہ ابھی ہوئی بولی۔

”اٹی تو کس بڑھی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

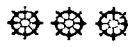
”لیا کوئی ماں جو ہوں۔“ عارفہ بیگم اٹھ کر رابعہ کی جگہ پر آ بیٹھیں اور اپنی تکلیف بتانے لگیں۔

”میری ٹانگوں میں بہت درد رہتا ہے۔ خاص طور سے ایڑیوں میں۔“ آئیے نے پوری توجہ سے ان کی تکلیف
 پوچھیں اٹھا کر میڈیسن لکھنے سے پہلے پوچھا۔

”ہم۔“

”بیگم عارفہ جمالیہ۔“ عارفہ بیگم کے لہجے میں جانے کیسا نفاخر سمٹ آیا تھا۔

”بیگم عارفہ جمالیہ۔“ آئیے کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا۔ چلتا ہوا قلم رک گیا اور بے اختیار انہیں دیکھ کر
 ”نپ شاہ پور سے آئی ہیں؟“



لوہ لہ کمال میں کراچی میں ہے؟“ عارفہ بیگم نے انتہائی معصوم بن کر پوچھا۔

آسیہ فوراً جواب نہیں دے سکی تو قدرے توقف سے عارفہ بیگم خود ہی کہنے لگیں۔

”ہم تو یہاں کانفرنس روڈ پر رہتے ہیں۔ وہ بھی ابھی دو مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اس سے پہلے تھے میرے میاں ابھی بھی وہیں ہیں ان کا اپنا بزنس ہے۔ اب سبوں سے وہاں جے ہوئے ہیں۔ آسکتے تھے۔ میں اپنے بیٹے اور اس بیٹی کی وجہ سے آئی ہوں۔ اس کی مفتی یہاں چچا کے گھر میں کئی دنوں کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ مل جائے تو پھر انشاء اللہ دونوں کیساتھ شادی کروں گی۔“

آسیہ بالکل غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگی تھی۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو یہی سہرا کر پڑی۔

”آپ یہ میڈیسن ایک ہفتہ استعمال کریں اس کے بعد میرے پاس آئیے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو دوں گی۔“

”میں نے دینی میں بہت علاج کرایا۔ جب تک وہ استعمال کرتی درد میں کمی ہوتی اور جہاں وہ پھرتا تکلیف، آخر کہاں تک وہ اکھاؤں تک آگئی ہوں۔“ عارفہ بیگم نے کہا۔

”اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔“ آسیہ نے کہہ کر ٹیل کا ہٹن پیش کیا تو رابعہ اگلے مریض کی آمد کا اشارہ کھڑی ہوئی اور ماں کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”چھا ڈاکٹر صاحبہ! میں پھر ایک ہفتہ بعد آؤں گی۔“ عارفہ بیگم اٹھتے ہوئے بولیں اور آسیہ کے متوجہ ناک سیکڑتی ہوئی رابعہ کے ساتھ باہر آ گئیں۔

علی جمناگیر گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر بھی اس نے کچھ مظاہرہ نہیں کیا تو رابعہ نے خود ہی عارفہ بیگم کو بٹھایا پھر دوسری طرف سے لیے فرسٹ ڈور کھولتے ہوئے بولی۔

”بھائی! کیا میں ڈیرا ڈالنے کا ارادہ ہے۔“

”ہیں! علی جمناگیر نے چونک کر اسے دیکھا پھر جلدی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور بہت جلدی سے باوجود خود کو فوراً کچھ پوچھنے سے باز رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اسپید سے مین روڈ پر لے کر آیا تھا کہ عارفہ بیگم اپنے آپ بولنے لگیں۔

”تو یہ کیسی چالاک عورت ہے۔ بابا جان نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ تو شکرے میں پہلے سے تیار تھا۔ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ہے نارابعہ؟“

”ہوں۔“ رابعہ زور زور سے اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

”کیا کیا ہوا تھا؟“ علی جمناگیر اب رہ نہیں سکا۔ اسپید آہستہ کر کے مرر میں عارفہ بیگم کو دیکھ کر بوجھ لگیں۔

”بہت تیز عورت ہے۔ میں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، پوچھنے لگی شاہ پور سے آئی ہیں۔ بتاؤ بھلا۔“

بات تو نہیں ہے سالوں گزر گئے۔ سکندر نے بھی کبھی اس کے سامنے میرا ذکر کیا ہو گا تو نام نہیں لیا ہو گا۔ جمناگیر بھی ایک صرف تمہارے باب کا نام تو نہیں ہے پھر بھی وہ خند ٹھک گئی تھی۔

”اور آپ؟ آپ نے کیا کہا؟“ علی جمناگیر نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

”رے بھائی! اسی نے تو کمال کر دیا۔“ رابعہ فوراً بول پڑی۔ خاصا پر جوش انداز تھا۔ ”حالانکہ میں لیکن امی نے اتنے سکون سے جواب دیا کہ ڈاکٹر آسیہ تو لیا اس کا۔“

علی جمناگیر نے تینبھی نظروں سے رابعہ کو دیکھا جس سے وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”ایک ہفتہ بعد بلایا ہے۔ اب دیکھو، کتنے عرصے میں بات بنتی ہے۔ ادھر بابا جان اتنے بے صبر ہیں۔ جلدی میں معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ یہ بات تم بابا جان کو سمجھاؤ نا۔“

عارفہ بیگم کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگیں۔

انہی نے صرف سہرا نے پراکتھا کیا تھا۔

غصوں پر ”خوشبو“ کھولے بڑے انہماک سے اس پر جھکی ہوئی تھی۔

انہی رسوائی تیرے نام کا چچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور کیا کیا دیکھوں
نہند آجائے تو کیا محفلیں بپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو کیا تنہائی کا صحرا دیکھوں
تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسنے
بوچھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں

آمد خاموشی سے ہوئی نہیں سکتی تھی۔ اسٹک کی آواز اس کے بعد وہ کرسی کھینچ کر بیٹھے لیکن وہ اتنی اسٹک کی آواز پر چونکی نہ کرسی گھسیٹنے جانے پر، نیل اسے متوجہ کرنے لگے تھے کہ پھر کسی خیال سے بہت خاموشی سے اس کے ہاتھ ہوئے سر کو دیکھنے لگے۔ کتنے لمحے یوں سر کے کہ اسے نیل تو کیا شاید ن تھی۔ پھر کھٹے پلٹے ہوئے سراو نچا کیا تو نہ صرف اچھل پڑی بلکہ بری طرح سٹپٹا بھی گئی تھی۔

”آپ آپ کب آئے؟“

”نہیں میری آمد کا پتا نہیں چلا۔“ نیل بلا ارادہ جتا گئے۔

”یہ ہی اتنی خاموشی ہے۔“ اس نے بھی بے ساختہ کہا لیکن فوراً احساس بھی ہو گیا۔ ”نہیں شاید تھیں۔“

ت دنوں سے دیکھ رہا ہوں اتنی گن ہو کہ اپنے آس پاس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی بات کو پرانی کتابوں میں ڈھونڈنے لگی ہو۔“ نیل نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور مسکرائے

”وہ گھبرا گئی“ میرا مطلب ہے۔ نئی بات کیا ہو سکتی ہے اور کتاب بھی نئی نہیں ہے۔ یہ دیکھیں،

کی تعریف کرو۔“ نیل نے کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا تو اس نے نچلا ہونٹا دانتوں میں بچنے کے بعد معذوری ظاہر کی۔

”مٹی البتہ محسوس کر سکتی ہوں۔“

اس بظاہر کتاب پر تھیں لیکن سارا دھیان اس کی طرف تھا اس کی بات سن کر کچھ بولے نہیں تو سے وہ انہیں متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”ہاں جو نے آپ سے کوئی کام لیا تھا؟“

”نیل کو جانے یاد نہیں تھا یا قصداً انجان بن کر پوچھا تو وہ ذرا سے کدھے اچکا کر بولی۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس کا کام نہیں کیا، جب ہی اس سے کترا رہے ہیں۔“

وہ جو کام اس نے کہا ہے، وہ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔“ نیل نے ناراضگی

اسے مجھے بتائیں۔“ اس نے عادت کے مطابق فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”نیل کچھ کتے کتے خاموش ہو گئے پھر گہری سانس کھینچ کر بولے۔“ مدحو بڑی جلدی بدگماں

ہو جاتی ہے حالانکہ میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”کس بات کی، مجھے بھی تو بتائیں یا مدحو نے منع کیا ہے آپ کو۔“ اس نے الجھ کر کہا۔
 ”نہیں اس نے تو منع نہیں کیا۔“ نیبل نے پرسوج انداز میں کہہ کر اسے دیکھا۔

”پھر آپ کیوں چھڑ رہے ہیں۔“
 ”بے وقوف! چھپا نہیں رہا بس یہ کہ تم بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو، اس لیے فی الحال تمہیں تیار رہنا پڑتا۔“
 ”نہیں، میں پریشان نہیں ہوں گی۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”جلدی سے بتائیں کیونکہ آپ نے مجھے بتا کر بتلا کر دیا ہے اور جب تک میں جان نہیں لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔“
 ”کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہی اسے شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کا دورہ پڑا ہے۔“ نیبل نے بے سرسری انداز میں کہا تو وہ ناگواری سے بولی۔

”اب اور کیا جاننا چاہتی ہے وہ۔“ ممانے سب بتا دیا ہے۔“
 ”ان کا اتنا بتاؤ نہیں بتایا اور وہی جاننا چاہتی ہے وہ۔“ نیبل کا انداز ہنوز تھا جس پر وہ چیخ مچی۔
 ”یعنی آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے اور مزید کوشش بھی کر رہے ہیں اتنا پتا معلوم کرنے کی اس بعد کیا ہو گا یہ سوچا ہے آپ نے۔“
 ”نیبل خاموشی سے اسے دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں۔“
 ”نہیں نیبل بھائی! آپ مدحو کا یہ کام نہیں کریں گے، اگر ماما کو معلوم ہو گیا تو انہیں بہت دکھ ہو گا اور پھر ہمیشہ آپ مجھے اور مدحو کو سمجھاتے رہے ہیں کہ ہمیں ماما کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیے پھر کیسے۔“ وہ بہت دکھ اور تاسف سے بول رہی تھی۔
 ”نیبل نے ہونٹ بھیچ کر گہری سانس کو پھر آنے سے روکا تھا۔

”کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں وہ پھر کوئی شوشہ چھوڑ دیتی ہے۔ شاید اسے سب کو پریشان کر کے مرنے کیس وہ بچ بچ تو پاگل نہیں ہے۔“ نیبل کی خاموشی پر وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”میں ممانے کو مل کی کسی سائیکالوجسٹ کے پاس لے جائیں اور نیبل بھائی آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے کچھ بولنے نہیں۔“
 ”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو اور وہی دیکھ رہا ہوں۔“ نیبل نے اپنی زبان کا انداز بدلتے ہوئے کہا۔

”تو کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔
 ”ہاں اب رونا بھی شروع کر دو۔“ نیبل کو جانے کیوں غصہ آ گیا۔ ”مدحو جیسے چلی گئی ہے ناں شاہ سکندر اور اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی، اسی بات سے ڈرتی ہو ناں تم اور پھوپھو بھی تو ایسا کبھی نہیں ہو گا وہ اگر گی بھی تو زیادہ دن وہاں رک نہیں سکے گی۔ اس لیے کہ وہ کسی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔ برعکس ماحول کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتی ہے اور اس گھر میں تو پھر اس کی مرضی چل جاتی ہے کہ اس سب کو پھوپھو کا خیال رہتا ہے اور شاہ سکندر کے ہاں تو بالکل ہی برعکس ہو گا پھر بتاؤ وہ کیسے رہے گی وہاں۔“
 ”آپ یعنی آپ مدحو کی فہم کر رہے ہیں۔“ وہ واقعی چکر اٹھی تھی۔
 ”نیبل نظر میں پڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے پھر کمرے کی طرف جاتے جاتے انہوں نے بے اختیار اس کے رکھا تھا۔

”نیبل بھائی!“ اس نے عقب سے پکارا لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے تو وہ سرا دیکھتی رہ گئی تھی۔

جس نے گئی۔ ”اگر سچ جیج ایسی کوئی بات، ہوتی تو وہ یہاں امی کو فون کرتے۔“
 نیک کہا آپ نے۔ ”مگر فوراً“ تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑے بھائی کی شرارت ہے۔ ضرور دھونے
 کی کوئی ایسی دھنسی بات لکھی ہوگی جس کے جواب میں انہوں نے ایسا مذاق کیا۔“
 بیاد بہت سنجیدہ تھے۔ ”اس نے لاپرواہی سے کہہ کر صباحت کو دیکھا تو وہ اسے خاموش رہنے کا اشارہ
 دے دی۔“

”حقیقت ہے، وہ ماموں جی آکر معلوم کر لیں گے۔“
 نیک کے لیے ہمیں اجازت دیجئے اللہ حافظ۔ ”مدحیہ ہنستی ہوئی بولی پھر صباحت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ

میرزا لجات تھے۔ خلیل بھائی کال بک کر دیا کوئی فون پر نظر نہ جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ابا جی،
 بونا بھائی نیل اور آسیہ بھی وہیں موجود تھی۔ اس کے باوجود کمرے میں گہرا سکوت تھا جسے فون کی نیل

خلیل بھائی نے فوراً ”سیور اٹھا یا تھا۔“ ”ہاں امیر کیسے ہو بیٹا؟“
 اب ٹھیک ہیں۔ تم ہواؤ شام میں فون کیا تھا تم نے۔“
 کیا تھا؟“

بال ٹھیک ہے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

عاجز کوچہ کہہ رہا تھا، خلیل بھائی بظاہر بڑے سکون سے سن رہے تھے۔
 رہا ہے؟“ ”اماں جی سے صبر نہیں ہو سکا۔ ان کا بازو ہلا کر پوچھا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور احمر سے

نے تم نے یہاں کا کیوں نہیں سوچا۔ میں تمہاری پھوپھو کو کیا جواب دوں گا۔ تمہارے کہنے پر ہم نے
 بت طے کی تھی۔ کوئی زبردستی نہیں ہوئی تھی تمہارے ساتھ اور تم بالکل غلط کہہ رہے ہو۔ گرین کارڈ
 مل نہیں ہوتے ویسے بھی اللہ کا شکر ہے ہمارے ساتھ کوئی ایسے مسائل نہیں ہیں، ہیلو ہیلو۔“ شاید
 ان کی۔ خلیل بھائی نے پاپوس ہو کر ریسورسز دیا پھر دھکے سے بولے تھے۔

”اس سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”میمونہ بھابی اسی قدر کہہ سکیں پھر رونے لگیں۔“

نیا کیا کر رہی ہیں۔ ”آسیہ نے فوراً ”ٹوک کر ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیا پھر اپنے تئیں انہیں تسلی
 ”امامان انہیں بے مشاء اللہ بہت سکھدار ہے۔ کچھ اچھا سوچ کر ہی اس نے یہ قدم اٹھایا ہو گا۔“
 سوچ کر اور یہاں منتقلی کیا سوچ کر کی تھی اس نے۔ اس وقت بھی نادان تو نہیں تھا۔ جو اسے اپنی نادانی
 سے خلیل بھائی کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔

نذر منہ کیا ہے اس نے ہمیں۔ ”میمونہ بھابی نے آسیہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔“

”اس کے لیے بھابی ایہ سب نہیں کریں۔“ آسیہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”ہم کوئی غیر نہیں ہیں۔ اس گھر
 کے ہر شخص کے سامنے ساتھ ہیں۔“

”نیک کتنی بے دلسن۔“ ”ابا جی تاکید کرتے ہوئے میمونہ بھابی سے کہنے لگے۔“ تمہیں اس کے سامنے
 ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ احمر جیسے تمہارا بیٹا ہے ویسے آسیہ کا۔ اس کے اس اقدام پر تم دونوں کا
 بے ہونا چاہیے۔ کسی نئے رشتے کو درمیان میں لا کر فاصلے مت پیدا کرو۔ پھر یہ سب قسمت کی باتیں
 ادا کرنا جو تمہیں لکھا ہو گا اور شاید اسی میں بہتری ہوگی۔“

آگے بڑھ گئی اور اماں جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔
 ”خواتین و حضرات میں آپ کے لیے زبردست خبر لائی ہوں۔ جسے سنتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑیں گے۔“
 ”مدحیہ!“ آسیہ نے گردن موڑ کر اسے کچھ تینہنہی نظروں سے دیکھا۔
 ”آپ سیشن تو ماما! وہ آسیہ سے کہہ کر باری باری سب کو دیکھنے لگی تو عقب سے عمر اس کے بالوں کو بڑبڑا رہا
 کر بولا۔“

”اب بتا بھی دو۔“ پہلے مٹھائی وغیرہ لاؤ اور ہاں ڈھولک بھی بجنی چاہیے کیونکہ احمر بھائی وہاں شادی کر رہے
 ہیں۔ ”وہ واقعی کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔“

آسیہ اور میمونہ بھابی قدرے سناٹے میں آکر اسے دیکھنے لگیں جبکہ صباحت اور سونیا کے ہونٹوں سے چہرہ
 آواز میں گہرا نکلا نکلا تھا اور اماں جی بس ایک لحظہ کو غصہ ٹھیکیں پھر اس پر ہلکے سنکین۔

”باؤلی ہو گئی ہو کیا؟“ ”میمونہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔“
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں اماں جی! احمر بھائی نے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے مجھے۔“ اس نے زور دے کر کہا تو میمونہ
 بھابی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”ک۔ کیا بتایا ہے اس نے؟“
 ”یہی کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔ اچھا ہے ناں، اماں جی اس گھر میں ایک انگریز لڑکی آجائے گی، جس کی آنکھیں
 نیلے سمندر جیسی ہوں گی اور“

وہ بولتی جا رہی تھی۔ کھنکھتی ہوئی آواز اور درمیان میں کہیں کہیں کھلکھلاتی ہنسی جس نے سب کو دشت حیرت
 میں ڈھکیل دیا تھا۔
 میں عمر نے آہستہ سے اس کا بازو تھاما اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

”کیا بکواس ہے۔“
 ”تمہیں یقین نہیں آ رہا، ابھی کال ملاؤ امریکہ کی اور پوچھ لو احمر بھائی سے۔“ اس نے کہا تو عمر کچھ دیر بغور نا
 دیکھتا رہا پھر دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”اور“ اور کیا کہا بڑے بھائی نے؟“
 ”کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔“ وہ عمر کی نظروں سے اندر رہی اندر دیکھنے لگی تھی۔
 ”اور تم اسے خوشخبری کہہ رہی ہو۔“

”کیوں یہ خوشی کی خبر نہیں ہے اور۔۔۔ اس سب۔“
 وہ ایک لحظہ کو خاموش ہوئی پھر جیسے اچانک سمجھنے کا اظہار کرتی ہوئی کہنے لگی۔
 ”اچھا اب سمجھی سب کو میری خوشی پر حیرت ہو رہی ہے۔ یہی بات ہے ناں۔ چلو تو میں اس کی شکل

ہوں۔ گھوٹو آنکھوں میں آنسو بھی بھر لوں۔ لیکن یہ ہے بہت مشکل کام اور تم تو جانتے ہو میں کتنی سلی
 ہوں۔“

عمر خاموشی سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھتا رہا۔ پیشانی سے ہونٹوں تک کہیں سے توجہ
 کوئی قیامت بنتی ہے لیکن وہ مدحیہ بھی بات بے بات قیامت برپا کر سکتی تھی تو چھپا بھی سکتی تھی۔ بڑی رازدار
 بول کر عمر کو بول دیکھنے لگی جیسے تمہیں کیا ہوا ہے۔ بھی صباحت اور سونیا اماں جی کے کمرے سے نکلیں
 دونوں کو خاموشی سے کھڑے دیکھ کر سونیا تیزی سے قریب آکر پوچھنے لگی۔

”کیا پھر احمر بھائی کا فون آیا ہے؟“
 ”نہیں تو کوئی؟“ وہ سونیا کی طرف گھوم کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”سچ بتاؤ مدحیہ! تم مذاق تو نہیں کر رہی یا ہو سکتا ہے احمر بھائی نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہو۔“ ”سونیا ناں

”شاید“۔ آسہ نے دکھ سے سوچا۔ پھر موضوع بدلنے کی خاطر خاموش بیٹھے نیل کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”بنا آج چھٹی کے دن تم کہاں چلے گئے تھے؟“
 ”جی، مجھ سے کچھ کہا۔“ نیل نے چونک کر دیکھا۔
 ”کہاں رہے سارا دن؟“ اس بار ابائی نے پوچھا۔

”ڈیڈی کی طرف چلا گیا تھا۔ دوپہر تک وہاں رہا اس کے بعد ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔“ نیل بتاتا رہا
 کھڑے ہوئے۔ چلیں پھوپھو! بوائے کھانا لگا دیا ہو گا۔“
 ”ہاں چلو اور بھابی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلیں انھیں آپ بھی کھانا وغیرہ کھا کر۔“
 آسہ نے اٹھتے ہوئے میونہ بھابی کو بھی ساتھ کھڑا کیا پھر کمرے سے نکل کر نیل کے ساتھ اوپر آئی۔
 بوا کھانا لگا رہی تھیں۔ جبکہ مدحیہ اور صباحت لی وی کے سامنے بیٹھی بڑے اٹھماک سے ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔

”مدحو! آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔“ آسہ نے بالکل غیر ارادی طور پر صرف مدحیہ کو پکارا شاید اس لیے کہ اس کا ذہن مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
 ”بس دو منٹ نما! اینڈ دیکھ لوں۔“ مدحیہ نے لی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا تبھی اسکرین بلیک ہو گئی۔ پھر
 بقیہ خبرنامہ کے بعد۔

”ٹو ہو گیا اینڈ۔“ صباحت اسے چھیٹی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”کتنا بور کرنے لگے ہیں یہ لی وی والے۔ پورے دس منٹ ہیں نو بجنے میں اور ڈرامہ دیکھنا دو منٹ کا رہ گیا۔“
 ”مدحیہ نے جھنجھلا کر لی وی بند کر دیا پھر ہاتھ دھونے کے بعد نیل پر آکر بیٹھی اور آسہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔
 ”احمر بھائی سے بات ہو گئی آپ کی؟ میں نے سچ کہا تھا نا۔“
 ”چلو کھانا کھاؤ۔“ آسہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ آیا اسے احساس نہیں ہے یا پوڈ کر رہی ہے۔
 ”واقعی نما! آپ کی بات ہوئی ہے احمر بھائی سے۔ کیا کہا انہوں نے؟“ صباحت نے پوچھا تو آسہ کو ایک دم غم
 آ گیا۔

”کچھ نہیں، کچھ نہیں کہا اس نے تم دونوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کھانے کے وقت گھر
 خاموش نہیں رہ سکتیں اور تمہیں اس سے کیا احمر نے شادی کی ہے یا نہیں۔“
 ”ہاں ہمیں کیا۔“ مدحیہ نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے پھر صباحت کو کہنی مار کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
 نیل کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مدحیہ کی لا پرواہی پر مزید متعجب ہوئے اور پھر کھانے کے دوران بار بار
 دیکھتے رہے۔ اس وقت جب مدحیہ نے نیچے جا کر سب کو خوش خبری سنائی تھی وہ موجود نہیں تھے تب ہی اب حیران
 رہے تھے۔

صباحت اور مدحیہ پہلے کھانا ختم کر کے اٹھ گئیں، تب وہ آسہ کو متوجہ کر کے پوچھنے لگے۔
 ”پھوپھو! کیا مدحو کو پہلے سے معلوم تھا۔ وہ احمر کی شادی کا؟“
 ”ہاں، شام میں احمر کا فون آیا تھا۔ اسی نے اینڈ کیا تھا اور بتا نہیں اس نے کس انداز سے اسے بتایا کہ وہ شادی
 سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ باقاعدہ سب کو خوشخبری سنائی۔“ آسہ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔
 نادان تو نہیں ہے جو اسے احساس نہ ہوا پھر کچھ زیادہ سمجھ دار ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“
 نیل کی سمجھ میں نہیں آیا کیا لیں اس لیے بس سر ہلا کر رہ گئے۔

”چلو یہ بھی اچھا ہے کہ اس نے محسوس نہیں کیا۔ گو کہ احمر نے اچھا نہیں کیا مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اب
 میں یہ کہوں گی کہ اچھا ہوا اس نے اسی وقت یہ قدم اٹھالیا۔ اگر شادی کے بعد۔“
 آسہ نے اچانک کسی خیال سے جھرجھری لی تھی پھر نیل کی طرف دیکھے اٹھ کر چلی گئی۔
 نیل کو آسہ کا جانا بہت غیبت لگا ورنہ انہیں اٹھنے کے لیے کوئی تدبیر کرنی پڑتی جو کہ اس وقت بہت

بدرج میں ایسے موڑ آتے ہی اس لیے ہیں کہ انسان اپنی اوقات پہچان لے کہ وہ کتنا بے بس ہے۔
 سر فلپ میں اچھٹے لگے تھے کہ صباحت نے دبے پاؤں آکر بہت دھیرے سے انہیں پکارا۔
 ”نیل! نیل بری طرح چونکے تھے۔

”جی جی! یہیں بیٹھے ہیں۔ کیا بوا سے مزید کسی ڈش کی فرمائش کرنی ہے۔“ صباحت نے ان کے سامنے
 ہاتھ ہوئے پوچھا۔

نیل البتہ چائے کی فرمائش تم سے کروں گا اور سونچا ہے ذرا اسٹرانگ ہو۔“
 ”وئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر اپنے کمرے میں آکر بیٹھے احمر کے بارے میں سوچنے لگے سب کی طرح
 اس کی حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ احمر وہاں شادی کر سکتا ہے۔ لیکن جھٹلایا یوں نہیں جاسکتا تھا
 ہے میں یہ اطلاع خود احمر نے دی تھی۔ جس کے مزاج میں کوئی رنگین نہیں تھی جس کی بنا رکھا جانا کہ
 با۔ بلکہ اس کی تعریف تو یہ تھی کہ وہ شروع سے خاصا سمجھ دار اور ذمہ دار لڑکا تھا۔ اس لیے اس کی یہ
 میں نہیں آ رہی تھی۔

غالی چائے۔“ صباحت نے انہیں متوجہ کر کے کپ تھمایا تھا۔
 ”مدحو کیا کر رہی ہے؟“ انہوں نے چائے کا سپ لے کر پوچھا تو صباحت بیٹھے ہوئے خاصی بے دلی سے

”ہے۔“
 ”وہ حیران ہوئے۔“ ابھی تو دس بھی نہیں بجے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی۔“
 ”رہی تھی۔ سب مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں جیسے میں کوئی عجوبہ ہو گئی ہوں۔“ صباحت مدحیہ کی
 زبانا ہی پھر کہنے لگی۔

”لگتا ہے مدحو اور احمر بھائی نے مل کر کوئی سازش کی ہے اور ہم سب کو یہ وقفہ بنا رہے ہیں ہے نا۔“
 ”نیل کا انداز نہ سمجھنے والا تھا۔

”مدحو کے اطمینان سے پتا نہیں چل رہا۔ اتنی بڑی بات پر اگر وہ ہنگامہ کھڑا نہ کرتی تب بھی مجھ سے تو ضرور
 ایسے احمر بھائی کے جانے کے دنوں میں اداس تھی تو مجھ سے اس نے کہا تھا کہ احمر کے جانے کے بعد اسے
 نہیں لگے گا اور آج تو یہ تک نہیں کہا کہ احمر نے اچھا نہیں کیا۔“ صباحت نے کہا تو نیل کچھ دیر
 دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”اسے ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو اور جا کر سو جاؤ۔ مجھے صبح کے لیے لیکچر تیار کرنا ہے۔“
 ”جی! جی۔“ وہ منہ پھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑبڑاتی ہوئی گئی تھی۔

”چائے کا کپ خالی کر کے رکھا پھر ٹیوب لائٹ آف کر کے اپنی رائٹنگ میبل پر آکر بیٹھے اور نیل
 کے سامنے فائل کھول لی لیکن کتنی دیر بعد بھی صفحے سادہ کے سادہ تھے بالکل ان کے ذہن کی طرح
 کوئی سوچ سمای نہیں رہی تھی۔ البتہ نظروں کے سامنے سے جانے بک بک کے واقعات بول کر زور رہے
 ان کی کل کی بات ہو یہاں تک کہ ایک ہی غلط پر مرکوزہ کران کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تو ایک لحظہ
 ہٹے آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں تو جیسے طویل نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔ کچھ حیران ہو کر اپنی آنکھوں
 میں کوئی کچھ پھرا سے رہنے کے ساتھ نیل لیپ بھی آف کر دیا اور چیئر کی بیک پر سر رکھ کر مدحیہ کے
 سامنے بیٹھے لگے کہ اسے واقعی احساس نہیں ہے یا بقل آسہ کے کچھ زیادہ سمجھ دار ہو گئی ہے اور ابھی وہ
 پھر نہیں پہنچے تھے کہ ہلکی سی آہٹ نے ان کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
 ”نیل لیپ آ کر کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر کسی خیال کے تحت رک گئے اور بہت احتیاط سے بنا
 ٹپک اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آکر اسی احتیاط سے باہر جانا کواستاروں کی مدھم روشنی میں
 ناظر آیا جس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔

ماں تو ڈراما صاحت کو بلا دو۔“
 اگر ادھر سے صاحت ہی نے ریسیو کیا تب کے بلانا ہے۔“ رابعہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی لیکن اس نے ان کے ریسیور سے تھمایا پھر مرمیہ داخل کر کے اسے دیکھنے لگا تھا۔

لو! دوسری طرف مدیہ تھی۔
 صاحت! میں ہوں رابعہ۔“ رابعہ آواز سے دھوکا کھا کر جتنی خوشی ہو کر بولی ادھر سے اتنا ہی تلخ لہجہ تھا۔
 میں میں صاحت نہیں ہوں۔“
 ہاں میں پکیزہ صاحت کو بلا دیں۔“ رابعہ قدرے بوکھلا گئی تھی۔
 دوسری ریسیور تھکنے کی آواز آئی تو رابعہ نے ناگواری سے ریسیور کو گھورا پھر علی جمائیکر کو دیکھ کر بولی۔
 ہاں میں کون یا گل ہے۔“

اچھے دو۔“ علی جمائیکر نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا تبھی ادھر سے صاحت نے ریسیور غا۔
 کیوں؟“

کیا ایسی ہیں آپ۔“
 اگل ٹھیک۔“ صاحت کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے رابعہ کو جانے کا اشارہ کیا پھر اس سے بات دنوں سے آپ نے فون نہیں کیا تو میں نے سوچا میں ہی آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔ سب ٹھیک تو ہے

میں۔“ صاحت کے مختصر جواب پر وہ چڑ گیا۔
 آپ کو اندازہ ہے کہ میں کس شدت سے آپ کے فون کا انتظار کرتا ہوں۔ کیا کرتی رہتی ہیں سارا وقت اتنا میں ہو سکا کہ۔“
 علی جمائیکر اس طرح بات نہیں کریں۔“ اس کے عاجزی سے ٹوکنے پر وہ ہونٹ بھیج گیا۔ پھر چند لمحے توقف سے

کی سانس بھیج کر بولا۔
 ہاں! ایک ساری ایک تو آپ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں لا سیریری کب جاری ہیں۔“
 انا حال کوئی پروگرام نہیں۔“
 اگر میں انہوں کل کاروگرام رکھ لیں۔“
 میں اور پکیزہ اصرار نہیں کیجیے گا۔ کیونکہ آج کل ماما کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہیں جانے کی اجازت مانگیں۔“ صاحت نے منع کرنے کے ساتھ سبب بتایا تو وہ جو یہی جانا چاہتا تھا بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے

یا ہوا آپ کی ماما کو؟“
 وہ ادھر میری سسر۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔
 آپ کی سسر بھی ہیں؟“ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا تو ادھر وہ ہنس پڑی۔
 ہاں! کامیابی بہن نہیں ہو سکتی۔“
 ہاں۔“ وہ ابھی بھی حیران تھا۔ جس پر وہ محفوظ ہو کر بولی۔
 میں سوچتی۔“

والہ! وہ ایک دم ہونٹ بھیج گیا۔ غالباً! جو پوچھنے جا رہا تھا کہ آسیہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن فوراً
 ہونٹ پر خاموش ہو گیا اور پھر فوراً! بات بھی بتا گیا! ”ابھی شاید آپ کی سسر نے ہی فون ریسیور کیا تھا۔“
 ہاں! بد فہمی تو نہیں کی اس نے؟“

”مدیہ!“ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد جہاں ان کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی وہاں دل پر چوٹ کی تھی کہ یہ وہ لڑکی تھی جو چھین لیتا جانتی تھی اور کبھی اپنی اس حرکت پر نادم بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب اس طرح رد رہی تھی۔ شاید اپنی بے بسی پر یا شاید اس کی بے وفائی پر جانے کیا بات تھی جو وہ بیش کی طرف سے احتجاج کرنے کے بجائے بے آواز آسو بہا رہی تھی جو براہ راست ان کے دل پر گرنے لگے تھے۔
 بہت چاہنے کے باوجود وہ اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکے کیونکہ اس سے کچھ بعد نہیں تھا انہر سامنے دیکھ کر بے قابو ہو سکتی تھی اور رات کے اس پسروہ کس کس سے کیا کیا کہتے یہی سوچ کر وہ بہت خاموش رہی اپنی جگہ پر آکر لیٹے تو ان کا دل اس کے آنسوؤں کے بوجھ تلے دیا جا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥
 علی جمائیکر، آج جتنی جلدی گھر جانا چاہتا تھا اتنی ہی آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر گھر آتے آتے فون لگے تھے
 آمدے میں قدم رکھتے ہی اس نے رابعہ کو پکارنا شروع کر دیا اور لاؤنچ میں آیا تو وہ کوئی غیر ملکی چینل دیکھنے میں
 مگن تھی کہ اس کی آواز بتا نہیں سنی نہیں یا جان بوجھ کر دھیمان نہیں دے رہی تھی۔ اس نے برہ کمر دی کا
 ہی سمجھ دیا تب وہ چیخ پڑی۔

”کیا کر رہے ہیں بھائی لگا میں ناں۔“
 ”سٹ اپ!“ اس نے قدرے غصہ دکھا کر اسے خاموش کر دیا پھر صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کو
 ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“ رابعہ کی رو بھی ہوئی آواز آئی۔
 ”خیریت!“ اس نے سر اٹھا کر کے اسے دیکھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ان کی۔ ڈاکٹر کہاں گئی تھیں؟“
 ”صل میں تو آپ بھی پوچھنا چاہتے ہیں اور میں تفصیل سے اس وقت بتاؤں گی جب آپ لی دی ان
 گے۔“ رابعہ نے فوراً سمجھ کر کہا تو اس نے پھر بیٹائی پر شکائیں ڈال لیں۔

”بالکل نہیں۔ ہر وقت لی دی ہوئی، کوئی اور کام نہیں ہے نہیں۔“
 ”کیوں نہیں؟ آپ کے کام سے گئی تو بھی امی کے ساتھ بیمار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو بیمار ظاہر کرنا؟“
 آسیہ کا کچھ سننا ٹیکن آج تو وہ خود مریض لگ رہی تھیں۔ ”رابعہ نہ بتانے کا کہہ کر بھی بتانے لگی تھی۔“
 پریشان بھی لگ رہی تھیں۔ امی کی باتوں پر کوئی توجہ ہی نہیں دی اور فوراً نسخہ لکھ کر ہاتھ میں تھام لیا۔

”اس سے یہ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ وہ پریشان تھیں؟“ اس نے بر سوچ انداز میں کہا۔
 ”ان کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ پھر بار بار بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھکا دے رہی تھیں جیسے کہ
 کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں رابعہ نے باقاعدہ آسیہ کی طرح کر کے دکھایا تو وہ اندر سے
 چین سا ہو گیا اور اسی سوچتے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

”کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟“
 ”یہ تو ہم نے نہیں پوچھا کیونکہ ابھی اتنی زیادہ جان پہچان تو نہیں ہوئی ان سے۔“ رابعہ نے اس کی
 سن کر کہا تو اس نے چونک کر دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا تم کھانا لگواؤ۔ میں چیچنگ کر کے آتا ہوں۔“
 رابعہ نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی وہیں سے کرم دین کو پکار کر کھانا لگانے کو کہہ دیا۔
 علی جمائیکر کا ذہن آسیہ کی پریشانی کو سوچتے ہوئے صاحت تک جا پہنچا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ
 نہیں ہے جس کی وجہ سے آسیہ پریشان ہے۔ چیچنگ کرتے ہوئے اور پھر کھانے کے دوران کچھ دیر
 رہا۔ کتنی باتیں تھیں اور ہر بات کے اختتام پر سوالیہ نشان جس سے اس کی بے چینی سوا ہوئی۔ تب
 کھانا ختم کر کے وہ رابعہ کو اشارہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد رابعہ اس کے پیچھے آئی تو وہ فوراً! ”میں فون سیٹ اپنے قریب سمجھ کر بولا۔“

”بھٹ سے تو بات نہیں ہوئی۔ راجہ بات کر رہی تھی اور میرا خیال ہے اس کے ساتھ بھی کوئی بدتمیزی نہ ہوگی کیوں کیا بات بدتمیزی ہے؟“ اس نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

”نہیں بس موڈی ہے۔“
”تو اس موڈی کی وجہ سے آپ کی ماما موڈ آف ہے۔“

”ہاں بس۔“
”نہیں تو جب ان کا موڈ ٹھیک ہو تب آپ خود مجھے رنگ کیجئے گا اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہوگی۔“
”اللہ حافظ!“ دھڑ سے سلسلہ منقطع ہو گیا تو وہ ریسور کھ کھڑا ہوا اور ادھر سے ادھر ٹٹلنے لگا۔

”جیسے لگی تھیں۔ جبکہ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔“
”دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ نیپل نے پکارا۔ دوسری اور پھر تیسری بار تب پہلے اس کی حرکت ہوئی پھر اٹھ کر ست روی سے جا کر دروازہ کھولا تو نیپل نے تشویش سے پوچھا۔
”تھک تو ہیں نا پھو پھو!“

”اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیپل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
”پریشان کرنے کی بے حد جو آپ کو۔“ نیپل نے اندر آتے ہوئے بس یوں کہی۔
”جیسا پریشان کرے میں اسے شاہ سکندر کے پاس نہیں جانے دوں گی یہ بات تم اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ نیپل میں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ تنفر سے کہتی ہوئی نیپل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
”سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے پھو پھو! وہ خود سمجھتی ہے۔ آپ بس اسے اس کے حال پر چھوڑیں۔“
”نہی کر سی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔“

”تک۔ جب سب مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔“
”بس آپ سے کوئی ناراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ احمر نے اس اٹھ جو عین مذاق کیا ہے اس پر اس کا یہی رد عمل ہو سکتا ہے۔“
”برج سے کہتے ہوئے نیپل کی نظروں میں اس رات کی مدیہ تھی جو خود کو بہت مضبوط پوز کرتے کرتے شاید نیپل سے چھپ کر رات کی تاریکی میں بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔
”بلن مٹا! احمر کے اس فعل میں یہاں کا کوئی فرد شریک نہیں ہے۔ یہ وہ بھی جانتی ہے پھر کیوں۔“
”بارے وہ۔ احمر سامنے نہیں ہے اس لیے اس کے گھر والے نشاندہ بن رہے ہیں۔ آپ ایسا کریں۔ کچھ دنوں کے لیے شکیل بیچا کے پاس اسلام آباد بھیج دیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نیپل کے مشورے پر وہ کچھ دیر لڑائی پھر دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلائی ہوئی کہنے لگی۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ لیکن تم کچھ مت کہنا اس سے کیونکہ ہمارے کہنے پر وہ کبھی نہیں جائے گی۔ میں آج میں شکیل بھائی کو فون کر کے انہیں ساری بات بتا کر کہوں گی کہ وہ خود آکر اسے لے جائیں۔“
”اُدھو کے لیے بھی یہی بہتر ہے۔ ماحول کے ساتھ آب و ہوا کی تبدیلی اس پر اچھا اثر ڈالے گی۔“ نیپل نے بولے۔ ”چلیں اب آپ آرام کریں۔“
”آرام کا وقت نہیں ہے بیٹا! کلیک جانا ہے۔“ آسیہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا پھر نیپل کے جاتے ہی وارڈ سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔

”پاپا! آؤ گھنٹے بعد جب وہ تیار ہو کر کلینک جانے کے لیے نکلی تب بھی وہ — مضطرب تھی۔ مدیہ کو بلو بھیجنا ٹھیک بھی لگ رہا تھا اور اس کی عادات و مزاج کی وجہ سے پریشان بھی تھی۔ کیونکہ شکیل بھائی اسے میڈیسن کے قائل۔ جبکہ مدیہ کا مزاج ہی الگ تھا۔ اسے ہر عمل میں آزاد کسی قسم کی کوئی اس سے برواشت ہی نہیں ہوتی تھی اور نہ گھر کے کام کاج سے اسے کوئی دلچسپی تھی۔
”پاپا میں مدعو ہوں نئے دن رہ سکے گی اور کہیں شکیل بھائی اور سیمابھائی کے لیے کوئی پرائلمن نہ کھڑی کر

”اس اپنیڈ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل اپنی سوچوں میں گہرا ہوا تھا۔ راستے پر نظر تو تھی لیکن کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ اپنی سوچوں میں بہت آگے تک نکل گئی۔ جب سگنل پر گاڑی روکی تب ماہوار کے کلینک کو پہنچے رہ گیا۔ اپنی بے خبری پر کڑھتی ہوئی سگنل کھٹنے پر گاڑی اپنیڈ سے بھاگ کر اوٹنڈا باؤٹ کی سڑک پر آئی تھی کہ روڈ کراس کرتی ہوئی ایک عورت اچانک سامنے آئی جسے بچانے کے چکر میں اس کی فیسپا پتھر پر چڑھ گئی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ وہاں کوئی نہیں تھا پھر بھی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اٹھارہ زور سے دھڑکنے لگا کیسے ابھی سینے سے باہر نکل آئے گا۔ جبکہ ہاتھ بالکل ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ کتنی

آسیہ واقعی مدیہ کے ہاتھوں سخت پریشان تھی۔ جو اپنی تلخ کلامی، طنز، جملوں اور حرکتوں سے سارے ماحول خراب کرنے پر تل گئی تھی۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ تو وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی اور اب تو اور زیادہ تھی۔ غالباً ”احمر کی بے وفائی کا بدلہ وہ اس طرح لے رہی تھی کہ میمونہ بھابھی کو بھی نہیں چھوڑتی تھی جاتے کبھی ان پر طنز کرتی اور کبھی بظاہر ہمدرد بن کر انہیں مشورہ دیتی کہ سونیا آپنی کے لیے کوئی اور شہر کیونکہ اشعر بھائی بھی باہر گئے ہوئے ہیں کیا پتا وہیں سے میم لے آئیں اور بے چاری میمونہ بھابھی پر جاتیں۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ قصور تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی سب اس کے سامنے ہوئے تھے۔ اور آسیہ نے زندگی اسی گھر میں گزار دی تھی۔ ابھی میمونہ بھابھی کے ساتھ تلخ کلامی تو لیا ہوا بات نہیں کی تھی اور کسی رنجش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ”نند بھاون والا رشتہ تو لگتا ہی نہیں تھا۔“
”حقیقتاً“ سبکی بہنوں سے بڑھ کر محبت ملی تھی اسے میمونہ بھابھی کی طرف سے اور ایسی محبت کرنے خاتون کے ساتھ مدیہ کی بدتمیزیوں پر اس کی پریشانی فطری تھی۔ گو کہ میمونہ بھابھی اس سے کہہ چکی مدیہ کی باتوں کا برا نہیں بنتیں۔ اسے حق ہے یہ سب کہنے کا۔ لیکن آسیہ کے نزدیک یہ اس کا حق نہیں کی طرف سے ناحق زیادتی تھی جو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاسکتی تھی اور آسیہ اس وقت سے کہ اوھر برداشت کی حد ختم ہو گئی تو پھر عمر بھر کی محبتیں مٹی میں مل جائیں گی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی لیے ضروری تھا کہ مدیہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے اور اسے باز رکھنے کے لیے آسیہ نے اپنا ہر حربہ سے ”پیار سے غصے سے یہاں تک کہ خود کو اس کے سامنے بہت عاجز اور مجبور بھی ظاہر کیا لیکن اس پر ہوا اور اس وقت تو آسیہ نے جیسے ہار مان کر اس سے پوچھا تھا۔

”بھٹے پاپا! تم کیا چاہتی ہو آخر؟“
”میں کچھ نہیں چاہتی ماما! اگر آپ مجھ سے اتنی تنگ ہیں تو مجھے میرے باپ کے پاس بھیج دیں اسے آرام سے کہنے پر آسیہ کچھ دیر کو نہالے میں آگئی تھی۔
”صباح نے سسم کر نیپل کو دیکھا تو انہوں نے آنکھوں سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔
”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ باپ تمہیں اپنے پاس رکھ لے گا۔“ نہالے سے نکل کر آسیہ نے فورا کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ یقین سے بولی۔

”انکا ذہنی نہیں کریں گے۔“
”یہ شخص تمہارا خیال ہے مدھو! اس شخص کو اگر تم سے ذرا سی بھی محبت ہو تو وہ بہت پہلے نہ چین کر لے جاسکتا تھا اور نہ لے جانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے دل میں اور گھر میں بھی نہیں ہے اور تم اتنی نادان نہیں ہو جو سمجھ نہ سکے۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دو ورنہ۔“
آسیہ کا مضبوطاب دینے لگا تھا جب ہی متنبہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی اور اپنے کمرے اندر سے لاک کر کے بیڈ پر ڈھس گئی۔ اور کتنی دیر سیدھی بیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ یہاں تک کہ

بہا! آپ کی مایہ جی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔“ ٹھیک بھائی، مدیہ کے لٹھ مارنے والے انداز میں سلام کا گے کر کھینے لگے۔ ”کہہ رہی تھیں۔ مدیہ کی چھٹیاں ہو گئی ہوں تو اسے لے آئیے گا۔ چلو گی؟“
بھی چھٹیاں نہیں ہوئیں اور ہوں گی بھی تو مہما نہیں جانے دیں گی۔“ مدیہ کا روٹھا ہوا لہجہ سب سے سن کر ظاہر کر رہا تھا۔

یہ نہیں جانے دیں گی بھی، آپ کو تو میں ابھی آپ کو ساتھ لے چلوں آئیہ منع کر کے تو دیکھے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ کا احساس دے کر کہا تو اس سے پہلے صاحت بول پڑی۔
بھی نہیں ماموں جی! امتحانوں کے بعد لے جائیے گا۔“

کچھ کچھ اعتراض ابھی سے شروع ہو گیا۔ ”مدیہ نے یوں سر جھٹکا جیسے اسے صاحت کی مداخلت سخت اذیت دے رہی ہو۔“

پس کوئی اعتراض، کوئی عذر نہیں سن رہا صبا کا نہ آئیہ کی طرف سے سنوں گا۔ چلو آپ تیاری کر دو صبح کیلئے آپ کو میرے ساتھ جانا ہے۔“

”اچھا ماموں جی! آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ مدیہ کی خوشی میں بے یقینی بھی تھی۔ ”مما منع نہیں کرتی۔“

”ان کے یقین دلائے پر اس نے گردن اٹھا کر صاحت کو دیکھا جیسے اب اسے کوئی نہیں روک سکتی۔“ پھر بھاگتی ہوئی اور آئی اور اسی وقت الماری میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بند کر دیتے تھے۔
”کیا کر رہی ہو؟“ کچھ دیر بعد صاحت کمرے میں داخل ہوئی اور سمجھنے کے باوجود ٹوک گئی۔

”تیاری ہم جلدی سے سوٹ کیس خالی کر دو۔“ وہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بولی۔
”وہ تو میں کر دوں گی لیکن بہتر یہ ہے پہلے تم مہما سے پوچھ لو۔“ صاحت نے ہر گھڑکی سے پردے سمیٹتے ہوئے

”مہما جی پوچھیں گے۔ مجھے تو وہ صاف منع کر دیں گی۔“

”ٹھیک منع کریں گی۔“ اور امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے ہیں، تمہیں خود سوچنا چاہیے۔ مہما تھارے بھلے بات کرتی ہیں۔“ صاحت نے دھیر دھیر سے اسے سمجھانا شروع کیا تھا کہ وہ کھانا کھا کر الماری بند کر کے اس

فرز پلٹ کر ہاتھ جوڑی ہوئی بولی۔
”مہما جی دو بہت ہو گیا میرا بھلا! اب کچھ برا ہو جائے دو۔“

”اللہ نہ کرے جو کچھ برا ہو۔ تمہاری ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ صاحت بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کر تھوڑے جھٹک کر خود ہی سوٹ کیس اتار کر خالی کرنے میں لگ گئی۔

آئیہ اپنے وقت پر کلینک سے لوٹی تو کچھ دیر بیٹھی ہی بیٹھی پھر ٹھیک بھائی کے ساتھ اوپر آئی تھی۔ جس سے اور اطمینان سے ہو گئی کہ اسے آئیہ سے اپنے جانے کے متعلق بات نہیں کرنی پڑے گی۔ ورنہ ساری

لگے بعد بھی اندر سے خائف تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ آئیہ خود اسے بھیج رہی ہے تو یقیناً اس کی فائدہ ہونے سے منع کر دیتی اور آئیہ ظاہر ہے اس کی ماں تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھتی تھی کبھی تو اسے شبہ

نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے سامنے ٹھیک بھائی کے ساتھ کتنی بحث کے بعد اسے بھیجے پر رضامند ہوئی تھی۔



بہرے جانے کے بعد ماحول کی کشیدگی تو کیا کم ہوتی بلکہ اور اسی گھمائی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب کے ہذا ہی ایک رابطہ تھی ہر وقت اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کبھی اتنے میڈمیں ابھی عمر کے ساتھ تھکا اور ادھر

سہل بات چلاتا۔ بس اسی کی آواز کو نکال کر کئی تھی اور اب ایک دم خاموشی تھی۔
بہت صبح کاج جانے کے لیے نیچے اتار لی تو سب کو سلام کرتی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ باہر نکل جاتی اور واپسی میں

لڑائی ہوئی اور آج تھی۔ حالانکہ وہ شروع سے مدیہ کے رویوں کی تلافی کرتی آئی تھی اور ابھی بھی کرنا چاہتی

در اسے خود پر قابو پانے میں لگی اس کے بعد ایک اور مصیبت کہ گاڑی اشارت ہو کے نہیں دی۔ بلکہ اس کے وہ تھکے، کتنی تو نیچے اتر کر کڑھکی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی، کبھی وائٹ بھیس اس کے پاس آئی، اس نے توجہ نہیں دی۔ لیکن جب اسے مخاطب کیا گیا تب چونک کر دیکھنے لگی۔ چہرہ شہسار تھا۔
پر زور دیا تو مہما بھی یاد آگیا۔ وہ راجہ بھی۔ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

”اگر صاحب! کہاں جائیں گی آپ، آئیے ہم ڈراپ کر دیں گے۔“
آئیہ نے بلارا اور ذرا سا جھک کر راجہ کے ساتھ ڈرائیو تک پر بیٹھنے علی جمائیکر کو دیکھا پھر راجہ کی طرف

کر بولی۔
”نو تو پر اہم بیٹا! بس یہیں کلینک جانا ہے۔“

”مہما جی راستے پر تو جا رہے ہیں۔ آئیے پلیز۔“ راجہ نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تو وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”اصل میں میری گاڑی۔“
”وگاڑا! ایک سسٹم ہوا ہے کیا؟“ راجہ نے فوراً پوچھا۔

”نہیں اللہ کا شکر ہے۔ ہر طرح سے بچت ہو گئی۔ بس اس میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ کلینک سے دور کٹ کر دوں گی وہاں سے کوئی مکینک آجائے گا۔“

”پھر تو آپ کو جلدی کلینک پہنچنا چاہیے۔“ راجہ نے اس انداز سے کہا جیسے اسے جلدی ہی پہنچا سکتی ساتھ اسے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تو اس نے مزید پس و پیش نہیں کی۔

”یہ میرے بھائی ہیں۔“ راجہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی علی جمائیکر کا تعارف کروانے لگی۔ ”فی الحال ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی پر موٹ ہو کر ڈی سی کلاں گے۔“

”مہاشاء اللہ۔“ علی جمائیکر پر نظر ڈالتے ہوئے آئیہ کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
”اور جب بڑی سی ہو جائیں گے تب میں اپنی فرزند کی شاندار سی دعوت کروں گی۔ آپ بھی آئیے گی ناں۔“ راجہ کو حقیقتاً موقع مل گیا تھا۔

”میں تمہاری فرزند میں تو شامل نہیں ہو سکتی بیٹا!“ آئیہ منع نہیں کر سکی تو باہی بھی نہیں بھری۔
”ان کی بدرز بھی ہوں گی اور ان میں تو آپ شامل ہو سکتی ہیں“ میں آپ کو اسپیشلی انوائٹ کروں

آپ نہیں آئیں تو میں پارٹی ہی ٹینسل کر دوں گی۔“
راجہ کے پر جوش انداز پر وہ ذرا سا مسکرا کر رہ گئی کیونکہ علی جمائیکر نے اس کے کلینک کے سامنے گا

دی تھی۔
”اگے بیٹا! تھینک یو۔“ وہ راجہ کے مزید اصرار کرنے سے پہلے شکریہ ادا کر کے اتر آئی اور کے بغیر

بندر کر لیا تھا۔
پھر اسی رات آئیہ نے ٹھیک بھائی کو فون کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے

لے جانے کو کہا تو ٹھیک بھائی نے نہ صرف فوراً ہاں بھری بلکہ دو دن بعد ابھی گئے تھے۔ ایک تو انہیں خیال تھا دوسرے کچھ اپنی غرض بھی تھی کہ سمینا کی شادی اور احمد کے باہر جانے سے خصوصاً

اکٹی ہو گئی تھیں۔ وہ خود سارا دن تو آفس میں ہوتے لیکن شام میں واپسی پر وہ بھی محسوس کرتے تھے

فرصت میں آئیے تھے شام کا وقت تھا۔
اس وقت آئیہ گھر پر نہیں تھی اور ٹھیک بھائی نے ماں جی اور ابا جی تک سے آئیہ کے فون کا ذکر

کے برعکس جیسے پہلے آفس ٹور پر ایک آدھ دن کے لیے آیا کرتے تھے ابھی بھی یہی ظاہر کیا تھا۔ وہ ابائی کے کمرے ہی میں بیٹھتے تھے۔ باری باری سب آکر انہیں سلام کر کے چاچکے تھے۔ صاحت کے

آئی تھی یوں جیسے زبردستی لائی گئی ہو اور واقعی صاحت اسے زبردستی لائی تھی۔

خواب میں آپ۔ میں اب آپ سے بات نہیں کروں گی۔" وہ مزید روٹھ کر ان کے کمرے سے نکل تھی
فلک کرک گئی۔
بے راجہ آری تھی اور اس کے پیچھے عارفہ بیگم بھی تھیں۔



میں نے کہا کہ راجہ اسے مخاطب کرتی اس نے اٹے بیروں دوبارہ نیل کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ
اس کا دروازہ زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

نیل میں آیا ہوا نیل برش رکھ کر پلٹے تو اسے دروازے کے ساتھ لگے، کچھ کر تشریف سے پوچھا
تو مل گیا۔
"کچھ نہیں۔"

راجہ نے کہا کہ کون کون آتا ہے؟
"میں آپ کے کمرے میں کون آ سکتا ہے۔ وہ تو شاید ماما کیس، لیکن میں نہیں جانتی انہیں۔ چتا نہیں
میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" بوکھلاہٹ میں وہ پہلے سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی ہوئی۔
"نیل دیکھا۔ کیا کہہ رہی ہو۔ ہٹو مجھے دیکھنے دو۔" نیل کی کچھ میں کچھ نہیں آیا۔ اپنی اسٹک اٹھا کر اسے
ہٹنے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے بولی۔

"نیل۔ آپ نہیں دیکھیں گے وہ خواتین ہیں۔"
راجہ نے کہا کہ تم نے پھر کوئی حماقت کی ہے۔ بلکہ نقصان اب کیا توڑا ہے؟" نیل کو ایک دم گلہ ان والا
ایا لیکن وہ سنجھی نہیں۔
"طلب؟"

طلب ہے تم کسی خاتون کا گلہ ان تو کر پریشان تھیں اور اب ان خواتین کا جانے کیا نقصان کر آئی ہو جو وہ
نہ پہنچ گئی ہیں۔ حالانکہ میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا کہ آئندہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتا دینا۔"
"میں نے اسے فوراً ہی بتا دیا۔ شروع کر رہی تھی تو وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بولی۔
"نیل بات تمہیں ہے نیل بھائی! میں نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا۔"
"بچہ کیوں رہی ہو؟"

نیل بچہ رہی ہوں۔ سامنے تو کھڑی ہوں۔" وہ ان کی جرح سے عاجز آ گئی۔
"میں نے ان کے سامنے جاؤ۔ تب میں سمجھوں گا کہ تم نے کچھ نہیں کیا یا پھر ابھی بھی وقت ہے۔ مجھے ج
پوچھو کہ سامنے میں تمہارا دفاع کر سکوں۔"

نیل نے کہا کہ آپ کو جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہاں نہیں تو۔" وہ روٹھے لمبے میں
نیل کے بیڑ پر بیٹھ گئی۔
"جاتا میں کہاں بیٹھ رہی ہو۔ جاؤ پھوپھو سے پوچھ کر آؤ کہ انہیں کوئی کام تو نہیں ہے پھر میں جاؤں۔"
"نیل کو کہہ کر کہنا۔"

نیل نے پوچھتے ہوئے چلے جائیں۔
"نیل لڑکی! پھوپھو کے پاس خواتین موجود ہیں۔ میں نہیں جاسکتا چلو اٹھو جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اب اس کی ایک نہیں چلے گی اس لیے مزید پس و پیش
کے بغیر بولی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور کچھ دیر راہداری میں رک کر خود پر قابو پایا پھر ڈرائنگ روم

تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی سے کیا کہے، کیونکہ مدیہ نے کس وقت بھی خاص طور سے ان کا
نام لے کر کسی پر کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ سب نے اسے اسے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور اس
اسے حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کے سامنے مجرم بھی بنے ہوئے تھے اور یہ کوئی قابلِ فحش بات نہیں تھی کہ اس کا
اس کے لیے بغضِ اوقات انسان سرخرو ہو کر بھی سرنگوں ہی رہتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ مدیہ
تو چلی گئی تھی لیکن وہ اندر سے شرمندہ تھی اور کسی کو اپنے سامنے شرمندہ دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سب
سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

کتنے دن ہو گئے تھے مدیہ کو گئے ہوئے۔ اس کا کسی بات میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کتنا سوچتی امتحان قریب
ہیں۔ اسے پڑھنا چاہیے لیکن اس پر بھی عمل نہیں کر پاری تھی اور نہ ہی اس نے علی جمائیکو فون کیا تھا صرف
اس لیے کہ وہ ملنے پر اصرار کرے گا تو اسے لائبریری جانے کے لیے ٹیسیہ یا عمر سے کہنا پڑے گا اور گو کہ اسے پیر
تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی منع نہیں کرے گا پھر بھی وہ کترا رہی تھی۔

عجیب روٹھے پھیلے دن تھے اور چھٹی کا دن تو اور بڑا کر دینے والا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے سوچا کہ آج
دن اپنے کمرے کی صفائی کرنے میں گزارے گی، لیکن اس کام میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے، کیونکہ مدیہ تو
نہیں جو ہر شے کو کسی پھینک دیا کرتی تھی اور اس کا پھیلاوا سمیٹنے میں وقت لگتا تھا۔ وہ تب بھی کڑھتی تھی اور اب
جلدی فارغ ہونے پر بھی کڑھ رہی تھی پھر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔
"تمہیں چھٹی کے دن بھی چین نہیں ہے۔" وہ ان سنی کر کے ان کی رائٹنگ ٹیبل کی گرد و احتیاط سے صاف
کرنے لگی۔ پھر کھڑکی سے باہر دیکھا تو انہیں تیار دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ چھٹی کے دن کہاں جا رہے ہیں۔"
"میاں کی طرف جاؤں گا پھر وہاں سے۔"
"ڈیفنس۔" اس نے فوراً کہا تو نیل چونک کر دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"
"آپ ہی سے اکثر سنا ہے کہ پہلے میاں کی طرف گیا تھا پھر وہاں سے ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔" اس
سیدھے سادے انداز پر نیل مطمئن ہو کر بولی۔

"ہاں دوست کے پاس۔" پھر بات بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔ "پھوپھو کیا کر رہی ہیں۔"
"پتا نہیں" اپنے کمرے میں ہیں مجھے لگتا ہے نیل بھائی، ماما جو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ دیکھیں
دن ہو گئے ہیں وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ امتحانوں کی فکر بھی نہیں ہے اسے۔ آپ اسے بلانے کی کوئی
کر رہی ہیں۔"

"وہ ہم میں سے کسی کے کہنے پر نہیں آئے گی۔" نیل نے کہا۔
"تو پھر شکیل ماماں سے کہیں۔ وہی اسے پھوپھو جاتیں۔ ورنہ ماما کو آپ جانتے ہیں کسی دن اچانک ان
ہائی ہو گیا تو اسی وقت روانہ ہو جائیں گی یہاں سے اور مدو کو بالوں سے پکڑ کر چھٹی ہوئی لے آئیں گی۔" اس
اپنے تئیں نیل کو اس وقت سے خائف کیا لیکن وہ مسکرا کر بولی۔
"فکر نہیں کرو۔ ایسا نہیں ہو گا کیونکہ پھوپھو نے خود اسے بھیجا ہے۔"

"ماموں جی کے مجبور کرنے پر ہاں۔"
"نیل بلکہ شکیل ماماں سے کہیں۔ وہی اسے پھوپھو جاتیں۔ ورنہ ماما کو آپ جانتے ہیں کسی دن اچانک ان
حد سے بڑھتی جا رہی تھیں اس لیے سمجھیں۔" آخر میں نیل نے اس کا سر ہلایا تو وہ سمجھ کر روٹھے ہوئے
"بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ میں خواہ مخواہ پریشان رہی۔"
"کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم ایسے ہی پریشان رہتی ہو خواہ مخواہ۔" نیل کا انداز چھینرنے والا تھا۔

میں داخل ہوتے ہی بولی۔ کوئی کام ہو تو بتا دیجئے۔ وہ بڑے ماموں کی طرف جارہے ہیں۔

”مما! وہ نیل بھائی کمرہ رہے ہیں۔ آئیے کچھ کھنے سے پہلے ہی عارفہ بیگم نے اس سے پوچھ لیا۔

”یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ آئیہ کے کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”ہاں بیٹا! نیل سے کھانا کھاؤ۔“

نیل نے البتہ شام میں وہ دروازہ جلدی آجائے تو۔ ”جی اچھا“ وہ آئیہ کی بات پوری نے بغیر دیر سے پلٹ آئی اور نیل کو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھ کر آہستہ آواز میں بولی۔

”کوئی کام نہیں ہے، بس شام میں جلدی آجائیے گا۔“

”کیوں؟“

”مجھے کیا بتا ماما کہہ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب سے نکل کر کمرے کے اندر آگئی۔

”چھی بات ہے۔“ نیل جلتے ہوئے اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لیتی ہوئی پھر دروازے سے زرا نکال کر انہیں جانے ہوئے دیکھنے لگی۔

جب وہ بیڑھیاں اتر گئے تب کچھ مطمئن سے ہو کر اس نے میسر کی طرف جانے کا سوچا مگر وہاں عارفہ بیگم کی باتیں سن سکے اور ابھی اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی تھی کہ بوا چائے اٹھائے راہداری میں نمودار ہوئیں، جہیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور آکر اپنے باغیچے کی طرف نکلی۔

اس کے اندر جتنا تجسس تھا اس سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ اگر آئیہ نے ان لوگوں کے بارے سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔ گوکہ علی جمائیک نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالے گا آئیہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ اب پتا نہیں وہ اس میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ یہ تو اس کی بالادہ جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا اور اتنی دیر تک وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ تجسس پریشانی خیز ایک احساس کو بھی دبا نہیں پاری تھی کہ مزید اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے آواز پر وہ ہڑوا کر اٹھ بیٹھی۔

”کون ہے بوا؟“

”میں۔“ رابعہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”میرے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

وہ خاموش رہی۔ ”اصل میں خواتین کی باتوں سے میں بور ہو گئی تھی اور تھینکس گاؤ کہ تمہاری امی نے محسوس تمہارے پاس بھیج دیا۔ کیا کر رہی تھیں؟“ تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔“

”نیکن کچھ سوچ تو ضرور رہی ہوگی۔“ رابعہ کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر وہ ادھر ادھر اندر دلی ایک مخصوص لہر پر دھڑکنے لگا تھا۔ جس سے چہرہ گلابی ہو گیا تو رابعہ ہنستی ہوئی بولی۔

”نہ بتاؤ پھر بھی میں جانتی ہوں۔ ویسے آج ہم اس مقصد سے نہیں آئے بلکہ میں تمہاری امی کو آئیہ اور عارفہ بیگم کے آنے سے رابعہ کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ بھی فوراً بیڈ سے اتر کر عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آئیہ سے بولیں۔

”مما! اللہ بہت پیاری بیٹی ہے۔ اسے بھی لے کر آئیے گا۔“

”جی آئی! میں بھی چینی کھنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔“ رابعہ نے فوراً تائید کے کہا۔

”ہوں دیکھو۔“ آئیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! وہیں اجازت دیجئے۔ اب انشاء اللہ آپ سے ملاقات رہے گی کیونکہ میری بیٹی تو آپ کی دیوانی ہو گئی۔

ناراضہ جیکم مزید راہ رسم بڑھانے کے لیے جو کلمات ادا کر رہی تھیں رابعہ ان کی تائید کرتی گئی۔

کے لبوں پر نرم مسکراہٹ تھی پھر ان دونوں کے ساتھ اس کے کمرے سے نکل گئی۔ تو وہ کسی معمول کی

بیٹی ہوئی دروازے تک آکر رک گئی۔ جب آئیہ انہیں زینے تک چھوڑ کر واپس آئی تو اسے خاموش

دیکھ کر اپنے آپ کہنے لگی۔

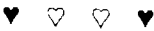
”اے بیٹی! اسے یہاں کی کسی تقریب میں انوائیٹ کرنے کی تھی، حالانکہ میں نے کل فون پر ہی

کہہ دیا تھا کہ میں کہیں آتی جاتی نہیں ہوں، پھر خیر خیر آج چھٹی کا دن ہے شام تک شاید موڈ بن جائے۔“

”اس نے چونک کر اپنی طرف اشارہ کیا۔ پھر اچانک کسی خیال سے منع کر دیا۔“ نہیں ممما! آپ چل

نہیں۔“

نہ قدرے پر سوچ انداز میں سر ہلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تو وہ مطمئن ہو کر مسکراتی تھی۔



غیر نے اپنے ایک دو خاص دوستوں کو ہی انوائیٹ کیا تھا۔ اور بس انہیں ریسو کرنے گیٹ پر آیا تھا پھر ان

فہال کمرے میں آ بیٹھا اور اس نے قصداً اپنے لیے وہ جگہ منتخب کی تھی جہاں دروازے کی طرف اس

دیکھ سکتا تھا، کیونکہ رابعہ نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ آئیہ کے ساتھ صبحت بھی ضرور آئے گی اور اس

کرکونڈ اسے خود پر اختیار نہیں رہتا تھا اس لیے اس نے دروازے کی سمت پشت کر لی تھی کہ کہیں پہلے

اس کی بے اختیار آئیہ کو چونکا نہ دے۔ بہر حال اس احتیاط کے باوجود اس کا دھیان دروازے ہی کی

جہاں سے زقے دلفے سے رابعہ کسی مہمان خاتون یا لڑکی کے ساتھ داخل ہوئی اور اسے عارفہ بیگم کے

برو آپس چلی جاتی۔ علی جمائیک نے ایک بار بھی گردن موڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اس کی

خی خاموشی سے ہوئی وہ محسوس کر سکتا تھا اور وہ اسی انتظار میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ سات بجنے میں کچھ

تھے جب رابعہ نے غالباً ”سے مطلع کرنے کے لیے دروازے سے ہی عارفہ بیگم کو پکار کر کہا۔

آئیہ آئیہ۔“

ماگھ خود کو روکتے روکتے بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دوستوں سے ایک سیوزی کہہ کر پلٹا تو آئیہ کے

ہند دیکھ کر وہ سخت مایوس ہوا اور اس عالم میں آگے آتا تو عارفہ بیگم اسے مخاطب کر کے بولیں۔

ایدا! کمر آئیہ ہیں اور ڈاکٹر صاحبہ! میرا بیٹا ہے علی۔“

لام علیک۔“ علی جمائیک نے سلام کرنے کے ساتھ آئیہ کے ساتھ کھڑے نیل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

نیل کھلتے ہیں۔“ نیل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

کی بولی آپ سے مل کر۔“

آپ کا بیٹا ہے؟“ عارفہ بیگم نے نیل کو دیکھتے ہوئے آئیہ سے پوچھا۔ تو وہ تقاضے سے بولی۔

ہاں بیٹا ہے۔“

ہائیں مجھی آپ کی بس وہی ایک بیٹی ہے۔ وہ آئیہ نہیں آپ کے ساتھ۔“ عارفہ بیگم کو ایک دم صباحت کا

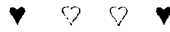
ہوا۔

ابھرنے لگی، جو ایک دن شاہ سکندر کے ساتھ اس کے کانویٹ آئی تھی۔ اس وقت اگر وہ کسی شاعر کا
 ہو سکتی تھی تو اس وقت بھی خوب صورت غزل کے سانچے میں ڈھلی تصویر لگ رہی تھی میک اب سے بے
 پناہ چہرہ اور سیدھی مانگ کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی چوٹی زیورات کے نام پر کانوں میں ٹاپس تھے اور کھائی میں
 دواغ علی جمائیکر کو اس عورت کے بجائے اپنے چچا شاہ سکندر پر رحم آئے گا تب ہی رابعہ اس کے قریب آ

جائی گی ایسا کیوں کھڑے ہیں۔ وہاں چلیں ناں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔ آخر آپ کو انہیں متاثر کرنا ہے۔
 میں ہوں۔ میں شاید انہیں متاثر نہیں کر سکتا۔ اس نے پر سوچ انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 یہاں کیا ہے آپ میں ماشاء اللہ۔

اس نے ٹوک کر رابعہ کو مہمانوں کے پاس جانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر بولی۔
 ہاں آپ۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہی ہوں اور آپ۔

کمال ہے۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہی ہوں اور آپ۔
 فضل باہن نہیں کرو چلو جاؤ۔ اس بار اس نے قدرے سختی سے ٹوکا اور اسے وہیں بڑھاتے چھوڑ کر اپنے
 بے کاغذ خیا۔



ہاں جی! کو کہ میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں پھر بھی واپس آ کر اچھی نہیں جاؤں گی۔ مدھیہ نے ہنر کے قریب
 کھینچ کر اس پر کھنٹے نیکتے ہوئے کہا تو سیما بھا بھی ایک نظر اس پر ڈال کر بولیں۔
 ہاں تو بیٹا! کون کہہ رہا ہے ابھی تمہیں واپس جانے کو جب سبک دل چاہے رہو۔

میرا مطلب ہے، میں بیٹیں پڑھنا، اتنی ہوں اور اس کے بعد جاب بھی نہیں کروں گی۔ آپ ماما سے کہیں
 ایس کی کالج میں ایڈمیشن کرا دیں اور ساتھ ہاسٹل میں بھی۔

ہاسٹل میں کیوں۔
 ٹوٹک میں آپ پر جوہ نہیں بننا چاہتی۔ اپنے تئیں وہ بڑی سمجھ داری سے کام لے رہی تھی۔

برہما بھی کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھے روکنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔
 اصل ٹھیک کہہ رہی ہوں ماما جی! مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ آپ مجھے ایک
 بار اور بات کر لیں گی اس کے بعد۔

تو فنی کی باتیں مت کرو۔ اسے جدوجہد سنجیدہ دیکھ کر سیما بھا بھی کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ٹوٹے ہوئے
 نہیں۔ پتا ہے جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ ہم نے اسی وقت آسیہ سے کہا تھا کہ تمہیں ہمارے پاس چھوڑ
 دے اگر اس وقت وہ ہماری بات مان لیتی تو تم شروع سے بیٹیں، ہو تیں تو کیا میں تمہیں بوجھ سمجھتی ایسا کیسے سوچ

رہے؟
 آپ سمجھ نہیں رہیں۔ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

تم سب سمجھ رہی ہوں۔ تم یہاں پڑھنا چاہتی ہو ناں تو ہو جائے گا تمہارا ایڈمیشن اور اس کے لیے ہمیں
 سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تمہارا لا حول و لا میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتی تھی
 ناں تو آسیہ سے بھی زیادہ احمق ہو۔

ماما احمق نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔ وہ ان کی خفگی سے خائف ہو کر بولی۔
 انہوں نے کالنی خاص شعبہ نہیں ہوتا۔ یہ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ بے شک اپنے سب سے بڑے ماسٹر ہو

نہ دوسرے معاملات میں احمق ہی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی ماما کو دیکھو۔ تعلیمی میدان میں اتنی ذہین
 بیوقوف تو بیوقوف لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں اتنی ہی احمق ثابت ہوئی۔

برہما بھی کہنے لگی اس کی بات پر مذاق میں شروع ہوئی تھیں۔ لیکن پھر آسیہ کا ذکر کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئیں۔
 ماما جی! آسیہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یا تو شاہ سکندر کے

جتنے کیف آئیں تھے۔ اب اتنی ہی بورت تھی۔ رہ رہ کر صباحت پر غصہ آ رہا تھا اور بہت کوشش کے باوجود وہ
 طرف سے دھیان بھی نہیں ہٹا رہا تھا۔ ادھر بات کیا ہوئی وہ جواب کیا دیتا۔ آخر اس کے دوست جینے سے
 دیا۔

”کہاں الجھے ہو یا؟ میں اتنی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم مسلسل ہمیں انڈر کر رہے ہو اور اب انہیں بھی
 اس کا اشارہ نبیل کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر اندر رہی اندر خود کو سرزنش کرتا ہوا نبیل کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔؟“
 ”گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں اس کے علاوہ بھی سارا وقت پڑھنے پڑھانے میں گزرتا ہے۔“ نبیل نے

سے انداز میں بتایا تو ان کے قریب رہی ان کی اسک کو دیکھتے ہوئے علی جمائیکر نے بے اختیار ہنسون پکا کر
 جیسے اسے حیرت ہوئی ہو۔ پھر فوراً ”موضوع بدل گیا۔“

”مجھے لگتا ہے میں نے پہلے بھی آپ کو نہیں دیکھا ہے۔“
 ”اتفاق ہے میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔“ پر سوچ انداز میں کہنے پر

نبیل کو اچانک یاد آگیا۔ ”ہاں لا سیرری میں۔ ایک دو بار وہیں دیکھا ہے۔“
 ”مائی گاڈ! انہیں صباحت کے ساتھ تو نہیں دیکھ لیا۔ اس نے سوچا اور قدرے رک کر بولا ”ہو سکتا ہے م

نے بھی وہیں دیکھا ہو۔“
 ”بھائی آپ کا فون ہے۔“ عقب سے رابعہ نے پکار کر کہا تو وہ دل ہی دل میں شکر کرتا ہوا ان سے معذرت کر

کے فوراً اٹھ کر لابی میں آگیا۔
 ”ہیلو علی جمائیکر اسپیکنگ۔“

”میں نک پو۔“ ادھر سے صباحت کی قدرے ہنسی ہوئی آواز آئی تو اس کی ساری کوفت پل میں رخت ہو
 لیکن بظاہر خفگی سے گویا ہوا۔

”کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟“
 ”خودی سمجھ جائیں۔“

”سوری۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا لیکن ذہن پر زور بھی دینے لگا تھا۔
 ”بھئی! ماما تک پہنچنے کے لیے آپ نے جو بھی طریقہ اختیار کیا۔ میں وہ سب تو نہیں جانتی۔“ ان آپ نے

پر کوئی آج نہیں آنے دئی اس کے لیے تھیک پو آئین۔
 اس نے وضاحت کے ساتھ دوبارہ شکریہ ادا کیا تو وہ شاک ہو کر بولا۔

”لگتا ہے آپ کو میرا اعتبار نہیں تھا اور اس لیے آپ آئیں بھی نہیں۔“
 ”نہیں علی! میرے آنے کا سبب بے اعتباری نہیں ہے اعتباری ہے۔“ وہ بڑی سادگی سے اعتراف کر

جس سے اس کی ظاہری خفگی پل میں ہو ہو گئی بے ساختہ مسکرا کر بولا۔
 ”وہ اقبال نے کیا کہا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہنا سببان عقل۔“

”جی ہاں میں نے اسی پر عمل کیا ہے۔“ وہ ہنسی۔
 ”گڈ اور اس کے اگلے مصرعے پر عمل کا کب تک ارادہ ہے۔“ اس نے محظوظ ہو کر پوچھا تو وہ بے ساختہ

”اس پر پہلے عمل ہو چکا۔“
 علی جمائیکر کا دلکش قہقہہ بڑا جان دار تھا۔ ادھر وہ بیٹھا گئی۔

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔
 ”بیوقوف!“ وہ ریسیور رکھ کر لابی سے نکلا تو رابعہ سب مہمانوں کو کھانے کے لیے لان میں لے جا رہی تھی۔

وہیں رک کر آسیہ کو دیکھنے لگا وہ سفید ساڑھی میں بڑی باوقار اور سب میں نمایاں لگ رہی تھی۔
 علی جمائیکر بالکل غیر ارادی طور پر اسے شاہ سکندر کے ساتھ سوچنے لگا تو اس کے ذہن کے کیوں نہ

شش نہ کریں اور اگر انہوں نے میرے ساتھ اس سلسلے میں کوئی زبردستی کی تو میں چمچ اپنے باپ کے ہاتھ میں لے کر دوں گا۔“

ایک دم سنجیدہ ہو کر اپنی بیٹی زانیہ وارنگ ہو گئی تو وہ رو پڑی۔

بہری ہو مدحو! تمہیں ذرا احساس نہیں کہ۔“

لوں میں احساس بناؤ۔ میرے ساتھ جو ہوا اس پر دوسرے کو احساس کیوں نہیں دلایا جاتا۔ میری تقدیر لایا جاتا ہے اور تم کس حساب سے میری دادی ابان بننے کی کوشش کرتی ہو۔ بڑی عقل ہے تمہارے ”مدحہ نے تنفر سے فون پر دیا تھا۔“

”جوا! اس نے بے قراری سے کریڈل پر ہاتھ مارا پھر باؤس ہو کر ریسور رکھ دیا اور ہتھیلیوں سے دلی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ بیل کی آواز پر ہاتھ نیچے کر کے انہیں دیکھنے لگی۔“

”اٹھو تھو؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”برہی تھی؟“

”نہیں جی! اس سے پوچھ لیں۔“ اس کی آنکھیں پھر چھلکنے کو ہو رہی تھیں۔ اس لیے جلدی سے کہہ کر

”میں آئی۔“

”نیل اس کے پیچھے چلے آئے۔“ یہ کیا یوقنی ہے۔ تم جانتی تو ہو مدحو کو پھر اس کی باتوں پہ رونے کا

”مجھے بتاؤ اب کیا کیا ہے اس نے؟“

”اب ہاں نہیں آئے گی۔ وہیں پڑھے گی اپنی بارکس شیٹ وغیرہ منگوائی ہے اس نے کہہ رہی تھی

”زبردستی تو وہ چمچ شاہ سکندر کے پاس چلی جائے گی۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا تو نیل گہری سانس

”لے۔“

”ابک سدھو کی تم دونوں۔“

”نہ کیا کیا ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”یہ کیا کتنی ہو سوائے رونے کے اور اسے دھمکانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ بس ساری زندگی میں

”رہا مدھو۔“ نیل کو جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔

”اب جلدی اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔“

”سکندر کے پاس جانے کی وہ ضرور جائے آخر پاپ ہے اس کا۔ تمہیں اگر باپ سے ملنے کا شوق نہیں ہے

”تو رو کو جانے دو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمہیں بھی جانا چاہیے۔“

”ابان کی میں بھی جاؤں گی۔“ لیکن اس طرح نہیں جیسے مدحو بات بے بات دھمکی دیتی ہے میں ممالی

”تہاؤں کی۔“ وہ کہہ کر ہاتھوں میں چہو چسپا کر رونے لگی تو نیل بار نیل بجائے اسے چپ کرانے کے

”سے سے نکل گئے۔“

”بدر اسے احساس ہوا تو ہاتھ نیچے گرا کر بہت حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر ان کے پیچھے جانے کا بس سوچ

”نہ بہت نہیں ہوئی کیونکہ ان کا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے رونے پر تھایا مدحہ پر اور کسی پر

”نہ تو وہ کبھی نہیں کرتے تھے کہ اسے رو تپھوڑ کر چلے جائیں۔“

”بدر نے پراپھتی ہوئی ادھر سے ادھر ٹھٹھنے لگی پھر اچانک کھانے کا خیال آیا تو سب بھول کر ان کے

”ہاتھ آگے کے لیے کھانا گرم کروں؟“

”نیل نیل کے پاس کھڑے تھے اس کی سمت ذرا سی گردن موڑ کر پوچھنے لگے۔“

”نہا یا جہ۔“

”ساتھ کچر دما کر لیتی یا پھر۔“

”آپ کا مطلب ہے، ماما کو دوسری شادی کر لینی چاہیے تھی۔“ سیما بھابی کے خاموش ہو جانے پر اس نے

”سمجھ کر پوچھا تو وہ نظرس چراتے ہوئے بولیں۔“

”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

”پھر کیا اچھا نہیں کیا ممانے؟“

”یہی کہ تمہیں شروع سے میرے پاس نہیں چھوڑا۔“ سیما بھابی بڑی خوب صورتی سے بات بتائیں اور پھر

”اس کی ٹھوڑی چھو کر کہنے لگیں۔“ ”خیر اب تم میرے پاس ہو اور میں تمہیں ہرگز واپس نہیں جانے دوں گی۔“

”تم نہیں پڑھو گی اور یہیں تمہاری شادی ہوگی ٹھیک۔“

”وہ سر ہچکا کرانے ناخن دیکھنے لگی۔“

”تم اگر پہلے کہیں تو اب تک تمہارا ایڈمیشن ہو بھی چکا ہوتا۔ خیر میں آج ہی ٹکٹیل سے کہوں گی۔“

”ان سے پہلے آپ ماما سے پوچھ لیں۔“ وہ مستحالی۔“

”تم کہتی ہو تو پوچھ لیں گے اس سے بھی۔“ سیما بھابی کو اس وقت وہ چھوٹی سی معصوم بچی لگ رہی تھی اور

”اسی طرح اسے بہلا رہی تھیں۔“

♥ ♥ ♥ ♥

”سردیوں کی راتیں ایک تو جلدی شروع ہو جاتی ہیں دوسرے سناٹا بھی چھا جاتا ہے۔ ابھی آٹھ بجے تھے اور گا

”رہا تھا جانے کتنی رات بیت گئی ہو۔ وہ عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی تھی جب آسیہ کا فون آیا تھا کہ اسے آنے میں

”ہو جانے کی اس لیے وہ کھانا کھا لے۔“

”وہ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئی تو بوائے اس سے کھانا لگنے کا پوچھا اور اسے بھوک تو لگ رہی تھی۔ لیکن نیل!

”نہیں تھے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔“

”اب کھالیں بوا! میں جب نیل بھالی آئیں گے ان کے ساتھ کھالوں گی۔“

”آسیہ تو آنے والی ہو گی ناں۔“

”نہیں ماما کا فون آیا تھا۔ وہ دیر سے آئیں گی اور آپ کو ان کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ کھانا کھائیں اور لحاف میں جا لیں۔ ماما کے لیے کھانا میں گرم کر دوں گی اور یہ نیل بھالی پتا نہیں کہاں

”ہیں۔“

”آخر میں وہ بڑبڑاتی ہوئی نیل کو دیکھنے کی غرض سے بالکلونی کا دروازہ کھولنے لگی تھی کہ فون کی تیل پر دروازہ

”کر لالی میں آگئی۔“

”آپ تو میرے میں ہو گئے تم سب۔“ دوسری طرف مدحہ تھی اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گئی۔ ”ہمت

”کرنے لگی تھی ناں میں تم سب کو۔“ ”چمچاؤ کتنے نفل کھانے کے پڑھے مے نے اور تمہارے۔“

”بکومت اور فوراً واپس آؤ۔ میں بہت بور ہو گئی ہوں اور اس پھی۔“ اس نے ٹوک کر کہا۔

”میرے بغیر۔“ ”مدحہ کی حیرت میں ڈوبی آواز آئی۔“

”اور نہیں تو کیا۔“

”اچھا کبھی آ جاؤں گی تم سے ملنے۔ فی الحال تو تم میرے ڈاکو مینٹس بھیج دو کیونکہ میں یہاں کان لچ میں

”لے رہی ہوں۔“ ”مدحہ نے اس پر احسان کرتے ہوئے کہا تو وہ چیخ پڑی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”اے سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میری انٹر کی مارکس شیٹ اور سرٹیفکیٹ

”ہرگز نہیں۔ یہاں امتحان ہونے والے ہیں تم فوراً واپس آؤ۔“

”نہیں صا۔ میں اب وہاں نہیں آؤں گی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم ماما کو بھی بتادینا اور ان سے کہنا!

نہیں اکیلی کیسے کھاتی۔“
 ”کیوں، پھوپھو کہاں ہیں؟“
 ”کلینک، فون آیا تھا ان کا کہ انہیں دیر ہو جائے گی اور اتنی دیر تو ہو گئی ہے، ابھی تک نہیں آئیں۔“
 ”والہاک! پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔“
 ”آجائیں گی، تم کھانا گرم کرو۔“ انہوں نے سرسری انداز میں کہہ کر بن موڑ لیا تو وہ وہیں سے پلٹ کر آگئی۔
 ”کھانا گرم کیا پھر نیپل پر رکھ کر نیپل کو بلا لائی اور ابھی دونوں نے کھانا شروع کیا تھا کہ آسیہ آگئی۔
 ”تم لوگ اب کھانا کھا رہے ہو۔ میں نے کہا ابھی تھا میرا انتظار نہیں کرنا۔“ آسیہ نے تعجب کے ساتھ صاف گوتی سے بولی۔

”آپ کے انتظار میں دیر نہیں ہوئی ماما! نیپل بھائی بھی نہیں تھے اور آپ کو پتا ہے میں اکیلی نہیں کھاؤں
 آسیہ نے چیخ کر کہنے ہوئے نیپل کو دیکھا لیکن پوچھا نہیں کہ انہیں کہاں دیر ہوئی۔
 ”وہ ماما! جو کافون آیا تھا۔“ قدرے توقف سے اس نے اسی قدر کہا تھا کہ آسیہ نے فوراً ”پچھا۔“
 ”اچھا! آئے کو کہا ہے اس نے۔“
 اس نے کچھ سیٹا کر نیپل کو دیکھا، لیکن وہ بہت انجان نظر آئے جیسے سنا ہی نہیں، تب وہ اندر ہی اندر غصا کر بولی۔

”آئے کو تو نہیں کہا بلکہ وہ تو وہیں رہنے کی بات کر رہی تھی۔“
 ”کہا مطلب؟“ آسیہ کا منہ کی طرف جانا ہوا تھا درمیان میں ہی رک گیا۔
 ”مجھے نہیں پتا ماما! وہ کہہ رہی تھی وہیں کالج میں ایڈمیشن لے گی۔“
 آسیہ نے جانے کیوں خاموشی اختیار کر لی اور کھانے میں مصروف ہو گئی جس سے وہ پریشان ہو کر پوچھے
 ”تو کیا ماما! آپ اسے وہیں رہنے دیں گی؟“
 ”نہیں آجائے گی وہ بلکہ میں خود لے آؤں گی اسے۔ اگلے ہفتے ڈاکٹر زکونشن میں مجھے اسلام آباد جانا
 میں اسے بھی لیتی آؤں گی۔“ آسیہ نے دھیرے سے اسے اطمینان دلایا پھر نیپل کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔
 ”نیپل! تم کل چار بجے کھ رہی رہنا۔ کچھ مہمان آئیں گے۔“
 ”کون؟“ نیپل نے کچھ بے دھیانی میں پوچھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ اس روز جن کے ہاں ہم لوگ گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ۔“
 آسیہ ایک دم خاموش ہو گئی تو نیپل نے غالباً ”سمجھ کر بے اختیار اسے جن نظروں سے دیکھا اس کا
 زور سے دھڑکنے لگا تھا اور فرار کا ایک ہی راستہ نظر آیا۔ فوراً ”برتن سمیٹ کر چن کی راہ لی لیکن
 عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ایسے میں اسے مدد کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اب اس مقام پر وہ اسے
 تب بھی اس کے ذریعے سے ایک ایک بات اسے معلوم ہو سکتی تھی۔

پھر رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ جانے کیا کچھ سوچ رہی۔ محبت کی جس شاہراہ پر وہ چل
 اس کی منزل صاف نظر آتی اور بھی درمیان میں خدشات گھیر لیتے اور محبت کی راہ گزرتو لگتی ہی
 رنگ بھولوں سے ڈھکی ہوئی۔ پتا ہی نہیں چلتا کہاں کانٹے چھپے ہیں۔ بہر حال اگلے دن کالج سے آکر
 کو نہ کو نہ جکا دیا لیکن اس وقت وہ بری طرح جھنجھلا گئی جب مہمانوں کو اوپر بلانے کے بجائے آسیہ
 اور نیپل کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہیں دیکھتی رہ گئی پھر اس انتظار میں ٹھنکنے لگی کہ کسی وقت اسے بھی بلایا
 ایسا بھی نہیں ہوا۔ تقریباً ”ایک گھنٹہ بعد نیپل واپس اوپر آئے تو ان کی اسٹک کی آواز سننے ہی وہ جلا
 کھول کر بیٹھ گئی۔

”صبا!“ نیپل نے اس کے دروازے پر آکر پکارا تو وہ منظر ہونے کے باوجود بھی چونک کر کھڑی ہو
 ”جی بھائی!“

”نہیں! اپنے کرتے کا بوجھ رہی ہیں۔“
 ”کر بھی یوں کھڑی کتنی جیسے مجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ شاید اس لیے کہ اس کی سماعتیں کچھ اور سننا
 اتنے سلا نہیں۔“ نیپل کے ٹوکنے پر وہ چونک کر بولی۔
 ”سل گیا۔ وہ تو میں نے کل ہی سی دیا تھا۔ بس ابھی دے رہی ہوں۔“
 ”میں۔“ نیچے اماں جی کو دے آؤ۔“ نیپل کہہ کر وہیں سے پلٹ گئے تو وہ بے اختیار ان کے پیچھے لپک کر
 ”مہمان۔“
 ”بے رک کر دیکھا تو بری طرح سسٹا گئی۔
 ”برا مطلب ہے نیچے مہمان ہیں۔“
 ”نہیں! نیپل بغیر کچھ بتائے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے تو وہ اپنے دھڑکنے والے دل پر ہاتھ رکھ کر بیڑیا کی
 ”اللہ! مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ پھر الماری میں سے کرتا نکال کر نیچے آئی تو آسیہ، اماں جی اور میمونہ بھابی سے
 بیات کر رہی تھی جو اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ جس سے اس کا دھڑکنے والا دل ٹھہرنے لگا بہت محتاط سی ہو
 بیٹھی بولی۔
 ”اماں جی! آپ کا کرتا۔“
 ”نہیں! وہ مہمان بھی ٹانگہ دیے ہیں۔“ اماں جی نے اس کے ہاتھ سے کرتا لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”اللہ کرے آپ کو پسند آجائے۔“ اس نے توبیہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظر سر دوڑاتے ہوئے کہا اور وہ
 ”اماں جی! تو ممانی سے پوچھنے لگی۔
 ”نہیں! کہاں ہے ماما جی؟“
 ”ہمارے ساتھ بازار گئی ہے۔ بیٹھو ابھی آتی ہوگی۔“
 ”اماں جی! وہ بیٹی بھی کہ میمونہ بھابی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”مہمان سے کوئی ناراضگی ہے کیا؟“
 ”اماں جی! میں آپ سے ناراض ہونے کی جرات کر سکتی ہوں بھلا ہر گز نہیں۔ وہ تو امتحانوں کی وجہ سے
 ”نہیں! وہیں ہوں ورنہ آپ کو دیکھے بغیر تو میرا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا تو مجھ میں ماما سے۔“
 ”نہیں! میمونہ بھابی کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے کہا تو وہ اس کا گال ٹھپک کر بولیں۔
 ”اماں جی! ہوں۔“
 ”اماں جی! کس بخیر و خوبی امتحان ہوا جائیں۔“
 ”اماں جی! توبیہ نے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے
 ”اماں جی! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے
 ”اماں جی! میں جج کرتے تھے۔“
 ”اماں جی! وہ ان کے علم کسے رہتی ہوئی بولی۔
 ”اماں جی! میں جج کرتے تھے۔“
 ”اماں جی! وہ ان کے علم کسے رہتی ہوئی بولی۔
 ”اماں جی! میں جج کرتے تھے۔“

اماں جی! وہ ان کے علم کسے رہتی ہوئی بولی۔
 ”اماں جی! میں جج کرتے تھے۔“
 ”اماں جی! وہ ان کے علم کسے رہتی ہوئی بولی۔
 ”اماں جی! میں جج کرتے تھے۔“

”ہوں۔“ چند منٹ بعد بابا جان متوجہ ہوئے اور انہیں متوجہ کرنے کے لیے ہٹکارا بھر کر بولے۔ ”کوئی نام ہے؟“

”میرا نام اخبار ہے۔“ انہوں نے اخبار تمہ کر کے واپس دی رکھ دیا پھر بابا جان کو دیکھ کر مسکرا کر بولے۔ ”نہر خبریں اخباروں میں نہیں چھپتیں۔“

”جواب! بابا جان کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔“

”آپ سنا میں وہ جو ابھی بیگم گرامی سیٹھل ہوئی ہیں انہوں نے کچھ معاملہ آگے بڑھایا یا نہیں۔“ شاہنشاہ غالباً اسی مقصد سے آئے تھے جب ہی فوراً اصل موضوع کی طرف آگئے۔

”میں بھی ہم علی سے اسی سلسلے میں بات کر رہے تھے۔ اس نے بتایا ہے، آج دہن بیگم باقاعدہ اس کا رشتہ لگتی تھیں۔“

”پھر کیا جواب دیا آسہ نے؟“ شاہ سکندر بے صبری کا مظاہرہ کر گئے جس پر بابا جان نے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھا پھر قصداً ”سرسری انداز میں بولے۔

”سوچنے کو وقت مانگا ہے اس نے اور پھر اپنے بھائیوں سے مشورہ بھی ضرور کرے گی ان کی درپر جو بچو اب تک۔“

”لیکن وہ کسی رپوچھ تو نہیں ہے۔“ شاہ سکندر بلا ارادہ کہہ گئے۔

”یہ تو ہی جانتے ہوں گے، بہر حال ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف تمہاری بیٹی کے لیے فکر ہیں۔ اگر آسہ بیگم نے اسے اپنے ہی خاندان میں بیاہ دیا تو یہ اس بچی پر برا ظلم ہو گا۔ ساری زندگی اسے اپنے دادا کے طعنے سننے پڑیں گے۔ خیمیں اس نے بھی دیکھا ہی نہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ دراصل رگوں میں دوڑتا مارا خون ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بادیخے اس کے لیے فکر مند ہیں اسی طرح اس کے باپ دادا کا طعنہ سنا عذاب ہو گا یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس لیے جب تک وہ بچی اسے لوگوں میں نمبر ہمیں چین نہیں آئے گا۔ بابا جان نے بڑی خوب صورتی سے اس میں تاریک پہلو سمجھا کر کہا تو وہ اندر ہی اندر ہو کر بولے۔

”چتا نہیں بابا جان! اس بچی کے دل میں ہمارے لیے کیا ہے۔ محبت، نفرت یا کچھ بھی نہیں۔“

”ہوئے والوں نے تو نفرت کا بیج ہی بویا ہو گا۔ خیر، ہمیں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بھلا اللہ خوش ہی ہوگی اور ہاں تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“

بابا جان نے محض ان کا دھیان مٹانے کی خاطر ان دو سرور بیتی کا ذکر چھیڑ دیا تو وہ چونک کر کہنے لگے۔

”الماس تو بہت چھوٹی ہے بابا جان! ابھی تو میرٹ کیا ہے اس نے۔ اور میرا ارادہ اسے ڈاکٹر بنانے کا۔“

”اللہ ذہن ہے آسانی سے میڈیکل میں جاسکتی ہے۔“

”دس۔“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر کافی دیر بعد بولے۔ ”اچھی بات۔ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں چلتا ہوں بابا جان! آپ آرام کریں۔“

بابا جان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ انہیں شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آئے اور جب میں داخل ہوئے تو آگے میرا لہذا ہنسنے لگی۔

”شاہ! آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔“

شاہ سکندر کچھ بولے نہیں لیکن جسم سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

”کیا سچ ہے کہ شہر میں آپ کی کوئی اولاد ہے جسے بابا جان میاں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔“

میرا لہذا کے غور میں اضافہ ہی کیا تھا اور اب تو خاصے جارحانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ شاہ سکندر مختصر جواب دے کر فہم کی پوجا دیتے ہوئے تھملا کر ان کی طرف پلٹی۔

”اس کی ماں مر گئی ہے کیا۔؟“

بابا جان میرا لہذا کی تدبیر کر رہے ہیں وہ میری بیٹی ہے اور مجھ پر اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا الماس۔ لیکن سے کیا دانا۔ یہ تو نہیں تھا کہ میرے پاس دینے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اگر وہ محروم رہی تو میری وجہ سے۔ تمہاری وجہ سے میرا لہذا اب بابا جان نے مجھے مجبور اور بے بس کر کے مجھ سے وہ کچھ دینے نہیں چاہتا تھا اور میں تو ابھی بھی اتنا مجبور ہوں کہ خود جا کر اپنی بیٹی کو نہیں لاسکتا۔ اسے لانے کے لیے تو تدبیریں کرنی پڑ رہی ہیں۔ خدا معلوم اتنے برسوں بعد انہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میری اور بھی کوئی بیٹی ہے اور یہ کہ اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ کتنی عجیب بات ہے پہلے خود اسے محروم کیا اور اب خود

اپنی بیٹی میں استہزا آمیز دیکھتا تھا۔

”میں بڑے ضبط سے سن رہی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر تڑخ کر بولی۔

بابا جان کو اگر اس کا خیال آئی گیا ہے تو اسے میاں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو اس کا حق دینا دلانا میرا دس۔“

بابا جان کو سب سے پہلے مجھے بھیجنا پڑے گا۔“ شاہ سکندر کو جانے کیا سوچ محفوظ کر گئی۔

”طلب ہے آپ کا۔“

”میں نے سمجھو تو اور بات ہے البتہ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ بچی میرے لیے کسی طرح بھی الماس سے کم نہیں ہے۔ شک اس سے کوئی تعلق نہ رکھنا لیکن اسے کوئی رک پچھانے کی بھی کوئی شش نہ رہا۔“ شاہ سکندر بولے۔

”مجھے میں سخت تنبیہ تھی۔“

”میرا لہذا نے سخت سے سر جھکا۔“ وہ آئے گی تب تو۔“

”آئے گی۔“ یقین سے کہتے ہوئے شاہ سکندر جانے کہاں کھو گئے تھے۔



”بہت بہت موڈ بنا کر بڑھنے بیٹھی تھی کہ عمر نے بہت خاموشی سے آکر اس کے سر پر ہاؤ کی آواز نکالی تو وہ ہلچل مچا کر ہلکے ہلکے دل پر ہاتھ رکھ کر تار اٹھکی سے بولی۔

”بہن میری ہے اگر میرا ہاٹ ٹیکل ہو جاتا تو؟“

”عمر نے قہقہہ لگا کر اس کا مذاق اڑایا۔

”بہن میری شرافت سے طے جاؤ یہاں سے ورنہ میں ماما کو پکار کر تمہاری خوب کھجائی کرواؤں گی۔“ اس نے قہقہے سے بڑی طرح تپ کر دھمکی دی تو وہ بجائے مرعوب ہونے کے اس کے سامنے بیڑ پڑھے گیا اور ایک معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بھلا جاؤں گا سیدھی شرافت سے۔ تمہارا تم کون سے طریقے سے جاؤ گی۔“

”مال جاؤں گی۔“ میرا کہہ رہی تھی۔

”اسے میں نہیں گھر سے جانے کی بات کر رہا ہوں۔ سنا ہے تمہارے لیے کسی نائی گرامی کا پرنسز لیا گیا ہے۔“

”میں خیر میں شوخی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”بس ہے تمہارا؟“ وہ ”نائی گرامی“ پر اچھل پڑی۔

”اسے پوچھنے آیا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ، کسی اے سی ڈی سی کا رشتہ آیا ہے۔“

”بہن بیٹھے ہوئے رعب سے کہا تو وہ نظروں کا زواہ بدلتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔“

راکی لعنت۔ ”وہ خلیفہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔
ہو جاتا ہے۔“ اس نے پھر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو عمر ایک ہی جست میں اس سے پہلے
اٹھا اور وہ لمبی رکی نہیں۔ اس کے پیچھے نکل کر چلے اسے بھاگتے اور میڑھیاں اترتے دیکھا چھر
ہے پر دستک دینے کے بعد اندر بھاگ کر پوچھنے لگی۔

”بس مان لیا تمہیں نہیں بتا“
”بس مان لیا ناں۔ اب جاؤ مجھے پڑھن دو۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے دوبارہ کتاب اٹھائی۔
”کیا کرو گی پڑھ کر وہ ڈی سی تم سے نوکری تو نہیں کروائے گا اور اگر کروائی بھی ہوئی تو اپنی سفارش پر شہر
کسیں تھانے والی لگوا دے گا۔“

”کیا؟“ اس نے چیخنے کے ساتھ کتاب عمر کے سر پر دے ماری۔ ”بہت ہی کمینے ہو تم تھانیدار اپنی نگاہوں پر
پیوی کو اور اپنی سالی کو اور۔“

”سناں گو۔“ عمر نے فوراً لقمہ دیا۔
”ہاں بہت اچھے لگو گے تھانیدار بیویوں میں گھرے ہوئے۔ ادھر سے وہ مارے گی ادھر سے وہ۔“ وہ بولے چارہ
تھی اور عمر ہنسنے جا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تب بڑی معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

”ان ساری باتوں کے لیے ڈی سی ہونا ضروری ہے جو کہ میں نہیں ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں تم ان سے کہنا
تمہاری بہ ساری خواہشیں پوری کر دیں گے۔“

وہ سمجھ گئی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے اس لیے ایک دم خاموشی اختیار کر لی اور کچھ بے نیازی بھی دکھانے لگی
”ارے اصل بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔“ قدرے توقف سے عمر نے اچھل کر اپنے تئیں اسے چوڑا
لیکن اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”ایمان سے صاحب! سنو کی توجہ ان ہو جاؤ گی بلکہ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھ
بھی یقین نہیں کر رہا۔“ عمر نے مزید جھجھکی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس بار کامیاب ہو گیا۔

”کیا کیا یہ بڑا عجیب۔“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔
”وہ اپنے نبیل بھائی۔“ آج میں نے انہیں طارق روڈ پر ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔“ عمر نے اس کی اس
جواب کر جھجھکی آہستہ آواز میں بتایا کہ وہ اتنی زور سے چیخی۔

”جھوٹ مت بولو۔“
”جو چاہے تمہارے لود۔“

”نبیل بھائی لڑکی کے ساتھ۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
”اور لڑکی بھی خاصی ماڈرن، بلک جینز، آف وائٹ شہرٹ پہنے ہوئے تھی اور بہت اتر اتر کر چل رہی
میں نے بہت کوشش کی ان تک پہنچنے کی لیکن براہر ٹریفک کا میرے روڈ کراس کرنے تک وہ دونوں گائیں
کر میری نظروں کے سامنے سے نکل گئیں۔“

عمر نے جوش سے بتاتے ہوئے آخر میں مایوسی کا اظہار کیا۔
”میں ابھی پوچھتی ہوں نبیل بھائی سے۔“ وہ اٹھنے لگی تھی کہ اس نے روک دیا۔
”ان سے کیا پوچھو گی؟“

”یہی کہ ان کے ساتھ لڑکی کون تھی۔“ وہ ساگی سے بولی۔
”جلدی کیا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ وہ خود سے کب بتاتے ہیں۔“
”وہ بتا نہیں کب بتائیں گے میں اتنا صبر نہیں کر سکتی۔“ وہ واقعی کھڑی ہو گئی۔
”تمہاری مرضی لیکن خیر وار جو میرا نام لیا تو میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں نے تم سے کچھ نہیں مانا۔“

”بہت کمینے کے ساتھ کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔
”اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

”سچ کہو۔ تمہیں بتا نہیں ہے۔“
”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل کوئی مہمان آئے تو تھے۔ لیکن مجھے نہیں بتا، وہ کس لیے آئے تھے۔ مہمان نے
نیچے ہی بٹھایا تھا پھر نبیل بھائی کو بھی وہیں بلا لیا۔“ وہ رک رک کر بتا رہی تھی کہ عمر نے ٹوک دیا۔

”بس مان لیا تمہیں نہیں بتا“
”بس مان لیا ناں۔ اب جاؤ مجھے پڑھن دو۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے دوبارہ کتاب اٹھائی۔
”کیا کرو گی پڑھ کر وہ ڈی سی تم سے نوکری تو نہیں کروائے گا اور اگر کروائی بھی ہوئی تو اپنی سفارش پر شہر
کسیں تھانے والی لگوا دے گا۔“

”کیا؟“ اس نے چیخنے کے ساتھ کتاب عمر کے سر پر دے ماری۔ ”بہت ہی کمینے ہو تم تھانیدار اپنی نگاہوں پر
پیوی کو اور اپنی سالی کو اور۔“

”سناں گو۔“ عمر نے فوراً لقمہ دیا۔
”ہاں بہت اچھے لگو گے تھانیدار بیویوں میں گھرے ہوئے۔ ادھر سے وہ مارے گی ادھر سے وہ۔“ وہ بولے چارہ
تھی اور عمر ہنسنے جا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تب بڑی معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

”ان ساری باتوں کے لیے ڈی سی ہونا ضروری ہے جو کہ میں نہیں ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں تم ان سے کہنا
تمہاری بہ ساری خواہشیں پوری کر دیں گے۔“

وہ سمجھ گئی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے اس لیے ایک دم خاموشی اختیار کر لی اور کچھ بے نیازی بھی دکھانے لگی
”ارے اصل بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔“ قدرے توقف سے عمر نے اچھل کر اپنے تئیں اسے چوڑا
لیکن اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”ایمان سے صاحب! سنو کی توجہ ان ہو جاؤ گی بلکہ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھ
بھی یقین نہیں کر رہا۔“ عمر نے مزید جھجھکی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس بار کامیاب ہو گیا۔

”کیا کیا یہ بڑا عجیب۔“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔
”وہ اپنے نبیل بھائی۔“ آج میں نے انہیں طارق روڈ پر ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔“ عمر نے اس کی اس
جواب کر جھجھکی آہستہ آواز میں بتایا کہ وہ اتنی زور سے چیخی۔

”جھوٹ مت بولو۔“
”جو چاہے تمہارے لود۔“

”نبیل بھائی لڑکی کے ساتھ۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
”اور لڑکی بھی خاصی ماڈرن، بلک جینز، آف وائٹ شہرٹ پہنے ہوئے تھی اور بہت اتر اتر کر چل رہی
میں نے بہت کوشش کی ان تک پہنچنے کی لیکن براہر ٹریفک کا میرے روڈ کراس کرنے تک وہ دونوں گائیں
کر میری نظروں کے سامنے سے نکل گئیں۔“

عمر نے جوش سے بتاتے ہوئے آخر میں مایوسی کا اظہار کیا۔
”میں ابھی پوچھتی ہوں نبیل بھائی سے۔“ وہ اٹھنے لگی تھی کہ اس نے روک دیا۔
”ان سے کیا پوچھو گی؟“

”یہی کہ ان کے ساتھ لڑکی کون تھی۔“ وہ ساگی سے بولی۔
”جلدی کیا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ وہ خود سے کب بتاتے ہیں۔“
”وہ بتا نہیں کب بتائیں گے میں اتنا صبر نہیں کر سکتی۔“ وہ واقعی کھڑی ہو گئی۔
”تمہاری مرضی لیکن خیر وار جو میرا نام لیا تو میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں نے تم سے کچھ نہیں مانا۔“

”بہت کمینے کے ساتھ کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔
”اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

کے شوہر۔ میرا مطلب ہے صباحت کے باپ کو۔ کیا نام بتایا ہے ان کا؟“ عارفہ بیگم حد کر رہی تھیں یا سنا ضبط جواب دے رہا تھا۔ جو وہ زانی میونہ بھائی کی طرف۔ کھیل کر اٹھ کر چلی آئی۔
 آپ نے آپ کی تمام چیزیں سوٹ کیس میں رکھ دی ہیں پھر بھی آپ دیکھ لیں۔ کچھ رہ تو نہیں گیا۔“
 نے اسے دیکھتے ہی سوٹ کیس کھول کر کہا تو وہ اچھٹی نظر ڈال کر بولی۔

”تھک جی۔“
 ”تو گر لیں ماما!“
 رگڑاؤ سیک بیٹا! میں کون سا لمبے عرصے کے لیے جا رہی ہوں۔ چھوٹو یہ سب اور جاؤ دیکھو نیل کیا کر رہا

نے جنملا کر صباحت کو کمرے سے نکال دیا اور سوٹ کیس بند کر کے وہیں بیٹھ گئی۔ اس کے اندر توڑ پھوڑ
 تھی اور ذہن بری طرح منتشر ہو گیا تھا۔ دل چاہا اسی وقت عارفہ بیگم کو صاف جواب دے دے کہ اسے یہ
 شور نہیں ہے۔

”ایہ میونہ بھائی اسے پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ کچھ گم صم حالت میں انہیں دیکھنے لگی۔
 یا ہوا ہے نہیں؟ اس طرح کیوں چلی آئیں؟“ میونہ بھائی نے نوکاتو وہ پھٹ پڑی۔

”ناہیں تھا آپ نے کیا کہہ رہی تھیں وہ بلکہ جب سے آئی ہیں، بچی کا باپ باپ کیے جا رہی ہیں جبکہ میں
 ۔ دیکھو! اس سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی۔“

”ہم بھی وہ پوچھیں گی اور جو بھی آئے گا۔ پوچھتے گا تم صرف یہ کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتیں کہ تمہارا اس سے
 تعلق نہیں۔ بے شک تمہارا تعلق ٹوٹ گیا لیکن بیٹیوں کا بھی نہیں ٹوٹ سکتا چاہے وہ اس سے ملیں نہ
 نہیں بہر حال بیٹیوں کو ان کے باپ کے نام سے متعارف کرانا ہے خصوصاً ایسے نازک موقعوں پر۔

”ہائے اندر حوصلہ پیدا کرو ورنہ۔“

”یونہی ہی نے دھیر سے سمجھاتے ہوئے اس کا کندھا دیا تو وہ بس گہری سانس کھینچ کر گرہ گئی۔
 چلو اٹھو۔ سفر جا رہی ہو۔ فریش ہو کر جاؤ۔“ میونہ بھائی نے اس کے چہرے پر چھائی افسردگی دور کرنے کی
 ”درا“ کا ہلکا انداز اختیار کیا تو وہ ان کی اس کوشش پر زبردستی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”غیرت کوشش سے بھی وہ اپنا دھیان نہیں ہٹا سکتی تھی۔ عارفہ بیگم سے زیادہ میونہ بھائی نے اسے چند
 ۔ میں سمجھو ڈوبا تھا اور اسے خود پر جرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس حقیقت سے کیسے نظریں چراتی رہی ہے کہ
 باپ کے نام کی اولاد کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔

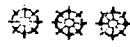
”نہیں احمد نے اس لیے تو مدد جو کو نہیں ٹھکرایا کہ۔“

”بٹ بٹ بٹ باندھتے ہوئے اس اچانک خیال سے اسے بڑے زور کا دھوکا لگا تھا۔ بہت ضبط کرتے کرتے بھی
 نہ پاس کی اتری آئی۔ جسے چھانے کے لیے اس نے سیٹ کی بیک پر سر رکھ کر پیکوں کے درمیان کے تو اندر جانے
 کے لیے کل کے جنہیں بند کرتے کرتے وہ نہ ہال ہو گئی۔ آنکھوں میں مچلتا پانی کوئی راستہ نہ پا کر دھیرے دھیرے
 نہ پکھلیں بھگوئے لگا اور اس سے پہلے کہ اسے احساس ہو تا بہت مانوس آواز نے اس کی سماعتوں پہ

”اوپر آؤ رات!“

”مخ کو وہ اسے اپنا وہم سمجھی لیکن آواز کے ساتھ مانوس خوشبو یوں سانسوں میں اتری کہ دوسرے پل اس
 نے نہ کہ پیکوں کے درمیان دیکھ دیکھ کر

”سندھو قدرے تشویش سے اسے دیکھ رہے تھے۔



عارفہ بیگم سے ابتدائی رسمی کلمات بھی خاص غلت میں ادا کر کے کہنے لگی۔
 ”اصل میں مجھے آج اسلام آباد جانا ہے۔ چھ بجے میری فلائیٹ ہے۔ آپ اگر آنے سے پہلے فون کر
 آج زحمت کرنے سے بچ جاتیں۔“

”زحمت کیسی۔ اپنی غرض سے آئی ہوں اور بار بار آؤں گی۔ آج آپ مصروف ہیں تو کوئی بات نہیں
 جاتی ہوں۔“

عارفہ بیگم نے برائے بغیر کہا تو وہ اپنی غلت پر اندر ہی اندر نام نہان ہرگز فوراً بولی۔
 ”اے نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں کھڑے کھڑے آپ کو رخصت کر دوں۔ آپ پتہ
 رکھیں۔ ایک گھنٹہ سے میرے پاس۔“

”شکریہ۔“ عارفہ بیگم بیٹھتی ہی پوچھنے لگیں ”اسلام آباد کس سلسلے میں جا رہی ہیں۔“
 ”ایک سینیئر کا دعوت نامہ ہے اس میں شرکت کرنی ہے اور میرے ایک بھائی وہاں رہتے ہیں۔ ایک

کیا پاس رہوں گی۔“ اس نے سولت سے بتایا۔
 ”اور آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح ڈاکٹر ہیں کیا؟“ عارفہ بیگم نے بظاہر بری

پوچھا تو چند لمحوں کے توقف سے وہ بہت سنبھل کر بولی۔
 ”جی نہیں۔ میرے شوہر نہیں ہیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ہماری علیحدگی ہو گئی تھی۔“

”وہ!“ عارفہ بیگم نے افسوس کا اظہار کیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”پھر آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟“
 ”جی نہیں اور پلیر کیوں کا سوال نہیں اٹھائیے گا۔“ اس نے کہہ کر گھڑی دیکھی جیسے کیوں کا جواب

لے اس کے پاس وقت نہ ہو۔
 ”فنا ہر ہے۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن بچی کا تو باپ سے ملنا ہوتا ہو گا۔“ عارفہ بیگم جانے کو

تھیں۔
 ”نہیں۔“ اسے نے اختصار سے کام لیا اور یوں دیکھنے لگی جیسے اب وہ کیوں کا سوال ضرور اٹھا کر

کے برعکس وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولیں۔
 ”اس کا مطلب ہے، بچی کی ماں بھی آپ ہیں اور باپ بھی۔“

”جی۔“
 ”پھر بھی بچی کی شادی کے سلسلے میں آپ اس کے باپ سے مشورہ تو کریں گی بلکہ ضرور کرنا چاہیے

وہ کوئی۔“ عارفہ بیگم نے قصداً بات ادا ہو رہی چھوڑ دی۔

”آہ خاموش رہی۔ ہمیں اس سے کیا سروکار۔ ہم نے آپ کو دیکھا، آپ کی بیٹی کو دیکھا۔ آپ
 ”خیر آپ کی مرضی۔ ہمیں اس سے کیا سروکار۔ ہم نے آپ کو دیکھا، آپ کی بیٹی کو دیکھا۔ آپ

یافتہ سلجھی ہوئی خاتون ہیں بیٹی کی پرورش اور تربیت آپ نے ہی تو یقیناً۔“ اس میں آپ کا کس
 باپ خواہ کیسا بھی ہو۔“ عارفہ بیگم کی بات جاری تھی کہ وہ بول پڑی۔

”معاف کیجئے گا۔ میری بیٹی کا باپ کوئی ایسا دھنچکا نہیں ہے۔ آپ نے اپنے ذہن ہی میں
 کا انتخاب کیا ہے۔ وہ بہت تیز مشر شاہ سندھ راجت کی بیٹی ہے۔“

عارفہ بیگم نے کوشش سے آنکھیں پھیلانی تھیں۔ تب ہی میونہ بھائی چائے لے کر آئے
 داخل ہوتے ہوئے انہوں نے عارفہ بیگم کی پچھلی ہوئی آنکھیں دیکھ لی تھیں جب ہی اشارے۔

کہ انہیں کیا ہوا۔ جواباً ”آہ“ نے کچھ نہیں کا اشارا کیا اور جلدی سے زانی اپنی طرف کھینچ کر
 عارفہ بیگم جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

”ہنام سنا ہوا لگ رہا ہے اور شادی دی پر بھی دیکھا ہے؟“ اپنے بیٹے سے پوچھوں گی وہ ضرور جانتا
 ”کے؟“ میونہ بھائی نے بے خبری کے باعث فوراً پوچھا۔

ب سگریٹ نہیں پینے دی۔ میں جیسے ہی سگریٹ نکالنے کے لیے جیب پر ہاتھ رکھتا ہوں فوراً "ٹوک دیتیں وہ میری بات نہیں کرتا تھا۔"
 "اے کبھی کبھی ایسا۔"
 "میں نے آپ جیسے ہمسفر نہیں ملے۔" انہوں نے دھوئیں کے مرغلوں میں سے اسے دیکھا تھا۔ اتنی دورانی دور، جیسے زندگی روٹھ جائے تو مٹانا ناممکن، ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں اتنے برس اس نے کیسے بھی ان کے سنگ گزرے لمحات کو یاد کیا۔

نہیں۔
 نہیں۔
 رائے منانے کی ادائیں۔
 جاننے کی باتیں۔

دل کی تسکین میں ہر نئے دن کے آغاز پر ان کے نام کا پھول کھلاتی تھی ان کا کیا ہوا؟
 بے بسب نفرتوں کی آندھریوں کی نذر ہو گئے۔
 اس بات کا پسیدہ لانا چلنے لگے۔ میں سارے ماہ و سال سمیٹ کر پھر اسی مقام پہ جا کھڑا ہوں جہاں میرے ہاتھ اپنی بات کا ہاتھ تھا۔ اور میں اسی محبت سے اسے پکاروں۔

انہوں نے بے اختیار پکار لیا تو وہ جو پہلے ہی ان کی نظروں کی تپش سے نروس سی ہو رہی تھی اپنی ہی ہو گئی۔

نہی۔ "میں فوراً ہی احساس بھی ہو گیا۔" میں جانے کس وقت میں کھو گیا تھا۔ ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا

بے خدا۔ "اسے اپنے بدن پر منھنی منھنی چوٹیاں رنگتی محسوس ہوئیں تب ہی ہوش نے چائے کی مائے کی تودہ و کپ اٹھا کر ایک اس کی طرف برسواتے ہوئے بولے۔

بے چارے۔
 بے مت خاموشی سے کپ تھام لیا اور ایک سب لے کر شیشے سے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا آسمان نہ زمین، خلا کا بھی بس احساس تھا۔ کئی دیر وہ محض ان سے بچنے کی خاطر ہنس مڑے بیٹھی رہی۔ صرف شاہ سکندر کو اسے متوجہ کرنے کے لیے پکارنا پڑا۔

نیکمیزی ڈاکٹر آسیہ۔
 ہر دم ہوئی لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں۔

میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کی بیٹی کیسی ہے؟ "انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے تادیب بات غیر متوقع نہیں تھی جب ہی بہت سکون سے بولی۔

بے بس۔ "فطری تجسس کے ساتھ ان کے بے ساختہ سوال شروع ہو گئے۔

بے بس بعد اس کے تھوڑا دیر کے امتحان ہیں۔"
 بے بس آئی میں اس کے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟

نا اچھا پوئل سے یا تلاش کرنا پڑے گا۔ "وہ اب براہ راست اسے دیکھنے لگے تھے۔
 نا اچھا لوگوں ذرا سناٹات میں سر ہلاتے ہوئے آسیہ کی نظروں میں علی جناح کی کاؤ جیسے راپا آن سجا اس کے لئے اسے عارفہ بیگم کی باتیں یاد آنے لگیں پھر میمونہ بھابھی کا سمجھنا، تو وہ انہیں دیکھتی ہوئی کچھ شش و دن میں

اتنے قریب اس ستم گر کی موجودگی سے آسیہ کا دل ڈوبنے لگا۔ کیونکہ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ بے شکل زہر قابو پا کر اس نے کچھ غیر محسوس طریقے سے پہلے نظروں کا زاویہ بدلا پھر ایک سے سر ہٹا کر سیدھی ہو بیٹھی۔
 "دشاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاہ سکندر ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے غالباً یہ ڈر تھا کہ آنکھیں پھٹنے سے پتلا ٹوٹ جائے گا۔
 آسیہ نے ان کی بات کا جواب دیا نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا بلکہ یوں جیسے وہ اس سے نہیں کسی اور سے

مخاطب ہوں۔
 "نہیں پلیر اتنی انجان نہ بنیں، میں آج بھی اس وعدے کا پابند ہوں، خود سے آپ کے راستے میں نہیں آیا۔
 چند گھنٹوں کی ہم سفری قسمت کی مہربانی ہے یا ستم ظریفی، میرے لیے بہر حال اس کا ایک ایک پل انمول ہے۔ میں آپ کا تاحیات ممنون رہوں گا اگر جو آپ ناراضگی اور نفرت سے نظریں چرا کر فقط اس سفر میں اور کچھ نہیں تو دوست ہی سمجھ کر بات کریں مجھ سے۔" شاہ سکندر کے انداز میں لہجے میں عاجزی تھی۔

وہ بے اختیار ذرا سی گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔
 "شاہ سکندر کا مقصد کچھ بتانا یا دو اجنبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔" شاہ سکندر کا معذرت کرتے ہوئے یاد دلانا نہیں تھا بس یوں ہی کہہ گئے تھے پھر بھی اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو گئی جس پر وہ فوراً "معذرت کرتے ہوئے بولے۔

"آئی ایم سوری، میرا مطلب ہے، ہم بھی اجنبیوں جیسی باتیں تو کر سکتے ہیں جیسے سب سے پہلے مجھے یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟
 "اسلام آباد" اس کے ہونٹوں نے بے اختیار جنبش کی تھی ایسے ہی بے ساختہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کچھ کنفیوز سی ہو کر نظریں چرائی۔
 "اسلام آباد کس کے پاس؟" شاہ سکندر نے بڑے محفوظ انداز میں فوراً "اگلا سوال کر دیا تو وہ جیسے ہتھیار ڈال کر بولی۔

"بھائی کے پاس۔"
 "کتنا عرصہ قیام رہے گا وہاں؟"
 "میں کوئی چار پانچ دن"
 "پھر واپس کراچی۔"
 "جی۔"

"دکراچی میں کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"
 "گھر اور کلینک۔"
 "تو آپ ڈاکٹر ہیں۔"
 "جی۔"

"دیری گند ویسے مجھے ڈاکٹروں سے ایک شکایت ہے"
 "وہ کیا؟"
 "ابھی میں سگریٹ کا پیکٹ نکالوں گا اور آپ مجھے اس کے نقصانات پر لیکچر دنا شروع کر دیں گی۔"

نے بڑی مسکراہٹ کے ساتھ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اسے دیکھا تو وہ سمجھ کر بولی۔
 "جی تمہیں آپ شوق سے پیئیں، میں بالکل ماسٹڈ نہیں رہوں گی۔"
 "تھینک یو۔" انہوں نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں باہا اور اسے لاسٹر کھانے کے بعد کھنے "تھینک یو۔"
 "میں ایک بار امریکا جا رہا تھا ایسے ہی میرے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں، اٹھارہ گھنٹے کے سفر میں

”ابن ابیہلم“ نہیں اس کا ہر انداز زیر تھا۔
 ”نور ابیہلم“ آپ پروپزل کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ تو بے ایک پروپزل اگر میں اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تو انشاء اللہ جلد صبا کی شادی کروں گی پھر۔“ وہ ایک دم ہونٹ بچھڑائی اچانک خیال آیا تھا کہ اگر صرف ایک بیٹی کی خبر ہے۔
 ”کون کون ہے آئی میں وہ لڑکا کیا آپ کی فیملی میں ہے۔؟“ شاہ سکندر پورے دھیان سے اس کی طرف پوچھ رہے تھے۔
 ”نہیں غیر لوگ ہیں اس کے والد کا دینی میں بزنس ہے اور وہ لڑکیاں کراچی میں غالباً اسٹنٹ کسٹمرز شاید بیٹی بہر حال اس کے بارے میں مکمل چھان بین کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔“ اس نے سہولت سے بتا کر انہیں دیکھا تو وہ فوراً بولے۔
 ”میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں یعنی اگر آپ کہیں تو اس لڑکے کے بارے میں معلومات دیں وہ فوراً جواب نہیں دے سکی۔ حالانکہ صرف جی یا نہیں کرنا تھا لیکن وہ سوچنے میں لگ گئی کہ یہ کام ان سے نہ چاہیے یا نہیں۔
 ”اطمینان رکھیں کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا اچھا چاہوں گا۔“ اس بار انہوں نے ”آپ کی بیٹی“ کہنے سے قصداً گریز کرتے ہوئے ایک طرح سے جواب دیا کہ وہ ان کی بھی بیٹی ہے اور اس نے سمجھ کر ذرا سائنات میں سر ہلایا پھر کہنے لگی۔
 ”تو لڑکے کا نام علی ہے۔ علی جمالیہ کراچی میں کاشن روڈ پر رہائش ہے۔ اس کے ساتھ اس کی والدہ اور ایک بہن ہے۔ والد کے بارے میں بتا چکی ہوں، دینی میں ہوتے ہیں۔ اب اس کے بارے میں جو آپ مطلع کر چاہیں، ان کی مین خاندان۔ اس لڑکے کا ذاتی کیریئر وغیرہ اور اگر آپ کو وہ مناسب لگے تو مجھے بتا دیجیے گا۔“
 ”حق میں فیصلہ دے دوں گی۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے گہری سانس کے درمیان ہوں کی آواز نکالی پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے تین اورنج سی ڈائری نکال کر لڑکے کا نام پتہ لکھا پھر اس سے پوچھنے لگے۔
 ”اور آپ سے میں کہاں کوٹھیکٹ کروں۔؟“
 وہ اپنے کھینک کا نمبر لکھوا کر بولی۔
 ”شام پانچ سے آٹھ بجے تک مجھ سے اس نمبر بات ہو سکتی ہے۔“
 ”اس کے علاوہ؟“ انہوں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا لیکن وہ ایک دم نرم ہو گئی۔
 ”کہیں نہیں۔“
 ”اوکے“ میں بہت جلد علی جمالیہ کے بارے میں ساری معلومات آپ تک پہنچا دوں گا۔“ انہوں نے اور تین واپس اندرونی جیب میں رکھا پھر اسے دیکھ کر ٹیبل پر پٹکے انداز میں مسکرا کر پوچھنے لگے۔
 ”آپ یہ بتائیے کہ بیٹی کی شادی میں مجھے انوائٹ کریں گی یا نہیں۔؟“
 ”نہیں۔“ اس نے بے مروتی کی حد کر لی اور شاہ سکندر نے پہلے بھی کہیں کیوں کا سوال نہیں اٹھایا تھا۔
 بھی خاموش ہو رہے تو ایک محسوس کی جانے والی دیوار درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔
 سفر تمام ہونے کو تھا لیکن اب منزل کیس نہیں تھی اور ان دونوں کے اندر کوئی جتنو بھی نہیں تھا۔
 المیہ یہ تھا کہ انہیں منزل پہلے ملی تھی اور سفر بعد میں۔ جسے زندگی کی آخری سانسون تک جاری رہنا تھا۔
 اپنی اپنی جگہ جانے کون سے وقت میں کھو گئے تھے۔ چونکہ اس وقت جب بائیک پر سیٹ پلٹ بائہ درخواست کی جا رہی تھی۔
 شاہ سکندر نے اسے یوں دیکھا جیسے پھر جانے کب ملاقات ہو اور وہ انجان سی بن کر پلٹ باندھ بیٹھا۔

”ابن ابیہلم“ اس کے بعد اپنا پرس کھول کر اس میں جھانکنے لگی۔ یوں ہی ادھر ادھر ہاتھ مار کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔
 ”میرا خیال ہے یہ پرواز نہیں تک بھی۔“ شاہ سکندر نے بغیر اسے مخاطب کیے کہا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔
 ”میرا خیال ہے یہ پرواز نہیں تک بھی۔“ شاہ سکندر کی ٹانگیں راستہ روکے ہوئی تھیں اور وہ اطمینان سے اپنا بریف کیس بند کرنے میں مصروف تھے۔
 ”ایکس کیو ڈی۔“ اس نے متوجہ کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور راستہ دینے کے بجائے فوراً ”کے“ ہو کر اس سے آگے چلنے لگی۔
 ”یہڑھیاں اترنے تک وہ ان کے پیچھے پیچھے تھی پھر ایک دم قدم ہٹا کر آگے بڑھنے لگی کہ وہ پکار کر بولے۔
 ”آہ! خدا حافظ نہیں کہیں گی۔؟“
 ”خدا حافظ۔“ وہ ایک پل میں خود پر قابو پا کر اعتماد سے مسکرائی تھی۔

~~*

وہ بہت ڈرتے ڈرتے نیپل کے کمرے میں داخل ہوئی تھی لیکن وہ موجود ہی نہیں تھے۔ جس پر وہ اطمینان کا راس لے کر کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔ دو دن ڈسٹنگ نہیں کی تھی تو اتنی گرو جمع ہو گئی تھی۔ بید کی چادر بھی ہلج رہی تھی۔ ڈسٹنگ کے بعد اس نے الماری میں سے دھلی ہوئی چادر نکال کر بچھائی پھر تکیے کا غلاف بدل کر بانے لیا۔
 ”وہ میں“ کمرہ گندہ ہو رہا تھا۔ میں میں نے سوچا۔“
 نیپل پچھ بولے نہیں۔ دروازے سے ہٹ کر اسے نکل جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک دم روپائی ہو گئی۔
 ”میرا کیا تصور ہے۔ مجھے تو عمر بے بتایا تھا۔ آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں۔؟“
 ”کوئی خفا نہیں ہوں میں بس جاؤ یہاں سے۔“ وہ آگے آتے ہوئے بولے۔
 ”کیوں جاؤں میں کیس نہیں جاری۔“ وہ وہیں بید پر ڈھے گئی۔
 ”مہا بھئے اس وقت تنگ نہیں کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“
 ”پریشان۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”آپ پریشان ہیں نیپل بھائی، کس بات سے۔ ممانے کچھ کہا ہے لیکن ممانو یہاں میں ہیں پھر پھر کس نے۔“
 ”الف“ ایک تو تم بتائیں کیا چیز ہو۔“ نیپل نے اپنا سر تھما لیا۔
 ”آپ کچھ بھی کہیں“ میں جب تک آپ کی پریشانی نہیں جان لوں گی یہاں سے ہلوں گی ہی نہیں۔“ وہ دوبارہ بڑبڑائی۔
 ”تو نیپل سر جھٹک کر واش روم میں چلے گئے۔
 وہ انتظار کرنے کے ساتھ اپنے آپ فیاں بھی کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے ہی نکلے فوراً ”شروع ہو گئی۔“
 ”آپ میری عادت سے اچھی طرح واقف ہیں نیپل بھائی پھر اس طرح کیوں کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں آپ کی پریشانی دور نہیں کر سکتی لیکن۔“
 ”باس۔“ نیپل نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اس کے پاس بیٹھے ہوئے نرمی سے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔“
 ”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔“
 ”زبان کچھ غلط پھسل گئی میری بہن! کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ سمجھیں یا نہیں۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ جم کر زور سے ہلایا تو وہ بسور کے انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”اور آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔؟“

”کس بات سے؟“

”وہ جو عمر کے کہنے میں آکر میں نے آپ سے لڑکی کا پوچھا تھا۔“ وہ ایسی ڈری ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی تھی جیسے اس بات سے ابھی وہ ہتھ سے اکھڑ جائیں گے لیکن اس کے برعکس وہ ہنستے ہوئے بولے۔
”وہ بھی احمق ہے اور تم بھی۔ اور میں احمقوں سے ناراض نہیں ہوں۔“
”لیکن آپ عمر سے پوچھنے کا ضرور کہ اس نے ایسی بات کیوں کی؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
”پوچھ لوں گا۔ ابھی تو تم مجھے چائے پلاؤ پھر مجھے جانا بھی ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس نے جاتے جاتے سر پوچھا۔

”کہاں؟“

”کہاں کا کیا مطلب؟ یعنی اب تم میرے جانے آنے پر پابندی لگاؤ گی۔“
”میں کیوں پابندی لگاؤں گی۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ۔۔۔“
”جاؤ دیکھو کس کا فون ہے۔“ نیل نے فون کی نیل سن کر اسے ٹوک دیا۔
”بہر حال کہیں بھی جائیں۔ جلدی واپس آئیے گا۔ مجھے آج آپ سے پڑھنا ہے۔“ وہ کتنی بھانک کر میں آئی۔
”ہیلو۔“

”صاحت شاہ سے بات ہو سکتی ہے۔“ ادھر سے علی جہانگیر نے اس کی آواز پہچان کر دلکش انداز میں کہا بھی اتر کر بولی۔

”جی نہیں، وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“
”کوئی بات نہیں، آپ تو ہیں ناں۔ میں آپ سے بات کر لیتا ہوں۔“ ادھر بڑا محفوظ لہجہ تھا۔
”مجھے کیا بات کر سکتے ہیں۔“
”وہی جو صاحت سے کہنی تھی۔“
”یہ تو سراسر فاول ہے۔“ اس نے بمشکل ہونٹوں تک آئی ہنسی روک کر کہا۔
”کیا کروں، وہ نہیں تو ہنسی اور تو نہیں تو کچھ نہیں۔“ وہ اچانک جذبات کی رو میں بہہ کر گنگنا لگا۔
”تیرے نام سے یہی سچی ہوئی میری زندگی کی کتاب ہے مجھے دیکھنا یہی نصیب ہے تیرے بعد سارا سراب ہے وہ اس کی دلکش آواز میں کھو گئی تھی۔“
”صبا! علی جہانگیر نے پہلی بار اس کے نام کو مختصر کیا تو وہ چونک کر بولی۔

”جی۔“
”آپ کو دیکھے ہوئے، آپ سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے بلکہ لگتا ہے زمانے بیت گئے۔ کچھ عرصہ تم جہنم میں رہیں۔ ابھی آجائیں۔“ اس کے لہجے کی بے قراری دل میں پھل پھل چاٹتی۔
”بہت مشکل ہے۔“
”ناممکن تو نہیں ہے ناں، کوشش کریں پلیز۔“ اس کے عاجزانہ اصرار پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”ہیلو صبا! کیا ہوا؟“ کچھ انتظار کے بعد اس نے پکار کر پوچھا۔
”کچھ نہیں، آئی مین میں کوشش کرتی ہوں اگر کامیاب ہوئی تو گھر سے نکلنے سے پہلے آپ کو فون کروں۔“
اس نے جلدی سے کہہ کر ریمپور روک دیا اور وہیں سے کچن کا رخ کیا۔
کچھ دیر بعد جب چائے لے کر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ بڑے آرام سے سو رہے تھے۔ کوئی اور ذرا وہ ہرگز انہیں نہ اٹھائی لیکن اب مجبوری تھی۔ علی جہانگیر کی خواہش کو رد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔
چائے کا کپ سائیڈ کارنر پر رکھ کر پہلے انہیں پکارا پھر آہستہ سے ان کا کندھا ہلایا تو وہ آنکھیں کھول کر

”آپ کو سونا تھا تو چائے کیوں نہ پلائی۔؟“

”نہیں، مجھے سونا نہیں تھا۔ وہ اٹھ بیٹھ۔ لاؤ چائے کہاں ہے۔؟“
”اس نے کپ اٹھا کر انہیں تھمایا پھر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔
”آپ کو پس جانا ہے۔“

”ابوں۔“
”مجھے بھی لے چلیں۔ میرا مطلب ہے میں لائبریری جاؤں گی۔ آپ مجھے وہاں جھوڑ دیتے ہیں۔“ اس نے بڑی سہولت سے کہا۔
”میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے صاف منع کر دیا۔

”کہوں۔؟“
”کیونکہ مجھے واپس میں دیر ہو سکتی ہے پھر تم کس کے ساتھ آؤ گی۔ ویسے بھی تمہیں ابھی امتحان کی تیاری کرنی پڑے گی۔“
”لائبریری کی کتابوں کا کیا کرو گی۔“
”نیل کی بات ٹھیک تھی۔ وہ مایوس سی ہو کر ان کے پاس سے چلی آئی اور ان کے کہیں جانے کا انتظار کرنے لگی۔ علی جہانگیر کو فون کر کے بتا کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی ہے۔

~~*

نہیں روزہ سینا کے بعد آسیہ کو اب فراغت ملی تھی تو اس نے سب سے پہلے مدیحہ سے واپس چلنے کی بات کی۔
”اس کی اپنی ضد تھی۔“
”مجھے نہیں جانا تھا میں یہیں رہوں گی۔“

”یہاں رہنے کی کیا تک ہے۔ وہاں تمہارے امتحان ہونے والے ہیں۔ صبا تمہارا ایڈمٹ کارڈ بھی لے آئی۔“
”یہ تو کس تاریخ سے پتہ شروع ہیں۔“ آسیہ نے حتی الامکان اپنے بچے پر کنٹرول رکھ کر کہا۔
”میں کوئی امتحان نہیں دے رہی۔ مجھے یہاں ایڈمیشن لینا ہے اور میں نے صبا کو فون بھی کیا تھا کہ میری مارکس بٹ بیچ دے، کیوں نہیں بیچتی اس نے یہاں ایڈمیشن ہو رہے ہیں۔ ڈیٹ نکل گئی تو میرا ایک نہیں دو سال لپٹ جائیں گے۔“ مدیحہ کا انداز جتنی تھا۔
”فصل باتیں مت کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ آسیہ چڑ گئی۔

”نہیں ممّا! اگر ماما جی اور ماما جی بھی یہ کہہ دیں کہ ان کے گھر میں میرے لیے جگہ نہیں ہے تب بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ مدیحہ جانے اپنے دل میں کیا ٹھان چکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کی پروا ہو تو ماما جی بھی نہیں کہ اس کے ساتھ جو ہونا ہے ہو جائے۔
”آسیہ! دیر سنائے میں آکر اسے دیکھتی رہی پھر بہت سنبھل کر نرمی سے بولی تو اس کے لیے میں عاجزی در آئی۔

”بھائی! تم ایسا کیوں کر رہی ہو، کیوں مجھے دکھ دیتی ہو۔“
”میں دکھ نہیں دے رہی ممّا، آپ سمجھیں۔ میرے وہاں ہونے سے آپ زیادہ پریشان نہیں بلکہ سب پریشان ہیں۔“
”پریشان کر رہی تھیں۔؟“ آسیہ نے زور دے کر کہا۔

”ہاں اور میں اب بھی اگر گئی تو پہلے سے زیادہ کروں گی کیونکہ مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ جو میرے اندر ہے وہیں ظاہر کروں گی۔ میرے اندر نفرت ہے سب کے لیے۔ میں محبت ظاہر نہیں کر سکتی۔ آپ اگر اس گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو مجھے یہیں رہنے دیں۔ بے شک یہاں باشل میں ڈال دیں اگر یہ خدشہ ہے کہ میں ماما جی کو تنگ کر دوں۔“
”جس طرح آسیہ کی نرمی میں عاجزی در آئی تھی، اسی طرح اس کی ہٹ دھرمی میں محسوس کی جانے والی آزدگی

تھی اور آسیہ ماں تھی جو بچوں کے احساسات ان سے زیادہ سمجھتی ہے۔ اس کی آزدگی پر تڑپ کر اسے اپنے ماتو اگایا۔

”میری جان! مجھے تمہاری طرف سے کوئی خدشہ نہیں۔ میں تو صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔“

”صاف ہے ناں ماما! آپ کے پاس بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے ہم دونوں میں۔“

اس کی بے وقوفی کی حد تک سادگی آسیہ کو حیران کر گئی۔ اس کا سراپنہ سینے سے لگا کر اس پر اپنی ٹھونک پڑی ہوئی کہنے لگی۔

”ایک بار میمونہ بھابھی نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی مدح و ست ہے و قوف ہے۔ تو میں مذاق سمجھ کر ہنسی۔ کاش وہ مذاق ہی ہوتا لیکن تم نے تو حد کر دی بیٹا۔ صاف صاف ہے تم کو۔ میرے دل میں تم دونوں کے ساتھ محبت الگ نہیں ایک جیسی ہے۔ تم نے تو وہ بات کی کہ سوئی تمہیں چھپے اور پی میں صبا کی انگلی میں باندھ دوں گا۔ وہ اسے اپنے سینے میں بھیج کر ذرا سانس دے گی۔ یہی سیما بھابھی آئیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہو کر بولیں۔“

”واہ! یہاں تو تختیں لٹائی جا رہی ہیں۔ کچھ میری جھولی میں بھی ڈال دو۔“

”کچھ کیوں بہت ہیں آپ کے لیے بھی۔ یہ تو وہ خزانہ ہے جتنا لٹاؤ اتنا بڑھتا ہے۔ کیوں مدح و ست؟“

بھابھی سے کہہ کر مدح و ست کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو وہ نظریں چرا کر بولی۔

”چاہ نہیں ماما! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“

”اپنے دل کو محبتوں سے آباد کرو گی تو سمجھو گی۔ نفرتیں انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور اکیلا بھی۔“

آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر سیما بھابھی کو دکھ کر کہنے لگی۔

”کیا جاؤ کر دیا ہے آپ نے میری بیٹی پر۔ یہ میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتی۔“

مدح و ست کی طرف سے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔

”میں۔۔۔ وہ تو بہت اچھی بچی ہے۔ میرا خیال ہے تم نے اس پر بے جا سختی کی ہے۔ جب ہی وہ تمہارے کرتی ہے۔ یہاں تو بالکل ٹھیک ہے اور اسے نہیں رہنے دو۔ وہ یہاں ایڈمیشن کی بات کر رہی ہے۔ ٹھیک رہنے دو۔“

”تخلیل بھائی نے مدح و ست کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔“

”میں بھائی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اس لڑکی نے تو مجھے۔“

”ہاں! تم اب اس کی فکر نہیں کرو۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم صرف صبا کو سوچو۔“

بھائی نے ٹوک کر کہا تو وہ خاموش ہو کر جانے لگا۔ یہی سیما بھابھی چائے لے کر آئیں اور بچے دیکھ کر میاں سے پوچھنے لگیں۔

”اسلئے ہے؟“

”ہاں آسیہ! ہم کوئی نئی تازہ سناری تھیں۔“

”تخلیل بھائی نے بیوی کو جواب دے کر اسے متوجہ کرنے سے چائے کا کپ اٹھا یا پھر سیما بھابھی کے بیٹھے پر کہنے لگی۔“

”میں صبا کے بارے میں مشورہ کرنا تھا۔ اس کے لیے ایک پر پوزل آیا ہے۔ لڑکا ماشاء اللہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ لکھ کر لوگ ہیں۔ اس لیے میں کچھ مدح و ست کر رہی ہوں۔“

”بہت قسمت کی باتیں ہیں۔ قسمت اچھی ہو تو غیر اسے ہو جاتے ہیں۔ نہیں تو اپنیوں کو غیر ہونے میں دیر لگتی۔“

”سیما بھابھی کا اشارہ احمر کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر ان کی تائید کرتے ہوئے بولی۔“

”بوت بھیک کہہ رہی ہیں لیکن ادھر وہ لوگ شادی بھی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔“

”اگر اچھا رشتہ ہے تو کرو۔ منع نہیں کرو۔ لڑکیوں کی عمر ذرا زیادہ ہو جائے تو پھر اچھے رشتوں کا مسئلہ ہو جاتا ہے لڑکے لڑکیاں تو لڑکا ہے؟“

”نیل بھائی نے فوراً مشورے کے ساتھ پوچھا تو وہ تفصیل سے علی جمائیکر کے بارے میں بتانے لگی۔“

”ہاں! آسیہ واپس آئی تو اسے اکیلے دیکھ کر صبا حجت نے پہلا سوال مدح و ست کے بارے میں کیا۔“

”مدح و ست کی بات نہیں؟“

”نہیں بیٹا! وہ وہاں خوش تھی پھر تمہارے ماموں جی اور ماما جی کا بھی اصرار تھا کہ اسے وہیں رہنے دوں! اس نے مجبور ہو گئی۔ تم کل ہی اس کی مارکس شیٹ وغیرہ بھجوا دیتا۔“

آسیہ نے بتا کر آخر میں تاکید کی تو وہ رو باسی۔

”آسیہ! وہ ہمیشہ وہیں رہے گی۔“

”نیل کیوں ملی اے مگر کے اٹھائے گی۔“

آسیہ نے یوں کہا جیسے یہ دو سال نہیں دو دن کی بات ہو۔

”آکھ مرگٹ نہیں ماما! میرا اس کے بغیر دل نہیں لگتا۔ آپ اسے فوراً واپس بلا لیں۔“

”ماما! میں اسے جاب دے رہی ہوں۔ تم کو کس کر کے دیکھو شاید تمہاری بات مان لے۔“

آسیہ نے خود فوراً ہر کر کے بات اس پر ڈال دی۔

”تو وہ پہلی ہی جواب دے چکی ہے بلکہ دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔“

”یہ تو تمہیں کچھ مت کہو۔ وہ اگر خوش ہے تو ٹھیک ہے۔“

آسیہ نے بات ختم کر دی پھر قدرے توقف سے بولی۔

”میرا کوئی فون تو نہیں آتا تھا۔“

”نیل! میری ایک خاتون کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں آپ کب آئیں گی۔“

”وہ روانی میں بتا کر نظریں سے کہیں میں پہلا خیال عارف بیگم کا آیا اور اس سے تصدیق کرنے کی بجائے اپنے آپ سے بولی۔“

”بیگم کا ہو گا خیر تم تاؤ امتحان کی تیاری ہو رہی ہے ناں۔“

”شما باش۔“ آسہ اس کا گل تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر اگلے روز اس کے کھینک جانے سے پہلے عارفہ بیگم آن موجود ہوئیں اور مسلسل اس کے پاس اصرار کرتی رہیں۔ بڑی مشکل سے وہ انہیں آئندہ پر مال سکی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ خودی نہیں دے گی اور اس کے لیے انہیں صباحت کے امتحان ختم ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا جبکہ خود اسے شاہ سکندر انتظار تھا جو کام اس نے عدل بھائی کے لیے سوچا تھا وہ شاہ سکندر نے اپنے ذمہ لے لیا تھا تو اس کے خیال اسے اس سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ شاہ سکندر نے اس کے ساتھ اچھا لیا یا برا نہ کیا ہے تو اچھا ہی ہو جائیگا۔

انسان ہمیشہ سے تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ جو بات ہوتی ہے اس کے لیے پہلے سے تیار واقعات جیسے ترتیب سے لکھ دیے جاتے ہیں۔ اتنے برسوں سے پہلے تو ہمیں شاہ سکندر سے اس طرح ہوا تھا۔ عین اس وقت کیوں جب بی بی کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس نے اس اتفاق کو سوچا بھی تو شب اور ان ہی پر بھروسہ بھی کر لیا کہ وہ باپ ہیں، انہیں زیادہ حق ہے اور وہ زیادہ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں اور مشورے کرتے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسرے دن جب وہ مریضوں سے فارغ ہو کر آرام وارڈ کے راولڈر نکل رہی تھی کہ شاہ سکندر کا فون آگیا۔

”ہیس ڈاکٹر آسہ امپیکٹنگ۔“ اس نے دروازے سے واپس پلٹ کر ریسورٹ اٹھایا تھا۔

”کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ آپ؟“ شاہ سکندر نے بظاہر رسمی انداز میں پوچھا لیکن ان کے لہجے میں اتنی جوشیل اندر بالکل چھپائی تھی اور اب دل ڈوبنے لگتا تھا۔

”جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بہت مستعجل کر بولی تو کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی کیونکہ وہ کر رہے تھے کہ وہ بھی ان کا احوال پوچھے گی، ”سا“ ہی سہی پھر اس کی طرف سے بایوس ہو کر ہی بولے تھے

”وہ آپ کا ایک کام تھا میرے ذمہ اور اس سلسلے میں کچھ کئے سے پہلے مجھے یہ پوچھنے کی اجازت۔“

”آپ میری فراہم کردہ معلومات پر یقین کر لیں گی۔“

”یقین کرنا میری مجبوری ہے سکندر حیات! کیونکہ دنیا کا کوئی باپ کم از کم اپنی بیٹی کا برا نہیں سوچ

نے بہت سہولت سے جتایا۔“

”آپ ہمیشہ سے بہت ذہین ہیں آسہ! لیکن افسوس اپنے معاملے میں آپ نے اپنا ذہن استعمال نہ

ذرا سی سمجھ داری سے کام لیتیں تو۔۔۔“

”پلیز۔“ وہ ٹوک کر بولی۔ ”آپ مجھے علی جانگیر کے بارے میں بتائیں۔“

”اچھا لڑکا ہے۔“ وہ فوراً شروع ہو گئے۔ ”خاندان بھی اچھا ہے۔ میں دینی میں اس کے باپ ہوں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گی تو میں یہی کہوں گا کہ اپنی بیٹی کے لیے یہ جتنا اچھا سوچ سکتا تھا تو سے بھی بڑھ کر ہے، ہی آؤ بری اسٹوٹ بوائے۔ آج وہ بس مقام پر ہے اس میں زیادہ اس کی اپنی ہے۔ خدا کے بعد خود پر بھروسہ کرنے والے اسی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ انشاء اللہ مزید ترقی آپ کو فوس تو نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے اچھا پر پوزل اور ہوی نہیں سکتا۔“

وہ جو پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ان کے خاموش ہونے پر پوچھنا انداز میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے مجھے ہابی بھرنی چاہیے۔“

”بہتر تو یہی ہے، آگے آپ کی مرضی۔“

”اوکے بہت بہت شکریہ۔“

”دک بات کا۔“ شاہ سکندر نے فوراً پوچھا لیکن اس نے بڑے آرام سے ریسورٹ رکھ دیا اور رات وہ کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ بس ایک کھٹک تھی کہ وہ اتنی جلدی صبا کی شادی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اپنی اے کر لیتی پھر لیکن عارفہ بیگم نے اپنی پہلی آمد پر ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں فوراً ”شادی کرنا“

چے میاں کے پاس دینی جانا ہے اور انہوں نے مزید اپنی کچھ مجبوریاں بتائی تھیں۔

رات آسہ دیر تک اماں جی، آبا جی، خلیل بھائی اور میوہ بھابی کے ساتھ بیٹھی ان سے مشورہ کرتی رہی پھر عقدہ فیصلہ ہی تھا کہ اگر وہ اس رشتے پر مطمئن ہے تو پھر اسے شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک باپ کے کرنے کی بات ہے تو وہ شادی کے بعد بھی کر سکتی ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یوں اس طرف سے جی ہو کر اس نے صباحت کے امتحانوں تک خاموشی اختیار کر لی اور جس روز وہ آخری پیپر سے فارغ ہوئی، آسہ نے عارفہ بیگم کو فون کر کے اگلے روز رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی اور علی جانگیر کو بھی ساتھ بلایا۔

~~*

جانگیر گاڑی کے ساتھ ٹپک لگائے بہت خاموشی سے وہ سارے لوازمات دیکھ رہا تھا جو عارفہ بیگم کرم دین گاڑی میں رکھوا رہی تھیں۔ ایک دو بار اس نے ٹوکا بھی کہ انہوں نے صرف کھانے پر بلایا ہے اور تو کچھ بچہ سب لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر عارفہ بیگم نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ تمہیں بلانے پر یوں ہی نہیں بلایا۔

جانگیر کے مرحلہ تمام ہوا تو اس نے شکر کرتے ہوئے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور رابعہ کو فون سے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”کہ بہت جلدی ہے۔“

”کچھ آٹھن کر رہے ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو۔ عین کھانے کے وقت پر پینیں۔“ اس نے ٹار انگی سے کہہ کر گاڑی چلائی اور ان کے بیٹھنے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

پانی خوش تھی۔ تمام راستہ اس سے مذاق کرتی رہی جبکہ عارفہ بیگم کا کچھ بتا نہیں چل رہا تھا کہ آیا اب وہ نئے خوش ہیں یا بالاجان کی وجہ سے مجبور ہیں اور اگر مجبور تھیں تب بھی آسہ اور اس کے تمام گھر والوں نے انہوں نے انہیں ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔ اس کے برعکس جیسے ان کی دلی مزبور آئی ہو۔

رے مبر کا بہت امتحان لے لیا آپ نے۔“ کھانے کے بعد عارفہ بیگم نے آسہ کے سامنے باقاعدہ اپنا دایا۔ ”آپ تو خوش ہماری جھولی میں ڈال دیں۔“

اسے نہیں۔ اماں جی اور آبا جی سے نہیں۔“ آسہ نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو دیکھتے ہوئے کہہ کر عارفہ بیگم انہیں خان کی طرف موڑ لیا۔

پہلا منت ہے۔“

اس قدر کہ گرجا خاموش ہو گئے کیونکہ انہیں وہ وقت یاد آگیا تھا جب انہوں نے یہی الفاظ آسہ کے لیے اس وقت سامنے شاہ جانگیر تھے اور اب انہیں کیا خبر تھی کہ اس جگہ ان کا بیٹا برا بھلا نہ ہے۔

سب مل مبارک سلامت کا شور۔ پھر عارفہ بیگم گاڑی میں سے مٹھائی اور دیگر سامان نکلوا کر لے آئیں تو جی جی کی جج گئی تھی اور جانے وہ کس کو نے میں چھپی تھی جسے دیکھنے کو علی جانگیر کا بے تاب دل بری رہا تھا۔

”میں صبا کے پاس جا رہی ہوں، کوئی پیغام؟“ رابعہ نے مٹھائی کی پلیٹ اٹھا کر سرگوشی میں اسے اطلاع دیا تو پھر وہ اس سے دیکھ کر رہ گیا کیونکہ اس کے ساتھ ہی خلیل بھائی بیٹھے تھے۔

”نونا اور تومیہ کے ساتھ اوپر آئی اور مٹھائی کی پلیٹ صباحت کے آگے کر لی ہوئی شوخی سے بولی۔

”آپ بھی منہ میٹھا کر لیں۔ کیا یاد کر سکیں۔“

”ہو سب سے آخر میں مٹھائی ملی۔“ تومیہ نے فوراً ”نونا لگا یا تو رابعہ کچھ جھل سی ہو کر بولی۔

”نونا زیادتی ہے۔ سب سے پہلے حق تو ان کا تھا۔“

”سب سے پہلے حق کی تلفی ہو گئی۔ اب اس کا زوالہ کون کرے گا۔“

بھی دخل انداز مت ہونے دناور نہ بہت ڈسٹرب ہو جاؤ گے۔“
 پھر کے اندر لیکنٹ سناٹا چھا گیا۔ کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی شاہ سکندر نے بلکہ شاید اسے خبردار کیا تھا۔
 اسے بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ گویا اب تک اس کی حیثیت صرف کھ پٹی کی سی تھی۔ وہ اپنی محبت
 نے نہیں بلکہ باباجان کی حکمت عملی سے اپنی منزل تک پہنچا تھا۔ یہ بات جب اس لڑکی کو معلوم ہوگی
 جو محبت سے حاصل کیا ہے تو وہ اس کی محبت پر کب یقین کرے گی۔ کبھی نہیں۔ ساری زندگی وہ اس کے
 منارے گا۔

دو ریسپوررھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھٹھ لگا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
 معا فون کی بیل پر اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے لیکن اسے ریسپور اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔
 بجے کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ تب بھی اسے احساس نہیں ہوا۔ عجیب موڈ تھا۔ جب منزل دو گام رہ گئی
 اگلے شدہ راستوں میں الجھ رہا تھا۔

رابعہ نے اس کا دروازہ کھیل کر اسے پکارا تو وہ ایسی ہی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
 میرا تو خیال تھا آپ خوشی سے جمو رہے ہوں گے لیکن آپ تو ایسے لگ رہے ہیں جیسے کوئی افسوس
 لاپہ۔“ رابعہ نے اس کے افسردہ چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ۔
 بے بھائی کیا ہوا ہے؟“ رابعہ قدرے متوحش ہو گئی۔
 میں فی الحال تم جاؤ یہاں سے۔ میں سو رہا ہوں۔“ وہ کوٹ اتارتا ہوا ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔
 بتائیں آپ نے فون کیوں نہیں اٹھایا۔ ادھر باباجان بات کر رہے ہیں۔“ رابعہ نے قدرے اوچی آواز
 نہ وہاں سنی کرتا ہوا ڈریسنگ روم میں بند ہو گیا۔

 ڈریسنگ روم اور عمار بھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اس نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نینس
 وہ انہوں نے ان تینوں کی طرح اسے تنگ نہیں کرتا تھا پھر بھی ان کی آمد سے وہ اندر ہی اندر پریشان
 ہو نظری شرم تھی جو اس کا سر آپ جھک گیا۔
 میں پوچھنے آیا تھا کہ تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔“ نیل نے اس کی جھک سمجھتے ہوئے قصداً کچھ بے خبری
 ڈالنا شروع کیا تاکہ وہ آرام سے بات کر سکے۔

ابو نے زبردستی کھلا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔ آپ نے کھالیا۔؟“ اس نے
 کھانا تو چھوٹا میل بیٹھتے ہوئے بولے۔
 مادر چائے بھی پی لی۔ تمہاری چھٹی ہو گئی۔ اس وقت چائے نہیں بنانی پڑے گی تمہیں۔“
 بتائیے کہ رہے ہیں جیسے میں چائے بنانے سے کتراتا ہوں۔“ اس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو وہ ہنس

نہ خیر تم کسی کام سے نہیں کتراتیں وہ تو۔“
 نہ ہے تو اپنا کام بھی نہیں کرتی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔
 نیل نے اسے وہ بھی۔ اب دیکھو وہاں جا کر رہ گئی۔ پھوپھو نے بھی اجازت دے دی اسے۔ اگر مجھے
 نہیں بھی اسے بھیجے گا مشورہ دیتا۔“ نیل کو اب افسوس ہو رہا تھا۔
 ہنسے تو کھانا تو زیادہ غصہ کہیں نہیں رہ سکتی۔“ اس نے یاد دلایا۔
 یہ ممکن رہ سکتی۔ ابھی بھی وہ خوشی سے وہاں نہیں رکی ہوگی۔“ نیل نے یقین سے کہا۔

نیل نے اسے بہت مس کرتی ہوں۔“
 نیل تو عادت ڈال لیتی چاہیے اس کے بغیر رہنے کی۔ کیونکہ تم خود یہاں کچھ وقت کی مہمان ہو۔“ نیل

”علی بھائی۔“ رابعہ فوراً بولی۔ ”بلاؤ انہیں۔“
 ”اے واہ! آپ تو کچھ زیادہ ہی فری ہو رہی ہیں۔ صرف مٹھائی کھا کر آپ کے علی بھائی میز پر نہ
 سکتے۔“ سوہنے کہا۔

”تو پھر انہیں نیچے لے چلتے ہیں۔“
 ادھر ان کی نوک جھونک جاری تھی اور نیچے عارفہ بیگم جلدی شادی پر اصرار کر رہی تھیں اور آسہ اور
 تھی لیکن تیاری کی ہمت ضرور چاہتی تھی جس کے لیے عارفہ بیگم کو دو تین مہینے بھی بہت کم رہتے تھے۔
 ”کیا تیاری کرنی ہے آپ کو؟ زیور، کپڑا، کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس
 مجبوریاں ہیں جو میں اتنی جلدی کر رہی ہوں۔ دینی میں علی کے والد کو کھانے وغیرہ کی پرانیلم ہے۔ میں صرف
 شادی کر کے وہاں جاؤں تو یہاں علی اکیلا ہو جائے گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں اس کا گھر بھی بسا کر۔“

”سے زیادہ مہینے لے لیں آپ۔“
 عارفہ بیگم نے نئے سرے سے اپنی مجبوریاں گوا کر فٹ سے کہا تو آسہ شش و پنج میں کبھی اٹھاؤ
 دیکھتی تھی، کبھی خلیل بھائی اور میمونہ بھانجی کو۔ آخر میں قریب بیٹھے نیل سے سرگوشی میں پوچھنے لگی۔
 ”تم کیا کہتے ہو بیٹا۔؟“

”میں کیا کہوں؟“ نیل نے پوچھیں۔ ”نیل یہی کہہ سکتے تھے۔
 آسہ نے اباجی کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھے جبکہ عارفہ بیگم اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں اور
 سننے کے لیے بڑی بے تاب نظر آ رہی تھیں۔ تب وہ باہمی بھرتی ہوئی بولی۔
 ”نیک ہے، دو مہینے بعد لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ صبا نے ابھی تھوڑا سا امتحان دیا ہے۔“

آپ اسے لی اے ضرور کرائیے گا، اگر آپ کے ساتھ مجبوری نہ ہوتی تو میں اس کے لیے اسے کرے
 کی شادی کر لیتی۔“ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش
 ”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش
 وقت تاریخ طے کر کے ہی اٹھی تھیں۔

پھر گھر آتے ہی علی جہانگیر نے سب سے پہلے شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کیے تھے کیونکہ منہ
 کی تھی کہ آج آسہ کے ساتھ جو بھی معاملہ طے ہو، وہ سب سے پہلے انہیں بتائے۔ یہ تاکید
 بھی تھی لیکن انہوں نے سب سے پہلے کی شرط نہیں رکھی تھی اور اگر رکھتے تب بھی شاید
 سے رابطہ کرتا۔

”میں شاہ سکندر حیات۔“ ان کے انداز میں بے دھبائی تھی۔
 ”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام کیا تو اس بار جیسے وہ پوری جان سے متوجہ ہوئے
 دینا بھول گئے اور بے آہی سے پوچھا۔
 ”ہاں، کوہینا کس بار۔؟“

”سب طے ہو گیا چچا جان۔“ آئی مین ڈاکٹر آسہ نے نہ صرف رشتے پر باہمی بھرتی ہے بلکہ
 شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔“ علی جہانگیر نے خوش خبری سنا کر انہیں حیران کر دیا۔
 ”واقعی۔ کب کب بے شادی۔؟“
 ”اپریل کے پہلے ہفتے میں۔“

”ڈیری گڈ! باباجان کو بتا دیا تم نے۔؟“
 ”جی نہیں، آپ نے کہا تھا سب سے پہلے آپ کو بتاؤں۔ اب باباجان کو آپ بتاؤں
 پوچھا تو شاہ سکندر یہ ذمہ داری اس پر ڈال کر ہنسنے لگے۔
 ”تم، تم، بتانا اور اس سے پہلے میری ایک بات سن لو مٹا کہ شادی کے بعد تم اپنے

”بی تمی مدحو۔“
 جانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے، ہونم۔! اس نے سگ کر سر جھٹکا۔

”نک کہ ری ہو۔ وہ دلوں سے کھینچتی ہے۔“
 نے کہاں کھو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر چائے بنانے کا کہہ کر وہیں سے واپس پلٹ گئی

--*

اپنے جذبات چھپانے میں ہمیشہ سے کمال حاصل تھا لیکن اس وقت جانے انہوں نے کوشش نہیں
 ہم ہو گئے تھے جو فون پر عارفہ بیگم سے آسیہ کی رضامندی کے ساتھ شادی کی تاریخ دینے کا سن کر وہ
 نے قابو ہو گئے تھے اور بال کرے میں ہنکراتی ہوئی آواز میں شاہ جہانگیر کو پکارا کہ ان کے ساتھ ادھر
 جان بھی گھر آکر اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

خمر النساء بھی پہلی کے بعد دوسری بیڑھی پر پاؤں رکھتی ہی وہیں رنگ تمام کر کھڑی ہو گئی تھیں۔
 یہ جو جہانگیر! تمہارے بیٹے کی بات پتی ہوئی۔ بابا! ان کے آوازیں غیر معمولی گونج تھیں۔
 نے میں مٹھائی تقسیم کر اوکس کی ماں۔ علی کی شادی طے ہوئی۔ یہ بی بی شان سے اس کی رات لے کر
 لے اور دن کو رخصت کر کر اپنے پیسے اسی حویلی میں لے کر آئیں گے۔ بہت چھپا لیا ڈاکڑنی نے اسے، ہم
 ہماری باری ہے۔“

خمر النساء نے نخوت و تنفر سے سر جھٹکا تھا۔
 بی بی سے سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھیں۔

نہ نے آگے آکر بابا جان کا بازو تھام لیا اور دھیرج سے کہنے لگے۔

ب تو تھک ہے بابا جان! لیکن اس طرح بی بی بانی بات بکڑ سکتی ہے۔ عین وقت پر اگر آسیہ نے انکار کر دیا
 بدنامی ہو جائے گی۔

نہ ان کی بات سمجھ کر چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی پھر کھنکھار کر پہلے گلا صاف کیا اس کے بعد

نہ کے سارے انتظامات یہیں سے ہوں گے اور رات بھی یہاں سے جائے گی پھر ہم علی کے گھر رک کر
 نہ گے جب ادھر نکاح ہو جائے گا تب ہم خود جا کر دلن کو رخصت کر لائیں گے۔“

نہ خیال ہے بابا جان یہاں سے کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ علی سے کہہ دیتے ہیں وہ دلن کو
 نہ لے آئے گا۔ شاہ جہانگیر غالباً کوئی بد مزگی میں چاہتے تھے۔

نہ ان کا تکیہ ہمارے علی کی شادی ہو اور ہم شریک نہ ہوں یہ تو ممکن ہی نہیں ہے پھر ہم نے سکندر سے
 نہ اس کی بیٹی کو ہم شاہ علی جہانگیر کے ساتھ رخصت کر لائیں گے۔ بابا جان کے منہ سے جو پہلی
 نہ اس سے بے کو تیار نہیں تھے۔

نہ کی مرضی۔ شاہ جہانگیر نے ان کی ضد سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔

نہ اس سے اسے بھی اطلاع کرو۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔“

نہ جہانگیر شاہ سکندر کا خیال آیا تھا اور اوپر بیڑھیوں پر کھڑی خمر النساء چیخ کر کہی۔

نہ ایک بیٹی ہے الماس اور کوئی نہیں۔“



نہ کو خمر النساء کی بات سے زیادہ اس کا چیخ کر لوٹنا اور گزرتا تھا اور یہ تھی بھی انہونی۔ بھلا ان کے سامنے
 نہ کوئی آواز میں بات کی تھی۔

کے سیدھے سادے انداز کے باوجود وہ پل ہی ہو گئی اور ان کے پاس سے اٹھنے کا ہانا سونے لگی۔ مشکل
 وہ اس کے کمرے میں بیٹھے تھے اس لیے فوری طور پر کوئی ہانا سمجھ میں نہیں آیا تو بات بدلتی ہوئی کہنے لگی۔
 ”آج شہر کا فون آیا تھا۔ ٹیلی بھائی وہ کہہ رہی تھی۔ کچھ وقت نکال کر اسے پر دھا یا کر رہیں۔“

”ہاں! عدیل چاہو تو بھی کتنا تھکے سے اور میں اب تک اپنے وقت کی سیٹنگ نہیں کر پایا۔ کوشش
 کہ۔“ فون کی نیل سے ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اس وقت مدحو ہوگی۔“ وہ کہتی ہوئی بھاگ کر لابی میں آ گئی اور ریپور اٹھایا تو دوسری طرف واقعی مدحو
 اس کی آواز سنتی ہی کہنے لگی۔

”بہت کمینہ ہو تم۔ بتایا ہی نہیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“
 ”میں کیا بتائی۔ مجھے خود ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ ماما نے میری شادی طے کر دی ہے۔“ اس نے مدحو

ناراغی کے خیال سے خود کو بے خبر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
 ”کیو مت یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ابھی رشتہ آیا اور ابھی شادی طے ہو گئی۔ آخر کچھ سلسلہ تو چلا ہوگا۔“ مدحو

فورا ”لوک کر جتا تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر کہی۔
 ”ہاں! سلسلہ تو کافی دنوں سے چل رہا تھا لیکن مجھے یہ کب معلوم تھا کہ ماما ہی بھی بھریں گی۔“

”تم سے پوچھتے بغیر تو ہی نہیں بھری ہوگی۔“ مدحو شاکی تھی۔
 ”جی نہیں! ماما نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ کسی کے ذریعے سے میری رائے پوچھی

”چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کب آ رہی ہو۔“ اس نے اپنی صفائی دینے کے بعد پوچھا تو مدحو لاپرواہی
 بولی۔

”نظا ہرے تمہاری شادی بر ہی آؤں گی۔ ماماں جی اور ماما جی کے ساتھ۔“
 ”ہائے نہیں مدحو! ایسے نہیں کرو۔ ماماں جی اور ماما جی تو عین وقت پر آئیں گے جبکہ میں اس وقت

شدت سے تمہاری کمی محسوس کر رہی ہوں۔ تم جلدی آ جاؤ پلیز۔“
 اس کی منت کا مدحو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کسے آ جاؤں۔ یہاں میری کلاس شروع ہو گئی ہیں اور ہاں تمہارے پیپر کیسے ہوئے۔“
 ”تھک ہوئے ہیں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”چلو تمہیں کون سا آگے بڑھنا ہے۔ آرام سے گھر واری کرنا۔ ویسے کرتے کیا ہیں موصوف بلکہ پہلے
 ہیں کیسے۔“ مدحو اچانک مشتاق ہو گئی تھی۔

”مجھے نہیں پتا، خود آ کر دیکھ لو۔“ اس کا لہجہ ہنوز تھا۔
 ”کیا مطلب؟ کیا تم نے دیکھا بھی نہیں۔“

”نہیں۔“ وہ صاف مکر گئی۔
 ”یا علی تو نہیں ہو گئیں۔ بغیر دیکھے شادی کرو گئی اور یہ ممانا اتنی دقینوسی کب سے ہو سکتی جو تم

تمہیں دکھایا۔ اپنے آپ فیصلہ کر لیا اور تم نے مان بھی لیا۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ۔“ مدحو
 کی سعادت مندی سے چڑھی تھی۔

”کوئی مجبوری نہیں۔ مجھے ماما پورا بھروسہ ہے۔“
 ”پھر تو تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔“ مدحو کی استہزاء نے اسے سخت گراں گزری۔

”بہت بد تمیز ہو تم۔ میں خواجواہ نہیں مٹا کر لی ہوں حالانکہ تمہارے بغیر یہاں بڑا سکون ہے۔“
 نہیں۔ سب بہت خوش ہیں۔ پتا ہے ابھی یہاں۔“ اس کی بات جاری تھی کہ ادھر سے مدحو نے سلسلہ

کر دیا۔
 وہ ریپور پتھر کر رہی تھی کہ اپنے کمرے میں آئی تو نیل ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے

مہر النساء کی اتنی جرات پر بی بی جان پریشان ہو گئیں۔ شاہ جہانگیر الگ ہو کھلا گئے تھے پھر بھی اس سے بیزار باباجان، مہر النساء کی بد تمیزی پر اسے سخت الفاظ میں کچھ کہتے، وہ بولی بڑے۔
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ مہر النساء! تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“
 ”قیوں نہیں، میں ہر اس معاملے سے تعلق رکھوں گی جس میں شاہ کا نام آئے گا۔“ مہر النساء، باباجان کو کڑے تیور دیکھنے کے باوجود اپنی جگہ جم کر کھڑی تھی۔
 ”ہمیں طیش مت دلاؤ مہر النساء! ورنہ ہم ابھی اسی وقت تمہارا شاہ سے تعلق توڑ دیں گے اور اس کے ہمیں کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔“ باباجان نے ایک ہی وار میں اس بھری ہوئی عورت کے پیر اٹھا دیے تھے کہ اس بار وہ بولی تو اس کی آوازیں وہ شکر نہیں تھا۔
 ”پھر بھی اس طوائف کی بی بی یہاں نہیں آئے گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ دو سیڑھیاں بھٹانگ کر تینویں اپنے کمرے میں چلی گئی۔
 ”اپنا گل ہے۔۔۔“ شاہ جہانگیر نے اس انداز سے کہا کہ باباجان اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔
 ”مسئلہ تو نہیں بنے گی؟“ باباجان نے پر سوچ انداز میں شاہ جہانگیر کو دیکھا۔
 ”نہیں، آپ چھوڑیں اسے اور بی بی جان کو سارا پروگرام سمجھائیں کیونکہ یہاں کے سارے انتظام تو ان ہی کرتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے خوبصورتی سے ان کا دھیان ہٹا دیا تھا۔
 ~~*

علی جہانگیر جتنا سوچتا اسی قدر الجھ رہا تھا۔ اسے محبت میں دھاندلی کسی طور مناسب نہیں لگ رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ صباحت کو اعتماد میں لے کر اس پر اپنا نظا پر کر دے اور اس سب پر اس نے سوچا بھی لیکن صباحت کی بزدلی سے خائف تھا کہ وہ بھی اس کے لیے بے بس نہ ہو۔ اس تمام عرصے میں وہ اسے اتنا تو جان گیا تھا کہ محبت سے دستبرداری میں خواہ اس کی جان کیوں جائے وہ اپنے بہوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس لیے اسے ہم نوا بنانے کا وہ بس سوچ کر رہ گیا اور وہ نے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح شادی کر کے اس کی نظر ٹٹو اعتبار بننا بھی کھل رہا تھا۔ عجیب شش دہچ میں تھا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی پر اسے کچھ کچھ لگ رہا تھا۔ بس خاموشی سے عارفہ بیگم کو فون پر باباجان کی ہدایات سننے اور پھر ان پر عمل کرتے ہوئے کچھ لگا جس پر رابعہ نے نئی بارے اسے نوکا کہ وہ اپنی دلی تمنا پوری ہونے پر بجائے خوش ہونے کے پریشان نظر آئے۔ اسے فیشنل پرائمر سے منسوب کر کے ٹال گیا تھا لیکن وہ شاید مطمئن نہیں ہوئی تھی جب ہی اس وقت بتلا رہی تھی۔

”غایہ کہہ رہے ہیں آپ، آفس کی پرائمر سے آپ کبھی اس طرح پریشان نہیں ہوئے۔ ضرور کوئی بات ہے اگر آپ انہیں بتائیں گے تو میں صبا سے پوچھوں گی۔“
 ”اس سے کیا پوچھوں گی؟“ اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔
 ”آپ کی پریشانی کا سبب یہ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور جانتی ہوگی یا پھر وہی ہے۔“ رابعہ کے اتے قیاس پر وہ ایک ٹوٹا کوٹھنک گیا پھر فوراً ”سر جھٹک کر بولا۔“
 ”ناہل جو تم، وہ تو خود اس بات سے پریشان ہوگی کہ اتنے دنوں سے میں نے اسے فون نہیں کیا۔“
 ”کیوں نہیں کیا؟“

”اس لیے کہ بہن آفس کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ ادھر سے اطمینان ہو گا تب اس سے بات ورنہ وہ بھی تمہاری طرح اپنے سیدھے قیاس کرنے بیٹھ جائے گی۔“ اس نے خوبصورتی سے بات چلائی۔
 ”تو ہے۔“ رابعہ تاکید کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے وہ آپ کے فون نہ کرنے پر بھی قیاس کر رہی ہے۔“
 ”پہلے کہ بدگمان ہو، آپ اسے اپنی مصروفیات کی داستان سنا کر یقین دلائیں کہ اتنے فیشن میں بھی

بیتا ہے اور ہاں یہ بھی کیسے گا کہ۔“
 ”ایہ! وہ اندر ہی اندر جربز ہو رہا تھا جب ہی ٹوک دیا۔ تو رابعہ چڑ کر بولی۔
 ”بہن! قیاس ناگل ہوں، خواہ مخواہ آپ کا خیال کرتی ہوں۔“
 ”بہن! خیال کرتی ہو، اس وقت بھی احسان کرو کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ اس کے چڑنے کا نوٹس نہ لیتے۔
 ”کی مرضی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رک کر کہنے لگی۔ ”ویسے میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ غلط فہمی سے صباحت کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی ہے۔“
 ”طلب؟“ وہ ایک دم متوجہ ہوا تھا۔
 ”طلب یہ کہ۔۔۔ خیر چھوڑیں اس وقت آپ تنہائی چاہتے ہیں لہذا شب بخیر۔“ رابعہ اس پر احسان کرتی ہوئی کہ وہ ایک ہی جھست میں دروازے پر آکر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔
 ”یہ بھی طرح بتاؤ۔ کیا بات ہے صباحت کو کہاں لے جانے کی اجازت ملی ہے تم نے۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“

”ایہ؟“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”ایہ؟“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”ایہ؟“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“

”ایہ؟“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“

”ایہ؟“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ ”کیکے جاؤ تم۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرائمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”کیکے جاؤ تم۔“

چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دوں گی؟“ وہ اسے پرکھ رہا

تھک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں ہاں ناں۔“ اس نے اس کی انگلی کو ہلکا سا جھکا دے کر اصرار کیا تو وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”اب ایسی باتیں نہیں کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”وہ قصداً نہیں بڑا۔“ بے وقوف لڑکی اتم سے تو مذاق بھی نہیں کیا جاسکتا۔

”مذاق نہیں کر رہے بلکہ شاید مجھے آزمانا چاہتے ہیں۔ بے ناں ہے ناں یہی بات۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”نہیں صبا! ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ عاجز آکر بولا۔ ”بس چھوڑو اس موضوع کو، چلو کچھ شاپنگ کر لیں

اپنا موڈ ٹھیک کرو۔“

”بات بتائیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ میرے پیرٹس میں علیحدگی ہو چکی ہے؟“ وہ اس کی بات بیکسر

اور گئی اور جانے کس خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ جواب کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”برائیاں اس لیے آپ میری طرف سے یہ یقین چاہتے ہیں کہ کبھی زندگی میں ایسا کوئی موڑ آیا تو۔“

”وہاں میں ایسا کوئی موڑ نہیں آنے دوں گا۔“ وہ سمجھ کر فوراً بول پڑا۔ ”جو کسی دوراے پر کھڑے ہو کر

لے لیے انتخاب مشکل ہو جائے۔ نہیں ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ مجھے تمہارے پیرٹس کی علیحدگی سے کوئی

بہت دور نہیں اور نہ میں سبب جانتا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے مذاق کو سنجیدگی سے لیا۔“

”جھکا کر آنکھوں میں آنی نمی اپنے اندر تارنے لگی۔ جانے کیوں دل سہم گیا تھا۔

”اب میری طرف دیکھو۔“ اس نے بے چین ہو کر پکارا تو وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھڑی ہوں گی۔“ وہ روٹھے لہجے میں کہتی ہوئی دستوراً ان سے نکل آئی اور پرس میں سے رومال نکال کر

مناد سے اپنی آنکھیں صاف کیں پھر اس کی گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ وہ آگیا اور آہستہ

سائے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کے پاس لے آیا۔

”میں کٹائی فیل کر رہا ہوں۔“ گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہی وہ اسے مخاطب کیے بغیر کہنے لگا۔ ”پتا نہیں میں

نے میں غلطی کی یا تم نے سمجھنے میں۔ بہر حال کتنی عجیب بات ہے کہ اس موڑ پر بجائے خوش ہونے کے تم مجھ

پر ہنسی ہو۔“

”میں علی ایس شاکس نہیں ہوں۔“

”غافل ہو۔“

”میں۔“

”میں۔“

”میں۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”سربراہ، چلو جاؤ۔“ رابعہ نے ہنستے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھلیل دیا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔

”تم بھی چلو ناں۔“

”ارے تم تو ایسے گھبراہڑی ہو جیسے پہلی بار علی بھائی کا سامنا ہوا ہو۔“ رابعہ نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو ہاتے

ہوئے کہا۔ تب ہی علی جمناگیر قریب آکر بولا۔

”آئیے صباحت اور ریاں رابعہ! تم گھر جاؤ۔ انہیں میں۔“

”نہیں پلیز۔“ وہ مزید گھبرا کر فوراً بول پڑی۔

”ڈرو مت، تمہاری مماسے میں نے پوچھ لیا تھا۔“ رابعہ نے اسے اطمینان دلایا۔ تب وہ اتر کر ایک طرف

کھڑی ہو گئی۔

”علی جمناگیر رابعہ سے بات کرنے کے بعد ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا پھر سیدھا ہو کر اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

”آئیے۔“

وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ گوکہ پہلی بار اس کے ساتھ نہیں تھی لیکن کچھ عرصے بعد جس بندھن

میں بندھنے والی تھی اس کا حجاب تھا جو اس کی نظریں علی جمناگیر کے قدموں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں اور اگر

پاس کا تو بالکل ہوش نہیں تھا۔ پتا نہیں کس طرف جا رہا تھا وہ۔ اس نے جان کر بھی کیا کرنا تھا اور پھر جہاں وہ را کا ر

کے قدم بھی نہیں جم گئے۔

”بیٹھیں۔“ علی جمناگیر نے کتاب اس نے چونک کر سر اٹھایا اور چاروں اور نظروں سے گزرتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ علی جمناگیر نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ بڑا محتاط انداز تھا، ہمیشہ سے مختلف۔

”بہتر ہیں شوقی تھی نہ نظروں میں وارفتگی اور براہ راست اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

”تھک ہوں آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کے بدلے انداز محسوس کرتی ہوئی بولی۔

”کیا لیں گی چائے یا؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کے فوراً منع کرنے پر وہ نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اپنے رویے کا احساس بھی ہو گیا، جب

مسکرا کر بولا۔

”کیوں، میرا ساتھ بھی نہیں دیں گی۔ آئی مین میں چائے پینا چاہتا ہوں۔“

”ضرور پیئیں، میں آپ کو تو منع نہیں کر رہی۔“ وہ ٹیبل کی چٹائی سطح پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی

بولی۔

”یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں چائے پیوں اور آپ ناراض ناراض سی بیٹھی رہیں۔ اب یہ مت کہہ دیجئے گا

آپ ناراض نہیں ہیں۔“

”نہیں ہوں۔“

”میری طرف دیکھ کر کہیں۔“ علی جمناگیر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ادھر ادھر پھسلتی انگلی کو اپنی دو انگلیوں

درمیان جکڑ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”کیا کر رہے ہیں چھوڑیں پلیز۔“

”پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔ کتنا پیار کرتی ہو مجھ سے۔“ وہ ایک دم آپ سے تم پر آکر اسے جانے

امتحان میں ڈال گیا۔

”پتا نہیں۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”چلو یہ بتا دو، میری خاطر کیا کر سکتی ہو۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں۔؟“ وہ الجھ کر بس ایک نظر اسے دیکھ سکی۔

”کیوں؟“

”ویسے میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی بلکہ اگر تم کوئی توہین خود سہیں ان کے پاس لے جاؤں گا۔“ وہ پھر ان سنی کر کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے کیوں اسے اچھن ہونے لگی تھی اور کچھ عجیب سا سنجھی ملگ رہا تھا۔ وہ خود اپنے باپ کے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچے یا کہے لیکن تیسرے شخص کے منہ سے ہمہ روزی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی کہ جانے وہ کیا سمجھے اور وہ اس کے منہ موڑنے سے ہی سمجھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

اس کی ثیادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ تیاریوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور آسیہ کو کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ سب ہی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کپڑوں کی تیاری میں میمونہ بھابھی، سونیا اور اماں جی عرصے اور بارہرے کاموں میں نبیل اور عمر بھی پیش پیش تھا اور یہ صرف اس کی محبت تھی جو اب سب اس کے لیے اپنے ضروری کام بھی بھول گئے تھے۔ ہر شام عدیل بھائی بھی یا سیمین اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ آجاتے تو اور روش ہو جاتی تھی لیکن اسے جس کا انتظار تھا وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ جس سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جانتی تھی کہ ابھی بھی وہ آئے گی تو دل چلانے والی باتیں ہی کرے گی اور شاید وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ جب ہی صبح شام فون کر کے اس کی منتیں کر رہی تھی اور اس وقت تو رنہ بھی لگی تھی۔

”مذہب! کیا تمہیں ذرا بھی مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں آؤں گی۔ ابھی تو پورا ایک ہفتہ بڑا ہے۔ ٹھیک ماموں نے دو دن پہلے کی سیٹیں کفرم کوالی ہیں اور ظاہر ہے میں بھی ان ہی کے ساتھ آؤں گی۔“ اس نے چیخ کر ریسپورنچ دیا اور آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو نیل ہنسنے سے موجود تھے، دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”صبا!“ نیل نے ہرچ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ”تناغمہ“ میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

نیل سمجھ گئے۔ اصل میں اسے مدیحہ کا نہ آنا لرا رہا ہے اور وہ کیا کر سکتے تھے۔ ان کے اختیار میں ہو تا وہ اسے بہت پہلے لے آتے۔ اس کے معاملے میں تو وہ بھی بے بس تھے۔

”تمت روؤ“ تم جانتی ہو۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ۔“ انہوں نے اس کا سرخ و اش روم کی طرز میں دھو رہا تھا۔

پھر رات میں ڈھولک کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ پہلے نیچے اور جب اباجی اور خلیل بھائی تک آنے لگے تو اوپر آگے قصہ بٹھو اور روٹی کے بہت اصرار پر سب کے ساتھ آکر بیٹھیں بھی کئے عمر آہ بھر کر بولا۔

اس کا تو یوں بھی اچ کل ذرا ذرا سی بات پر دل بھر آتا تھا۔ اس روانی سے آسو چھلکے اور ایسی بچی بندھی کہ جب کراتے کراتے تھک گئے، ساتھ ساتھ عمر کو بھی لگاؤ رہے تھے کہ اس نے کیوں ایسی بات کی۔

ہر ایک کو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ رہے ہو اور اسے بھی چپ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی بھر کر رونے دو مجھے اچھے سارے آنسو میں نہالے۔ آگے بہت خوش رہے گی۔" عمر سب کی سن کر آخر بول پڑا۔

ایک لڑکھو بچہ میں لب آئے۔ سب سے اچھی دھولک وہی بچائی ہے۔ ”توبیہ نے دھولک اپنی طرف ہونے کا نوہ روئے کے درمیان جل کر بولی۔
 نہیں آئے گی۔“

ہر جھک کر رہ گئی تو تھوک کے ساتھ روٹی بھی نیل کی طرف گھوم کر ان سے پوچھنے لگی۔
 ”نیل بھائی! مدد تو نہیں آئے گی۔“

نے کی کیوں کہیں۔ اس کے بغیر بھلا شادی ہو سکتی ہے۔ ”نیل نے صباحت کو گھورتے ہوئے کہا۔

راخانیال ہے۔ سونا چاہیے۔ چلو تم لوگ بھی اٹھو بہت رات ہو گئی ہے۔“
 ”میں نیل بھائی! ہم ڈھونک بجائیں گے۔“ وہ نیل نے لجاجت سے کہا۔
 ”اے کل بجالینا، چلو اٹھو۔“ نیل نے سب کو اٹھادیا، آخر میں صبحت کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئے

کے دن سے وہ سب کے بلانے پر بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ رات گئے تک ڈھولک کے ساتھ ہنسی آواز اس سے سونے نہیں دیتی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ متضاد میں گھر اس کا دل کچھ سہم سا گیا تھا۔ یعنی کبھی پالنے کی خوشی، کبھی اس گھر سے جانے کا غم، کبھی مدح پر ناز، یہ کہ اس کے جانے کے بعد آسیہ اکیلی ہو جائے گی۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے وہ الگ تھک پڑی یا کچھ سوچتی رہتی اور مدح پر تو اسے اتنا غصہ تھا کہ اپنے کہنے کے مطابق جب وہ دو دن پہلے آئی تو اسے اس نے منہ موڑ لیا جس پر مدح نے بجائے اسے منانے کے الٹا ناراض ہو کر بولی۔

مہمارے بغیر۔“ کوئی توقع رکھوں گی۔ جانتی نہیں ہوں کیا میں تمہیں؟ اور تم نے کیوں زحمت کی

”میں ہو سکتا تھا میرے بغیر“ مدحیہ فوراً ”ٹوک گئی“ تم سے تین بارہاں میں ہی کہلو اؤں گی۔“

”اے! اس نے سر جھٹک کر منہ موڑا تو مدحیہ نے لپک کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہونہ“ میرے بغیر کر تیں شادی بتاؤ“ میں تمہیں ہم سے آزاد دوں گی اور کیا نام ہے اس کا علی جمائیکر کو بھی“

ایک تہجوری اوپر سے سینہ زوری۔ ”وہ اس کے ہاتھ سے اپنی گردن چھڑاتی ہوئی بولی۔

”مجھ سے منہ موڑو گی تو ایسے ہی کروں گی۔“ مدحیہ ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔
”بہت بری ہو تم۔“ اس کا سارا غصہ جھاگ بن کر میٹھ گیا۔

~~*

”شاہ! مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔“ مہر النساء بہت تلملائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
شاہ سکندر نے پہلے الماس کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
”ہاں! کیا برداشت نہیں ہو رہا۔“

”اس لڑکی کے سوا گت کے لیے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کچھ نہیں رہے۔ باباجان نے سب کو ای کامیاب رکھا ہے۔ یوں جیسے کہیں کی مہارانی آنے والی ہو۔ حویلی میں پہلی شادی تو نہیں ہے یہ نہ ہی پہلی ہو آ رہی ہے۔ اس سے پہلے بولس بھائی کے بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کی دہن کے لیے تو اتنے اہتمام نہیں کیے گئے تھے۔“
”یہاں معاملہ ذرا دوسرا ہے مہر النساء! اور دل کا بھی، یعنی باباجان کے سب سے جیتے پوتے کی شادی ہے۔ آنے والی صرف بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے جو اب تک محروم رہی۔ شاید باباجان اسی کی تلافی کر رہے ہیں۔“
سکندر نے سمجھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔
”ہو نہ تلافی، باباجان تلافی کر رہے ہیں اور آپ کیا کریں گے؟۔“ مہر النساء کے لہجے میں تفرکے ساتھ طنز

سمٹ آتا تھا۔
”دیکھو مہر النساء! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اس بچی کے لیے دل میں بغض مت رکھو۔ اس آنے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ زیادہ دن یہاں نہیں رہے گی۔ علی اسے اپنے ساتھ لے جا گا۔“

”اب بھی کیوں نہیں، یہ سارے انتظام وہیں شہر میں ہوتے۔ یہاں لانے کی ضرورت کیا ہے۔“

”بس باباجان کا شوق ہے۔“
”شوق نہیں شاہ! وہ مجھے اذیت دینا چاہتے ہیں۔“
”یہ شخص تمہارا خیال ہے۔ باباجان نے ہمیشہ تمہیں اہمیت دی ہے۔ کبھی تمہاری حق تلفی نہیں ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری بد تمیزوں کو بھی برداشت کیا ہے انہوں نے اور تم ان کی اتنی سی خوش برداشت کر رہی ہو یا در کھو باباجان ایک حد تک ہی ذہیل دیتے ہیں۔“ شاہ سکندر حتی الامکان ضبط کر رہے تھے پھر

میں مبتلا کر گئے۔
”کیا کریں گے وہ نکال باہر کریں گے مجھے حویلی سے، نہیں شاہ! اب یہ ممکن نہیں ہے، میری اولاد وہاں ہے اور آپ یہ سن لیں کہ اتنا بھی اس لڑکی کے یہاں آنے کے حق میں نہیں ہے۔“ مہر النساء نے جواب

خبردار کیا تو ان کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھینچ گئیں۔
”اتنا کیا کہتا ہے وہ؟۔“
”میری کہ کسی رکھیل کی اولاد ان کی برابری نہیں کر سکتی۔“ مہر النساء نے اس بار کچھ آرام سے کہہ کر

دکھائی تو وہ بری طرح سلگ کر بولے تھے۔
”وہ رکھیل کی اولاد ہے اور آٹا، آٹا کس کی اولاد ہے۔“
”میری۔“ مہر النساء نے گردن اڑائی تھی۔
”ہاں صرف تمہاری۔“ ان کا وارکاری تھا۔
مہر النساء چیخ پڑی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟۔“
”جو چاہے سمجھ لو۔“ شاہ سکندر سر جھٹک کر جانے لگے کہ مہر النساء ان کے سامنے آگئی۔
”ایک بات بتائیں شاہ! وہ کتنی اپنا حشر بھول گئی جو بیٹی کو یہاں بھیج رہی ہے۔“
”وہ تمہیں بھیج رہی بہم لارہے ہیں۔“ شاہ سکندر بے اختیار کہہ گئے۔

”ہاں تو ایک ہی ہے۔ وہ بھیجے یا آپ لائیں۔ اس نے اعتبار کیسے کیا یا آپ نے کوئی بھاری ضمانت دی ہے؟
میں جائیداد اپنا آپ۔“ مہر النساء طنز کے ساتھ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔
”میراں باؤں میں کیوں الجھ رہی ہو مہر النساء! جب میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو میرا یقین زبردست شاہ سکندر نے نرمی سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹایا اور کمرے سے نکل گئے۔



ہے ایک افزا تفری محی تھی۔ حالانکہ سارا دن ہاتھ لیکن ناشتے کے بعد سے ہی سب کو اپنی اپنی تیاری کی فکر ہوتی تھی۔ مدحیہ کے لیے آئیہ نے بہت چاہ سے مندی کلر کا کرتا اور تنگ پاجامہ بنایا تھا۔ جیسے اب وہ ریجیکٹ کی کھڑی تھی۔

”آخر کیا خرابی ہے اس میں۔“ صباحت نے اس کے سوٹ کے ساتھ کا جھلملا تا دوشہ بیڈ پر پھیلاتے ہوئے پچھلا۔
”بس مجھے نہیں اچھا لگ رہا۔“ ماما کو اور کوئی کلر نہیں ملا تھا اور یہ تنگ پاجامہ تمہیں پتا ہے مجھے کتنا برا لگتا ہے۔“ مدحیہ نے بیڈ پر پھیلا دوشہ بھیج کر اس کا گولہ سا بنا کر اچھال دیا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی ایمر جنسی میں تو کوئی تمہیں تمہاری پسند کے کپڑے ہی کر نہیں دے گا۔ اسی لیے میں تمہیں جلدی بلارہی تھی تاکہ سہولت سے اپنی تیاری کر سکو، لیکن تمہیں تو سب کیا کرایا ملنا چاہیے۔“

”بہنویکی۔“
”ہرگز نہیں، یہ تم اپنے جینز میں رکھ دو، چار دن بعد تمہاری مندی ہوگی تو اس میں پن لینا۔“ مدحیہ نے نہ پچھا کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کی الحال تو تم اسے میری مندی میں پہنو۔ چار دن بعد میں پہن لوں گی۔“
”بس تم ہی پنسنالو مجھے کوئی اور انتظام کر کے دو، ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ کی ہٹ دھرمی پر اس نے اپنا

ہونٹ لیا۔
”یالہ کیا چیز ہو تم، اتنے کم وقت میں میں کہاں سے انتظام کر کے دوں، نیچے سب لوگ تیار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اچھا ایسا کرو۔ ریڈی میڈ لے آؤ لیکن جاؤ گی کس کے ساتھ۔“ صباحت مشورہ دے کر خود ہی اچھبے میں پڑھ

لی۔
مدحیہ یوں بیٹھی رہی جیسے یہ سرے سے اس کا مسئلہ ہی نہ ہو۔
”عمر سے کھولے جانے تمہیں، ہمیں حیدر می مارکیٹ سے جیسا سوٹ چاہو گی مل جائے گا۔“ صباحت مصطیٰ
اس کے رویے کو نظر انداز کر رہی تھی۔
”ہاں، جیسے تمہارا باپ دے گا۔“

”باب کو بھوٹو۔“ میں دے رہی ہوں اپنی ساری جمع پونجی۔“ صباحت نے ہنستے ہوئے وارڈروب کھول لی تو مدحیہ

نرا ہونٹ لیا۔
”چارپانچ سو کا سوٹ میں نہیں لوں گی۔“
صباحت کچھ نہیں بولی۔ آرام سے کپڑوں کی تہوں میں سے پیسے نکال کر گئے پھر پلٹ کر اس کے ہاتھ پر رکھتی

بولی۔
”تو پورے ڈھائی ہزار ہیں۔ زبردست سوٹ آئے گا اور دیکھو عمر نہ مانے تو تو یہ کو لے جانا۔“
”اور اگر وہ بھی نہ مانی تو میں اس کی چلی جاؤں گی۔“

مدحیہ کبھی ہوتی کمرے سے نکل گئی تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اسے کبھی نہیں سمجھا سکتی پھر اس کے وہ کپڑے جو

سہارے آتے دیکھ کر چیخ پڑی۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”کچھ نہیں ہوا، ہٹو سامنے سے۔“ عمر نے قدرے تیز ہو کر کہا۔

مدحہ کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بہت تکلیف میں ہو۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف ہٹ کر دیکھنے لگی جب سونیا نے آرام سے مدحہ کو بیٹھ پر لٹا دیا تب وہ بول کر اس کے پاس آئی اور قریب بیٹھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”سیڑھیوں سے پھسل گئی ہیں محترمہ! پیر میں موج آگئی ہے۔ پھوپھو کہاں ہیں؟“ عمر نے ہٹا کر پوچھا تو سونیا جلدی سے بولی۔

”پھوپھو نیچے ہی ہیں، جاؤ بلا لاؤ۔“

عمر چلا گیا تو وہ اٹھ کر مدحہ کا پیر دیکھنے لگی پھر آہستہ سے انگلی سے چھو اتو وہ چیخ پڑی۔

”ہاتھ نہیں لگانا۔“

وہ اچھل کر پیچھے ہٹی تو سونیا نے اسے تھام لیا۔

”تم بیٹھو آرام سے، پھوپھو آکر دیکھ لیں گی۔“

”ان کے دیکھنے سے کیا اسے تکلیف نہیں ہوگی اور تمہیں ضرورت کیا تھی سیڑھیاں پھلانگنے کی۔ آرام سے نہیں اتر سکتی تھیں۔“ وہ روبانسی ہو کر مدحہ پر بکڑنے لگی۔

”ادوہ! میں نے کہا تھا۔ تم ادھر بیٹھو۔“ سونیا اسے پیچ کر دوسری طرف لے آئی۔

کچھ دیر بعد آسہ آئی تو مدحہ کی موج چیک کرنے سے بیزار تنک اس نے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد وہ بھی اسے سخت ست کرنے سے باز نہیں رہ سکی تھی۔

مدحہ آنکھوں پر بازو رکھے چپ چاپ سستی رہی۔ آخر صباحت کو اس پر رحم آیا۔

”بس کر بس ماما! آب پجاری جان بوجھ کر تو نہیں کری۔“

آسہ نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کھڑی دیکھ کر سونیا کو جلدی تیار ہونے کا کسمتی ہوئی کمرے سے نکلی گئی تو مدحہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر رونی آوازیں بولی۔

”سونیا جی! میں کیسے جاؤں گی۔“

”تم کہاں جا سکتی ہو، بس آرام کرو اور دیکھو پیر کو زیادہ ملانا جلانا نہیں ورنہ شادی کے دن بھی ایسے ہی پڑا رہو گی۔“ سونیا نے دھینج سے تنبیہ بھی کی تو وہ خفگی سے بولی۔

”اس سے تو اچھا تھا۔ میں آتی ہی نہ۔“

”اے نہیں زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ صبح تک انشاء اللہ سو جن اتر جائے گی پھر تم چل سکو گی۔“ سونیا نے تسلی دی پھر صباحت کو اس کا خیال رکھنے کا کسمتی ہوئی چلی گئی۔

”چلو میں بور ہونے سے بچ گئی۔“ صباحت نے جھٹکے پھلے انداز میں کہا تاکہ اسے ملال نہ ہو پھر مزید ان دھیان پڑانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں تو کچھ دیر میں واقعی وہ بہل گئی تھی۔

پھر اگلے روز مدحہ کے پیر کی سو جن تو اتر گئی لیکن چلنے میں اسے کچھ تکلیف ہو رہی تھی جس سے آسہ اسے مزید آرام کرنے کا کہہ دیا تاکہ اگلے دن تنک ہو یا کھل تنک ہو کر بارات کا استقبال کر سکے اور اسے بھی لٹا۔

چلنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے بلا چوں و چرا آسہ کی بات مان لی اور جب صباحت کو مندی کی کمی۔

لیے پیچ لے جایا گیا تب بھی وہ آرام سے لیٹی رہی۔ نیچے سے گانے اور ڈھولک کی آوازیں اور پرک آوازیں۔

کسی وقت وہ کان لگا کر سننے لگی پھر اچانک ذہن کہیں اور بھٹک جاتا۔ صباحت کے جانے کا خیال آیا تو پھر وہ اس سوچنے لگی کہ اب بس وہ یہاں ایک ہی رات کی مہمان ہے اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو۔

ن عجیب بات ہے۔ میں نے ابھی تک اس کے ہم سفر کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے آپ پر ذرا سانسہ تھی کہ

”پر تنک کی آواز سے چونک کر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔“

”انکے آجاؤ۔“

انکے جانے کے ساتھ نیل اندر آتے ہوئے بولے۔ ”کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“

ہنی طبیعت خراب کب تھی۔“ اس نے یوں ہی لیٹے لیٹے کہا یعنی ذرا سا سرا و نچا کرنے کی زحمت بھی نہیں بلکہ قدرے جھل سے ہو کر بولے۔

”میرا مطلب ہے تمہارا پیر۔“

”جانے میں کچھ تکلیف ہو رہی ہے۔“

”یوں نہیں نیچے جھوڑ آؤں۔“ نیل نے اس کا خیال کر کے کہا۔

”نہیں نہیں۔ صبا کے سرال والے تبھی سن گئے اس کے دونوں ہن بھائی لنگ۔“ اس نے اپنی زبان ہاتھ چپکائی تو ایک پل میں ضبط کی جانے کن منزلوں سے گزر کر نیل اس کی تائید کرتے ہوئے ہوئے

نہیں ایسا نہ ہو وہ صبا میں بھی کوئی عیب تلاش کرنے بیٹھ جائیں۔“

ن جواب پر کچھ حیران ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ تو قدرے توقف سے نیل پوچھنے لگے۔

”نہیں مستقل اسلام آباد رہنے کا سوچ لیا ہے۔؟“

”ہاں۔ کج پیش کے بعد دیکھیں کیا کرتی ہوں۔“ اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”بس پھوپھو کا خیال کرنا چاہیے۔ صبا کے جانے سے وہ اکیلی ہو جائیں گی۔“

”بھئی تو ہیں، آپ کیوں نہیں خیال کر لیتے۔“

”انہوں نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔“

”اب آپ کا فرض نہیں ہے۔؟“

”نہیں۔“

”مجھے ہیں تو شادی کر کے ماما کو اچھی سی بھولا دیجیے۔“

”ہی!۔“ وہ ذرا سانسے۔ ”مجھ سے تو کوئی عام سی بھی شادی پر آمادہ نہیں ہوگی۔“

”اے۔؟“ اس نے پہلے بے دھیانی میں کہا پھر خودی چوری بن گئی۔ غالباً اپنی کسی بات یاد آگئی تھی اور نیل کے کچرے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ مسکراتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئے۔

بے آسہ خود صباحت اور مدحہ کو پوٹا پر لپکھوڑ آئی تھی۔ اس کے بعد انہیں لانے کی ذمہ داری نیل اور

ن کو سونپ کر وہ اس طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

مات بچے کے قریب وہ سب کے ساتھ میں جال پہنچ گئی۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کچھ

بھابھی، خلیل بھائی اور خلیل بھائی کے ساتھ گیٹ پر کھڑی ہوئی تھی پھر اندر چلی آئی اور لڑکیوں کو بارات

نیل کے لیے گیٹ پر جانے کا کہہ کر اماں جی کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”میرا ہٹ ہو رہی ہے اماں جی۔“

”ن سے، صبح سے دیکھ رہی ہوں ایک ایک کے ساتھ مغز ماری کر رہی ہو اور یہ لڑکیاں نہیں آئیں ابھی

ان کی خوشی کبھی پوری نہیں ہوگی بھابھی۔“ آسیہ نے روتے ہوئے کہا تب ہی عارفہ بیگم آگئیں اور فاتحانہ
بہن مسکرائی ہوئی بولیں۔
”سارک ہو، کہاں ہے دلہن، باہر لے آئیں اسے۔“

بہن کل خود پر ضبط کرنے کے بعد بولی۔
”بھگے افسوس ہے، آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں، جا کر کہہ دیجئے اپنے خسر نامدار سے کہ وہ آسیہ
والدین کے سامنے ناگ بھی رکھیں گے۔“

”ہی تو ہماری ہوگئی ڈاکٹر صاحبہ! اب نہ دینے کا کیا سوال؟“ عارفہ بیگم نے اس کے کندھے سے پیچھے ڈیرنگ
لے اندر بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو آسیہ نے جلدی سے پیچھے کر دروازہ بند کر دیا اور اس کے ساتھ
کریں کھڑی ہوگئی جیسے کوئی اندر جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔

”اسی وہ۔۔۔“ راجہ بھائی کوئی آئی تھی۔ اور جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ آسیہ کو دیکھ کر خاموش ہوگئی پھر
بولے عارفہ بیگم کو کچھ اشارہ کیا تو وہ واپس پلٹی ہوئی بولیں۔

”میں مردوں سے بات کرتی ہوں دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔“
”ہونہ!“ آسیہ نے تنفر سے سر جھٹکا پھر ذرا سادروازہ کھول کر سر اندر کر کے صباحت سے بولی۔

”صبا! یادروازہ اندر سے بند کر لو اور جب تک میں نہ کہوں، نہیں کھولنا۔“
”کیوں ممال۔“ صباحت کو کسی گڑبڑ کا احساس پریشان کر رہا تھا۔

”ہیں بیٹا! آخر دروازہ بند کرلو۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر دروازہ اپنی طرف کھینچا پھر کسی سوچ میں کھڑے تشکیل
ہی کا زونہ تمام کر بولی۔

”خپل بھائی! مہمانوں کو رخصت کریں۔“
”نہ بھائی نے چونک کر اسے دیکھا پھر گہری سانس کھینچ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”کچھ نہیں کہیے گا بھائی۔ صبا میری دلہیز پر سسک سسک کر مرجائے مجھے یہ گوارا ہے لیکن شاہ پور کے کسی
بہن کی گلی میں بننے والوں کی اسے۔“

”نہ بھائی نے ہونٹ پیچ کر ذرا سانس میں سر ہلایا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل پڑے۔ اور دونوں لان
پہاڑے تھے کہ ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے فضا گونج گئی اس کے ساتھ ہی آگے پیچھے نئی گاڑیاں گیٹ پر آن
ہیں اور ایک ساتھ سب کے دروازے کھلنے لگے۔

”نہ بھائی اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔
”اندھے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بارات کے ساتھ آئے مہمان اٹھ کر باہر جا رہے تھے جس سے وہ

”لہجہ سے ہو کر اباجی کی طرف بڑھی تھی کہ دو لمبے چوڑے جوان رانٹیل لیے ہوئے اس کے سامنے آئے۔
”دلہن کہاں ہے؟“

”مٹا۔“ وہ زور سے چیخی تو اس کی آواز سن کر مدیہ بھاگتی ہوئی آگئی۔ اور اس پر اتنی رانٹیل دیکھ کر سہم
ڈنڈا۔

”ان سے بات نہیں کریں ممالیہ ڈاکو ہیں۔“
”تو بھائی یہی ہے دلہن۔“ عقب سے راجہ نے اونچی آواز میں کہا۔ تو ان میں سے ایک نے فوراً ”بڑھ کر

”بہن! کاپی تمام لی اور اس سے پہلے کہ آسیہ کچھ سمجھتی اس نے جھپٹے سے مدیہ کو پیچ کر اس کے منہ پر رومال
دیا اور فوراً ”کندھے پر لا کر گیٹ پیار کر گیا۔

”مذہب۔“ آسیہ ایک دم حواس باختہ ہو کر چیخی۔ اباجی! بھائی روکیں انہیں۔“
”مذہب! آسیہ ہوش کو“ عدیل بھائی نے بھاگ کر اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑا تو وہ ان کے بازوؤں میں
نہل گئی تھی۔

”آسیہ ان کے پیچھے ڈیرنگ روم میں آئی اور دروازہ بند کرتی ہوئی بولی۔
”مذہب! آخر سو نیا وغیرہ کو کیا جاؤ۔ بارات آنے والی ہوگی۔“

”جب آئے گی، چلی جاؤں گی۔“ مدیہ لا پرواہی سے کہہ کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔
”بھابھی! آپ یہاں بیٹھیں گی یا میمونہ بھابھی کو بھیج دوں۔“ اس نے صباحت کی کھوڑی چموت بھر

بھابھی سے پوچھا۔
”میں یہاں ہوں یہاں، تم البتہ باہر جاؤ۔ میرا خیال ہے بارات آگئی ہے۔ شور مچا رہا ہے۔“

”میں بھی نے دروازے کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ بہت غلٹ میں مدیہ کو ساتھ آنے کا ہوتے
ڈیرنگ روم سے نکل کر گیٹ کی طرف آئی تو سب سے پہلے عارفہ بیگم سے سامنا ہو گیا۔ ان سے مل کر

دوسری خواتین کی طرف بڑھنا چاہا لیکن عارفہ بیگم نے بڑی خوبصورتی سے اسے باتوں میں لگا کر اسے ساتھ
چلنے پر مجبور کر دیا تھا پھر کچھ دیر وہ ان کے ساتھ بیٹھی جب نکاح کے لیے تشکیل بھائی اور خلیل بھائی کو ذرنگ
کی طرف جانے دیکھا تب عارفہ بیگم سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے میمونہ بھابھی کے پاس

ان سے اس پیکٹ کی بابت پوچھا جس میں دولہا کے لیے گھڑی، قلم اور انگوٹھی وغیرہ تھیں اور ان کے بتانے
کر گاڑی میں سے وہ پیکٹ نکال لانے کو کہا پھر ڈیرنگ روم کی طرف آئی تو دروازہ ہی میں رک گئی کیونکہ

اندر جگہ کم تھی دوسرے اچانک دل سہم سا گیا تھا۔ غالباً اس تمام عرصے میں اب یہ خیال آیا تھا کہ وہ
”زیادہ اس کی اپنی تھی وہ پرانی ہو رہی ہے اور اس خیال نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ جس سے اسے

دھندلا گیا تھا اور اب بھی یہ دھند چھٹی نہیں تھی کہ سماعتوں میں اتر کر نکاح خواں کی آواز ذہن کے کسی بند
جا لگی تھی۔

”شاہ علی جاگتے ولد شاہ جاگتے حیات کے ساتھ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟“
”نہیں۔“ آسیہ نے پورا زور لگا کر چیخا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے اسے بڑی زور کا جگر آیا اور سننے

اس کا ہاتھ دروازے پر یوں لگا کہ خلیل بھائی نے چونک کر دیکھا اور فوراً ”بڑھ کر اسے کندھوں سے تو
ساتھ لگاتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

”موصدا بیٹا! موصدا۔“
وہ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی حلق سے کوئی آواز نہیں نکال سکی۔ البتہ آنکھیں لباب بھر گئیں

”بہت ملتی انداز میں نفی میں سر ہلایا تو خلیل بھائی اسے تقریباً ”ٹھٹھٹے ہوئے ڈیرنگ روم سے باہر۔
دونوں بازوؤں کے حلقے میں لیا تو اس کا پورا وجود جھپٹنے لگا رہا تھا۔

”معا۔ سارے میں مبارک سلامت تمہی آوازیں گونجنے لگیں پھر قریب سے گزرتے خلیل بھائی کی آواز
”اچھا نہیں ہوا۔“

”اچھا بڑا دھوکا۔“ میسا بھی ”میاں سے کہہ رہی تھیں۔
”بس خاموش رہو۔“ خلیل بھائی نے انہیں ڈانٹا تب وہ پورا زور لگا کر ان کے بازوؤں سے نکل کر

”میں خاموش نہیں رہوں گی، ہرگز نہیں۔ جا کر کہہ دیں سب سے، جس طرح آئے ہیں؟“
جاگتے ورنہ میں۔“

”آسیہ! آسیہ بیٹا! ہوش سے کام لو۔“ خلیل بھائی ٹوک کر بولے۔
”میں بھی تو ہوش میں آئی ہوں بھائی۔“ وہ رو پڑی۔

”مما! ممما کیا ہوا۔؟“ مدیہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی کہ اسی مل فائرنگ کی آواز سے پوری ف
”یہ کیا ہو رہا ہے ماموں جی۔؟“ مدیہ نے سہم کر خلیل کو دیکھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔
”خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔“

”اوگاڑ! میں دیکھوں۔“ مدیہ بھاگی ہوئی لان میں اتر گئی۔
394

اتنی افرا تفری میں کوئی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ خلیل بھائی اپنے مہمانوں سے معذرت کر کے انہیں رخصت کر رہے تھے۔

خلیل بھائی ابھی بھی مصلحت کا دامن تھامے ہوئے تھے اور اس دھوکا دہی پر بجائے علی جمائیک پر ناراض ہونے کے بہت مضبوط کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ اب صاحت آپ کی امانت ہے لیکن اس وقت رخصتی ممکن نہیں ہے اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ پھر وہ علی جمائیک کے ساتھ اس کی گاڑی تک گئے تھے اور جب انہیں عدیل کے بازوؤں میں جھونٹی آسیہ کو دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

”اسے لیا ہوا ہے؟“

”جی نہیں بھائی! میں تو اس کی چیخ سن کر۔“ ابائی کے آنے سے عدیل کی بات ادھوری رہ گئی۔

”چلو بیٹا! اب جو بھی ملے کرنا ہے گھر چل کر کرو! ابائی نے کہا۔

”جی ابائی! آپ اماں جی اور بیچوں کو لے کر چلیں۔ ہم بھی آ رہے ہیں۔“

خلیل بھائی کہتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے آسیہ کے سامنے آکھڑے ہوئے تاکہ ابائی کی اس پر نظر نہ پڑے۔

دستک کی آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا پھر قریب جا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

”کون؟“

”میں ہوں نیل دروازہ کھولو بیٹا۔“ نیل کی آواز سن کر اس نے کچھ دیر سوچا پھر دروازے کا لاک کھول کر طرف سے پیچھے موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نیل اندر داخل ہوئے اور اسے اکیلے دیکھ کر پوچھا۔

”اور کوئی نہیں ہے یہاں۔“

وہ ایک دم پلٹ کر ان کے بازو سے لگ گئی۔

”نیل بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مہمان کہاں ہیں اور یہ اتنی گولیاں کیوں چل رہی تھیں کیا کوئی؟“

”کچھ نہیں ہوا چلو میرے ساتھ۔“ نیل نے نوک کر کہا۔

”کہاں؟“

”یہ سامان تمہارا ہے یہ بھی لے لو۔“ نیل اس کا کہاں نظر انداز کر گئے۔

”لیکن ممانے تو کہا تھا۔ میں ان کے علاوہ کسی کی۔“

”ادھر وہ! تم چلو تو۔“ نیل قصداً سمجھلائے پھر خود ہی پیکٹ اور بیوٹی بکس اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولا۔

الحال کوئی سوال مت کر دیکھنے میں جواب نہیں دوں گا بس اتنا سن لو کہ ہم گھر جا رہے ہیں۔“

اس کے ہونٹ ذرا سے نیم دوا ہوئے لیکن کچھ بول نہیں سکی۔ اس لیے نیل نے منع کیا تھا بلکہ جو

تھی۔ پھر سر جھکا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

ڈرینک روم سے باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر الجھنے لگی لیکن سروانچا کر کے

نہیں دیکھا اور اسی طرح گاڑی میں بیٹھ گئی جب نیل اس کے برابر بیٹھے تب اس سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔

طرف دیکھ کر عاجزی سے بولی۔

”جی جی! میں نیل بھائی! گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں۔“

نیل نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگایا یوں جیسے چھلنے

ہوئی بچی کو سہارا دیا جائے اور وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی مزید عروسی جوڑے نے اسے پابند کر دیا تھا جو

داخل ہو کر وہ کسی سے فوراً کوئی سوال نہیں کر سکی اور سیدھی اوپر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو

بند کرنے لگی تھی کہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر رک کر انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد سونیا آئی۔

”میں نے سوچا تمہاری مدد کروں۔“ سونیا نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہہ کر اپنے پیچھے دروازہ بند

ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

نیل! کیا ہوا ہے؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟ ممانا اور مدھو کہاں ہے؟

نیل! چلو تم پہلے کمرے تبدیل کر کے منہ باہر دھولو۔“ سونیا نے کہا اور ہر کمرے کے دوپٹے میں

چھانکنے لگی اس کے بعد زیور انار کر الماری میں رکھنے کے ساتھ اس کے لیے ایک سوٹ بھی نکال لیا۔

نیل! کمرے میں۔“

نیل! وہ تو بتاؤ میں کچھ کھانے کو لے آتی ہوں۔“

نیل! نہیں ہے۔“ وہ کتنی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔

نیل! تو سونیا کو موجود نہ پا کر وہ باہر نکلی ہو گئی دل چاہا چیخ کر سب کو پکارے اور پوچھے کہ اسے اتنا بے خبر

نہا ہوا ہے ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو اس سے چھپائی جا رہی ہے۔

بے خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت بے دلی سے اس نے عروسی شرارہ بیڈ پر پھینکا اور خود بھی ڈھسے لگی تو

علی جمائیک کا خیال آیا۔

نیل! جی جمائیک تو ٹھیک ہیں ناں؟“ وہ فوراً اٹھی تھی کہ سونیا ٹرے میں چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ لے کر

نے سوچا، تم جب تک چہنچ کر گوگی میں چائے بنا لوں گی۔“ سونیا نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی پھر بیٹھے

لگی۔ ”میں جانتی ہوں تم بہت اچھے رہی ہو اور پریشان بھی ہو۔“

نیل! ہلکے۔“ وہ نوک کر بولی ”جو بھی کہنا ہے سیدھے صاف لفظوں میں کہہ دیں میں سب سن لوں گی۔“

نیل! لیکن خیر اصل بات یہ ہے کہ پھوپھو تمہاری شادی علی جمائیک کے ساتھ نہیں کرنا چاہتیں۔“ سونیا

بدمعاشانہ لہجہ سے کہنے لگی۔

نیل! مطلب ہے۔“ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

نیل! مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ سونیا فوراً بولی۔ ”وہ جو علی جمائیک سے ناں وہ شاہ سکندر کا بھتیجا ہے اور یہ

ممانے پہلے سے نہیں بتائی تھی ورنہ پھوپھو پہلے ہی انکار کر دیتیں، یعنی اپنی اصلیت چھپا کر وہ تمہیں

اپنا رہے تھے دھوکے سے۔“

نیل! اسے۔“ اس نے اپنی آواز کیسے دور سے آتی لگی تھی۔

نیل! دھوکا نہیں ہے۔“ سونیا چائے کا سپ لیتی ہوئی بولی۔

نیل! کمرے میں ہو گئی۔

نیل! بھی ان کی اصلیت نہ کھلتی تو تم تو پہنچ چکی تھیں شاہ پور۔“ سونیا اس کی کیفیت سے بے خبرانی کے

بالاں اٹھ جانے کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ بہر حال اس وقت تمہیں بہت اہمیت سے کام لینا ہے،

پھوپھو کے سامنے انہیں یقین دلاؤ کہ تم انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ سمجھیں تمہارے یہاں آجانے سے

نہ ہو گئی کیونکہ نکاح ہو چکا ہے اور اس کے بل پر وہ تمہیں لے جانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

نیل!۔“ وہ جانے کس خیال سے سسم کر رونے لگی۔

نیل!۔“ سونیا نے چائے کا کپ رکھ کر اس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔ ”یہ کیا حماقت کر رہی

ہیں؟“

نیل! جلتے ہیں۔ جی نہیں پھوپھو کو ہوش آیا کہ نہیں۔“

نیل! تمہیں کچھ کرنا چاہی۔“ ممانا کو کہا ہوا ہے؟“

نیل! عدیل چاچو ہم میں سے کسی کو کمرے میں جانے ہی نہیں دے رہے تم چلو شاید تمہیں جانے

دے گا تو اس نے فوراً اٹھتے ہوئے پوچھا۔

نیل! کہاں ہے؟“

نیل! تو میں نے نہیں دیکھا شاید پھوپھو کے پاس ہوگی۔“

خدا۔ ”وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور اگلے پل چاروں اور جھولتی لڑیوں کو بے دردی سے کھینچنے لگی۔ لڑیاں اس کے وجود سے لپٹ گئی تھیں۔ کچھ بازوؤں میں الجھ گئیں جس سے اس کی جھنجھلاہٹ میں

دبا۔ ”آج لگا دوں گی میں سب کو۔“ وہ بری طرح تملتا کر بڑبڑاتی تھی کہ دروازہ کھلنے کے ساتھ علی

پہلے ہو کر بولا۔

”پہلے؟“

”پہلے لڑیوں سے آزاد کرانے کی سعی بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”کوئی اٹھاڑے کا۔“ علی جتنا تیرنے سارے میں بکھرے پھولوں کو دیکھتے ہوئے قدرے محفوظ

باندھ کر کہا تھا کہ وہ تیز ہو کر بولی۔

”آپ؟“

”وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس جیسے مجھے نہیں جانتیں۔ وہ لڑیوں سمیت مسہری سے اتر کر اس

نزلولی۔

”آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”بہائیں ماننا ہوں کہ یہ سب۔۔۔“

”ن علی جتنا تیریں۔“ وہ ایک دم سمجھ کر خامے تسنخرانہ انداز میں اس کے گرد چکر کاٹ کر پھر اس کے

پل۔ ”چہ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”بے ہمارا۔“ وہ کچھ ٹھٹھک کر دیکھنے لگا۔

”بہ کہ میں صاحبت نہیں ہوں اور نہ ہی اس کی طرح معصوم، مسکین اور بزدل ہوں، سمجھے آپ۔“

”بچار کما تو علی جتنا تیر پیداشانی پر بے شمار شنائیں ڈال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سمجھنے کی

بابو۔

”ہاں ہی چھوڑ کر ٹھٹھنے کے انداز میں دروازے تک آئی اور اسے پورا کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ طویل

نار اور اس سے آگے غالباً ”تیرس اور بس یہیں تک روشنی تھی“ اس کے بعد گھپ اندھیرا تھا۔

”یوں ہی جگہ ہے۔“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

”نرا ایک دم پلٹا اور اسے دروازے کے پتوں بچ کھڑے دیکھ کر خاصا متعجب سا ہو کر اس کی طرف بڑھتے

زکات سے سب لوگ کیا کہیں گے۔“

”اؤل کے کہنے کی کبھی پروا نہیں رہی۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر رہاداری میں نکلی تھی کہ علی جتنا تیر

ت میں اس تک پہنچ کر اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

”نرا کو۔“

”ت لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

نکلی اپنی قسمت کو رو رہی ہوگی۔ اس بزدل کو رونے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے، ہونہ۔“

”میں نے پہلی بار ٹھٹھک کر اسے سر تپا دیکھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی سر، کوئی فرق نہیں تھا پھر

بابا جین کر گیا۔

”ناما نہیں ہو۔“ پھر انگوٹھے سے دائیں جانب اشارہ کر کے بولا۔ ”ادھر چلی جاؤ۔ بابا جان ابھی لاؤنج

رہ نہیں جو بھی کہنا ہے ان سے کہو۔“

”بابا جان آپ کے فادر۔“ وہ اس کے اشارے کی سمت دیکھ کر پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سو نیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

سڑھیاں پھیلاکتی ہوئی نیچے آئی تھی۔

”ابا جی کے کمرے کے باہر میونہ۔“ بھائی جی سیما بھی اور اماں جی بیٹھی تھیں جب کہ دروازے کے پاس بیٹل اور

نبیل کھڑے تھے اور وہ جو بیٹھیاں پھیلاکتی ہوئی آئی تھی بس ایک لحظہ کو تعصفی۔ پھر ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔

”مجھے مت روکے گا نبیل بھائی! میں ماما کو دیکھوں گی۔“

”دیکھ لینا بیٹا، دیکھ لینا ذرا صبر کرو۔“ نبیل سے پہلے عدیل نے کہا تو وہ چل کر بولی۔

”نہیں ماموں جی! میں صبر نہیں کر سکتی۔ مجھے اندر جانے دیں۔“

”جانے دو۔ شاید اسے دیکھ کر۔“ میونہ بھائی اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئیں تو عدیل کچھ دیر کو ان کی طرف

متوجہ ہوئے پھر احتیاط سے دروازہ کھول کر آہستہ آواز میں اس سے بولے۔

”مما کو پریشان نہیں کرنا بیٹا۔“

”نہیں۔“ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی لیکن آسیہ کو دیکھتے ہی بے اختیار اسے پکارا۔

”مما۔!“

”آسیہ بالکل سیدھی ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آواز پر بھی اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں

ہوئی البتہ آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

”مما۔“ وہ آسیہ کے قریب جا بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس پر جھک کر دھیرے سے بولی۔

”میں آپ کے پاس ہوں ممما۔“

”آسیہ نے ذرا سی پلکیں جھپکیں تو آنکھوں کا پانی روانی سے کناروں سے بہنے لگا۔

”مما پلیز! رو میں نہیں، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ اس کے لمبے میں عاجزی کے ساتھ بے

دکھ تھا۔

”آسیہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بہت کوشش کے بعد اس کے ہونٹوں سے سسکی کی صورت نکلتا تھا۔

”مدو۔“

”تم تو بہت بہادر ہو بیٹا۔“ ابا جی سر ہانے بیٹھ کر آسیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے ”ہمت سے“

تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا صبا جو بیٹا مدو کو بلا لاؤ۔“

وہ اٹھنے لگی تھی کہ آسیہ نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں سے لگا کر بولی۔

”مدو نہیں ہے ابا جی! مدو نہیں ہے۔ وہ لے گئے اسے۔“

”کون؟“ ابا جی سے زیادہ خلیل بھائی اور خلیل بھائی چونکے تھے۔

”مدو کو لے گئے۔ نہیں ممما! میں بلاتی ہوں اسے۔“ وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر مدیہ کو دیکھنے

تھی۔



مدیہ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولی تھیں۔

بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ جنازی ساز مسہری چاروں طرف سے گلاب کی لڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور

ذہن کو تھکا دہی بوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس لیے فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔

نے اٹھنے کی کوشش کی۔ کتنی دیر تک پلکیں جھپک جھپک کر خود پر تنے گلابوں کے ساتبان کو دیکھنے لگی

تھک کر زار دیر کو آنکھیں بند کی تھیں کہ اس کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔

شادی، آفرانقری، فائرنگ اور پھر۔۔۔ اس کے سینے میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس بھی نہ

تھیں۔ جیسے میلوں بھاگتی آئی ہو۔

”گرینڈ فور شاہ حیات محمد۔“ وہ اس کا رد عمل دیکھنے کی خاطر اس پر نظریں جماتا رہا۔
وہ ایک دم اچھل پڑی۔

”جس کیپا، تم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آسہ کے پاس تمہاری بیٹی ہے یا بیٹا۔“ باباجان نے کہا تو وہ انہیں
نے کی بجائے سہولت سے بولے۔

”اب تو جان گیا ہوں کہ ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں، صباحت اور مدحیہ۔ آپ یقین نہ کریں تب بھی یہ حقیقت
میں آئی ہے۔“

”جی، آپ شاہ پور میں ہیں۔“ وہ کہہ کر واپس کمرے کے اندر چلا گیا۔
تو وہ کچھ دیر اس کے پیچھے دیکھتی رہی پھر جیسے خواب کے عالم میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ریڈنگ کے پاس

نیچے دیکھنے لگی۔ وسیع و عریض لاؤنج تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ درمیان میں ایرانی قایم کے چاروں اطراف
صوفیوں پر جانے کون کون راجاں تھا۔ کسی شناسا چہرے کی تلاش میں اس کی نظریں سمیٹتی ہوئی شاہ سکندر
نہیں تو اس کے دل میں ایک لہری اٹھی تھی اور دوسرے پل وہ بیڑھیاں اتر کر ان سب کے درمیان آ
ہوئی۔

”ہیں“ باباجان نے تعجب سے اسے بول دیکھا جیسے یہ کہاں سے آئی۔
”میں نے سوچا“ آپ لوگ اپنی جیت کی خوشی منارہے ہوں گے۔ میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔

”کہہ کر زور سے ہنسی اور پھر ایک ایک کو دیکھ کر ہنسی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں واضح تمسخر تھا۔
شاہ جہانگیر نے بول کھلا کر شاہ سکندر کو دیکھا لیکن وہ اپنی جگہ پریشان ہو کر باباجان کو دیکھ رہے تھے جن کا چہرہ

اور توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر دھاڑے۔
”خاموش۔“

مدحیہ کی ہنسی وہیں تھم گئی، لیکن وہ خائف نہیں ہوئی بلکہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔
”تو آپ ہیں شاہ حیات محمد، میرے باپ کے باپ۔“

”صبا، شاہ سکندر نے سرزنش کے انداز میں بولا تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔
”صبا نہیں ہوں میں لیکن آپ کیا جانیں گے کبھی دیکھا ہو تب تو۔“

”آرام سے بیٹا، آرام سے۔“ شاہ جہانگیر نے صورت حال سنبھالنے کی سعی کی۔
”آرام سے۔“ وہ طنز آمیز تنہائی سے گویا ہوئی۔ ”باپ“ دادا، بیٹی کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور یہ بھی

جانتے کہ وہ کون ہے۔ مدحیہ ہوں میں، مدحیہ سکندر۔“
”مدحیہ۔“ شاہ سکندر کے ذہن میں جھٹک چلنے لگے تھے۔

”آس“ ہماری بیٹی ہوئی تو، ہم اس کا نام مدحیہ رکھیں گے۔“
”ہوں“ اچھا نام ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر پھر خوشی سے پوچھا تھا۔ ”ویسے کا

مدحیہ؟“
”کیا مطلب، تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“

”میرے خدا۔“ انہوں نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھکا دے کر مدحیہ کو دیکھا تھا۔ وہ ا
اسی زہر خند سے بول رہی تھی۔

”آپ نے ممّا کو دھوکا دے دیا لیکن اس سے بڑا دھوکا آپ نے خود کھایا ہے۔ صباحت میری بہن ہے،
بہن۔ بنانے والے نے صرف ہماری شکلیں ایک جیسی بنائی ہیں، مقدر ایک جیسے ہمیں لکھے۔“ آخر
کس خیال سے اس کے لہجے میں آرزو کی سمٹ آئی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ باباجان اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔
”نہیں باباجان۔“ شاہ سکندر نے آگے بڑھ کر مدحیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میری بیٹی جھوٹ

رہی۔“
مدحیہ نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا اور اپنے کندھے پر ان کے ہاتھ کے لمس کو یوں محسوس کیا جیسے

اپنی احساس کو ترس رہی ہو۔
”ابا جان، آپ کی بات سنی۔“

”ابا جان، آپ کی بات سنی۔“
”ابا جان، آپ کی بات سنی۔“

”اب میں پہنوں گی کیا۔ ان میں تو ابھرن ہو رہی ہے۔“
شاہ سکندر فوراً جواب نہیں دے سکے۔ غالباً ”فوری“ نام سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈالی پھر واش روم کھنکھایا۔ رات وہ صبا کے ساتھ نہنی پارلر سے تیار ہوئی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے جانے کیا کچھ یاد آیا۔ پھر ان ہی سوچوں کی گرفت میں رہ کر اس نے پیر میک اب صاف کیا پھر منہ دھویا اس کے بعد بالوں میں شکر کے نفی تو بیڈ پر تین چار سوٹ رکھے تھے۔ پانچواں جنگ کئے ہوئے۔ جنہیں دیکھ کر بھی اس نے قصداً ”نہ نماز کر دیا اور اپنا ڈیوٹی اٹھا کر شانے پر ہمارا ہی کمر“ الماس مزید دوسوٹ لے کر آئی۔

”پاپا دیکھیں یہ کیسے۔“ الماس دروازے سے داخل ہونے کے ساتھ بولنے لگی تھی لیکن اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئی۔
اس نے اپنی مصروفیت ترک کر کے بے اختیار سراپا کیا اور الماس کے دونوں ہاتھوں میں ٹنگر دیکھ کر غور سے بولی۔

”میں اتن نہیں پہنتی۔“
”تمہاری مرضی۔“ الماس نے جواباً ”ناگواری کے شمار کے ساتھ دونوں ٹنگر بیز پر اچھال دیے اور اوپر جانے لگی کہ شاہ سکندر اسے پکار کر بولے۔
”الماس! یہ تمہاری بڑی بہن ہے مدحیہ۔“
الماس کچھ نہیں بولی لیکن اندازاً یہاں تھا جیسے میں کیا کہیں۔
”اور مدحیہ بٹا!“

یہ میری پھولی بہن ہے۔“
وہ فوراً ”کہہ کر ذرا سانس لی پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر بولی۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“
”ہاں چلو بی بی جان کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔“ شاہ سکندر کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ ان پیچھے چلتی ہوئی الماس کے قریب رک کر بولی۔
”تم بھی چلو۔“ اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے آگے بڑھ گئی۔

ڈانکنگ ہال میں باباجان کے علاوہ سب موجود تھے اس نے داخل ہوتے ہی سب پر اپنی نظر ڈالی تھی پھر یوں کھانے میں مصروف ہو گئی جیسے پیشہ سے یہیں رہتی آرہی ہو۔ یعنی کوئی تکلف نہیں نہ غیرت۔ ماسب کے درمیان وہ خود کو اجنبی محسوس کر رہی تھی حتیٰ کہ قریب بیٹھے شاہ سکندر بھی اسے نہیں لگ رہے۔ پھر بھی اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا نہ ہی ذرا کو مہمان پوز کیا تھا اور سب سے پہلے کھانا ختم کر کے ہوئی اور کھانا سرو کر لی ملازمہ کو دیکھ کر بولی۔

”مجھے فوراً چائے چاہیے۔“
”جائے کس نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ بی بی دلی ہنسی۔ جسے وہ نظر انداز کرتی ہوئی ڈانکنگ ہال۔“
”فوراً۔“ جانے کس نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ بی بی دلی ہنسی۔ جسے وہ نظر انداز کرتی ہوئی ڈانکنگ ہال۔
کر لاؤنج میں آ بیٹھی اور گلاس وال سے باہر دیکھنے کی غیور کو ریڈور سے آگے غالباً ”ذرا سیوے“ تھا اس لان جس کی آخری حد نظر نہیں آرہی تھی۔

”تو یہ میرے باپ دادا کا گھر۔“ وہ اپنے آپ سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے کے انداز میں رابڈاری نظر آئی اس میں داخل ہو گئی۔ دائیں ہاتھ پر بند دروازے کو ذرا سا ہول کر دیکھا۔ وسیع دروازے جس کی سیاہی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ فوراً دروازہ بند کر کے آگے چل پڑی۔ آخر میں بائیں جانب دروازہ وہ بھی بند تھا۔ اس نے ہینڈل کھما کر دروازہ کھلیا تو سامنے مسہری باباجان تھے۔ دروازے پر آواز پر ہی متوجہ ہو گئے تھے اور اسے دیکھ کر ان کی زبانی شکن آلود ہو گئی۔ جس سے وہ چند خانے کو کھینچ کر آرام سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”کھانے پر نہیں آئے۔؟“

بی بی اتنی تیز نہیں کہے کہ بیوں کو پہلے سلام کیا جاتا ہے اور اندر آنے سے پہلے بھی اجازت لی جاتی ہے۔ یہ ہے۔ یہاں ہم جسے بلاتے ہیں وہی آتا ہے۔ خود سے آنے کی جرات کوئی نہیں کرتا۔ یہ ہم ہمیں پہلی اور ہمارے ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔“ باباجان نے اس کی بدتمیزی کو ٹوک کر بتایا۔
بی بی نے سلام نہیں کیا یہ میری غلطی ہے۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں جانتی یعنی اس حویلی کے ادب اصول۔ نہ ہی وہ مجھ پر لڑا کو ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں یہاں رہی نہیں اور نہ ہی رہنے کا ارادہ ہے۔ وہ ہے کہتی ہوئی بڑے آرام دہ انداز میں صوفے میں دھس گئی۔

بی بی یہیں کھتاخ بھی ہو۔ تمہاری ہاں نے۔“
”ہاں کانام میں لہجے گا۔“ وہ فوراً ”بول پڑی۔“ ”ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔“
”دین۔“ باباجان کا ضبط جواب دینے لگا تو فضل دین کو پکار کر بولے۔ ”سکندر کو بھیجو ہمارے پاس۔“
”سکندر کیا کر لیں گے۔“ اس نے سوچا اور نیبل سے اخبار اٹھا کر گھٹنوں پر پھیلاتی ہوئی انہیں سنا کر بولی۔
”میں شاید میرے اغوا کی خبر چھپی ہو۔ کہ شادی ہال سے دلہن کا اغوا۔“

”ان انتہائی قہر آلود نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔
”نوں بعد شاہ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔
”ہم ایک باباجان۔“

”ان نے اس پر سے نظریں ہٹا کر شاہ سکندر کو دیکھا اور سلام کا جواب دیے بغیر اس کی طرف اشارہ کر کے بی بی کو سب سے پہلے یہاں کے آداب سکھاؤ۔“

”نہ آہستہ سکھ جائے گی باباجان۔“ شاہ سکندر اس کی نشست کا انداز دیکھ کر یہی سمجھ کہ باباجان کو اس کا ہے بیٹھنا ناگوار کر رہا ہے۔ اس لیے بڑے آرام سے بولے تھے۔
”نہ آہستہ یعنی تب تک ہم اس کی بدتمیزیاں اور گستاخیاں برداشت کرتے رہیں ہرگز نہیں۔ لے جاؤ رہے اور سمجھاؤ کہ اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آئے جب تک ہمارے سامنے مودب کھڑے ہوتا ہے۔“ باباجان نے اتنے عرصے سے کہا کہ شاہ سکندر خائف سے ہو گئے لیکن وہ ہنوز سی لا پرواہ سے انداز میں بند کرتے ہوئے بولی۔

”بہن! ہاتھ باندھ کر۔ سوری یہ تو میں قیامت تک نہیں سکھ سکتی۔“
”بہن میرے ساتھ آؤ بیٹا۔“ شاہ سکندر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔
”نہا انصوہ۔“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

”اور سنو فون کر کے اپنی ماں سے پوچھو کہ ہم دلہن رخصت کرانے کب آئیں۔“ باباجان نے خاصے انٹس اجازت دینے کے ساتھ کہا۔
”لو بے ساختہ ہنسی اور فوراً۔“ ہونوں پر ہاتھ بھی رکھ لیا لیکن شاہ سکندر اسے کھینچتے ہوئے باہر لے

”بہن بڑی ہے۔“
”نہ آہستہ کی مصروفیت پر ہنسی آئی۔“ وہ بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔ ”یعنی وہ ابھی بھی یہ سمجھ رہا کہ دلہن رخصت کر دیں گی۔ وہ نہیں جانتے لیکن آپ تو جانتے ہوں گے ماما کو اور صبا کو میں جانتی ہوں۔“
”نہ آہستہ کے بغیر تو وہ ایک اچھا ادھر ادھر نہیں ہو سکتی۔“
”اب۔“ شاہ سکندر غیر ارادی طور پر پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔
”نہ آہستہ کی مالک ہوں۔“ وہ گردن اٹھا کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ اب آپ بی بی جان کے پاس جاؤ، میں کسی کو بھیج کر آپ کے لیے کپڑے وغیرہ منگوا دوں۔“
وہ بے جوہر اس لیے لڑائی تھی وہ بھی نہیں تھے۔ ”انہوں نے چلتے ہوئے کہا۔“

”تھے تو اس کے بعد میں جانتی کہ میں نے اس کی چیز لے لی۔“
شاہ سکندر کچھ نہیں بولے اور اسے لاؤنج میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔
وہ بڑی ہی ان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی کہ گلاس وال سے نظر کو ریڈور میں کھڑے علی جمالیہ پر پڑی اور پھر دھیانی میں اسے ہی دیکھنے لگی۔ سفید کانن کے کلف لگے شلوار سوٹ میں اس کا درازہ اور نمایاں ہو گیا۔
جائے اس کی رنگت بھی ہی ایسی یا سنہری دھوپ کا عکس تھا جو اس کے چہرے کو جاذب نظر بناتا تھا۔
”صبا، تم ہمیشہ سے۔“ وہ جانے کیا سوچنے جا رہی تھی کہ اسی پل علی جمالیہ نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اس کے آگیا تھا۔

”ہیلو“ خاصا دوستانہ انداز تھا۔
وہ نظرس چرا کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔
”کب ناراض ہیں؟“ علی جمالیہ نے پوچھا۔
”پتا نہیں ابھی تک میں سمجھ نہیں سکی کہ مجھے کس بات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ناراضی خوشی دکھ، افسوس،“
”بس۔“ وہ ٹوک کر بولا۔ ”جب سمجھ جائیں تو تیار ضرور رہیں گے۔“
”اچھی بات ہے۔“ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ گہری سانس خارج ہوئی پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔
”اپنے اپنے کاموں میں۔“ علی جمالیہ نے سرسری انداز میں بتایا اور اس کے خاموش رہنے پر قدرے سے پوچھنے لگا۔

”سنیں، آپ اپنے گھر فون نہیں کریں گی۔“
”اپنے گھر میں تو ٹھہری ہوں۔“ وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔
”میرا مطلب ہے اپنی ماما کو۔“
”کیوں کروں؟ یہ بتانے کے لیے کہ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ وہ میری فکر نہ کریں اور مزید صبا کو کرنے کا سوچیں۔ سوری، ممانہ تو میری کسی بات کا یقین کریں گی اور نہ ہی عمل، اس لیے فی الحال میرا رابطہ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“
”میری بات کرادیں صبا۔“ وہ کسی طرح اپنے لیے بے قراری چھپا نہیں سکا۔
”سوری امین، میں جب تک ماما سے یہ معلوم نہ کروں کہ وہ کیا چاہتی ہیں تب تک میں کچھ نہیں کر سکتی۔“
”مما کو فون بھی جب میرا دل چاہے گا کروں گی۔“ اس کے ”وہ بغیر کسی مروت لحاظ کے صاف منع کر کے آگے نہیں۔“

آسیہ گھنوں کے گرد بازو پیٹے بیٹھی تھی اور ہر ایک کی بات کے جواب میں اس کی بس ایک ہی تکرار تھی۔
”مجھے مدد چاہیے۔ وہ ظالم اسے مار ڈالیں گے۔“
”تم یہ کیوں بھوتی ہو بیٹا؟ وہاں اس کا باپ بھی موجود ہے اور وہ خواہ کتنا بھی ظالم کیوں نہ ہو بیٹا۔ زیادتی نہیں ہونے دے گا۔“ خلیل بھائی اس کی تکرار سے عاجز آ کر بولے تھے۔
”اور کیا تم تاج پریشان ہو رہی ہو۔“ خلیل بھائی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مدد کو تم جانتی نہیں؟“
سے خائف ہونے والی نہیں ہے زیادتی تو کیا تیز لہجہ برداشت نہیں کر سکتی۔“
”اسی بات سے تو ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ جذبات میں جانے کیا کر بیٹھے۔ بس آپ کسی طرح اسے بلا لیں۔“
”تم کیا چاہتی ہو، ہم ان کے در پر جائیں، نہیں۔“ عدیل کو اپنا ایک بار جانا یاد تھا اس لیے سختی سے

کوئی نہیں جائے گا۔ تم انتظار کرو مدد خود آئے گی یا فون کرے گی تو تم خود اس سے بات کر لیتا۔“
”عزیز بی بی، دن گزر گیا۔ اب تک اس کا فون آجانا چاہیے تھا اور نہ آنے کا مطلب۔“ آسیہ کی تشویش

مطلب نہیں ہے۔“ خلیل بھائی نے ٹوک دیا۔
”پتا، تم حوصلے سے کام لو۔ ابھی تو تمہیں صبا کا معاملہ نمٹنا ہے۔ یوں بہت باروگی تو یہ بچی ادھر کی ادھر کی۔“ اباجی نے دھیرج سے اسے صبا کا احساس دلایا۔

”ماں ہے؟“
”تمہیں اس کا خیال کرنا چاہیے۔ اصل زیادتی اس کے ساتھ ہوئی ہے اور وہی بے چاری محسوس کر رہی ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سب ہوا جبکہ اس کا کوئی قصور نہیں۔ زیادہ وہ تمہارے لیے ہے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو تب تو اسے سمجھا سکو گی۔“

بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ اب تک صرف مدد کے لیے پریشان تھی۔ صبا کا خیال ہی نہیں آیا۔
”اباجی اور خلیل بھائی نے احساس دلایا تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔
بھائی نے سب کو جلنے کا اشارہ کیا تو ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔

”کی فکر نہیں کرنا بیٹا، وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔“ اباجی نے جاتے جاتے کہا تو اس کا ذہن ایک بار پھر اٹھا۔

”کپا پر ہی تو بھروسہ کیا تھا میں نے۔“ اس نے بید کی بیک سے سر نکاتے ہوئے دکھ سے سوچا۔
”کس قدر گرا ہوا شخص ہے شاہ سکندر حیات۔ بیٹی کے معاملے میں بھی فریب دے گیا۔ غلطی میری ہے،“
”کاشقین کیوں کہا۔ عدیل بھائی سے کہتی تو شاید اسی وقت علی جمالیہ کا اصل سامنے آجاتا۔ یہاں تک پہنچی اور اب تو مجھے ایک نہیں دونوں بیٹیوں کے لیے لڑنا ہے۔“
”نبیل نے دروازے تک آکر اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر بولی۔

”تہہ بیٹا۔ آؤ۔“
”لے کھانا نہیں کھایا۔“ نبیل نے اندر آتے ہوئے کہا۔
”لگے گی تو کھالوں گی۔ تم نے اور صبا نے کھایا۔“ آسیہ نے حتی الامکان خود کو نارمل ظاہر کرنے کی سعی

”نبیل اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے تو قدرے توقف سے وہ بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔
”ن تو نہیں آیا۔“
”؟“ نبیل نے بے اختیار کہا تھا۔
”سے فون تو کرنا چاہیے تھا۔“

”کوہا تو ہے پچھو! وہ کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی اور یہاں تو سمجھیں اس کی ایک آرزو پوری کر رہی تھی۔ شاہ سکندر کے پاس جلی جاؤں گی۔“ نبیل جانے کس خیال میں کھو کر بول رہے تھے۔
”لے لینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔“

”آپ فکر نہیں کریں، زیادہ دن وہاں نہیں رہے گی۔ آجائے گی جلدی۔ آپ بس صبا کو سوچیں لیکن پتا نہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو جو فیصلہ کرنا ہو کر لیں گے اس کے بعد ہر کام مجھ پر۔ جیسا آپ چاہیں گی وہی ہو گا۔“ نبیل کے مضبوط لہجے پر وہ کتنی دیر انہیں دیکھتی رہی پھر مبہم سی کے ساتھ بولی تھی۔

”ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔“
”ات اور۔“ نبیل اچانک کسی خیال کے تحت بولے تھے۔ ”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے صبا سے ضرور

پوچھ لیجیے گا۔“

”صبا۔“ آسہ نہ صرف چونکی بلکہ کچھ ٹھٹھک بھی گئی تھی۔

”جی پچھو، کیونکہ وہ آپ کی بات سے اختلاف کرتی ہے نہ احتجاج۔ ابھی بھی آپ جو سوچیں گے وہ کچھ نہیں بولے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ۔“ نیل ایک دم خاموش ہو گئی۔

”تمہارا مطلب ہے وہ علی جمائیکر کے ساتھ۔“

”میرا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے پچھو۔“ نیل فوراً بول پڑی۔ ”میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں غیر اہم نہ سمجھنے لگے کہ اس کی زندگی کے معاملے یوں طے ہوتے ہیں کہ اسے خبری نہیں ہوتی۔ ویسے اس پوچھنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

”ہوں۔“ آسہ پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگی تھی۔

* * *

گزشتہ رات بھی اس کی آنکھوں میں کئی تھی اور اب بھی وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی، لیکن نیند نہیں دی۔ آخر اس نے بستر چھوڑ دیا اور لائٹ آن کر کے میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن بہت جلد اسے ادھر ہو گیا کہ جن باتوں کو وہ گزشتہ دو روز سے مسلسل ذہن سے جھٹک رہی ہے ان سے مزید پہلو بھی ممکن نہیں ہے۔ ”میرے خدا کیا ضروری تھا کہ جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ بھی ہو۔“ وہ بہت تھک کر پھر اُٹر

جگہ پر لیٹی تھی کہ اس کی نظروں کے سامنے فلم سی چل پڑی تھی۔

علی جمائیکر سے پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک۔ وہ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک اندازہ رہی اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ باقاعدہ پلان کے تحت اس کی زندگی میں آیا اور شاہ سکندر کی طرح اسے بھی محبت کا قریب دے کر اسے حاصل کرنا چاہا اور یہ ایسی تلخ حقیقت تھی یا اس کی سوچ بہر حال بے حد دکھا والی تھی کہ اس سارے قصے میں اس کا بہت نقصان ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنے دل کی ہستی میں بڑی مجتہد چاہت سے اس کے نام کے بیچ بونے تھے اور پھر پوری ایمانداری سے ان کی آبیاری کی تھی اور اب جب کہ بستی پھولوں سے سج گئی تھی تو وہ اتنا مانگ رہا تھا۔

”تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو۔“

”میں چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دو گی۔“

”نہیں۔“ اس کی آنکھیں یکبارگی آنسوؤں سے لبریز ہو کر کناروں سے چھلک گئیں۔ ”تم چاہو گے تو نہیں کیونکہ تم جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہے۔ تم نے صرف محبت کا ڈھونگ رکھا، قریب دیا مجھے اور چاہے تمہاری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دوں۔ میری دنیا ہے ہی کتنی۔“ ماما نیل بھائی اور مدحو، جنہیں اپنی طرف دینے کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا اور کیاستم ظریفی ہے کہ میری ذات ہی دکھ اور پریشانی کا باعث بن گیا کے ذمہ دار تم ہو علی جمائیکر۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، ابھی نہیں۔“ اس نے سر کے نیچے سر پھینک کر نہ پرکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

اور اس نے تو اس وقت جب علی جمائیکر اس کی زندگی میں آیا تھا سوچ لیا تھا کہ اس کے بارے میں سو فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آسہ کو ہے اور ابھی بھی اس نے یہی سوچ کر خود کو الگ تنہا کر لیا تھا اور اسے نہیں تھی کہ اس تسلسلے میں آسہ اس سے کوئی سوال جواب کرے گی پھر بھی وہ خود کو ایسی کسی صورت حال میں تیار کرنے لگی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی انداز سے علی جمائیکر کے ساتھ اس کو اپنے ہونے محسوس کر کے آسہ کو فیصلہ کرنے میں مشکل ہو۔

پھر صبح جب وہ سو کر اٹھی تو آسہ موجود نہیں تھی۔ اس نے بوا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج ٹھیک تھا۔ ابھی واپس اسلام آباد جا رہے ہیں اور اسی لیے آسہ اٹھتی ہی نیچے چلی گئی تھی۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ ممانی سے ملنے جائے لیکن سب کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔ گو کہ اس کا کوئی تصور

رہی اسے تصور وار سمجھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے سب دیکھتے تھے اس سے وہ اپنے آپ میں کٹنے لگتی تھی۔ جسے وہ چاہنے کے باوجود نہیں گئی اور یا کا سامنا کر کے زبردستی خود کو جھاڑ پونچھ میں مصروف کر لیا۔ اس کام فائغ ہو کر بوا کی مدد کے ارادے سے بچن کی طرف جاری تھی کہ فون کی بیل پر بہت تیزی سے پلٹ کر اس پر پورا اٹھایا تھا کیونکہ اسے پہلے خیال مدیحہ کا آیا تھا اور اس نے بے اختیار اسے ہی پکارا۔

”ہیلو مدحو۔“

”علی جمائیکر کی آواز سنتے ہی اس کے اندر ناگواری کے احساس کے ساتھ بے پناہ تفر بھر

”میری رائگ نمبر۔“ اس نے فوراً ”ریسیور پٹخ دیا اور کتنی دیر وہیں کھڑی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اس کا ذہن چمکنے لگا تھا کہ اتنا بڑا دھوکا دینے کے بعد علی جمائیکر نے اسے فون کرنے کی جرات کیسے کی۔ کیا چاہتا ہے اب وہ اس پر۔“

”صبا۔“ آسہ کی پکار پر وہ نہ صرف چونکی بلکہ فوراً ”نیل فون کے پاس سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ البتہ جواب دے سکی۔

”کھ گئیں بیٹا، ناشتا کر لیا۔“ آسہ نے لابی میں آکر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اشارت میں سر ہلادیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ آسہ نے اس سے کہتے ہوئے نیل فون کو دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔

”ہاں ماما، صفائی کر رہی تھی۔“ نیل بھائی کا کمرہ اتنا گندہ ہو رہا تھا۔“

”چھ ماما، سپاس آؤ۔“ آسہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”اللہ۔“ اس نے نیل فون کو خائف نظروں سے دیکھا پھر آسہ کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی

”کل ماماوں چلے گئے۔“

”ہاں ابھی گئے ہیں۔ تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں بلایا نہیں۔ چلو پھر آئیں گے تو مل لینا۔“ آسہ برسی انداز میں کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے خود کلائی کے انداز میں بولی۔

”ابھی تک مدحو کا فون نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار ہے۔“

”مدحو کو کیوں لے گئے ماما۔“ اس نے پوچھا تو آسہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر تاسف بھری ذرا سی ہنسی کے

”ڈوبل۔“

”تمہارے دھوکے میں۔ وہ یہی سمجھے کہ دلہن وہی ہے اور یقیناً ”شاہ پور“ بننے تک وہ خود کو فوج سمجھتے رہے ہوں۔“

”مدحو دلہن۔“ اس کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا۔

”پریشان نہیں ہونا بیٹا، مدحو آجائے گی۔“ آسہ اپنی سمجھ کے مطابق اسے تسلی دینے لگی۔ ”میں اپنی غلطی

”ڈاکٹر نہیں اور مدحو کو نہیں سمجھتے دوں گی۔“

”آپ کی کیا غلطی ہے ماما۔“ اس نے کم سم سے انداز میں پوچھا۔

”میری ہی غلطی ہے، جیسا کہ میں نے عارفہ بیگم کے سارے قبھلوں کا اعتبار کر لیا تھا اور ان کے کہنے کے مطابق

”میری شادی پر آمادہ بھی ہو گئی۔ انہوں نے جلدی کی ہی اس لیے تھی کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔ خیر ابھی

”فون کس بجڑا۔“ ان کی جیت کا نہ تو ہرن ہو ہی گیا جو گا مزید۔“

”یہ اپنے خیال میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی پھر قدرے توقف سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے

”مجھے اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی طے کرتے ہوئے میں نے تم سے پوچھا تک نہیں تھا۔ پتا

”مے اپنے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ مجھے کم از کم تمہیں اتنا حق تو دینا چاہیے تھا کہ تم اپنی سوچوں کا اظہار

کر سکو، بالابی بالا فیصلہ کر لیا، جیسے مدحیہ کے وقت میں کیا تھا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔ امیر نے وہاں شاہی کونسل اور تمہارے ساتھ یہ سب ہوا۔

”نہیں ماما، آپ ایسا نہیں سوچیں۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”آپ کے فیصلے غلط نہیں تھے۔ بس میری اور مدح کی قسمت۔“

”قسمت خراب نہیں ہوتی بیٹا۔“ آسیہ کے لمبے میں بے پناہ آزر دگی سٹ آئی تھی اور جانے کس خیال سے آنکھیں بھی غم ہو گئیں۔ اس مقام پر شاید وہ ٹوٹ رہی تھی۔

”ماما، آپ رورہی ہیں۔“ وہ تڑپ کر اس سے ٹپٹ گئی۔

”نہیں بیٹا، میں رو نہیں رہی۔“ آسیہ نے ہنسنے کا پورا پورا کر اسے خود سے الگ کیا پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”بہت زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔ تم مدح جیسی کیوں نہیں ہو۔ جیسے وہ ذرا اسی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اتنا ضبط کرتی ہو۔“

وہ حیران اور پریشان بھی ہو گئی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں ماما۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے آسیہ کے ہاتھ ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ہمیشہ سے آپ کو یہ شکایت رہی کہ مدح میرے جیسی کیوں نہیں ہے اور اب۔“

”ہاں اب احساس ہو رہا ہے کہ وہی ٹھیک ہے۔ وہ نہ ملے تو چھیننا جانتی ہے اور چھین جائے تو بزدلوں کی طرح چھپ کر آنسو نہیں بہاتی۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور جانے لگی کہ آسیہ روک کر بولی۔

”سنو بیٹا، میں اصل بات کہنا تو بھول گئی۔“

”جی۔“ وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”وہ کسی بھی طرح سہی علی جمائیکر کے ساتھ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے تم کیا چاہتی ہو، یہ رشتہ قائم رہے یا۔“ آسیہ قصداً بات اوجھڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کچھ نہیں چاہتی ماما، جو آپ کا دل چاہے کریں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

وہ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی غرض سے بی بی جان کے کمرے میں آئی تھی۔ لیکن آگے مہر النساء کو بی بی جان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اسے جانے کیا سو بھی جو اس پر جتا کر پوچھنے لگی۔

”بی بی جان، میرے پیارے کہاں ہیں؟“

مہر النساء بری طرح تھملا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”آپ کو پتا ہو گا انہی پیارے کہاں ہیں۔“

مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی طرح تھملائی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

”میں نہیں کیا ہوا؟“ اس نے بہت معصوم بن کر بی بی جان کو دیکھا پھر ان کے قریب بیٹھتی ہوئی ہنوز معصوم سے بولی۔

”میرا خیال ہے آٹنی مہر النساء کو میرا سا آنا اچھا نہیں لگا لیکن میں خود سے تو نہیں آئی۔ لائی گئی ہوں وہ۔“

”کدنیب کر کے۔“

”کیا کر کے؟“ بی بی جان سمجھی نہیں۔

”کدنیب، خچر چھوڑیں۔ یہ بتائیں آپ تو میرے آنے سے خوش ہیں نا۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے۔“ بی بی جان نے اس کی تھوڑی چھو کر کہا۔

بہت خوش ہے نا۔“ اس نے کھکھلا کر بی بی جان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور انہیں دائیں بائیں ہوتی بولی۔

”جی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اماں جی سے بھی زیادہ۔ اماں جی کو جانتی ہوں۔“

”بہتر رہی ہو۔“

”اماں جی، ہم سب اماں جی کہتے ہیں۔ جیسے آپ سب کی بی بی جان ہیں۔“ وہ ان سے الگ ہوتی ہوئی بی بی جان کے ساتھ چلی۔

”بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔“

”بی بی جان، ابابی سے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔“ اس نے فوراً حساب برابر کر دیا پھر ایک دم خیال آنے پر چہرہ مار کر بولی۔

”میں آپ سے پیار کا پوچھنے آئی تھی۔ کہاں ہیں باپا، میں نے صبح سے انہیں نہیں دیکھا۔“

”ام تباؤ گیا ہے۔“ بی بی جان نے اس کی قدر کہا تھا کہ اسے یاد آگیا۔

”ہاں۔ رات بتایا تھا انہوں نے کہ حج چھ بجے ان کی فلائٹ ہے اور یہاں سے تو وہ دو تین بجے ہی نکل گئے۔“

”علی جمائیکر نے آتے ہوئے اس کا آخری جملہ سن کر کہا۔“

”ام تباؤ گئے ہیں۔“ علی جمائیکر نے کچھ بے دھیانی میں کہا تو وہ جتا کر بولی۔

”مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہ وہ کب آئیں گے۔“

”وہ ذرا سا بس کر بی بی جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔“

”خا جازت دیجئے بی بی جان۔“

”ہے ہو۔“

”بی بی جان کے گھٹنے چھو کر سیدھا ہوا تو وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں چاہتے ہیں۔“

”اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

”ہاں اچھی نہیں۔“

”بی بی جان۔“

”تذوق ہے آپ میں اور صبا میں۔“ علی جمائیکر اس روز سے مسلسل ہر بات میں دونوں کا موازنہ کر رہا تھا۔

”بہتر ہے بغیر رہ نہیں سکا۔“

”بہتر کہہ سکتے ہیں جبکہ آپ صبا سے۔“ وہ اچانک کچھ یاد آنے پر ایک لحظہ کو خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔

”ہاں اس روز بی بی جان کہہ رہے تھے کہ انہوں نے صبا کو پہلی بار آپ کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی گائے گشتی کہیں ہے صبا، مجھے بتایا تک نہیں۔“

”بظلمت کچھ رہی ہیں۔“ علی جمائیکر نے یوں ہی کہہ دیا۔

”آپ نے اتنے یقین سے کہے کہہ کہ ہم دونوں میں بہت فرق ہے۔“ وہ جانے بی بی جان کی موجودگی فراموش نہ کیا تھا۔ ”نظر انداز کر رہی تھی جبکہ علی جمائیکر کو ان ہی کا خیال تھا جب ہی ٹاٹے ہوئے بولا۔

”ناگہجی۔“ پھر فوراً ”بی بی جان کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

”بہتر بی بی جان میں اچھی آتی ہوں۔“ وہ اس کے پیچھے جاگ آئی تھی علی علی رکیں۔“

”کیا بات ہے۔“ وہ جیسے بادل خواستہ رکھا تھا۔
 ”وہ آپ کراچی جا رہے ہیں ناں تو صبا سے بھی ملیں گے۔“
 ”نہیں۔“ اس نے فوراً ”نہیں کہہ کر ہونٹ بھیج لے۔“
 ”کیوں۔؟“

”اس کا جواب نہیں دے سکتا اور آپ میرے ذریعے سے اس سے کیا کہلوانا چاہتی ہیں۔ جو بھی کہتا ہے،
 کہیں۔ کیلی فون موجود ہے۔“ علی جہانگیر کو اب تک یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ گھر فون کیوں نہ
 کرتی۔
 ”فون تو میں کر لوں گی لیکن جو چیزیں میں اس سے منگوانا چاہتی ہوں۔ وہ فون کے ذریعے سے تو نہیں آئیں گے۔
 خیر چھوڑیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ خدا حافظ۔“ وہ یکدم بے نیازی سن گئی۔

”خدا حافظ۔“ وہ اندر ہی اندر جڑبڑہوتا ہوا ہر نکل گیا۔
 ”میلی فون موجود ہے۔“ وہ اپنے آپ بڑبڑاتے لگی۔ ”آخر سب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں گھر فون کر لوں۔
 جانا چاہتے ہیں کہ مہار کیا بہت رہی ہوگی۔ کوئی فرق نہیں پڑا ہو گا مہار۔ میں پہلے کون ساں کے پاس رہ
 تھی۔ البتہ صاف ضرور پریشان ہوگی اور وہ بھی اس خیال سے کہ کہیں میں نے اس کی سچ برفیضہ تو نہیں کر لیا۔“
 ”کر بھی سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ شام کی ہو کر سوچا تھا کہ رابعہ اس کے پاس آکر بولی۔
 ”سنو، کہیں باباجان بلا رہے ہیں۔“

”کیوں۔؟“
 ”یہ تو تم ان ہی سے پوچھنا۔ ویسے باباجان کے بلائے پر یہاں کیوں کا سوال کوئی نہیں اٹھاتا، بس فوراً پلڑ
 ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کہیں تم ان سے نہ پوچھ لو۔“ رابعہ نے بڑے مخلصانہ انداز میں
 سمجھایا۔

وہ کندھے اچکا کر چل پڑی اور اس بار باباجان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں سلام کیا تھا۔
 ”وعلیکم اسلام“ آؤ بیٹھو۔“ باباجان نے اپنے برابر اشارہ کیا۔
 ”شکریہ۔“ وہ آرام سے بیٹھ گئی۔
 ”خوش ہو، یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“ باباجان پتا نہیں اچھے موڈ میں تھے یا اس سے بات کرنے کے
 نہیں یہ لہانہ اوڑھنا پڑ رہا تھا۔

”تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ اس نے سیدھا سا جواب دیا۔
 ”اور اپنی ماں کو فون کیا تم نے۔“ باباجان نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”نہیں۔“

”کیوں۔ وہ پریشان نہیں ہوگی تمہارے لیے۔“
 ”ہو نا تو نہیں چاہیے کہونکہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ویسے آپ کو ان کی پریشانی سے۔“
 باباجان ایک دم کھانسنے لگے۔
 ”وہ سمجھ کر نظر انداز کرتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جب ان کی کھانسی رک گئی تب انہیں دیکھ کر بولے۔
 ”معاف کیجیے گا باباجان، آپ بہت بزدل ہیں۔“
 ”ہا ہا۔“ باباجان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی، سچ کہہ رہی ہوں۔ مہار سے بیٹی لینے کے لیے آپ نے طویل انتظار کیا اس نے
 براہ راست ان سے بات نہیں کر سکتے۔ کیوں یہ خدشہ تھا نا کہ مہار انکار کر دیں گی۔ تو وہ تو انہیں کرنا ہی تو
 بعد اصل جنگ لڑتی تھی آپ کو۔“ وہ انہیں بزدل ثابت کرنے کے لیے بڑی جرات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
 باباجان کی آنکھوں میں خیر سمٹ آیا تھا۔

اب تو آپ کبھی نہیں جیت سکتے کیونکہ آپ نے مہار کے ساتھ فائل کھلیا ہے۔ ویسے مجھے یہ کیم بڑا دلچسپ
 ہے اور میری دعائیں اپنے باپ دادا کے ساتھ ہیں۔“ آخر میں وہ بڑے محفوظ انداز میں مسکرائی تھی۔
 ”نہیں ابھی اسے باپ دادا کو صرف دیکھنا ہے، جانا نہیں۔ ہم بارنا نہیں جانتے۔“ آسہ سے بیٹی جھین لانا
 ہے بائیں ہاتھ کا ٹھیکر تھا لیکن ہم تمہارے باپ سے کیے وعدے سے مجبور تھے۔ جو میں چاہتا تھا کہ آسہ
 بی بی جینی جائے اور ہمیں آسہ کے سامنے دامن پھیلا نا گوارا نہیں تھا۔“ باباجان بڑے مضبوط سے چپا چکر بول
 تھے۔

باباجان کیوں نہیں چاہتے تھے۔ ”وہ اسی ایک بات میں انک گئی تھی۔
 ”حق ہے وہ۔“ باباجان نے شاہ سکندر کی حماقت سوچ کر سر جھٹکا۔ اسے بتانا غالبا ”ضروری نہیں سمجھا۔
 مہار ایام حق ہیں، ابھی احمق۔“ اسے سیسا بھانسی کا آسہ کو احمق کہنا یاد آ گیا تھا۔ جب ہی زیر لب بڑبڑاتی
 تھیں کہ چپک کر پوچھنے لگی۔

”آپ نے بتایا کہ میں بابا نے کیا حماقت کی۔“
 ”وہ ایک حماقت۔“ باباجان کو فوراً احساس ہو گیا۔ ”نہیں تم بچی ہو۔ اپنے باپ کے بارے میں تمہیں ایسی
 باتیں کرنی چاہیں۔ چلو جاؤ۔“
 ”آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا۔“ وہ سمجھی شاید وہ اصل کام بھول گئی تھی۔
 ”تمہارا حال و احوال پوچھنے کے لیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا اور ہاں آنا سے کو تمہیں رعبہ
 پر کالائے اور اپنے باپ کا فارم بھی دیکھو جا کر۔“
 ”قالے جائے گا ہونہ۔“ وہ آغا کا رویہ سوچ کر نخوت سے سر جھٹکتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

 بے بے کیف سے دن تھے۔ زندگی میں جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا سوائے انتظار کے۔
 رعبہ کے فون کا انتظار۔

نہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی تھی۔
 پاس انتظار کے اختتام پر کیونکہ اسے کسی اچھی بات کی امید نہیں تھی اس لیے اس کی طوالت غنیمت لگ
 گی۔ البتہ خدشات چہن نہیں لینے دیتے تھے۔ مدیجہ کا خیال آتا تو وہ گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی
 بنے شاہ پور والے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ شاید اسے کسی کال کو ٹھہری میں بند کر دیا ہے جب
 اس نے فون نہیں کیا۔ ورنہ وہ پہلی فرصت میں اسے فون کرتی اور ایک ایک کے بارے میں بتاتی، خصوصاً
 رعبہ کے بارے میں اور یہ ضرور ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس کا یہی جملہ سننے کو بڑی بے چین
 ہو کر بیٹھ کر اس کی سلامتی کی دعا میں مائل تھی۔

نہیں ہی بار اسے علی جہانگیر کا خیال بھی آتا تھا۔ لیکن یوں کہ اس کے وجود میں نفرت اور تنفر کی آگ سی
 ہو گئی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اس کے خیال کو فوراً ”جھٹک بھی نہیں پاتی تھی۔ اس کی طرح اس کا
 جیڑنا زور آور تھا۔ وہ لاکھ خود کو ادھر ادھر مصروف رکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی گرفت سے نہیں نکل
 نہ آخر اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔
 ”نہیں ہی کسی کا برا چاہنا سوچا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔“ کبھی آسہ بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ اب
 سوچیں اس بات پر انک جاتی تھیں۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو
 بتا تھا نہ ہوا۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

اسے اپنے خوابوں کی کرجیاں سمیٹتے ہوئے آتا تھا۔
 ”صبا!، نیل نے دوسری بار پکارا۔ تب اس نے چونک کر دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی نہیں ہوئی۔

”تو مت سوچا کرو۔“ نیل اس کے قریب چیر کر کھینچتے ہوئے بولے۔ ”سوچنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ تم نے تو سب کچھ چھو چھو کر چھوڑ دیا ہے پھر تمہیں کیا پریشانی ہے۔“

”مدحو! میں مدحو کے لیے پریشان ہوں۔“ وہ نظریں چرا لیتی ہوئی بولی۔
 ”صرف مدحو کے لیے۔“ نیل کے کنبے میں جانے کیا تھا کہ اس کا دل پوری قوت سے پھیل کر سماتا تھا۔

”سنو! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن جانتا ضرور ہوں۔ اس بات سے تمہاری نہیں کر سکتیں کہ بہت ساری باتیں تمہارے کنبے بتا جان لیتا ہوں۔“

اس نے بہت خائف ہو کر سر جھکا لیا کہ جانے وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔
 ”اور تمہاری زندگی کے نئے باب کو میں نے اس وقت جان لیا تھا جب تم نے اس کا عنوان تجویز کیا تھا۔“

رازداری برت لی تم نے صبا!۔ اب مت چھبواؤ۔ میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں دوست بھی ہوں۔ کیا ہر مسئلہ ہم نے دوستوں کی طرح شیر نہیں کیا۔“ نیل نے بہت دھیر ج سے اس کے راز میں شریک ہونے کا دعوہ کر لیا تھا۔

اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ کر نیل ایک دم خاموش ہو گئے پھر گردے تو قف سے اپنے آپ کہنے لگے۔

”میں علی جمالی سے چند مہینے پہلے ملا ہوں اس لیے زیادہ اسے نہیں جانتا اور جتنا جانتا اس کے بارے میں اب یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا پھر بھی میں تمہیں بتاؤں کہ پہلے ملاقات میں وہ مجھے بہت سچا اور کھرا لگا تھا۔ اس کے بعد جب رشتے کی بات چلی تب میں نے محسوس کیا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ جبکہ اس کے ہر انداز میں مجھے بناوٹ نظر آتی تھی۔ جسے میں نے یوں اہمیت نہیں دی کہ ایک تو علی جمالی کے ہر لحاظ سے مضبوط لگ رہا تھا یعنی ہر مخالفت کو زیر کرنے والا۔ دوسرے تم تمہاری محبت۔ مجھے یقین تھا کہ تمہاری ساری محبت بہت جلد عارفہ بیگم کو تمہارا کر دینا دے گی اور علی جمالی کو تو پتہ ہی ہے۔“ وہ خاموش ہو کر جیسے اپنی سوچنے لگے تھے۔

وہ ابھی بھی اس طرح سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن پوری جان سے ان کی طرف متوجہ تھی۔
 ”چنانچہ میں نے علی جمالی کو سمجھنے میں غلطی کی یا تمہارا؟ تمہیں کیا لگتا ہے؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے

میں کہہ کر اچانک اس سے پوچھا۔
 وہ کچھ بول سکی نہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی۔

”خاموش مت رہو صبا! مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو۔ اگر علی جمالی تمہارے ساتھ ایماندار ہوا تب بھی صرف اس لیے ٹھکرا دو گی کہ وہ شاہ جمالی کا بیٹا ہے۔ نہیں، ایسا مت کرنا۔ یہ اس کے ساتھ ہی تمہارے ساتھ بھی ظلم ہو گا کیونکہ تم کسی سے نفرت کر رہی نہیں سکتیں۔“

”کرتی ہوں، علی جمالی سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔
 ”بے وقوف!“ نیل کے ہونٹوں پر مہم س مسکراہٹ پھیل گئی اور بڑے سکون سے اس کے چپ انتظار کرنے لگے۔

کتنی دیر بعد وہ پتیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی تو نیل جیب سے رومال نکال کر اسے تھماتے ہوئے
 ”خود کو دھو کا مت دو۔ تم صرف چھو چھو کا خیال کر رہی ہو۔“

”ہاں، مجھے ماما کا خیال ہے۔ ماما کے لیے میں جان بھی دے دوں گی۔ علی جمالی کی محبت اور ایمان مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں وہی کروں گی جو ماما کہیں گی۔“ وہ رومال سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرتے ہو

تھے۔

تھے۔

تھے۔

تھے۔

پالے جا رہی تھی۔
 ”چھو روٹی کیوں ہو؟“

”مجھے اپنے آپ پر رونا آتا ہے۔ کیوں ہو صبح کے میں آگئی میں۔“
 ”چھو جاؤ پہلے منہ دھو کر آؤ اور بوا سے چائے کا بھی کھتی آنا۔ نیل کو اس کے بے تحاشا بتے آنسوؤں سے دکھ تھا۔ جب ہی اسے اٹھایا۔



”افی! نیل بھائی سب جانتے ہیں۔“ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچا پھر دوبارہ ان کے پاس بکے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔

”ابا کروں؟“ بوا سے چائے کا کمرہ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ فون کی تیل پر نیل وہیں سے پکار کر بولے۔
 ”ماما! کھوس کا فون ہے۔“

اس نے اگر ریسور اٹھالیا۔
 ”ہیلو۔“

”کیسی ہو صبا اور ماما کیسی ہیں؟“ دوسری طرف مدحو تھی۔
 ”مدحو! تم تھک تو ہو۔“ وہ ایک دم بے اختیار ہو گئی۔

”بالکل تھک، فرسٹ کلاس اور بہت خوش۔“ مدحو کھلتی ہوئی آواز میں شروع ہو گئی تھی۔
 ”میں بتا نہیں سکتی صبا! کہ مجھے یہاں آکر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ یہ تو جج کوئی اور سی دنیا ہے۔ کوئی غم، کوئی فکر

نہا اور وہ علی جمالی کے کتنا پیوند سم، کتنا اسرار اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ اس پوری حویلی میں سب میں نمایاں ہے۔“

مدحو کی آواز سن کر جتنی خوش ہوئی تھی اب اتنی ہی غم صم اور دل تھا کہ اندر کسی اتھاہ میں ڈوبا جا رہا تھا۔
 ”ما! نیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا۔

اس نے دھندلائی آنکھوں سے نیل کو دیکھا تو وہ اس کے ہاتھ سے ریسور لے کر اپنے کان سے لگا کر بولے۔
 ”پلو گون؟“

”میں ہوں مدحو۔ وہ صبا کہاں گئی۔“ ادھر سے مدحو نے ہنوا سی انداز میں پوچھا۔
 ”یسی ہو مدحو کہاں ہو؟“ نیل اس کا سوال نظر انداز کر گئے۔

”شاہ پور! اپنے باپ کے پاس۔ آپ نے تو میری بات نہیں مانی تھی نیل بھائی پھر بھی دیکھ لیں، میں پہنچ گئی۔“ مدحو نے کھلکھلا کر کہا۔

”اب تمہاری آرزو پوری ہو گئی۔ کسی بھی طرح سی۔“ نیل نے بادل خواستہ کہا تھا، جبکہ نظریں صباحت پر

ملے۔ جس کی آنکھیں روانی سے چھلک رہی تھیں۔
 ”آپ کو افسوس ہو رہا ہے؟“ ادھر سے مدحو نے ٹوکا۔

”اب تمہاری آرزو پوری ہوئے پر نہیں بلکہ غلط طریقے سے پوری ہوئے پر افسوس ہے۔“ انہوں نے تاسف

کے ساتھ بولے۔
 ”خیر طریقے کے لیے تو میں سرچ کر رہ گئی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ اس لیے مجھے کوئی افسوس نہیں۔ خیر

نہا! یہ بتائیں ماما کہاں ہیں۔“
 ”یامطلب! اتنے سے دنوں میں تم یہ بھی بھول گئیں کہ چھو پھو اس وقت کہاں ہوتی ہیں۔“ نیل کے جتانے

کے شرمندہ ہونے کے حیرت سے بولی۔

”کلینک واقعی ممالیکینک گئی ہیں؟“

”تم کب آری ہو؟“ نیل اس کی حیرت اور سوال نظر انداز کر گئے۔

”کبھی نہیں۔“ مدیہ نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو نیل ریسیور رکھ کر صباحت سے بولے۔

”تم اس کے لیے رو رہی ہو، جسے کسی بات کی پروا ہی نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اور شدت سے رونے لگی۔

”میرے خدا! مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ پھوپھو نے تم دونوں کی خاطر خود پر زندگی کے دروازے بند کر دیے۔ کاش وہ اپنے لیے سوچتیں۔“

نیل کو جانے اس کے رونے پر غصہ آیا تھا یا مدیہ پر۔ گو کہ بہت ضبط کے بعد بولے تھے پھر بھی ان کا لہجہ نکتہ تھا۔

”بند کرو رونا، ورنہ میں تمہیں بھی اسی وقت شاہ پور پہنواؤں گا۔“

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”کئی سوال نہ ہو۔“

”نیل کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل کر بولا۔

”اسلام علیکم۔“ نیل نے کہا۔ ”آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟“

”خالی ہے“ خلاقی طور پر ابھی میں اتنا دیا لیہ نہیں ہوا کہ نہیں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دوں۔“ نیل نے کہا

خلی ہی دل میں شکر کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی آپ؟“

”آپ سنا میں کیسے یاد کیا؟“

”جیسے گائیل صاحب! ہم ان رسمی باتوں سے آگے نکل آئے ہیں۔“ اس نے جڑبڑہو کر کہا تو ادھر

نیل نے سناٹہ بولے تھے۔

”ان کے لہجے میں طنز بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ نظر انداز کر گیا۔

”ہال میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کئی اعتراض نہیں۔“

”کل دن میں جو وقت آپ کو سوٹ کرے بلکہ میرٹ میں لنچ پر میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”خدا حافظ۔“ ادھر سے سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس نے گہری سانس کھینچی پھر ریسیور رکھ کر کل کا

ہونے لگا تھا۔

”ان اس نے آفس سے ہی میرٹ میں نیل ریزرو کوالی تھی اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ بھی گیا

کے بعد اسے کوفت میں مبتلا کرنے والا انتظار ابھی نہیں کرنا پڑا۔ یعنی نیل ٹھیک وقت پر آگئے تھے۔

”آپ نے میری دعوت قبول کی۔“ وہ بیٹھتی ہی بولا۔ پھر مینو پر نشان لگانے کے بعد پوری طرح نیل کی

توجہ ہو کر کھینے لگا۔

”ابھی صفائی میں کچھ نہیں کھنا۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس کتنے کو کچھ نہیں بلکہ میں بہت عجیب سا

لوں گا اپنے ادا کے اس اقدام کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے۔ جس سے میری پوزیشن اتنی اگورڈ ہو گئی

ہی منکوحہ میری آواز تک سننے کی روادار نہیں رہی۔“

”یاد رکھو غلط اور ناجائز تو نہیں ہے۔“ نیل نے قدرے چھپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔ ”میں انہیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔“

”آپ کو سکون سے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ اس کی ماکہ فیصلے کا۔ کیونکہ وہ ہر بات کا

نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”نہایت اگورڈ ہو گئی ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ صباحت کی کوئی بہن بھی ہے بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ جب مدحیہ سنے بتا دیا
بھی باباجان تو یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔“
”اور آپ“ نیل ایکدم پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔ ”آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔“
”فورا۔“

”کیوں۔ میرا مطلب ہے بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے دونوں میں۔“
”میں صرف ظاہر نہیں دیکھتا۔“ وہ یہ اختیار کر کے فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گیا تو ہم سب ہی مسکراہٹ کے
نیل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

~~*

وہ لاؤنج میں بیٹھی گود میں رکھی مونگ پھلی کھانے کے ساتھ گلاس وال سے الماس کو دیکھ رہی تھی۔ دروازہ
یوں کھل رہی تھی جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اور خود اسے شاہ سکندر کا انتظار تھا جن کی آن اسلام آباد سے آمد
تھی۔ جب ہی الماس کے اس طرح ٹھٹھنے پر وہ یہی سمجھی کہ وہ اپنے انتظار کو اس پر جتا کر باپ کے ساتھ اس
زیادہ اپنی وابستگی ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

اور وہ مدحیہ بھی۔ ایسے فطری مظاہر کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ نانا بابا کے گھر میں اس کی کسی کر
بنتی ہی اس لیے نہیں تھی کہ صباحت کو اس کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور محبت حاصل تھی اور اس کی وجہ صبا
کا ہر ایک پر جان چھڑکنا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس اپنے آپ متفر اور شاہی ہو جاتی تھی۔ ابھی
یہی حال تھا۔ الماس کے خلاف دل میں خواہ مخواہ ابال اٹھنے لگے تھے اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ مونگ پھلی
وائے منہ میں ڈالتی اور چٹکے الماس کی طرف اچھال رہی تھی۔ جیسے اس کا نشانہ لے رہی ہو۔ حالانکہ درمیان
گلاس وال بھی اور اس سے بھی کافی فاصلے پر الماس ٹھل رہی تھی۔

بڑے گیٹ سے جیپ اندر داخل ہوئی تو کچھ دیر کو اس کا دھیان الماس کی طرف سے ہٹ گیا لیکن جب
الماس کے قریب رکی اور اس میں سے اتر کر شاہ تیور نے جس انداز سے مسکرا کر اسے سلام کیا اس سے
جگہ اچھل پڑی۔

”او گاڈ! تو یہ معاملہ ہے؟“
شاہ تیور اسی طرف اُتر رہا تھا۔ وہ فوراً انجان بن کر اپنی مونگ پھلی میں مصروف ہو گئی لیکن جیسے ہی شاہ
اس کے قریب سے گزرنے لگا اس نے پکار لیا۔

”ایکسکیوز می کزن۔“
”جی، مجھ سے کچھ کہا۔“ شاہ تیور نے رک کر اسے دیکھا۔

”ہاں، وہ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ وہی ہیں نا جو مجھے میرن ہال سے اٹھا کر لائے تھے۔“ اس نے بظاہر
سادگی سے پوچھا۔

شاہ تیور نے ہنس کر ایک طرح سے اعتراف کیا تو وہ ہتھیلی پر مونگ پھلی رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے
ہوئی۔

”لیجیے، مونگ پھلی کھائیے۔“
”شکریہ۔“ شاہ تیور اس کی ہتھیلی سے چند دانے اٹھا کر آگے بڑھ گیا تو اس کے غائب ہونے تک وہ
پچھتے دیکھتی رہی پھر کسی خیال سے کندھے اچکا کر گردن سیدھی کی تو الماس کو سر پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“
”مہراں۔“ الماس نے اسے جواب دینے کے بجائے ملازمہ کو پکارا اور اس کے آنے پر ادھر ادھر بکھرے

کے چٹکوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”صاف کرو یہ سب۔ پتا نہیں کہاں سے آجاتے ہیں جاہل، جنگلی۔“
انہیں جاتے جاتے لائے جاتے ہیں۔“ وہ خلاف عادت ایکدم آپے سے باہر ہونے کے بجائے آرام سے کہتی
پڑھ کھڑی ہوئی۔ جس سے اس کی گود میں رکھی مونگ پھلی کا ربڑ پر پھیل گئی تھی اور وہ اس کی طرف اشارہ
الماس سے بولی۔

”تم کھالو، تھوڑی آٹا کو بھی دے دینا۔“
”ہنہ۔“ الماس نے نخوت سے سر جھینکا۔
”ہنہ! وہ اس کی نقل اتار کر ہنسی ہوئی اور آگئی۔

یادگار شاہ سکندر کے اسٹڈی روم سے نکلتی تھا اور وہ جب دل چاہتا درمیانی دروازہ کھول کر اسٹڈی میں چلی
کی۔ حالانکہ اسے مطالعے کا شوق کبھی بھی نہیں تھا اور ابھی بھی وہ ایسے کسی خیال سے نہیں آئی تھی۔ نہ
یادگار کوئی جستجو تھا کہ اپنے باپ کا انتخاب ہی دیکھ لے۔ اس کی جگہ اگر صباحت ہوتی تو ایک ہی دن میں
نگال چکی ہوتی لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ محض مہر النساء پر اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اس نے
رے میں آنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ اصل میں اس کے یہاں آنے کے دوسرے دن مہر النساء ہی نے اپنے طور
پر باور کرائے کی کوشش کی تھی کہ یہ شاہ سکندر کا خاص کمرہ ہے جس میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں
اس کے کچھ دیر بعد ہی وہ شاہ سکندر کے پیچھے اس کمرے میں نہ صرف داخل ہو گئی بلکہ درمیانی دروازے کا
ہی ان سے کھلوایا تھا۔ یہ کمرہ وہ جب بور ہوئی یا گھبرائے گی تو کتابوں میں اپنا دھیان پٹانے کی کوشش
کی اور شاہ سکندر ظاہر ہے منع نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پہلی بار آئی تھی ورنہ شاید پس و پیش ضرور
۔ بہر حال اس وقت وہ اپنے کمرے میں رکے بغیر سیدھی اسٹڈی میں آکر بیٹھی تو کچھ دیر الماس کے ساتھ
والی معمولی سی بھڑپ برائے آپ محظوظ ہوتی رہی پھر ایک دم اس کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ ”آسیہ“
صباحت وہ سب سے شگبی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی بھی اس کے لیے پریشان نہیں تھا۔ اس کے
اپنے معمولات میں یوں مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

مجھے کب کسی کی پروا ہے۔ بہت خوش ہوں میں یہاں آکر۔ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ جانے کس احساس
کو خود کو باور کراتے لگی تھی کہ اچانک ٹیوب لائٹ آن ہونے سے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ سکندر کو
فدا ”مسکرائی۔

”پکب آئے؟“
”نور ہوئی۔ نیچے باباجان کے پاس تھا۔“ شاہ سکندر ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے قریب آگئے پھر
ناگدھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”پاؤس تو نہیں ہو؟“
”میں اؤس کیوں ہوں گی۔“

”نما نما اور سسٹر کے لیے فون کیا تھا؟“

”نما سے بات نہیں ہوئی۔ صبا اور نیل بھائی ٹھیک ہیں اور پوچھ رہے تھے کہ میں کب واپس آؤں گی۔“

”کمری انداز میں بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا تھا۔“
”بے کیا کہا؟“

”نما نہیں۔ نما پوچھیں گی تو انہیں بھی میں یہی جواب دوں گی۔“
”نما کا مطلب ہے آپ یہاں خوش ہو سوری گئیں۔“

”ناؤ خوش ہوں پاپا! لیکن صبا یہاں آکر بھی خوش نہیں ہوگی۔ اسے ماما اور نیل بھائی کے علاوہ اور کوئی نظر
نہ دے ان سے بہت کچھ سوچ سکتی ہے۔ ڈرنی بھی بہت ہے ماما۔ اگر وہ یہاں آجاتی ناں تو رو رو کر

ہنس سلسلے میں؟“ اس نے سروانچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”شاہ علی جانگیر کے بارے میں۔“ وہ عاجزی سے نوک کر گویا ہوئی۔ ”اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں نیل بھائی پلینے میں یہ نام سننا نہیں چاہتی۔“ وہ عاجزی سے نوک کر گویا ہوئی۔ ”اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں

چھوڑ چکی ہوں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے کیا سوچا ہے۔“

”ہماری رخصتی کا سوچ رہی ہیں۔“ نیل نے اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اپنی طرف سے کہہ دیا۔

”میں نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔“ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں

ارے رہے۔“ نیل نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں

پھوپھو نے کیا سوچا ہے۔ البتہ تمہارا ارادہ معلوم ہو گیا ہے بہت خطرناک ہے۔ آخر ہونا دیکھ کی بہن۔“

”صرف ہنسیاں دیتی تھی۔ میں عمل کروں گی۔“

”تم ان صبا! تمہارے منہ سے ایسی باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ بیٹا! اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے اور تم تو

ایلی نہیں تھیں پھر اب تمہیں کیا ہوا ہے۔ اگر مرہات پھوپھو پر چھوڑ چکی ہو تب تو تمہیں ہر دو صورتوں کے

بار دنا چاہیے۔“ نیل نے دھیرج سے ٹوٹے ہوئے کہا۔

”خاموش رہی۔“

”میری ایک بات مانو گی۔“ قدرے توقف سے نیل نے پوچھا۔

”سروانچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔“

”میں چاہتا ہوں۔ تم ایک بار علی سے مل لو۔“

”اگر میں کیوں ملوں۔ اپنی پہچان کرانے کے لیے۔ اسے بتاؤں کہ میں صبا تھوں اور وہ جو اس کے پاس

ہے۔ وہ مدیحہ ہے۔ نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ مدحوہاں خوش ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اسے وہیں رہنے

دے۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”نیل اس کی باتوں میں الجھ گئے تھے۔ اس کے رونے پر بس چپ چاپ بکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہتھیلیوں سے

نرگزی ہوئی اٹھنے لگی تھی کہ انہوں نے ایک دم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بے اختیار بولے تھے۔

”سو محبت کرنے والے اپنی محبت کو چہروں سے نہیں ڈل سے پہچانتے ہیں۔ کیا کبھی میں نے تم پر مدیحہ کا گمان

جان بڑے دیتی۔“ وہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی۔

”شاید اس کے ذہن میں یہاں کا تصور خوفناک ہو گا۔“ شاہ سکندر نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ

سُنی کر کے ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”اس روز باباجان کہہ رہے تھے کہ ان کے لیے ماما سے بیٹی چھین لانا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ آپ سے

وعدے سے مجبور تھے کیونکہ آپ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے ریک کی طرف جاتے جاتے

کر شاہ سکندر کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

”پھر تو باباجان کے اس سارے پلان سے بھی آپ بے خبر رہے ہوں گے۔“

”وہ ہنوز سرسری انداز اختیار کیے ہوئی تھی، لیکن اس بار شاہ سکندر کچھ ٹھٹھک گئے اور جواب سے بچ

خاطر سامنے نیل پر ناگہم سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

”میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا! مراں سے کوٹ چائے لے آئے اور دیکھنا میں موبائل کہاں چھوڑ آیا ہوں۔

بیدروم میں ہو گا۔“

”وہ انہیں دیکھتی ہوئی کمرے سے نکلی تو پہلے مراں کو پکار کر چائے کا کما پھر ان کے بیدروم سے موبائل

واپس آئی تو انہیں سہمانے کے بجائے خودی نمبر ہنس کرنے لگی۔

”مجھے دو۔“ شاہ سکندر نے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔

”بیلو۔“

”کون، نیل بھائی؟“ وہ غیر محسوس طریقے سے شاہ سکندر کی طرف سے رخ موڑ کر بات کرنے لگی۔

”ماما کو لائیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔“

”شاہ سکندر اس کی پشت پر نظریں جمائے پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ سچ کر بولی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”کیوں کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔“

”ظاہر ہے جہاں ہوں وہیں سے بات کر رہی ہوں۔“

”نہ میں آپ کو نہیں ماما کو بتاؤں گی۔“

”مجھے بات ہے انتظار کریں۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر

موبائل شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ماما! شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

شاہ سکندر کچھ نہیں بولے۔ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنا نمبر ہنس کرنے لگے تو وہ مزید کچھ کہنے کا

ترک کر کے اس کمرے سے نکل آئی تھی۔

”مجھ سے کس بات ہے ناراض ہو؟“ نیل نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بہت سچا لہجے میں بولی۔

”میں ناراض نہیں ہوتی۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”تو پھر تمہاری اس خاموشی کو اور کیا نام دیا جائے، بولو۔“ نیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہلایا۔

”نہیں تو اپنی پریشانی تو بتاؤ۔“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔“

”پہلے کون کتنا تھا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟“ نیل فوراً اصل بات

آگئے۔

کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ جذبول کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں پھر آپ نے اپنے جذبہ اس کے نام کو لکھ دیا۔ بہت رسوا کرے گی وہ آپ کو۔“

”دھیرج، دھیرج۔“ وہ اس کا ہاتھ تھک کر زرا سا مسکرائے۔

”نہیں بھائی! میں، آپ کو رسوا نہیں ہونے دوں گی۔“

”تو اس راز کو اپنے اندر دفن کر دو۔“ ان کے لہجے میں اچانک آزدگی سمٹ آئی تھی پھر ایک دم خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔ ”تم نے مجھے کہاں الجھا دیا۔ اصل بات تو وہیں رہ گئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں وہ علی جمائیکہ کیا نہیں اس کی محبت پر بھروسہ نہیں ہے۔“

”محبت ہوئی تب تا۔ وہ تو باقاعدہ ایک پلان کے تحت آیا تھا۔“ وہ تاسف سے کہہ کر ان کی طرف سے رخ موڑ گئی۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ تو کیا اس کے بعد محبت نہیں ہو سکتی؟“

”نہیں، اور اگر ہو تب بھی میں یقین نہیں کروں گی کیونکہ اس کی بنیاد میں جھوٹ اور فریب شامل ہے اور اگر اسے بھی نظر انداز کروں تو بھی میں ماما کو تو دکھ نہیں دے سکتی۔ آپ نے دیکھا نہیں مدد کے جانے سے ماما کی ہو گئی ہیں۔ کمزور اور خاموش گو کہ ہم پر ظاہر نہیں کرتیں لیکن میں جانتی ہوں وہ اندر سے کتنی دکھی ہیں۔ کاش مدد میں احساس نام کی کوئی چیز ہوئی۔“ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اس کے حصے کی حسدیت بھی تم میں آگئی ہے۔“ نیل نے گہری سانس کھینچی۔

”پھر بھی آپ اس سے۔“

”چھوڑو یہ سب باتیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ پھر نیچے چلتے ہیں۔ پتا ہے ایک دو دن میں ٹھیک لپچا آنے والے ہوں گی شادی کی تاریخ رکھنے۔“

”اے میں۔ اشعر بھائی آگے کیا؟“ اس نے فوراً ان کی طرف گھوم کر پوچھا۔

”نہیں، میں تاریخ کو آ رہا ہے۔“

”تو کیا ان کے آتے ہی شادی ہوگی۔“

”ہاں، چلو باقی معلومات نیچے سے حاصل کرتے ہیں۔“

”میں منہ دھو لوں۔“ وہ آتش روم کی طرف بڑھ گئی۔

نیل اس کا دھیان بٹ جانے پر ہنسنے لگے تھے۔

شاہ سکندر باباجان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں شاہ جمائیکہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ باباجان نے انہیں مقصد سے بلایا ہے اور اس بار انہوں نے انجان بننے کی کوشش نہیں کی۔ سلام کر کے بیٹھنے ہی گئے۔

”باباجان! آخر صباحت کر لانے کا مسئلہ ہے تو اب آپ کو ڈائریکٹ آسیہ سے بات کرنی چاہیے۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے۔ ہم اس کی مرضی پر چلیں۔“ باباجان نے اپنی ناگواری چھپا کر کہا۔

”مجبوری ہے۔ چنانچہ لے گا۔“

”نہیں، نہیں سکندر! مجبوری ہمارے ساتھ نہیں، اس کے ساتھ ہے۔ ایک بیٹی ہم اس کی لے کر بیٹھی ہے جو اس کے پاس ہے۔ وہ بھی اس کی نہیں۔ کیوں جمائیکہ ہم غلط کہہ رہے ہیں؟“ باباجان کو شاہ سکندر کا بچہ ڈالنے والا انداز قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔

”نہیں باباجان! صباحت، علی کی منکوحہ ہے۔“ شاہ جمائیکہ نے فوراً ان کی تائید کی۔

”اس سے پہلے وہ میری بیٹی ہے۔“ شاہ سکندر بھی فوراً ”بولے تھے۔“ مدحہ کو جس طرح آپ لے کر

جی جگہ کوئی اور ایسی جرات کرتا تو میں اسے شوٹ کر دیتا۔ اس حویلی میں بیٹیاں اس طرح نہیں بیاہی گئیں ہیں لانے کے لیے کیا آپ سوالی بن کر نہیں گئے پھر میری بیٹی کے لیے سوال کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے؟“

”ہم صرف سوال نہیں، تمہارے سامنے بورا دامن پھیلا دیتے ہیں۔“ باباجان ان کے بدلے ہرگز نہیں۔

”اے اندر ہی اندر تھک گئے تھے لیکن معاملہ فہم تھے اس لیے فوراً دامن پھیلا دیا تھا۔“

”برے سامنے نہیں باباجان! ان کی ماں کے سامنے۔ کیونکہ میں بہت پہلے بچپن کے تمام اختیارات ان کی ہونچکا ہوں۔“ شاہ سکندر نے ناراض لہجے میں کہا تو باباجان ناگواری سے بولے۔

”نہیں ہو سکتا۔“

”فہم صباحت کو لانے کا خیال بھی چھوڑ دیجیے۔“

”پتاور بھی ناممکن ہے۔ ہم شاہوں کی بیٹیاں عیروں میں نہیں بیاہی جاتیں۔“

”فریقے سے بیاہی جاتی ہیں اور طریقے سے لائی جاتی ہیں، اس طرح گن پوائنٹ پر اٹھا کر نہیں لائی جاتیں۔“

”نک اس سارے معاملے میں خاموش رہا اور جہاں ضرورت پڑی وہاں آپ کا ساتھ بھی دیا تو صرف اس میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا تھا کہ میری بیٹی کو خاندان کا نام دینے کے ساتھ آپ نے اس کے بہتر ان کی ضمانت دی تھی۔“

”ہم ابھی بھی ضمانت دے رہے ہیں۔“ باباجان فوراً ”بولے تھے۔“

”لیکن اس کے ساتھ آپ میری غیرت سے بھی کھیل رہے ہیں اور یہ میں برواشت نہیں کر سکتا۔ مدحہ اور ہر میری بیٹیاں ہیں۔ خواہ میاں رہیں یا آسیہ کے پاس، آپ کو ان کے لیے اسی طرح سوچنا ہو گا جیسے الماس، اور دوسری بچیوں کے لیے سوچتے ہیں۔ صباحت کو بیاہ کر لانا ہے تو خود چل کر جائیں۔ اگر اس میں آپ اپنی محسوس کرتے ہیں تو جمائیکہ کو بھیج دیں۔ میرے وقت میں بھی تو آپ نے انہیں ہی بھیجا تھا لیکن اب بلاش نہیں ہوئی۔“ شاہ سکندر نے جانے بیٹوں کی محبت میں یا اپنی غیرت پر چوٹ پڑنے سے سارے لحاظ لیے تھے۔

”سکندر! باباجان کا ضبط جواب دے گیا۔“ تم حد سے بدھ رہے ہو۔ سن رہے ہو جمائیکہ! ہمیں اس دو کوئی لڑائی کے سامنے جھکا نا چاہتا ہے۔“

”بھل آپ کی سوچ ہے باباجان! اور آسیہ سے بغض۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ لینے کے لیے بلانا ہوتا ہے۔ صباحت کی جگہ اگر الماس ہو تو کیا آپ مہر النساء سے بات نہیں کریں گے؟“ شاہ سکندر رنج اے تھے۔

”میں۔“ باباجان ہٹ دھرمی سے گویا ہوئے۔ ”مہر النساء سے کیوں بات کریں گے۔ ہم اپنے طور پر جو فیصلہ کرتے ہیں اس میں کسی دوسرے فرد کو شامل نہیں کرتے، پوچھ لو جمائیکہ۔ علی کے معاملے میں میں نے اس کی بیٹی کی بیوی سے اور جو کہا انہوں نے وہی کیا۔“

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشمگین نظروں سے انہیں گھورتے

پروا نہیں تھی بلکہ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بابا جان کی ضد سے بھی واقف تھے اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا وہ بھولے نہیں تھے لیکن وہی بات کہ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نظر انداز کریتا ہے لیکن جب اولاد کی بات آتی ہے تو مصلحت بھی کوئی زیادتی برداشت نہیں ہوتی۔

اور شاہ سکندر اس سارے معاملے میں اگر خاموش رہے تھے تو اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو بابا جان کی ضمانت، دوسرے علی جمائیکر کی ہر لحاظ سے انریکٹو سٹائن کی تیسری بڑی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے صاحت کو دیکھا نہیں تھا تو اس کے لیے ان کے اندر وہ محبت نہیں تھی جو ساتھ رہنے والی اولاد سے ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ آیا وہ لڑکی شاہ پور آتا بھی چاہے کی یا نہیں۔ گویا اس کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر مدیہ کی جگہ صاحت ہی آجاتی تب بھی شاید وہ اسے اہمیت نہ دیتے، خواہ وہ کتنا اوپر اٹھ جائے۔ وہ یہ سوچ کر اور اطمینان سے رہتے کہ بابا جان نے اس کے ساتھ اچھا کیا۔ خاندان کا نام اور علی جیہ سرفراز سے بڑھ کر اور اطمینان سے رہتے کہ بابا جان نے اس کے ساتھ اچھا کیا۔ خاندان کا نام اور علی جیہ سرفراز سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ کیونکہ درمیان میں مدیہ آگئی تھی جس کے وجود سے ہی وہ لاعلم تھے۔ اس نے اچانک ان کے اندر سولی محبت کو یوں بیدار کیا تھا کہ اس کے ساتھ ان کی غیرت بھی جوش میں آگئی تھی اور اب وہ صرف باپ بزرگ کو سوچ رہے تھے تو انہیں بابا جان کا طرز عمل انتہائی نامناسب اور گھنایا لگ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ صاحت کو لانے کے لیے بابا جان پھر کوئی ایسا پلان بنائیں جس سے بیٹیوں کی نظروں میں وہ بھی بد وقعت ہو کر رہ جائیں۔

گوکہ مدیہ نے ابھی تک ان پر کچھ جنایاں نہیں کیں تھیں لیکن وہ اس خیال سے بھی پریشان ہو جاتے تھے کہ کسی دن وہ ان کے مقابل کھڑی ہوگئی تو وہ اسے کیا جواب دیں گے۔ ان کی زندگی میں یہ دو سرا شاید تیسرا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جہاں اگلے لمحے کے تصور سے ان کا دل بیٹھے لگے تھا اور ذہن بری طرح منتشر ہو جاتا۔

پہلا مرحلہ وہ تھا جب جگہ عرو میں موہو پکارتے ہوئے وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آگئے تھے۔ دوسری بار جب آسہ کے ہاتھ میں لٹافہ چھما رہا تھا۔ اور اب اولاد کے لیے بھی بابا جان ان سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے۔ ”ہرگز نہیں۔“ مدیہ اور صاحت لاورث نہیں ہیں۔ میں ان کا باپ ہلکتے مندر شاہ سکندر رجات میری اپنی ذاتی حیثیت ہے، شناخت ہے اور میں اپنی شناخت کے ساتھ اپنی بیٹیاں رخصت کروں گا۔“ وہ بہت مضبوط ارادے کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے ساتھ مدیہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”آپ یہاں ہیں بابا! میں آپ کو نیچے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“

”خیریت؟“ انہوں نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں بہت بور ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بند۔ کھانے کے وقت نکلے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھ سے کتنا ہے میں یا۔“

”نہیں بیٹا! آپ سے کیوں کتنا میں گم۔ بس سب کا اپنا اپنا مزاج ہے اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ آپ کی ہل کیا اہمیتو فیروز تھیں؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں پھر بھی زندگی مٹھ کر تھی۔ صبح ناشتے کے ساتھ ساتھ ماما کیچر کھا کر کالج جانے کی تیاری تھی صابلی جلدی جلدی کا شور مچاتی رہتی۔ مجھے اسے تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا ہے اور ٹیبل بھائی کو بھی۔ اور عرب ساتھ تو میری بیٹی ہی نہیں ہے۔ بہت لڑائی ہوتی ہے ہماری لیکن ہم ناراض نہیں ہوتے۔ بس لڑتے ہیں اور اب لڑتے بھی نہیں ہیں کیونکہ میں وہاں نہیں رہتی۔ آپ کو پتا ہے میں اسلام آباد میں ہوتی ہوں۔ اپنے خلیل کے پاس۔“

”اس سے شاید سب یاد آ رہے تھے جو وہ شوق سے بتاتے بیٹھ گئی تھی۔“

”کیوں ان کے پاس کیوں؟“ شاہ سکندر نے پوچھا تو وہ اصل بات کول کر گئی۔

”مجھے اسلام آباد جانے کا شوق تھا۔ وہاں گئی تو پھر آنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ ماما سے ضد کر کے وہیں رہ گئی۔ میں ایڈمیشن بھی لے لیا۔ اف میرا تو بہت نقصان ہو گیا۔ ایک ہفتے کی چھٹی تھی اور یہاں ایک مہینہ سے ایکدم اپنا کالج یاد آ گیا۔“

”کون کون ہے آپ کے خلیل ماماؤں کے گھر میں؟“ انہوں نے ایک خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”س ماماؤں جی اور ماما جی ہیں۔ سمعیہ جی کی شادی ہو گئی اور اشعر بھائی لندن میں ہیں۔ شاید آنے والے ماماؤں ہو سکتا ہے وہیں شادی کر لیں جیسے۔“ وہ روائی میں بتاتی ہوئی ایکدم خاموش ہو گئی۔

”صاحت! وہ بھی آپ کی طرح ہے؟“ شاہ سکندر چاہتے تھے وہ یوں ہی بولتی رہے، جب ہی اس کے خاموش ہونے کا سوال کر رہے تھے۔

”نہیں، وہ بہت ڈرپوک ہے۔ شادی والے روز اگر میری جگہ وہ ماما پر بند و قیں تنی ہوئی دیکھ لیتی تو اس کا تو وہیں ہلی ہو جاتا۔“

”صاحت کی تعریف میں ہمیشہ سب سے پہلے اس کی بڑی کا ذکر کرتی تھی۔“

”شاہ سکندر اندر ہی اندر جڑ بڑھنے اور صاحت کے بارے میں مزید جاننے کا خیال چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”لوکے بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جاؤ، مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“

”ہلے میرا مسئلہ تو حل کریں۔“

”بابا! کیا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”بہت۔“ اس نے بوری شکل بنا کر کہا۔

”بیٹا!۔“ آپ کا کیا دل چاہتا ہے پڑھنا چاہتی ہو تو اسلام آباد لے چلوں یا نئے سرے سے کہیں اور۔“

”نہیں، مجھے نہیں پڑھنا۔“ وہ بیزار سی بولی۔

”ابھی بیٹا! کم از کم گریجویشن تو کر لینا چاہیے آپ کو۔“

”اگر فائدہ نہیں۔“ جتنی ناخ میری اب ہے، اگر گریجویشن کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی۔ کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔

”مگر کیا ہاتھ آئے گی؟ کیا کروں گی ڈگری لے کر۔“ نوکری تو نہیں کرنی بیٹھے۔“

”یہ دن میں آیا بولے جارہی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شاہ سکندر کا ذہن کہیں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا تھا۔

”میرے خواب ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے میں چھوڑ سکتی۔“

~~*

کرمیں سونیا کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے لیکن خوشیوں میں بے ساختگی نہیں تھی بلکہ جیسے ہر بات منوج کر اور سنبھل کر ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھیں تو ایک لائن سے رنے لڑائے گانے شروع ہوئے۔ درمیان میں نہ کوئی چھینا چھینتی نہ ہنسی مذاق۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کی شادی نے جو مسائل دیکھے تھے گوکہ اس کی لپیٹ میں سب نہیں آئے تھے لیکن اپنے اپنے طور پر سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ یوں ماما پر اس کے تمام بیٹھے بیٹھیاں جان چھڑکتے تھے پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی پریشانی کو وہ محسوس نہ کریں۔

”آسیہ ظاہر نہیں کرتی تھی اور بھرپور طریقے سے ہر کام میں حصہ لے رہی تھی اور اسی کی طرح صاحت بھی کس کر رہی تھی کہ وہ اس خوبی پر اپنے ساتھ ہونے والی ٹریڈی کا سایا بھی نہ پڑنے دے۔ جب ہی کچھ زیادہ ہی دیکھ کا مظاہرہ کر رہی تھی پھر بھی سب بہت محتاط تھے۔

”یونار رخصت ہو کر اسلام آباد چلی گئی تو اگلے دن باقی سب گھر والے ویسے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔

”مے گھر ایکدم خالی ہو گیا۔ صرف اماں جی، آسیہ اور وہ تھی۔ اماں جی کی جعبیت خراب تھی۔ اس لیے آسیہ سے اپنا جانا ملتی کرنا پڑا، ورنہ پروگرام تو ان کا بھی تھا اور آسیہ نے اس سے تو بہت کما کہ وہ بھی چلی جائے لیکن

ہل میں آنے والے ہیں۔“

ماخذ احافظ۔“

”وہ ریسوررکھ کر پلٹی تھی کہ پھر تیل بج اٹھی۔“

”اس بار اس نے کچھ بزاری سے ریسور اٹھایا تھا۔“

”یہ پور جا رہا ہوں۔ مدد کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔“ دوسری طرف علی تھا۔ بغیر سلام دعا کے ہی بولا اور اس کا دماغ جھنجھٹا گیا۔ حسب سابق ریسور پختہ لگی تھی کہ اچانک کسی خیال کے تحت رک گئی کچھ نہیں اور اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔

”بمباحثہ! قدرے توقف سے دھر سے وہ پکار کر کہنے لگا۔ ”خفگی ناراضگی بجاہے لیکن پلینیری بھی تو کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو۔“

”بے ہوش پھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔“

”اگر تم پر اس سلسلے میں کوئی باندی لگائی گئی ہے تو میں آجاتا ہوں۔ اب تو آسکتا ہوں اپنی منکوحہ سے ملنے پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا۔“ آخر میں اس نے اس کی خاموشی کی سی گئی۔

”میں اس نے ریسور شیخ یا اور اس کی دیدہ دلیری پر تلملاتی ہوئی دوبارہ اماں جی کے پاس جا بیٹھی تھی اور کچھ جس انداز سے احمد کے بارے میں سوچ رہی تھی اب اس کی جگہ شاہ علی جمائیم آ گیا تھا۔“

”نہرے روز سب لوگ اسلام آباد سے واپس آ گئے، کیونکہ سب کام کان والے تھے۔ بس ایک وہ اور ثوبیہ باقی۔ ثوبیہ کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ میڈیکل میں جانے کا تھا اور رزلٹ تو اس کا بھی مل گیا تھا لیکن فور تھ ایئر میں ایڈمیشن شروع ہو چکے تھے اور اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آسیہ نے

”بارے میں کیا سوچا ہے۔ یعنی اس کی پڑھائی کے متعلق اور وہ خود چاہتی تھی کہ دوبارہ سے کان لگ جاتا شروع۔ لیکن آسیہ سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں آسیہ کا مزاج کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں

”میں بہت مہربان اور کبھی ذرا سی بات پر ہستے سے اکھڑ جاتی۔ اس لیے وہ ضرورت کے علاوہ ضروری بات بھی نہ کرنے لگی تھی اور گو کہ ایڈمیشن بہت ضروری تھا پھر بھی وہ ڈرتی تھی اور بہت ہمت کرنے پر بھی آسیہ کہہ سکی اور نیل کے پاس چلی آئی۔“

”بھائی! بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میں بی اے کروں۔“ اس نے نیل کے لئے کاکپ رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً ”تائید کرتے ہوئے بولے۔“

”ما تمہیں پڑھنا چاہیے۔“

”آپ ماما سے کہیں نا۔“

”ماہ منع کر رہی ہیں کیا؟“

”ماہ وہ میرا مطلب ہے، میں نے ان سے بات نہیں کی۔ مجھے ڈر لگتا ہے نیل بھائی! شاید وہ منع کر دیں

”میں نے کچھ کچھ کرنا چند شہ ظاہر کیا تو نیل مجھے کر بولے۔“

”خیال ہے وہ پڑھنے سے نہیں روکیں گی۔ خبر میں بات کروں گا۔ ایڈمیشن تو ہو رہے ہیں۔ تم لیٹ نہیں

”بلکہ خیال کیوں نہیں آیا تمہیں۔“

”لیکن ماما سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتی

”نہرے ریسور کر بولی۔“

”اؤف! تمہیں ان سے شامی نہیں ہونا چاہیے۔ جانتی تو ہو وہ کتنی پریشان ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں مدد

”بے نیل نے دھیرج سے اسے ٹوک کر کہا تو وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔“

اس کا دل کچھ اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اماں جی کا ہانا کر کے رک گئی کیونکہ آسیہ سارا دن تو گھر میں نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت بھی آسیہ کلینک جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے گیٹ بند کر کے واپس اماں جی کے پاس آ کر بیٹھی اور ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہنے لگی۔

”۲۴ گھنٹہ کی آخر نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا ماما جی نے، اور سونیا آپلی تو بہت دور ہی تھیں۔ انہیں اگر نہیں ہوتا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ خواہ آس دلائی۔“

”ہاں! اماں جی نے ہاں کی صورت لمبی سانس کھینچی۔ ”پتا نہیں پردیس کی مٹی کیسی ہے۔ سارے رشتے بھرا

”دیتی ہے۔“

”۲۴ گھنٹہ ایسے تو نہیں تھے اماں جی! وہ تو سب سے بہت محبت کرتے تھے اور ذمہ دار بھی بہت تھے۔“ وہ ان دنوں میں کھو کر بولی جب احمد یہاں تھا۔

اماں جی پر غصہ کی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی بات پر بس ہوں کر کے رہ گئیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی پھر آہستگی سے ان کے پاس سے اٹھ کر رز آمدے میں آ بیٹھی اور احمد ہی کو یاد کرتے ہوئے وہ جانے کیا کہ

”سوچنے لگی تھی۔“

”اگر احمد بھائی وہاں شادی نہ کرتے تو شاید یہ حالات نہ ہوتے۔ اس کے برعکس جیسے اشعر بھائی اور ان کی ایک

ساتھ منگنی ہوئی تھی تو اب شادی بھی دونوں کی ساتھ ہی ہوتی۔ سونیا جی رخصت ہوتیں اور مدح و مہمیں ہوتیں

”دس بنی ہوئی۔ بہت غلط کیا احمد بھائی نے۔ انہیں شاید مدح و محبت بھی ہی نہیں۔ محض دل لگی با۔“ فون

”تیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں اور اماں جی کی نیند خراب ہونے کے خیال سے اس نے بھاگ کر ریم

”اٹھایا تھا۔“

”ہیلو۔“

”کون مدحو! کیسی ہو؟“ دوسری طرف وہی تھا جسے ابھی وہ یاد کر رہی تھی اور اس کے منہ سے مدح و تحسین

”بولی۔“

”جی نہیں میں صبا ہوں اور اتفاق سے ابھی آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

”اچھا! دھروہ خوش دلی ہے نا۔“ ”پھر یہ نہیں کہو گی۔ بڑی عمر ہے تمہاری۔“

”کیوں نہیں۔ اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔“

”بہشت بے وقف چلو ذرا امی کو بلاؤ۔“ ”اگر نہ پیار بھری سرزفش کے ساتھ کہا۔“

”مامی جی نہیں ہیں بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ سب اسلام آباد گئے ہیں ویسے میں۔ آپ کیوں نہیں آئے؟“

اس نے تار کر پوچھا۔

”بس یار! پھٹی نہیں ملی اور سنو ہم کیوں نہیں گئیں؟“

”اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ماما اور میں نہیں گئے۔“

”اور مدحو! اچھا ہاں وہ تو وہیں ہوتی ہے نا۔“ ”اگر نہ ایک مدھاد آنے پر کہا تھا۔“

”میں مدحو شاہ پور میں ہے۔ شاہ سکندر کے پاس۔“

”کیوں میرا مطلب ہے وہاں کیوں چلی گئی۔ پھوپھو نے جانے دیا۔“

”جی! اس نے اختصار سے کام لیا۔“

”یقیناً بہت ضد کی ہوگی اس نے ضدی تو وہ شروع سے ہے۔ آئے گی کب؟“ ”اگر نہ مدھہ کے اس اند

پر تاسف کا اظہار کر کے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کر دی۔“

”پتا نہیں۔“

”اچھا میں پھر فون کروں گا۔ کب تک آئیں گے سب لوگ؟“

”آپ تو کہتے تھے نیل بھائی کہ مدحو اس گھر کے علاوہ اور کہیں بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔“

”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔“ نیل فوراً بولے۔

”بس کریں بھائی! اتنے دن تو ہو گئے ہیں۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔ کبھی نہیں آؤں گی۔“

”سنی رہو اس کی باتیں۔ وہ نارمل نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یہی سب کرتی رہی ہے کہ کسی نہ کسی سبب سے اس کے لیے پریشان رہیں۔ جس دن اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سب اس سے بے پروا ہو گئے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”نیل نے کہا تو اسے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔“

”ہائے میں نیل بھائی! اس سے تو وہ اور چڑ جاتی ہے۔“

”کب تک چڑے گی۔“

”بس جانے دیں۔ یہ بتائیں۔ آپ مماسے کب بات کریں گے میرے کالج جانے کے سلسلے میں۔“ وہ پورا بات برائی۔

”مجھے ہی اور تم بس تیار رہو۔ مجھے یقین ہے پھوپھو منع نہیں کریں گی۔ بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہوں گی کہ میں نے پہلے کیوں نہیں یاد دلایا۔“

نیل نے بات کے اختتام پر خالی کپاٹھا کر اسے یوں تھمایا جیسے اب تم جاؤ یہاں سے اور وہ بھی اٹھ کھڑی تھی پھر دروازے کے قریب رگ کر پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی! آپ مدحو کے لیے سنجیدہ ہیں نا؟“

نیل نے بہت بری طرح اسے گھورا تھا۔

وہ ہنسی ہوئی باہر نکل گئی۔

~~*

وہ بی بی جان کو ڈھونڈتی ہوئی پہلے ان کے کمرے میں، پھر ہال میں دیکھنے کے بعد باباجان کے خاص کمرے طرف آئی تھی لیکن دروازے کے پاس ہی رک گئی کیونکہ اندر سے باباجان کے تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

نے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر سوچا پھر اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے واپسی پلٹی تھی کہ باباجان کی آواز پر پھر آئی اور بہت آہستہ سے دروازے کے قریب ہو کر سننے لگی۔

”سکندر کا دماغ خراب ہے۔ کہتا ہے، ہم اس ڈاکٹرنی کے پاس جائیں اور اس پر بھی اس کی مرضی کو دینا پانہ دے۔ ہونہ۔“

”بہت خیال کر لیا ہم نے سکندر کا۔ اب نہیں کریں گے۔“ باباجان کی آواز وقفہ وقفے سے آ رہی تھی۔

غصے میں اوھر سے اوھر نکل رہے تھے اور جانے اندر اور کون کون تھا۔

”تم پہلی فرصت میں اس عورت کو پیغام بھیجو کہ مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو فوراً“ علی کی منکوحہ اس کے پتہ پر آئے۔

”میرے خدا!“ اس نے بہت دہل کر دروازے کو دیکھا تھا۔

”اور سنو! مدیحہ پر کڑی نظر رکھو۔ وہ ضرور اپنی ماں کو فون کرتی ہوگی۔ ہم علی کا مسئلہ حل کر لیں پھر بارے میں بھی سوچتے ہیں۔“

وہ اسی طرح سہمی ہوئی اٹل قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی تھی پھر اب داری کے موڑ پر تیرکی ہوئی علی جمائیکر سے ٹکرائی اور اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹ لیا۔

”کیا بات ہے؟“ علی جمائیکر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ علی جمائیکر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ علی جمائیکر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ علی جمائیکر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

لے سے قاصر تھی۔ نفی میں سر ہلایا پھر علی جمائیکر کا بازو مضبوطی سے تھام کر کھینچتی ہوئی لاؤنچ بنی اور اسے صوفے پر دھکیل کر یوں دیکھنے لگی جیسے آیا وہ قابل اعتبار ہے کہ نہیں۔

نے کچھ کہا ہے۔ باباجان نے۔ ”علی جمائیکر نے پوچھا پھر خود ہی قیاس کیا۔“

نہیں۔ وہ میں بارہ دردی کی طرف نکل گئی تھی۔ ڈر سی گئی۔ ”اسے فوری طور پر جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔“

”کون تھا وہاں؟“

”اُدھو جو گھنا سنا پیڑ ہے نا اس میں جھانک رہا تھا۔“ وہ اب اپنی بات پر قائم رہنے کے لیے پوری کمائی بنا رہی تھی۔

”مجھ کو کہا تو میں اس نے تمہیں؟“ علی جمائیکر نے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھا۔

”وہ نظریں چرا کر سیدھی ہو گئی پھر ایک دم خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ ”آپ کراچی سے آ رہے ہیں؟“

”اور صبح واپس بھی جانا ہے۔ سکندر رچھا نہیں ہیں یا نہیں نور پر اٹھ گئے ہیں۔“

”ہاں۔“ کچھ دیر پہلے میں نے انہیں اپنے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ وہیں چلے گئے۔

باباجان سے مل لوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے جاتے رک کر بولا۔ ”میں نے صباحت سے پوچھا تھا کہ

لیے کوئی پیغام ہو تو۔“

پکی ملاقات ہوئی اس سے؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے فون کیا تھا۔ البتہ نیل بھائی سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں

بڑا ہوں اور ان کم لوگوں میں ایک فرد کا اضافہ نیل بھائی۔ ہی ازوری جینٹلس۔“ اس نے کہا تو وہ بے

عکاسہ اچکا کر بولی۔

بی جگہ اگر صبا ہوئی تو نیل بھائی کی تعریف پر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ اس کے ”اب جائیں ملیں اپنے

سے اور دیکھیں انہوں نے آپ کی شادی کی دوسری اور آخری قسط کا پلاٹ تیار کیا کہ نہیں۔“

ہاں دوسری بات پر جڑ بڑھ کر آگے بڑھ گیا۔

”اچھے خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی بار کو جیت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

ایسا تو کو سوچتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا تھا۔

رب تو میں ماما کو فون کر کے خبردار بھی نہیں کر سکتی۔ کتنی مجبور ہوں گی ماما۔ اگر انہوں نے میری وجہ سے

نابا تو پھر وہ بھی ہم دونوں کو نہیں دیکھ سکیں گی۔ ان لوگوں کو مجھ سے اور صبا سے کوئی محبت نہیں ہے بلکہ یہ

سے ہمارا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں مٹانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔“

غائب سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر جا کر سوئی تھی پھر بھی صبح بہت جلدی اٹھ گئی اور یہ یقیناً ”اس

کا فون تھا جس نے اسے گہری نیند سوئے نہیں دیا تھا۔ دل و دماغ دونوں بوجھل ہوئے تھے۔ منہ پر پانی

پینے کا روہا تھا۔ ہی سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی دوبارہ کمرے میں آئی اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی سے پردے

کے آگے پلان پر بات کر رہے ہوں۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر دوپٹہ اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیڑھیاں

”ہاں لیکن آج تو میرا جانا کفرم نہیں تھا۔ دوپہر میں البتہ کراچی جاؤں گا۔ علی تم بھی میرے ساتھ ہی رہنا۔“
اسے بتا کر وہ علی سے مخاطب ہوئے۔
”جیسے آپ کہیں۔ انہیں بھی لے چلتے ہیں۔ یہ یہاں ڈرتی ہیں۔ کل شاید کوئی بھوت وغیرہ دیکھ لیا تھا۔“
جہانگیر نے شرارت سے اسے دیکھا تو وہ بے ساختہ بولی۔
”وہ تو میں ابھی بھی دیکھ رہی ہوں۔“

شاہ سکندر نے ہلکا سا تھوہ لگایا پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر چلتے ہوئے بولے۔
”میری بیٹی بہت بھاری ہے۔“
”وہ کیا آپ کراچی جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ وہ فوراً اصل بات کی طرف آئی۔
”آج نہیں بیٹا! چھر کسی دن۔“ شاہ سکندر نے بہت نرمی سے آئندہ پر ٹالا۔
”نہیں بیٹا! میں آج ہی جاؤں گی۔ مجھے۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ورنہ کہنے جاری تھی کہ مہماست یا دت

یہ۔
”صلی! تمہاری پرورش کا کیا ہوا؟“
شاہ سکندر ان سنی کر کے علی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ سمجھ گئی کہ اسے لے جانا نہیں چاہتے اور وجہ تو وہ جان ہی گئی تھی۔ البتہ شاہ سکندر سے کچھ امید تھی کہ وہ اگر بابا جان کے اگلے پلان سے آگاہ ہو گئے تو شاید وہ خود ہی اسے یہاں سے نکال لے جائیں گے لیکن انہوں نے منع کر کے صرف اس کی امید توڑ دی بلکہ اسے شاک بھی کر دیا تھا۔
اس نے بہت غیر محسوس طریقے سے اپنے کندھے سے شاہ سکندر کا ہاتھ ہٹا دیا اور اسی طرح پہلے ان سے قدم پیچھے ہٹی پھر رک کر انہیں علی جہانگیر کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔
کافی آگے جا کر شاہ سکندر واپس پلٹے تو انہیں دوبارہ اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ حرکت میں آئی۔ کیا یہی کہہ جا کر کچھ پھول ٹوڑے اور ان کا گلہستان بنانے لگی۔ بظاہر وہ بڑے اشناک سے اس کام میں مصروف تھی لیکن اگر ذہن کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا تھا جو شاہ سکندر اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو جائیں۔

اس نے کالج جو ان کر لیا تو اب آنے جانے کا مسئلہ ہو گیا تھا۔ پہلے مدحیہ اور ثویہ ساتھ ہوتی تھیں۔ اب دونوں نہیں تھیں۔ مدحیہ تو خیر پہلے ہی اسلام آباد چلی گئی تھی اور ثویہ رزلٹ کے بعد میڈیکل میں جانے والی تھی۔ اس کا راستہ الگ ہو گیا تھا اور وہ کیونکہ ابھی اکیلی نہیں نکلی تھی، اس لیے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ آخر آئیہ نے اسے باقاعدہ لیکچر دینے کے ساتھ ڈانٹا بھی تھا کہ وہ اب سچی نہیں ہے جو ابھی بھی انگلی پکڑ کر طے کیا بیس سے عادت ڈالنی چاہیے۔ ورنہ زندگی میں کچھ نہیں کر سکے گی اور وہ آئیہ کے سامنے تو خاموش ہو گئی۔
نبیل کو راضی کر لیا کہ وہ صبح آن کے ساتھ جایا کرے گی۔ البتہ واپسی کا کوئی زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ کافی لڑکیاں نکلتی تھیں۔

یوں کچھ دنوں میں وہ سیٹ ہو گئی تھی کہ کسی دن نبیل دیر کرتے تو وہ صبح بھی خود ہی نکل جاتی۔ ان دنوں بڑھنے کے علاوہ مزید کچھ کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بالکل آئیہ کی طرز پر سوچنے لگا۔
”اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہوگی، جیسی اس کی ماں نے گزارا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے نبیل کے سامنے کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹالا تھا کہ پہلے بی اے کر سوجنا۔“

”وہ تو میں کر رہی رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی کورس کر لوں تو کیا برا ہے۔“
”برا تو کوئی نہیں ہے لیکن تمہیں جلدی کیا ہے۔ بہت وقت ہے تمہارے پاس۔ بی اے کے بعد اہم

نہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ایم اے میں پوزیشن لا کر لیکچر شپ کے لیے اپلائی کرو۔“
ہل نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ جو کہ اس وقت تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا لیکن اب میڈم عاصمہ کو دیکھ کر صرف نبیل سے اتفاق کر رہی تھی بلکہ اندر سے اتنی پر جوش ہو گئی تھی کہ دل چاہ رہا تھا جلدی جلدی بیچ بھلا لگتی ہوئی میڈم عاصمہ جیسی بن جائے۔
”جی ہاں! میں میڈم عاصمہ! اللہ اگر نبیل بھائی ماں جائیں تو میں کموں گی ان سے بلکہ مہما سے بات کروں گی۔“

ایک خوش کن تصور لیے جانے لیا کچھ سوچتی آ رہی تھی کہ قریب گاڑی رکنے کے ساتھ ہوں دروازہ کھلا کر راستہ رک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹ کر کنارے سے نکلتی، دوسری طرف سے نکل کر علی جہانگیر کے سامنے آ گیا۔

”السلام علیکم۔“
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”بہت سیٹ بیٹھ جاؤ۔“ علی جہانگیر نے نرمی سے کہا۔
”میں سر ملاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی تھی کہ علی جہانگیر نے ایک دم اس کی کلائی تھام لی اور اس بار تھکام سے

ناخن کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو بیٹھو۔“ اس کے ساتھ ہی اسے گاڑی کے اندر رکھ لیا دروازہ بند دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ بہت ضبط سے دانتوں پر دانت جما کر بولی۔
”میرے کھڑا پ کروں۔“

”اے اس نے اسپڈ سے گاڑی بھگا دی۔“
”بیٹا! اندر سے کانپ رہی تھی لیکن اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے سب کو سارا دینے میں لگی رہی۔ جب کافی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تب راستوں کو دیکھ کر پھر آئی۔

”اب کہاں جا رہے ہیں؟“
”وہ اطمینان سے بولا۔“ ”تم ہی نے گھر چلنے کو کہا ہے ورنہ میرا ارادہ تو کہیں اور جانے کا تھا۔“
”اپنے گھر جاؤں گی۔“ وہ جیج کر بولی۔

”تمہارا گھر ہے۔“ اس نے اپنے گیٹ پر گاڑی روک کر بارن بجایا اور گیٹ کھلنے پر اسے دیکھ کر بولا۔ ”مجھے ہے اس وقت تمہارے استقبال کو یہاں کوئی نہیں ہے لیکن میں تو تمہارے ساتھ ہوں ناں اور جب غریب ہو تو باقی ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔“

”اسے اس وقت چھوڑے تھے۔“
”وہ گاڑی اندر لے آیا تھا اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ تھا تو وہ چاہنے اور کوشش کے رامت نہیں کر پائی۔ کیونکہ ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا اور ہاتھ پاؤں الگ سن ہو گئے تھے۔
”رام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے جوس لے کر آتا ہوں۔“ وہ سیدھا اسے اپنے بیڈ روم میں لے آیا تھا اور جہرے پر کھنڈی زد رہی دیکھ کر فوراً جوس لینے نکل گیا۔ تو چند لمحوں بعد جانے کس خیال سے اس نے زور بھری لی پھر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے تک گئی تھی کہ قدموں کی آواز سن کر جلدی سے بند کے طرف آئی اور اپنے دفاع کے لیے اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا۔

”تو یہ کھانے کا وقت لیکن۔“ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی بولنے لگا تھا لیکن اسے کھڑے دیکھ کر پہلے ہاتھ پھر شمع و معنی خیز انداز میں مسکرایا تو اس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ جن سے اس کی

تاگواری اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کم آن یار! یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جیسا ہم سوچیں، چاہیں ویسا ہی ہو۔ کبھی کبھی۔“ وہ رُسے نہیں بڑے دلکش انداز میں کہتا ہوا اس کی طرف آنے لگا تھا کہ وہ ایک دم حرکت میں آئی اور کارنر سے کانچ کا بازو اٹھا کر اسے کارنر کے کنارے پر دے مارا اور اس تیزی سے لوٹے کانچ اپنی مٹھی میں بھر کر بولی تھی۔

”شاہ علی جانگیر! اگر آپ نے مزید ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو میں یہ سارے کانچ اپنے حلق سے اتار لوں گی۔“

علی جانگیر کے قدم وہیں رک گئے تھے۔



اس کی بند مٹھی سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ ہتھیلی میں کانچ چبھ رہے تھے۔ تکلیف بھی ہو رہی تھی یہ وہ اس طرح کھڑی تھی۔ بہت چونکا۔

علی جانگیر اس کے خطرناک تیوروں کے ساتھ ارادے کی مضبوطی سے خائف ہو گیا تھا۔ یہ ہرگز وہی تھی جو ذرا سا تیز بولنے سے سسم جاتی تھی اور اس کی اس تبدیلی کا سبب خواہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت یہ سب سے قاصر تھا۔ اس کا ذہن صرف اس صورت حال پر قابو پانے کی سوچنے لگا تھا۔

”دیکھو، تمہارا ہاتھ زخمی ہو رہا ہے۔ پھینک دو یہ سب۔“ وہ اس کی لہو پڑتی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”نہیں آپ ہٹ جائیں سامنے سے اور جب تک میں باہر نہ نکل جاؤں آپ اس کمرے سے نہیں گے۔“ وہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”رکو صاحت! میں وعدہ کر رہا ہوں۔ جب تک تم نہیں چاہو گی میں تم پر کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ میرا انتہا اور اس طرح مت جاؤ۔“

”استقرار!“ وہ تنہی سے کہہ کر ہونٹ بھیج گئی۔

”اوگاؤ! میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ سنو تمہیں خود اپنے آپ پر تو بھروسہ نہ تھا۔ پھر کیوں ڈرتی ہو؟“

علی جانگیر نے زچ ہو کر کہا پھر ایک دم جھپٹ کر اس کی کلائی تمام لی تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلا اور دوسرے پل پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”پاگل مت بنو صبا! اپنا ہاتھ دیکھو۔“

علی جانگیر نے مجبور ہو کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا اور اس کا بازو گھٹنے کے نیچے دبا کر بہت احتیاط سے اس کی ہند

کھولی تو ایک ٹوٹے کوہ خود بھی چکر اٹھا تھا۔ کتنے کانچ اس کی ہتھیلی میں اندر تک چلے گئے تھے۔

”خبردار! ہلنا نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر تیز لہجے میں بولا تو اس نے دوسرا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا کیونکہ ہم

تھی کہ اب اس کی کوئی بھی کوشش نہ صرف بے کار ہوگی بلکہ اسے مجبور اور بے بس بھی بنا کر رکھ دے گی۔

نہیں چاہتی تھی۔

وہ دوبارہ اس کے ہاتھ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت آرام و احتیاط سے ایک ایک کانچ نکالنے لگا۔ گاہے گاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا جو نکلا ہونٹ و انتوں میں دبائے بہت مضبوط کر رہی تھی۔ پھر بھی کسی وقت اس کے

”سی کی آواز نکل جاتی۔“

”چلو آج یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم کتنی بہادر ہو۔“ وہ آخری کانچ نکال کر اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر دوسرے تم

سے فرسٹ آئینہ باکس اٹھا کر لایا اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”جو کانچ مجھے نظر آئے وہ میں نے نکال دیے ہیں اور اب خون صاف کر کے ٹیوب بھی لگا دوں گا لیکن ذرا

اکتفا مت کر لینا آئی میں ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔ کو تو ابھی لے چلوں۔“

میں۔“ وہ بس ایک لفظ کہہ کر پھر ہونٹ بھیج گئی۔ جبکہ آنکھوں سے بازو بھی نہیں ہٹایا تھا۔

پہلے میں ماما کو دکھانا۔ ویسے کیا ہوگی ان سے؟“ دوسری بات پر وہ خود ہی محفوظ ہو کر مسکرایا تھا۔

بولی میں اسپرٹ لگا کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا اس کے بعد ٹیوب پھینکا کر ہاتھ دھونے کے لیے

میں میں چلا گیا تو اس نے پہلے آنکھوں سے ذرا سا بازو ہٹا کر دیکھا اور اسے مہجور نہ پا کر فوراً ”اٹھ کر بیٹھی تھی

بیلے سے ہاتھ صاف کرنا ہوا گیا اور بہت انجان بن کر بولا۔

”ہو! ہو!“

ن گھر جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ لیکن اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

بامطلب؟“ وہ تڑخ کر بولی۔

”خداو آرام سے یا چلو پہلے کھانا کھالیں۔ اس کے بعد بات کریں گے۔“

مجھے نہیں کھانا اور نہ میں آپ کی کوئی بات سنوں گی۔“ اس کے لہجے میں ضد اور خفگی تھی۔

”نویہ طے ہے کہ میں اپنی بات کے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ آج جانا چاہو یا چار

۔“ وہ ہنوز اسی سنجیدگی سے کہتا ہوا آرام سے صوفے پر جا بیٹھا اور ٹیبل سے سکرٹ اٹھا کر سگائے لگا تو وہ

طلب سمجھ کر بری طرح سلگ کر بولی۔

”بالا بات کہنی ہے آپ کو؟“

ن طرح نہیں۔ یہاں آکر بیٹھو۔“ اس نے اطمینان سے اپنے برابر اشارہ کیا تو وہ کچھ دیر تک خستہ گیس

سے اسے دیکھتی رہی پھر اس صوفے کے دوسرے کنارے پر خاصے ٹکلف سے بیٹھتے ہوئے استراخیہ انداز

پ کیا سمجھتے ہیں۔ جو آپ کہیں گے میں یقین کر لوں گی۔“

ن کے لیے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم صرف سچائی سن لو اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے کرتا۔“ وہ

بطے بولا تھا۔

پ سے بڑی سچائی یہ ہے کہ آپ شاہ جانگیر حیات کے بیٹے ہیں اور آپ نے مجھ سے اس حقیقت کو

رف اس خوف سے کہ کہیں میں تمہیں کھونہ دھل۔“ جس طرح وہ فوراً بولی تھی۔ اس طرف سے بھی

دب آیا تھا۔ پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور اپنے آپ کا فیصلہ بھی کر لیا تھا اور اس

ن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر آسیہ کی بیٹی ہو جس روز تم گلدان کے پیسے دینے یہاں آئی تھیں اگر

یاد ہو تو میں بابا جان موجود تھے۔ ان کے ساتھ باتوں میں تم نے انہیں بتایا تھا کہ تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی

ن مارا کھیل وہیں سے شروع ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں اس کھیل میں شامل ہی نہیں تھا لیکن میں

ن نہیں تھا۔ اس لیے اس تمام عرصے میں بار بار میں نے سوچا کہ تمہیں ساری حقیقت بتا دوں لیکن تمہاری

بیٹھتے ہوئے میں نے مجبوراً ”خود کو باز رکھا کیونکہ تم میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلے کرنے کی جرات ہی

نہیں اس خولی یا خامی سے تم خود بھی اچھی طرح آگاہ ہو۔ پھر بتاؤ میں خاموش نہ رہتا تو کیا کرتا۔“ وہ کچھ دیر

خاموش ہو گیا کہ شاید وہ بولے لگی لیکن وہ کچھ گم صم سی بیٹھی تھی۔

یہ تمہارے لیے محبت سے دستبردار ہونا آسان ہے اس لیے اپنے اختیارات تم نے اپنے ہیوں کو سوچ

۔“ اسے بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر وہ مزید گویا ہوا تھا۔ یہ کوئی قابل خیرات نہیں ہے صبا! اس لیے کہ ہمارے

ہیں۔ اس میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کانچ چھ گئے تھے۔“
 نیل بیٹا! میرا پاس لاؤ۔“ آسیہ اس کی ہتھیلی کو انگلی سے چھو کر دیکھ رہی تھی ایک دو جگہ کانچ کی چھین
 بن ہوئی تو نیل کو مخاطب کر کے بولی۔
 نیل پاس لے آئے پھر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”کم از کم فون تو کر دیتیں۔“

”مجھے ہوش نہیں تھا اور جب ہوش آیا تو فوراً ”چل پڑی۔“ وہ نیل کی طرف دیکھ بغیر بولی۔ کیونکہ جانتی تھی
 وہ اس کا جھوٹ فوراً ”کچل لیتے ہیں۔“
 ”کہاں ہوا تھا ایک سیل فون؟“ آسیہ نے پاس میں سے کاشن اور بینڈنگ نکالتے ہوئے پوچھا تو وہ اندر رہی اندر
 بان ہو کر کہنے لگی۔

”کانچ کے پاس اور اچھا ہوا کچھ کانچ فیلوز ساتھ تھیں اور ان کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔“
 ”بڑے سوالوں سے بچنے کی خاطر دو سرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر بولی۔“ مجھے بھوک بہت لگ رہی ہے۔ آپ نے کھانا کھا
 ”ہاں! نیل بوا! اسے کہو اس کے لیے کھانا گرم کر دیں۔“

آسیہ نے اسے جواب دے کر نیل سے کہا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پر بینڈنگ کرنے لگی جب تک یہ کام
 ادا ہوا تب تک ادھر کھانا بھی گرم ہو گیا تھا اور اس پر اس نے اسے اچھے کاموں پر مل گیا۔ دایاں ہاتھ زخمی ہوا تھا اس
 ہاتھ میں ہاتھ سے کھانے میں اسے کچھ دیر لگی اور کچھ اس نے جان بوجھ کر دیر لگائی تاکہ آسیہ کلینک کے لیے
 جانے کا پانچ تو بج رہے تھے۔ نیل بھی اس وقت نیوشن کے لیے جاتے تھے۔ یوں ان دونوں کے جانے سے
 بے طرح سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ جس پر وہ شکر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور ان چند گھنٹوں میں جو
 پیش آیا اسے پہلے مرحلے سے سوچنے لگی تو نہیں اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اور کہیں سہم سا گیا۔ گویا
 ملائقیات تھیں۔ جنہیں سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید تھکن کے باعث ورنہ یہ کوئی سوئے کا وقت
 نہ تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی اور پتا نہیں بوانے اسے نماز کے لیے اٹھایا کہ نہیں وہ اٹھ
 نیل کے اٹھانے پر اٹھی تھی۔

اس وقت سوئے کی کیا تک ہے۔ ابقیہ رات کیا جانے کا پروگرام ہے۔“ نیل نے نوکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھوں
 الٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
 ”نہیں کیسے سو گئی۔ ماما آئیں کیا؟“
 ”نیل ابھی اٹھ جے ہیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ لیکن تمہارا تو ہاتھ۔“
 ”شکر ہے دو سرا ہاتھ سلامت ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو نیل کو
 بل پر نیم دراز دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”اب آپ سو رہے ہیں؟“

”نیل! اپنے پیچھے کتہ کتہ کر سیدھے ہو بیٹھ۔“ تمہارے ہاتھ میں تکلیف تو نہیں ہے؟“
 ”ہے تو لیکن زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور پھر یہ سوچ کر کہ جب وہ سب جانتے ہیں تو انہیں یہ واقعہ بھی بتا
 دینے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”نیل! ایک سیل فون نہ تھا تو نیل بھائی! وہ علی جہانگیر ہیں نا وہ راستے میں سے مجھے اپنے گھر لے گئے تھے۔“
 ”اس کی پہلی بات پر متوجہ ہوئے تھے اور دوسری بات پر ان کی پیشانی پر لیکر س نمودار ہو گئی تھیں۔ جنہیں
 علاوہ صرف خائف ہوئی بلکہ اپنی حماقت کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا کہ اب اپنے ہاتھ زخمی ہونے کا
 پیش کرے۔“

ہوں کے پیش نظر ہماری بہتری نہیں ہے بلکہ اپنا ہستی میں وہ ایک دوسرے کو بچاؤ کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔
 ہم دونوں تو ان کی بساط پر محض مہرے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جذبات ہمارے احساسات ہماری محبت ہماری
 کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صرف اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جس میں ایک جیتے گا دوسرا ہارے گا۔ پھر
 اپنی جیت کی خوشی میں اور ہارنے والا اپنی ہار کے غم میں یہ بھی نہیں سوچے گا کہ اس میں ہم دونوں کا کیا نقص
 ہوا۔ ان باتوں سے میرا مقصد تمہیں تمہارے ہوں کے خلاف اکسانا نہیں ہے صبا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم
 تمہاری مت بنو۔ تمہاری ممانہ کو یہ خدشہ ہے تاکہ کہیں ان کی کہانی نہ دہرائی جائے تو اس کے لیے وہ مجھ سے
 مرضی کی شرائط طے کر سکتی ہیں۔ تم انہیں بتاؤ کہ تم مجھ سے۔“
 وہ ایک دم خاموش ہو گیا پھر گہری سانس کے ساتھ اپنے آپ سے بولا تھا۔
 ”چاہتیں! تمہیں مجھ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔“
 ”محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ناجائز کا فرق ہی بھلا دیا جائے۔“ وہ جن سوچوں میں تھی ان ہی میں گر
 کر بولی تھی۔

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے تم میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں
 دھاندلی میں شریک نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہیں شاہ پور میں ہوتیں۔“ وہ اس کے ایک
 زچ ہو گیا تھا اور وہ شاہ پور کے نام سے اچھل پڑی۔
 ”آپ نے جو کتنا کھانا کھا لیا اب مجھے جانے دیں۔“
 ”مائی گاڈ! اتنی دیر سے میں کیا صرف کھانا کھا کر رہا تھا۔ کم از کم اس پر کچھ تبصرہ تو کر دیا سوچنے کا ہی کہہ دو۔“
 ”جہانگیر نے بڑی آس سے اسے دیکھا تو وہ یہاں سے نکلنے کی جلدی میں اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”ہوں! سوچوں کی ضرور۔“
 ”گڈ! پھر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے کیا سوچا ہے۔“
 ”میں فون کروں گی۔“ وہ نظرس چرا کر بولی۔
 ”اچھی بات ہے۔ میں انتظار کروں گا اور ہاں جاؤ گی کیسے۔ میں چھوڑ آؤں؟“ اس نے بڑے سادہ سے انداز
 آفر کی تھی۔
 ”نہیں! میں جلی جاؤں گی۔ میرا ایک شاید آپ کی گاڑی میں ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”چلو۔“ اس نے ہرہ کر دروازہ کھول دیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر اس سے بیک لیتے ہوئے
 سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”میری کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک اور بہت خوش۔“ وہ جانے کس خیال کے تحت مسکرایا تھا۔
 ”میں چلتی ہوں۔“ وہ اس کی مسکراہٹ پر عجیب سا محسوس کرتی ہوئی فوراً ”گیت پار کر آئی تھی۔“

♥ ♥ ♥ ♥
 جب وہ گھر میں داخل ہوئی آسیہ اور نیل پریشانی سے منہل رہے تھے کیونکہ اسے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی
 اسے خود بھی احساس تھا اور اپنے طور پر انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس نے تمام راستہ بہت کچھ سوچا
 بھی آسیہ کو دیکھتے ہی وہ سہٹا گئی۔ اس پر آسیہ کا پوچھنا۔
 ”کہاں رہ گئی تھیں؟“
 ”وہ ماما! ایک سیل فون نہ تھا تو نیل بھائی! وہ علی جہانگیر ہیں نا وہ راستے میں سے مجھے اپنے گھر لے گئے تھے۔“
 ”آسیہ نرم پڑ گئی اور فوراً اس کی کلائی تھام لی۔
 ”کیسے ہوا اور کہیں جوت تو نہیں آئی؟“

”جی نہیں جی۔ مجھے تو بالے گیا تھا۔“ مہراں نے اس بار لا علمی کا اظہار بہت مسکین سی شکل بنا کر کیا۔ تو وائٹ پیس کر بولی۔

”تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”وہ جی صفائی۔“

”کوئی صفائی و فانی نہیں کرنی۔“ وہ غصے سے کھڑی ہوئی تو مہراں نے بھاگ جانے ہی میں نہایت سنجھی۔

”بڑی آئی صفائی کرنے والی ہونہ اور یہ میں کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہوں۔ جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔ کوئی روک سکتا ہے مجھے روک کر تو دکھائے کوئی۔ میں صبا نہیں ہوں جو رعب میں آجاؤں گی۔ میں تو چینی یا کر ساری جوہلی سربراٹھانوں کی ڈرتی نہیں ہوں میں کسی سے۔“

وہ غصے سے تلملاتی ہوئی ادھر سے ادھر مٹنے کے ساتھ اپنے آپ بولے جاری تھی۔

”پاپا آجائیں۔“ لیکن نہیں وہ تو بابا جان کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکتے، میں خود بات کرتی ہوں۔ ابھی اس وقت صاف کہہ دوں گی کہ اب میرا یہاں دل نہیں لگتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔“ وہ ایک دم سے فیصلہ کر کے اس وقت دوبارہ اٹھا کر شانوں پر پھیلائی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج میں بی بی جان بڑی سو کے ساتھ جانے کس مسئلے پر بات کر رہی تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے اپنی بات روک دی اور اسے پاس بلایا لیکن اس نے فاصلے پر ہی رک کر تجلّت میں پوچھا۔

”بابا جان کے پاس کوئی مہمان تو نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ لیکن شاید وہ نہیں جا رہے ہیں۔“ بی بی جان نے کہا۔

”مہم بھی گئے تو نہیں نا۔“ وہ اسی غلّت میں کبھی ہوئی تیز قدموں سے چل پڑی اور بابا جان کے کمرے کے پار رک کر پہلے دستک دی۔ اور ان کا جواب آنے پر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جیتی رہو۔“ بابا جان نے اونچا شملہ اپنے سر پر جماتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ خاصی بے نیازی سے آگے بڑھنے پوچھنے لگی۔

”نہیں جا رہے ہیں؟“

”ہوں۔“ جواب میں انہوں نے نیکارا بھرا وہ بھی بادل خواستہ کیونکہ انہیں اپنے معمولات سے متعلق بالکل پسند نہیں تھے نہ کسی کو اجازت تھی اور وہ ان کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود بے ساختہ بولی۔

”میں بھی جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ بابا جان کا اپنی اسٹک کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

”کراچی“ ایک دو دن مہما کے پاس رہوں گی پھر اسلام آباد چلی جاؤں گی کیونکہ میرے کالج بہت حق ہو رہا۔ آپ کسی سے نہیں مجھے چھوڑ آئے۔“ وہ بظاہر بڑے آرام سے کبھی ہوئی صوفے میں دھس گئی۔

”یہ اچانک تم نے جانے کا پروگرام کیسے بنالیا۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”میرے پروگرام ایسے اچانک ہی بنے ہیں۔“ وہ بول کر خود ہی ہنسی۔ ”حالانکہ اس روز بیانیہ بہت اصرار کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں بنا اور اب میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔“

”سکندر سے ملے بغیر؟“

”تو میں کون سا پیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آجاؤں گی۔“ وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ کسی طرح ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے مکنتی خانہ ہے۔

”وہ تو تھک ہے پھر بھی تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ جب تک سکندر نہ آجائے اور ہم اس کی اجازت تمہیں کسی کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔“ بابا جان نے اسے ٹالنے کی سعی کی تو وہ حیران ہو کر بولی۔

آپ کو بابا سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“

”ہوں نہیں وہ تمہارا باپ ہے۔ ہم سے کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہیں کیوں جانے دیا نہیں جلدی کیا ہے۔ کل شام تک سکندر آجائے گا تب۔“

”نہیں۔ کل شام تو بہت دور ہے۔ میں ابھی جاؤں گی، آپ بابا سے فون پر بات کر لیں وہ منع نہیں کریں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”جان کچھ دیر تک پر سوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔ پھر فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”نیک ہے، ہم سکندر سے بات کرتے ہیں۔ تم جب تک تیار ہو کر آؤ۔ ہم خود تمہیں لے کر جائیں گے اور سنو ہے کہو بیور کو ہمارے پاس بھیج دے۔“

”بی بہتر۔“ وہ بمشکل اپنی حیرت اور خوشی چھپا سکی اور فوراً ”ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اتفاق سے شاہ تیمور غرف آتا تھا۔ وہ بڑی تجلّت میں اسے بابا جان کا پیغام دے کر ادھر چلی آئی۔ کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں یہ اپنے ساتھ کچھ لے جانا چاہتی تھی۔ بس کپڑے بدل لیے۔ پھر کمرے سے نکلی تو جانے کیا خیال آیا کہ پہلے باپ کے پاس چل آئی اور اسے مخاطب کر کے بولی۔

”آئی میں جا رہی ہوں۔“

”ماں؟“ مہراں نے یونہی پوچھ لیا اور نہ اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

”راجی! بی ماما کے پاس۔“ بابا آئیں تو ان سے کہتے گامیں انہیں فون کرتی رہوں گی۔“

”السلام علیکم کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی اور نیچے آکر بی بی جان کو اپنے جانے کا حتمی کہہ شاہ تیمور آگیا۔

”ہوکن بابا جان انتظار کر رہے ہیں۔“

”جالی بی جان! میں پھر آؤں گی۔“ وہ کبھی ہوئی بی بی جان کے گلے لگ گئی۔

”مارا اپنا گھر ہے۔“ بی بی جان نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ ان کے گال پر پیار کر کے شاہ تیمور کے پیچھے باہر

جان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور اس کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئی تو شاہ تیمور نے

بند کر دیا دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

”تو تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر بابا جان اور شاہ تیمور آپس میں کسی نرمی جھگڑے کے بارے میں

”لے لگے“ تو اس نے آرام سے سیٹ کی پشت سے سر نکال لیا اور اس خیال میں کھوئی کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو

”ماس سے کس طرح ملیں گے اور کیسے کیسے سوال کریں گے“ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طویل مدت کے

”خارجی ہو۔ دل چاہ رہا تھا اس فوراً“ پہنچ جائے پتا نہیں کتنی دیر کا سفر تھا۔

”ایک گھنٹہ بعد گاڑی ایک رستہ ہاؤس کے سامنے رکی تو اپنے خیال سے چونک کر وہ نا سمجھی کے عالم میں

”کیسے ہوئے بولی۔

”من کی جگہ ہے؟“

”نہ جواب دے بغیر اتر گئے اور شاہ تیمور آکر اس کی طرف دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

”نیک کو یہاں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ تب تک چلو! میں تمہیں یہاں کی سیر کرادوں۔ بہت خوب صورت

”نہیں، ہمیشہ یاد رہے گا۔“

”نہ لگے؟“ اس نے اترتے ہوئے پوچھا۔

”بی بی جان سے زیادہ دو گھنٹہ۔“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”نہاں آگیا۔“

”جی سائیں سلام بڑے سائیں۔“
 ”اچھی گھر والی سے کہو ہماری پوتی کے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کرے اور ذرا جلدی کیونکہ ہمیں آٹے شہر ہے۔“ باباجان نے چوکیدار سے کہا پھر اسے دیکھ کر بولے۔
 ”بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔“
 ”جی! وہ یہی کہہ سکی۔“
 ”تیور! تم پہلے اسے ریسٹ ہاؤس کی سیر کراؤ۔“ باباجان کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ ان کے پیچھے بڑے پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”وہ ادھر جہاں لوگ جمع ہیں۔ وہ سب باباجان کا انتظار کر رہے ہیں جلدو ہم اندر چلتے ہیں۔“
 اس نے باباجان کی طرف سے دھیان بٹا کر شاہ تیور کو دیکھا پھر اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگی۔
 ”یہاں کوئی رہتا بھی ہے؟“
 ”چوکیدار اس کی بیوی اور بچے، ہم لوگ اکثر پکنک وغیرہ کے لیے یہیں آتے ہیں۔ ویسے یہ سارا علاقہ سکند کی ملکیت ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی انہوں نے ہی بنوایا تھا۔“
 وہ اپنے تئیں اسے بڑی مفید معلومات فراہم کر رہا تھا اور اس انداز سے جیسے وہ بڑی مشتاق ہوئی اور وہ ضرور اگر جو اس روز باباجان کی باتیں نہ سن چکی ہوئی جو وہ کہہ رہے تھے۔

”اس سے کہو اگر مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو صباحت کو ہمارے حوالے کرے۔“
 اس کے بعد اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ابھی بھی بہت بے دلی سے سن رہی تھی۔
 ”تم شاید تھک گئی ہو۔“ اس کی خاموشی محسوس کر کے آخر وہ ٹوک گیا۔
 ”باباجان کب تک فارغ ہو جائیں گے؟“ وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔
 ”یا اللہ! تم تو بہت ہی بور لڑکی ہو۔ میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تم مجھو یہاں میں باباجان کو آتا ہوں اور کھانے کا بھی پتا کرتا ہوں۔ اگر تیار ہوا تو ٹھیک ورنہ کراچی جا کر کھا میں گے۔“ وہ اس کی چیز جھنجھال گیا تھا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں۔ باباجان یہیں آئیں گے۔“ وہ قدرے غصے سے کہہ کر زبردستی اتر گیا۔ وہ کچھ دیر پیچھے دیکھتی رہی پھر میز پر نکل آئی دور تک سبز ہی سبز تھا۔ اسے پہلی بار اس منظر میں کشش نظر آئی تو اس کا دھیان بٹ گیا۔

”یہ سب میرے باپ کی جاگیر ہے۔ کتنے بڑے آدمی ہیں بابا۔ کتنے امیر کوئی کمی نہیں۔ چار کیا دس بڑے کر سکتے ہیں پھر انہوں نے ماما کو کیوں چھوڑ دیا۔ بے شک انہیں شاہ پور لے کر نہ آتے۔ نہیں اور کتنے کتنے ان کے بارے میں باباجان کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ماما کو ساتھ لے کر یہ ملک ہی چھوڑ دیا۔ کیا بگاڑ سکتا تھا ان کا لیکن شاید۔“

اس کی سوچیں جانے کس سمت بہہ نکلی تھیں کہ عقب سے چوکیدار کی بیوی اسے پکار کر بولی۔
 ”بی بی! کھانا کھا لیں۔“

”جی! وہ چونک کر پوری اس کی طرف گھوم گئی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔“
 ”کھانا تیار ہے نیچے آجائیں۔“
 ”چلو۔“ وہ ایک طرح سے انتظار ختم ہونے پر شکر کرتی ہوئی نیچے آئی تو سنگ روم میں ہی نیپیل پر کھانا اس نے ہاتھ دھونے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو ایک دم سے باباجان اور شاہ تیور کا خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں ہیں؟“

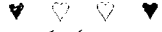
”بڑے سائیں! وہ تو جی چلے گئے۔“ عورت کے جواب سے وہ قدرے تشنگ گئی۔

”کہاں کہاں چلے گئے اور وہ تیور؟“

”پتا نہیں جی! بڑے سائیں اور تیور سائیں دونوں چلے گئے۔ میرے آدمی سے کہہ گئے ہیں آپ کا خیال رکھ۔ آپ ادھر ہی رہیں گی۔“ عورت اپنے سادہ سے انداز میں بتا رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا اور پھر اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن آگے گیٹ پر دو چوکیدار نے اسے روک لیا تھا۔

”بڑے سائیں کا حکم ہے جب تک وہ نہ کہیں آپ اور سے نہیں جا سکتا۔“



”وہ مدحو کا فون تو نہیں آیا؟“ آسیہ نے جاتے جاتے رک کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تو صباحت اور نیپیل یک کر اسے دیکھنے لگے۔

”نہیں ماما! نیپیل کے اشارے پر صباحت نے جواب دیا تھا۔ ”کئی دنوں سے اس نے فون نہیں کیا۔ غالباً“

”بہت دل لگ گیا ہے اس کا وہاں۔“ تالاق لڑکی کو اپنی پڑھائی کی بھی فکر نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گی۔“ آسیہ نے ناف بھرے انداز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”پھوپھو! اگر آپ اجازت دیں تو میں فون کروں مدحو کو۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔“ نیپیل نے اپنی سے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں یہاں سے کوئی فون نہیں کرے گا۔“

”کیوں پھوپھو! آپ مدحو سے کیوں بدگمان ہو رہی ہیں۔ وہ خود سے تو نہیں گئی۔“

”میں اس سے بدگمان نہیں ہوں۔“ اسے نیپیل کا تو کتنا اچھا نہیں لگا ناگوار ہی چھپا کر بولی تھی۔

”پھر آپ نے اسے اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کی مرضی پر۔ کیا وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ اچھے سے میں سیر کر سکے۔ نہیں پھوپھو! ابھی وہ ہر چھٹی چیز کو سونا سمجھنے والی عمر سے نہیں نکلی۔ ابھی قدم قدم پر اسے نہائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ شاہ پور والے اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیں آپ کو اسے وہاں سے نکلنے کی تک دو کرنی چاہیے۔“ نیپیل نے دھیر سے اسے مدیحہ کا احساس دلانے کی سعی کی تو وہ اندر ہی اندر جربز لڑ پڑی۔

”میں کیا کروں جب وہ آتا ہی نہیں چاہتی۔ ایسے میں ہماری کوشش کس کام کی آتا! ہمیں منہ کی کھانی پڑے گی۔“

”بہہ یہ کہہ دے گی کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں اپنے باپ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔“

”وہ ایسا نہیں کہے گی۔“ نیپیل نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

”میرے دھک سے مسکرائی اور گہری سانس لے کے اندر روک کر کہنے لگی۔“

”بہر حال۔ اب مدحو کا فون آئے تو تم اس سے پوچھ لینا کہ وہ کیا چاہتی ہے اگر یہاں آنے پر آمادہ ہے تو پھر۔“

”نیپیل بھائی جا کر اسے لے آئیں گے۔“ صباحت درمیان میں بول پڑی۔ پھر کچھ خائف بھی ہو گئی تو وہ اسے ڈکا خیال چھوڑ کر گھر کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ ہو رہی ہے اور یہاں آج شام واپسی میں بھی دیر ہو جانے کی تم دونوں کھانا کھا لیتا۔“

”نہیں ماما! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ آپ خواہ گیارہ بجے آئیں۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے کیوں نیپیل صباحت نے کہہ کر نیپیل کا بازو تھام لیا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”اگر ایسی بات ہے تو پھر ابھی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھا لیتا۔“ وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

”میں اتنی کمزور کبھی نہیں تھی۔ مجھے مدھونے کمزور کر دیا ہے۔“

گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی اسے پھر مدیحہ کا خیال آگیا تھا اور حقیقتاً ”وہ اس کے لیے بہت پریشان تھی اور بے بس بھی اس لیے اسٹینڈ نہیں لے رہی تھی ورنہ اگر مدیحہ اس کے پاس آنے پر آمادگی ظاہر کرتی تو وہ یوں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور صباحت کے معاملے میں بھی وہ شخص مدیحہ کی وجہ سے چپ کھسی اور چاہتی تھی کہ پہل شاہ بوروالوں کی طرف سے ہو۔ جنہوں نے اب تک صباحت کے حصول کے لیے جانے کیوں پیش رفت نہیں کی تھی اور اسے کیونکہ رتی برابر بھی کوئی اچھی امید نہیں تھی اس لیے جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا اور ابھی یہ جان کر کہ مدیحہ نے ایک ہفتے سے فون نہیں کیا وہ متوحش بھی ہو گئی تھی کہ خود اس نے ایک بار بھی مدیحہ کا فون نہیں سنا تھا پھر بھی اطمینان تھا جو کہ اب اچانک رخصت ہو گیا تھا۔ سارا وقت مرلیضوں کو اینڈ کرنے کے دوران بھی بار بار وہ ہمیشہ کی طرح اسے غیر ذمہ دار اور موڈی کہہ کر خود کو ہلکا بھی نہیں رہی تھی۔

”تقریباً“ دس بجے وہ ایک ڈیلیوری کیس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو بہت تھک گئی تھی۔ زیادہ ذہن انتشار نہ تھا کیا تھا۔ جو وہ فوراً کھر جانے کی بجائے اپنے اعصاب پر سکون کرنے کی خاطر منہ ہاتھ دھو کر بیٹھ گئی اور ماسی کو بلا کر چائے لائے کا کہا تو وہ اس کے سامنے پیبل سے ایک کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہو۔

”بی بی! یہ آدمی بہت دیر سے بیٹھا ہے۔“
”کون ہے؟“ اس نے کارڈ لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس کے اعصاب مزید تن گئے۔ پیشانی پر ایک ساتھ کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

”کیا کہوں گی اس سے؟“ ماسی پوچھ رہی تھی۔
اس نے چونک کر ماسی کو دیکھا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی تھی۔
”بھج دو اور سٹو چائے ابھی ملتا نا۔“
”جی اچھا!“ ماسی چلی گئی تو وہ ایک نظر اپنا جائزہ لے کر سیدھی ہو بیٹھی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر اٹھا کر پیڈ پر چلانے لگی۔

اسٹیکل پل شاہ جہانگیر حیات دروازے میں نمودار ہو کر بولے۔
”السلام علیکم۔“
وہ سروانجا کر کے براہ راست انہیں دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔
”مندر آگئے ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے ہلکے سے دروازہ ہجا کر اپنے تئیں اسے چونکا نا چاہا لیکن وہ بڑے آرام سامنے کر سی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”شرف لائیے۔“
”شکریہ۔“ شاہ جہانگیر آکر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پہلے اپنی رستہ واقع پر نظر ڈال کر ایک طرح سے جھباکا کہ اس زیادہ وقت نہیں ہے پھر انہیں دیکھ کر بولی۔

”فرمائیے۔ کیسے زحمت کی؟“
”میں صباحت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں کیا سوچا ہے آپ نے۔“ شاہ جہانگیر نے اس کا زور بخانداز ہوئے تمہید کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ اندر تک سلگ گئی تھی۔ دل چاہا اس شخص کو بری طرح بے عزت کر کے نکال باہر کرے۔ لیکن مدیحہ؟ تھا جو اسے بہت ضبط کرنا پڑا پھر بھی جب بولی تو اپنے میں غصہ تھا۔
”آپ کو صباحت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس بات سے سروکار کہ میں اس کے

ناپید بھول رہی ہیں کہ وہ میرے بیٹے علی کی منکوحہ ہے۔“ انہوں نے فاتحانہ انداز میں جتایا تو وہ بھی تنفر

ن میں کچھ نہیں بھولی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار پہلے بھی آپ میرے باپ کے دروازے پر آئے

بری باتیں دہرانے نہیں آیا۔ ”وہ فوراً“ بولے تھے۔ ”مجھے صرف صباحت کی رخصتی طے کرنی ہے۔“
بیس شاہ جہانگیر حیات! اتنے نادان نہیں ہیں آپ جو میرا جواب نہ جانتے ہوں۔ انسان ایک بار دھوکا درود بھی انجانے میں سمجھے آپ اور اب آپ جاسکتے ہیں۔ ”وہ اب مزید ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تو شاہ جہانگیر اس کی تقلید کرتے ہوئے بولے۔

ملٹی کر رہی ہیں ڈاکٹر آسیہ۔“
کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگ گئی اور گو کہ شاہ جہانگیر بھی اس کی طرف افزائی کی امید لے کر نہیں آئے تھے پھر بھی اس کا رویہ انتہائی ہنگ آمیز لگا، بمشکل خود پر ضبط کرنے لے تھے۔

بال ہے اس وقت آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اس لیے میری بات سمجھ نہیں پا رہیں۔ گھر جا کر آرام سے رگولی بھی فیصلہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ مدیحہ ہمارے فتنے میں ہے۔“
لب ہے آپ کا۔ ”وہ ایک دم سنجی تھی۔

کی سلامتی کے لیے۔“
اپ جہانگیر حیات! ”وہ کسی طرح خود پر قابو نہیں پاسکی۔“ آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ ناؤ گیٹ

غیر نے چند لمحے رک کر اس کے تپے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھا پھر ذرا سے کندھے اچکا کر باہر نکل گئے
پار دونوں ہاتھ جہا کر خود کو سہارا دیے کھڑی تھی ان کے جاتے ہی کرسی پر ڈھے گئی اور دونوں ہاتھوں میں
مذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مزید جسم سے جان بھی نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

بعد سرسبز کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
امیدم؟“
نے آواز سن کر بھی کوئی حرکت نہیں کی تو سرسبز جلدی سے جا کر گلو کو زینا کر لے آئی اور اپنے ہاتھ سے گلاس

نٹوں سے لگا دیا۔
نٹ لے کر اس نے اپنا سر چیز کی بیک پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی فون کی تیل بج اٹھی۔
نے ریسیور اٹھا کر ہلو کہا۔ پھر اس سے بولی۔

”آپ کے گھر سے فون ہے۔“
مقامت محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر سرسبز کو دیکھا اور آہستہ آواز میں بولی۔
میں فارغ نہیں ہوں۔“

نے اس کی بات دہرا کر فون بند کر دیا تو اس نے اسے جانے کا اشارہ کر کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تنہائی
لیکن تنہائی کہاں تھی۔ بند پلوں کے اندر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ جس میں تسلسل نہیں تھا۔ ماضی
واقعات گڈ گڈ ہو رہے تھے۔ ایسے ہی چہرے اور آوازیں سنیں۔

”ان رکھیں۔ کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا“ اچھا ہی

شاہ سکندر نے کہا تھا اور ان کا اعتبار کر کے ہی اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو اپنے ہاتھوں سے سولی چڑھانا تھا اور وہ ٹکس کی طرف سے دل پر پتھر پڑے۔
”مرد جو صبا۔“
”صبا مدحو۔“

بالکل غیر ارادی طور پر وہ انتخاب کرنے لگی تھی کہ ایک دم گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جسے ہمیشہ سے جاگی ہو۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی کے ساتھ ہتھیلیاں بھی پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔
”میرے خدا!“ اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر گڑا پتھر انگلیاں بالوں میں پھنسا کر سر کو زور زور جھٹکنے لگا کہ ایک طرح سے ساری سوچوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی اور کسی حد تک کامیابی ہوئی۔
گھر کا خیال آیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ کھڑی دیکھتے ہی وہ گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ کبھی اس طرح اور اتنا نہیں روئی تھی۔ نہ کبھی کہیں شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے ذرا سی زیادتی پر سارا گھر سربراہاٹھ اٹھ اٹھتی تھی اور جب تک اپنی منوا نہیں لیتی جیتن سے نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کون تھا اس کی سننے والا۔ اتنے بڑے ریٹ ہاؤس میں چوکیدار اس کی بیوی اور دو بیٹے جن پر بیچ چلا کر ہاں حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ بابا جان کے حکم کے غلام تھے اور ان بے بسوں سے بھی بڑھ کر اس پر بے ہوئی تھی جس نے اسے اتنا رلایا تھا۔ دوسرے شام ہو گئی اور پھر تاریکی کے ساتھ ساتھ خونخاک سناٹا چلنے لگا۔ وہ جس کمرے میں بیٹھی تھی اس کی کھلی کھڑکیوں سے دور تک نہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ پھیلا ہوا بڑھون کے اجالے میں جتنا دلکش تھا اب اتنا ہی خونخاک اس نے چاہا کہ اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دے۔ ہمت ہی نہیں ہوئی تو سرگھٹنوں میں چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد بٹن آن ہونے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی محسوس ہوئی تب ہی اس نے ڈرتے ڈرتے کیا اور چوکیدار کی بیوی کو دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی تو پوچھنے لگی۔

”کوئی آیا ہے؟“
”نہیں بی بی! اس وقت کون آئے گا۔ آپ یہ کھانا کھا لو۔ دوسرے بھی نہیں کھایا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے زرخیز پھرنے بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ روتی کیوں ہو۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“
”یہ کون سی جگہ ہے؟“ اس نے ان سنی کر کے پوچھا۔
”سکندر سامیں کی جاگیر ہے۔ آپ پہلے کبھی اور نہیں آئیں؟“ اس نے ہتا کر پوچھا۔
”نہیں کیا آتے ہیں یہاں؟“
”کون؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”بابا! شاہ سکندر جن کی یہ جاگیر ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں؟“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔
”میں تو جب سے یہاں ہوں نہیں آئے اس سے پہلے کا پتا نہیں۔ آپ بی بی کی خانا بھی کھانا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے کھانا لایا تو اس نے پانی کا گلاس اٹھا لیا اور ایک گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔

”تم کب سے یہاں ہو اب یہ مت کہہ دینا کہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔“
”نہیں جی۔ شادی ہو کر اور آئی۔ اس سے پہلے تو بڑے سامیں کی حویلی میں تھی۔ بڑی چہ خدمت کی ہے میں نے اور میری ماں وہ تو ابھی بھی ادھر ہی ہے۔“
”اچھا کون ہے تمہاری ماں؟“ اس نے گلاس رکھ کر کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ اصل میں وہ جانے سے خائف تھی اس لیے بات کو طول دے رہی تھی۔

چراں۔“
پھر وہ مہراں تمہاری بہن ہوئی۔“
”جی۔ آپ کو کیسے پتا؟“ چوکیدار نے اسے یوں کہنے لگی۔ جیسے پچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
”میں وہیں سے آ رہی ہوں۔“
”جی۔ میں نے تو آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔“
”ہاں جی۔ وہ آگیا جی۔“ چوکیدار نے اسے یوں کہنے لگی۔ جیسے پچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
”اور کیا بات کروں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔
”اچھا۔ بتاؤ بابا جان دوبارہ کب آئے کو کہہ گئے ہیں۔“ اس نے فوراً اسے مشکل سے نکالا۔
”جی۔ میرے آدمی کو بتا ہوا کہ پوچھ کر آؤں؟“ وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔
”میں صبح میں خود معلوم کروں گی اور سنو۔ تم بیٹیں میرے پاس سونا۔ بے شک اپنے دونوں بچوں کو لے“

اپنے آدمی سے پوچھتی ہوں۔ وہ کہے گا تو آجاؤں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے سے ٹرے اٹھا کر باڑا اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سوچا۔
”دیکھ کیسے لوگ ہیں دنیا میں کوئی حکمرانی کے نشے میں چور ہو کر بھی خوش نہیں اور کوئی غلامی میں بھی خوش۔“
خانے کے بعد بدن میں چھ توانائی آگئی تھی اور ذہن بھی سوچنے کے قابل ہو گیا تھا البتہ اندر خوف جوں کا توں رہا تھا۔ جب ہی چوکیدار نے والیس آئے کا انتظار کرنے لگی اور وہ کوئی پندرہ منٹ کے بعد آئی تھی۔ اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے۔ اس کے بیٹے کے برابر نیچے گدا بچا کر نیچے کوسلایا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ بیٹھو یہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھ رہی تھی فوراً پوچھنے لگی۔

”تم سو رہی ہو؟“
”نہیں جی۔ مجھے پتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ جب تک آپ سو نہیں جاؤ گی میں نہیں سوتی۔“ اس نے لمبی لمبی لے کر کہا تو وہ برا سامنے بنا کر بولی۔
”مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔ تم سو جاؤ آرام سے۔“
”جی۔“
”اے جی۔“ اس کی ہدایت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ چچ کر بولی پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر سے ادھر لگی۔

چوکیدار نے جب سادھ لی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی تھی۔ اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی، لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ غصے غصے تھک گئی تو لائٹ آف کر کے اپنی جاگ پر آکر لیٹی اور کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی نظرس آسمان بچے پر جگمگاتے ستاروں میں جھٹکنے لگیں۔ جبکہ ذہن کے درجہوں پر ایسی ہی ننھی ننھی قدیلیں جلتے بجھنے لگی

”ان جو اٹھ کر نہیں آتے تھے۔ سب کی محبتوں کے ساتھ اسے اس کے منفی رویوں کی چھب دکھلا رہے تھے۔“
”اے خدا! الماری زور سے بند کرنا کہ ادھر نہیں بھائی اپنے کمرے میں اچھل پڑتے۔“
”جو کبھی مہراں دیتیں تو وہ فوراً شاکی ہو کر دوسری دیتی۔“
”ہاں یہ بپ کے پاس چلی جاؤں گی۔“
”نہر خائف کر دیتی تھی وہ اپنے ایک چمٹے سے سر کو خنہ صبا تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑتی

تھی۔
 ”خدا کے لیے مدد! تم شاہ سکندر کا خیال چھوڑ دو۔“
 ”کیوں؟ کیوں چھوڑ دوں۔ میرا باپ ہے وہ، کتنا زعم تھا اسے جو نیل کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ جو وہ جب بھی انہیں موقع ملتا اسے اور صبا کو احساس دلاتے تھے کہ ان دونوں کو صرف اپنی ممانعت کا خیال چاہیے جنہوں نے ان کی خاطر اپنی زندگی تیاگ دی اور میری سچ تھا لیکن اس کے اندر تو جیسے احساس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اننا ضد باندھ لیتی۔“
 پھر احمد نے ہار شادی کیا کی اس کے دل میں ہر ایک کے خلاف نفرت بھر گئی تھی۔
 اب ایک شخص کا بدلہ میں نے کس کس سے نہیں لیا۔ ماما جی، سونیا آبی بھلا ان کا کیا قصور تھا اور ماما جی تک کیا میں نے اس کی آنکھیں یکبارگی پائیوں سے بھر گئیں اور پھر ہر شخص کے ساتھ اپنا رویہ سوچ کر دہرا رہی تھی۔



صبح جب سورج کی کرنیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑیں تب وہ انھی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے نکلنے لگی تھی کہ شاہ تیور کی آواز سن کر رک گئی۔
 ”بی بی کہاں ہے؟“ وہ چوکیدارنی سے اس کا پوچھ رہا تھا۔
 ”نور رہی ہیں۔“
 ”شور تو نہیں مچایا تھا اس نے؟“
 ”نہیں جی، شور تو نہیں مچایا پر روٹی بہت تھیں۔“ چوکیدارنی کے جواب پر وہ جربز ہونے لگی۔
 ”کھانا کھایا تھا؟“
 ”دوہریں تو نہیں رات میں کھایا تھا۔“
 ”اچھا جاؤ اٹھاؤ اسے۔“ وہ محاکم سے کہہ رہا تھا۔
 وہ جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ دواش روم میں بند ہو گئی اور خود کو اس کا سامنا کرنے کے تیار کرنے لگی۔ رات اس نے اس سوچ پر نہیں سوچا تھا کہ بابا جان کے اس اقدام پر اسے کیا رد عمل ظاہر چاہیے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ اسے کمزور نہیں پڑنا اور نہ ہی لڑنا ہے۔ کیونکہ جانا بھی کہ وہ ان کا کچھ نہیں لگا سکتی۔
 چوکیدارنی اس کے دروازے پر دستک دے کر جا چکی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر سوچتی رہی۔ پھر باہر کر آئی تو شاہ تیور کو دیکھتے ہی کھلتی مفسر اہٹ کے ساتھ بولی تھی۔
 ”ہیلو کرن، کیسے ہو؟“

شاہ تیور غالباً ”کچھ اور سوچے بیٹھا تھا جب ہی جہان ہو کر دیکھنے لگا۔“
 ”بابا جان نہیں آئے؟“ وہ اس کی حیرت سے نظریں چڑھا کر ادا دھڑکنے لگی۔
 ”اب کسی طبیعت ہے تمہاری؟“ شاہ تیور نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا تو وہ بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا؟“
 ”شریفان بتا رہی تھی کل تم روتی رہی ہو۔“ وہ اس کے چہرے پر جانے کیا کھوجنے لگا تھا۔
 ”ہاں، میں بہت روئی۔“ وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔
 ”آپ مجھے چھوڑ کر جو چلے گئے تھے۔ اگر کراچی نہیں لے جانا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ میں نے وہاں“

ہوئی اتنی ضد تو نہیں کی تھی خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں اب کیا پروگرام ہے؟“
 ”الہال تمہیں یہیں رہنا ہے۔“ وہ فوراً ”کہہ گیا پھر فوراً“ ہی وضاحت بھی کرنے لگا۔ ”میرا مطلب ہے تم رہو گئی تھیں اس لیے بابا جان نے پروگرام بنایا کہ تمہیں تمام رقبوں کی سیر کرائی جائے تاکہ تم فریش ہو۔“
 ”کیا؟ اس کے علاوہ اور کتنے رہتے ہیں۔“ وہ متاثر نظر آنے لگی۔
 ”ہاں۔ تم پہلے ناشتا کرو پھر چلتے ہیں۔“ اس نے کہہ کر شریفان کو پکارا اور اس کے آنے پر مدد کے لیے نے کو ماما تو وہ بول پڑی۔
 ”بائے ضرور لانا۔ میں نے کل سے چائے نہیں پی۔“ پھر آرام سے بیٹھتے ہوئے شاہ تیور سے بولی ”اور کرنز کو لے آتے۔“
 ”اے آؤں گا، کل لے آؤں گا۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اندر کے خوف کے باعث اس نے فوراً ”پوچھا۔“
 ”ماں جارہے ہیں؟“
 اسے دیکھ کر مسکرایا یوں جیسے سمجھ گیا ہو۔
 ”میرا مطلب ہے آپ ناشتا نہیں کریں گے؟“ اس نے جربز ہو کر بات بنائی۔
 ”نہیں اگلیتہ چائے پی لوں گا۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔
 پھر بعد شریفان ناشتے لے آئی تو اس نے پہلے چائے بنا کر ایک کپ اسے تھمایا پھر خود ناشتے میں مصروف ہو

”سنو، تم کراچی کیوں جانا چاہتی ہو؟“ قدرے توقف سے شاہ تیور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تو وہ سوچ کر لگی۔
 ”اصل میں تو مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں میرا کالج ہے۔ کراچی تو بس ایک دو دن رہوں گی۔ کچھ اپنی چیزیں لے کر اور ماما سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ صبا کی رخصتی کب کر رہی ہیں۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ اسے رخصت کر دیں گی؟“
 ”گنا تو چاہیے۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر وہاں سے ہاتھ صاف کرنے لگی پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر فریج سمجھ میں نہیں آتا اس بات کو اتنا مسئلہ کیوں بنایا گیا ہے۔ کیا یہ معاملہ آرام سے بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتا؟
 ”بابا جان کی مرضی وہ جیسے بھی طے کریں۔ یہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ چلو۔“ وہ موضوع لے لے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”تو نہ بابا جان کی مرضی۔“ وہ تنفر سے سوچتی اس کے پیچھے باہر نکلی تھی۔

اسے شاہ پوروالوں سے کوئی اچھی امید تو نہیں تھی لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ صبا کے حصول کے لیے وہ بڑا کوا قاعدہ بر غمال بنالیں گے اور پھر بیٹی کے بدلے بیٹی کی شرط رکھ کر اسے ہتھار ڈالنے پر مجبور کریں گے وہ بڑی طرف سے مطمئن تو پہلے بھی نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے جہاں اگر وہ آرام نہیں تو تکلیف میں بھی نہیں ہوگی اس لیے اس نے ابھی تک مدد کی واپسی کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ دوسرے اسے یہ بھی یقین تھا کہ جس روز مدد کا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ وہ اسی روز واپس آجائے یہ تو اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے وہاں نہیں رہ رہی بلکہ اس کے باپ دادا نے زبردستی اسے روکا ہے تاکہ اسے چارے کے طور پر استعمال کر سکیں۔ یعنی ان کے نزدیک مدد کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو ایسی

صورت میں وہ صباحت کو وہاں پہنچنے کا کیسے سوچ سکتی تھی۔ وہ بھی اسی کی بیٹی تھی۔

شاہ جہانگیر کو تو رات اس نے صاف جواب دے دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اسے اب تک اسے ایک ماں نہیں آیا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح مدیحہ کو ان کے پتھن سے نکال لائے۔ اس کی سلامتی سے اپنی انا، خود داری و قار سب داؤ پر لگا سکتی تھی۔ جسے برسوں پہلے شاہ سکندر کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اسے دم شاہ سکندر کا خیال آیا تو اس کے اندر دہکتے لالہ میں شدت آئی تھی۔ ہاشم وہ بھرے ہتھکے میں اس شخص پر گریبان پکڑ سکتی۔

”لیکن میں اسے اتنے تو دکھا سکتی ہوں۔“ اس نے کھولتے ہوئے ہانگ سے سوچا اور اسی وقت کارڈ لیس ادا لیکن ان کا کوئی نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ برسوں پہلے جب شاہ پور فون کیا تھا۔ تب بھی ڈائریکٹری میں نمبر یاد اور ابھی پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صباحت نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور غالباً ”نئے ہاؤس“ اندر آئی تھی لیکن اسے ابھی تک دست میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”مما! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں کیوں؟“ اسے اس وقت صباحت کی مداخلت سخت ناگوار لگ رہی تھی۔

”طبع سے کمرے میں جو بند ہیں، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“ گیارہ بج رہے ہیں۔ کلینک نہیں جانا آ رہا۔ صباحت اس کے کیوں سے قدرے سٹپٹا کر رہ گئی۔

”نہیں! اس وقت نہیں جاؤں گی،“ سسٹر کافون آئے تو منع کر دینا۔ کتنا شام میں آؤں گی۔“

”اچھا! میں یہ بتانے آئی تھی کہ میں نیچے اماں جی کے پاس جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔“

”ابھی بات ہے، جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر اپنے لیے تکیہ ٹھیک کرنے میں لگی۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر سیدھی ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کارڈ لیس پر علی جہانگیر کے نمبر کرنے لگی۔

”میں شاہ علی جہانگیر! تیسری بیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔“

”میں ڈاکٹر آسیہ بات کر رہی ہوں۔“ اس نے خامسے روکے انداز میں کہا تو ادھر سے وہ فوراً بولا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام کیا تم بتا سکتے ہو کہ شاہ سکندر حیات اس وقت کہاں ہوں گے؟“ اس نے مختصر جواب کے پوچھا۔

”جی اس وقت کوئٹہ میں ہیں اور شام چھ بجے وہاں سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوں گے۔“ اس نے سکندر کا گلا روگرام بھی بتا دیا۔

”کوئٹہ کا کوئی نمبر موبائل نمبر؟“ اس نے سائڈ کارڈ سے پین اور ڈائری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی موبائل نمبر ہے۔“ علی جہانگیر نمبر بتا کر پیچھے اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے فوراً ”تھکریہ کہہ کر ما“ منقطع کر دیا اور پھر خود کو شاہ سکندر سے بات کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد ان کے نمبر مائل تھے۔

”میں شاہ سکندر حیات! بالکل وہی انداز تھا جو اس سے پہلے علی جہانگیر کا تھا۔“

”جی میں ڈاکٹر آسیہ۔“ اس بار وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ان کے لہجے میں ایک لخت، اشتیاق در آیا تھا اور وہ جو پھٹ پڑنے کو تیار تھی، ہنسی بھری۔

”میرے جواب سے آپ کو مایوسی ہوگی۔ یعنی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ سکندر اس کی طرف سے پوچھنے لگی۔

”میری بیٹی مدیحہ کہاں ہے؟“

درمیں ”خیر ہے۔“

مدیحہ کی خیریت مطلوب ہے۔“ وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

علی ٹھیک ہے۔ کیا کسی نے اس کے بارے میں کچھ کہا آپ سے؟“ شاہ سکندر اس بار کچھ ٹھٹکے تھے۔

کے بھائی شاہ جہانگیر آئے تھے میرے پاس۔ موصوف یہ کہہ گئے ہیں کہ اگر میں مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہوں تو ان کے بیٹے کے ساتھ رخصت کر دوں۔“ اس نے چہا چہا کر کہا تو دوسری طرف ایک دم خاموشی

شاہ سکندر حیات! آپ سن لیں۔ اگر میری بیٹی مدیحہ کو کچھ ہوا تو۔“

نہیں ڈاکٹر آسیہ! آپ اطمینان رکھیں، اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ فوراً بولے تھے۔ ”کسی میں اتنی یقین ہے کہ میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ جہانگیر بھائی نے جو کچھ کہا، اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگوں۔“

یہ سب نہیں جانتی۔ آپ مدیحہ سے کیوں فوراً واپس آجائے۔ مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش ہے۔“

تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کی بیٹی نہیں میری بیٹی ہے۔“ شاہ سکندر گو کہ شاہ اس اقدام پر اندر رہی اندر تملارے تھے، لیکن اسے مسلسل اطمینان دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور آپ اس کے لیے اچھا سوچیں گے، اچھا کریں گے۔ جیسے صباحت کے لیے۔“ اس نے ان کی بات پر بڑکایا۔

اس بات پر بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہیں اور ہاں آپ کو مدیحہ کی ہر ضرورت نہیں ہے وہ اب میری ذمہ داری ہے اور صباحت پر بھی آپ مکمل اختیار نہیں رکھتیں۔ اس میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔“

ابھی اچانک بدل گیا تھا۔ جانے اس کا طنز کرنا برا لگا تھا یا کوئی اور بات یاد آئی تھی۔ وہ بہر حال چند لمحوں کو اس آگے بڑھ کر ایک دم جیسے ہوش میں آکر انہیں پکارا لیکن ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

”اے! اس کا دماغ کھولنے لگا تھا۔ دل چاہا ہر شے تھس تھس کر دے۔“

مجھے ہنس شاہ پور والے، میں ان کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ میرا معاملہ تھا جو خاموشی اختیار کر گئی تھی۔ مدحو اور صبا کے لیے تو میں زمین آسمان ایک کر دوں گی۔ بڑے آئے حق جتانے سے پوچھ کر فیصلہ کروں ہونم۔“

خند سے سوچ رہی تھی اور پھر اسی وقت ایک فیصلہ کر کے ہی اٹھی تھی۔



اور نیل کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ادھر سے ادھر چکراتی رہی، پھر اپنی الماری ٹھیک کرنے کھڑی ہو گئی۔ مایوسی ضرورت نہیں تھی لیکن کرنے کو اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ جب سے نیل نے اس کا کالج جانا بند اس کا خوسے بھی کچھ بڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور کام بھی کوئی اتنے نہیں ہوتے تھے۔ سارا وقت بیکار اس کا ذہن بھی متاثر ہو رہا تھا۔ کوئی اچھا خیال تو آتا ہی نہیں تھا اور وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا یا اسے صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور بس، نہیں کوئی ہلچل نہیں تھی کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ مدیحہ کی چلا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پھر خوب بنے یا خوب روئے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے لگا۔ سب کچھ آسیہ پر چھوڑ کر بھی چین سے نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اب علی جہانگیر کا خیال آتا تھا۔ جس کا فائدہ وہ شاہ جہانگیر کا بیٹا تھا اور یہ تصور کم از کم آسیہ تو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ ابھی طرح جانتی مایوسی، بہت چاہنے کے باوجود وہ علی جہانگیر کو فون نہیں کر رہی تھی کہ کہیں اس کی محبت میں بارگاہ اپنی ماں

کو غلط نہ سمجھنے لگے۔ وہ حقیقتاً ”اب دور اسے یہ آکھڑی ہوئی تھی۔“
 ”صائب! فون آیا ہے۔“ بوائے اس کے کمرے کے دروازے میں آکر پکار کر کہا تو وہ الماری کا پٹ بند کر پوچھنے لگی۔
 ”کس کا ہے؟“

”پتا نہیں کون ہے، پہلے نیل میاں کا پوچھا میں نے کہا نہیں ہیں تو بولا گھر میں جو بھی ہے بلاؤ۔“ بوائے بتانے لگھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ درمیان ہی میں نکل کر لابی میں آئی اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف علی تھا۔ چھوٹے ہی بولا۔

”یار! تمہیں ذرا احساس نہیں۔ میں کتنی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“
 ”کیوں؟“ وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔
 ”کیوں کا کیا مطلب؟ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ میری باتوں کو سوچنے کے بعد مجھے فون کرو گی۔“ علی جہانگیر دلایا تو وہ آزدگی میں گھر کر گئی۔
 ”مجھے یاد ہے۔“

”پھر؟“
 ”پھر کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی باتوں سے اختلاف ہے مجھے مما کا خیال ہے اور میں کسی مقام پر بھی اس سے نظریں نہیں چرا سکتی۔“ وہ ہنوز آزدہ سی صاف گوئی رہی تھی۔

”اب میں تم سے کیا کہوں۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔
 ”کچھ نہ کہیں، کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔“
 ”اچھا سنو، ہمیں معلوم ہے۔ آج تمہاری ممانے مجھے فون کیا تھا۔“ علی جہانگیر نے اصل میں یہی جانے لیے اس وقت فون کیا تھا۔

”نہیں! کیا کہا انہوں نے آپ سے؟“ اس نے لاعلمی کے اظہار کے ساتھ فوراً پوچھا۔
 ”ہمارے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ سکندر چچا کا پوچھا اور ان کا موبائل نمبر لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے معلوم انہوں نے سکندر چچا سے بات کی یا نہیں میں صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن سکندر چچا کا موبائل بند پڑا۔ اب پتا نہیں تمہاری ممانے سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بند کیا ہے یا۔“
 وہ اس انداز سے بول رہا تھا جیسے اس کا دھیان اس بات کی طرف ہو کہ شاہ سکندر اور آسیہ کے درمیان کیا ہوئی ہوگی۔

اور اس کا دھیان آسیہ کی طرف چلا گیا کہ صبح وہ کلینک نہیں گئی تھی اور اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔
 ”ہیلو صبا! قدرے توقف سے علی جہانگیر نے پکارا تو وہ چونک کر گئی۔
 ”جی۔“

”تم آج کل کالج نہیں جا رہی؟“
 ”نہیں۔“
 ”کیس میری وجہ سے تو نہیں چھوڑ دیا۔ دیکھو سچ بتانا۔“
 وہ خاموش رہی جبکہ اس کے قیاس پر دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”یہ توقف لڑکی! تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں اس گھر سے اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ سب کی موجودگی میں جانے کی جرات رکھتا ہوں۔“
 ”نہیں تم۔“
 ”میرے خدا! اس نے گھبرا کر ریسیور رکھ دیا اور ہاگ کرا اپنے کمرے میں آئی۔ یوں جیسے وہ ابھی آ رہا ہو۔“

بعد پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی۔ لیکن وہ نہیں گئی اور جب بوا کو جاتے دیکھا تو انہیں بھی روک دیا۔ کیونکہ لیسن تھا کہ وہی ہو گا جو اسے اس مقام پر لے آیا تھا کہ وہ کسی معجزے کے رونما ہونے کی دعا کرنے لگی تھی۔ کا خوشی سے مان جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔
 نئی دیر وہ وقفہ وقفہ سے فون کی بیل سنتی رہی پھر جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تب اس کی باتوں کو سوچتے ہوئے کا وہن اس بات پر اٹک گیا کہ آسیہ نے شاہ سکندر کو فون کیوں کیا اور کیا بات ہوئی۔ ابھی اسے اپنا خیال آتا ہی تھا کہ اس کا وہ فون اس کے کسی کے متعلق بھی بات کی ہو اسے بہر حال حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی ماں جو کا فون صرف اس لیے نہیں سنتی تھی کہ وہ شاہ پور سے آتا تھا اس نے خود شاہ سکندر کو فون کیسے کر لیا۔ کیا نی مجبور ہو گئی ہے یا بہت جرات مند ہر دو صورتوں میں اسے بہر حال ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور وہ شدت سے کا انتظار کرنے لگی، کیونکہ وہی اسے خدشات سے نکالتے تھے اور روزانہ تو نیل آٹھ بجے تک آ جاتے تھے روز جانے کہاں رہ گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے ٹیرس اور ٹیرس سے کمرے تک کے چکر لگا کر تھک گئی اور لی آمد ہوئی بھی تو نوبت وہ بھی آسیہ کے ساتھ جس سے وہ فوراً ”کچھ کہنے سے رہ گئی۔ البتہ نوکے سے باز نہیں

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“
 ”میں پھوپھو کے ساتھ تھا۔“ نیل نے بے دھیانی میں جواب دیا اور اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتے، آسیہ اس بلی۔
 ”بنا! جاؤ پہلے کھانا لگاؤ۔“

نیل کو دیکھتی ہوئی وہیں سے کچن میں چلی گئی۔
 پھر کھانے کے بعد وہ معمول کے مطابق نیل کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو خلاف معمول وہ اسے ادھر ٹھہر رہے تھے۔ اسے دیکھنا تو رک گئے اور اسٹک سے چائے کا گم کارز نیل پر رکھنے کا اشارہ کیا تو برتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے جانے کا اشارہ نہیں کیجیے گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔“
 ”کیوں؟“
 ”بس۔“ وہ گم کارز پر رکھ کر آرام سے صوفے میں دھنس گئی۔ تو نیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اس کی آکر بیٹھتی ہی پوچھنے لگے۔

نیل کی بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“
 ”شام میں علی جہانگیر کا فون آیا تھا۔“ اس نے رک رک کر بتایا اور نیل نے ایک دم گردن موڑ کر اسے دیکھا بکا کر بولی۔

”میں نے نہیں انہوں نے کیا تھا۔“
 ”اُس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“
 ”پریشانی کی بات وہ ہے جو انہوں نے بتائی۔“ اس نے فوراً ”کہا تو نیل ایک بار پھر چونکے تھے۔

”نیل! کیا بتایا ہے اس نے؟“
 ”نار ہے تھے آج ممانے شاہ سکندر کو فون کیا تھا۔“ اپنے تئیں اس نے بڑے راز کا انکشاف کیا لیکن نیل اس پر جھٹکا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو اور چائے کا گم اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تو وہ حیران ہو کر گئی۔
 ”آپ کو حیرت نہیں ہوئی نیل بھائی۔“
 ”نیل حیرت کی کیا بات ہے؟“ نیل نے اطمینان سے کہا تو وہ الجھ کر گئی۔
 ”ہے کیوں نہیں۔ ممانے شاہ سکندر کا نام بھی نہیں سنا چاہتی تھیں پھر انہیں فون کرنے کا مطلب۔“

”اور جب تک آسیہ کا ان کی طرف سے دل صاف نہیں ہو جاتا اور بخوشی انہیں دونوں بیٹیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دے دیتی وہ مدیحہ کو اعتماد میں لے کر آسیہ سے دور رہی رکھیں گے، کیونکہ اس عرصے میں ان کے دل میں الماس اور آغا کے برابر جگہ بنا چکی تھی۔ اس لیے اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آسیہ بیٹی کی خاطر ہمیشہ کے لیے مدیحہ اور صبا سے دستبردار ہو جاتے۔ ایک بار پہلے وہ آسیہ کی خاطر ایسا کر چکے تھے انہیں صرف اس کا خیال تھا اور اب اس کے خیال کے ساتھ بیٹیوں کا احساس بھی تھا جنہیں وہ سمجھتے تھے اب ضرورت ہے ان کی ماں لاکھ پڑھی لکھی ذہین عورت سہی پھر بھی تہا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

بہر حال تین روز بعد جب وہ اسلام آباد کی مصروفیات سے نکل کر شاہ پور پہنچے تو سیدھے مدیحہ کے کمرے میں پہنچے اور اسے موجود نہ پا کر یہی سمجھے کہ کہیں ادھر ادھر یا بی بی جان کے پاس ہوگی اس لیے اپنے کمرے میں آئیں تو میرا نساء سے اس کے بارے میں فوراً ”نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی میرا نساء کو یہ بات ناگوار گزرتی۔ وہ چاہتی تھی ان کی ساری توجہ اس کی اولاد پر مرکوز رہے۔

”آغا کہاں ہے؟“ وہ جب ایسی ہو کر بیٹھے تو پہلے میرا نساء سے آغا کا پوچھا تھا۔

”ہاں لالہ کی طرف گیا ہے۔“ میرا نساء نے بتایا۔

”نہایت تم نے کسی کام سے بھیجا ہے یا۔“

”شریانو نے بلوایا تھا۔“ میرا نساء فوراً ”بولی تھی۔“ ”ہو گا اسے کوئی کام۔ آغا آئے گا تو خود ہی اس سے پوچھ

”تم نے نہیں پوچھا تھا؟“ انہیں میرا نساء کی غیر ذمہ داری بہت کھٹکتی تھی جب ہی ٹوکے بغیر رہ نہیں سکے۔

”مجھے کہاں بتانا ہے۔“ وہ صاف دامن بچا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے کا کون جیراں سے؟“

”ہاں اور زرا مدیحہ کو میرے پاس بھیج دو۔“ انہوں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”وہ تھیلی گئی۔“

”ہاں؟“ وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔

”راچی اپنی ماں کے پاس۔“ میرا نساء کا انداز بے حد سرسری تھا۔

”کس کس کے ساتھ گئی ہے؟“ ان کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی لیکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

”ہائیں شاید بابا جان لے گئے تھے۔“

”بابا جان!“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مال جا رہے ہیں۔ میں چائے کا۔“

اسے بولتا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے تھے۔

دیر بعد وہ بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کیونکہ بابا جان

بین سے بات کر رہے تھے اور جب اسے فارغ کر کے ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دوبارہ سلام کیا۔

”سلام علیکم!“

”دش رہو۔ کب آئے؟“ بابا جان نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”دش رہی ہوئی۔ ابھی میرا نساء نے بتایا ہے کہ آپ مدیحہ کو کراچی چھوڑ آئے ہیں۔“ انہوں نے جواب کے

لی بغیر کسی تہمت کے اپنی بات کہہ دی۔

”بہت ضد کر رہی تھی شاید گھبرا گئی تھی یہاں۔ شہر والوں کا بھلا کہاں مل لگتا ہے گاؤں میں۔“ بابا جان

ٹھیکے کے نیچے ہاتھ ڈال کر جانے کیا تلاش کرتے ہوئے بول رہے تھے۔

”اب میرا انتظار تو کرنا چاہیے تھا۔“ وہ مدیحہ کے جانے کی تصدیق ہونے پر الجھ گئے تھے۔

”اتھا ہم نے اس سے کہ اپنے باپ سے مل کر جانا لیکن وہ نہیں مانی کہنے لگی۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں

بھرتاؤں گی تو بابا سے مل لوں گی۔“ بابا جان نے مدیحہ کے الفاظ دہرا کر انہیں دیکھا تھا۔

”مدیحہ مدیحہ کے لیے فون کیا تھا۔ اسے واپس بلانا چاہتی ہیں لیکن۔“ نیپیل ایک دم خاموش ہو گئے۔

”لیکن کیا وہ نہیں آنا چاہتی؟“ اس نے فوراً ”جو چھوٹا نیپیل لہری سرس کھینچ کر کہنے لگے۔

”جی نہیں وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید آنا چاہتی ہے لیکن شاہ پور والے اسے نہیں آنے دے رہے۔ ان کا منہ

پہلے نہیں رخصت کریں پھر وہ مدیحہ کو یہاں بھیجیں گے۔ یہ انتخابی اہلیات کو شش بہ ان کی پھوپھو کو بلک مینا

کر رہے ہیں۔“

وہ سناٹے میں آکر انہیں دیکھنے جاری تھی۔

”اب تک ہم ہم سمجھتے رہے کہ مدیحہ وہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہے اور خوش ہے لیکن وہ خوش نہیں ہے۔

جانتا ہوں۔ وہ اس گھر کے علاوہ کہیں نہیں رہ سکتی۔ اس پر جب کیا گیا تو وہ مر جائے گی۔“

”اف نہیں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چڑچڑاہٹ کر رو پڑی تو نیپیل ایک نظر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”کچھ دیر بعد وہ ہاتھ نیچے کر آکر پوچھنے لگی۔

”پھر آپ اسے کیسے لائیں گے؟“

”لے آئیں گے پہلے تمہارا معاملہ نمٹالیں۔“ نیپیل نے ہاتھ بڑھا کر تنکیے کے نیچے سے ایک لفافہ کھینچا۔

اسے دیکھ کر بولے۔ ”پھوپھو نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی نظریں ان کے ہاتھوں میں پکڑے لفافے پر جا پڑی تھیں جبکہ اندر دل لکڑ

خاموش ہو گیا تھا۔

”مدیحہ کو بھیجنے کے لیے جو شرط انہوں نے رکھی ہے۔ پھوپھو پہلے اس کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ

دعا نہیں کر سکیں گے۔“

نیپیل نے کہتے ہوئے لفافے میں سے پیپر نکال کر اس کے سامنے کر دیئے جن پر ایک نظر ڈال کر اس

ناکھی کے عالم میں انہیں دیکھا تو وہ قدرے رک کر بولے۔

”خلع کے کاغذات ہیں سائے کر دو۔“

اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کورٹ پیپر دیکھنے لگی جس پر اس کی طرف

تحریر لکھی گئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ اپنے دل کی بستی اسے اپنے ہاتھوں سے اجاڑی تھی اور کوئی اجازت

نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ پہلے مرحلے پر ہی اس نے فیصلے کا اختیار آسیہ کو سونپ دیا تھا۔

نیپیل نے بین اس کے ہاتھ میں تھا کر پیپر پر اس جگہ اپنی انگلی رکھ دی جہاں اسے سائن کرنا تھا۔

اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی قطرہ پلکوں سے گرتا۔ وہ سائن کر کے

کھڑی ہوئی اور تیزی سے جانے لگی کہ نیپیل پکار کر بولے۔

”سنو میں جانتا ہوں تم پھوپھو کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہو۔ اگر کو تو میں انہیں مزید اقدام سے روک

کوشش کروں۔“

”نہیں نیپیل بھائی! ممانے اپنی ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی۔ میں کیا ان کے لیے انتہائی نہیں؟

کہ ان کے فیصلے کو قبول کر لوں۔“

وہ بہت ضبط سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی، لیکن اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آنکھ

پانی چھلک گیا تھا۔



شاہ سکندر کے تین دن اسلام آباد میں بے انتہا مصروف گزرے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی انہیں

کا خیال آ رہا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے شاہ پور نہیں رہنے دیں گے۔ جیسا کہ اس نے بتا دیا

اسلام آباد میں رہتی ہے تو وہ اس بجائے اسے اسلام آباد لے آئیں گے اور بائبل میں اس کی رہائش کا

”چنانچہ نہیں پھر آئے گی بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے خود کھامی کے انداز میں کہا تھا۔ لیکن باباجان سن کر بولے۔

”ضرور آئے گی۔ وعدہ کیا ہے اس نے ہم سے۔“

”آپ خود چھوڑ کر آئے ہیں اسے یا کسی کے ساتھ بھیجا ہے۔“ انہوں نے اچانک کسی خیال کے تحت چہرہ۔
”کسی کے ساتھ کیوں بھیجتے، ہم خود لے کر گئے تھے اور اس کے گھر کے سامنے اتار کر آئے ہیں۔“

باباجان نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں کسی کے ساتھ بھیجنے والی بات بری لگی ہو۔

”اچھا!“ شاہ سکندر یقین کر بھی رہے تھے اور نہیں بھی اور اندر ہی اندر الجھ رہے تھے کہ پانچ روز پہلے آسیہ نے فون پر ان سے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں کتنی صداقت تھی۔

”ابھی رہو گے یہاں یا پھر کہیں جانا ہے؟“ باباجان نے انہیں سوچتے دیکھ کر فوراً ”ان کا دھیان بنانے کی کوشش کی۔

”بس دو دن ہوں پھر کینڈا جانا ہے۔“ انہوں نے سرسری اپنا پروگرام بتایا پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ کو معلوم ہے جہانگیر بھائی ڈاکٹر آسیہ کے پاس گئے تھے۔“

”اچھا کب؟“ باباجان میسرانجان بن گئے۔

”تھیں!“ ایک ہفتے پہلے۔“

”تھیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ڈاکٹر آسیہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھیں، جہانگیر بھائی نے صباحت کی رخصتی پر زور دیا اور جب وہ نہیں مانیں تو دھمکی کے طور پر یہ کہہ آئے کہ مدیہ ان کے قبضے میں ہے۔“ شاہ سکندر صاف گوئی سے بتا کر کہنے لگے۔

”جہانگیر بھائی بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کروں گا برسوں پہلے آپ نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اب آپ سن لیں کہ اس گھر میں میری بیٹیاں رہتی ہیں۔ دھمکی تو دور کی بات اگر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا بھی گیا تو۔“

وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ پیچھنے لگے۔

”تم ناخن بدگمان ہو رہے ہو سکندر۔ تمہاری بیٹیاں کیا ہماری کچھ نہیں لگتیں۔ خون ہیں ہمارا اور تم سے پہلے ہم جہانگیر سے پوچھیں گے کہ اس نے ڈاکٹری سے ایسی بات کیوں کی۔“

باباجان کو کہ اندر ہی اندر اس صورت حال سے بوکھلا گئے تھے۔ لیکن ظاہر نہیں کیا اور ان کی طرف دارا کرتے ہوئے شاہ جہانگیر پر غصہ کرنے لگے تھے۔

”بہر حال جہانگیر بھائی کو دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کینڈا سے واپسی پر صباحت کا معاملہ میں نہ طے کروں گا۔“ وہ دخل کی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہاں اور کوشش کرنا مدیہ کی بات بھی یہیں طے ہو جائے۔ تیور کے ساتھ۔“ باباجان نے کہا تو وہ انہیں دہر کر رہ گئے تھے۔



”کتنی خوب صورت جگہ ہے اور کتنا سکون ہے یہاں۔ میرا بس چلے تو میں ساری زندگی کے لیے یہیں جاؤں۔“ وہ چاروں اور دیکھتی ہوئی ایک جذب کے عالم میں بولی تھی۔

چند قدم آگے چلتا شاہ تیور اس کی بات سن کر رک گیا اور پلٹ کر پوچھنے لگا۔
”رہ سکوں گی؟“

”کیوں نہیں؟ یہ تو میرے خوابوں سے بھی زیادہ حسین جگہ ہے۔ لیکن میرے اور کون سے خواب پورے ہوئے جو یہ ہو گا۔“ وہ اچانک آزرہ نظر آنے لگی۔ لہجہ میں بھی دکھ سمٹ آیا تھا جسے محسوس کر کے شاہ تیور

کے قریب آگیا۔

”تم خواب بھی دیکھتی ہو؟“

”جہیں حقیقت میں کچھ میسر نہ ہو، وہ خواب ہی دیکھتے ہیں۔“

وہ کالج کی طرف جاتی سرخ بھری کی روش پر قدم رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اور صبا کس ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ کاش بابا شروع ہی میں ہمیں چاہا لے آتے تو ہمارے اندر اتنی تحریروں میں نہ ہوتیں۔ ہر بات، ہر چیز کو ترسے ہیں، ہم، ماما کے ساتھ جو کچھ

اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا لیکن انہوں نے اور ان کے سب گھر والوں نے ہمیں ہی قصور وار سمجھ لیا جی، ہم سے بدلہ لیتے رہے۔ بہت زیادتیاں ہوتی ہیں ہمارے ساتھ۔“

”پھر بھی تم وہاں جانا چاہتی ہو؟“ شاہ تیور نے فوراً ”نہ کا تو وہ ایک دم تیز ہو کر بولی۔

”کس نے کہا، میں جانا چاہتی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میں بھی نہیں جانا چاہتی میرے تو دوبارہ وہاں جانے کا سوچ کر اٹھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ برا سلوک ہو گا میرے ساتھ۔ لیکن میں کیا کروں۔ ادھر بابا جان جو جلی میں بھی میرے لیے جگہ نہیں ہے شاید۔“

”ارے یہ تم سے کس نے کہا۔“

”میں محسوس کر سکتی ہوں شاہ تیور! کوئی نہ کہے تب بھی میں جانتی ہوں کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک بابا کو بھی میری پروا نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری اصل شناخت یہیں سے

ہے اگر ماما نے اتنی پابندیاں نہ لگائی ہوتیں تو میں بہت پہلے یہاں آچکی ہوتی اور اسے ساتھ صبا کو بھی لے آتی۔“
”غیر وہ تو اب آئی جائے گی اور تم بھی نہیں جاؤ گی۔“ شاہ تیور نے کہا تو وہ قدم روک کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کہہ رہا ہوں ناں تم نہیں جاؤ گی۔“ اسے یقین دلانے کی خاطر اس نے زور دے کر اپنی بات دہرائی پھر کہنے لگی۔

”تمہیں یہ کالج پسند ہے تو ہم نہیں رہیں گے۔“
”ہم۔“ اس کے ہونٹ ذرا سے نیم ہوا کر پھر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

”تم اور میں، یا تمہیں میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض ہے۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس

کا آنکھوں میں جھانکا تو وہ فرسوس ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔
”چاہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”ارے!“ وہ ذرا سا ہنسا۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہروں کے بات کر رہا ہوں۔ سچ بتاؤ اپنے خوابوں کی حسین راہ گزر پر تم کس کا ہاتھ تھام کر چلتی رہی ہو، کوئی ماورائی

تقل یا مجھ جیسا عام سا انسان۔“
”عام سا، میرے خدا۔“ وہ بھاگ کر کالج کا گیٹ پار کر گئی۔

شاہ تیور خوشوار سے احساس میں گھر کر اس کے پیچھے دھنکتا رہا۔ کوریڈور سے آگے جب وہ دروازے کے اندر

تپ ہو گئی تب جب سے موبائل نکال کر باباجان کے ممبرش کرنے لگا۔
”السلام علیکم بابا جان! میں تیور بات کر رہا ہوں۔“

”جی سب ٹھیک ہے۔“
”میں بابا جان! کوئی مسئلہ نہیں بلکہ وہ تو بہت خوش ہے یہاں۔“

”آپ شاید اسے سمجھے نہیں۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی۔“
”جی جی۔“
”اگر آپ کہیں تو اسے شاہ پور لے آؤں۔“
”اچھی بات ہے۔ ویسے آپ سکندر بیچا کو ابھی بتادیں کہ ان کی بیٹیاں اپنی ماں کے پاس خوش نہیں ہیں۔“
”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

”خدا حافظ!“ اس نے موبائل بند کر کے واپس جیب میں رکھا پھر اس کے پیچھے اندر آیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

”اے!“ شاہ تیور نے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لرایا تو وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹی پھر جانے کیا ہوا تھوں میں چڑچڑھایا کروانے لگی۔

”اے مدیحہ!“ شاہ تیور نے آہستگی سے اس کی دونوں کلاسیاں تھام کر ہاتھ نیچے کیے۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس سے مجھ سے؟“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس کی طرف جھکا۔

”نہیں۔“ وہ ہتھیائیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”پھر؟“

”میری قسمت سے!“ اپنے خوابوں سے کہیں مجھے رسوا نہ کر دیں۔“

”بیوقوف! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اپنے دل سے سارے ڈر، سارے خوف مٹاؤ والو اور بھول جاؤ اب تک جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ بہت جلد ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

وہ بہت مضبوط لمبے میں اسے اپنے ذات کاٹان دے رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا تم میرا یقین نہیں کر رہی؟“

وہ ذرا سانسبات میں سر ہلا کر اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔ تب ہی باہر گاڑیاں رکنے کی آواز پر وہ چونک کر بولا۔

”لو آگئے سب لوگ۔“

”کون؟“ اس نے بے دھیانی میں پلٹ کر پوچھا۔

”کرزنز۔“ جاؤ تم منہ دھو لو ورنہ سب سمجھیں گے۔ میں تم پر ظلم و ستم تو ڈرتا رہا ہوں۔“ اس نے شوخ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھاگ کر واش روم میں بند ہو گئی۔

چند لمحوں بعد سارے میں ایک شور مچ گیا، علی جمالیگر بھی آیا تھا جسے دیکھ کر شاہ تیور حیرت بھری آواز میں چلایا۔

”اے ڈی سی صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔“

مدیحہ واش روم سے نکل کر آرہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔

”کبھی، ہم ان کو کبھی ایسے کھڑے دیکھتے ہیں۔“

”ہائیں! ہم ہمارے قافلے میں تو نہیں تھیں۔ علی جمالیگر نے حیران ہو کر مدیحہ کو دیکھا تو اس سے پہلے شاہ تیور بول پڑا۔

”ہم قافلے کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے آگئے تھے۔“

”اچھا!“ علی جمالیگر ایک نظر شاہ تیور پر ڈال کر پھر سوچتے ہوئے انداز میں مدیحہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ فصا مسکرا کر بولی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟“

”بالکل ٹھیک اور اس کاٹھ میں آکر تو بہت خوش۔“

”تیور بھائی! اہلخانے پینے کا کیا انتظام ہے۔“ ایک طرف سے رابعہ نے پکار کر پوچھا تو شاہ تیور ادھر متوجہ

گیا۔

دست سب کی فیورٹ ڈشز تیار کروائی ہیں۔“

وہ کس بات کی ہے۔ بس فوراً ستر خوان پھو او پھر مجھے جانا ہے۔“ علی جمالیگر نے کہا۔

مطلب؟ آتے ہی جانے کی بات کرنے لگے۔“

یاد میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ سکندر پچاسے ملنا تھا لیکن وہ میرے شاہ پور پہنچنے سے پہلے ہی تھے۔ اب پتا نہیں کراچی میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں۔ پانچ بجے ان کی کینڈا کی فلائٹ

جاگگیر نے کہا تو مدیحہ بے ساختہ پوچھنے لگی۔

”کنڈا جا رہے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟“

”دس دن تو لگیں گے، تم چلنا چاہو کراچی تو میرے ساتھ چلو۔“ علی جمالیگر نے جواب کے ساتھ کہا تو تیور لپ پڑا۔

”میں یہ میرے ساتھ جائے گی کیوں مدیحہ؟“

”اس کے جواب پر علی جمالیگر ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”بے تمہاری مرضی آپ پلیر نہ کھانا۔“

”اچلو مدیحہ! منبر پانی کے فرائض نبھادیں۔“ شاہ تیور نے چلتے ہوئے مدیحہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”سب حیران ہو کر دیکھنے لگے تھے۔

لہانا کھاتے ہی علی جمالیگر بہت غلٹ میں سب کو خدا حافظ کہتا ہوا نکل گیا تو کتنی دیر تک سب اسی کے میں باتیں کرتے رہے۔ خصوصاً اس کی شادی پر جو بد مزگی ہوئی تھی اس کا سب کو افسوس تھا۔ اور یہ کہ اس کا معاملہ طے کیوں نہیں ہوا۔

”جان ڈھیل دے رہے ہیں ورنہ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔“ شاہ عازم نے کہا تو آغا اس کی تائید دے بولا۔

”جیسے میرے باپ کو ڈھیل دی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں اس چنگل سے نکالنا تھا اور علی کو پھنسانا ہے۔ با

آخر میں اس کے ساتھ دو چار تھپے اور بھی شامل ہو گئے تھے۔

”یہ کچھ پریشان سی ہو کر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔“ معا شاہ تیور کی اس پر نظر پڑی تو سب کو خاموش نہ ہوئے بولا۔

”ایک فضول باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے۔“ چلو مدیحہ! ہم باہر چلتے ہیں۔“

”تاہم علی کی طرح یہ بھی۔“ عازم کے مسخرانہ انداز پر وہ اسے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سب کے درمیان یہ کہا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھا دیا۔

”بالے جاؤ گے اسے؟“ آغا نے پوچھا لیکن وہ ان سی کرتا ہوا مدیحہ کو لے کر چل پڑا تو عقب سے الماس کی

ناکھی۔

”ہاں! کانجام بھول گئی ہے۔“

”جاؤ آپ کو یقین آگیا کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔“ گیت سے نکلتے ہی مدیحہ نے دکھ سے کہا۔

”ہائیں! جو کرتا ہوں کیا تمہارے لیے صرف میری محبت کافی نہیں ہے اور کسی کی پروا مت کرو۔“

”میں نہیں کروں۔ آپ نے سنا نہیں۔ الماس کیا کہہ رہی تھی۔ اگر پاپا کی طرح آپ نے بھی مجھے۔“ اس کی

ناکھی۔

”ف! سکندر پچاسے تمہاری ماں کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا۔ بابا جان نے مجبور کیا تھا انہیں۔“ وہ

تو تھا مگر روش پر دھیرے دھیرے چلنا ہوا ساری کہانی دہرانے لگا تھا۔

وہ سراسیمہ سی سن رہی تھی۔

من نہیں تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ ہفتہ کیا میدان انتظار کر سکتا تھا اور اب تو جیسے ایک ایک پل اتنا اہم اس کا بس چلتا تو وہ وقت کو میس روک دیتا جو اس کی زندگی چھیننے کے درپے ہو گیا تھا۔

سوچنے کے بعد اس نے بابا جان کو فون کیا اور جب انہیں نوٹس کا بتایا تو وہ چیخ پڑے تھے۔
ہو گئی ہے وہ عورت، اپنی زندگی سے سبق نہیں سیکھا اس نے جواب بتی کو طلاق دلو اگر گھر بٹھانا چاہتی ہے سمجھا دو کوڑ پکھری کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے پورے خاندان کو گھسیٹ لیں

اگر بس بابا جان! غصے اور جوش سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو گا نہ ہی میں کوئی دھاندلی چاہتا ہوں آپ میری کو پیچھیں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔ اس نے ناراض لہجے میں ٹوک کر کہا۔

فائدہ مارا باپ، اسی پر تو ڈاکٹر نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ بابا جان سخت تلمٹائے ہوئے لگ رہے تھے۔
کب گئے تھے اب؟ اس نے فوراً پوچھا۔

بڑھ ہفتہ ہوا ہے۔ بہت بے عزتی کی اس عورت نے تمہارے باپ کی اس کے بعد بھی اگر تم چاہتے ہو بارہا سے وہاں جانے کو کہیں تو۔

ن۔ وہ ایک دم بول پڑا۔
چاہو ہم کیا کریں۔

اگلے تو میری اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا پھر بھی میں یہ ضرور کروں گا کہ اس سارے قصے میں صباحت کا کوئی حصہ ہے۔ اس لیے اس کی ماں کے کیے کی سزا سے نہیں ملتی چاہیے۔ اس نے کہا۔

با کا خیال کر کے تو ہم خاموش ہیں ورنہ۔ بابا جان فوراً بولے اور خاموش بھی ہو گئے۔
بابا جان! میں پھر بات کروں گا۔ اس نے اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

بہرمت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب شاہ سکندر ہی کو ڈاکٹر آسیہ کے پاس جانا چاہیے اور اس سے بہت جلد سے شاہ سکندر کا انتظار کرنا تھا۔

با کی تیل بج رہی تھی۔
لے لے کچھ دیر انتظار کیا کہ صباحت فون اٹھائے گی، لیکن وہ پتا نہیں کہاں تھی آخر انہیں خود ہی کمرے سے ایک نیکہ دوسری طرف کوئی مشغل مزاجی سے منتظر تھا۔

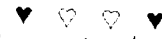
بولے، نیل نے ریسپور اٹھایا اور دوسری طرف کی آواز سننے ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔
دو کیسی ہو؟ کہاں ہو؟

اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا۔ تم ٹھیک تو ہونا۔؟
بابا کیا تم نے؟

با کی سماعتوں نے جانے کیا سنا تھا کہ پورا وجود سن ہو گیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ نیچے گرا کر ریسپور فون اس کے بعد بھی وہیں کھڑے رہے اتفاق سے اسٹک بھی ہاتھ میں نہیں تھی ورنہ اس کے سارے خود کو ٹٹلیتے۔ انتہائی بے بسی سے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار صباحت کو پکارا تھا۔

بابا! صحت اپنے کمرے سے نکل کر آئی اور انہیں دیکھتے ہی بٹھٹھک گئی تھی۔
بابا! تم نے نیل بھائی؟

بولے کچھ نہیں تو قریب آکر صباحت نے ان کا بازو تھام لیا۔
ناوا بھائی۔ میاں کیوں کھڑے ہیں؟ پھر فون پر نظر پڑی تو اندر ہی اندر پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ کس کا تھا۔؟



علی جا نگیر ایئر پورٹ پر بس تھوڑی دیر کے لیے شاہ سکندر سے مل سکا تھا اور اصل بات جو وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا وہ بھی نہیں پوچھ سکا کیونکہ وہ اپنے وفد کے ساتھ تھے۔ اس لیے بس سلام دعا ہی ہوئی۔ البتہ اس بات پر اس نے بہت زور دیا کہ کینڈا سے واپسی پر وہ شاہ پور جانے سے پہلے اس کے پاس آئیں اسے ان سے بہت ضروری کام ہے اور انہوں نے ہائی تو بھلی تھی پھر بھی وہ ان کی واپسی کی تاریخ کنفرم کر کے آیا تھا تاکہ خود انہیں ریسپو کرنے جاسکے۔ اصل میں وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آسیہ نے ان سے صباحت اور اس کے متعلق کیا بات کی۔ فطری سی بات تھی وہ یہی سوچ سکتا تھا، مدحیہ کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں گیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر سکندر کو سی آف کر کے جب وہ گھر پہنچا تو کمرہ دین چائے کے ساتھ ہی اسے ایک لفافہ بٹھا کر دیا۔

”ابھی ایک آدمی دے گیا ہے۔ میرا انگوٹھا بھی لٹوایا تھا اس نے۔“
”اچھا جاؤ۔“ وہ لفافے پر تامل دیکھ رہا تھا۔ فوراً ”کرم دین کو بھیج کر چائے کا کپ نیل پر رکھا اور لفافہ کھول کر دیکھا۔

نکالتے ہی ٹھنک گیا۔ پھر جب تحریر پر نظریں دوڑائیں تو بری طرح چکرا گیا۔ دل کسی طرح یقین نہیں کر رہا تھا صباحت خلع کا دعوا کر سکتی ہے۔

”میرے خدا۔“ اس نے صوفے کی بیک پر سر رکھا تو اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا جو بات گمان میں نہیں رہے ہو گئی تھی۔

گزشتہ تین چار روز سے وہ کتنا متحس ہونے کے ساتھ پر امید بھی تھا کہ آسیہ اور شاہ سکندر کے درمیان را ہونے سے اس کا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا اور اس خیال کے ساتھ اس نے اس منزل سی کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی تھی۔

میں تو کبھی کچن میں اور بیڈ روم میں جانے کیوں وہ دے پاؤں داخل ہوتی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اسے دیکھتے محسوس کرتا تھا اور بھی بے اختیار اسے چھونے کے لیے اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھ کر رہ جاتا۔ تو اسے لگتا جیسے وہ کوئے میں کھڑی ہنس رہی ہے۔ کیسی بدھر ہنس ہوتی تھی جو اس کے اندر خوشوار سی پھیل جاتی تھی۔

”نہیں صباحت شاہ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنٹھوں کو زور سے دبایا پھر آجھکے سے سیدھا ہوا بیٹھا اور سیل فون سیٹ قریب کھینچ کر اس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تیسری تیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔
”ہیلو!“

”دیکھو! ابھی تمہاری طرف سے نوٹس موصول ہوا ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے بھیجا ہے یا۔“ وہ چھوٹے سے لہجے میں بولا۔

اپنی مرضی سے بھیجا ہوا کسی اور کی کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ دھڑ دھڑاتی ہوئی لگ رہی تھی۔
”فرق پڑتا ہے صباحت شاہ! فرق پڑتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہی ہو۔“

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“
”یہی کر سکتی ہو تم۔“ اس نے خود ہی ریسپو بیٹھ دیا۔

اس لڑکی کو وہ نہیں سمجھا سکتا تھا اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کبھی سوچتا خود اکثر آپاس جائے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ صباحت کے ساتھ وابستگی بھی بتا ڈالے۔ لیکن زیادہ دیر تک سوچ پر قائم نہیں رہ سکا کیونکہ اس کے خیال میں وہ ڈاکٹر آسیہ سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا البتہ شاہ صباحت پر اپنا حق جتا کر کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بھی آج ہی باہر گئے تھے اور ایک ہفتے سے پہلے

”کسی کا نہیں، وہ میں نے اسٹک پتا نہیں کہاں چھوڑ دی۔“ انہوں نے بات بناتے ہوئے خود کو سمارا دیا۔
 خاطرِ صباحت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”بس نیل بھائی! اب اسٹک کا پیچھا چھوڑ بھی دیجیے۔ اس کے بغیر چل تو سکتے ہیں۔“ وہ ان کی اسٹک سے چڑ
 بولی تھی۔
 ”کیا کروں؟ عادت ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر خود کو خالی خالی سامحوس کرتا ہوں ابھی دیکھو ہاتھ میں نہیں تھم
 میں۔“ وہ جانے کیا کہتے جا رہے تھے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔
 ”یہ یہاں رکھی تو ہے۔“ صباحت ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے اسٹک دیکھ کر بولی۔
 ”ارے، میں سمجھا شاید راستے میں کہیں گر گئی۔“ انہوں نے قصداً حیرت کا مظاہرہ کیا۔
 ”گر ہی جاتی تو اچھا تھا۔“ وہ یونہی کہہ گئی۔
 ”کیوں کیا تمہیں بھی مدھوک کی طرح اس کی آواز بری لگنے لگی ہے۔“ انہوں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے
 پوچھا تو وہ اپنی یونہی کسی گئی بات پر جڑ جڑ سی ہو کر بولی۔
 ”نہیں تو۔“

”اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ وہ اپنی رائفنگ نیل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔“ اس نے ان کے ہیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو نیل نے ذرا سی گردن موڑ کر
 دیکھا پھر اپنے سامنے فائل کھول دی اور بظاہر اس پر نظریں دوڑانے لگے جبکہ ذہن مدحیہ کو سوچنے لگا تھا۔
 آواز ہمیشہ کی طرح کھنکتی ہوئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی دباؤ میں ہے۔ بلکہ یہاں سے بھی
 آزاد جب ہی تو اپنے بارے میں فیصلہ کر کے خوش ہو کر انہیں بتا رہی تھی۔ ان کی ساعتوں میں ابھی بھی اس
 الفاظ گونج رہے تھے۔ جو ان کی روح پر کسی تازیانے سے کم نہیں تھے اور جب آئیہ پھو بھی سنیں گی تو۔
 اس سے آگے سوچ کر ہی وہ پریشان ہو گئے اور بے حد مضطرب۔ تب ہی صباحت انہیں پکار کر پوچھنے لگی۔
 ”نیل بھائی! اس کا فون تھا؟“

”کب؟“ انہوں نے بہت سنبھل کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لابی میں کھڑے تھے۔ مجھ سے مت چھپائیے میں نے خود تیل سنی تھی اور
 اٹنڈ کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ صباحت کے ذہن میں علی جمالیگر کا خیال تھا جب ہی وہ جاننا چاہتی تھی کہ ا
 کیا کہا۔

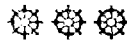
”پھر اس میں اچھنے کی کیا بات ہے۔ کیا میرا فون نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔
 ”ہو کیوں نہیں سکتا۔“ وہ الجھ گئی۔
 ”پھر؟“

”پھر یہ کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔
 ”ہاں چھپا رہا ہوں، ضروری نہیں ہے کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔
 ضبط کرنے کی وجہ سے۔

”اور تم آپ کیا جاننا چاہتی ہو۔ تمہارے بارے میں پھوپھو نے جو فیصلہ کرنا تھا اگر لیا اور اس پر تم سے
 کروالیے اور شاید علی جمالیگر کو بھیجا بھی چکی ہیں۔“
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر بولی۔
 ”پھر اور کیا جاننا چاہتی ہو۔ اس نوٹس پر علی جمالیگر کا رد عمل تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں قیاس
 ہوں۔“ ان کا لہجہ ہنوز تھا۔ جس پر وہ پڑ کر کہنے لگی۔
 ”آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بالکل میری طرح ہیں آپ۔ بزدل اور کم ہمت آپ نے آپ پر ذرہ برابر بھرا

”اچانک جیسے ٹوٹ گئے۔“ اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا تو یوں جانے دیتا اسے، کبھی نہیں اور وہ بھی کیسی
 بوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔
 وہ ان کے ٹوٹنے سے کچھ گم صم سی ہو گئی تھی۔
 ”نئی ہو، آپ وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟“ انہوں نے اپنے خیال سے نکل کر اسے دیکھا اور اس کے نفی
 پر غمی سانس کھینچ کر بولے۔

احت کے صرف ہونٹ کھلے تھے، حلق سے آواز نہیں نکلی تھی اور نیل بھی جیسے کسی پاتال میں سے
 اس کا فون آیا تھا۔ خود تار رہی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے۔ شاہ تیور کے ساتھ۔“
 صباحت کا سر نفی میں ہلکا ہلکا اور نیل نے جیسے تھک کر چیڑ کی بیک پر سر نکال دیا تھا۔



یہ بعد صباحت اپنی جگہ سے اٹھ کر نیل کے پاس آئی اور آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی
 بانی! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے ہمیں۔“
 ہاتھ تھک کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔
 ”راہیں ہمارے ماں باپ کا ہے۔ جنہوں نے اپنی اپنی اثنا میں اولاد کو بیکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر ہماری
 ماںیں کبیر و ماہر کر لیتیں تو ہم ادھورے ہوتے نہ ہمیں ایسے حادثات پیش آتے۔ میں مدحو، تم، ہم
 ابھی مکمل نہیں ہے۔ ہمارے اندر ہمیشہ ایک محرومی کا احساس رہا جس نے ہماری شخصیت کی تکمیل
 دی۔

”رجہ حساس۔ اس کے ساتھ تمہارے لاشعور میں ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں کوئی تمہیں تمہاری ماں یا
 نہ دے مارے۔ ہر مقام پر جھپٹتی اور ٹوٹی چلی گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ تمہارے اندر لڑنے اور احتجاج
 اقت ہی نہیں تھی۔ تھی، لیکن اس خوف نے تمہیں اپنا دفاع تک نہیں کرنے دیا۔

”جو اس خوف نے الٹا اثر ڈالا۔ یعنی تمہارے بالکل برعکس وہ بے حس، خود سر اور باغی ہو گئی اور اپنی
 نہ ہر ایک سے لینے لگی اور وہی ٹھیک ہے۔ جو نہ جھپٹتی ہے نہ ٹوٹی ہے۔ اور جو چاہتی ہے، پھینکتی
 اپنا دامن نہیں کرتی۔ میں اب سے نہیں شروع اسے پسند کرتا ہوں۔ مجھے وہ چیخ چلا کر اپنی بات منوالی
 چلی گئی۔ لیکن وہی بات جو ابھی تم نے کہی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ

بستہ اور اعتماد کی کمی نے ہی مجھے بزدل بنا دیا، جو میں اس کے سامنے اظہار نہیں کر سکا اور تمہاری طرح
 مقام پر جھٹکا اور ٹوٹنا چلا گیا۔ حالانکہ سب لوگ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن یہ ساری محبتیں بھی
 ”محرومی کے احساس کو کم نہیں کر سکیں۔ اس لیے ابھی صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کر سکے۔ ہم ڈرتے
 اتر رہیں گے۔“

”کچھ نہیں دیکھ تھا،“ تنہی بھی سمٹ آئی تھی۔
 ”آپ کھڑی انہیں سن رہی تھی۔ جب آخر میں انہوں نے ہونٹ بھیج کر جانے بقیہ تنہی اپنے اندر
 دھکیلی گویا ہر آنے سے روکا۔ تنہی تنہی آواز میں پوچھنے لگی۔

اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے۔ شاید ان کے لاشعور میں کہیں یہ خیال تھا کہ وہ اگر صحیح وقت پر اپنے انگھار کرنے کے ساتھ اسے خوبصورت زندگی دینے کا وعدہ کرتے تو وہ بھی فرار کا راستہ اختیار نہ کرتی اور یہ اس کے ہر عمل کے ذمہ دار رہی ہوں گے۔

ان میں تمہیں سمجھا سکتا روک سکتا ہو! انہوں نے بے بسی اور دکھ سے سوچا تھا۔
ہرات کے تیسرے پیر جب وہ ہر طرح سونے کی کوشش میں ناکام ہو گئے تو اٹھ کر میسر پر آ گئے۔ خاموش ہو کر سر سر ہاٹ، بہت لمبا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جبکہ روشنی کہیں نہیں تھی۔ ان کا دل چاہا، ساری وجہ تک کر یہیں ننگے فرش پر سو جائیں۔ کتنی دیر ادھر سے ادھر ٹھل کر وہ اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کرتے رہے اور جب کسی حد تک کامیاب ہو گئے تب لانی میں آکر امریکا کی کال مانے لگے، کیونکہ خود کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں بار بار امریکا کا خیال بھی آ رہا تھا کہ وہ اگر مدیہ کے ساتھ وفاداری نبھاتا تو وہ کبھی بے نہ جاتی۔ بہر حال چند لمحوں بعد جب ادھر اچلاؤں پر آیا تو وہ چھوٹے ہی بولے تھے۔

نہارے ایک غلط قدم نے یہاں کس کس کی زندگی خراب کی۔ کبھی سوچا تم نے۔
وہ؟ فیمل بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ احمران کی آواز سن کر جہاں خوش ہوا وہاں الجھ بھی گیا تھا۔
مرا اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے جج کر کہا تو احمریجے سمجھ کر گہری سانس کھینچ

میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر شرمندہ ہوں۔
اب تم کیوں شرمندہ ہو گے۔ شرمندہ تو میں ہوں میں نے پھپھو کو یقین دلایا تھا کہ مدحو کے لیے تم سے بہتر اور بس ہو سکتا۔ ان کا لہجہ ہنوز تھا۔

نپ کو شرمندہ ہونا بھی چاہیے، کیونکہ آپ نے پھپھو سے غلط بیانی کی تھی۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے مدحو کے لیے بہتر تھیں۔ احمران کی بات سے خائف ہونے کے بجائے آرام سے بولا تو انہوں نے مکر پر چھا۔

انہوں نے؟
نہیں! احمران نے ان پر چڑھے آہنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے اور آواز نکلی تھی۔

نہیں! کیوں خود کو چھپائے رکھا آپ نے محبت گناہ تو نہیں ہے جس کے اعتراف پر آپ کو دار پر لٹکا دیا گیا کہہ رہے ہو احمران! وہ ملتی لمبے میں بولے۔ جیسے خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔

نہیں! کہہ رہا ہوں۔ غلط کام میں نے نہیں، آپ نے کیا تھا۔ میں تو شکر ہے بچ گیا اور نہ اگر مدحو سے شادی کے آپ کے جذبات کی خبر ہوئی تو میں ساری زندگی انگاروں پر چلتا۔ اب آپ پوچھیں گے مجھے کیسے خبر ہوئی تو میں وقت پر رخصت جب میں نے آپ سے کہا تھا مدحو کا خیال رکھیے گا تو آپ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہٹا دیا۔ اس وقت آپ کے دھیان میں یقیناً مدحو تھی جو آپ نے بہت دھیمی آواز میں خود کھائی کی تھی۔ کوئی لمحہ سے بھی غافل ہوتا ہے۔ احمران روتی میں بول رہا تھا۔ ایک لحظہ کو دار کا پھر شروع ہو گیا۔

نہیں! بھائی! وہ ایک لمحہ تھا جس نے آپ کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا آپ کیس نظر نہیں آتا۔ منظر دلوں میں آپ ہی آپ تھے، پھر میں کیوں زبردستی اپنا آپ منوانا اور اگر منوانا بھی لیتا تو کیا ملتا۔ مجھے۔
وہ جو کم صدم کھڑے تھے چونک کر بولے۔ وہ تو تم سے محبت کرتی ہے۔
نہیں! صرف اپنا آپ منوانا چاہتی تھی اور آپ تو اسے شروع سے مانتے ہیں۔ اس لیے وہ صرف آپ کے

اور فیمل بھائی! مدحو؟
اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنے آپ سے بھی بھاگ رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں تک جائے گی۔
کرے کسی راستے میں جج اس کی منزل آجائے وہ پالے اپنی منزل۔ ہم میں سے کوئی ایک تو۔ وہ بولے۔
خود ہی چوئے اور جیسے اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔
مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ فیمل بھائی! اور جب ممانیں گی تو کتنی پریشان ہوں گی۔ وہ رو بائی ہوئی۔
دکھ اور پریشانی کی بات تو ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ابھی پھپھو کو معلوم نہیں ہوتا چاہیے۔
تمہاری ٹینشن انہیں کیا کم ہے۔
اور۔ اور کیا کہہ رہی تھی مدحو؟

کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔
مجھے لگتا ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے یا پھر اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میرا معاملہ کورٹ میں چلا گیا ہے۔
نے پر سوچ انداز میں کہا تو فیمل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔
”بس ختم کرو یہ موضوع۔ کہیں پھپھو سنتی ہوئی نہ آجائیں۔ اور ہاں دیکھو میں تمہارے لیے ایک کتاب تھا۔ وہ نیکے کے پاس رکھی ہے، لے لو۔“
اس نے وہیں کھڑے کھڑے کتاب کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر بولی۔
”میرا کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”دل چاہے یا نہ چاہے پھر بھی پڑھنی ہے۔ اٹھاؤ اسے۔“ انہوں نے رعب سے کہا تو اس نے بڑھ کر اٹھائی اور وہیں کھڑے اٹھنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر بولے۔
”یہاں نہیں آپ نے کمرے میں جاؤ۔ مجھے لیکچر تیار کرنا ہے۔“
”تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ایسے ہی لیکچر دینے میں ماسٹر ہیں۔“

وہ تپتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل گئی تو انہوں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر آکر لیٹ گئے کرنے کا تو بہانا تھا۔ اصل میں تنہائی چاہتے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ تنہائی کتنی عذاب ہوگی مگر انہیں پسند ہو رہے تھے۔ اپنے جرم پر خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتے تھے۔ مدیہ سے محبت کر کے انہوں ہی کیا تھا۔ وہ تو ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ بلکہ شروع سے خود کو سرزنش کرتے آ رہے تھے۔ جانے کیوں وہ کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی بہت اعلا و ارفع اور ناقابل حصول نہیں تھی، لیکن انہیں اپنے تھی۔ سب سے الگ، سب سے جدا۔ شاید اس لیے کہ نظروں میں سما کر ان کے دل میں اتار گئی تھی اور اتار جائیں وہ یوں ہی سب سے الگ، سب سے جدا لگتے ہیں۔ بہر حال اس میں ان کا شعوری عمل دخل یوں بھی دل کے معاملے میں کبھی کبھی انسان بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بے اختیار تھے اس انہوں نے بھی اس کے حصول کی تمنا نہیں کی تھی۔ اپنی محبت کو اس غرض سے پاک ہی رکھا تھا اور سوچا کہ وہ ان کی نہیں تو کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس کے لیے اچھا ہی سوچتے تھے۔ جب کے ساتھ مل گئی ہوئی تھی تب بھی وہ خوش تھے تو اس خیال سے کہ وہ احمر کے ساتھ خوش رہے گی۔ کسی حسی دامن کا خیال آتا تو وہ فوراً سر جھٹک دیتے تھے۔

پھر انہیں احمر کے باہر شادی کر لینے کا دکھ بھی اس کی وجہ سے تھا۔ ایک بار بھی اپنی محبت میں خود نہیں سوچا۔ بس اس کے دکھ کا احساس تھا جو وہ اب تک احمر سے ناراض تھے۔
اور اب گو کہ اس نے بہت خوش ہو کر بتایا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے ساتھ شادی کر رہی ہے، لیکن انہیں لگتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے اندر اسے پانے کی کوئی تمنا جاگ اٹھی تھی، بلکہ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ یہاں نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً دھوکا کھانے جا رہی ہے اور یہ سراسر اس کا اپنا عمل، اپنا فعل تھا۔ اس کے

ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ بس اب دیر نہیں کریں خلیل بھائی! س سے پہلے کہ۔۔۔“ احمر کی بات جاری لائن کٹ گئی۔
 ”میرے خدا!“ ان کا ریسور والا ہاتھ یوں نیچے گرا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو، پھر اپنے کمرے میں بجز گھٹیتے ہوئے آئے تو مدحیہ کے ساتھ احمر کا دل بھی ان کے ساتھ تھا۔

~~*

شاہ تیور اسے پیچھو شہر یانو کے پاس جموڑ کر خود شاہ پور چلا گیا تھا۔
 اور گو کہ رست باؤس اور کالج کی نسبت وہ پھوپھی کے گھر میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی اس کے سکون سے سو نہیں سکی۔ رات بھر وقفہ وقفہ سے اس کی آنکھ کھلتی رہی تھی پھر بھی صبح اس نے جلدی دیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد کمرے سے نکل کر پیچھو شہر یانو کو ڈھونڈتی ہوئی گول برآمدے میں آئی تو بیٹی سحر رنگین بیاہوں والی چارپائی پر بیٹھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مرغیوں کے آگے ڈال، اسے دیکھا تو قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

”تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟“
 ”بس اچانک آنکھ کھل گئی پھر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ کہتی ہوئی چارپائی کے کنارے گئی۔

”آرام سے بیٹھو۔ لمبی پیوگی۔“
 ”نہیں۔ لمبی نہ چائے۔ سب کے ساتھ ناشتا کروں گی۔“ وہ اس کے سامنے سے روٹی کے ٹکڑے مرغیوں کو ڈالتے ہوئے بولی۔

سحر خاموش رہی تو قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔
 ”پیچھو کب آئیں گی؟“
 ”امی تو ان کے وقت ہی اٹھ جاتی ہیں۔ ابھی قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ پھر پہلے احمد اور حسن کو گی اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔“ سحر یہی کہتی تھی کہ وہ ناشتے کی وجہ سے پیچھو کا پوچھ رہی ہے؟ پورا پروگرام بتا ڈالا۔ تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
 ”ہماری باری نہ بھی آئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
 ”کیوں تم ناشتا نہیں کرتیں؟“

”کبھی کرتی ہوں، کبھی نہیں۔ ویسے جب سے یہاں آئی ہوں۔ میرا مطلب ہے شاہ پور تو بلی کر جاتی ہیں۔“ اس نے کہا اور شہر یانو کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم پیچھو!“
 ”جیتی رہو۔ بیٹھو کھڑی کیوں ہو گئیں۔ یا اگر ناشتا کرنا چاہو تو احمد حسن۔“
 ”نہیں پیچھو! میں آپ کے ساتھ کروں گی۔“ وہ فوراً ”کہہ کر بیٹھ گئی۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ شہر یانو آگے بڑھ گئیں تو سحر اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔
 ”سنو رات شاہ تیور تار سے تھکے کہ بابا جان تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہانے پر اکتفا کیا۔
 ”لیکن تمہاری امی اس شادی کو تو مان نہیں رہیں۔ وہ جو تمہاری بہن کی ہوئی ہے۔ ر کر رہیں۔“
 ”میرا خیال ہے میری شادی کے بعد مصاصبا کی رخصتی پر آمادہ ہو جائیں گی۔“ اس نے یقین سے پوچھنے لگی۔

ماری شادی پر آمادہ ہو گئیں؟“
 ”یہاں نہ ہوں میں تو آمادہ ہوں۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔
 ”بل دیکھ رہی تھی جیسے اسے سمجھ نہ پا رہی ہو۔“

”ہیں یہ بات عجیب کیوں لگ رہی ہے۔ میری شادی کا فیصلہ میرے دادا نے کیا ہے اور میں ان کے فیصلے سے دل۔ جس پر ماما کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر اعتراض کریں تب بھی بابا جان کے نزدیک میری خوشی م ہے۔ میں شاہ پور میں رہنا چاہتی ہوں اور مجھے شاہ تیور پسند ہیں۔“

مرکی نا سمجھی پر تعجب کا اظہار کرنے کے بعد وضاحت کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے خاموش برزوا سی گردن موڑی تھی کہ شاہ تیور سامنے آگیا۔ اس کے ہونٹوں میں دلی دنگش مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی آخری بات سن چکا ہے۔ پھر بھی انجان سی ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ تو وہ براہ راست اس کی باتیں دیکھ کر بولا۔

”باکھ رہی تھیں ذرا پھر سے کہو۔“
 ”میری بات دہرایا نہیں کرتی۔“ وہ ایک اداسے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”ہاں کہاں رہی ہو؟“ شاہ تیور نے فوراً ”آگے آکر اس کا راستہ روکا تو وہ مسکرا کر بولی۔
 ”ہیں میں ڈائننگ ہال تک۔“ پھر لیٹ کر سحر سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو سحر ناشتا کر لیں۔“
 ”جھانسنو ناشتے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے میں رہنے پر جا رہا ہوں۔ اگر چلنا چاہو تو۔“
 ”نہیں میں آج پیچھو کے پاس رہوں گی۔ رات تو وہ جلدی سو گئی تھیں۔ میری ان سے زیادہ بات ہی نہیں اس نے سہولت سے منع کرتے ہوئے کہا تو شاہ تیور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”اٹھک ہے۔ تم ابھی ایک دو دن نہیں رہو بلکہ جب تک تمہارا دل چاہے۔“
 ”دل کی بات نہ کریں۔ دل تو بتاتا نہیں کیا کیا چاہتا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے شاہ تیور اسے کندھے پر اچکا کر مسکرایا پھر سحر کو اپنے جانے کا پتا کر رہیں سے باہر نکل گیا تھا۔
 کہ شہر یانو کا رویہ اس کے ساتھ لیا دیا تھا۔ اس کے باوجود ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اسے گھر کر بیٹھ گئی بریک یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی ساتھ لگاؤ کا مظاہرہ بھی کیا۔ جس سے شہر یانو کی سرد مہری ناٹھی۔ وقفہ وقفہ سے بے اختیار ہو کر کبھی اس کا گال چھوتی، کبھی پیار سے ہاتھ باتھوں میں لے لیتی اور ناسے بھی اظہار کر دیا۔

”بہت پیاری بیٹی ہو۔ اگر بابا جان تمہیں تیور کے ساتھ منسوب نہ کر چکے ہوتے تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے لے لے لیتی۔“
 ”وہ ان کا مطلب سمجھ کر شرمائی تو شہر یانو نے اسے گلے لگا کر پیار کیا پھر پوچھنے لگی۔
 ”خوش ہوتا؟“

”لیکن مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔“ اس نے اپنے ناخنوں سے کھیلے ہوئے کہا۔
 ”ہاں ڈر کیوں لگ رہا ہے۔ تیور ماشاء اللہ بہت اچھا بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔“
 ”لیکن۔“ وہ چٹکائی۔

”نہ کیا؟ کہو بیٹی! جو بھی بات ہے کہہ ڈالو۔ کیوں ڈرتی ہو۔“ شہر یانو نے بہت اچانکیت سے کہا۔
 ”ناٹاں پیچھو! اصل میں امی کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ کہتی تھیں، اگر ہم شاہ پور گئے تو ہمارے ساتھ بھی۔“
 ”میں سوچ کر ڈرتی ہوں۔“ اس نے رک رک کر اپنے ڈرنے کا سبب بتایا تو شہر یانو فوراً ”بولی تھیں۔“
 ”سے نہیں بیٹا! تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو گا۔ تم اور صبا تو اس گھر کی بیٹیاں ہو اور اپنی بیٹیوں کے لیے مکے پرے تخت اصول ہیں۔“

تو کہہ دیں فوراً چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی علی جاگ کر اٹھا تھا۔
 غائب ہو گئے تھے تم؟ انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔
 میں تھا چچا جان! علی جاگ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ ان کے سامنے کر دیا۔
 یا ہے؟ انہوں نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔
 چوہ دیکھ لیں۔

میں نے چائے کا کپ رکھ کر لفافے میں سے پیپر نکال لے اور پھر تحریر پر نظریں دوڑاتے ہوئے ان کی پیشانی پر
 کا خیال نہ کیا تھا۔

ناگہ بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ان کے ہونٹ بھینپنے پر کہنے لگا۔
 ایسا نہیں چاہتا چچا جان! اور صباحت بھی نہیں چاہتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس اقدام کے
 مجبور کیا گیا ہے۔

ثبوت ہے تمہارے پاس؟ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔
 جی ہمت۔ وہ کہہ کر ہونٹ بھیج گیا۔

مکندرجو تک کر دیکھنے لگے تو قدرے توقف سے مزید گویا ہوا۔
 چچا جان تو صباحت سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں کسی پلاننگ کے تحت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوا
 نے اس وقت ایک دوسرے کو پسند کیا جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور تب
 تھا مجھے بھی آپ کی طرح سب کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ بابا جان نے
 ات میں ہی جان لیا تھا کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔

جان نے۔ وہ کسی طرح اپنی حیرت نہیں چھپا سکے۔ وہ کب کہاں ملے تھے صباحت سے؟
 اسی گھر میں۔ اتفاق سے جس روز وہ آئی تھی بابا جان یہیں موجود تھے اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ آپ کی
 انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔

کی تفصیل بتا رہا تھا اور شاہ سکندر کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔ جب بابا جان نے ایک دن اچانک انہیں بلا کر
 کہہ ڈاکٹر آسیہ کے پاس ان کی کوئی اولاد ہے اور اگر ہے تو اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ اس وقت وہ کتنے
 گائے تھے کہ پتا نہیں آسیہ کے پاس کا بیٹا ہے یا بیٹی۔ جبکہ بابا جان جانتے تھے اور باقاعدہ اسے لانے کا پلان
 بناتے تھے۔

پکیا سوچنے لگے چچا جان؟ میرا یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں صباحت کے ساتھ اتنا ہی فیئر ہوں
 آپ کے ساتھ۔ علی جاگ کر نے عاجزی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اسی سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر سگارا اٹھا لیا اور اسے سلگانے کے بعد
 علی جاگ کر دیکھ کر پوچھنے لگے۔

ہم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟
 ماچا ہوتا ہوں، آپ ایک بار ڈاکٹر آسیہ سے ملیں۔ انہیں بتائیں کہ صباحت اور میں۔۔۔ وہ روانی سے بولتا
 خاموش ہو گیا۔

میں پہلے میں صباحت سے بات کرنا چاہوں گا۔ تمہارے پاس اس کا نمبر تو ہو گا؟ انہوں نے جب سے
 لے ہوئے پوچھا اور جو لفافہ وہ لایا تھا اس پر نمبر لکھنے کے بعد اسے جانے کا کہا تو وہ کچھ جربز سا ہو کر کمرے
 لیا تھا۔

مکندرجو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے موبائل پر نمبر پیش کیے تھے۔

لپارہ میوور اٹھنے کے ساتھ ہیلو کی آواز آئی تھی۔

”جی میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں رہا ہے۔“
 یہ حقیقت ہے اور جو کچھ تمہاری ماں نے تم سے کہا۔ اس پر میں یہی کہوں گی کہ وہ عورت اپنی جگہ صحیح
 اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد وہ تمہارے سامنے شاہ پور والوں کی کوئی اچھی تصویر تو پیش نہیں کر سکتی
 تھی۔ یقیناً اس نے تمہیں ڈرایا ہو گا۔ اس لیے تمہارے اندر خوف ہے۔“ شہرانا نے کچھ غیر جانب دار
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

”جی، اور بے بنیاد تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ بابا بھی تو بہت اچھے بہت محبت کرنے والے انسان ہیں
 بھی انہوں نے مہم کو طلاق دے دی تھی۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بابا جان تمہاری ماں کو طلاق نہ دلاتے تو یہاں دو گھر برباد ہو جاتے
 شہرانا کے ایک ہی جملے سے ان ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی جو اسے شاہ تیور نے بتائی تھیں۔

”ہاں۔“ اس نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی۔
 ”میری بات سمجھ گئی ہو نا۔ علی اور تیور کے ساتھ وہ مسئلہ نہیں ہے جو تمہارے باپ کے ساتھ تھا۔ بابا جان
 جتنی محبت تمہارے باپ کو واپس لانے میں کرنی پڑی تھی اس سے زیادہ تمہارے اور صبا کے حصول کے لیے

پڑ رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہ چلی جائیں۔ تم اپنے دل سے سارے
 سارے خوف نکال دو۔ تمہارے اور صبا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ بہت خوش رہو گی تم یہاں۔“
 ”میں ابھی بھی بہت خوش ہوں۔“ اس نے خوشی کا اظہار شہرانا کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

...

ٹھیک دسویں دن شاہ سکندر کی واپسی ہوئی تھی اور اپنے استقبال کے لیے آنے والوں میں علی جاگ کر کوئی
 کچھ تشویش تھی۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، البتہ اس کے چہرے پر سنجیدگی غیر معمولی تھی
 انہوں نے پہلی نظریں ہی محسوس کی اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب خیریت ہے نا؟“

”جی! اس وقت وہ یہی جواب دے سکتا تھا، پھر فوراً پوچھنے لگا۔

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”دو تین روز کے لیے شاہ پور جاؤں گا اس کے بعد۔“

”نہیں چچا جان!“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”آج آپ میرے سمان ہوں گے۔ میں اسپیشلٹی۔ آپ کو بلے
 ہوں۔“

”کوئی خاص بات؟“ انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
 ”جی! علی جاگ کر نے جی کہہ کر ہونٹ بھیج لیے تو انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ اسے ساتھ آنے کا

کر کے باہر نکلے اور پھر پہلے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا اس کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔
 تمام راستہ انہوں نے قصداً ”کچھ پوچھنے سے گریز کیا تھا اور گھر آ کر علی جاگ کر یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ
 کر لیں اس کے بعد بات کرے گا۔ اس لیے انہیں خاص ان کے لیے مخصوص کیے گئے بیڈ روم میں جا کر

چائے کا کمنے کے بہانے نکل گیا تھا۔
 شاہ سکندر ایک سگارا پیئے تک بیٹھے پھر شاور لینے کے ارادے سے واش روم کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ شاور لے کر نکلے تو کمرہ میں چائے کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے چھوٹے ہی پوچھا۔
 ”علی کہاں ہے؟“

”جی اپنے کمرے میں۔“
 ”وہاں کیا کر رہا ہے۔“ جھجھکاؤ سے میرے پاس۔ ”وہ اب مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے قدرے درشت

نہ لے کر مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا۔“ وہ ہٹوہری سے بولی تھی۔
 رصاحت، وہ کیا چاہتی ہے؟“ انہوں نے جھپٹتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 اچر ہے اس کی مرضی سے۔“

نہیں۔“ وہ فوراً ”ٹوک گئے۔“ اس کی مرضی آپ کو معلوم ہی نہیں ہے ڈاکٹر آسیہ! آپ خود جو کچھ کرنا
 میں اس پر زبردستی محبت سے یا کسی بھی طرح اسے راضی کر لیتی ہیں۔ یہ جاننے کی آپ نے کبھی ضرورت ہی
 مجھی کہ اصل میں وہ کیا چاہتی ہے۔“

فاف۔ کیجئے گشاہ سکندر رامیں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت نیک، سعادت مند اور محبت
 والی بچی ہے۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا اور اس معاملے میں تو اس نے شروع ہی
 را اختیار مجھے سوچ دیا تھا کہ میں جو چاہوں فیصلہ کروں۔“ آسیہ نے صباحت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
 ت خوب، اس محبت کرنے والی بچی کی سعادت مندی کا یہ صلہ دیا آپ نے اسے کہ اس کے دل کی بہتی
 نے کا سامان کر دیا۔“ وہ طنز آمیز لہجے میں بولے تھے۔
 مطلب ہے آپ کا؟“ آسیہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

نھے آپ کی بے خبری پر افسوس ہے، ڈاکٹر آسیہ! میرا تو خیال تھا۔ ماں ہونے کے ناتے آپ بیٹیوں سے بہت
 دران کی ہر بات سے آگاہ ہوں گی اور یہ بھی جانتی ہوں گی کہ صباحت اور علی جمائیکہ ایک دوسرے کو پسند
 ہیں۔“ انہوں نے تاسف کے اظہار کے ساتھ کہا تو آسیہ کی پیشانی کی شکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن
 نہیں۔

رجال میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ جو ظلم آپ نے اپنے ساتھ کیا وہ صباحت پر
 دنا چاہیے۔“ ان کے انداز میں وارننگ تھی۔

آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔ نہیں شاہ سکندر حیات! میں زندگی میں کبھی نہیں
 اور میری بیٹی بھی نہیں پچھتائے گی۔ ابھی ہو سکتا ہے اسے دکھ ہو اور میرے اس فیصلے کو ظلم سمجھ رہی ہو
 تھ وقت گزرنے کے بعد وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ آنے والے مظالم
 ایتھا۔“ وہ ان کی وارننگ پر تیز ہو کر بول رہی تھی۔

در شاہ سکندر حیات! آپ کیوں اپنی بیٹی کے دشمن ہو رہے ہیں۔ بھتیجی کی محبت میں بیٹی کو نظر انداز کر رہے
 مرف اس لیے کہ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا۔“
 ل خاموش ہو جائیں آسیہ! انہوں نے غصے سے ٹوکا تو وہ، نوزاسی لہجے میں بولی۔
 ہل بچ نہیں سن سکتے۔“

ٹائی سنا چاہتا ہوں، سچ ہی کہنا چاہتا ہوں اور سچ ہے کہ میں آج بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔“ جانے
 ماہذبہ اچانک غالب آکر انہیں بے اختیار کر گیا تھا پھر فوراً ”ہونٹ بھینچ گئے۔“
 پر ایک دم سناٹے میں آگئی تھی۔
 اس دوران یہ کس موڑ پر لے آئی تھی۔

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیاں بھی ہے
 عہد و پیاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
 درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے نحر برپا
 اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
 کٹے لمبے بہت حیران ہو کر ان ساکت وجودوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے دل ایک ہی لے پر دھڑک رہے
 ٹکٹن کتے بے بس تھے دونوں کہ درمیان میں جاسٹ خلیع عبور کرنے کا حوصلہ کر بھی لیتے تب بھی ایک

”مجھے صباحت سے بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اپنا سارا دھیان دوسری طرف رکھ کر کہا۔
 ”جی آپ کون؟“ ادھر سے پوچھا گیا۔ آواز بالکل مدیحہ جیسی تھی۔ وہ سمجھ گئے صباحت ہی ہے۔ کیونکہ مدیحہ
 آپ کون کا سوال نہیں اٹھا سکتی تھی۔

”بیٹا صبا! میں ہوں شاہ سکندر حیات۔“ انہوں نے بڑی محبت سے اس کا نام لے کر کہا۔
 دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پتا نہیں وہ کس کیفیت میں گھرنی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے اور چند لم
 رک کر ایک بار کرکے گئے۔

”بیٹا! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ سن رہی ہو نا؟“
 کوئی جواب نہیں آیا۔

”صبا! خاموش مت رہو بیٹا۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔ اس وقت مجھے صرف ایک بات کا جو
 دے دو۔ یہ جو قطع کا نوٹس آپ نے بھجوایا ہے کیا اس میں آپ کی مرضی شامل ہے؟“
 بہت ہلکی سی آواز آئی تھی۔ جیسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی کو دیا گیا ہو۔
 ”آپ رو رہی ہو؟“ انہوں نے بہت بے چین ہو کر فوراً پوچھا تھا۔

ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔
 ”ماں! گا!“ انہوں نے موبائل آف کر دیا اور اس کے رونے کا سبب سوچنے لگے، لیکن کچھ دیر بعد ہی ان کا ذہ
 اس سے آگے کی سوچنے لگا تھا اور پھر وہ اسی وقت آسیہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

شام کے سات بج رہے تھے جب انہوں نے ڈاکٹر آسیہ کے روم کے کھلے دروازے پر ہلکے سے دستک
 تھی۔

آسیہ ایک خاتون کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ دستک کی آواز پر ادھر متوجہ ہوئی اور انہیں دیکھ کر ہنسنے
 کے ساتھ پیشانی پر ہل وال کر قدرے ناگواری سے بولی۔

”آپ پلیمز باہر انتظار کریں۔“
 وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ آئے اور بڑے آرام سے اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ بھی گئے تو آسیہ
 تماشا کرنے کے خیال سے جلدی جلدی خاتون کو چیک کر کے میڈیسن لکھ کر اسے تھما کر جانے کا اشارہ کر دیا۔
 ”سنس! باقی مریضوں سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحبہ ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں باہر جا رہی ہیں۔ اس لیے
 کل دیکھیں گی۔“ خاتون کے جاتے ہی شاہ سکندر نے سنس کو مخاطب کر کے کہا تو وہ آسیہ کو دیکھنے لگی۔
 آسیہ نے ناچار سنس کو جانے کا اشارہ کیا پھر چیر کی بیک سے کمر نکاتے ہوئے بولی۔
 ”میں کہیں نہیں جا رہی۔“

”اچھی بات ہے۔“ شاہ سکندر اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور ایک نظر باہر دیکھنے کے بعد دروازہ بند
 آسیہ کی طرف پلٹے تو وہ بہت ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑی۔

”شاہ سکندر حیات! آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔
 ”اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہو تا رہا وہ بہت ٹھیک تھا؟“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔
 ”مجھے نہیں معلوم آپ کے ساتھ کیا ہوا اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ آپ پلیمز صاف لفظوں میں اپنے
 مقصد بیان کریں اور۔“

وہ روانی میں بولتی ہوئی ہونٹ بھینچ گئی تو وہ کچھ دیر تک اس پر نظر نہیں جمائے خاموش بیٹھے رہے، پھر نہ
 لفافہ نکال کر اس کے سامنے بھینکتے ہوئے بولے۔

”جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ صباحت کے بارے میں آپ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گی پھر نہ
 نوٹس کیوں بھجوایا؟“

۔ بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

”تم روری ہو؟“ فیمل نے آہستہ سے اس کے منہ پر سے تکیہ ہٹایا اور جل تھل کا سماں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
”صبا! کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس طرح روری ہو؟“ انہوں نے پہلے نرمی سے پوچھا پھر اسے جھنجھوڑا لالا تو وہ جیج کر

”میری مرضی میرا دل چاہ رہا ہے رونے کو۔ اور اس سے آپ کا کیا بگڑ رہا ہے۔ خواہ خواہ پریشان ہو رہے ہیں۔
مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے چیخنے پر حیران ہوتے ہوئے بولے تھے۔
”کوئی مشکل نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ جائیں۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف
تے ہوئے بولی۔

”آرام سے۔“ ان کی ذرا سی ہنسی میں دکھ تھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”چلو منہ دھو کر آؤ۔
پو آنے والی ہوں گی۔“

”تو آجائیں“ ان کے سامنے کیا میں نہیں رو سکتی۔“
”کوئی وجہ بھی ہو رونے کی۔“

”ضروری نہیں ہے۔ بس میرا دل چاہ رہا ہے اور آپ پلیز مجھے منع نہیں کریں۔“ اس نے پھر لٹ کر تکیہ منہ پر
لایا تو فیمل ابھ گئے کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو وہ ان سے چھپا رہی ہے۔ گواہیں یقین تھا کہ کوئی بات ہوئی
نہر ہے کچھ دیر تک قیاس کرتے رہے۔ زیادہ گمان یہی تھا کہ علی جمائیکر کا فون آیا ہو گا اور اسی نے کوئی ایسی
بات کہی ہے جس سے وہ ہرٹ ہوئی ہے یا پریشان ہو کر روری ہے۔ اور یہ طے تھا کہ اس وقت وہ کچھ نہیں بتائے
ہیں۔ اس لیے انہوں نے مزید اصرار کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے مخاطب کر کے بولے۔

”سو، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں لیکن آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اس لیے
رونے سے دل بھر جائے تو میرے آرام سے سونے کا خیال کر لینا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس کے کمرے
نکل گئے۔

”ہرگز نہیں۔ اب میں کسی کا خیال نہیں کروں گی۔ ماما کا بھی نہیں۔“
”جو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتی کبھی سب سے ناراض ہو کر سوئے لگی تھی۔ بے سرو پا سوچیں تھیں جو
، ہر احساس سے عاری کر رہی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی ایک احساس بیدار ہوتا،“ فیمل نے اسے اپنے
ہاتھ سے بھی غافل کر دیا تھا۔

”بکہ اوسر فیمل اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح کچھ دیر میں ہی وہ ان کے پیچھے
نائے گی اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں اپنے رونے کا سبب بتا کر کہے گی۔ اب بہت خراب ہیں فیمل
نے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر نہیں بہت دیر ہو گئی۔ تب فیمل تشویش میں مبتلا ہو گئے اور کسی طرح رہا نہیں
تھیں۔ اس کے کمرے میں آگئے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ آواز میں ایک دوبار پکارا کہ شاید کچھ
بات سے بیدار ہو جائے، لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تب اس کے پاس بیٹھے ہوئے انہوں نے بغور اس کا چہرہ
نہلا اس کی پکیوں پر موقی چمک رہے تھے اور گالوں پر ٹیکرس سی بن گئی تھیں۔

”یہ رونا بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔“
”میں جیتھیا“ بہت دکھ ہو رہا تھا۔ بہت احتیاط سے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر اٹھتے ہوئے بے
ناراس کی پیشانی پر چوم لی۔ اس سارے جہاں میں ایک وہی تو تھی جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ شیئر کرتے تھے اور
ایک ذرا سی تکلیف انہیں اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے رہے
لیاں اس آکر علی جمائیکر کے نمبر اکاؤنٹ پر گئے۔

دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔
”آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا۔“ کتنی دیر بعد شاہ سکندر بولنے کے قابل ہوئے تو
معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہم کر کر سکیں تو ایک بار اور میرا اعتبار کر لیں۔ میرے پیش نظر پہلے بھی صحبت کی بہتری تھی اور ابھی بھی میں
اس کا خیال کر کے آیا ہوں۔ آپ کی خاطر وہ علی سے نا آتا تو نے پر آتا تو ہو گئی ہے، لیکن اس کے بعد وہ خوش رہتا تو
دور کی بات، زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ وہ آپ کی طرح بہادر نہیں ہے۔ مجھے مدد دینے سے تیار تھا کہ وہ بہت
بزدل ہے۔ ایسی صورت میں تو آپ کو اس کا اور خیال کرنا چاہیے۔ میں ابھی بھی آپ کو فورس نہیں کر رہا، بلکہ
درخواست کر رہا ہوں کہ اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا اور بالکل غیر جانبدار
ہوں۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تو آسیہ کے سینے سے بے اختیار گرمی سانس خارج ہوئی، پھر کچھ ناراض
لہجے میں بولی تھی۔

”میں کچھ نہیں سوچ سکتی جب تک مدد میرے پاس نہیں آ جاتی۔“
”مدد!“ وہ بری طرح چونکے لیکن خود کو مزید کچھ کہنے سے روک بھی لیا۔ جبکہ ان کا ذہن تیزی سے سوچنے

تھا۔
”جی، شاہ جمائیکر کی دھمکی کے بعد میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں اور صحبت کا فیصلہ بھی اس دھم
کا مرہون منت ہے۔ میں کیسے اس گھر میں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں جہاں اس کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں۔
سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدد میرے آ
تھیں ہوں نا ان کا باپ۔ آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدد میرے آ
گیا۔“

انہوں نے بہت سنبھل کر اسے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر ہانکے تو ان کا اپنا اطمینان رخصت
تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ علی جمائیکر کس شدت سے ان کا انتظار کر رہا ہو گا۔ صرف مدد کا خیال تھا جو ہر
گاڑی شاہ پور کے راستے پر ڈال دی تھی۔

~~***
اس کے اندر بھی شاہ سکندر کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ لیکن اس نے کبھی مدد میرے کی طرح
نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے بھی اظہار سے روکتی تھی۔ کیونکہ اسے آسیہ کا خیال تھا اور اسے دکھ دینے کا تو وہ سو
نہیں سکتی تھی۔ اس لیے باپ سے فطری محبت کو اس نے ہمیشہ دیا تھا اور اس کے لیے اسے زیادہ تردد نہ
پڑتا تھا۔ بس ایک سوچ ہی کافی تھی کہ اس شخص نے اس کی ماں کو دکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ان
بھرتا اور محبت جانے کن کوئے کھدروں میں جا چھٹی، جو اگر کبھی سراجا رہی بھی تو اس کی بڑی اسے تھک
کر سادتی تھی۔ لیکن ابھی شام میں شاہ سکندر نے فون کر کے جس محبت سے اسے مخاطب کیا تھا اس سے
بری طرح بکھری تھی کہ اس کے بعد سے اب تک خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آنسو جوان کی آوا
جھلکے تھے، اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ
باندھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ چیخوں کو روکنے کے لیے اس نے منہ پر تکیہ رکھ لیا تھا
آٹھ بجے کے قریب فیمل آئے اور حسب عادت پہلے اس کے کمرے میں بھانکا تو اسے بے وقت
میں منہ چھپائے دیکھ کر کچھ ہنسنے لگے۔ پھر پکارتے ہوئے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔

”صبا! کیا ہوا بیٹا!“
اسے زندگی میں پہلی بار فیمل کی آمد بہت بری لگی تھی۔ دل چاہا سارے لحاظ بھلا کر انہیں چلے
468

اور ہر سے پہلی بیل کے ساتھ ہی جس طرح ریسور اٹھایا گیا اس سے یہی لگا جیسے وہ فون کے انتظار میں بیٹھا تھا۔
 ”میں ہوں نیل۔“ انہوں نے اس کی بیل کے جواب میں کہا تو اس بار اس کا انداز مایوسی لیے ہوئے تھا۔

”جی فرمائیے۔“

”مجھے یہ پوچھنا ہے کہ شام میں آپ کی صباحت سے کیا بات ہوئی تھی؟“ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اور بڑے یقین سے پوچھا۔

”میری۔“ علی جمالی کی حیرت بھری آواز پر وہ زردے کر بولے۔

”جی آپ کی۔“

”جی نہیں، میری صباحت سے بات نہیں ہوئی۔ البتہ چچا جان نے فون کیا تھا۔“

”چچا جان؟“

”شاہ سکندر حیات کیوں خیریت؟“ علی جمالی نے نام تکرار فوراً ”پوچھا۔ لیکن وہ شاہ سکندر کا نام سنتے ہی ایک دم خاموش ہو گئے اور فون بھی رکھ دیا۔ کیونکہ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صباحت کا رونا ان کی سمجھ میں آگیا تھا اور اس کا سبب نہ بتانا بھی حیرت انگیز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ دو سال پہلے طویل مدت بعد جب وہ اپنی ماں سے ملے تھے تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی اور انہوں نے تو ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شام میں یونیورسٹی کے بعد اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان کے دو بہن بھائی اور بھی ہیں۔ جو ان سے اسی طرح ملتے ہیں۔ جیسے اپنی اولادیں۔ سمیرا، راجا اور موم۔

”کتنے چاہنے والے ہیں ہمارے پھر بھی ہم اکیلے ہیں۔“ انہوں نے صباحت کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر اپنے کمرے میں آکر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔

~~*

شاہ سکندر رات بارہ بجے کے بعد شاہ پور پہنچے تھے اور باباجان کے آرام کا خیال کیے بغیر اسی وقت سیدھے ان کے کمرے میں چلے آئے۔ زیر پاؤں کی مدھم مدھم روشنی میں باباجان پتا نہیں سو رہے تھے یا یوں ہی آنکھیں بند کیے لیے تھے۔

”باباجان!“ سکندر نے انہیں بکارنے کے ساتھ ٹیپ لائٹ کاٹن آن کر دیا۔

باباجان نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور انہیں دیکھ کر ٹیکے سے سرواٹھا کرتے ہوئے بولے۔

”نم سکندر! ابھی آ رہے ہو؟“

”مدحہ کہاں ہے؟“ شاہ سکندر نے ان کی بات سیکر ان سنی کر کے پوچھا۔ نمبرے ہوئے سرواٹے میں جیسے کوا طوفان چھپا تھا۔

باباجان ایک لمحہ کو ٹھٹھکے پھر فوراً ”انجان بن گئے۔“

”کون؟“

”مدحہ، میری بیٹی۔ کہاں چھپا دیا ہے آپ نے؟“ اور کیوں؟“ شاہ سکندر کسی طرح ضبط نہیں کر پا رہے تھے۔

”آرام سے آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ باباجان نے انہیں پرسکون کرنے کی سعی کی۔

”میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا باباجان! جب تک مجھے مدحہ نہیں مل جاتی۔ آپ بتائیں کہاں ہے وہ؟“

”ہم کیا بتائیں۔ ہم تو اسے کراچی چھوڑ کر آئے تھے۔ تم کراچی والوں سے معلوم کرو۔ وہ یقیناً پھر تمہیں دے رہے ہیں۔ جیسے پہلے انہوں نے تم سے تمہاری بیٹی کو چھپایا تھا۔“

باباجان نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا کہ کچھ دیر کو وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بات میں واقعی صداقت تھی۔ آئیہ نے انہیں ایک بیٹی کا بتایا تھا۔

”میں کراچی ہی سے آ رہا ہوں باباجان! اور مجھ کو وہیں سے معلوم ہوا ہے کہ مدحہ وہاں نہیں پہنچی۔“ اس بار

سکندر کا لہجہ کمزور تھا۔

”کیسے نہیں پہنچی۔ ہم خود اسے اس کے دروازے پر چھوڑ کر آئے تھے۔“

باباجان اپنی بات پر قائم رہ کر تیز لہجے میں بولے۔ ”معلوم کرو اس ڈاکٹرنی سے کہ اب وہ ہم سے اور کیا چاہتی ہے۔ ہم اپنی بوتلیوں کے صدمے میں اسے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔“

شاہ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کا یقین کریں۔ آئیہ کا یا باباجان کا۔ ان دونوں کے درمیان وہ خود کو الٹی احمق لگنے لگے تھے۔

”بیٹا! تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ مدحہ اپنی ماں کے پاس ہے اور اس کی ماں بہت شاطر عورت ہے۔ اس کی س تم نہیں سمجھ سکتے۔ جانتے ہو صباحت کی طرف سے وہ طلع کا دعوا کر چکی ہے۔“

باباجان ان سے ہمدردی جتا کر آئیہ کے خلاف بولنا شروع ہو گئے تھے۔

”جی، مجھے علی نے بتایا ہے اور میں اس سلسلے میں آئیہ کے پاس گیا تھا۔ تاکہ اسے نوٹس واپس لینے پر مجبور سکوں۔“ دھڑکے اور دھڑکے ہوئے شاہ سکندر نے رک کر بتایا تو باباجان نے فوراً ”پوچھا۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“

”اس کا کہنا ہے جب تک مدحہ اس کے پاس نہیں پہنچ جاتی، وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔“

”دیکھ لو اس کی چالاکی۔“

اگر جو یہ اس کی چالاکی ہے تو بہت ہنگامی پڑے گی اسے۔“ شاہ سکندر نے انتہائی تنفر سے کہا اور ایک نظر باباجان پر کران کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

پھر صبر النساء کی نیند خراب ہونے کے خیال سے وہ بیڈ روم میں جانے کی بجائے اپنے اخڑی روم میں آگئے۔ نا کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا۔ گلے سے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈالی پھر مگارسلگا کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ ان ارغ بری طرح سو رہا تھا۔ کیونکہ باباجان اور آئیہ دونوں کی باتیں ایک ساتھ ان کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اور اس میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان دونوں میں سے کون سچا ہے۔ اور کوئی بھی ہوا انہیں مدحہ کا پتا چلنا ہے۔

”کس سے معلوم کروں؟“ انہوں نے سلگتے ذہن کے ساتھ سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں سب سو رہے تھے لیکن کراچی میں تو اس وقت رات شروع ہوئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر

اور اپنا موبائل اٹھا کر آن کیا تھا کہ بزرگ بچے لگی۔ غالباً ”کوئی مسلسل ٹرائی کر رہا تھا۔“

پہلو! انہوں نے بہت بے دلی سے پہلو کہا تھا۔

”چچا جان! کہاں ہیں آپ؟“ دوسری طرف علی جمالی تھا۔ ان کی آواز سن کر جیسے اس کی جان میں جان آئی تھی۔

”میری بیٹا! میں بالکل بھول گیا کہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔ میری سوری۔“ انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ

کس انتظار میں چھوڑ آئے تھے۔ بہت معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”صل میں بات ہی ایسی ہو گئی تھی کہ میں وہاں رک نہیں سکا اور سیدھا شاہ پور چلا آیا۔“

”کس کی کیا بات؟“ وہ غالباً ”اپنے متعلق سوچ کر پریشان ہوا تھا۔“

”وہ بیٹا! مدحہ کا معلوم کرنا تھا کہ کہاں ہے وہ؟“ انہوں نے قصداً ”سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے اسی قدر کہا۔“

”دو دو بول پڑا۔“

”رہے پر۔“

”کہاں؟“ وہ ایک دم پوری جان سے متوجہ ہوئے تھے۔

”رہے پر چچا جان! جہاں مایاجی کا کاش ہے۔ جس روز آپ کینیڈا جا رہے تھے اس روز میں نے اسے وہیں دیکھا۔“

دور کہہ رہی تھی کہ اسے وہ جگہ بہت پسند آتی ہے۔ میں رہے گی۔ میرا خیال ہے اس کی خواہش کو دیکھتے

ہوئے بابا جان نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ بابا جان سے معلوم کر لیں۔“

علی جمائیکر نے تفصیل بتانے کے ساتھ مشورہ بھی دیا تو وہ چونک کر نکلے۔

”ہاں، ابھی تو بابا جان سو رہے ہیں۔ صبح معلوم کروں گا اور سنو ہم صبح جتنی جلدی ممکن ہو سکے رستے پر پہنچ جائیں۔“

”جی ہمت۔“

”خدا حافظ۔“ انہوں نے موبائل بند کر دیا اور دل تو چاہا اس وقت جا کر بابا جان کو جھنجھوڑا لیں، لیکن ان کے شاعرانہ چالوں کا سوچ کر انہیں ضبط کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سوچ لیا کہ جب تک مدیہ کو حاصل نہیں کر لیتے بابا جان کچھ ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ان سے کچھ بعد نہیں تھا۔ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے وہ مدیہ کو جان بھی لے سکتے تھے۔ بہر حال انہیں مدیہ کا پتا چل گیا تھا، اس کے بعد اپنا اگلا اقدام کا سوچ کر وہ کافی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود تمام رات سو نہیں سکے اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی حویلی سے نکل آئے تھے۔

مسلسل ڈیزہ گھننے کی ڈرائیو کے بعد جب وہ کامیج پہنچے۔ سورج نکل آیا تھا۔ سرخ۔ بھری کی روش پر گاڑی روک کر وہ نیچے اترے تو چوکیدار دور سے بھاگا آیا۔

”سلام صاحب!“

وہ سر کے اشارے سے جواب دیتے تیز قدموں سے آگے چل پڑے۔ کامیج گاڑی کھلا تھا۔ وہ رکے بغیر اندر چلے آئے۔ کوریڈر اور پھر ہال میں کوئی نہیں تھا، نہ کسی کی موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے پھر بھی انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا۔

”مدیہ!“ خاموشی میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔

”لی لی یہاں نہیں ہیں صاحب!“ عقب سے چوکیدار نے کہا تو فوراً اس کی طرف پلٹے۔

”پھر کہاں ہے؟“

”چنانچہ صاحب! مجھے بتا کر تو نہیں گئیں۔“ چوکیدار ان کے جارحانہ انداز سے خائف ہو کر بولا۔

”بتا کر نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے یہاں آئی تھی۔“ انہوں نے پر سوچ انداز میں خود کلامی کی پھر چوکیدار

دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”یہاں سے کب گئی ہیں؟“

”چار پانچ روز ہو گئے ہیں۔“

”کون نے لے گیا تھا اسے؟“

”شاہ تیور۔“

”یہاں کتنے دن رہی تھی؟“

”پہلے تو جی دو دن رہیں پھر چلی گئیں پھر آئیں تو چار دن رہیں اور جاتے ہوئے پھر آنے کا بھی کہہ گئی ہیں۔“

چوکیدار نے باقاعدہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا۔

”کب؟“

”یہ تو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا آج آجائیں یا کل۔ آپ شاہ تیور سے معلوم کر لیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ اور کوئی ناشتہ وغیرہ کا انتظام کرو۔“

وہ چوکیدار کو بھیج کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ اور دونوں باتھوں میں سر تھام لیا۔ اب اس مقام پر کاہن مزید کچھ نہیں سوچ پاتا تھا۔ رات بھر گانے نے انہیں اتنا نہیں تھکا تھا جتنا ناکامی نے تو فرکرکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار نے ناشتہ لکرا کر ان کے سامنے رکھا تو اس وقت علی جمائیکر بھی آگیا۔

”السلام علیکم پچا جان!“

ہیں نے علی جمائیکر کی آواز پر باتھوں سے سراونچا کیا تھا اور اسے دیکھ کر انہیں کافی حوصلہ ہوا۔

”بیٹا اب وقت پر آگئے۔“

بابا تھے پچا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ علی جمائیکر نے ان کے تے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔ بیٹا! دوا کرو“ آگے سب ٹھیک ہو جائے۔“ انہوں نے چوکیدار کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”یہ کہاں ہے؟“ علی جمائیکر کی نظریں ادھر ادھر بہکتے لگیں۔

”کی تلاش میں تو آیا ہوں۔ پتا نہیں تیور اسے کہاں لے گیا ہے۔ ادھر میں آئیہ سے وعدہ کر آیا ہوں کہ سورت مدیہ کو اس کے پاس لے کر آؤں گا۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں تلاش کروں اسے۔“

”مات لوان کا۔ سب کیا دھرا ان ہی کا ہے۔“ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”جمائیکر حیران اور قدرے خائف بھی ہو گیا تھا۔

”دیر بعد خود پراکشاہ سکندر نے ساری باتیں تفصیل سے بتا ڈالیں۔ جنہیں سن کر وہ واقعی چکر اگیا تھا۔

”نہی خاطر خود کو سنبھال کر بولا۔

”ب کفر نہیں کریں پچا جان! مدیہ کو کچھ نہیں ہو گا۔“

بابا جب تک وہ بابا جان کے قبضے میں ہے۔ میں اس کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرو تم ابھی شاہ پور جاؤ۔ بن طور پر بابا جان سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مدیہ کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا ہے اور ہاں، اے ہلے انہیں یہ بتاؤ تاکہ رقبے پر تمہاری مدیہ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ جبکہ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہے ہوں یا؟“

”لی لی! علی جمائیکر سمجھ کر انہاں میں سر ہلانے لگا۔

”اب تم جاؤ۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھپک کر اٹھادیا تھا۔

”کون سی جگہ ہے؟“ مدیہ نے سرزکوں پر اچھی خاصی رونق دیکھ کر پوچھا تو شاہ تیور نے کچھ بے دھیانی میں

”جا تھا۔

”تیرا آباد۔“

”تیرا آباد ہے۔“ وہ اشتیاق سے بولی تو اس بار وہ متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”ہاں، تمہیں حیدر آباد دیکھنے کا شوق تھا؟“

”اس نے سوچا آج تمہیں شاپنگ کرادوں۔“ شاہ تیور نے شاہانہ انداز سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”ہاں ہے۔“

”سے کیا سمجھتی ہو۔ جو درائی اور کوالٹی یہاں سے کہیں نہیں ملے گی۔“ وہ گاڑی بند کرتے ہوئے بولا۔

”نہی دیکھ لینے ہیں۔“ وہ احسان کرتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری تو سامنے کھڑی بس کے پاس کھڑا

”راج گراچی“

”شاہ تیور چکر کاٹ کر اس کے پاس آکر بولا تو وہ چونک کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن اس کا دھیان

”پچھ کی طرف تھا۔



اس کے قدموں کی رفتار بہت سست تھی۔ شاہ تیمور نے ٹوکا تیرہ سر جھٹک کر تیز چل پڑی۔
پھر کئی دکانوں پر رک کر شاہ تیمور نے اپنی پسند سے اس کے لیے سوٹ خریدے۔ وہ کپڑے دیکھی غائب
کیس چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آخر اسے آگاہ ہونے لگی تو مزید آگے چلنے سے انکار کر دیا۔
”بس تیمور! میں تھک گئی ہوں۔“
”ارے اتنی جلدی ان کے ساتھ بیچنگ شوز اور جیولری نہیں لوگی؟“ شاہ تیمور نے دوسری چیزوں کے
کراے مزید چلنے کے لیے اکسانا چاہا لیکن وہ منہ بنا کر بولی۔
”پھر سی۔“
”شوز لے لو جیولری پھر سی۔ چلو مجھے بھی جو گزر لینے ہیں۔“ شاہ تیمور نے کہا اور اسے کچھ کہنے کا مو

بغیر چل پڑا۔ تو اسے ناچار اس کی تقلید کرنی پڑی۔
پھر شوز اور سینڈل وغیرہ دیکھنے کے لیے وہ شوئیس کے پاس ہی رک گئی تھی۔
شاہ تیمور دکان کے اندر داخل ہو گیا اور سیلز مین سے جو گزر دیکھانے کا کہہ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔
سیلز مین فوراً حرکت میں آ گیا اور ایک کے بعد ایک ڈیڑھ کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگا۔
اس نے باری باری سب میں بیروڑال کر دیکھا پھر چونک کر آیا اسے پیک کرنے کا کہہ کر مدح کی طرف
وہ شوئیس کے پاس موجود نہیں تھی اس نے اپنے اطراف — نظروں سے گزر دکان سے باہر نکل کر ادھر
کے بعد کاؤنٹر پر آکر منیجر کو مخاطب کیا۔
”ہیکس کجوزی۔ یہاں ایک لڑکی شوز دیکھ رہی تھی۔ کچھ بتائیں گے کس طرف گئی ہے؟“

منیجر نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔
”کہاں چلی گئی؟“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا جہاں کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ پھر
دکان میں جھانکتا ہوا مارکیٹ سے نکلا تو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ اسے ہوشیار کر رہا ہے اور اس خیال
پریشان کر رہا تھا۔ بابا جان کے سامنے جواب دی سے زیادہ اسے اپنا خیال تھا کہ وہ صحیح گج اسے چاہئے لگاؤ
”نہیں وہ کہیں نہیں جاسکتی اور جائے گی کہاں؟“ کسی دکان میں کھڑی ہوگی۔“
وہ خود کو تسلی دیتا ہوا دوبارہ مارکیٹ کے اندر گیا اور پھر ایک ایک دکان دیکھ ڈالی۔ لیکن وہ کہیں نہیں
واپس آتے ہوئے اس کی پریشانی میں غصہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اسے چکر دے گئی تھی اور
دے کر۔

”قریب نہیں، نہیں۔“ اس کا دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ یقیناً
کے لیے کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ ٹریفک میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آیا اور جوشاہزادہ
رکھنے کے لیے پچھا اور واڑہ کھولا تو کھٹک گیا، وہاں وہ سارے شاہزادے تھے جو مدح کے ہاتھ مہر
مطلب تھا کہ وہ باتو نہیں کہیں موجود ہے یا اس کی چیزیں واپس کر کے گئی ہے۔ ایک جسم سی امید
کتنی دیر گاڑی کے پاس کھڑا رہا۔ شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ تب بہت سیوس ہو کر وہ گاڑ
وہیں سے شاہ پور چل پڑا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ حویلی پہنچا تو سید بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔
”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ تو بابا جان یوں جو
آمد غیر متوقع ہو۔ پھر فوراً ”سامنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
”آؤ تیمور! ابھی علی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔“
”علی۔“ وہ ادھر متوجہ ہوا تو علی جہانگیر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف مصافحے کے لیے آئے

ہوتے ہو یا ر! کیا کایج میں مستقل ڈرہ جمایا ہے؟“
”میں بابا جان کے کام سے حیدر آباد گیا تھا۔ ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔“ اس نے علی جہانگیر کا برہنہ ہوا
رکھا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھا تو پوچھنے لگا۔ ”تم کب آئے؟“
”آؤ اٹھنٹہ ہوا ہے اور بس ابھی جانے ہی والا تھا۔“
”ار! ابھی آتا ابھی جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“
ری ملازم ہوں۔ اپنا کام بس ایسے ہی چلتا ہے۔“ علی جہانگیر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا بابا جان! میں
لیلی جان سے مل لوں۔“

ناؤ۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔“ بابا جان نے کہا۔
انگیر نے جاتے جاتے شاہ تیمور کو اشارہ کیا کہ وہ بابا جان سے فارغ ہو کر اس کے پاس آئے۔
درنے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جانے کے بعد بابا جان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”ابن لودھ حیدر پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“
”؟“ بابا جان نیکیے کا سہارا چھوڑ کر یکدم سیدھے ہوئے ”کیا کہا تم نے؟ کہاں چلی گئی؟“
”نہیں معلوم کہاں چلی گئی۔ بس کچھ دیر کو میری توجہ اس کی طرف سے ہٹی تھی اور اتنی ہی دیر میں وہ
شاہ تیمور کے انداز میں حد درجہ بچھتا ہوا تھا۔“

”شہزادوں کے گھر سے؟“ بابا جان نے پوچھا تو وہ کتنی دیر نفی میں سر ہلانے کے بعد بولا تھا۔
”میں آج اسے حیدر آباد لے گیا تھا۔ کچھ اپنی چیزیں لینی تھیں کچھ اس کے لیے، بس وہیں سے لگتا ہے
لغے کی تلاش میں بھی پھر میں نے بہت ڈھونڈا اسے۔ کہیں نہیں ملی۔“
”تم آگئے۔“ بابا جان کے لیے میں ایسی چھین تھی کہ وہ تملایا گیا۔

”ابا ساری زندگی وہیں کھڑا رہتا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا اگر جو وہ خود سے نہ گئی ہوتی۔ اور مجھے اس کے جانے
بائیں بہ دکھ اس بات کا ہے کہ اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔“
”نہ! بابا جان نے اس کا مطلب سمجھ کر نخوت سے سر جھکا پھر اٹھ کر ادھر سے ادھر شلتے ہوئے بولے۔
”اکی ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ ادھر سکندر الگ، ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم
اس سے کہہ چکے ہیں کہ وہ کراچی چلی گئی اور سنو۔“

”اب ایک دم رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔
”ابا سید حیدر کے بارے میں ضرور پوچھو گا“ اسے یہی بتانا کہ وہ آٹھ دس دن پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ہم چھوڑ
لئے اسے سمجھے۔“
”بے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اثبات میں سر ہلایا تو بابا جان غصے میں بولے۔
”تم نے ہم نے کیا کہا۔“

”اس نے بابل خواست جی کی آواز نکالی تھی پھر اٹھ کھڑا ہوا تو بابا جان نے سخت لمحے میں تنبیہ نہ کی۔
”دار علی کے سامنے کچھ اگلی مت دینا۔ ہمیں اس وقت اس کی آمد خاصی مشکوک لگ رہی ہے۔“
”میرے بعد میری آمد بھی مشکوک لگے گی۔“ وہ سوچتا ہوا ان کے کمرے سے نکل آیا۔

”تاں گھر نہیں کہاں تھا۔ اس نے لاؤنج میں رک کر جہاں سے پوچھا اور اس کے لائسنس ظاہر کرنے پر اپنے
میں چلا آیا۔ خود اس کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ علی
نور اس کے پاس آئے گا اس لیے اس سے ہر قسم کی بات کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥
”نکے بے حد خوفزدہ تھی، اس لیے مٹھی میں جتنے پیسے تھے رکشہ والے کو تھما دیے اور بھاگ کر گیٹ پار کر

میں تمہارے لیے بہت محبتیں، بہت چاہتیں ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں سب تم سے۔ تمہارے گھر بہت سونا ہو گیا تھا اور ہم سب بہت اداس۔“
 بن تو سب کو بہت تنگ کرتی تھی۔“ وہ گم سم سے انداز میں بولی تھی۔ تب ہی صبا نے کمرے میں ما۔
 ہی ہیں۔“

نے گردن موڑ کر دیکھا تو صبا بت جڑبڑی ہو کر واپس پلٹنے لگی کہ وہ پکار کر بولی۔

اے ماما کیوں پریشان کیا۔“
 انہیں تو ماما تو بہت خوش ہوئیں تمہارا سن کر اور ہاں تم نیچے سب سے مل کر آ رہی ہو! صبا بت
 ارا وہ ترک کر کے اس کے پاس آئی تھی۔

لوئی نظری نہیں آیا۔ میں سیدھی اور چلی آئی۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بیڈ کی بیک پر سر رکھا تو
 اس مسافت کو سوچنے لگا جو وہ طے کر کے آئی تھی۔
 در اسے دیکھ رہے تھے اور صبا بت کی نظریں نیل پر تھیں۔

بہت خاموشی سے سرکتے جا رہے تھے۔ تینوں میں سے کسی کو پتا نہیں چلا کہ آسمیہ کمرے میں داخل
 اس کی پکار نے ایک دم بالچل بچادی تھی۔

ور صبا بت چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جبکہ وہ چونکنے کے ساتھ ہی چھلانگ لگا کر آسمیہ کے
 جاگتی اور یوں چل چل کر روئی کہ اسے چپ کراتے کراتے آسمیہ نڈھال ہو گئی تھی۔ آخر سکون کا
 نارا سے سلا دیا اور کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد نیل اور صبا بت کو لے کر کمرے سے نکل کر آئی
 ہری انداز میں پوچھنے لگی۔

پھوڑ گیا ہے مدھو کو۔“
 میں پھوڑ گیا اس نے کچھ بتایا ہی نہیں اور مجھے اس وقت خیال ہی نہیں آیا کہ میں باہر نکل کر دیکھتا۔ اصل
 اہل آقا تخی خوفزدہ تھی اور اتنا رو رہی تھی کہ میں۔“

ہاتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئے تو آسمیہ نے مزید نہیں کرید اور ان دونوں کو کھانا کھانے کی تاکید کرتی
 ہارے میں آگئی کل شاہ سکندر اس سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ آج مدیہ کو لے آئیں گے۔ اس کے خیال
 سے پھوڑ گئے ہوں گے۔ لیکن مدیہ کا خوفزدہ ہونا اور رونا اس کے خیال کی نفی کر رہا تھا۔ کتنی دیر وہ اسی
 لپکتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر لیٹ گئی کہ اصل بات مدیہ سے معلوم ہو جائے گی۔ جسے اس نے انجکشن
 ہاتھ اور شام سے پہلے اس کا اٹھنا متوقع نہیں تھا۔ اس لیے اس کی طرف سے کچھ بے فکر ہو کر آسمیہ خود
 مٹی۔ یوں بھی دوپہر کی نیند اس کے معمول میں تھی اور معمول کے مطابق ہی وہ ساڑھے چار بجے اٹھ
 پہلے مدیہ کے پاس جا کر اسے چیک کیا پھر اس کے قریب پریشان بیٹھی صبا بت کو دیکھ کر قصداً مسکرا کر

بالر کی بات نہیں ہے بیٹا یہ ابھی تھوڑی دیر میں بہت فریش اٹھے گی۔ جب تک تم چائے کے ساتھ کچھ
 نظام کر لو۔ کیونکہ اس نے دوپہر میں کچھ نہیں کھایا تھا۔“

پہلے بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا؟“ صبا بت نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 اٹھتے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن پہلے میں شاور لوں گی۔“

بس ہے ماما! اتنے میں بسکٹ اور کیک منگوا لیتی ہوں اور ہاں ماما جی دوبارہ مدھو کو دیکھ کر جا چکی ہیں کہہ
 نا کہ جب یہ اٹھے تو مجھے بلا لیتا۔“ صبا بت نے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے دیکھا۔

آئی۔ آنگن اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے کسی کو پکارا بھی نہیں اور اسی طرح بیٹھتی ہوئی یہ
 پھاٹک کر اوپر آئی تو بالی سے نکلتے نیل کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ان کے سینے سے جا لگی اور ایسے
 اختیار اس کے آنسو چھلکے تھے۔ جبکہ پورا دو چوہے کی طرح لرز رہا تھا۔
 ”مدھو! نیل کو اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال نے گنگ کر دیا تھا۔ بہت آہستہ سے اس کے کمرے
 جا مل کر کے اسے اپنی پناہوں میں تولے لیا پھر بھی غیر یقین سے تھے۔

”نیل بھائی! مجھے چھپا لیں، مجھے چھپا لیں نیل بھائی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا ہو گا۔“ وہ روتی ہوئی کہہ رہی
 ”کون؟ کوئی نہیں آئے گا۔“ نیل عمل طور پر ان لمحوں کی گرفت میں تھے۔ جانے کیسے یہ چند لفظ کہہ
 ”آپ نہیں جانتے انہیں۔ بس آپ سارے دروازے بند کر دیں۔“ وہ ان کے بازوؤں میں چل کر چڑھ
 کی آواز سن کر صبا بت اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”کون ہے نیل بھائی؟“ پھر ایک دم ٹھٹھک کر دیکھنے لگی تو نیل جیسے ہوش میں آ گئے۔ فوراً اسے
 سے تھا مگر جو اسے الگ کرتے ہوئے بولے۔

”مدھو! صبا بت بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔“ کیا ہوا مدھو! تم رو کیوں رہی ہو؟“
 ”یہ سوال جواب بعد میں کرنا، پہلے اسے کمرے میں لے جاؤ۔“ نیل نے صبا بت کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

”آپ! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے صبا بت کو چھوڑ کر نیل کا بازو تھام لیا۔
 ”کیس نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ؟“ نیل اس کا ہاتھ تھام کر صبا بت کے کمرے میں لے
 اس کے ساتھ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولے۔

”صبا! جاؤ پانی بلکہ گلو کو زلا کر لے آؤ۔“
 صبا بت اٹھ کر قدموں واپس پلٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں گلو کو زلا کر آگئی تو نیل نے گلاس لے کر
 ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی۔ پھر باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔
 ”میں سچ گھر آگئی ہوں۔ صبا! نیل بھائی میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ناں۔“

”اف مدھو! تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو اور تم کسی کے ساتھ ہو؟
 حسب عادت پریشان بھی تھی اور فوراً ساری باتیں جان بھی لینا چاہتی تھی اور جانتا تو نیل بھی چاہے
 اس کی حالت کے پیش نظر بہت حمل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور صبا بت کو بھی ایک بار پھر ٹوک دیا۔

”تم صبر نہیں کر سکتیں۔ ذرا آرام کرنے دو اسے۔“
 ”ہاں، میں بہت تھک گئی ہوں۔“ اس نے ناگہم سیدھی کرتے ہوئے کہا تو نیل اٹھ کھڑے ہو۔
 ”لیٹ جاؤ لیکن سونا نہیں۔ میرا مطلب ہے کھانا کھا کر سونا۔“

”مما! آج میں نے کتنا کچھ کھا ہے۔“ اس نے سامنے والے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
 ”مما آج دیر سے نہ کا کچھ کھا ہے۔“ کموٹو فون کر دوں۔“
 ”نہیں، انہیں پریشان مت کرو۔“ اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر فوراً

گئی اور بے حد خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔
 ”میں ماما کو فون کرتی ہوں۔“ صبا بت نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو نیل اس
 ہوئے بولے۔
 ”سنو، تم تو بہت بہادر ہو۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے اور پھر اب تو تم اپنے گھر میں ہو۔“
 وہ بہت خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں ابھی بھی نمی تیر رہی تھی۔

”ہاں بلا لو۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔
 کچھ دیر بعد جب دوبارہ مدھیہ کے پاس آئی تو وہ چھت پر نظر میں جمائے ساکت بیٹھی تھی۔
 ”یہ جو ایسی ہو بیٹا؟“ آسیہ نے اس پر جھک کر پوچھا تو اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں پھر گری سانس کے ساتھ بولی تھی۔

”میں ماما کے پاس سوؤں گی نہیں۔ میرا مطلب ہے جب وہ سو جائیں گی تو تمہارے پاس آ جاؤں گی تم سونا
 بچہ خند کماں آئے گی؟“ صبا حبت نے کہا۔
 ”جہ پھر میں آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر آسیہ کے کمرے میں آئی تو زیر و پاؤں کی مدھم روشنی میں نیم دراز آسیہ
 نگار کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں ماما۔“
 ”نہ! آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”چلو منہ ہاتھ دھو لو پھر چلا
 نہیں گئے۔“

”مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے لیکن ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
 ”صبا نے انتظام کر لیا ہے تم آؤ تو۔“

وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آسیہ کے ساتھ کمرے سے نکل کر رآمدے میں آگئی جہاں صبا حبت نے چائے
 ساتھ اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اور خود جانے کہاں تھی۔

”صبا کہاں چلی گئی اور نیل بھائی؟“ اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔
 ”نیل! آسیہ نے وہیں سے نیل کو پکارا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”صبا آ رہی ہے تمہاری مائی جی کو لے کر۔“

”اماں جی اور اباجی کیسے ہیں؟“
 ”سب ٹھیک ہیں بیٹا! چائے پی کر پھر نیچے چلتے ہیں۔“ آسیہ نے پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ تب

نیل آگئے اور ادھر سے صبا حبت بھی میمونہ بھائی کے ساتھ آ رہی تھی۔
 السلام علیکم مائی جی! ان کے قریب آنے پر اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا اور میمونہ بھائی کے گلے

لگی۔
 ”جیتی رہو۔ خوش رہو۔“ میمونہ بھائی نے اس کے گال پر پیار کیا پھر بیٹھے ہی پوچھنے لگیں۔ کس کے ما

آئی ہو؟“
 ”آسیہ اس کا جواب سننے کے لیے بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کسی کے ساتھ نہیں۔ اکیلی آئی ہوں۔“ اس کے جواب پر آسیہ کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں
 جبکہ میمونہ بھائی اچھل پڑیں۔

”اکیلی شاہ پورا والوں نے تمہیں اکیلا بھیج دیا؟“
 ”انہوں نے نہیں بھیجا بلکہ وہ تو بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میں خود آئی ہوں کسی کو بتائے بغیر۔“ وہ ابھی

کے خلاف کچھ نہیں بولنا چاہتی تھیں۔ اس لیے سارا الزام اپنے سر لیا اور پھر خود بھی حیران سی ہوں۔ شاید
 لیے کہ یہ سہا موقع تھا جو اس نے کسی مصلحت کا دامن تھا تھا۔

”کسی کو بتائے بغیر۔“ آسیہ نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کلینک فون کروں۔“
 ”آپ کلینک جاری ہیں ماما؟“ مدھیہ نے فوراً پوچھا۔

”نہیں بیٹا! اس لیے تو فون کر رہی ہوں۔“ آسیہ اس کا گال تھپک کر آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہو۔
 جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ صبا حبت اس سے شاہ پورا والوں خصوصاً ”شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کے لیے آئی
 ہیں۔ اور وہ خود بھی اب تک کی ساری روداد کی کو سننا چاہتی تھی اور اس کے لیے دونوں انتظار کر رہی

کے نیل اور آسیہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جا چکی تھیں۔ لیکن جب سونے کا وقت آیا تو آسیہ نے اسے
 پاس بلا لیا۔ جس پر اسے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ حیرت زدہ رہی۔ اور جاتے جاتے مڑ کر صبا حبت سے کہنے لگی۔

”یہاں میرے پاس لیٹو۔“
 ”میرے لیے پریشان نہیں ماما؟“ وہ اوندھی لیٹی اور دونوں ہاتھ ملا کر ان پر ٹھوڑی ٹکا کر پوچھنے لگی۔

”آسیہ نے ذرا سائنات میں سر ملایا پھر اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”پریشان تو میں
 یہ خیال بھی تھا کہ تم اپنے باپ کے پاس ہو۔ اس لیے اتنا وقت میں نے خاموشی میں گزار دیا۔“

”بہت کم شاہ پور میں رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھیں آرام کی غرض سے ایک دو دن کے لیے جاتے ہیں ورنہ
 ہاں کبھی کہاں۔ ابھی بھی شاید کینڈا میں ہیں۔“

”نیل تو ابھی کل۔“ آسیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر سنبل کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہنے لگی۔
 ”اب مجھے صبا حبت کی فکر ہے۔ انجانے میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن اب جان بوجھ کر تو میں اسے کسی مشکل میں

ال کتی۔ پتا نہیں سب لوگ کیسے ہیں۔ اگر اچھے ہوں تب بھی میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے ان کا مقصد
 مجھ سے بیٹیاں چھیننا ہے۔ تم تو ہاں رہ کر آئی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”یہاں ہے ماما! میں نے خود سنا تھا۔ بابا جان۔ جہاں گئے چاچا سے کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے کہہ دیں کہ اگر
 اسلام آتی چاہتے ہیں تو صبا حبت کو رخصت کر دیں اس کے بعد سے ماما مجھے لگائیں آپ کو کبھی نہیں دیکھ

۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔
 ”میں نہیں بیٹا! روؤ نہیں روؤ نہیں میری جان۔“ آسیہ نے اس کا سراپے سینے پر رکھ لیا۔ ”تم تو بہت

پر تم نے یہ بات اپنے باپ سے کیوں نہیں کہی۔“
 ”اس وقت بابا کو بالکل سمجھ نہیں پاری تھی۔ پھر بھی میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے کراچی لے چلیں

ان نے آئندہ پرناں دیا جس سے میں کیسی سمجھتی کہ وہ بھی بابا جان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے دوبارہ
 ان سے یہاں آنے کی بات نہیں کی بلکہ شاید موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں وہ اسلام آباد چلے گئے تھے۔ پھر میں

بہت کر کے بابا جان سے کہا تو وہ مجھے یہاں لانے کا کہہ کر اپنے رقبوں پر چھوڑ آئے تھے۔“ وہ بولتی جاری
 وہ ساتھ اس کی ناک سے شوشوں کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔

”پھر کس کے پاس؟“ آسیہ کے وجود میں انگارے سکنے لگے تھے۔
 ”کے پاس نہیں۔ اتنے بڑے رست ہاؤس میں چوکیدار اور اس کی بیوی تھی۔ اس رات مجھے بہت ڈر لگا

ت روئی تھی۔“ اس نے اس رات کے تصور سے جھرجھری لی پھر آسیہ کا ہاتھ اپنے گال پر رکھتے ہوئے
 ”اب کو بہت تنگ کرتی تھی ماما! اس لیے میرے ساتھ ایسا ہوا۔“

”بیٹا! ایسا مت سوچو۔“ آسیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر پوچھنے لگی۔ ”تم وہیں رست ہاؤس
 ہو؟“

”ماما! وہاں سے شاہ تیمور مجھے کہیں اور لے گئے تھے پھر پھوپھو شہر بانو کے پاس تین دن چھوڑا اور آج دن
 آباد لے کر آئے تھے۔ شاہنگ کے لیے وہیں مجھے موقع ملا اور میں انہیں چھوڑ کر بس میں سوار ہو گئی۔“

”یہ تو آسیہ پر سوچ انداز میں اسے دیکھ گئی۔
 ”ابھی ڈر لگ رہا ہے ماما! وہ لوگ یہاں تو نہیں آجائیں گے۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ ہلا کر کہا۔

”کون؟“ آسیہ نے چونک کر پوچھا۔
 ”شاہ پور سے کوئی تھی۔ آپ کسی کو نہیں بتائیے گا کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا اور شاہ پور تو کبھی بھی نہیں پایا کروا کر ملنا ہو گا تو وہ یہیں۔“ اس نے ایک دم پچلا ہونٹ و انتوں میں دبایا اور پھر خائف بھی ہو گئی تھی۔

”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تم ڈرو مت۔ کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ میرے پاس سے تمہیں باہر نکال دے۔“ آسیہ نے اس کا گال تھپک کر تسلی دی پھر اپنے پیچھے سے ایک تکیہ نکال کر برابر میں رکتے ہوئے بولی۔

”چلاؤ اب تم سو جاؤ۔“
 ”یہاں نہیں ماما! میں اپنے کمرے میں سوؤں گی۔“ وہ صباحت کا خیال کر کے اٹھ گئی۔

”ڈرو گی تو نہیں؟“
 ”اگر ڈر گا تو آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ آسیہ کے گلے میں بائیں ڈال کر بولی۔ پھر شرب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

دو بج رہے تھے لیکن صباحت جاگ رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹتے ہوئے بولی۔
 ”میں آتی ہوں لیکن تمہاری کس بات کا جواب نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

صباحت خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔“

”تم ذرا بھی نہیں بدلیں۔“ صباحت نے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”کوئی مطلب نہیں چلو سو جاؤ۔“ صباحت کروٹ بدلنے لگی تھی کہ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
 ”سونا ہوتا تو میں ماما کے پاس نہ سو جاتی۔ تمہارے لیے آتی ہوں میں یہاں مجھے پتا ہے تم اندر سے کتنی

چین ہو اور کس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔“
 ”کس کے؟“

علی جمالیہ کے اور کس کے۔“ اس نے شرارت سے اس کے بازو میں چنگی کاٹ کر کہا۔
 ”جی نہیں، میں اس کے بارے میں جان کر کیا کروں گی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔ تم صرف

اپنی بات کرو۔ تم نے ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کیا؟“ صباحت نے اپنے اندر کے سارے جتنوں کو دبا کر بات کرنا شروع کی۔
 ”میں نے میں نے کیا پریشان کیا۔“

”کیوں شاہ پور پہنچنے کے کتنے عرصے بعد تم نے یہاں اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور میں نے جب تم سے آئے کا کہا تم نے یہی جواب دیا کہ تم کبھی نہیں آؤ گی اور ابھی کچھ دن پہلے تم نے اپنی شادی کی اطلاع دے کر ہم پر برا احسان کیا تھا۔“ صباحت خاصی ناراضی سے اسے لتاڑنے لگی تھی۔ وہ سن کر کبھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔

گہری سانس کھینچ کر کہنے لگی۔
 ”یہ صحیح ہے، البتہ میں نے قصداً سب کو پریشان کیا۔ یہاں اور وہاں بھی، کیونکہ میں سب سے متفرق تھی اور اس متفرق کردار کے وجہ سے سب کی تمہارے ساتھ محبت جبکہ میرے لیے کسی کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اب پتا نہیں

واقعی ایسا تھا یا محض میری سوچ نے مجھے سب سے شامی کر دیا تھا۔ بہر حال شاہ پور جا کر میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کسی کو میری پروا نہیں تو پھر میں کیوں اپنی خیریت کی اطلاع دوں جبکہ وہاں بھی سب خصوصاً بابا جان، علی جمالیہ اور پاپا اس بات سے پریشان تھے کہ میں ماما کو فون کیوں نہیں کر رہی۔ وہ تو خیر یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہاں ماما پر

بیت رہی ہے اور میں انہیں کوئی اطمینان نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے ان کے بار بار ٹوکنے پر ہی میں نے فون

نہ کیا اور جب کیا تو تم پر ہی ظاہر کیا کہ میں وہاں بہت خوش ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی اور میں سچ کہوں تو رقت میرے اندر عجیب سی رقابت تھی کہ یہاں وہاں ہر جگہ صبا صبا کی پکارے اور میں کہیں نہیں۔ مقررہ رکھنے لے لے لے آخر سب کچھ تمہارے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ میرے لیے کیوں کچھ نہیں۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں لیم ہوا کہ کائنات کے سارے نظام دو اور لوگ کے اصول پر چل رہے ہیں اور میں تو دینا جانتی ہی نہیں صرف لینا

سچی ہوں ہو نہ۔“
 اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

ماں صم سے انداز میں اسے دیکھنے جا رہی تھی۔
 ”وہاں بھی میں شاید صرف لینا چاہتی تھی۔“ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”خود سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ

نہ بٹھایا اور یہ توقع کرنے لگی کہ سب میری طرف آئیں گے، جیسے میں کوئی بہت اہم، ہستی ہوں۔ اہم تو کیا میری ان کے نزدیک رہی برابر حیثیت نہیں تھی یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے بابا جان کی باتیں سنیں۔ تب

مسلمتی تو خطرے میں نظر آئی ہی ساتھ تمہاری فکر نے بھی گھیر لیا تھا۔ میں سوچتی تھی اگر ماما نے بابا جان کی باتیں کر تھیں رخصت کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے دونوں بیٹیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی اور میں چاہتی تھی کہ

بہتر ہو تو میں ماما کے پاس نہ سو جاتی۔ تمہارے لیے آتی ہوں میں یہاں مجھے پتا ہے تم اندر سے کتنی

ہاں کی آخری بات پر پری طرح چونکے تھے۔
”وہ شہراناو کے ہاں کب گئی تھی؟“

”چنانچہ، مجھے تو آج صبح شہراناو کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ مدیحہ دو تین دن اس کے پاس رہ کر گئی ہے۔ کیوں کیا ہاں اس کے شہراناو کے گھر جانے پر اعتراض ہے؟“ ”لی بی جان نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔
”ہمیں“ اعتراض کیوں ہو گا۔ بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ سب سے ملے اور اور کیا کہہ رہی تھی شہراناو۔“ وہ بدی مشکل سے خود پر ضبط کر رہے تھے۔ ورنہ دل یہ چاہ رہا تھا ایک دم سے ہر بات اگوا لیں۔
”ہاں اسی کی باتیں تھیں اور ہاں یہ تم باپ بیٹے نے اتنی خاموشی سے کیسے مدیحہ کی بات طے کر دی۔“ ”لی بی جان بے اچانک یاد آیا تھا۔

”نہیں تو میرا مطلب ہے آپ سے کس نے کہا؟“ وہ مزید ٹھنھکے تھے۔
”وہی شہراناو بتا رہی تھی بلکہ گلہ کر رہی تھی کہ بابا جان نے مدیحہ اور تیمور کی نسبت طے کر دی اور اسے بلایا ہے۔ میں نے لاکھ کہا یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن وہ مانی نہیں۔“ ”کنسنے کئی مدیحہ نے خود حکر کو بتایا ہے کہ لی تیمور کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔“

”جانتا نہیں لی بی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔“ ”ان کا ذہن چٹختے لگا تھا۔ بالوں میں ابل پھنسا کر سر کو جھکا دیتے ہوئے بولے تھے۔

”نہیں تمہیں بھی معلوم نہیں ہے۔“ ”لی بی جان نے تعجب سے پوچھا۔
”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ ”ان کی بے بسی اور ٹوٹے ہوئے بریلی جان دہل گئیں۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”بابا جان سے پوچھیں جا کر کہ وہ میری بیٹیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔ میں اگر ان کے مقابل کھڑا ہوا تو بات ادھوری چھوڑ کر خاصے جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے تو لی بی جان حواس باختہ ہو گئیں۔

”کون کہاں جا رہے ہو سکندر؟“
”انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پیچھے لی بی جان پکار رہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں پہلے شاہ پوٹس حیات کے پورشن میں جا کر ان سے شاہ تیمور کا پوچھا پھر وہیں سے باہر نکلے اور گاڑی میں بی بی ڈرائیور سے شاہ ہارون کے ہاں چلنے کو کہا تھا۔

”فریبا“ دو گھنٹے بعد وہ شہراناو کے پاس موجود تھے۔

”شہراناو نے انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے ذہن پر مدیحہ سوار تھی۔ اس کے اتنے والہانہ کے جواب میں بس اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور فوراً پوچھا۔

”مدیحہ آئی تھی؟“

”آئی، مآشاء اللہ۔“

”کس کے ساتھ آئی تھی؟“ ”انہوں نے فوراً دو سرا سوال کیا تو خوشی کا اظہار کرتی ہوئی شہراناو یکدم خاموش ہو کر ان کے تیمور دیکھ کر کچھ خائف سی ہو کر بولی۔

”تیمور کے ساتھ؟“

”نہیں دن رہی تمہارے پاس؟“

”نہیں دن؟“

”تیمور بھی ساتھ تھا؟“

”نہیں وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

مدیحہ فوراً ”کوئی جواب نہیں دے سکی۔ تو وہ پیراری سے ٹوک کر بولی۔

”چھوڑو اس بات کو۔ تم مجھے پایا کا بتاؤ۔ وہ کیسے ہیں اور تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہوا انہوں نے کچھ نہیں کیا اور اسٹینڈ نہیں لیا۔“

”وہ کیا اسٹینڈ لیتے انہیں تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی کہ بابا جان کے منصوبوں میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور بعد میں میری اور سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ کنیڈا چلے گئے تھے ابھی بھی شاید وہیں ہیں۔“

مدیحہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر تک پرسوج انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر اس انداز میں کہنے لگی۔
”میرا خیال ہے وہ سبیں کراچی میں ہیں۔ کل انہوں نے میس سے فون کیا تھا مجھے۔“

”پاپائے؟“ ”مدیحہ نے فوراً پوچھا۔

”ہاں۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”کہہ رہے تھے میں جلد تم سے ملنے آؤں گا۔“ ”وہ بتا کر خائف سی ہو گئی پھر اس کا ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔

”سنو ماکو نہیں بتاتا۔“

”کیوں؟ جب وہ ملنے آئیں گے تب ماکو پتا نہیں چلے گا یا وہ کوئی سلیمان ٹوپی پہن کر آئیں گے۔“ ”مدیحہ۔

”تک کر کہا۔“

”جب آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ تم سہر حال ماکو نہیں بتاؤ گی، سمجھیں۔“ ”صباحت بھی تیز ہو کر بولی تھی۔

”سمجھ گئی۔“ ”خلاف عادت وہ بڑی جلدی مان کر لیٹ گئی تھی۔



شاہ سکندر اس امید پر دو دن کانچ میں رکے تھے کہ شاید مدیحہ آجائے حالانکہ علی جمائگیر نے شاہ تیمور۔ معلوم کرنے کے بعد انہیں بتا دیا تھا کہ وہ کراچی جا چکی ہے اور پھر اس نے انہیں اپنے ساتھ چلنے پر اصرار بھی کیا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ انہیں اب کسی کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ اگر مدیحہ کراچی پہنچ چکی ہو، آسیر اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتی اور اب تو خود انہیں بھی اس کی سامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بابا جان بات سچ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے اور اس بار اپنے اشاروں پر چلانے کے لیے انہوں نے شاہ تیمور۔ انتخاب کیا تھا۔

ان دو دنوں میں شاہ سکندر نے بہت ساری باتیں سوچی تھیں تو انہیں بابا جان کی وہ بات بھی یاد آئی جو انہ نے کہا تھا کہ آسیر سے صباحت کی رخصتی کی بات کرو تو مدیحہ کی بات بھی کر لیتا۔ شاہ تیمور کے ساتھ۔ گویا وہ دو سری بیٹی کے لیے بھی باقاعدہ پان بنا چکے تھے اور وہ اتنے بے خبر تھے انہیں اپنی بے خبری پر بھی غصہ آیا۔

سہر حال میرے دن صبح وہ شاہ پور پہنچے تو بابا جان سے بس سلام دعا کی حد تک ہی ملاقات کی۔ مدیحہ کے بارے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے اوہر سے ایک ہی جواب آئے گا۔ جس کا انہیں یقین نہیں تھا اور بابا سے مزید نہ اچھنے کا وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ اس لیے ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ وہ مدیحہ کی تلاش میں گئے۔

نہ اس کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا تھا البتہ وہ دوسرے کھانے کے بعد لی بی جان کے پاس آکر بیٹھے اور پے کا حال احوال پوچھا پھر اوہر کی باتیں کرتے ہوئے مدیحہ کا ذکر لے آئے۔

”مدیحہ کے جانے سے آپ کو بھی کوئی فرق پڑا ہے لی بی جان کہ نہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ ”بچی صبح شام میرے پاس آکر بیٹھتی تھی۔ یعنی اور دو سری لڑکیوں کو بلاؤ تو سہما سہما ہوتے ہیں۔“

”آئی تھی۔“ ”بہت محبت کرنے والی بچی ہے۔ شہراناو بھی عرفیہ کر رہی تھی کہ دو دن میں اس کے ساتھ ایسے گئی جیسے پتا نہیں کب سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔“ ”لی بی جان مدیحہ کی عرفیہ کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

”پھر اسے لینے بھی دی آیا تھا؟“
”جی۔ خیر تو ہے ناں بھائی! کیا ہوا ہے؟“ شہر بانو نے تشویش سے پوچھا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔
”کہاں لے گیا ہے؟“
شہر بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”بتاؤ شہر بانو! تم سے کچھ تو کہا ہو گا تیور نے۔“
”میاں سے کہاں جانے کا پروگرام تھا اس کا؟“ وہ اس کی چند لمحوں کی خاموشی سے جھنجھلا گئے تھے۔
”پتا نہیں بھائی! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ خدا کے لیے آپ یہ تو بتائیں کیا ماجرہ ہے؟“ شہر بانو ان کے سوا در سے پریشان ہو کر عاجزی سے بولی۔
”ناجرا۔۔۔ وہ بہت مضطرب سے ادھر سے ادھر ٹھلنے لگے۔
شہر بانو اندیشوں کی زد میں آکر اندر ہی اندر ہونے لگی تھی۔ انہیں مخاطب کرنا چاہتی تھی، لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔
”سنو شہر بانو! اب اگر تیور مدیحہ کو لے کر یہاں آئے تو فوراً“ مجھے اطلاع کرنا اور میرے آنے تک مدیحہ کو اپنے پاس روکے رکھنا۔“
شہر بانو سمجھی یا نہیں، لیکن فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔
”میں چلتا ہوں۔“ وہ جانے کا کہہ کر چل بھی پڑے تو شہر بانو حیران پریشان سی ان کے پیچھے لپکی۔
”بھائی! اتنے عرصے بعد آئے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں تو کوئی چائے پالی۔“
”ابھی بہت کام ہیں شہر بانو! پھر آؤں گا۔“ انہوں نے پلٹ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر تیز قدموں سے باہر تھے۔
”میاں سے مایوس ہو کر اب انہیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا مزید آسیہ کے سامنے جو ابدی کا خیال پریشان کرنے لگا۔ وہاں سے اگلے دن ہی مدیحہ کو لانے کا کہہ کر آئے تھے اور یہاں چار دن ہو گئے تھے۔
”یا اللہ کہیں تو اس عورت کے سامنے مجھے سر خرودے۔“ انہوں نے پہلے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے سیٹ کی بیک پر رکھ لیا۔
گاڑی اونچی نیچی راستوں سے نکل کر شفاف سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ دور سے چورہا دیکھ کر انہوں نے دم کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی شہر جانے والی سڑک پر موڑنے کا کہہ کر پھر آسیہ کو سونگے۔ جس کے سامنے چند دن پہلے وہ اعتراف کر کے آئے تھے کہ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اسے جتا کہ ان کی زندگی میں آنے والے سارے امتحان، ساری آزمائشیں اور ساری تکلیفیں اسی لمحہ مرہون منت ہیں۔

شام کے سائے گرے ہو رہے تھے جب وہ علی جمائیکر کے بنگلے پر پہنچے مسلسل سفر اور مسلسل منشن نے اُپری طرح تھا کہ دیا تھا پھر بھی ان کا آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا شاور لیں گے۔ اور ایک لپ کے ساتھ علی جمائیکر سے شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے، بس اسی لیے اس کے بنگلے پر آ گئے تھے۔
علی جمائیکر کچھ دیر پہلے ہی اُس سے آیا تھا۔ ان کی آمد پر تو حیران نہیں ہوا لیکن ان کا غلیہ پریشان کن تھا۔
”خیریت چچا جان؟“ ان کے گلے لگتے ہوئے اس نے فوراً پوچھا۔
”مدیحہ کا کچھ پتا چلا؟“ ان کے سوال میں جواب موجود تھا۔
”مدیحہ!۔“ وہ ان کی پریشانی سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

”میں سارے میں معلوم کر آیا ہوں بابا جان نے پتا نہیں اسے کہاں چھپا دیا ہے اور اس بار یہ کھیل انہیں بہت پڑے گا۔ خیر تم جلدی سے چائے بناؤ مجھے آسیہ کے پاس جانا ہے۔“ انہوں نے اچانک عود کر آنے والے بڑبڑا کر کہا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ آسیہ کے پاس کس سلسلے میں لیکن ان کی پریشانی سمجھتے ہوئے خاموش رہا پھر کمر دین کو پکار کر نکلے جانے کا کہا۔ اس کے بعد انہیں دیکھ کر بولا۔
”چائے سے پہلے آپ ہاتھ لے لیں۔“
”ہاں! وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اٹھے تھے۔
پھر کچھ دیر میں وہ ہاتھ لے کر آئے تو غالباً وہی کپڑے دوبارہ پہننے کی وجہ سے خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔
نئے مینے ہوئے بھی ان کے چہرے پر مسلسل ناگواری کا تاثر رہا۔
علی جمائیکر کچھ دیر انتظار کر رہا کہ وہ کچھ کہیں گے لیکن جب وہ متوجہ ہی نہیں ہوئے تب اسے خود مخاطب کرنا چاہا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا آپ کو یقین ہے مدیحہ کو بابا جان نے کہیں ادھر ادھر۔“

اب حالات یہی ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے سے انہوں نے اس وقت جب میں کنیڈا جا رہا تھا۔ کہا تھا کہ وہ مدیحہ کو ہجومز آئے ہیں۔ جبکہ وہ رہے برنجی۔ خود تم نے اسے کانچ میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ تین چار دن شہر بانو ن رہی۔ وہاں سے پتا نہیں چل رہا کہ تیور اسے کہاں لے گیا ہے، سر حال کہیں بھی ہو میں اسے۔“ وہ بولتے ایک دم ہونٹ بھیج گئے پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان کی تقلید کرتے ہوئے لگا۔
”اب ڈاکٹر آسیہ کے پاس کیوں جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ان سے مدیحہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟“
”ہی کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ وہ بے اختیار کہہ گئے۔ پھر کچھ یوں وضاحت کرنے لگے۔
”کہاں تک میں ان سے غلط بیانی کروں غلط بیانی کی وجہ سے ہی سارے کام خراب ہو رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہ حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔“
”مجاہد! اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے بس سر ہلا کر رہ گیا۔
”اُسے میں چلتا ہوں۔“

”اب واپس بیٹیں آئیں گے نا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم انتظار نہیں کرنا۔“ وہ اس کا کندھا تھپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔
ہوں نے علی جمائیکر سے تو بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ آسیہ کو حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔ لیکن جیسے ٹینک قریب آ رہا تھا ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس بار وہ سیدھے آسیہ کے کمرے میں داخل نہیں ہوئے۔ پہلے چوکیدار سے کہلوایا اور اس کا جواب سن کر باہری اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے، اس وقت انہیں اسی نشیبت یاد نہیں تھی۔ بلکہ ایسا باپ جو گمشدہ بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد اب اس کی ماں کے سامنے سے خوفزدہ ہو کر اسے کیا کہے گا۔

”نہا! آدھے گھنٹے بعد غالباً“ آسیہ نے اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر انہیں بلوایا تھا۔ اور اتنی دیر میں وہ بجائے ہر کم کی صورت حال کے لیے تیار کرنے کے منہی سوچوں میں گھر رہے تھے۔ جب ہی آسیہ کے کمرے کی مجرم کی طرح داخل ہوئے تھے اور ان کے برعکس وہ بڑی پراعتقاد تھی۔
”خیریت رہیں۔“

کی معمول کی طرح بیٹھ گئے، تو آسیہ نے یوں دروازے کی سمت دیکھا جیسے کسی اور کی آمد متوقع ہو پھر ان کی متوجہ ہو کر پوچھا۔

”مدحو نہیں آئی؟“ انہوں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ جبکہ اندرا چانک ایک جنگ شروع ہو گئی تھی کہ وہ کیوں اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ مدحہ صرف اس کی بیٹی تو نہیں ہے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ آسہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ہاں نہیں۔“ وہ الجھنے لگے۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ جیسے بے اختیار ہو گئے تھے۔

”میں تھک گیا ہوں آسہ! اتنا سفر جانے کیسے طے ہو گیا۔ مزید ایک قدم نہیں چل سکتا۔ کوئی سارا نہ لے نہیں کیا کروں کس سے کہوں کہ کس جرم کی سزا پائی ہے میں نے جو ختم ہونے میں نہیں آتی تمہاں تم سے گواہ گا۔ کیونکہ ابتدا تم سے ہوئی تھی۔“

آسہ سر اٹھادی انہیں ٹوٹنا بھرتا دیکھ رہی تھی۔

اور انہیں جیسے کسی بہت اپنے کا کاہدہ میسر آیا تھا جس پر سر رکھ کر رو لینے سے دل کا سارا غبار دھل جاتا ہے وہ بھی اپنی کتاب زندگی کے تمام اوراق اس کے سامنے الٹ کر شانت ہو گئے تھے۔ کرسی کی بیک پر سر رکھ آٹکھیں بند کر لیں۔

آسہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ اس بے قصور شخص کو معاف کر دے یا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال پوچھے کہ یہ ساری باتیں اس نے اس وقت اسے کیوں نہیں بتائیں جب اس کے دل کی بستی اس کے دم سے نکلی۔ اب کیوں تیار رہے جب اندر سب کھنڈر ہو چکا۔

اس کی زندگی کی خاطر بابا جان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کے بنا وہ کیسے جئے گی۔

اف سکندر حیات تم نے تو حد کر دی۔ اب اس مقام پر یہ کہہ رہے ہو کہ یہ زندگی بھی بابا جان کی بخشی ہے۔

میرے خدا! اشرف المخلوقات بنایا تو ایک ذرا سا اختیار وقت پر بھی دیا ہوتا۔ میں ایسا کیا کروں جو گزرے سالہ سمٹ کر میری مٹھی میں آجائیں پھر یا تو میں اپنا ہر دن اس شخص کو دان کرتی جاؤں یا خود اپنے ہاتھوں سے زندگی کا خاتمہ کروں۔

تم ایسے بزدل سکندر حیات! اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔

کاش یہ اعتبار پہلے کرتے مجھ پر تو شاید پور کار میں ہو گیا دنیا کی کوئی طاقت میرے دل کی بستی نہیں اجاڑ سکتی! کتنا کھن مہر ملے آیا تھا جو گزر کے نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اندر صف ماتم کچھ گئی تھی۔ سارے دکھ ساتھ سکنے لگے تھے وہ بھی جو ابھی ابھی شاہ سکندر نے اس کی جھولی میں ڈالے تھے اور سدا کا بے رحم وقت نظریں چرائے گزر رہا تھا کیونکہ ان دکھوں کا دوا انہیں کر سکتا تھا۔

کتنی دیر بعد شاہ سکندر نے آٹکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ وہ پیہر ویش پر نظریں جمائے جانے کس کرب رہی تھی۔ جو اس کی آنکھوں سے جھٹک رہا تھا۔ وہ قصداً ”ذرا سا کھائے تو وہ جوئے کھنے کے ساتھ سیدھی ہوتا کچھ دیر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

”حالات و واقعات مقدر کے تابع ہوتے ہیں شاہ سکندر حیات! جو کچھ ہمارے لیے لکھا گیا ہوتا ہے وہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی طرح سہی۔ میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ کسی نے کیا کیا نصیب تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اندھے کنویں میں یہ سوچ کر چھلانگ لگا دوں کہ مٹا اگر دونا مرنا نہیں لکھا تو میں زندہ سلامت نکل آؤں گی۔ نہیں اللہ نے ذہن دیا ہے سوچنے سمجھنے کی صلاح ہے پھر حالات و واقعات ہمیں اور بہت کچھ سکھاتے ہیں اور سیکھنے کے بعد بھی اگر دوبارہ وہی غلطی دہرائی اس کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خوفناک نکلتے ہیں۔ آپ میری اس بات سے تو اتفاق کریں گے ناں۔“

شاہ سکندر بہت آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہانے لگے تھے۔

میر آپ بتائیں میں کیا کروں۔ جس راستے پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوں میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹیوں کے لیے ہ کا انتخاب کیسے کروں۔ گزشتہ بار آپ نے کہا تھا کہ میں ایک بار اور آپ کا اعتبار کر لوں! ایسے کر لوں آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مدحہ کہاں ہے جبکہ صاحت کے بارے میں آپ جانتے تھے۔ میرا مطلب ہے اس بی کے سلسلے میں آپ کے بابا جان نے جو پانا تنگ کی اس سے آپ بے خبر نہیں تھے بلکہ آپ ان کے ساتھ تھے کیوں؟“ وہ ان کا محاسبہ کرتے ہوئے سوال نشان بن گئی تھی۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میرے پیش نظر صاحت کی بہتری تھی اور ہے۔“ انہوں نے پھر زور دے کر گویا اس رشتے کو قائم رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

”وہ کتنی دیر ان پر تاسف سے نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں شاہ سکندر حیات! آپ پتا نہیں کس پہلو سے صبا کی بہتری سوچ رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے بے ایک بار پھر۔“

میں۔ ”وہ فوراً بولی پڑے۔“ یہ صحیح ہے کہ بابا جان نے صاحت کے حصول کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا تھا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

یہ نہیں پہنچا سکتے۔ مدحہ تم کے ساتھ انہوں نے کیا کیا۔“ وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

سکندر ابھی خود ہر بات کا اعتراف کر چکے تھے اس لیے لا جواب ہو کر رہ گئے پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے

جہ کو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی دونوں پوتیاں شاہ پور میں بیاباں اور اسی مقصد سے انہوں نے مدحہ کو اپنے پاس روک رکھا ہے۔ شادی کے بعد اس پر کوئی پابندی نہیں ہو جب چاہے گی آپ کے پاس آئے گی۔ اس طرح صاحت بھی۔“

لیکن مجھے اپنی بیٹیاں شاہ پور میں نہیں بیاباں اور یہ صرف میری ضد نہیں ہے میری بیٹیاں بھی ایسا نہیں مآ آئی ایم سوری شاہ سکندر حیات!“ وہ جتنی انداز میں کہہ کر گھڑی دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

سکندر اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر بھی خاموش بیٹھے رہے۔

اپنی چیزیں سمیٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے پتا نہیں قصداً ”انجان بن رہے تھے یا بوج میں تھے۔

بارہن رہے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ انہیں مخاطب کیے بغیر خود کلائی کے انداز میں بولنے

بچے۔“ انہوں نے سوچا اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہی مدحہ کی کاس کر اس تمام عرصے میں اس نے کوئی دوا دیا یا چایا تھا کہ اسے ہر صورت اپنی بیٹی چاہیے۔

آپ۔“ وہ ان کی نظروں سے الجھ کر اس اسی قدر کہہ سکی۔

ہاں چلنا چاہیے۔“ وہ ہاں کی صورت گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دروازے کے پاس جا کر

پہلٹ کر اسے مخاطب کیا۔

الکر آسہ! میں صاحت اور مدحہ سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے اس پر آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کل

بچے سہ پہر گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے۔“

ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ یقین سے بولے۔

میں جانتا ہوں مدحہ آپ کے پاس ہے۔“ اس کے ساتھ ہی دوبا ہر نکل آئے تھے۔



شاہ سکندر واپس علی جمالتیر کے پاس آئے تھے اور اسے اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر انہیں تعجب تو نہیں ہوا
پھر بھی نوک گئے۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“
”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ علی جمالتیر نے صاف گوئی سے کہا۔
”لیکن میں نے یقین سے تو واپس یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔
”کھانا گرم کروں آپ کے لئے؟“ علی جمالتیر ان کی بات ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔
”ہاں یا رہا! بھوک تو لگ رہی ہے اور بس کھانے کے بعد کافی بھی ضرور پیوں گا۔ گرم دین سے کتنا۔“
”گرم دین نہیں ہے۔ میں بنا دوں گا کافی بھی۔“ علی جمالتیر کہتا ہوا پچن کی طرف چلا گیا تو انہوں نے آرام سے
سامنے ٹیبل پر ٹائلیں سیدھی کر لیں اور اگلے دن کا پروگرام سوچنے لگے جو وہ آتے ہوئے آسیہ سے کہہ آئے تھے
کہ کل مدحیہ اور صباحت کے لئے گاڑی بھیج دیں گے۔

”آئیے چچا جان۔“ کچھ دیر بعد علی جمالتیر نے آکر کہا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً اٹھ کر اس کے
ساتھ ڈائننگ روم میں آگئے اور کرسی بھیج کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔
”تم نے کھانا کھایا یا میرے انتظار میں۔۔۔؟“
”کھایا تھا۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔
”گڈ!“ شاہ سکندر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

علی جمالتیر بہت توجہ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا، جس پر اب کسی تردد، کسی پریشانی کی لکیر نہیں تھی۔ اس
برعکس اطمینان بھٹک رہا تھا جس سے وہ سمجھ گیا کہ انہیں مدحیہ کا سراغ مل گیا ہے۔
”مدحیہ یقیناً کراچی میں ہے نا؟“ قدرے توقف سے اس نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔
”ہاں!“ انہوں نے نیچکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کب سے۔۔۔ آئی مین کون چھوڑ گیا ہے اسے؟“
”چنانچہ۔۔۔ یہ ساری تفصیل نہیں پوچھی میں نے۔ مدحیہ سے معلوم کروں گا۔ ہاں، تم کافی بنانے وا۔“
”تھے۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی۔۔۔ آپ چلیں میں لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً پچن کی طرف بڑھ گیا۔
شاہ سکندر لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنے رہائشی کمرے میں آگئے اور کپڑے نکالنے کی غرض سے الماری کھولا
لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو بغیر کسی پروگرام کے یونہی چلے آئے تھے۔ یعنی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائے تھے۔
”چچا جان!“ علی جمالتیر نے غالباً ”کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پکارا تھا۔“

”باب۔۔۔ آجاؤ۔“ انہوں نے الماری بند کر کے کہا۔
علی جمالتیر اندر آیا تو جھولی ٹیڑھے میں کافی کے دو گم تھے۔
”تمہیں صبح آفس نہیں جانا؟“ انہوں نے ایک گم اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھ کر بولا۔
”جنانا ہے۔ بس یہ ہے کہ کچھ لیٹ ہو جاؤں گا۔“

”اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہراؤ گے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو علی جمالتیر قدرے جھینپ گیا۔
”نہو سر! آپ نے تو نہ مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا اور نہ اپنے ساتھ کافی پینے کی آفر کی۔“
”گویا اپنے ہر عمل کے تم خود ذمہ دار ہو۔“

شاہ سکندر نے کافی کے ایک دو سبب لینے کے بعد سگریٹ ساگن تھی اور ایک ساتھ دونوں سے شغاف
ہوئے، تاہم علی جمالتیر کی موجودگی بھول گئے یا قصداً ”نظر انداز کر رہے تھے۔ کچھ بھی تھا بہر حال علی جمالتیر
لے ان کی لالچائی خاصی تکلیف دہ تھی۔ کچھ دیر ہی وہ خود پر جبر کر سکا، پھر پہلے ذرا سا کھاس کر انہیں اپنی موہ

دلا یا اس کے بعد مخاطب کر کے کہنے لگا۔

چچا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر آسیہ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آئی مین میرے اور
کے۔۔۔؟“

آئی ڈونٹ نوٹا! میری ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔“ انہوں نے پہلے سرسری انداز میں کہا پھر
احساس ہونے پر اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

تم فکر نہیں کرو میں انشاء اللہ جلد ڈاکٹر آسیہ سے بات کروں گا۔ اصل میں وہ سب سے زیادہ تمہارے باپ
نفر ہیں۔ اگر تم غیر جانبداری سے دیکھو تو وہ حق بجانب ہیں اس لئے میں انہیں زیادہ فورس نہیں کر سکتا۔
شش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ صباحت کی خاطر مان جائیں گی۔“

نب صباحت سے ملے؟“ علی جمالتیر نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔
نیل کل۔۔۔“ شاہ سکندر اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔

نی ماما! دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکلیں تو آسیہ ایک نظر ان پر ڈال کر ڈائننگ کی طرف بڑھتے ہوئے
ہیٹا! کھانا کھالیں۔“

نی ماما! ٹیبل بھائی تو ابھی آئے نہیں۔“ صباحت اچھنے میں گھر کر بولی۔
نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آگئیں۔
ارات تمہیں بتانا بھول گئی۔“ آسیہ ڈونگا اٹھا کر ان دونوں کی ہلٹیوں میں سالن نکالتے ہوئے بظاہر
نڈاز میں بولنے لگی۔ ”اور صبح بھی یاد نہیں آیا ورنہ اسی وقت تم سے کہہ جاتی۔ خیر ابھی کافی وقت ہے۔ تم
ہ تیار کر سکتی ہو۔ تین بجے تمہارے پیپا کی گاڑی آئے گی۔ تم دونوں چلی جانا۔“

ہاں؟“ دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔
میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں ملیں گے بہر حال وہ تم دونوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض
ہو کہ تم دونوں اب سمجھ دار ہو۔“ آسیہ بہنوز سرسری انداز میں کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

اگر وہ ہمیں شاہ پور لے گئے؟“ مدحیہ نے فوراً خدشہ ظاہر کیا تو آسیہ ایک دم سراوٹا کر کے اسے دیکھنے لگی
خود بھی اس خدشے سے پریشان تھی لیکن ان پر ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اب جو مدحیہ نے کہا تو وہ سوچ میں
رکتی دیر بعد اس نے ان دونوں سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

بہ میرا خیال ہے، وہ ایسا نہیں کریں گے۔“
ہی ماما۔“ مدحیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے نوک دیا۔

ہاں کوئی بات نہیں ہے بیٹا! پھر تم پہلے بھی ان سے مل چکی ہو کئی مرتبہ۔۔۔ یہ دیکھنا صباحت گم
تھی۔

ٹھیک ہے ماما! لیکن انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔“ مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو
تے ہوئے بولی۔

ہو گیا معلوم۔ اب تم جلدی سے کھانا کھا کر تیار ہو جاؤ۔ شاہ سکندر کی گاڑی زیادہ دیر تک اس دروازے پر
نہ چاہئے۔ اوکے۔“ آسیہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل گئی

بھی جلدی کرو۔“
نہیں جاؤں گی۔“ صباحت نے اسی گم صم انداز میں کہا۔

ان کیوں نہیں جاؤ گی؟ اب تو ماما خود بھیج رہی ہیں ہمیں۔ چلو اٹھو۔ کھانا دانا بھی وہیں کھالیں گے پیپا کے

ساتھ۔ ”وہ زبردستی اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تو یہ بھی ماما کی پریشانی۔ عجیب ہیں ماما بھی۔ اگر انہیں پیلا پر اعتبار نہیں ہے تو صاف منع کر دیتیں۔ خیر یہ دیکھو۔ سوٹ تم پہن لو۔ یہ میں۔“

”ہاں میں۔“ صاحبہ اچھل پڑی۔ ”ہم کسی شادی میں نہیں جا رہے۔“

”تو تمہیں کیا پتا شاہ پور کی خواتین گھر میں بھی ایسے ہی بلکہ اس سے اچھے اور جھللاتے ہوئے کپڑے ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے صباحت کے اعتراف کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کپڑے استری کرتے کھڑی ہو گئی۔ ”تمہاری مرضی لیکن میں یہ نہیں پہنوں گی۔“ صباحت نے اپنے لئے دوسرا سوٹ نکال لیا تھا۔

پھر ٹھیک تین بجے وہ دونوں آسیر سے کہہ کر نیچے اتریں تو اسی وقت گاڑی بھی آگئی تھی۔

”مدحو! اس سے پوچھو پیلا کہاں ہیں؟“ صباحت نے اسے کہنی مار کر ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ”یا اللہ! یہ تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو۔ تمہاری زبردست دیکھ کر تو پیلا، لیکن نہیں، انہیں پتا ہے تم بہت ڈر ہو۔“ مدحیہ اس سے کہہ کر فوراً ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سنو! پیلا اس وقت کہاں ہیں؟“

”جی گھر پر۔“ ڈرائیور نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”گھر پر۔“ مدحیہ کو پہلا خیال شاہ پور کا آیا جب ہی فوراً پوچھنے لگی۔ ”تمہارا مطلب ہے شاہ پور میں۔“

”نہیں جی۔ یہاں کافیٹن روڈ پر۔“

”اچھا۔“ مدحیہ نے ”اچھا“ کو یوں لبا کھینچا جیسے بہت اچھی طرح واقف ہو پھر صباحت کی طرف جو سرگوشی میں کہنے لگی۔

”سن لیا۔ ہم منسٹر ہاؤس جا رہے ہیں۔ اب اپنی شکل ٹھیک کرو اور ڈرائیور بھی اکرالو۔“

”بکو مت۔“ صباحت نے دانت پیسے۔ ”میری جان پرینی ہے اور تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“

”مذاق! میں ہر مذاق نہیں کر رہی۔“

”اچھا بس چپ رہو۔“

”انتہائی فضول ہو تم۔“ وہ سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد گاڑی بڑے سے سیاہ گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔ تب وہ صباحت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ”چلو، تمہیں پیلا سے ملو اؤں۔“

”سنو، یہاں صرف پیلا ہی ہیں یا۔۔۔؟“ صباحت نے اس کے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر ”مجھے کیا پتا۔ یہ تو اندر جا کر معلوم ہو گا کہ اور کون کون ہے اور کوئی ہو بھی تو نہیں کیا۔“

”آئیے لی! صاحب انتظار کر رہے ہیں۔“ ایک باوردی ملازم نے قریب آکر کہا تو وہ صباحت کا ہاتھ بٹکے پیچھے چل پڑی۔

طویل گیلری کے بعد گول کمرہ تھا۔ وہیں شاہ سکندر موجود تھے۔

”بابا!۔“ مدحیہ انہیں دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

”تیسے ہو بیٹا! شاہ سکندر نے اس کی پریشانی جو مہلی پھر صباحت کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلے پر رہی رک پڑا۔“

”صبا! آؤ بیٹا! انہوں نے اپنا دوسرا بازو اس کی طرف پھیلا دیا تو وہ بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کی آغوش میں آکر پھر اگلے بل بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپایا تو اس کے آنسو بھی بے اختیار جھٹک گئے۔“

”نہیں نہیں بیٹا! روتے نہیں۔“ شاہ سکندر نے فرط محبت سے اسے اپنے بازوؤں میں جھینپ لیا تو۔

جیسے طویل مسافتوں کے بعد شجر سایہ دار میسر آ گیا ہو، جس کی ٹھنی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ جی بھر کر روتی تھی

نے غلط تو نہیں کہا تھا بابا! یہ روتی بہت ہے۔“ مدحیہ نے بڑی مشکل سے اسے الگ کر کے بٹھاتے ہوئے سکندر قصداً ”ذرا سا مسکرائے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولے۔

”نہیں روئے گی۔“

”کو نہیں بتا۔ اس کی آنکھوں میں مسند روں بتنا پانی ہے۔“

”روں بتنا۔“ شاہ سکندر خامے محفوظ ہوئے۔ ”کیوں بیٹا صبا! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

ت نے نفی میں سر ہلا کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی تو شاہ سکندر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پھران دونوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”نے کھانا کھالیا یا۔۔۔“

نے تو تھوڑا بہت کھالیا تھا، البتہ صبا نے بالکل بھی نہیں کھایا۔“ مدحیہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے پہلے کھانا کھاؤ۔“ شاہ سکندر نے کہہ کر ملازم کو پکارا اور اس کے آنے پر ان دونوں کو ڈانٹنگ ہال میں لے آکر وہ بیٹا! آپ دونوں کھانے کے بعد ادھر ہی آجانا۔“

کھانا نہیں کھا میں گے؟“ مدحیہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نچ نامم دو بجے ہے۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے



نے کے بعد وہ دونوں شاہ سکندر کے کمرے میں آئیں تو کچھ دیر تک وہ ہلکے ہلکے انداز میں ان کی تعلیم ان کی نند کے بارے میں پوچھتے رہے اور یہ کہ جڑواں ہونے کے ناتے کون سی باتیں اور عادات دونوں میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مدحیہ سے پوچھا تھا کہ وہ شاہ تیور کے ساتھ رہنے پر اپنی مرضی سے گئی تھی یا نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور یہ کہ وہ کراچی کس کے ساتھ آئی ہے۔

باپیں مدحیہ نے انہیں تمام حالات کہہ سنائے۔ وہ بہت متنفر ہو رہی تھی اور برملا اظہار بھی کر رہی تھی۔

میں کتنی بار صباحت نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کر کے احساس دلانا چاہا کہ اسے شاہ سکندر کا خیال ہے یعنی ان کے سامنے ان کے خاندان کو برا نہیں کہنا چاہئے لیکن وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بھی خاموش نہ تھیں۔

کندر بظاہر بڑے سکون سے سن رہے تھے اور اس کے خاموش ہونے پر اسی سکون سے بولے تھے۔

پہا ق پریشان ہوئیں اور مجھے بھی پریشان کیا۔ حولی میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہیں رہ کر آپ انتظار کرنا چاہئے تھا۔ میں کینڈا گیا تھا یا امریکہ۔ مجھے واپس تو وہیں آنا تھا۔ اس طرح آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر بھی بھروسہ نہیں تھا؟ ان کے تھہرے ہوئے پر سکون لہجے میں تنبیہ بھی کیا جیچن مدحیہ کو

نات بہت ڈرگا، سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔

ہکے اس اقدام سے میری پوزیشن کتنی آکڑ ہو گئی ہے۔ خود اپنے آپ میں گھٹی فیل کر رہا ہوں میں کہ

”بیٹا! مدحیہ رو پڑی تو وہ ہونٹ جھینچ کر اسے دیکھنے لگے۔“

”شکال اندر رہی اندر بیٹھنے لگا کہ جانے اب وہ کیا نہیں اور اگر اس کے معاملے پر بات کرنے لگے تو وہ کیا

”آئیے بیٹا! شاہ سکندر نے یکدم لہجہ بدل لیا اور مدحیہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”میں تو آپ کو

”خیر چھوڑو، باتوں کو اور یہ بتاؤ! اس کریم کیسی تھی؟“

”ماکی۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”صرف اچھی۔“ انہوں نے صباحت کو دیکھا تو وہ فوراً بولی۔
”بہت اچھی۔“

”گڈ! اور اب آپ دونوں میں سے مجھے بہت اچھی چائے کون پلائے گا؟“ انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھ کر صباحت نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مدحیہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”صبا! صبا! اچھی چائے بناتی ہے۔“

”اور آپ!“
”میں صرف اچھی۔“ اس نے یوں برا سامنے بنا کر کہا کہ وہ صاف منع کر دیں لیکن وہ دوا میں تھے۔
”چلو تو آج ہم صرف اچھی چائے پی لیتے ہیں، بہت اچھی پھر سی۔“
”مجھے پتا تھا آپ بیس کہیں گے۔“ وہ سدا کی کام چور بہت بے دلی سے انہی تھی، مزید صباحت کی مسکراہٹ سے تپ گئی تو جاتے جاتے اس کے بازو میں چٹکی کا تکی گئی تھی۔
”اف!“ صباحت اپنا بازو سسلانے لگی۔

شاہ سکندر نے قصداً اس کی طرف سے دھیان ہٹالیا اور اٹھ کر دیوار گیر ریک کا شیشہ کھولا تھا کہ فون کی بیل واپس پلٹ کر اسی جگہ آئی تھی اور ریپور اٹھالیا۔
”بس شاہ سکندر۔“
”اوہ علی! کیسے ہو بیٹا؟“

صباحت کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
شاہ سکندر نے پہلے نا سمجھی کے عالم میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر ایک دم سمجھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا جبکہ ادھر کی بات بھی توجہ سے سن کر کہہ رہے تھے۔
”نہیں، میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ البتہ کل میں شاہ پور جانے کا سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی کنفرم نہیں ہے۔“
”ابھی، نہیں ابھی نہیں۔ کل آجانا۔“
”اوکے خدا حافظ۔“ انہوں نے ریپور رکھ دیا اور کچھ دیر جانے کیا سوچنے کے بعد بہت آہستہ سے صباحت کو کدھا تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نیل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی لابی میں آکر فون کے پاس کھڑے ہو جاتے کبھی میز پر جا کر دور تک دیکھتے۔ اس پریڈ میں آٹھ بج گئے تو ان کے اضطراب میں خدشات بھی شامل ہو جینیں وہ کسی طرح دبا نہیں سکے تو آسیر کو فون کر ڈالا۔

”پھوپھو! بدحواس اور صابھی تک نہیں آئیں؟“
”آجائیں گی بیٹا!“ آسیر کے لہجے کے اطمینان نے انہیں مزید منتشر کر دیا۔
”کب میرا مطلب ہے کب تک آئے گا کہہ گئی تھیں۔ آٹھ بج گئے ہیں۔“
”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب ان کا باپ بھیجے گا تب ہی آئیں گی ناں۔“
”کیا ہو گیا ہے پھوپھو آپ کو۔ آپ نے انہیں جانے کیوں دیا تھا۔ پتا نہیں شاہ سکندر انہیں کہاں لے گئے۔“
”نیل نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بھی مصلحتاً ”شاہ پور کا نام نہیں لیا۔“
”نہیں نہیں لے گئے۔ میں اسی شہر میں ہیں۔ تم فکر نہیں کرو آجائیں گی۔“ آسیر نے پھر خود کو تسلی دینا شروع کر دیا۔

”میرے خدا!“ نیل ریپور رکھ کر پھر میز پر نکل آئے اور ریڈنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا۔
تک مسلسل ٹھنسنے کے باعث ان کی اکڑی ہوئی کمریں ٹھنسن اٹھنے لگی تھیں۔

شہ غلط فیصلے کرتی ہیں پھوپھو۔“ چیرے کی بیک سے کمر نکالتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ اور اس بار تو انہوں نے اپنی نہیں کہ شاہ سکندر رہیں۔ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید تھک گئی ہیں پھوپھو یا پھر۔۔۔“
”ہنسی کی آواز سے وہ بری طرح چوکنے اور انہی اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ صباحت نے لابی سے پکارا۔
”بل بھائی!“

”نیل!“ انہوں نے گہری سانس کھینچی اور اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے چیرے کی بیک پر سر رکھ لیا۔
”بل بھائی۔“ دوسری پکار کے ساتھ ہی صباحت سامنے آتی ہوئی بولی۔

”پہاں کیا کر رہے ہیں۔ سو گئے کیا؟“
”بل نے آنکھیں کھول دیں لیکن بولے کچھ نہیں۔“
”ابو! نیل بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ صباحت متوحش سی ہو کر آگے آئی اور ان کی پیشانی پر ماتوہ آہستہ سے اس کی کلائی تھام کر بولے۔
”ٹھیک ہوں بالکل! بس ذرا پریشان ہو گیا تھا۔“

”بات سے؟“ وہ کبھی نہیں۔
”جا جائے دو۔ تم اپنی سناؤ۔ مل آئیں اپنے پیارے؟“
”نیل بھائی!“ اس کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی جیسے برسوں کی آرزو پوری ہوئی ہو اور ایک جذب میں کرسی کے بازو پر دونوں ہاتھ جما کر فرش پر گھٹنے ٹیک گئی تھی۔
”ہے گے!“

”اتجھے۔ بہت محبت کرنے والے، مجھے لگا جیسے۔“ مدحیہ کی آمد سے اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔
مدحیہ کی آمد خاموشی سے نہیں ہوئی تھی خاصی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔
”نیل۔ تم یہاں ہو۔ یقیناً۔“ نیل بھائی کو پوری، سہمی سناری ہوئی۔ بس کو صبا! اسرال جاؤ گی تو بڑا مسئلہ روزانہ بھاگ کر آنا پڑے گا تمہیں۔ نیل بھائی کو ان بھر کی روداد سنانے کے لئے۔“

”ومت۔“ اسے غصہ آ گیا۔
”نیل نہیں رہی۔ عرض کر رہی ہوں کہ خدا کی بندی رحم کو نیل بھائی پر۔ بے چارے عاجز آگئے ہوں یوں نیل بھائی؟“

”رہنے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جھنجھلا کر بولی۔
”آپ کبھی سچ نہیں بولیں گے۔“
”لے لے کہ تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔“ صباحت نے کہا تو نیل فوراً ”مداخلت کرتے ہوئے

”ابو جاتا ہے تم دونوں کو۔ فضول میں لڑنے لگتی ہو۔ چلو جاؤ جینج کر کے کھانا گاؤ۔“
”ماتا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔“ مدحیہ نے کہا۔

”کھا کر آئے ہیں۔ ماما اور نیل بھائی تو ہیں۔ آپ چلیں نیل بھائی میں بس ابھی جینج کر کے آتی ہوں۔“
”مکھی ہوئی اندر چلی گئی تو نیل مدحیہ کو دیکھ کر بولے۔

”نیل روکا نہیں انہوں نے۔“ نیل جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔
”نیل۔ وہ زیادہ یہاں رہتے کب ہیں۔ آج یہاں ہیں۔ کل شاہ پور میں ہوں گے۔“ وہ انتہائی لاپرواہی سے دے رہی تھی۔

”اور تم سے پوچھا نہیں انہوں نے کہ تم شاہ پور سے کیسے آئیں؟“
”پچھا تھا اور الٹا مجھ پر ناراض ہو رہے تھے کہ میں اس طرح کیوں آئی۔ مجھے وہیں شاہ پور میں رہ کر ان کا

انتظار کرنا چاہئے تھا۔ ”مدحیہ کو اب اس بات پر غصہ آنے لگا تھا۔

”یعنی سارے حالات سننے کے بعد بھی کہہ رہے تھے کہ میں وہیں رہتی۔ آپ بتائیں میں روکتی تھی۔“
فیصلی ذرا سانس فی میں سر ہلا کر پوچھنے لگے۔

”اور صبا کے بارے میں کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے اس کی رخصتی شادی کی کوئی بات کی۔“

”بالکل کچھ نہیں۔ حالانکہ اب انہیں اس مسئلے کو سلجھانا چاہئے۔ بے ناں۔“ اس نے پھر تاکید چاہی تو منبر بے ساختہ مسکرا ہٹ کے ساتھ بے ساختہ بولے تھے۔
”ہاں ناں۔“

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب علی جمالیگر شاہ پور پہنچا تھا۔ بھوک اور سفر کی تھکان دونوں ہی غالب تعمیر پہلے اس نے سوچا چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن خالی پیٹ نیند آتی بھی مشکل تھی۔ اس نے بچن میں جھانک دیکھا تو بچراں نظر آئی۔

”بچراں! جو بھی کھانا ہو گرم کر کے نکالو میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ دروازے میں سے کہہ کر واپس پلٹا اور قدموں سے اپنے پورشن میں آیا تو شاہ جمالیگر کے کمرے کی آواز آئی تھی جس کا مطلب تھا وہ سوئے نہیں ہیں۔ اس نے رک کر ان کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ کہا۔

”اباجی! میں ہوں علی۔“

”علی! ہاں اندر آ جاؤ۔“ شاہ جمالیگر کے لہجے میں تعجب غالباً اس کی بے وقت آمد پر تھا۔

اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور سر اندر کر کے بولا۔ ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ خیریت سے تو ہونا بیٹا۔“

”جی۔ دعائیں ہیں آپ کی۔“

”تو اندر آؤ۔“

”وہ بابا میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگر آپ۔۔۔“

”ہاں! ہاں چلو پہلے کھانا کھاؤ۔ کوئی ہے بچن میں یا سو گئے سب۔“ شاہ جمالیگر بول کر کھڑے ہو گئے جیسے نو کے لئے کھانا گرم کرنے کو تیار ہوں۔

”بچراں ہے اب اور میں اس سے کھانا نکالنے کا کہہ آیا ہوں۔ آپ بیٹھیں آرام سے میں کھانا کھا کر آپ

پاس ہی آؤں گا۔ آپ ابھی سو تو نہیں رہے نا؟“

”نہیں۔“ شاہ جمالیگر دوبارہ بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ اس کا صرف منہ ہاتھ دھونے کا تھا لیکن جب آئینے میں خود کو دیکھا تو پھر شاور لے کر ہی نکلا اور ڈرائنگ میں جا کر کھانا اس کے بعد دوبارہ شاہ جمالیگر کے کمرے میں آیا تو اب وہ باقاعدہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”سوری! میں نے بے وقت آپ کو تنگ کیا۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
”نہیں نہیں بیٹا! میں تو جاگ ہی رہا تھا اور کھانا تو تمہاری ماں کو بھی اٹھا دوں۔“ شاہ جمالیگر نے اسے کھونچا نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو فوراً بولا۔

”نہیں امی کو نہیں اٹھا سیں۔ مجھے بس آپ سے بات کرنی ہے۔“

”کیا بات؟“ ان کے تھکنے پر وہ اپنے آپ میں الجھ کر اور جیسے آگیا کر بولا تھا۔

”کوئی نئی بات نہیں ہے اب! ابھی پرانا قصہ ہے میری شادی کا۔ کیا سوچا ہے آپ نے؟ اگر آپ صبا سے نہیں بنا چاہتے تو صاف کہہ دیں میں خود اسے طلاق دے کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔“

”بابا! میں۔۔۔ شاہ جمالیگر اچھل پڑے۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تنگ چھوڑ دو گے۔“
”ہاں چھوڑ دوں گا۔ صرف اسے ہی نہیں آپ سب کو بھی۔ زندگی بھر میری صورت نہیں دیکھی ہیں۔“

بس ابھی فیصلہ کر لیجئے۔ صباحت کو بھونانا ہے کہ نہیں۔“ اس نے ٹھوس حتمی لہجے میں کہا تو شاہ جمالیگر گھٹے۔

تاؤ چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہے تمہارا اس سے۔ باقی رخصتی کے لئے اس کی ماں نہیں مان رہی

یوں نہیں مان رہی۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”آپ گئے تھے اس کی ماں کے پاس؟“

ن۔ نہیں۔“ شاہ جمالیگر نظریں چرا گئے۔

نب گئے ہی نہیں تو پھر کیسے کہہ رہے ہیں کہ وہ نہیں مان رہی۔ آپ ایک بار جائیں تو اور بابا جان کے بے بن کر نہیں بلکہ میرے باپ بن کر جائیں۔ اگر آپ کو میری خوشیاں میری زندگی مطلوب ہے تو اس کے آپ کو دامن پھیلائے میں بچکچا نا نہیں چاہیے اور یہ کام تو آپ کو بہت پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن آپ منظر سے

بہتا تو بات وہیں پہلے مرٹے پر ہی ختم ہو جاتی۔“
بابا! اس لئے کہ آپ لوگ فیئر نہیں تھے۔ اگر فیئر ہوتے تو آپ کے اندر پہلے مرٹے پر ہی بات ختم ہونے کا بلکہ یقین نہ ہوتا۔“

ابا! مطلب ہے تمہارا؟“ شاہ جمالیگر نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں اب!۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں تو سنیں کہ بابا جان کے دل میں کے خلاف جو نفرت، بغض اور دشمنی تھی وہ انہیں طلاق دلوانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ جب ہی تو انہیں صباحت کا پتا چلا تو وہ ایک بار پھر ڈاکٹر آسیہ کو زیر کرنے کا سوچنے لگے۔ انہیں میری شادی سے کوئی نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ڈاکٹر آسیہ سے بیٹی چھیننا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکے تھے۔
یہ نے درمیان میں اگر سارے کئے کرانے پر پانی پھیر دیا۔ جس سے وہ اور تھملا گئے اور صباحت کے کے لئے مدحیہ کو استعمال کرنے لگے۔ کہیں کسی مقام پر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ دونوں لڑکیاں ان کا اپنا ہیں۔ ان کے ذہن پر صرف آسیہ سوار رہی اور وہ بس اس کے خلاف سوچتے اور پلٹا بنا تے رہے۔ اگر پوتوں میں اور واقعی ان کی بہتری سوچ کر وہ آسیہ سے بیٹی مانگتے تو میں یقین سے کہوں گا کہ وہ بھی انکار نہ

نہیں جانتے بیٹا وہ عورت۔۔۔۔۔“

رت ہی سے نا۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پہلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اسی کی رک اور بیڑھی اگر آرام سے محبت سے سیدھا کرو گے تو سیدھی ہو جائے گی ورنہ ٹوٹ جائے گی اور ٹوٹی رت کو رام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر صرف بھرتی ہی نہیں پھر بھی جاتی ہے۔ آپ خدا کے مہا بابا جان کے اشاروں پر چلنا بند کریں اپنے ذہن سے سوچیں کیا مباحات اور مدحیہ سکندر ریچا کی بیٹیاں نہیں

میں۔۔۔ میں کیا آپ کی اولاد نہیں ہوں۔“

ابا! نہیں۔“ شاہ جمالیگر مکمل طور پر اس کی گرفت میں آ چکے تھے۔

رکوں آپ میری خوشی کا خیال نہیں کر رہے۔ مجھے تو اس سارے فتنے میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا ہے میری کوئی اہمیت، کوئی حقیقت ہی نہیں۔“

بابا! میں۔۔۔

نہیں۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں یا میرا خیال کر کے میں آپ صرف بابا جان کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ان ہی کی زبان بولتے رہے اور ابھی تک وہی کرتے

ابا! جان کہتے ہیں۔“

فک لیجئے گا بابا! میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں جو خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں اور نہ ہی میں مزید انتظار کر سکتا

ہوں۔ صباحت میری منکوحہ ہے اور یہ طے ہے کہ ڈاکٹر آسیہ خود اسے لاکر میرے گھر نہیں پہنچوڑ جائیں گی۔ آپ جانا پڑے گا۔ امی اور آپ اور یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کی ہر اسی رشتے کے ساتھ بندھی ہے۔“
اس کے آخری جملے پر شاہ جہاگیر منہ کھولے اسے دیکھتے رہ گئے کیونکہ اس نے ان کے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور وہ انہی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر پھر کسی وقت پر چھوڑنا ہوا انہی ہوا۔

”اچھا بابا۔ اب آپ آرام کریں بہت رات ہو گئی۔“
”نہیں۔ تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جہاگیر نے چونک کر پوچھا۔
”میں کمرے میں جاؤں؟“ وہ بتا کر مسکرایا۔

”ہاں اور یہ لائٹ آف کرتے جاؤ۔“
”اوکے شب بخیر۔“ وہ لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل آیا۔
دو بج رہے تھے جب اس نے تکیے پر سر رکھا اور اپنی باتوں کو سوچتے ہوئے کچھ ہی دیر میں سو بھی گیا تھا۔



کافی دن چڑھ آیا تھا جب عارف بیگم نے آکر اسے اٹھایا تھا۔
اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلے حیران ہوا پھر ایک دم یاد آیا کہ وہ رات ہی یہاں آیا تھا۔ فوراً اٹھتے ہوئے ”السلام علیکم امی!“
”جیتے رہو۔ رات کس وقت آئے تھے؟“ عارف بیگم نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پوچھا۔

”گیارہ بج رہے تھے شاید۔“
”گیارہ! تمہارے باپ تو بتا رہے تھے دو بجے سوئے ہو تمہیں جب ہی میں صبح تمہیں اٹھایا نہیں۔“
”جی آیا تو میں گیارہ بجے تھا پھر باپ کے ساتھ باتوں میں دو بج گئے تھے۔ ابا اٹھ گئے یا سو رہے ہیں ابھی۔“
”وہ تو صبح ہی اٹھ گئے تھے۔ چلو تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بھجواتی ہوں۔“ عارف کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہاں بھجوائیں گی۔ نہیں میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ حیران سے کہنے کا گاجائے میں دودھ کم ڈالے۔“
کچھ دیر بعد نیچے اتر کر آیا تو بس برائے نام ناشتا کیا۔ اس کے بعد بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا سے شاہ تیور نے اسے پکار لیا۔

”علی، سنو!“
اس نے پلٹ کر دیکھا پھر قصداً ”مسکرا کر بولا۔

”ہیلو، کیسے ہو۔“
”ٹھیک ہوں۔ تم کہاں جا رہے ہو۔“ شاہ تیور نے بہت عجلت سے جواب دے کر پوچھا۔
”یہیں بابا جان کے پاس، آؤ چلو۔“ اس نے بہت سادہ سے انداز میں کہا۔
”نہیں تم جاؤ بلکہ بعد میں چلے جانا پہلے میرے ساتھ آؤ۔“ شاہ تیور نے اسی عجلت میں آگے آکر پکڑا تو وہ حیرت سے بولا۔

”ارے میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جانا کہاں ہے؟“
”تم آؤ تو۔“ شاہ تیور نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ تاجدار اس کے ساتھ چل پڑا۔
برآمدہ میں آکر شاہ تیور رک گیا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر رازداری سے پوچھنے لگا۔
”سنو، تم نے مدیہ کو دیکھا ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے بڑے آرام سے اثبات میں گردن ہلائی تو شاہ تیور یک دم پر جوش ہو گیا۔

”کہاں۔ کہاں دیکھا ہے؟“
”یہیں اسی گھر میں۔“

”اسی گھر میں! میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔“ شاہ تیور کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔
”پھر کالج میں۔“ ہاں آخری بار میں نے اسے تمہارے ساتھ کالج میں دیکھا تھا۔ کیوں کیا ہوا اسے؟“ وہ سارا بلکہ سمجھ کر انتہائی معصوم اور انجان بن گیا تھا۔
”کچھ نہیں۔“ شاہ تیور مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔
”نہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس نے اصرار سے پوچھا تو شاہ تیور کچھ دیر پر سوچ انداز میں دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔
”مدیہ چلی گئی یہاں سے۔ کسی کو بتائے بغیر۔ کیا تم اس کے گھر سے معلوم کر سکتے ہو کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی۔“

”میں! امیرا تو ہاں آنا جانا نہیں ہے۔“ اس نے ایک طرح سے مددوری ظاہر کی۔
”آنا جانا نہیں ہے فون تو کرتے ہو گے۔“ شاہ تیور نے بے قراری سے کہا۔
”وہ بھی نہیں۔“
”کیوں؟“

”میں کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ اس کے آرام سے کہنے پر شاہ تیور جھنجھلا گیا۔
”عجب آدمی ہو تم۔ اپنی منکوحہ کو فون بھی نہیں کرتے نمبر جیسی ہے تمہارے پاس یا وہ بھی نہیں ہے۔“
”ہے نمبر ہے۔“ وہ اندر ہی اندر اس کی حالت سے خاصا غصہ ہو رہا تھا۔
”تو بھائی میرے، میری خاطر ہی فون کر کے مدیہ کا معلوم کرو۔“ شاہ تیور نے خوشامد سے کہا۔
”اگر تو یوں لیکن فرض کرو اگر مدیہ وہاں نہیں پہنچی تو میں تو پھنس جاؤں گا۔ سوری یا ریا کرو مجھ سے نمبر لے لو معلوم کرنا ہے خود کرو۔“ اس نے بین کے لئے جیسے ٹٹولتے ہوئے کہا پھر اسے دیکھا۔ ”بین ہے تمہارے؟“

”ہاں۔“ شاہ تیور نے جب سے بین نکال کر اسے دیا تو وہ اس کے ہاتھ پر نمبر لکھ کر بولا۔
”اگر تمہاری بات ہو مدیہ سے تو میری منکوحہ کو میرا سلام کھلوانا۔“
”صرف سلام۔“ شاہ تیور نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
”صرف سلام۔“ وہ کھل کر مسکرایا اور اسے ہاتھ ہلاتا ہوا اندر آیا تو کچھ دیر بی بی جان کے پاس بیٹھا پھر بابا جان کے کمرے میں آ گیا۔

”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔
”کونسا جزاؤں! ہم کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ بابا جان نے کہا تو وہ بڑھ کر پوچھنے لگا۔
”اب کو میری آمد کی اطلاع کس نے دی؟“
”مجھ تمہارے باپ نے بتایا تھا کہ رات گیارہ بجے تم آئے بغیر کسی اطلاع کے۔“
”گوئی اتنی دور سے تو نہیں آتا ہو تا بابا جان جو پہلے سے پروگرام بنایا جائے اور یہاں اطلاع کی جائے۔ بس جب پابنتا چل پڑتا ہوں۔ آپ سنائیں کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“ اس نے اپنی بات سرسری انداز میں کہہ کر ان مصروفیات جاننے میں دلچسپی ظاہر کی۔

”ہماری مصروفیات وہی ہیں جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہیں۔ زمینوں کے بکھیرے پھر تم لوگوں کے مسائل۔ کیا ہوا اڑی شادی کا۔ کچھ بات بنی؟“ بابا جان نے یوں کہا جیسے اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے تھک گئے ہوں۔
”بات بنانے سے بنی ہے بابا جان! جبکہ ادھر سے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔“ اس کی صاف گوئی پر بابا

جان کی پشانی شکنیں آلود ہو گئی۔
 ”جی نہیں۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

ابو اس بند کو سکندر اور چلے جاؤ ہمارے سامنے سے ورنہ۔۔۔ ”بابا جان کا اشتعال انتہا کو چھو رہا تھا۔
 ورنہ کیا۔ شوٹ کروں گے مجھے گردیں۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ خاموشی سے دیکھ اور سن رہا
 دم حرکت میں آگیا۔
 چچا جان! پلیر چلیں۔“

میں۔۔۔ آج دیکھ لینے دو کہ کتنا دم خم ہے ان میں۔“ شاہ سکندر کی طرف سے کھلا چیلنج تھا۔
 م خم دیکھنا چاہتے ہو؟“ بابا جان دیوار پر لگی ہندو کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھے تھے۔
 جگڑا۔ وہ واقعی پریشان ہو گیا اور بھاگ کر بابا جان کے سامنے آکر بولا۔ ”خدا کے لئے بابا جان! یہ کوئی مذاق
 ہے۔“

اٹھ جاؤ علی۔“ بابا جان نے اسے دھکیلنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس نے ان کی دونوں کانیاں تھام لیں۔
 اتنی مضبوط تھیں کہ بابا جان کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں اور اس سے پہلے کہ ان کی کمزوری ظاہر ہوئی وہ
 اور شاہ سکندر کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے بولے۔
 لے جاؤ اسے یہاں سے۔“

سکندر نے اونہ کے انداز میں سر جھٹکا اور کین کی چیر کو پیر سے ٹھوکر مارتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو
 ے مطمئن سے ہو کر بابا جان کے بیروں کے پاس بٹھنے ٹیکتا ہوا بولا۔
 یس بابا جان، ریلیکس۔“ پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ریلیکس کر کے ہی ان کے کمرے سے نکلا

”اس نے صباحت کو پکارتے ہوئے نیل کے کمرے میں جھانکا تو وہ کتاب سے نظرس ہٹائے بغیر بولے۔
 نہیں ہے۔“

ماں ہے؟“ اس نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔
 لی ہوگی۔“ اس بار نیل نے کتاب بند کر کے اسے دیکھا تو وہ برا سامنہ بنا کر بولی۔
 ناگوئی نام ضرور ہونا چاہئے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔
 بے ساختہ مسکرائے لیکن بولے کچھ نہیں۔
 آپ کو عجیب نہیں لگتا؟“ وہ نیچے اوپر کی گردان سے جھنجھلا کر ان سے پوچھنے لگی۔

لئے کہ آپ خود عجیب ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
 نے تھک گیا۔“ نیل نے خاصے محفوظ انداز میں تاکید کی تو وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔
 کہا۔“

بس عجیب ہوں۔“ نیل نے کہا تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھنے کے بعد بولی۔
 رگستہ عجیب بھی نہیں ہیں۔“
 واہ تھوڑا سا۔“ نیل بھی ابھی ہی اس موڈ میں آتے تھے۔
 سے بھی صبا کی وجہ سے ہیں۔“ اس نے کہا تو نیل حیران ہوئے۔
 مبا کی وجہ سے کیوں؟“

پوری عجیب، بلکہ عجوبہ ہے اور آپ پر تھوڑا بہت اس کا اثر آیا ہے۔“
 تم نے نئی بات بتائی۔“ نیل نے بمشکل جیسی مضطرب کر کے کہا تب ہی فون کی بیل پر وہ انہیں ابھی آئی
 کرفون کے پاس آئی تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بابا جان۔“ وہ خاصا جڑ بڑ ہوا۔
 ”پھر کیا مطلب ہے تمہارا، کیا چاہتے ہو تم؟“ بابا جان کے لہجے میں طنز تھا جیسے تم مجھے مشورہ دو گے۔
 اس نے مصلحتاً ”خاموشی اختیار کر لی اور پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا کہ اسی پل دروازہ کھلی سی رہ سکے
 ساتھ کھلا اور شاہ سکندر اندر داخل ہوئے تھے۔

”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام میں پہل کی۔
 ”شاہ سکندر سر کے اشارے سے جواب دے کر بابا جان کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔
 ”السلام علیکم۔“
 ”وعلیکم السلام۔“ بابا جان نے انہیں جواب دے کر فوراً علی جمائیکر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تم دونوں ساتھ آ
 تھے؟“

”جی نہیں۔ میں رات کو آیا تھا اور چچا جان شاید ابھی آرہے ہیں۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر آگے آتے ہو
 بولے۔
 ”شاید نہیں یقیناً۔“

”ہوں۔“ بابا جان نے یوں ہٹکارا بھرا جیسے ان دونوں کی آمد کو کوئی معنی پہنارہے ہوں۔
 ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے بابا جان۔“ شاہ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بابا جان کو ٹوکا تو وہ چو
 کر بولے۔
 ”ماں بیٹھو۔“

”شکریہ۔“ شاہ سکندر نے بیٹھتے ہوئے علی جمائیکر کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھایا تھا
 قصداً ”بابا جان کو سنا کر اس سے کہنے لگے۔
 ”کل میں نے تمہیں اپنے ماں آنے سے روک دیا تھا تم نے ضرور مانتا کیا ہو گا۔ آئی ایم سوری۔ اصل
 اس وقت صباحت اور مدحیہ میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔“
 ”مدحیہ۔“ بابا جان بے اختیار بول کر خاموش ہو گئے تو شاہ سکندر انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔
 ”جی مدحیہ۔ آپ نے تھیک کہا تھا کہ وہ کراچی میں ہے۔ اپنی ماں کے پاس لیکن آپ اسے چھوڑ کر نہیں
 تھے۔“

”کوئی بھی چھوڑ آیا ہو۔“ بابا جان نے اس بات کو قطعی غیر اہم قرار دے کر اپنی طرف سے موضوع ختم کر دیا
 ”کوئی بھی نہیں بابا جان! کوئی بھی نہیں۔“ شاہ سکندر ایک دم آپ سے باہر ہو گئے۔ ”دکھ تو اس بات کا۔
 میری بیٹی کو یہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ کیوں۔۔۔ کیوں کیا آپ نے اس کے ساتھ ایسا۔ رقبے پر
 چھوڑ دیا۔“
 ”شکر کرو رقبے پر چھوڑا، کہیں اور نہیں پہنچا دیا۔“ بابا جان کا کھیل ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بارہائے والوں میں
 نہیں تھے۔

”ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، لیکن۔۔۔“
 ”خدا الزام مت لگاؤ سکندر۔۔۔“ بابا جان زور سے دھاڑے۔ ”اگر ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو تم کبھی اس
 دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کبھی اپنے ارادے میں ناکام نہیں ہوئے۔“
 ”ناکامی ہی نے آپ کو بولکھا دیا ہے بابا جان! جو آپ کوئی رشتوں کی پہچان بھی بھول گئے ہیں۔“ شاہ سکندر
 کے دھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”مدحیہ ہیں۔“ دوسری طرف شاہ تیمور تھا۔ جانے آواز بدل کر بولا تھا یا وہ نہیں پہچانی تھی۔
”جی آپ کون۔“

”مدحیہ، میں ہوں تیمور۔“ شاہ تیمور نے اس بار اسے پہچان کر کہا تو وہ لہک کر بولی۔

”اوشاہ تیمور، کیسے ہیں آپ؟“
”کیسا رکھنا چاہتی ہو تم؟“ شاہ تیمور کے جذباتی لہجے پر وہ ایک لحظہ کو کھٹکی پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔
”جیسے آپ ہیں۔ ویسے یہ امید کم ہے کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں گی۔“

”کیوں؟“

”جانتی نہیں۔“ وہ ٹال کر موضوع بدل گئی۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“
”تھیک ہیں۔ یہ بتاؤ تم اس طرح کیوں چلی گئیں بغیر بتائے۔“ شاہ تیمور کے لہجے میں چور تھا۔ وہ زور سے نہ
”بابا! آپ کا مطلب ہے مجھے بتا کر آنا چاہئے تھا۔ کسے آپ کو یا بابا جان کو؟“

”کسی کو بھی۔“ وہ اس کی ہنسی سے مزید جڑ بڑھوا تھا۔
”چھا! آئندہ خیال رکھوں گی اور کوئی بات۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“
”مدحیہ! آیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟“ شاہ تیمور نے ٹوکر
کیا۔

”کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ بیکہ مدحیہ بن گئی۔
”تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ شاہ تیمور نے زور سے کہنا تو وہ چیخ
”شٹ اپ شاہ تیمور! مجھے اس حال میں پھانسنے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے تمہارے پورے
سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت۔ مجھے تم اور آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔“

اس نے انتہائی غصے سے ریسورٹ کر دیا اور جیسے ہی ہلکی ساٹنے نیل اور صباحت کھڑے نا سمجھنے والے ایک
دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔



”اومنہ محبت! ایسی ہی پاگل احق ہوں تا میں جوان کے قریب میں آ جاؤں گی۔ سو بارعت بھیج
اسے جرات کیسے ہوئی یہاں فون کرنے کی۔“ وہ بقیہ غصہ اپنے آپ بول کر نکالنے لگی تھی۔
”اؤف! کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کون تھا؟“ نیل کے اشارے پر صباحت نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔
”وہ شاہ۔ شاہ تیمور جسے میں چکروے کر بھاگی تھی۔“ اس نے یوں بتایا جیسے اگر وہ سامنے ہوتا تو اسے

لیتی۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ صباحت نے اس کے غصے سے خائف ہو کر کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ ہونہ۔“
اس نے استہزاء سے انداز میں کہہ کر سر جھکا تو صباحت نے بے اختیار نیل کی طرف دیکھا۔ جن
ایک سایہ سالہا لیا تھا۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولے تھے۔

”تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟“
”کیا! وہ مزید سلگ کر چینی۔“ آپ کے خیال میں مجھے خوش دونا چاہیے؟“
”ہے تو خوش کی بات کہ تمہارے لیے جی شاہ پورے۔“
”بس نیل بھائی! خاموش ہو جائیں۔“ وہ چیخ کر بولی اور پھر ایک مہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

رہے۔! نیل نے پریشان ہو کر صباحت کو دیکھا تو اس نے اشارے سے اسے چھپڑنے سے منع کیا لیکن
وہ نہیں سکے اور قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے
پول۔

بات بات کر رہی تھی۔ میں جانتی ہوں آپ سب مجھ سے تنگ ہیں۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔“
جلی، تو تم بالکل۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے نیل بھائی نے جو تم ان پر ناراض ہو رہی ہو۔“ صباحت نے ٹوکتے ہوئے
نیل یہ شاہ پور والوں کی فیور نہیں کر رہے۔“ وہ روتے ہوئے اسی طرح بولی۔

میں۔ میں نے کب کسی کی فیور کی ہے۔ میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا۔“ نیل نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔
”نی ضرورت نہیں ہے آپ کو یونہی ایک بات کہنے کی۔ بہت برے لگتے ہیں مجھے شاہ پور والے! بد تیز، ظالم
“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

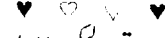
نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

”وہ کیا چاہتے ہیں؟“ کاش تم جان سکو۔“ صباحت کی دھیمی آواز اس نے سن لی تھی پھر بھی پوچھنے لگی۔
”کیا کام ہے؟“

”کچھ نہیں۔ چلو آؤ نیچے چلتے ہیں۔ میں نے عمر سے کچھ کتابیں منگوائی تھیں پتا نہیں لایا ہے کہ نہیں۔
صباحت بات بدل گئی۔
”تم جاؤ۔“ وہ اس کے بات بدلنے پر چڑ کر بولی اور اس کے جانے کے بعد دھیمی آواز میں نیپ آن کر کے یہ
گئی تھی۔



شاہ سکندر آج تیسرے دن بھی حویلی ہی میں تھے۔ لیکن بابا جان سے دوبارہ ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔
قصداً ”گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے اندر ابھی بھی غصہ بھرا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ بابا جان سے پھر ان کا
کامی ہو۔ اتنا تو وہ جان گئے تھے کہ بابا جان کو صباحت اور مدیحہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انہوں نے صرف آخر
اپنی ضد باریک رکھا ہے۔ جبکہ خود ان کے پیش نظر ان کی دونوں بیٹیاں تھیں اور وہ صرف باپ بن کر ان کے لیے
رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ بابا جان نے جس طرح اپنی دوسری اولادوں اور ان کی اولادوں کی شادیاں کر
اسی طرح اور اسی شان سے ان کی بیٹی صباحت کو بھی رخصت کرالائیں۔ اور وہ اس سلسلے میں بابا جان سے سہ
سے بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مدیحہ کے معاملے میں جو ان کے ساتھ بچ کما ہی ہوئی تھی اس کی وجہ سے خود
مؤذ ابھی تک خراب تھا۔ کتنی بار مرنساء نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار انہوں نے جھڑپ
اسے خاموش کر دیا تھا اور اس بار تو کمرے سے ہی نکل جانے کو کہا تو وہ بری طرح تپ کر ان کے مقابل آگئی تھیں
”شاہ! یہ گھرتویوں بھی آپ کے لیے سرائے ہے۔ دو ایک دن کے لیے آتے ہیں ان میں بھی اپنے مسائل
الجھے رہتے ہیں۔ میرے لیے بچوں کے لیے آپ کیسے کوئی وقت نہیں۔“
”میرے مسائل الگ نہیں ہیں۔ بچوں ہی کے لئے پریشان ہوں۔“ وہ اس کا تپا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر قند

نرم ہو گئے لیکن انداز میں ناگواری تھی جیسے بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔
”میں بھی بچوں کی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ مرنساء نے کہا تو اس بار وہ کچھ سنبھل کر بولے۔
”کیا بات؟“

”آغا! ماشاء اللہ شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے میں شہر بانو کی بیٹی لانے کا سوچ رہی ہوں۔ بابا جان
بھی یہی چاہتی ہیں اور الماس کے لیے۔“
”الماس ابھی چھوٹی ہے۔“ وہ فوراً بول پڑے۔ ”اس کے لیے تمہیں ابھی سے فکر کرنے کی ضرورت
ہے۔ میں اسے بہت بڑھانا چاہتا ہوں۔ انٹر میں اچھے مارکس لے آئی تو میڈیکل میں ایڈمیشن کرا دوں گا۔“
مرنساء نے فوراً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ان کی بات سے متفق ہو کر کہنے لگی۔
”ٹھیک ہے الماس پڑھے گی لیکن آغا تو زمین جائیداد دیکھنے والا ہو گیا ہے اس کی شادی میں دیر کیوں کریں۔“
”دیر صرف صباحت کی شادی میں ہے۔ وہ بھی بابا جان کر رہے ہیں۔ آج اگر وہ اسے رخصت کرا لیں۔“
میں۔

”اس کی شادی سے ہمارا کیا تعلق؟“ مرنساء نے چڑ کر ان کی بات کاٹ دی۔
”تمہارا ہو یا نہ ہو میرا تعلق ہے۔ اور گو کہ وہ آغا سے چھوٹی ہے، لیکن خود بابا جان نے پہلے اس کی شادی کی
چھٹی تھی اور یہ طے ہے کہ جب تک اس کا معاملہ سلجھ نہیں جاتا میں اور کسی بچے کی شادی کا سوچوں؟
نہیں۔“ شاہ سکندر نے جتنی انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔
”اس کا معاملہ تو ساری زندگی نہیں سلجھے گا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔“ مرنساء
جل کر کہا تو وہ چیخ پڑے۔

”شٹ اپ مرنساء۔“

”نہیں خاموش ہو سکتی میں۔ آپ میری اولاد کا حق مار رہے ہیں۔ آپ کا بس چلے تو ساری زمین جائیداد ان ہی
دیکوں کے نام لکھ دیں اور لکھ بھی دیتے اگر میری جگہ کوئی عام سی عورت ہوتی۔ میں نے اپنا حق چھوڑا نہ اولاد کا
بڑوں کی اور بس اس لڑکی کا معاملہ سلجھنے نہ سلجھنے مجھے آغا کی شادی کرنی ہے۔“
شاہ سکندر بند منھ ہی ہونٹوں پر جمائے شعلہ بار نظروں سے اسے چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ خاموش
ہو تو بہت ضبط سے بولے تھے۔

”سنو مرنساء! میں اگر چاہوں تو ابھی بھی اپنا سب کچھ مدیحہ اور صباحت کے نام لکھ سکتا ہوں، کوئی نہیں روک
مجھے لیکن میری صرف وہی دوستیاں نہیں ہیں، تین بچے یہاں بھی ہیں اور میں سب کے لیے ایک جیسا سوچتا
ہوں۔“

”ایک جیسا سوچتے ہیں تو پھر آغا کی شادی پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟“
”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں تم چاہتی ہو، لیکن صباحت کی شادی کے بعد
اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ ایک دم بابا جان
بات کرنے پر آمادہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ور جب بابا جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ یہی سمجھے کہ اپنے اس روز کے رویے پر نادم
آئے ہیں۔ جب ہی چھوٹے ہی کہنے لگے۔

”تم کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہو سکندر! اور یہ جرات تم اس لیے کرتے ہو کہ جانے ہو، ہم اپنی اولادوں میں
سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں۔“

اے سکندر نے صرف اس لئے انہیں نہیں جھٹلایا کہ اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے تھے۔
کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو۔“ بابا جان نے ان کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا بابا جان۔“ وہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مجھے صباحت کے سلسلے میں یہ پوچھنا
راس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ کب تک وہاں کے گھر بیٹھی رہے گی؟“

تب تک اس کی ماں چاہے گی۔“ بابا جان نے فوراً کہا تو وہ زور دے کر بولے۔
”اس کی ماں کو چھوڑیں۔ میں اس کا باپ اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے آگے اور بھی اولاد ہے اور
باحث کے فرض سے سیکدوش ہو کر رہی اوروں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“

”تو اچھی بات ہے۔ جہاں تک مدیحہ کے ساتھ بیٹھ کر کوئی قریبی تاریخ طے کرلو۔“
بلے سارے معاملات میں نے اور جہاں تک بھائی نے طے نہیں کیے تھے۔“

”ی نے بھی کیے ہوں، تمہیں اب بیٹی رخصت کرنی ہے۔“
”لیکن اس طرح جس طرح آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آئیہ سے بیٹی چھینیں گے نہیں بلکہ اس کے
ر رخصت کرا کے لائیں گے۔“ شاہ سکندر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

”ایا ہم گئے نہیں تھے۔“ بابا جان کے اطمینان سے کہنے پر وہ بری طرح سلگ گئے۔
”بے گئے تھے۔“

”لندرا! کیا چاہتے ہو تم؟“
”اچھی طرح جانتے ہیں اور میں آپ کو فوراً اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ سارا کھیل آپ نے شروع کیا تھا
میری طرف سے پہل ہوئی تو میں خود اس سے بیٹیاں چھین لانا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو جو ہو گیا سو ہو گیا۔
نزدیک اب سب سے اہم صباحت کی رخصتی ہے اور وہ اسی وقت عمل میں آئے گی جب آپ خود جا کر آئیہ
نا کریں گے۔“ شاہ سکندر جتنی الامکان اپنے لہجے پر قابو پا کر بول رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز قدرے تیز

ہو گئی تھی۔

”جی ہاں!“ الماس فوراً ہی آگئی تھی۔
دینا میری الماری میں جتنا سامان ہے، سوٹ کیس میں پیک کر دو۔“ انہوں نے الماس سے بات کرتے ہوئے
مجھ نرم کر لیا تھا۔

”سارا سامان۔“ الماس کو حیرت اس بات پر تھی کہ سارا سامان ایک سوٹ کیس میں کیسے آئے گا اور وہ سمجھ کر
”سوٹ کیس لے لو، دو میں تو آجائے گا ناں۔“

”شاید۔“ الماس ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گئی تو انہوں نے قصداً ”مہرا النساء کو نظر انداز کر دیا اور اپنا بریف
ن اٹھا کر بیڈ پر رکھا پھر دروازہ کھول کر اس میں سے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں نکال کر بریف کیس میں رکھنے

”شاہ! آپ نے بابا جان سے کہہ دیا ہے کہ آپ یہاں سے جارہے ہیں۔“
”کیوں؟“ وہ سراوٹھائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ان سے کہنا ضروری ہے کیا یا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ
”روک لیں گے۔ نہیں مہرا النساء! روک تو وہ مجھے پہلے بھی نہیں سکے تھے۔“
”آپ گئے ہی ایسے تھے کہ۔۔۔“

”اب اس طرح رات کے اندھیرے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ فوراً بول پڑے۔
”جاؤ کرو سارے میں اعلان کہ میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جارہا ہوں۔ جاؤ مہرا النساء۔“
مہرا النساء ان کے غضب ناک ہونے پر خائف سی ہو کر کمرے سے نکل گئی۔
”ٹان سینس۔“ انہوں نے سر جھٹکاتے ہی الماس ڈرینگ سے نکل کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بابا؟“
”کچھ نہیں بیٹا! تم اپنا کام کرو۔ اور ہاں سنو، اسٹڈی میں رائننگ نیبل کی دراز میں جتنی دائریاں ہیں وہ سب
”ٹان سینس میں رکھ دو۔“

”آپ کہاں جارہے ہیں بابا! میرا مطلب ہے کیا بہت زیادہ دنوں کے لئے جارہے ہیں؟“ الماس نے قدرے الجھ
”پوچھا تو وہ یوں اسے دیکھتے گئے جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ کیا جواب دیں۔ پھر اسے قریب بلا کر پوچھنے لگے۔
”تم چلو گی میرے ساتھ!“
”کہاں؟“

”کراچی۔ میں نے مستقل وہیں سکونت کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”اسی جی جا رہی ہیں؟“
”میں نے تو ان سے طے کر لیا ہے آگے ان کی مرضی۔“ وہ کہہ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو الماس کچھ
”بوسنے کے بعد پوچھنے لگی۔“

”بابا! اگر امی نے انکار کر دیا تب بھی آپ جائیں گے؟“
”ہوں۔“ انہوں نے پہلے مصروف انداز میں جواب دیا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”بیٹا! جیسے تم میری بیٹی ہو اسی
”نہ صاحب اور مدد مجھ میں ہیں۔“

”تو آپ ان کے لئے جارہے ہیں۔“ ان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ الماس بول پڑی تھی۔
”ہاں! لیکن اس کا یہ مطلب ہمیں ہے کہ میں تم سے غافل ہو جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔“ وہ بریف کیس بند کر کے
”کھڑے ہوئے۔“ چلو بیٹا! جلدی سے پکینگ کر دو مجھے ابھی جانا ہے۔“

الماس بڑی بے دلی سے اٹھ کر دوبارہ ڈرینگ روم میں چلی گئی تو وہ بی بی جان سے ملنے کے ارادے سے نیچے آئے
”لڈو جی میں بی بی جان کے ساتھ بابا جان اور مہرا النساء کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کے خلاف کیا محاذ کھل چکا ہے
”وہ اس کے لئے تیار بھی تھے لیکن لڑنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔“

بابا جان ان کی آخری بات پر یوں بن گئے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

”یہ آسیہ کی ضد نہیں ہے بابا جان!“ وہ ان کے انجان بننے پر زچ ہو کر کہنے لگے۔ ”وہ دوسرے سے صحبت
یہاں بیٹھنا ہی نہیں چاہتیں۔ آپ جانتے ہیں وہ خلع کا دعویٰ دائر کر چکی تھیں۔ اگر میں درمیان میں نہ آتا تو وہ
تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر تباہ میں آپ کیا کرتے۔ اتنی پلاننگ کے بعد کیا حاصل ہوتا آپ کو۔ انا آپ کا وقت
مجرور ہوتا اور میں زیادہ عرصہ تک آسیہ کو مزید اقدام سے نہیں روک سکوں گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس
کے اگلے نوٹس سے پہلے ہی آپ صحبت کو رخصت کرالائیں۔“

”جب وہ ڈاکٹری اسے یہاں بیٹھنے کو تیار ہی نہیں ہے تو پھر تم کس حساب سے ہمیں اس کے پاس جانے
مجبور کر رہے ہو؟“ ان کی پوری بات سننے کے بعد بڑے سکون سے کہا تھا۔

”وہ آپ کی بات نہیں مانے گی۔ مجھے یقین ہے۔“ انہوں نے بڑی امید سے کہا۔
”یہ یقین ہمیں اس ڈاکٹری نے دیا ہے؟“ بابا جان کے مشکوک لہجے نے انہیں بری طرح ہرٹ کیا تھا
انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے مزید اگر بابا جان نے ایک لفظ بھی کہا تو وہ پھٹ پڑ
گئے۔ ”بس بابا جان!“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں نے جان لیا کہ آپ کسی قیمت پر صحبت کو رخصت کرانے نہ

جائیں گے۔“
ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جانے کیا تھا۔ بابا جان ایک لحظہ کو ٹھٹکے پھر فوراً بولے تھے۔

”ہم یہاں اس کا استقبال۔“
”نہیں۔“ انہوں نے بھی فوراً ٹوک دیا۔ ”صحبت یہاں نہیں آئے گی۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ بابا جان نے کوشش سے اپنے لہجے کو مضبوط بنایا تھا۔

”اس کی ماں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ٹھیک ہے۔ میں ناحق اسے روکتا رہا۔“ وہ بابا جان کی طرف دیکھے بغیر
اپنے آپ سے کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥
”مہرا النساء! میرا سارا سامان پیک کر دو۔“ شاہ سکندر نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مہرا النساء کو غما
کر کے کہا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

”سارا سامان کیوں؟“
”میں یہ جو ملی ملکہ شاہ پور چھوڑ رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے تم اور بچے بھی اگر میرے ساتھ چلو تو مجھے
ہوگی۔“ انہوں نے بہت سادہ لہجے میں کہہ کر سگریٹ کیس اٹھالیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر
میں دیا۔ پھر لاٹری تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ مہرا النساء نے کوئی جواب نہیں دیا۔
پلٹ کر دیکھا تو وہ پشیمانی پر بے شمار شکنیں ڈالے جانے لگا سوچ رہی تھی۔

”مہرا النساء! سنا نہیں تم نے، میں نے کیا کہا ہے۔“ انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا تو وہ چونچ
بولی۔ ”ہاں، جو ملی چھوڑ رہے ہیں، لیکن کیوں؟“

”میری مرضی۔ تم یہ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی کہ نہیں۔“ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔
”کیا ہو گیا ہے شاہ آپ کو۔ اگر بابا جان نے کچھ کہہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ جواب
دیں۔ ایسا کریں آپ دو چار دنوں کے لئے شہر چلے جائیں۔ واپس آئیں گے تو بابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا
نساء! انا انہیں سمجھانے کھڑی ہو گئی۔

”تو تم نہیں جاؤ گی۔“ وہ اس کے سمجھانے پر تپ کر بولے اور اونچی آواز میں الماس کو پکار لیا۔

وہ جب سے شاہ جہانگیر کو اپنے حق میں ہموار کر کے کراچی آیا تھا تب سے صباحت سے رابطہ کرنے کی کوشش رہا تھا۔ لیکن ادھر کا شاید فون خراب تھا جو مسلسل ٹیل جتنی تھی اور کوئی اٹھاتا نہیں تھا۔ وہ صبح شام اور آفس بھی جب اسے موقع ملتا اس کے نمبر ڈائل کرتا اور پھر باؤس ہو کر اپنی قسمت کو کوٹنے لگتا کیونکہ اب اسے بن ہو چلا تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ جب ہی ایک طرف کچھ حالات بہتر ہوتے ہیں تو سری طرف پہلے سے زیادہ خراب بہر حال اسے شاہ پور سے آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور شاہ جہانگیر نے اس سے رہ کیا تھا کہ وہ زمینوں کے کچھ کام نمٹا کر ہفتہ دس دن کے بعد اس کی ماں کو لے کر اس کے پاس آئیں گے۔ پھر باؤہ کے گے گاویا کریں گے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انہیں آسیہ کے پاس بھیجے گا اور یہ اس کی طرف سے فری کوشش ہوگی۔ آسیہ مان گئی تو ٹھیک دو سری صورت میں وہ خود صباحت کو طلاق دے کر یہ سارا قصہ ختم دے گا کیونکہ اس سے زیادہ وہ اپنی تدبیر برداشت نہیں کر سکتا تھا اور یہی بات وہ صباحت سے کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس نے بہت بے دلی سے ٹیلی فون سیٹ قریب کھینچ کر نمبر ڈائل کئے اور دو سری طرف کی ٹیل سننے۔ خلاف توقع دو سری ٹیل پر ہی ریسپونڈر اٹھنے کے ساتھ تیز آواز آئی تھی۔

”ہیلو!“
 ”کون مل رہی ہے؟“ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا تھا۔
 ”جی آپ کون؟“ مدیحہ کا وہی لٹھ مارنے والا انداز تھا۔ وہ گہری سانس کھینچنے کے بعد بولا۔
 ”صلی کیسے ہیں آپ؟“

”تم سناؤ، خیریت سے پہنچ گئیں اپنی بہن کے پاس۔“ وہ فوراً ہی صباحت کا ذکر لے آیا تو ادھر وہ بڑی زور سے ہنسی مچا۔
 ”سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو صبا کی خیریت مطلوب ہے تو جناب وہ بالکل ٹھیک ہے اور میں آپ کی خیریت بھی اس تک پہنچا دوں گی۔“
 ”نہیں۔ تم بس اتنی زحمت کرو کہ اسے بلا دو۔“ اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا۔
 ”کیوں گیوں بلا دوں؟“

”مدیحہ پلیز۔“ وہ اندر ہی اندر چیخ و تاب کھا رہا تھا لیکن اس کی عادت سے بھی واقف تھا اس لئے بہت لجاجت کا ظاہر کیا۔
 ”بس بس۔ زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً ٹوک کر وہیں سے صباحت کو پکار کر کہا۔
 ”صبا! تمہارا فون ہے۔“

وہ دو سری طرف کی تمام حرکات و سکنات بول محسوس کر رہا تھا گویا دیکھ رہا ہو۔
 ”ہیلو!“ چند لمحوں بعد صباحت کی آواز سن کر وہ مطمئن سا ہو کر بولا تھا۔
 ”صبا! میں ہوں علی۔“
 ”جی۔“ وہ غالباً ”گھبرا گئی تھی۔“
 ”سنو، مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟“ وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے بھی نظر انداز کر گیا۔

”مشکل ہے۔“ صباحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تو وہ بے لہجے میں چیخ پڑا۔
 ”ناممکن تو نہیں ہے نا۔“
 ”نہیں، ناممکن تو شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کے لہجے میں آزر دگی سمٹ آئی تھی جسے محسوس کر کے وہ نرم ہو گیا۔
 ”چلو جانے دو، میں تمہیں مجبور نہیں کرتا لیکن خدا کے لئے اب ڈرنا چھوڑ دو۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ میں

”مجھے اجازت دیجئے لی بی جان۔“
 لی بی جان کچھ گھبرا کر بابا جان کو دیکھنے لگیں تو وہ آگے آتے ہوئے بولے۔
 ”تو مہر النساء ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس ڈاکٹرنی کے لئے تم ہمیں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔“
 شاہ سکندر ان کے ڈاکٹرنی کہنے پر بری طرح تلملا گئے تھے۔

”بابا جان۔ اگر آپ ہرجیت کا ٹھیل ٹھیل رہے تھے تو ان لیں کہ آپ بارگئے کیونکہ اس عورت کو میری سے بے شک آپ نے نکال دیا لیکن اپنے ذہن سے کبھی نہیں نکال سکے۔ وہ ہمیشہ آپ کے لئے چیلنج بنی حالانکہ اس نے کبھی آپ کو چیلنج نہیں کیا۔ بہر حال آپ سن لیں کہ میں اس کے لئے جا رہا ہوں یا کسی اور لئے اپنے بال بچوں کو نہیں چھوڑ رہا۔ مہر النساء سے میں پہلے ہی ساتھ چلنے کو کہہ چکا ہوں۔ لیکن اسے جانے بات کا زعم ہے۔ شاید سمجھتی ہے کہ پہلے کی طرح۔“
 وہ گزشتہ بائیس دہرانہیں چاہتے تھے اس لئے سرجھٹک کر خاموش ہو گئے۔

بابا جان کو ان کی پہلی ہی بات نے گویا آسمان سے زمین پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد اتنی دیر انہیں اپنی حیات پر قابو پانے اور خود کو سہارا دینے میں لگی تھی۔ پھر بھی جب بولے تو آواز میں وہ دبہ تھا نہ کرج۔
 ”ہماری اولاد ہی ہمارے خلاف ہوئی سکندر! تو ہم کسی اور کو کیا کہیں۔ تم جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ! ایک بات یاد رکھنا کہ ہم کبھی جھک سکتے ہیں نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور ہر ناتواہماری لغت ہی میں نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم ہرجیت کا ٹھیل ٹھیل رہے تھے۔ ایسے ٹھیل ہم اپنے برابر والوں کے ساتھ ٹھیلے ہیں۔ ہمیں ہ تمہاری بیٹیوں کا خیال تھا اور ابھی بھی ہے۔“

”بہت شکریہ بابا جان! آپ جتنا ان کا خیال کر سکتے تھے کر لیا۔ اب وہ میری ذمے داریاں ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے لی بی جان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”چلو تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو ہوا۔“ بابا جان نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ بھی ان ہی انداز میں بولے۔

”دیر آید درست آید۔ اب یقیناً میں ان کے بارے میں بہتر فیصلے کر سکوں گا۔“
 ”یقیناً“ لیکن یہ کبھی مت بھولنا کہ ہم شاہ ہیں اور شاہوں کی بیٹیاں شاہوں میں ہی بیاہی جاتی ہیں۔ بابا نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ کچھ بھی کرو مدیحہ اور صباحت کو ہر حال میں یہیں آنا ہے اور وہ کہنے لگے۔

”یہ اصول آپ کے ہیں بابا جان! آپ کے۔ وہ جو شاہوں کے شاہ ہیں جنہیں کل عالم کے لئے رحمت بنا کر گیا انہوں نے انسانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے والے سارے نفرتے مٹا ڈالے تھے۔ ذات پات، نسب مہرور کالا، میاں تک کہ عربی کو بھی بر فضیلت نہیں ماسوائے تقویٰ کے اور مجھے افسوس ہے کہنا ڈر رہا۔ جان! کہ آپ اپنی نسبت تو ان ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جوڑ رہے ہیں لیکن ان کی تعلیم عمل نہیں کر رہے۔“

”جاؤ سکندر! ہمیں تم سے کوئی غرض ہے نہ تمہارے کسی معاملے سے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ بابا لا جواب ہو کر وہ بڑے تھے اور رکے بھی نہیں۔ فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔
 شاہ سکندر کچھ دیر ان کے پیچھے دیکھتے رہے۔ پھر دوبارہ لی بی جان کے پاس بیٹھے ہوئے مہر النساء کو مخاطب ہوئے تھے۔

”مہر النساء! دیکھو الماس نے میرا سامان پیک کر دیا۔ اس سے کمو جلدی کرے میں شام اترنے سے پہلے سے جانا چاہتا ہوں۔“

”شام تو ہو جائے گی شاہ! مجھے اپنا سامان اکٹھا کرتے کرتے۔“

بہت جلد اپنے امی ابا کو تمہارے گھر پہنچ رہا ہوں۔ انہیں وہاں سے باپوس نہیں لوٹنا چاہئے، سمجھیں تم۔“
”نہیں“ میرا مطلب ہے میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ رو بہا ہی ہو گئی تھی۔

”بس صبا! میں اب یہ نہیں سننا چاہتا کہ تم نے سارا اختیار اپنی ماما کو دے رکھا ہے اور وہ جو چاہیں فیصلہ کر رہے۔ ان کا فیصلہ اب بھی وہی ہو گا۔ وہ اور بابا جان ہمارے لئے نہیں سوچتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ پھر ان کے فیصلے پر سر جھکا کر کا مطلب ہے۔ سراسر اپنی ذات کے ساتھ ظلم ہے صبا! میری بات سمجھ رہی ہوں اور یہ بھی سن لو کہ یہ میری آخری کوشش ہے اگر میرے امی ابا تمہارے گھر سے باپوس لوئے تو پھر واقعی ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے اور اس کا زہم دار میں سب سے زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گا اور کبھی معاف بھی نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔“

اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی ریسیور رکھ دیا کیونکہ اس کا رونا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کمزور پڑنے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اس کی بڑبڑی پر کڑھتا رہا پھر اپنا دھیان بنانے کے لئے باہر نکلا تو رات کے تین سو گھنٹوں پر ہی گاڑی دوڑا تا رہا تھا۔ حقیقتاً ”وہ بے حد مضرب تھا اور بے حد باپوس۔ شاید اس مقام سے بھی آگے نکل آیا تھا جہاں انسان کے اندر کسی معجزے کے رونما ہونے کی ایک آخری امید زندہ رہتی ہے۔ اس کے اندر وہ بھی نہیں سمجھتا کہ وہ اتنا شاکہ ہو رہا تھا۔ اور جب گھر لوٹا تو مزید خاموشی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ شدت سے محسوس کرتا ہوا وہیں لاؤنج میں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔

صبح نہ تو معمول کے مطابق خود سے اس کی آنکھ کھلی اور نہ کرم دین کے اٹھانے پر اٹھا تھا۔ بس ذرا سی آنکھیں کھولیں اور اسے جانے کا اشارہ کر کے دوبارہ سو گیا تھا۔ اس کے بعد کرم دین نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب اسے اپنے سر پر شاہ جہانگیر کی آواز سنائی دی تو منہ میں ہونے کے باعث پہلے وہ یہی سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن دوسرے پل عارفہ بیگم اس کا بازو ہلا کر پکارنے لگیں۔

”علی علی! آخر تو ہے۔ ابھی تک سو رہے ہو اور یہاں۔“

وہ ہڑبکا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے کے بعد سلام کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”آپ کب آئے؟“

”ابھی آ رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”تمہیں کرم دین نے نہیں بتایا۔ رات میں نے فون کیا تھا۔“

”وہ۔۔۔ میں اصل میں دیر سے آیا تھا۔ آپ بیٹھیں امی میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ وہ ان کے مزید دیر سے آنے اور اتنی دیر تک سونے سے متعلق سوالوں سے بچنے کی خاطر منہ دھونے کے بہانے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور پہلے آفس فون کر کے اپنے آنے کا بتایا پھر وارڈروب سے کپڑے نکل کر واش روم کا رخ کیا۔

نہانے سے وہ کافی ہلکا پھلکا تو ہو گیا تھا لیکن باپوسی کا ابھی بھی وہی عالم تھا۔ شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کی آمد نے بھی کوئی امید نہیں جگائی تھی پھر بھی وہ آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی ملال نہ رہے۔
”ہاں تو کیا کہتے ہو تم۔ ہم آسیہ کے پاس جائیں۔“ وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو شاہ جہانگیر نے اصل بات چھیڑ دی۔
”جی۔۔۔!“

”جانے کو تو تم تیار ہیں لیکن بابا جان کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانتے ہو وہ۔۔۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ سکندر یہاں آنے کے بعد کیا کہتا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”تمہارے چاچا سکندر، وہ ادھر ہی آگئے ہیں ناں! اپنے بال بچوں کو لے کر۔ تمہیں پتا نہیں ہے؟“ عارفہ بیگم نے بتا کر اس کی لاعلمی پر تعجب کا اظہار کیا۔

”چچا جان فیملی کے ساتھ یہاں آگئے ہیں۔ کب؟“ اس کی حیرت میں الجھن بھی تھی اور سوچ بھی۔
”ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں آسیہ سے پہلے اس کے پاس جانا چاہئے کیونکہ یہی تو اس کی بھو

ہے۔ پھر اگر وہ کہے گا تو ہم ادھر بھی چلے جائیں گے۔“ شاہ جہانگیر اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ فوراً تائید کرے گا لیکن اس کا ذہن شاہ سکندر میں الجھ گیا تھا۔ اس لئے ان کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔

”آپ چھوڑیں نا سکندر کو۔ بس جہاں علی کہتا ہے وہیں چلتے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد کی خوشی دیکھنی ہے۔“ عارفہ بیگم اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھی تھیں۔

”اسی کی خوشی کی خاطر تو یہاں آیا ہوں۔ بتاؤ ناں علی۔ کیا کہتے ہو تم؟“ شاہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا تو وہ ذرا ہاجو کا چھوڑوؤں ہاتھوں سے سر تھا م لیا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بابا! جو آپ کا دل چاہے کریں۔“

”کیا۔۔۔ کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بابا جان نے کچھ کہا ہے تم سے یا سکندر نے مجھے بتا دیا کیا بات ہوئی ہے۔“

”میرے ساتھ کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ بتائیں بیچا جان فیملی کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں۔ میرے سامنے انہوں نے بابا جان سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”مجھے خود نہیں بتایا! میں زمینوں پر تھا واپس آیا تو معلوم ہوا سکندر حویلی چھوڑ گیا ہے اور میرا خیال ہے اسی کی شادی کے لئے چھوڑی ہوگی اس لئے میں کہہ رہا ہوں پتہ اس پتہ میں نہ ہو سکتا ہے اس کی آسیہ کے ساتھ اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہو۔“

شاہ جہانگیر نے اس کے اٹھنے پر دھیرج سے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

لا۔

”ہوں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ چچا جان کے پاس جائیں۔“

”ہم جائیں! تم نہیں چلو گے؟“ شاہ جہانگیر نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔

”نہیں۔ میں کیوں جاؤں! اپنا رشتہ لے کر کیا میں گیا تھا؟“ اس نے روٹھے لہجے میں کہا تو عارفہ بیگم فوراً اس کی نیکرتی ہوئی بولیں۔

”ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ یہ کیوں جائے گا۔ اسے تو بس اب سرابا ندھ کر ہی لے جائیں گے۔“

”انشاء اللہ! اچھا بیٹا پھر ہم چلتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔

”اس وقت کہاں جائیں گے کھانے کے بعد۔۔۔“

”کھانا ہم سکندر کے ساتھ کھائیں گے۔ چلو عارفہ! اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔“



شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو دیکھ کر شاہ سکندر کا منسلکنا فطری بات تھی اور انہیں پہلا خیال ہی آیا تھا کہ بابا نے ایک بار پھر ان کے خلاف سازش کر کے انہیں بھیجا ہے۔ اس لئے انہوں نے موتا ”بھی ان کی آمد پر دشمنی کا اظہار نہیں کیا اس کے برعکس خاصا لیا دیا انداز تھا۔

”کیسے آئے آپ لوگ؟“

”برا! کا ہمارا آنا؟“ شاہ جہانگیر فوراً ہی ان کی بے اعتنائی محسوس کر گئے تھے۔

شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ بیکانے پن کا بھی مظاہرہ کر گئے تو شاہ جہانگیر نے آگے بڑھ کر انہیں اندھوں سے تھا م لیا۔

”میں جانتا ہوں سکندر! تم کیا سوچ رہے ہو۔ بخدا! مجھے بابا جان نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں تمہارے پاس۔ اسے بیٹے کی خوشیاں مانگنے اور میں تو بہت پہلے تم سے مانگنا چاہتا تھا لیکن تمہارا اصرار تھا کہ بابا جان آسیہ لپکاس جائیں۔ مجھے تو کسی نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ بابا جان نے نہ تم نے۔ حالانکہ علی کا پاپ میں ہوں۔ بہر حال ناماری باتوں سے قطع نظر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنی چاہئیں۔ آخر ان کا کیا تصور ہے؟“

شاہ سکندر آہستہ سے اپنے کندھوں سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولے۔
 ”میری تو میں پوچھتا رہا کہ میری بیٹی کا کیا قصور ہے۔ اس کے لئے بابا جان اس طرح کیوں نہیں سوچتے جیسے دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہیں۔“

”دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہوئے بھی وہ ان کی خوشی کا خیال کب کرتے ہیں۔ وہ تو زبردستی اپنے فیصلے مسلط کرنے کے عادی ہیں اور جو ذرا سا ان کے فیصلے سے اختلاف کرتا ہے اسے وہ اپنی ضد بنالیتے ہیں لیکن خدا کے لئے سکندر تم اس بات کو ضد مت بناؤ کہ بابا جان ہی صاحت کو رخصت کرانے جاتیں گے۔“

”نہیں، میرا بابا جان سے کوئی تعلق نہیں اور جہاں تک صاحت کی رخصتی کا سوال ہے تو اس کا فیصلہ اس کی ماں کرے گی اور مجھے نہیں معلوم اس کی ماں نے کیا سوچا ہے؟“ شاہ سکندر صاف دامن بچا گئے۔
 ”ہم اسی لئے تمہارے پاس آئے ہیں کہ تمہاری اجازت سے ہم آسہ کے پاس جانا چاہتے ہیں۔“ شاہ جاناگیر

ان کے پہلو تکی کرنے پر اندر ہی اندر جڑبڑہو کر بولے تھے۔
 ”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جب آپ کا دل چاہے جائیں۔
 پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر معذرت کر کے اپنے کسی کام سے چلے گئے تھے۔

عارف بیگم، مہر النساء کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں تو شاہ جاناگیر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ انہیں شاہ سکندر کے روتے ہوئے نے خاصا مایوس کیا تھا اگر علی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بیسوں سے واپس شاہ پور لوٹ جاتے لیکن انہیں علی کی بات یاد بھی جو اس نے کہا تھا۔ ”میری زندگی کی دورا سی رشتے سے بندھی ہے۔“ جسے مضبوط کر کے لئے وہ اب اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے رویے سے دلبرداشتہ ہونے کے باوجود وہ

ٹھیک چار بجے عارف بیگم کے ساتھ آسہ کے دروازے پر موجود تھے۔
 تیل کے جواب میں گیٹ ٹویس نے کھولا تھا اور وہ عارف بیگم کو پہچانتی تھی اس کے باوجود فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا بلکہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

”ڈاکٹر صاحبہ ہیں یا ان کے والد صاحبہ ہمیں ان سے ملنا ہے۔“ شاہ جاناگیر نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا تو وہ گیٹ اسی طرح کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔
 عارف بیگم یوں شاہ جاناگیر کو دیکھنے لگیں جیسے بری بے عرق ہو گئی۔

”اولاد کی خاطر عارف بیگم! بہت کچھ سہنا رہا ہے اور پھر شروعات تو ہماری طرف سے ہوئی تھیں۔ اب جو کہیں چپ چاپ سہنا ہے۔“ شاہ جاناگیر ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر آواز دبا کر بول رہے تھے تب ہی اباجی نے آکر پورا گیٹ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔“ شاہ جاناگیر بس ایک نظر اس بوڑھے شخص کو دیکھ سکے پھر سر جھک گیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام۔ آئے۔“ اباجی اگر خندہ پیشانی سے نہیں ملے تو پیشانی پر برہا پے کی عطا کردہ شکنوں میں کو

ناگوار شکن کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔
 ”شکریہ!“ شاہ جاناگیر نے عارف بیگم کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور ان کے پیچھے اباجی کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو انہیں اچانک وقت بہت پیچھے لے گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر سب لوگوں کے چہرے کھل گئے تھے اور وہ سب کے درمیان راجہ اندر رہنے سب کو حیران کر رہے تھے۔ اب خود حیران تھے کہ زندگی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔

”آپ بیٹھیں میں آسہ کو بلاتا ہوں۔“ اباجی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو عارف بیگم ان کا ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئیں۔
 ”شاہ جی! آپ کو کیا ہوا؟“

”ہیں۔“ وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

بھج جا میں۔ وہ آسہ کو بلانے گئے ہیں۔“
 ”انہوں نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر بیٹھنے کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں برسوں پہلے تھے لیکن کتنا فرق تھا اب اور اب میں۔ جو گردن غور سے تھی تھی اسے وقت نے جرم کا احساس دے کر غا۔

نا در ہو گئی۔ اباجی آئے نہ آسہ نہ کسی اور نے جہانک کر دیکھا تھا۔
 فہ بیگم پہلو پر پہلو بدلنے لگی تھیں۔ کسی وقت بڑھانے بھی لگتیں۔ لیکن شاہ جاناگیر ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ وہ مسلسل اپنا محاسبہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

چا آدھے گھنٹے بعد اباجی آسہ کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت مجبور کرنے پر آئی ہے۔
 جہانگیر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عارف بیگم بھی اٹھنے لگی تھیں کہ آسہ نے ہاتھ اٹھا کر

ایا۔
 لہذا تشریف رکھیں۔“
 جہانگیر بیٹھ گئے تو پوچھنے لگی۔
 یہ زحمت کی آپ نے؟“

اری آمد کا مقصد آپ جانتی ہیں۔“ شاہ جاناگیر کو حقیقتاً ”بولنے میں دقت ہوئی تھی۔
 ما نہیں میں بالکل نہیں جانتی۔“ وہ رکھائی سے بولی تو اباجی فوراً ”کنے لگے۔

ن جانتا ہوں۔ آپ یقیناً ”صاحت کے لئے آئے ہیں۔“
 ما ہی صاحت بیٹی کے لئے نہیں آتا تو بہت پہلے چاہئے تھا لیکن۔“ شاہ جاناگیر کوئی بات نہیں بناسکے تھے۔
 مان کیوں نہیں کہتے کہ اپنی ساری چالوں میں ناکام ہونے کے بعد۔“ وہ زہر خند سے بول رہی تھی کہ اباجی

جایا۔
 سہ! تمہیں گھر آئے ممانوں کا خیال کرنا چاہئے۔“ پھر ان دونوں کو دیکھ کر بولے تھے۔ ”آپ اس کی باتوں کا سامانے گا۔“

فی نہیں! نہیں حق ہے۔ چاہیں تو ہمیں گھر سے ہی نکال دیں۔ لیکن اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“
 یہ نے ہونٹ پیچھے لئے کیونکہ اباجی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

س سے پہلے جو کچھ ہوا اس کے لئے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ شاہ جاناگیر نے اپنا رخ اباجی کی طرف ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو آسہ ہونہ گئے انداز میں سر جھکتی ہوئی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔
 ما کے پیچھے پردہ ہل رہا تھا۔ باقی سب ساکت ہو گئے تھے۔

میں اجازت۔“ لکھی دیر بعد شاہ جاناگیر غالباً ”کنا کچھ اور چاہتے تھے اور کچھ گئے تو بول کھلا کرو صاحت لگے۔“ م بھی ڈاکٹر صاحبہ کاموڈ ٹھیک نہیں ہے، ہم پھر آجائیں گے۔“

ل! لیکن چائے۔ چائے آ رہی ہے۔“ اباجی کو فوراً ہی بات سمجھ میں آئی اور وہاں سے اٹھنے کا سامانہ بھی مل گیا

ب کیا کر س شاہ جی! ڈاکٹر کی تو بات سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔“ اباجی کے کمرے سے نکلتے ہی عارف بیگم سے بولیں۔
 پر کرو۔ اس کے اباجی سے بات کرتا ہوں، وہ اسے سمجھالیں گے۔“ شاہ جاناگیر خود بھی فکر مند تھے لیکن بیگم نہیں کر رہے تھے۔

سیر جے پیر کی ملی کی طرح سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ جاناگیر اور عارف دھکے دے کر نکال باہر کرے۔

”ماہی نے انہیں اندر رکوں آنے دیا۔ کیا وہ بھول گئے کہ مجھے تباہ کرنے والا یہی شخص ہے۔ وہ بھول سکتے ہیں لیکن میں نہیں بھول سکتی۔ کیسے بھول جاؤں اتنے برسوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں جب میرے دل کی ہنسی اپنے اجزے کا ماتم نہ کیا ہو۔“

خس نے دیکھا وہ ابو جو قطرہ قطرہ میرے دل سے ٹپکتا رہا۔
کس نے دیکھے وہ آنسو جو شب تنہائی میں میری آنکھوں سے تکتے میں جذب ہوتے رہے۔

کسی نے نہیں دیکھے جب ہی میری بیٹی کو اسی راتے پردہ خیلنا چاہتے ہیں۔
وہ سیکلے ذہن کے ساتھ جانے کیا کچھ سوچتی ہوئی ریٹنگ کے قریب رگ کر نیچے دیکھنے لگی۔ شاہ جہانگیر کی گارڈ موجود تھی جس سے وہ مزید سلگ کر واپس پلٹی اور مدد کو نیچے بھیجنے کے خیال سے اس کے کمرے تک آکر۔
پکارنا چاہتی تھی کہ اندر سے آتی اس کی تیز آواز سن کر رگ گئی۔ وہ صبا صحت پر ناراض ہو رہی تھی۔

”تم انتہائی احمق پائل ہو“ اپنے آپ میں گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے ماما کہہ دو کہ تم علی کو پسند کرتی ہو یا؟
میں کہہ دوں گی۔“

”نہیں بدحو! تمہیں میری قسم۔ تم ماما سے کچھ مت کہنا۔“ صبا صحت کی منت بھری آواز آئی تھی۔

”کیوں؟ کیوں اتنا ڈرتی ہو۔ ماما تمہیں جان سے تو نہیں مار دیں گی۔“
”میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ مجھے بس ماما کو دکھ نہیں دینا۔“ گرنے دو انہیں جو فیصلہ کرتی ہیں۔ میں بھول جاؤ گی علی جہانگیر کو۔ میرا یقین کرو میں نے اپنے دل کی بستی میں اس کے نام کے جتنے بھول کھلائے تھے سب ہاتھوں سے نوح ڈالوں گی۔ پھر تم دیکھنا میں کبھی نہیں روؤں گی۔“ آنسوؤں کے درمیان صبا صحت رگ رگ کر رہی تھی۔

”نہیں۔“ آسیہ نے دروازہ دھکیلنے کے لئے جو ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا وہ بے اختیار اپنے سینے پر رکھ لیا تھا
آہستہ آہستہ نفی میں سر ملاتے ہوئے وہ بہت دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس دروازہ بند کر لیا اور بستری بڑھے گئی۔ اس کی سانسیں تیز تیز جلنے لگی تھیں جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی عجیب سے بے بسی طاری ہو رہی تھی اس پر۔ آنکھیں الگ جلنے لگی تھیں۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے دونوں آنکھوں پر رکھے تو ذہن کے درپچوں پر اس کے اپنے الفاظ دستک دینے لگے تھے۔

”میرا دل پھولوں کی بستی ہے اسے اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے میری زندگی سے پیار نہ؟“
اس نے شاہ سکندر سے کہا تھا۔

اور اسے لگا جیسے اس کی جگہ صبا صحت آن کھڑی ہوئی ہو۔
”نہیں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ ”نہی کی بستی اجڑ جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ ایک درد مسلسل جو دیتا ہے نہ مرنے۔ ایسی کڑی سزائیں اپنی بیٹی کو نہیں دوں گی۔“

”صبا!“ اس نے یوں پکارا جیسے وہ سامنے کھڑی ہو۔ پھر کمرے سے نکلی تو سیلے ریٹنگ کے پاس جا کر نیچے جھانک دیکھا۔ شاہ جہانگیر کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ ایک لحظہ کو اسے لگا جیسے وہ گھٹی لیکن فوراً ہی اس نے اس خیا جھٹک دیا۔ پھر کلینک جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو قصداً ”انجیان بن کر اور بہت سرسری انداز میں اما سے پوچھنے لگی۔“

”طے گئے ممان؟“

”ہاں۔“ اماں جی نے ناراض لہجے میں مختصر سا جواب دیا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر ان کے پاس ہوئے عاجزی سے ہوئی۔

”اماں جی! میں کیا کروں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ کم از کم آپ کو تو میری کیفیت چاہئے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ عقب سے میمونہ بھا بھی نے کہا تو اس نے پہلے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اٹھتے ہوئے
”اماں جی کو بھی سمجھائیں۔“

”ان کو میں سمجھا لوں گی، پہلے تم سمجھ لو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرتا۔“
”آئندہ۔“ اس کی سوالیہ نظروں میں بے تابی تھی۔

”ہاں آئندہ۔ وہ پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔“ میمونہ بھا بھی نے کہا تو اس نے بمشکل خود کو ”کب؟“ کہنے سے روکا
ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”جھا! ابھی تو مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔ واپس آکر آپ سے بات کروں گی تب تک آپ اماں جی کو عادی تھے کہ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔“

”ارے تم سے کون ناراض ہوتا ہے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پتا نہیں کون سے جہاں میں رہتی
”میمونہ بھا بھی کو اس سے یہی شکوہ تھا جس پر وہ ہمیشہ کی طرح ہنستی ہوئی باہر نکل آئی۔

لو کہ اس وقت اس کا کلینک آنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے چند
بعضوں کو انڈین کر کے باقی کو ڈاکٹر صائمہ کے پاس بھیج دیا اور سسر کو دروازہ بند کر کے جانے کا کہہ کر ٹیلی فون سیٹ
پہنچ لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”میری نیکل کے بعد ان کی آواز آئی تھی۔“
”ہیں! شاہ سکندر حیات!“

”السلام علیکم!“ اس نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ ماں اسے حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ہمارا بھی
ت گئی ہے۔

”علیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر کو جیسے خوشگوار احساس ملا تھا۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو یہاں میرے کلینک
آئیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔

”ظاہر ہے، ضروری بات ہی کرنی ہوگی لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کلینک ہی میں بیٹھ کر بات کریں۔“ شاہ
مدر نے قدرے جتا کر کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

”نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔“
”تھنک یو۔“ ٹھیک چندر منٹ بعد میں آپ کو وہاں سے پک کروں گا“ اوکے۔“

”اوکے“ اس نے ریمیورر کے گھر ڈی دیکھی اور پھر پونہ بیٹھنے کے بجائے راؤنڈ پر نکل گئی۔ بندرہ منٹ میں وہ
نہ جزل وارڈی کا راؤنڈ لگا سکی تھی۔ وہ بھی بڑی جلت میں۔ پھر سسر سے کہہ کر وہیں سے باہر نکل آئی۔

شاہ سکندر گاڑی سے اتر رہے تھے اسے دیکھا تو وہیں رگ گئے اور دروازہ اس کے لیے کھلا پھوڑ دیا۔
جس اعتماد سے چل رہی تھی اسی اعتماد سے ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور چندر منٹ بعد ایک فائیو اشار میں
با آئے سائے تھے۔

”مجھے صبا صحت کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے بیٹھے ہی کہا تھا۔
”ہوں! کیا بات؟“ شاہ سکندر نے گار سا گانے کے بعد پوچھا تھا۔

”وہی اس کی شادی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آج آپ کے بھائی شاہ جہانگیر حیات اپنی بیگم کے
ڈائے تھے۔“

”آپ نے کیا کہا ان سے؟“ آسیہ نے بات ختم نہیں کی تھی کہ وہ بول پڑے۔
”میری ان سے بات نہیں ہوئی۔ میں اصل میں پہلے خود کسی نیچے پر پچھتا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ان سے

ابجی! ”وہ چونک کر کی اور برآمدے میں سب کو بیٹھ دیکھ کر اپنی بے دھیانی پر تادم سی ہو کر اس طرف آتی ہوئی سلام علیکم!“
 سلام علیکم! کیا بہت تھک گئی ہو یا بھوک زیادہ لگ رہی ہے؟“ میمونہ بھابی نے سلام کا جواب دینے کے پوچھا۔

ہاں پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔“ اس کے جواب دینے سے پہلے اباجی نے کہا تو وہ ان کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھے بولے۔
 کھانا میں کھا چکی ہوں۔“

کہاں باسپٹل میں؟“
 قصداً ”ان سنی کر کے بات بدل گئی۔
 لگتا ہے یہاں کوئی اہم مسئلہ زیر بحث تھا۔“
 ہاں، ہم صیاحت کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں تو شاید احساس نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے پاس ت سے کہے کہ تم اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچ سکو۔“ اباجی نے بہت شرے ہوئے لہجے میں اسے سخت ست شروع کیا تھا۔

تمہیں صرف بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کا شوق تھا۔ ان کی تعلیم اور تربیت پر تم نے کوئی توجہ نہیں دی نہ تمہیں لکھ پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ آخر کیا سوچا ہے تم نے ان کے بارے میں اگر ان کی شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کم تنی تعلیم تو لاؤ کہ وہ تمہاری طرح۔“

نہیں اباجی! میری طرح نہیں۔“ وہ جو سر جھکائے سن رہی تھی ایک دم بول پڑی۔“ وہ دونوں میری طرح ہو میں سکتیں کیونکہ ان کے اندر شروع سے میری جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ پڑھائی میں دونوں بس نارمل مزید کتنا بھی پڑھاؤں ڈاکٹر بن سکتی ہیں نہ لیکچرار پھر بہتری ہے کہ ان کی شادی ہو جائے۔“

ہاں یہی میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔“ اباجی فوراً بول پڑے تھے۔ ”میں نے شاہ جہانگیر کو جمعہ کے دن بلایا اس دن ہم شادی کی تاریخ رکھ دیں گے، تمہیں اگر اعتراض ہو تو ابھی بتاؤ۔“
 نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہا تو سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ غالباً ”کسی کو بھی کے اتنی جلدی مان جانے کی امید نہیں تھی۔

بیجیے اباجی! اسے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں۔“ غلیل بھائی نے اباجی کو مخاطب بہ قدرے سٹھانے۔

نہیں پریشانی تو کوئی نہیں۔“
 اس کو کوئی قریبی تاریخ طے کر لیجیے کیونکہ تیاری تو ہوگی کیوں آسیہ؟“ غلیل بھائی نے اس سے پوچھا۔
 جی تیاری تو ہے۔“

کی خوشی میں میں چاہے لاتی ہوں۔“ میمونہ بھابی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔
 پیرے لیے نہیں لایئے گا بھابی! اوپر بچوں نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہوگا۔“
 نے تو کھایا ہے نا؟“
 جی میں تو کھا چکی ہوں۔“

اس تو بیٹھو آرام سے۔ میں ٹوبہ سے کھلاؤ دیتی ہوں کہ وہ کھانا کھالیں۔“ میمونہ بھابی کہتے ہوئے اندر چلی۔
 فہر بعد اس نے جس تیزی سے ٹوبہ کو بیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا اس سے سمجھ گئی کہ میمونہ بھابی نے نے کھانا لانے کے ساتھ صیاحت کو نئے موسموں کا سندیہ بھی بھیج دیا ہے۔

بات کروں گی۔ شاید آپ کو یاد ہو ایک بار آپ نے کہا تھا کہ میں صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہوں اس سے مجھے صیاحت کی بہتری نظر نہیں آتی۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کریں گے یا ان سب باتوں کو چھوڑ دیں۔ مجھے صرف آپ کی نمانت چاہئے۔“
 اس نے بات مختصر کرنے کی خاطر آخر میں ایک ہلکہ کہا تھا اور فوری طور پر خود اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ ان پر بھرا اعتماد کا مظاہرہ کر گئی ہے۔

”صرف میری!“ شاہ سکندر گویا پھر سے زندہ ہو گئے تھے جو تھوڑی توجہ سگارنے سمجھنے کی تھی انہوں نے وہ بھی اس کی طرف مبذول کرنے کی خاطر سگارائش ٹرے میں ڈال دیا پھر راہ راست اسے دیکھ کر کہنے لگے۔
 ”یہ سچ ہے کہ میرے پیش نظر صیاحت کی بہتری تھی اور ہے کیونکہ مجھے علی جہانگیر پر اور اس کی محبت پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں۔ وہ کبھی اپنی محبت کے ساتھ فریب نہیں کرے گا اور میں اس بات کا بھی آپ کو یقین دلانا ہوں کہ شاہ پور کا کوئی شخص علی اور صیاحت کی زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا، نہ کوئی سازش ہو سکتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ صیاحت میری بیٹی ہے اس لئے کہ وہ علی کی بیوی ہوگی۔ آپ اپنے دل سے تمام خدشات نکال دیں۔ آپ کی بی بی انشاء اللہ بہت خوش رہے گی اور جب تک آپ نہیں چاہیں گی علی اسے شاہ پور نہیں لے جائے گا۔ یہ ساری باتیں میں خود علی سے طے کروں گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی کوئی شرط ہو تو وہ بھی کہہ دیں۔“

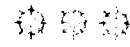
”نہیں، کوئی شرط نہیں۔“ وہ جوان کی باتوں کے دوران کچھ گم صم سی ہو گئی تھی اسی انداز میں بولی تھی۔
 ”پھر بھی آپ سوچ لیجیں اور جب تک آپ کا دل اس رشتے پر مکمل طور پر مطمئن نہ ہو جائے شادی کی ہائی نہ بھرس۔“ شاہ سکندر ہر طرح سے اسے اہمیت دے رہے تھے۔

اسے لگا جیسے ساری دنیا کا اختیار اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو اور اس انہوں نے اور انوکھے سے خیال سے اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

شاہ سکندر کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی لیکن وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکے۔
 ”چلیں!“ کچھ دیر بعد وہ اپنے خیال سے نکل کر انہیں دیکھنے لگی۔
 ”نہیں، آئی میں کھانا اس کے بعد کافی اور اس دوران ہم انجھے دوستوں کی طرح بہت ساری باتیں کریں گے۔
 بے مقصد باتیں۔“ انہوں نے کہا تو وہ قدرے حیران ہو کر بولی۔

”بے مقصد!“
 ”ہاں، کبھی کبھی بے مقصد گفتگو بھی کر لینی چاہئے۔ ذہن فریش ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی گفتگو میں مسائل کا ذکر نہیں ہوتا۔“ انہوں نے ویدر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”گویا فرامس!“
 ”رائے۔“ ان کے ہنر انداز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”ویسے ہم موسموں کی رنگوں اور خوشبوؤں کی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ ابتدا آپ کریں گی یا میں۔“
 ”آپ۔“ وہ بالکل غیر راوی طور پر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔



تمام راستہ آسیہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی تھی اور یہ سارا اکمال اس بے مقصد گفتگو کا تھا۔
 ”واقعی! کبھی کبھی بے مقصد گفتگو بھی کر لینی چاہئے۔“ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچا اور کچھ گن سی زینے کی طرف جاری تھی کہ میمونہ بھابی نے پکار لیا۔
 ”آسیہ!“

”نبیل نے انہیں ٹوک کر کہا۔
 ”نسا کو میں بلاتی ہوں“ آپ چلیں۔“ مدحیہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔
 بابت الماری کے اندر سرگھسائے جانے کیا کر رہی تھی۔
 ”نہیں نہیں ملے گا۔“ مدحیہ نے اس کے قریب آکر زور سے کہا تو وہ اچھل پڑی۔
 ”کیا؟“
 ”علی۔“

”افسوس! تم بہت بد تمیز ہو۔“
 وہ تو میں ہوں اور خالی پیٹ میں اور بھی بہت کچھ ہو جاتی ہوں۔“ مدحیہ نے بڑے آرام سے اعتراف کے
 بھوک کا احساس دلایا۔
 ”تو جاؤ کھانا کھاؤ۔“

”کھانے ہی کے لیے بلائے آئی ہوں تمہیں چلو۔“
 ”جیہ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کی ایک ٹمبل سنی۔ کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔
 ”کھانے کے دوران نبیل یوں بے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور انہوں نے مدحیہ اور ثوبیہ کو بھی اشارا
 اٹھا لیکن وہ کہاں باز آنے والی تھیں۔ مسلسل اسے چھیڑتی رہیں جس سے وہ کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی کہ
 لو آتے دیکھ کر نبیل کے نیچے مدحیہ کو پیر مارتے ہوئے بولی۔

”مما آ رہی ہیں۔“
 ”مما! آپ نے بہت اچھا کیا۔“ مدحیہ نے بے اختیار ہو کر نعرہ لگایا پھر ایک دم سٹپا بھی گئی کیونکہ آسیہ تینہ ہی
 اسے دیکھنے لگی تھی۔

”آئیے پھوپھو!“
 بس بیٹا! تم لوگ آرام سے کھاؤ میں ذرا چینیج کر لوں۔“ آسیہ ایک نظر صباحت پر ڈال کر وہیں سے واپس پلٹ
 ”نبیل مدحیہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”تمہیں کیا ہوا تھا؟“

”جھوٹیں نبیل بھائی! ممما بھی بس ایسی ہی ہیں انضمام الحق جیسی۔“
 ”جیہ نے برا سامنہ بنا کر کہا تو وہ تینوں بے ساختہ ہنسنے کے ساتھ بولے تھے۔
 ”لیا مطلب ہے تمہارا۔“

”انضمام الحق جیہ کا لگائے یا بولڈ ہو جائے اس کی شکل پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔“ مدحیہ ہنوز اسی انداز میں کہہ کر
 کھڑی ہوئی تو ثوبیہ بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔

”جی نہیں پھوپھو کا چہرہ پیٹ نہیں ہے۔ پھر ان کی آنکھیں بھی بولتی ہیں۔ بے نا نبیل بھائی۔“
 ”نبیل نے اس بات میں سہلائے براکتفا کیا پھر مدحیہ کو جاتے دیکھ کر فوراً ”پکار کر بولے۔
 ”مدحو! تم نے کھانے کے بعد چائے پلانے کا کہا تھا۔“

”نبیل لاتی ہوں چائے۔ ثوبیہ! ہم جانا نہیں۔“ صباحت کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔
 ”نہ میں آکر اس نے جو لمے پر چائے کا پانی رکھا پھر انستول کھینچ کر بیٹھی تو اس کا دل چاہا اب کوئی اس کے پاس نہ
 نا اور نہ اسے بلائے۔ اس کے گرد جو ایک خوب صورت ساحصار کھینچ گیا تھا وہ اس سے نکلتا نہیں چاہتی تھی،
 ہنسنے لگیں بعد ہی مدحیہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔ وہ پتا نہیں کس سے کیا کہہ رہی تھی اور شاید اسی
 سے آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹا میں چائے دم کرنے لگی تب ہی مدحیہ کچن میں آکر بولی۔

”اگرے چائے تمہارا ہی ہو؟“

”مدحیہ نبیل پر کھانا لگا کر دوبارہ آنگن میں نبیل اور صباحت کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میز چیلوں پر قدموں کی آ
 سن کر نبیل کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے پھوپھو آ رہی ہیں۔“
 ”دھنیک گاؤ، چلیں اب آپ دونوں بھی انھیں مجھے بہت بھوک۔“ ثوبیہ کو دیکھ کر مدحیہ نے بات دہرائی پھوپھو
 برا سامنہ بنایا تھا۔

”او ٹوبیہ! کیا خبر لائی ہو؟“ نبیل نے اس کے بھاگ کر آنے پر یونی کہہ دیا تھا جس پر وہ حیران ہو کر بولی۔
 ”آپ کو کیسے پتا کہ میں کوئی خبر لائی ہوں؟“
 ”اس کا مطلب ہے واقعی کوئی خبر ہے۔“ نبیل نے داد طلب نظروں سے صباحت کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہ
 تھی۔ البتہ مدحیہ نے ان کی بات میں غلڑا لگایا تھا۔

”وہ بھی اچھی۔“
 ”ہاں اچھی بہت دنوں سے کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ جلدی بتاؤ ثوبیہ کیا بات ہے۔“ نبیل نے مدحیہ کی
 کرتے ہوئے کہا تو ثوبیہ نے باری باری تینوں کو دیکھا پھر بڑے آرام سے بولی تھی۔

”وہ پھوپھو کہہ رہی ہیں۔ آپ تینوں کھانا کھالیں۔“
 ”اور ماما خود کہاں ہیں؟“

”نیچے سب کے ساتھ بیٹھی ہیں اور وہ کھانا کھا کر آئی ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ تم لوگ ان کا
 نہیں کرو۔“ ثوبیہ نے مدحیہ کو جواب دے کر نبیل کو یوں دیکھا جیسے یہ بھی اچھی خبر۔
 ”یہاں آؤ۔“ نبیل نے تحام سے اسے اپنے پاس بلایا تو اس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔

”کیوں نبیل بھائی؟“
 ”میں کہہ رہا ہوں یہاں آؤ۔“

”میں بیس سے بتا دیتی ہوں۔ پھوپھو صبا کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔“
 ثوبیہ نے نبیل کے غصے سے ڈر کر جس تیزی سے کہا اسی طرح صباحت نے جھکا ہوا سراونچا کیا تھا جبکہ نبیل
 مدحیہ خوشگوار حیرت میں گھر گئے تھے اور اسی انداز میں دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر صباحت کو دیکھا تو
 کراٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ روک صبا!“ مدحیہ اپنی جگہ سے اچھل کر اس سے لپٹ گئی اور اس کے کان میں دھیرے سے
 کی۔ ”مبارک ہو۔“

”صباحت کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ اتر آئے تھے۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب ہو گئی تھیں۔
 ”یہ بے ایمانی ہے نبیل بھائی! ان سے بھی تو پوچھیں کہ یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی ہیں۔“ ثوبیہ نے نبیل
 دونوں کی طرف متوجہ کر کے احتجاج کیا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے صباحت خود کو چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

”ہاں کیا کہہ رہی ہو تم؟“ مدحیہ نے ثوبیہ کی طرف گھوم کر پوچھا تو وہ روٹھے لمبے میں بولی۔
 ”کچھ نہیں۔“

”اگرے تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں بہت اچھی چا-
 گی۔“ مدحیہ نے اسے مناتے ہوئے کہا۔
 ”تم چائے پلاؤ گی؟“ ثوبیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلایں تو وہ جین پڑی۔
 ”کیوں کیا پہلے کبھی نہیں پلائی۔“
 ”ہاں میں یہ تم دونوں کس خوشی میں لڑنے لگیں۔ چلو مدحو! تمہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اسے؟“

”اچھا سنو ابھی میں مہما سے تمہاری شادی کا پوچھ کر آرہی ہوں، ان کا ارادہ ایک مہینے میں تمہیں رخصت دینے کا ہے اور میں نے سوچا ہے اب جتنے دن تم یہاں ہو میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ البتہ شادی بعد جب تم علی کے ساتھ آؤ گی تب میں سارے کام تم سے کراؤں گی چاہے علی کو برا لگے یا بھلا۔ ویسے تمہارا خیال ہے اسے برا لگے گا۔“ مدحیہ نظارہ بڑی بنیدگی سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اس کی شرارت سمجھ رہی تھی۔ یہی کوئی جواب نہیں دیا اور اڑے اٹھا کر اسے تنہا ہی۔



شاہ جہانگیر جمعہ کے دن پھر عارفہ بیگم کو ساتھ لے کر آگئے تھے۔ گو کہ گزشتہ بار آسیہ کا رویہ انتہائی مایوس تھا۔ لیکن اس کے بعد اباجی اور میمونہ بھابی نے اپنے طور پر آسیہ کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں گے۔ لیکن اس کے مان جانے کا یقین نہیں دلایا تھا اس لیے شاہ جہانگیر کچھ زبردستی نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ابھی بھی ٹال دیے جائیں گے۔ البتہ کھڑے ہوئے علی کو سہل آئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اسے آسیہ کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ صرف اس لیے کہ انہیں خد تھا کہ علی دوبارہ انہیں آسیہ کے پاس نہیں جانے دے گا اور خود فیصلہ کرے کہ نہ صرف اس رشتے کو ختم کر دے گا سب سے بھی تانا توڑے گا۔ وہ یقیناً ”ان دونوں ہر ایک سے اس قدر متنفر ہو رہا تھا کہ اس سے ہر قسم کے اقدام توقع کی جا سکتی تھی اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہی کھیل جاتا۔ اسی لیے شاہ جہانگیر اور عارفہ جہاں بکھلائے ہوئے تھے وہاں اس کے سامنے محتاط بھی اتنے ہی تھے جتنے تھے کہ وہ کتنا اصول پسند ہے۔ اس کے دل میں ہر رشتے کی اپنی جگہ اور مقام ہے۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دے سکتا۔ نہ صباحت کی خاطر ماں با کو چھوڑے گا اور نہ ماں باپ کی خاطر صباحت کو اگر انتخاب کا مرحلہ آتا تو وہ خود کو درمیان سے ہٹالے گا۔ اس میں اور شاہ سکندر میں یہی فرق تھا اور یہ شاہ سکندر بھی جان گئے تھے جب ہی اس کی ضمانت لیتے ہو انہوں نے آسیہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شاہ پور چھوڑ دے گا بلکہ صباحت کے جانے کا بھی مبہم سا اشارہ دے کہ جب آسیہ چاہے گی تب وہ بھی جائے گی۔

بہر حال شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم اس وقت کوئی اچھی امید لے کر نہیں آئے تھے البتہ یہ اطمینان ضرور گھر کے دوسرے افراد ان سے اچھی طرح سے ملیں گے، حسب سابق اباجی ہی انہیں ڈرائنگ روم تک لا تھے اور انہیں بٹھا کر اندر چلے گئے تھے۔

”سوری“ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی میں اصل میں ابھی افس سے آیا تھا۔“

”پھر تو ہم نے آپ کو زحمت دی۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”بالکل نہیں، پلیز نشرف رہیں۔“

شاہ جہانگیر نے اباجی کو دیکھا اور ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھے تھے کہ دوبارہ کھڑے ہو گئے کیونکہ میمونہ بھابی جی کے ساتھ داخل ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے آسیہ بھی۔

پھر ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

شاہ جہانگیر کو اندازہ نہیں تھا کہ ادھر سب لوگ کیا طے کیے بیٹھے ہیں اس لیے اپنا مدعا ہرانے کے لیے انہ سوچنا پڑا تھا جبکہ ادھر سب منتظر تھے کہ بات وہ شروع کریں۔

عارفہ بیگم کو پہلے ہی گہرا ہٹ ہو رہی تھی۔ اس طویل ہوئی خاموشی سے مزید گھبرا کر وہ بول پڑیں۔

”پھر کیا سوچا آپ نے؟“

شاہ جہانگیر نے چونک کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر ان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”ہمارا اچھی امید لے کر آئے ہیں۔ آپ بڑے ظرف کے لوگ ہیں۔“ یقیناً ”اچھا سوچا ہو گا جس میں پورا بہتری ہوگی۔“

”ماں باپ تو بہتری ہی سوچتے ہیں۔ دعا کریں۔ آگے لکھنے والے نے بہتری لکھی ہو۔“ خلیل بھائی نے کہا تو اباجی ان کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”لکھنے والا بہتری ہی لکھتا ہے بس ہم انسان اس کی مصلحتیں نہیں سمجھتے۔ ٹوٹے رشتے پھر سے استوار ہونے میں بھی یقیناً“ اس کی کوئی مصلحت ہوگی اور ہمیں چاہیے ہم گزشتہ ساری باتوں ساری رنجشوں اور کدورتوں کو مٹا کر ایک دوسرے کو معاف کر دیں ہمارے دل صاف ہوں گے تو آگے راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔“ اباجی نے خاموش ہو کر باری باری سب کے ہتھکے ہوئے سروں کو دیکھا پھر کہنے لگے۔

”بہر حال آپ اچھی امید لے کر آئے ہیں اور ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو مایوس نہیں کریں گے، شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سرا سیمہ سے اباجی کو دیکھ رہے تھے۔

”کچھ چاہئے وغیرہ۔“ خلیل بھائی نے ان دونوں کو اس کیفیت سے نکالنے کی خاطر فہرے اونچی آواز میں کہا تو باقی وہی بری طرح چونکے، پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اباجی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ممنون لہجے میں بولے تھے۔

”آپ نے تو ہمیں خرید لیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں آپ کا اور ڈاکٹر صاحبہ کا شکریہ ادا کر سکوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اباجی نے ان کا کندھا تھک کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر عارفہ بیگم کو کھڑے دیکھ کر آسیہ کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر ان کے گلے لگتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“

شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو ان کی توقع کے بالکل برعکس اور اچانک جو خوشی ملی تھی، وہ ان سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً ”علی کو اطلاع دے کر اس خوشی میں شریک کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبر کیا تھا۔ تاریخ رکھنے کے بعد چائے پینے تک رکھیں پھر سب نے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں البتہ شاہ جہانگیر نے بہت محل کا مظاہرہ کیا تھا۔ فردا ”فردا“ سب سے ملے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔

”کمال ہو گیا شادی! اس روز تو ڈاکٹر نے۔“ عارفہ بیگم شروع ہوئی تھیں کہ انہوں نے نوک دیا۔

”بس عارفہ بیگم! اس روز کیا ہوا کیا نہیں پچھلی ساری باتیں بھول جاؤ۔ بس آج کو یاد رکھو اور آج کے بعد آنے والا ہر دن ایسا ہی خوشیوں بھرا ہونا چاہیے۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔“ عارفہ بیگم فوراً بولی تھیں۔

اور جب وہ گھر پہنچے تو آگے علی ان کا انتظار تو کر رہا تھا، لیکن کھانے کے لیے جب ہی دیکھتے ہی کہنے لگا۔

”بس اسی جلدی سے آجائیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا تو شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر علی کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کوئی خاص ڈش بنوائی ہے کیا؟“

”ہاں نہیں اب! اگر مہینے نے کیا کیا بنایا ہے آئیے بیٹھیں۔“

”بھوک تو نہیں ہے پھر بھی تمہارے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ بیٹھو عارفہ!“ شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کے لیے کرسی کھینچی پھر اپنے لیے کھینچ کر بیٹھے تو بظاہر سرسری انداز میں کہنے لگے۔

”کھانے کے لیے وہ لوگ بھی بہت روک رہے تھے لیکن تمہاری ماں کو بہت جلدی تھی۔“

”کس بات کی؟“ اس نے سالن کا ڈونگا ان کے سامنے کرتے ہوئے بول ہی پوچھ لیا۔

”تمہیں خوشخبری سنانے کی، ہم تمہاری شادی کی تاریخ طے کر آئے ہیں۔“ عارفہ بیگم نے ابھی بھی بہت جلدی کھائی تھی۔

اور علی جہانگیر کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان دونوں کی ہوئی تھی۔ سرا سیمہ باری باری دونوں کو دیکھ گیا۔

”تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! اگلے مہینے کی بارہ تاریخ طے ہوئی ہے۔“ شاہ جمائگیر پوری تفصیل کے ساتھ آئندہ کاروگرام بھی بتانے لگے اور وہ بظاہر سب سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ وہ بڑبڑلائی لڑکی جو اس کی ہر بات کے جواب میں رونے لگتی تھی۔ یا پھر ایک بات کہتی۔
”میں کیا کروں۔ میں ماما کو دکھ نہیں دے سکتی۔“
ادھر شاہ جمائگیر سارا پروگرام بتانے کے بعد پتا نہیں کیا پوچھ رہے تھے اس نے سنا ہی نہیں تو جواب کیا دیا۔
تب عارفہ بیگم اونچی آواز میں اسے پکار کر بولی تھیں۔
”علی تم سے پوچھ رہے ہیں۔“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ بیٹھا بھی گیا۔ ”جی بابا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“
”میں کہہ رہا ہوں ادھر کا مسئلہ تو حل ہو گیا اب بابا جان سے کیا کہوں؟“ شاہ جمائگیر نے اس بار زور دے کر اپنی بات دہرائی تھی۔
”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مطلب یہ کہ میں بابا جان سے کہہ کر نہیں آتا تھا کہ یہاں میں تمہاری شادی کے معاملات طے کرنے آرہا ہوں اور اس بات پر وہ ناراض ہوں گے کہ ان کے علم میں لائے بغیر اور ان سے مشورہ کیے بغیر میں نے شادی طے کر دی۔“

”بابا! نا حق پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا بابا جان یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر آسیہ بغیر کسی شرط کے صحت کو رخصتی پر آمادہ ہو جائیں اور اسے وہ اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہوں گے تاکہ ناراض۔“
اس نے زنج ہو کر ماما تو عارفہ بیگم نے اس کی تائید کی۔

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔“ شاہ جمائگیر نے یوں سر جھٹکا جیسے ان دونوں سے بات کرنا فضول ہے۔ پھر علی کا جانے کا اشارہ کر کے اٹھ گئے تھے۔



جس روز شاہ سکندر حوطی چھوڑ کر گئے تھے بابا جان اپنے سب کام بھول گئے تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ ہم ترک کر رکھا تھا سارا وقت اپنے کمرے میں بند۔ بس یہی سوچتے تھے کہ سکندر نے ڈاکٹر کی اور اس کی بیٹیوں کو ان ترجیح دے کر اچھا نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کا ذہن مسلسل ان کے خلاف سوچتا رہتا تھا۔ شاہ سکندر سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہرجیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے اور لاکھ وہ خود کو بھی یہی کہہ کر فریب دیتے لیکن ان کی کیفیت اس جواری کی سی تھی جو ہارنے کے بعد انتقام پر اتر آتا ہے اور ان کے اندر انتقام کی آگ تو شروع ہو چکی تھی اب مزید شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ لیکن وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔
اس وقت بھی جب شاہ جمائگیر نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا تو وہ سر کے اشارے سے جواب دے کر بہت بلکے بھٹکے انداز میں پوچھنے لگے۔
”کہاں چلے گئے تھے تم؟“

”راجی گیا تھا بابا جان!“ شاہ جمائگیر ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بولے۔

”علی کے پاس گیا ہے علی، آیا نہیں بہت دنوں سے؟“

”ملازم آدمی ہے بابا جان! چھٹی مل جاتی ہے تو آ جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ ہوں کے انداز میں لمبی سانس باہر نکال کر خاموش ہو گئے۔

شاہ جمائگیر کو کہ خود کو بہت تیار کر کے آئے تھے، پھر بھی انہیں اپنی بات کہنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ اص میں انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بابا جان کا رد عمل کیا ہو گا اور یہی دیکھنے کے لیے وہ بہت سوچ کر بولے۔

وہ بابا جان میں علی کی سرسرا گیا تھا۔

علی کی سرسرا؟ بابا جان نے یوں دیکھا جیسے ہم سے پوچھتے بغیر۔

جی وہ علی کی شادی طے کرنے۔ شاہ جمائگیر نظریں چرا کر بولے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

ہو گئی طے؟ بابا جان نے طنز سے پوچھا۔

جی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ۔ شاہ جمائگیر اسی قدر کہہ سکے۔

ہوں۔ بابا جان کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگے۔ ”کیا شرائط رکھی ہیں اس ڈاکٹر کی؟“

شرائط! نہیں بابا جان! انہوں نے کوئی شرط نہیں رکھی۔“

اب جواب سے بابا جان کو اپنی اہمیت کم ہونے کے احساس سے شدید دھچکا لگا تھا۔ کتنی دیر انہیں خود پر قابو

میں لگی پھر بھی طنز سے بولے تھے۔

اس کا مطلب ہے بیٹی بہت بھاری ہو گئی ہے اس پر۔“

ناہ جمائگیر مصلحتاً ”خاموش رہے۔“

خیر مبارک ہو نہیں۔ اپنی بی بی جان کو بتایا؟“ بابا جان اب انہیں ٹالنا چاہتے تھے۔

جی نہیں میں سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“

تو اب جا کر بتاؤ انہیں تاکہ وہ تیری کر سکیں۔“

آپ! آپ چلیں گے بابا جان؟“ شاہ جمائگیر نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا تو وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے۔

کہاں؟“

راجی میرا مطلب ہے شادی میں شریک ہوں گے نا؟“

ہم کیا چاہتے ہو؟“ بابا جان بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

میں تو یہی چاہوں گا کہ علی کے سر پر سہرا آپ سجا سکیں۔“ شاہ جمائگیر ہر طرح سے ان کا مان ان کی بڑائی رکھنا

چاہتے تھے۔

”ہاں!“ بابا جان نے طویل قہقہہ لگایا پھر کہنے لگے۔

”ہم اپنی اولاد کی خواہش رد نہیں کرتے جمائگیر! یہ تم جانتے ہی ہو۔ سکندر نے شہر میں شادی کرنی چاہی تھی تو ہم

خود نہیں بھیج کر اس کی شادی کرادی تھی۔ علی نے جو چاہا اس کے لیے ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ہم اس

نیک چین سے نہیں رہے جب تک اس لڑکی کو علی کی منکوحہ نہیں بنادیا اور اب تم چاہتے ہو کہ علی کے سہرا

راہم سجا سکیں تو تمہاری یہ خواہش ہم علی کی دوسری شادی میں پوری کر دیں گے۔“

”جی!“ شاہ جمائگیر حقیقتاً ”چکا لگے تھے دیواریں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں اور ساعتوں میں بابا جان کی

زخمی کہ پکھلا ہوا سیسہ کس قدر سفاکی سے بول رہے تھے۔

”جی!“ اپنی اولاد کی خواہش ہم ضرور پوری کرتے ہیں جمائگیر! اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی پڑیں،

موت نہیں کرتے چھوٹے سے گھر کی کیا اہمیت ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔ محبت کا نشہ اتر جائے پھر علی بھی

طرح ہمارے پاس آئے گا جیسے سکندر آتا تھا۔“

”میں، نہیں بابا جان نہیں۔“ شاہ جمائگیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آپ گھر اجاڑ سکتے

بستیاں اجاڑ سکتے ہیں لیکن دل کی بستیاں اجاڑنے پر آپ قادر نہیں ہیں۔ سکندر کو دیکھ لیں اس کے دل میں

ایسی عورت بستی ہے۔“

”ہاں!“ بابا جان پھر قہقہہ لگا کر بولے تھے۔ ”اور علی کے دل میں اس کی بیٹی۔“

”ہاں اور اب آپ وہ کہانی دوبارہ نہیں دہرائیں گے۔ اس سے نقصان ہمارا ہی ہو گا بابا جان! آپ خدا کے لیے

بچوں پر رحم کریں ہم نے ہمارے اولاد نے کوئی ایسے جرم نہیں کیے جن کی پاداش میں آپ ہم سے زندہ رہنے

کا حق بھی چھین رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر ان کے عزائم سوچ کر پریشان ہو گئے تھے۔
 ”ہم چھین رہے ہیں۔ ہم اپنا تم کو ان شر والیوں نے باطل کر دیا ہے جو ایک کے بعد ایک ہمارے مقابلہ
 کھڑا ہو رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے ان مایہ ناز بیٹیوں میں جن کے لیے پہلے سکندر ہمیں چھوڑ گیا
 تم ہمیں نفع نقصان سمجھا رہے ہو۔“

بابا جان غصے سے بول رہے تھے، لیکن آخر میں آپ ہی آپ ان کے لہجے میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔
 ”آپ نہیں سمجھ سکتے بابا جان! کیونکہ آپ کے نزدیک جذبات کی کبھی اہمیت نہیں رہی۔ محبت پر آپ کا
 نہیں تھا۔ ورنہ آسہ کو طلاق دلوانے سے پہلے ایک بار تو ضرور سوچتے اور اس وقت ہمیں تو اب سوچ لینا کہ
 عورت کے لیے کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی اس نے خود پر سارے دروازے بند کر دیے کیوں اس لیے کہ جو
 ایک بار دل سے جس کو اپنا مان لے پھر ہمیشہ کے لیے اسی کی ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کا محبوب اسے مٹی میں
 دے، ٹھوکر مار کر کہیں چلا جائے یا بیوگی کی چادر اوڑھا کر۔ اس کے دل سے نہیں نکلتا اور ایسی عورت کے
 چھوڑنے والے تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔ سکندر تو پھر ڈنڈی مار گیا ہے۔ اپنی زندگی بڑے آرام سے گزار
 ابھی وہ اس کی خاطر یہاں سب چھوڑ کر نہیں گیا۔ اپنی بیٹیوں کے لیے جنہیں آپ ان کا اصل مقام
 تیار نہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ بھی ان کے بارے میں نہ سوچے، وہ اپنی بیٹی کے لیے گیا ہے بابا جان اور میر
 بیٹی کی محبت سے مجبور ہوں۔“

شاہ جہانگیر بولنے پر آئے تو بولنے چلے گئے تھے۔
 ”اب ہمیں اپنی مجبوریوں کی داستان مت سناؤ جہانگیر! جاؤ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“
 بابا جان بہت دیر سے ضبط کر رہے تھے بلا خرچ بڑے اور انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ بھی کیا
 جہانگیر نے یوں ہونٹ پیچھے جیسے مزید پتھر سے سر نکلانے کا کوئی فائدہ نہیں پھر کمرے سے نکل گئے تھے۔
 ”مجبور ہو نہ، ہم تو کبھی مجبور نہیں ہوئے یہ ہماری اولاد بتائیں۔“
 بابا جان سخت سے سر جھٹک کر اپنے آپ بول رہے تھے کہ شاہ تیمور کے آنے پر ہونٹ بھیجنے کراے
 لگے ان کی آنکھوں سے ابھی بھی غصہ جھلک رہا تھا۔ جس سے شاہ تیمور خائف سا ہو کر دروازے کباب
 رک گیا۔

”کیا بات ہے؟“ بابا جان نے پوچھا تب وہ آگے آتے ہوئے بولا۔
 ”میں ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں بابا جان!“
 ”ضروری بات۔“ بابا جان کی پیشانی سکڑ گئی۔
 شاہ تیمور کو اگر معلوم ہو تاکہ اس کے آنے سے پہلے یہاں شاہ جہانگیر اور بابا جان کے درمیان کیا بات
 تھی تو وہ ہرگز اس وقت نہ آتا لیکن اسے کیونکہ معلوم نہیں تھا اس لیے سہولت سے کہہ گیا۔
 ”جی میں مدیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ شادی آپ ہی کر سکتے ہیں۔“
 ”مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ بابا جان پر سوچ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھلے گئے
 دم رک کر بولے تھے۔

”کیوں خاندان میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں مدیحہ سے زیادہ خوب صورت پڑھی لکھی اور جائیداد والی؟
 نظر نہیں آتیں۔“
 شاہ تیمور خاموش رہا لیکن اس کے ہر انداز سے بغاوت جھلک رہی تھی۔ بابا جان کچھ دیر تک اسے
 پھر دھیمے پر کراؤ داری سے پوچھنے لگے۔
 ”کیوں کرنا چاہتے ہو مدیحہ سے شادی؟“
 ”اس نے میری توہین کی ہے بابا جان! میرا مذاق اڑایا ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے اور میں اسے بتاؤں گا“

و تا ہے۔“ شاہ تیمور کا سلگتا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کیسی آگ بک رہی ہے۔
 ”ہوں!“ بابا جان کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی تھی۔ پھر بیٹھے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا
 در کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

”یہ سبق تو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ وہ اتنی سی لڑکی، ہم سب کو دھوکا دے گئی۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ ہم تمہارے
 آپ سے کہتے ہیں کہ وہ پہلی فرصت میں سکندر کے پاس جائے اور مدیحہ سے تمہاری شادی کی بات کرے۔“
 ”سکندر رچا نہیں مانیں گے۔“ شاہ تیمور نے باپ سے کہا۔
 ”کیوں کیوں نہیں مانے گا۔ علی کی شادی ہو رہی ہے کہ نہیں۔ تمہاری بھی ہو جائے گی اور پھر تمہارے باپ کا
 وہ بہت لحاظ کرتا ہے۔ اس کی بات خود نالے گا، نہ ڈاکٹری کو نالے دے گا مجھے۔ تم فکر مت کرو۔“

”آج اتوار تو نہیں ہے پھر نیل بھائی گھر پر۔“ وہ سوچتے ہوئے نیل کے کمرے میں آئی اور انہیں بیڈ پر دیکھ کر
 بت کے مطابق پریشان ہو گئی۔
 ”کیا ہوا نیل بھائی! آپ کی طبیعت خراب ہے۔“
 ”نہیں، بس ذرا سر میں درد تھا، وہ بھی اب نہیں ہے۔“ نیل نے بوا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے
 اطمینان دلایا۔

”لیکن آپ کی تو آنکھیں بھی لال ہو رہی ہیں۔“ وہ کہاں مطمئن۔ ہونے والی تھی۔
 ”سو کر اٹھا ہوں اس لیے ہو رہی ہوں گی۔ اب تم زبردستی مجھے کوئی بیماری لگا دو۔“ نیل نے چڑ کر کہا۔
 ”بیماری لگے آپ کے دشمنوں کو۔ آپ کو تو میری عمر لگ جائے۔“
 ”صبا!“ نیل نے فوراً ٹوکا۔ ”فضول باتیں مت کیا کرو۔“
 ”ڈانٹ کیوں رہے ہیں۔ ایک تو میں پہلے ہی بور ہو رہی ہوں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔
 ”کیوں مدحو کہاں ہے؟“

”بازار گئی ہے۔ میں بھی چلی جاتی تو اچھا تھا۔“
 ”ہاں ذرا سکون ہو جاتا۔“ نیل نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مزید چھیڑا تو وہ جھنجھڑ کر بولی۔
 ”فکر نہیں کریں میں آج جا رہی ہوں پھر آپ سکون سے رہے گا۔“
 ”کہاں؟ تم کہاں جا رہی ہو؟“ نیل نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔
 ”پیلا کے پاس، ابھی ان کی گاڑی آئے گی اور اب بس میں وہیں رہوں گی۔ یہاں نہیں آؤں گی آپ کو سکون
 ہے نا اور ہاں مدحو بھی میرے ساتھ جائے گی۔“

وہ ناراض سی ہو کر بولی چلی گئی اور جب خاموش ہوئی تب بھی نیل کچھ نہیں بولے جانے کیا سوچنے لگے تھے۔
 ”نیل بھائی!“ اس نے پہلے پکارا پھر ان کے پاس آئی بیٹھی اور آہستہ سے ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کیا
 سوچ رہے ہیں؟“

”ہاں!“ نیل نے چونک کر اسے دیکھا پھر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”کچھ نہیں۔“
 ”اچھا بتائیے میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”تم اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ خیر تمہارا جانا تو یوں بھی طے ہو گیا ہے لیکن مدحو کو تو ابھی یہیں رہنا
 ہے جب تک اس کی کہیں بات طے نہیں ہوتی۔“
 نیل نے نظارہ ٹکے جھلکے انداز میں کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔
 ”آپ چاہتے ہیں مدحو کی کہیں بات طے ہو؟“
 ”ہاں کیوں نہیں۔ ساری زندگی وہ بوہنی تو نہیں بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔“ نیل نے نظرس چرا کر بولے تھے۔

”جانا اپنے اختیار میں ہے آنا نہیں۔ خدا حافظ۔“ وہ بیگ اٹھا کر جس تیزی سے کمرے سے نکلی اس سے مدد چاہی کہ اس سے تھا ہو کر گئی ہے اور اسے منانا کون سا مشکل تھا جو وہ اس کے پیچھے بھاگتی بس گہری سانس کھینچ کر بیٹھی پھر عمر کو کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“

”ہاں تمہارے در سے میں ہمیشہ کچھ لینے ہی تو آتا ہوں۔“ عمر نے کہا تو وہ آکر کمرے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

”بجٹ کون کر رہا ہے۔ یہ بتاؤ صبا ناراض ہو کر کیوں گئی ہے؟“

”میں اس کے ساتھ نہیں گئی اس لیے اب یہ مت پوچھنا کہ میں کیوں نہیں گئی۔“

”تو مجھے کیا یاد لے کتے نے کاٹا ہے جو میں تم سے کچھ پوچھوں گا۔“ عمر کاٹوں کو ہاتھ لگاتا ہوا وہیں سے پلٹا تو اس نے ایک دم پکار لیا۔

”سنو عمر!“

عمر رک گیا لیکن اس کی طرف رخ نہیں موڑا تھا۔

”وہ ماما کیلی ہو جاتیں نا میں اس لیے نہیں گئی۔“ اس نے کہا تو عمر جھٹکے سے اس کی طرف پلٹا اور حیرت سے اس میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

”یہ تمہیں دوسروں کا احساس کب سے ہونے لگا۔ تمہاری بلا سے کوئی اکیلا ہوا۔“ عمر اس کے گھورنے پر ادھوری پھوڑ کر ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

ایک میری ہی ہر بات پر گرفت کیوں ہوتی ہے۔“ وہ سوچتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر اسے ہند کر کے اس ساتھ کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی اور یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں شاید کوئی سانس ملا تھا۔ کچھ کھونے کا کچھ پانے کا لیکن وہ سمجھ نہیں پاری تھی۔

”یہ صبا کیا کہہ رہی تھی نیل بھائی ہے؟“

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا اور ست روی سے آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے اندر دل کسی کشتی میں آگیا تھا اور ذہن کے پردوں پر کہیں دھندلے عکس ابھر رہے تھے، کہیں بہت واضح اور ہر جگہ ایک مت نمایاں تھا جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا اور آپ ہی آپ اس سے دشمنی بھی باندھ لی تھی کہ وہ کیوں اہمال کی محبت میں حصہ دار بن کر آگیا تھا۔

اب وہ پھوٹی تھی تب بھی آسمان کی نیل پر ذرا سی توجہ پر چچ پلا کر احتجاج کرتی تھی اور اس پر بس نہیں تھا اس حد نیل سے بھی لڑتی تھی، لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ الٹا اس کی طرف داری تھے اور اب تک ایسا ہی تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اسی عادت کو صبا نے محبت سمجھ لیا تھا یا واقعی وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ کتنی دیر تک وہ اس بات میں الجھتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی اور نہ ہی مجھے کیا کہہ کر اس وزہن سے جھٹک سکی۔ شاید یہ نیل کے جذبے تھے جو اپنا آپ منوارے تھے۔

صبا اہل صبا سے پوچھتی ہوں۔“ اسے ایک دم صبا کے کا خیال آیا تو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اسے فون نے کے ارادے سے لابی میں آئی تو اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی تھی۔

”ہیلو صبا!“ وہ کیونکہ صبا نے اسے ہی بات کرنے کا سوچ رہی تھی اس لیے ریسور اٹھاتے ہی اسے پکارا تھا۔

”میں صبا نہیں اصر ہوں۔“ دوسری طرف سے اصر کی آواز سننے ہی وہ سنبھل گئی۔

”جی کیسے ہیں آپ؟“

”نہم کیسے ہو۔“ اصر نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی گول کر گئی۔

”آپ چاہیں تو وہ اس گھر میں رہ سکتی ہے اور یونہی نہیں۔“ اس نے زور دے کر کہا تو نیل اس کا مطلب کر خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ یہ ہے کہ آپ چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ وہ ان کے خاموش رہنے پر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”پتا نہ کیا سوچ کر کھا ہے آپ نے یا آپ کو کسی خاص وقت کا انتظار ہے، یہی بات ہے نا۔“

”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ تمہاری فضول باتیں سننے سے بستر ہے میں۔“ وہ بولتے ہوئے بیڈ کی دوسری طرف اتر گئے۔

”فضول باتیں! آپ مدحو سے محبت کرتے ہیں یہ فضول بات ہے۔“

”بس خاموش ہو جاؤ صبا!“ نہیں جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔

”آپ واقعی بزدل ہیں نیل بھائی اور آپ کو اپنی محبت پر بھروسہ بھی نہیں ہے، ورنہ مدحو کوئی آسمانی مخلوق نہ ہے جس کے سامنے اعتراف نہ کیا جاسکے۔ میں بتاؤں گی اسے کہ آپ۔“

”ہاں بتا دینا اور اس کے بعد بھول جانا کہ یہاں کوئی نیل بھی تھا۔“ انہوں نے اسی غصے سے کہا تو وہ اچھل کھڑی ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

نیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وارڈ روپ سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلے گئے۔ تو وہ پہلے جنیلائی پڑی دل ہی دل میں افسوس کرتی ہوئی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی اور آگے مدیہ کو کھڑے دیکھ کر تعجب سے بولی۔

”ہائیں۔ تم لوگ اتنی جلدی آگئے۔“

مدیہ نے کوئی جواب نہیں دیا نا ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ چند قدم آگے آکر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ گئی۔

”کیا بات ہے مدحو؟“

”وہ میں یہ بیگ دیکھ رہی تھی۔ کہیں جا رہی ہو کیا؟“ مدیہ نے ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور بیگ کے اندر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔

”صرف میں نہیں، ہم دونوں جا رہے ہیں پاپا کے پاس۔ وہ چاہتے ہیں میں کچھ دن ان کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں پھر تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔“ مدیہ نے یہ بات بھی کچھ کھونے ہوئے انداز میں کہی تھی۔

”اچھا دیکھو میں نے تمہارے یہ سوٹ رکھے ہیں۔“ اس نے بیگ اپنی طرف کھینچ کر مدیہ کے سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیے تو وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

”میرے کیوں؟ میں تو نہیں جا رہی۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب۔ یہاں اتنے کام ہیں وہ کون کرے گا پھر ماما بھی اکیلی ہو جائیں گی۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ مدیہ قدرے ترشی سے کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاتی۔“

”جو کومت پاپا نے بلایا ہے تمہیں ضرور جانا ہے۔ چلو اور جو کچھ رکھنا ہے رکھو بیگ میں ورنہ میں ابھی ماما کو فون کرتی ہوں پھر ان کی ڈائنٹ سن کر روٹی ہوئی جاؤ گی۔“ مدیہ پتا نہیں کیوں ناراض ہو رہی تھی۔

”صبا! منشر صاحب کی گاڑی آگئی ہے۔“

”آ رہی ہوں بلکہ جا رہی ہوں۔“ اس نے بیگ بند کر کے مدیہ کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

”زیادہ دن مت رکنا۔“

ایا توں کوڈہن سے جھٹک دے، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنا اپنا دھیان ادھر ادھر کرتی کوئی نہ کوئی بات جانی۔

نیل بھائی کیا چاہتے ہیں۔ کاش تم جان سکو۔ ”ایک بار صباحت نے کہا تھا۔
وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔ پتا نہیں احمر پر کیسے ظاہر ہو گئے تھے جو وہ کہہ رہا تھا۔
نادان لڑکی! اصل بات سوچو دنیا میں بے غرض وہ بے لوث محبت نایاب ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ۔“
بے غرض وہ بے لوث محبت۔ نامکمل۔ وہ جھٹلانے کی سعی کرنے لگی۔ کائنات کا سارا نظام دو اور لوکے اصول پر
ہا ہے۔ سودے بازی ہر جگہ سودے بازی۔
نڈیا ادھار۔

سود سوچتے ہیں۔
ندگی کے کاروبار میں گھائلے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔
بت بھی کاروبار ہے۔ سراسر دکانداری۔
کے عوض دل۔

یوں ہی اوٹ پانگ سوچے جاری تھی کہ آسیہ کی آواز پر چونک گئی۔
سہ نیل کو پکار رہی تھی۔ وہ سامنے کی تو کچھ حیرت سے پوچھنے لگی۔
تم گئیں نہیں بیٹا۔ ”پھر خود ہی کہنے لگی۔“ اچھا کیا یہاں اتنے کام ہیں۔“
جی ماما! میں اسی لیے نہیں گئی اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ صبا چلی جائے گی تو کیسا لگے گا۔“ اس نے
، صورتی سے بات بتائی۔ تب ہی نیل کمرے سے نکل کر آئے تو آسیہ جو اس سے کچھ کہنے جاری تھی، نیل
رف متوجہ ہو کر بولی۔
چلو بیٹا! بوائے کھانا لگا دیا ہے۔ آؤ دو۔“
جی ماما چلیں۔“ اس نے آسیہ کے بعد نیل کو اندر جانے دیا پھر ان کے پیچھے ڈانٹنگ میں داخل ہوئی تھی۔



صباحت کے ساتھ مہر النساء اور الماس کا رویہ خاصا زور تھا اور ناگواری لیے ہوئے تھا۔ بس شاہ سکندر کے
نے الماس نے اس سے رسمی جملے بولے تھے جبکہ مہر النساء نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور وہ مدیہ
تھی جو جو اب! اپنے ہر عمل سے ان پر یہ جتاتی کہ اسے بھی ان کی پروا نہیں ہے۔ اسے پروا بھی جب ہی تو اسے
رف بری طرح محسوس ہو رہا تھا بلکہ بہت دکھ بھی ہو رہا تھا اور رات جب تک اسے نیند نہیں آئی، وہ کڑھتی
تھی۔

محصول سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی جگہ کی وجہ سے بہر حال اس نے دوبارہ سونے کی
ش نہیں کی اور اٹھ کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کراچی کے موسم کا کچھ پتا نہیں
دسمبر شروع ہو چکا، لیکن سردی بس برائے نام ہی تھی۔ صبح کے وقت کچھ ٹھنڈک محسوس ہوتی یا پھر شام

س وقت فضا میں قدرے خنکی تھی جو کہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اترتے اجالے میں
لے منظر واضح ہونے لگے تھے اس نے کھڑکی میں آگے کی طرف جھک کر یاں سمت دیکھا تو لان کا کچھ حصہ
آیا۔ اتنے سے حصے میں ہی خوش رنگ پھولوں کی بہتات تھی اور وہ پھولوں کی دیوانی وہیں سے کود کر لان میں آئی
بتا۔ ”اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس نے تلتے چکر لگا ڈالے اور ابھی
کایہ خفیل جاری تھا کہ شاہ سکندر آگئے۔

”صبا اور نیل بھائی دونوں نہیں ہیں اس وقت اور ماما بھی کلینک گئی ہوئی ہیں۔“
”اور مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ احمر نے فوراً کہا۔
”جی! اس نے سننے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بیچھے ابھی ٹوبہ کے خط سے صبا کی شادی کا پتا چلا ہے میں نے سوچا ماما کب ادے دوں۔“
”شادی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ کو ہے۔ بہر حال پیشگی مبارکباد کا پیشگی شکریہ اور کوئی بات؟“
”ہاں ایک بات اور ہے تم ہر اتو نہیں مانو گی۔“ احمر نے رک کر پوچھا تھا۔
”میرے برائے نہ مانے کو چھوڑیں۔ آپ اپنی بات کہیں۔“ وہ خاصی بے مروتی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
”میں تمہیں اس شخص کا بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے ساتھ سب سے زیادہ مخلص ہے بہت محبت کرتا ہے وہ تم
سے۔“

”کون؟“ اس کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔
”نیل بھائی! احمر بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔
اسے لگا وہ اس سچائی کو کبھی نہیں جھٹلا سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک خیال آیا تھا۔ فوراً احمر کو پکار کر
پوچھنے لگی۔

”احمر! آپ کو کس نے بتایا۔“
”تمہارا کیا خیال ہے نیل بھائی نے بتایا ہو گا۔ نہیں وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔“ احمر نے
کہا تو وہ اندر ہی اندر الجھ کر بولی۔
”پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟“
”اس بات کو چھوڑو نادان لڑکی اور اصل بات سوچو۔ دنیا میں بے غرض وہ بے لوث محبت نایاب ہے، تم خوش
قسمت ہو کہ۔“
شاہ لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دو تین بار کریڈل پر ہاتھ مارا پھر ریسیور رکھ کر پلٹی تو سامنے سے نیل کو
آتے دیکھ کر وہ ان ہی کے انتظار میں وہیں رک گئی تھی۔



اور جب نیل قریب آئے تو وہ کچھ شپٹا کر نظروں کا ڈاؤیہ بدل گئی۔
”کیا بات ہے؟“ نیل نے رک کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔
”کچھ نہیں۔“
”پھر یہاں کیوں کھڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کسی کے فون کا انتظار ہے۔“ نیل کا انداز ہوش کی طرح سادہ تھا۔
کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے سب سے الگ جذبے چھپائے کھڑے ہیں۔
”وہ میں صبا کو فون کر رہی تھی لیکن نمبر ہی نہیں مل رہا۔“ اس نے بات بتائی۔
”صبا کو! اچھا ہاں، شام میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پیارے ہاں جاری ہے۔ تم نہیں گئیں؟“ نیل نے ایک
دم باؤ آنے پر پوچھا۔

”نہیں۔“
”کیوں؟“
”بس بدل نہیں چاہا۔“
”دل نہیں چاہا۔“ نیل ذرا سا مسکرائے پھر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے، تم نمبر ڈائی کرو۔“
اس نے خاموشی سے انہیں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا پھر میز پر نکل آئی اور بہت چاباکہ صباحت اور پھر

”سلام علیکم بابا۔“ وہ انہیں دیکھتے ہی تیز قدموں سے ان کے قریب چلی آئی تھی۔
 ”وعلیکم سلام آج کی صبح ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔“ شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔
 ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر اس کے ساتھ لان چیمبر
 بیٹھے اور کچھ دیر ایسی ہی ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد کہنے لگے۔
 ”بیٹا! مجھے افسوس ہے کہ الماس اور اس کی ممی نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا بھلا ہیو نہیں کیا۔ آپ نے ضرور
 مانتا دیکھا ہوگا۔“

”نہیں بابا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن ان سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں کوشش کروا
 گی کہ انہیں بھی مجھ سے شکایت نہ ہو۔“
 ”گندبو آراؤں ڈاٹر۔“ شاہ سکندر کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔
 ”تھینک یو۔“

”اور بیٹا! آپ کے ساتھ مدھیہ نہیں آئی۔“
 ”ہاں نہیں بابا! اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔“
 ”ہوں۔“ موڈی لڑکی ہے۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ غالباً ”ان کا ذہن کیوں اور ہٹک گیا تھا۔
 وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ پھر پکار کر پوچھنے لگی۔
 ”بابا! آپ کے لیے چائے لاؤں۔“
 ”چائے۔“ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”ابھی تک چائے نہیں آئی۔“

”میں لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کر اندر آئی تو آگے خانساں چائے لیے بکھن سے نکل رہا تھا۔ اس نے ٹرے میز
 ایک کپ دیکھا تو وہیں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔
 پھر ناشتے کے بعد شاہ سکندر چلے گئے تو وہ کتنی دیر انہیں کی طرح لاؤج میں بیٹھی رہ گئی۔ حالانکہ دو تین بار
 الماس وہاں سے گزری تھی لیکن مروتا بھی اس سے بات نہیں کی اور مہر النساء تو اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلی
 تھی۔ اس لیے الماس سے بڑی ہونے کے باوجود اس نے پہل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور خود اس کے
 کمرے میں چلی آئی۔

الماس ایک کونے میں نیچے کاربٹ پر بیٹھی اپنے سامنے اخبار پھیلانے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے
 اطراف کچھ ساوہ پیرز کھڑے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے فوراً ”سراونجا کیا تھا اور اسے دیکھ کر اس
 تیزی سے ادھر ادھر بکھرے پیرز سمیٹنے میں لگ گئی۔ تو وہ اس کی اس حرکت کو قصداً ”نظر انداز کرتی ہوئی دوستانہ
 انداز میں بولی۔

”کیا ہو رہا ہے۔“ الماس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔
 ”میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ حالانکہ میاں میرے شوق اور دلچسپی کے لیے بہت کچھ ہے لیکن پتا نہیں کیوں
 نہ میرا لپاکا لائبریری میں دل لگانا۔“
 وہ اپنے آپ بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی تو الماس بلا ارادہ اسے دیکھنے لگی اور اس کا مقصد اسی طرح اسے
 متوجہ کرنا تھا۔

”تم کوئی کام کر رہی تھیں۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ تم آرام سے اپنا کام کرو۔“ وہ اس سے کہہ
 فاصلے پر نیچے بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔
 ”تمہارے کمرے کی سینگ بہت خوب صورت ہے۔ اگر تم نے خود کی ہے تو یقیناً تم آرٹسٹک مائنڈ ہو
 تمہارے سبھی کٹ کیا ہیں؟“

الماس خاموشی سے اسی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بالکل مدھیہ جیسی لگ رہی تھی، لیکن اس کا ہر انداز اس سے
 مختلف تھا نہ لہجے میں تنفر نہ آنکھوں میں خشونت اس کے برعکس اپنائیت کا احساس دیتی لگ رہی تھی۔
 ”فائن آرٹس۔“ اس نے جواب نہ پا کر خود ہی قیاس کر کے کہا تو اس بار الماس بے اختیار بولی تھی۔
 ”نہیں سائنس۔“

”اے تم سائنس کی اسٹوڈنٹ ہو۔ کون سی کلاس میں ہو۔“ اس نے حیرت کے اظہار کے ساتھ دلچسپی بھی
 ظاہر کی۔

”انٹر کا امتحان دیا ہے۔“
 ”دیری گڈ۔ آگے کیا ارادہ ہے؟“
 ”بابا! کاراؤم میڈیکل میں میرا ایڈمیشن کرانے کا ہے۔“ الماس قدرے جھجک کر جواب دے رہی تھی۔ شاید اس
 لیے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کی ذات میں اس طرح دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ اس نے فوراً کہا پھر اس کی بات پر غور کر کے پوچھنے لگی، ”کیا تم نے پاپا کا ارادہ
 ٹھیک نہیں شوق نہیں ہے ڈاکٹر بننے کا۔“

”مجھے بھی ہے لیکن امی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا۔
 ”کیوں؟“ وہ پوچھ کر خود ہی جڑبڑی ہو گئی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی امی کیوں نہیں چاہتیں۔
 ”آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟“ الماس خوب صورتی سے بات بدل گئی۔
 ”میں مٹروڈائر کے پیپر دے چکی تھی اس کے بعد کالج چھوڑ دیا۔“
 ”کیوں؟“ الماس نے بھی اس کی طرح فوراً پوچھا لیکن پھر خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔
 ”اچھا ہاں، پھر آپ کی شادی ہو گئی تھی۔“
 ”شادی۔“ وہ ہنسی تو الماس قدرے جھینپ کر بولی۔
 ”شادی ہی تھی۔“

”اچھا چھوڑ دیا۔“ وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ مہر النساء کی آواز پر خاموش ہو گئی۔
 مہر النساء نے الماس کو نیکارے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لیکن جب اسے دیکھا تو اندر نہیں آئی اور
 وہیں دروازے ہی میں رک کر بولی تھی۔

”الماس! میں عمیر کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔“
 ”میں چلوں۔“ الماس نے چند لمحے رک کر سوچا پھر کہنے لگی۔ ”میں نہیں جا رہی۔ صابجی اکیلی ہو جائیں گی۔“
 مہر النساء کو اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی جبکہ وہ بے انتہا خوش لیکن بہت سنبھل کر بولی۔
 ”اے نہیں۔ میری وجہ سے تم اپنا جانا ملتوی نہیں کرو۔“

”نہیں۔ بس میں نہیں جا رہی۔“ الماس نے اس سے کہتے ہوئے مہر النساء کو دیکھا۔
 ”اچھا ٹھیک ہے، تم لوگ کھانا کھا لیتا۔“
 پھر دو دن میں الماس اس کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی اور مہر النساء کو کہ خود اس سے بات نہیں کر رہی
 تھی، لیکن اس کی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ اس کے انداز میں وہ تنفر اور ناگواری بھی نہیں رہی تھی اور اس
 کے لیے فی الحال یہی بہت تھا۔ یوں بھی وہ بہت زیادہ دنوں کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا مزید دو دن
 رک کر وہ چلی جائے گی۔ اس وقت الماس کے ساتھ لان میں کھلتے ہوئے وہ اس سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کل یا
 ہول وہ چلی جائے گی۔

”کیوں، میرا مطلب ہے اتنی جلدی کیوں جائیں گی۔ ابھی تو آپ کی شادی میں بہت دن ہیں۔“ الماس نے
 توجہ کرتے ہوئے کہا تو وہ رک کر بولی۔

”وہ تو ہیں لیکن مجھے مدحو کا خیال آ رہا ہے۔ جب میں آ رہی تھی تو وہ کچھ خفاسی لگ رہی تھی اور دیکھو اس نے فون بھی نہیں کیا۔“

”آپ فون کریں۔ میں امی کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔“ الماس اسے لابی میں جھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ نمبر وائل کر کے انتظار کرنے لگی۔ ماما اور نیل بھائی کا تو اسے پتا تھا کہ اس وقت دونوں گھر پر نہیں ہوں گے اور مدح نے تفتی دیر بعد رسورا اٹھایا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے چھوٹے ہی ٹوکا۔

”رہ سرج۔“ ادھر مدح یہ جانے کس موڈ میں تھی وہ سمجھ نہیں سکی۔

”کھا ہے؟“

”یہ میں تجھ سے نہیں بتاؤں گی۔ بلکہ میں اب کوئی بات تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“ مدح نے زور دے کر کہا۔

”کیوں مجھے کیوں نہیں بتاؤ گی۔“ اس نے حیران ہو کر ٹوکا۔

”اس لیے کہ تم ہر بات مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔“

”کیا میں نے کیا بات چھپائی ہے؟“

”اے آپ سے پوچھو۔“

”میں بالکل نہیں جان پاؤں گی۔ تم بتا دو پلیز۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”جو قسمت یہ بتاؤ واپس کب آ رہی ہو۔“

”اگلے ہفتے۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”اگلے ہفتے کیوں؟ اگلے مہینے آنا۔“ مدح پر اس کی لجاجت کا اثر ہوا تھا نہ روٹھنے کا، فوراً ”فون بند کر دیا۔“



علی جمائیکیر کو اس وقت صاحت کے نمبر وائل کرتے ہوئے ادھر سے کسی اور کے رسورا اٹھانے کا خدشہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی آواز سننے کو ملے۔ لیکن دوسری طرف مدح بھی جس کی آواز سننے ہی وہ برا سامنہ بنا کر بولا۔

”تمہیں کیا پیرے پر بٹھایا ہوا ہے۔“

”جناب! آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“ وہ ہنسی کے درمیان بولی تھی۔

”اعتراض ہو بھی تو تم کون سا سامنے والی ہو۔ چلو بلاؤ اسے۔“ اس نے رعب سے حق جتایا تو ادھر سے کورا جواب آیا۔

”وہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب وہ یہاں نہیں ہے۔ پیپا کے ہاں گئی ہوئی ہے۔“ مدح روانی سے بتا کر پوچھنے لگی ”اور بتائیں کس کو بلاؤں۔“

”کسی کو نہیں۔ بس سب کو سلام کہہ دینا۔“ وہ غلت میں فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور وہیں سے عارفہ بیگم کو پکار کر بولا تھا۔

”امی! میں پچا جان کی طرف جا رہا ہوں۔“

اور پھر آدھے گھنٹے کا فاصلہ اس نے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا۔ طویل راہداری سے گزر کر جب وہ گول کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ہی وہ الماس کے ساتھ بیٹھی نظر آئی، جس پر اسے حیرت ہوئی کیونکہ مدح کو اس نے شاہ پور میں کسی کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”سلام علیکم۔“ اس نے اپنی حیرت چھپا کر قدرے اونچی آواز میں سلام کیا تو جہاں وہ چونک کر بھاڑا کھڑی ہو گئی وہاں الماس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”اے علی بھائی آپ۔“

”ہاں مجھے ابھی پتا چلا تھا کہ جسے میں سارے شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں وہ تمہارے پاس ہے۔“ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”جہ نہیں۔ ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔“ الماس فوراً ”صاحت کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دونوں بازو انہیں بائیں پھیلا دیے۔“

”پھر کب مل سکتا ہوں۔ ان سے پوچھ کر بتاؤ۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا تو وہ ہالگ کر کمرے میں چلی گئی۔

”مل گیا جواب، وہ ملنا ہی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا تو وہ مایوس سی شکل بنا کر بولا۔

”اب کیا کروں؟“

”صبر۔“ الماس ہنسی۔

”شٹ اپ! یہ بتاؤ پچا جان اور چچی جان کہاں ہیں؟“

”وہ کئی تقریب میں گئے ہیں۔“

”اور تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ چائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو، میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔“ وہ اسے سامنے سے ہٹاتا ہوا اسی کمرے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے الماس نے اسے روکنے کی کوشش میں یہاں تک کہا کہ دیکھیں پیپا آ رہے ہیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر رہی رکھا تھا۔

وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی، گھبراہٹ میں کبھی پردہ ادھر بھینچتی کبھی ادھر۔ ”لاؤ میں تمہاری مدد کر دوں۔“ وہ اس کے قریب جا کر بولا اور پردے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا تو وہ بمشکل اپنا توازن قائم رکھ کر بولی۔

”آپ کیوں آئے ہیں۔“

”یہ دیکھنے کے اپنے دل کی بستی میں تم نے میرے نام کے جو گل کھلائے تھے، ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔“ وہ پرشوق نظروں سے اس کے چہرے پر اترتے رنگ بکھ رہا تھا۔

”میرا ہاتھ جھوڑیں۔“ وہ بہت زور سے ہو رہی تھی۔

علی جمائیکیر نے ایک بار اس کے ہاتھ کو زور سے دیا پھر ہونٹوں سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھے یقین کر لینے دو صبا کہ ہم ساری آزمائشوں سے گزر کر اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ سو، تمہارے دل میں اگر کوئی خدشہ باقی رہ گیا ہو تو اسے بھی نکال پھینکو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہمارے راستے میں اب صرف پھول ہی پھول کھلیں گے کوئی کانٹا نہیں ہو گا۔ بہت کانٹے ہوں گے جتنے پھول ان سے زیادہ کانٹے۔ لیکن میں تمہیں ان سے نہیں اچھٹے دیوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ اس کے دلنشیں لہجے میں کھو کر اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”اور ہاں۔“ مجھے تمہاری ثابت قدمی نے بہت امپریس کیا ہے۔ اول روز تم نے جو بات کہی، آخر تک اس پر قائم رہیں کہ تمہاری ممانجہ فیصلہ کریں گی۔ تمہیں وہی قبول کرنا ہے اور اب جبکہ ہمارے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے تو کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت میں بھی ایسی ہی شدت پسندی کا مظاہرہ کرو گی۔“ وہ اپنی نظریں اس کی پوری کھلی آنکھوں میں اتار کر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

صاحت نے پلکیں جھپکا کر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تھی۔

”اگر کبھی آپ کو میری آزمائش مطلوب ہو تو جان مانگیے گا۔“
 ”اوس ہوں۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے بہت نرمی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔
 ”ماٹوں گا، نہیں، جان دوں گا۔“

وہ اس کی مزید کسی جسارت سے بچنے کی خاطر، وقدم اور پیچھے ہٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”الماس آ رہی ہے شاید۔“

”معتی بیوقوف نہیں ہے وہ۔“ وہ مسکراتا ہوا پھر اس کے قریب آنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک کے ساتھ
 اس پکار کر بولی۔

”معتی بھائی! کیا آگئے ہیں۔“

”افسوس تو واقعی ہے ووقوف ہے۔“ وہ گہری سانس کے ساتھ بڑبڑایا تو وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ پردہ کھینچ کر پھر
 اس کی اوٹ میں ہو گئی۔

”اوکے جلدی ملیں گے۔“ وہ اس کے پردے کو مضبوطی سے تھامے ہاتھ کو ہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا اور
 اس کے اشارے پر جلدی سے اس جگہ آ بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شاہ سکندر اور مہر النساء اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا تو شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔

”معلیٰ! کیسے ہو۔ بڑے دنوں بعد آئے؟“

”بس چچا جان! سوچتا تو تھا آنے کا لیکن۔“ وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”ابا کہاں ہیں تمہارے؟“ شاہ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ پور۔ امی البتہ یہیں ہیں۔“

”انہیں بھی لے آتے۔“ مہر النساء نے کہا۔

”لے آؤں گا چچی جان! ابھی میں گھر سے نہیں آ رہا۔“ اس نے مبالغے سے کام لیا۔

”اور کھانا وغیرہ کھایا۔“

”نہیں۔ چائے کا کھا تھا الماس سے۔“ اس نے الماس کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔

”چائے آپ کو ضرور ملے گی لیکن کھانے کے بعد۔“



شادی کی تیاریوں میں دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے اور اس بار مدیہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اسلام آباد
 سے سیما بھائی، سمینہ اور سونیا بھی آگئی تھی۔ سمینہ کی گود میں چند ماہ کا بیٹا تھا اور سب کی زیادہ توجہ اس بچے نے
 کھینچی تھی۔ سمینہ سارا وقت اسے ڈھونڈتی پھرتی۔

”ابھی عمر کس تھا۔“

”مدو سے پوچھو، وہ اس کے کپڑے بدل رہی تھی۔“ سارا دن ایسی آوازیں گونجتی رہتیں اور رات میں ڈھولک
 کے ساتھ ہنسی مذاق میں محفل کتنے رنگ بدلتی تھی۔ کبھی سب سنجیدہ ہو جاتے بھی بہت شوخ، ایسے میں جب

جیسے چائے لے کر آتی تو وہ ہر روز نئے سرے سے باقاعدہ حیرت کا اظہار کرتے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ
 کہ کدوہ برا نہیں مان رہی تھی اور پلیٹ کر جواب دینا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔

اس وقت وہ چائے لے کر آئی تو سب سے پہلے عمر شروع ہوا تھا۔

”واؤ! مدو چائے لے آئی۔ آج ضرور سورج مشرق سے طلوع ہوا ہوگا۔“

”مشرق ہی سے ہوتا ہے۔“ شمو نے کہا تو وہ روائی میں بولا تھا۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔“ سب کے بے ساختہ قہقہوں سے وہ بوکھلا گیا تھا۔
 ”بس عمرا اب اور کچھ مت کہنا۔ کیونکہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔“ نیل نے دھیرے سے عمر کو ٹوکا تو وہ سر
 کھجاتے ہوئے بولا۔

”گیا کروں نیل بھائی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ اس لڑکی سے پانی مانگو تو کورا جواب ملتا ہے۔ خودی لو کہاں
 چائے آفراس میں یہ انقلاب آیا کیسے۔“

”کیسے آیا۔“ نیل خود حیران تھے۔ اسے کیا جواب دیتے۔ بس ذرا سے کندھے اچکا کر مدیہ کو دیکھنے لگے
 پھر رات دو بجے تک یہ محفل جی رہی اور آسیر کے کہنے پر ہی سب اٹھے تھے۔ مدیہ ڈراٹنگ روم اور لابی کی

لائسنس آف کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو آگے صباحت کو بیٹھے دیکھ کر تعجب سے بولی۔

”ہائیں! تم جاگ رہی ہو؟“

”تنتے شور میں بھلا میں سو سکتی تھی۔“ صباحت اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے ناراض تھی۔

”تو کیا چاہتی ہو تم۔ خاموشی سے ہم تمہیں رخصت کر دیں۔“ وہ اپنی جگہ پر لیٹے ہوئے بولی۔

”نہیں خوب دھوم دھڑکے سے کرنا۔ لیکن یہ پندرہ دن پہلے سے ڈھولک پینے کی کیا تک ہے۔“

”ناراض کیوں ہوتی ہو۔ یہ تو میری خوشی ہے تمہیں اگر اچھا نہیں لگ رہا تو کل سے نہیں بجے گی ڈھولک
 دو لک۔“ وہ کہتی ہوئی دوسری طرف کروت بدل گئی۔ جانے کیا تھا اس کے کعبے میں کہ صباحت پہلے ایک دم

خاموش سی ہو کر اسے دیکھ گئی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”مدو! ادھر میری طرف دیکھو۔“ اس نے دیکھا نہ کچھ بولی۔

”مدو! کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم رو رہی ہوناں۔“ صباحت کو اس کا رونا محسوس ہو رہا تھا۔ جب ہی بے چین ہو کر
 اسے جھنجھوڑنے لگی۔

”تم رو رہی ہوناں مدو! تم رو رہی ہوناں۔“

”ہاں۔“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی تو صباحت نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا
 یا اور اس کے سر پر اپنی پیشانی ٹکائی ہوئی بولی۔

”ممت رو مدو! مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔ میری بات بری لگی ہے تمہیں یا کسی اور نے کچھ کہا ہے۔“

اس نے آہستہ سے سراؤ نچایا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا۔“

”بس میرا دل چاہ رہا تھا رونے کو۔“ اس نے کہا تو صباحت کچھ دیر تک اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس
 کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

”پتا ہے بنا کسی بات کے رونے کو دل کب چاہتا ہے۔ جب اندر کوئی احساس جاگتا ہے یا کوئی درد۔“

اس کی بھیگی آنکھوں میں کچھ خیر سمٹ آیا تھا۔

”میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔ اس احساس اس درد کا نام ہے محبت۔“ صباحت نے معنی خیز شریر مسکراہٹ کے
 ماتھ کاٹوہ نظرس چرائی ہوئی بولی۔

”مجھے پتا ہے۔“

”واقعی پھر جلدی سے بتاؤ کون ہے؟“ صباحت نے خوش ہو کر پوچھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”انجان مت بنو مدو! میں بہت دنوں سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں۔ باتیں کرتے کرتے کھو جاتی ہو۔ آنٹوں پر
 بوکتی ہو اور صبح تو میں نے تمہیں اپنے آپ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جبکہ ابھی رو رہی تھیں بنا کسی بات کے۔“

”تھینکس۔“ شاہ سکندر کی نظروں میں تشکر تھا اور ممنونیت کہ اس نے ان کا بیان رکھ لیا تھا۔
 گو کہ رات اتر آئی تھی پھر بھی انہوں نے گاڑی ساحل کے قریب جا کر روکی تھی۔ اندھیرے میں سمندر نظر
 نہیں آ رہا تھا لیکن لہروں کا شور اس کے ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔
 وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی بالکل انجانے میں اس جگہ آئی جہاں برسوں پہلے انہوں نے لفافے میں بند
 آزادی کا پروانہ اسے تھمایا تھا۔

شاہ سکندر جتنے سرشار آئے تھے اس جگہ کو دیکھ کر انہیں شدید دھچکا لگا تھا اور بیٹھے ہوئے بے اختیار کہہ
 گئے: ”یہاں سے ہم جدا ہوئے تھے۔“

آسیہ نے جو کچھ کہہ سیکھا پھر اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں لکھت دھندلا گئی تھیں۔
 ”بہت مشکل ہے فرار، کم از کم اس شہر میں تو ناممکن۔“ قدم قدم پر یادیں بھری پڑی ہیں۔ ”شاہ سکندر نے کہہ کر

سمری سانس کھینچی تھی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔

خاموشی	کا	تو	نام	ہوتا	ہے
دیر	یوں	بھی	کلام	ہوتا	ہے
آنکھ	سے	آنکھ	نہیں	ملتی	ہے
دل	ہم	کلام	ہوتا	ہے	ہے

اور سانس بدل رہے تھے۔

جذبہ بول رہے تھے، نو وقت اور عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔

میں برسوں میں کس پر کیا بیتی؟ ہوا میں بوجھ رہی تھیں۔

آسیہ کی نظریں تاریک آسمان پر دوڑتے بھٹکنے لگیں۔ ہمیں کوئی ستارہ نہیں تھا۔

پتا نہیں کہاں چھب گئے تھے وہ سب تارے جو اس کے رت جھگوں کے امین تھے۔ وہ چاند جو اس کے

آنسوؤں پر بھی مسکراتا اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

وہ لکھاؤں کی راہ گز جہاں ہر قدم پر اس سے ایک ہی سوال ہوتا۔ تیرا ہم سفر کہاں ہے۔

کیسی دھندھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”آسیہ۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے پکارا تھا۔

بہ ذرا سا چونکی پھر ان کی طرف متوجہ تو ہوئی لیکن انہیں دیکھا نہیں۔

”ایک بات پوچھوں؟“ شاہ سکندر براہ راست اسے دیکھتے ہوئے پکڑا رہے تھے۔

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ قدرے رک کر بولے تھے۔

”تم نے پھر شادی کیوں نہیں کی؟“

”کیا سنا جاہیں گے۔“ چچ یا جھوٹ؟“ وہ اپنی انگلی میں وائٹ گولڈ کے رنگ کو بہت دھیرے دھیرے گھما رہی

تھی۔ اس کی نظریں بھی اس پر جمی تھیں۔

”جو تم آسانی سے بول سکو۔“ شاہ سکندر نے کہا تو اس نے ایک دم سرواں چا کر کے انہیں دیکھا پھر دکھ سے گویا

ہوئی۔

”آسانی سے تو ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کی خاطر۔ ہر وہ عورت جو ایسے کسی ایسے سے دو چار ہوتی

ہے وہ بیک وقت ہی ہے اور شروع میں تو یہی چاہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے عورت اپنے لیے سوچنے لگتی

یہ ساری علامات ظاہر کرتی ہیں کہ کسی مسافر نے تمہارے دل کی کشتی میں ٹھکانا کر لیا ہے۔“ صبا کچھ ہلکے
 پھلکے انداز میں اس پر گرفت کر رہی تھی۔

”لیکن مدد جواب تم کوئی دھوکا مت کھانا۔ پہلے دیکھ لینا کہ اس کی محبت میں کتنی سچائی! کتنی ایمانداری ہے۔“

”سچائی ہی سچائی! ایمانداری ہی ایمانداری۔“ وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔

”میں حیران ہوں کہ میری تمام تر خاموشی، میری نظروں اور عداوتوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتا رہا کرتا

ہے۔ میں اس کی نفی کرتے کرتے بارگئی صبا، وہ محبت کا آسمان ہے۔ جانے کب سے اس نے میرے لیے اپنی

بانہیں وا کر رکھی ہیں۔ میں سراٹھا کر اسے دیکھ سکتی ہوں لیکن چھو نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مجھے اپنا آپ

بہت کمتر بہت حقیر لگنے لگا ہے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں صبا! پھر تم کیوں اسے مجبور کرتی ہو کہ وہ مجھ سے اپنی

محبت کا اظہار کرے۔“

♥ ♥ ♥ ♥

شاہ سکندر کے لیے شاہ بونس کا آنا اور مدیہ کے لیے شاہ تیمور کا پرنزل دنا دونوں باتیں ہی غیر متوقع تھیں

لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا کیونکہ شاہ بونس سب سے بڑے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس لیے انہیں صاف جواب بھی نہیں دے سکے اور یہی کہا کہ وہ مدیہ کی ماں سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔ پھر ان

کا ارادہ تو نہیں تھا اس سلسلے میں آسیہ سے بات کرنے کا لیکن یہ سوچ کر کہ شاہ پور میں قیام کے دوران ہو سکتا ہے

مدیہ اور شاہ تیمور کے درمیان اندراشیدنگ ہوئی ہو انہوں نے آسیہ سے بات کر لینا ضروری سمجھا۔ ان کے

خیال میں اگر آسیہ اس رشتے پر راضی ہوئی تو پھر صبا جت کے ساتھ ہی مدیہ کی شادی بھی کر دیں گے، اسی لیے

انہوں نے جلدی کی تھی اور اس شام آسیہ کے کھینک پہنچ گئے تھے۔

اس بار آسیہ نے ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں اپنے کمرے میں انہیں بلا لیا تھا اور ابتدائی رسمی جملوں

کے بعد ان کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

”میں مدیہ کی بات کرنے آیا ہوں۔ اتنی مین اس کی شادی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”صبا کے بعد۔“ آسیہ نے بہت مختصر ”جواب دیا۔ تو وہ قدرے رک کر پوچھنے لگے۔

”کوئی ہے آپ کی نظر میں اس کے لیے کیا؟“

”میرا بھتیجا ٹیبل۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”ٹیبل۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے ”اوکے! یوں لگتا ہے“ ویسے میں بھی ایک پرنزل لایا تھا لیکن میرا

خیال ہے اب اس کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے یا آپ جاننا چاہیں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ آئی ایم سوری۔“

”تو سوری بھول جائیں کہ میں نے آپ سے ایسی کوئی بات کی ہے۔“ وہ کہہ کر فوراً ”موضوع بدل گئے۔“

”پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ ”لیکن یہاں رنگ ہیں نہ خوشبو اور موسم

کا بھی پتا نہیں چل رہا۔ کیا خیال ہے کہیں باہر چلیں، کھلی فضا میں کھلے آسمان تلے۔“

آسیہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی اور سوچنے کے بعد بھی شش در شش میں تھیں۔ انہوں نے اپنا لٹریچر جو خانی

میں اس کی ٹیبل پر رکھ دیا تھا وہ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے گویا چلنے کا اشارہ دیا تھا پھر شہر گر گیا ہوئے۔

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں

چلو اس شہر کو آگ بار پھر سے دیکھ تو آئیں

آسیہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اٹھتی ہوئی بے ساختہ گویا ہوئی تھی۔

بہت دن سے سمندر کی ہوا گم صم سی آتی ہے۔

نہ ہوں طوفانوں کے سن پر بیٹھنے دیکھ تو آئیں

ہے لیکن اس کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بچوں کے ساتھ کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ بچوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی، یوں بقیہ ساری زندگی ایک ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں گزر جاتی ہے جو اس کے ساتھ اس کے بچوں کو بھی تحفظ دے سکے اور ایسا شخص ہزاروں نہیں لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔“

شاہ سکندر بغور اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس کی بات حتم نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ”سانس لینے کو رکھی تھی کہ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گئے۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ حالانکہ میرے ماں باپ بھائیوں اور بھانجوں نے بہت چاہا اور وہ جولا لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے وہ بھی خود چل کر میرے پاس آیا۔ وہ بہت نائس بہت فیئر تھا لیکن۔“

وہ بولتے ہوئے کچھ کھوسی گئی تھی۔

لیکن شاہ سکندر کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔

”میرا دل نہیں مانتا کہ میں اس کے ساتھ منافقت کروں۔ اس کے سچے جذباتوں کے ساتھ بے ایمانی کروں۔ گوکہ اپنے دل کی بستی سے میں نے وہ سارے پھول خود اپنے ہاتھوں سے نوج ڈالے تھے جن کی آبیاری میں میری ساری محبتیں شامل تھیں اور محبتیں تو فنا نہیں ہوتیں شاہ سکندر!“

انسان فانی ہے، روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا پھر میں ایسی کوشش کیوں کرتی۔

کیا ہوا بادل کی بستی اتر گئی۔

کیا ہوا جو قربتیں فاصلوں میں بدل گئیں۔

یہ سب تو وقت کی ادائیں ہیں۔

کبھی دے جاتا ہے۔

کبھی لے جاتا ہے۔

یہی زندگی ہے۔

اور زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی کھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

اور میری روح میں جو محبت رچ بس گئی اسے نکال پھینکنے پر میں قادر ہی نہیں تھی۔ پھر کیسے میں کسی اور کا ہاتھ تمام لیتی۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہوتی۔ اس کے ساتھ خود اپنے ساتھ اور اس بے ایمانی پر میری محبت روتی، تڑپتی سکتی نہیں یہ مجھے منظور نہیں تھا۔“

شاہ سکندر اپنی جگہ بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ نظریں اس محبت و وفا کی دیوی پر جم کر رہ گئی تھیں اور سماعتوں میں صرف اس کی آواز تھی۔ جیسے کائنات میں بس ایک وہی سچ ہے، وہی حقیقت باقی سب فریب۔

جانے ایک طویل خواب کے بعد اب بیداری کا وقت آیا تھا۔

یا۔

ساری عمر جاگتے جاگتے تھکی ہوئی آنکھوں میں اب نیند اتری تھی۔ کچھ بھی ہو، یہ لمحے خواب یا حقیقت زندگی کا حاصل تھے ان کے سینے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا تھا۔

”اے وقت بس اب ٹہر جا۔ اس سے آگے اب کچھ نہیں ہے۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش۔

نہ امنگ نہ ترنگ۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش

نہ رنگ نہ ترنگ

تو اب کس کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلے گا

زندگی تو بس یہیں تک تھی

اس کے بعد روح کا سفر ہے اور تو روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

کہہ دے اس بے درد دنیا سے کہ

روح سے روح کا ناتا جڑ گیا ہے اب اسے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تو بھی نہیں، تو بھی نہیں۔

ان کے سینے میں درد بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

”اس!“ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی ان کے ہونٹوں سے بہت مدھم آواز نکلی تھی۔ پھر بھی آسیہ نے فوراً سراونچا کیا اور انہیں سینے پر ہاتھ رکھے جھکتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”سکندر! سکندر!“ بے حد پریشان ہو کر وہ انہیں پکارنے لگی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے بہت ہمت کر کے انہیں گھسیٹ کر وچیں پھیر لی زمین پر لٹا دیا اور ان کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر زور زور سے دبانے کے ساتھ مدد کے لیے لوگوں کو پکارنے لگی۔

ادھر ادھر سے کافی لوگ جمع ہو گئے کسی نے موبائل پر امبولینس بلالی۔

اور امبولینس کے آنے تک وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف رہی تھی۔



ایک ایک بل قیامت تھا۔ اس کی نظریں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ ذہن اور دل دونوں ہی کسی نامعلوم شے میں جکڑ گئے تھے۔ جب ہی ہونٹوں پر کوئی دعا نہیں تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر نے آکر اسے متوجہ کیا تب بھی وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا تو اس کا سر آپ ہی آپ نفی میں ہل گیا۔

”کسی کو بلا لیں۔“ ڈاکٹر نے پھر کہا تو اس کا سما ہوا دل مزید سہم گیا۔ بہت کوشش کر کے بولنا چاہا تو بس ایک ہی لفظ کہہ سکی۔

”ک۔۔۔ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیں۔“

”مم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں وہ۔۔۔“ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔

”دعا کریں۔“ ڈاکٹر اسی قدر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”دعا۔“ اس کے احساسات پر جیسے کوئی ہتھیوڑنے والی ضرب پڑی تھی، اور دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”میرے اللہ۔ میرے اللہ۔“ اس سے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یونہی اللہ اللہ کا ورد کرتے ہوئے اس نے پی سی او کا رخ کیا۔ پھر گھر کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ کتنی دیر بعد ریسیور اٹھنے کے ساتھ ہی ڈھولک کی آواز نے اس کے اندر کی دنیا تہہ بالا کر دی تھی۔ اس کے بعد غالباً ”مدحہ تھی۔“

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔“

”میرے خدا۔“ اس نے آہستہ سے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد علی جمائیکر کے نمبر ڈائل کیے تو ادھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی آواز آئی تھی۔

”ہیں۔۔۔ علی جمائیکر۔“

”علی! یہ میں ہوں، آئیہ، وہ کسی طرح اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔

”جی آئی! آخریت؟“ علی جھانگیر نے اس کی بدلی ہوئی آواز سے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے، بیٹا! میں یہاں کارڈیو سے بول رہی ہوں۔ تم آگے آ سکتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔“

”میں آ رہا ہوں آئی! آپ پریشان نہیں ہوں اور پلیز یہ تو بتائیں کہ کون۔“

”بس تم آ جاؤ۔“ اس نے غلی جھانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا اور فون رکھ دیا۔ پھر کو ریڈور تک آئے اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”میرے اللہ۔“ میری بچیوں کو اب کا باپ ملا ہے۔ ان کے سروں پر یہ سائبان سلامت رکھنا۔“ اس نے کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر ان ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا کیونکہ آنسو روانی سے چھلک گئے تھے اور اس تیزی سے آ کے ہونٹ حرکت کرنے لگے تھے۔ ساری دعائیں اس شخص کے لیے تھیں جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بہت تھا۔

تقریباً اندرہ منٹ بعد علی جھانگیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔

”بہن آئی!“

اس نے چونک کر ہاتھ نیچے گرائے تو اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیاں دیکھ کر علی جھانگیر مزید پریشان ہو گیا۔

”آئی پلیز! بتائیں کیا ہوا ہے۔“ صاحبت اور مدحیہ۔“

وہ زور زور سے نفی میں سر ہانے لگی۔

”پھر کون ہے یہاں؟“ وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیوں پر۔

ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ رک کر بولی۔

”شاہ سکندر۔“

”سکندر بچا۔“ کیا ہوا ہے انہیں؟“ علی جھانگیر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں کو زور سے دبایا تھا۔

”ہارٹ۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”اوہ گا!“ علی جھانگیر کے ذہن میں کتنے سوال ابھرے۔ کب، کہاں، کیسے لیکن اس کی حالت کے پیش نظر۔

نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”سب ٹھیک ہو گا آئی! آپ پلیز خود پر قابو رکھیں، میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“

”سنو! میرے گھر فون کر گئے نیل سے کہنا یہاں آ جائے۔ خیال رکھنا مدحو اور صبا کو ابھی معلوم نہیں، چاہیے۔“

”جی بہتر۔“ وہ تسلی کے انداز میں اس کے ہاتھ تھپک کر پہلے کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود نرس سے ڈاکٹر کا محلہ کر کے فوراً اس طرف چل پڑا۔

راہداری میں تیسرے دروازے پر ڈاکٹر اکرام اللہ کے نام کی تختی دیکھ کر اس نے اس دروازے پر آہستہ۔

دستک دی اور کم ان کی آواز پر اندر داخل ہو کر بولا۔

”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام۔“ جواب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جب سے اپنا کارڈ نکال ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

”سر شاہ سکندر حیات میرے بچا ہیں۔“

”اوہ۔“ ڈاکٹر نے ہونٹ، سکیٹر کر اس کے کارڈ پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

”بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ کریں۔“ اس بات کے جواب میں وہ کیا کہتا۔ چپ چاپ انہیں دیکھے گیا۔

”ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آجے زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ دعا کریں ان کی زندگی۔“

”آمین!“ اس نے پیپر پر ہاتھ جما کر گویا خود کو سہارا دیا پھر ٹیلی فون کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے ڈاکٹر شاہ کرنے کے ساتھ ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔

”تھنک یو۔“ اس نے بیٹھے ہی آئیہ کے گھر کے نمبر ڈائل کیے اور اس کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ ریسپونڈر اٹھتے ہوئے گھر کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو ایک لمحہ کو وہ چکرا گیا کہ جہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں وہ یہ خبر کیسے دے۔

”ہیلو، ہیلو۔“ اس بار ادھر سے نیل بول رہے تھے۔

”السلام علیکم نیل بھائی! میں علی جھانگیر۔“ وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”خیریت علی! اس وقت کیسے فون کیا؟“ رات کے دو بجے نیل کی تشویش فطری تھی۔

”بس نیل بھائی خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ ابھی کسی سے نہیں کہیں اور فوراً کارڈیو آ جائیں۔ سکندر و میریس انیک ہوا ہے۔ آئیہ آئیہ بھی ہمیں ہیں۔“

اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ کر ان کا جواب نے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر شاہ پور کے نمبر ڈائل کرنے لگا کیونکہ ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اس لیے اس نے بابا جان کو اطلاع کرنا ضروری تھا۔

”ہیلو!“ کتنی دیر بعد بابا جان کی نیند میں ڈوبی آواز آئی تھی۔

”السلام علیکم بابا جان! میں علی بات کر رہا ہوں۔“

”علی! بابا جان کو غالباً“ بیدار ہونے میں کچھ وقت لگا۔“ ہاں علی! کیا بات ہے؟“

”وہ بابا جان۔“ وہ اسی قدر کہہ رکھا۔

”ہاں کو، ہم سن رہے ہیں۔ کیا پھر تمہاری شادی میں کوئی۔۔۔“

”میری شادی کو گولی ماریں بابا جان! بس آپ فوراً یہاں آ جائیں، سکندر بچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ان ات کاٹ کر بولا۔

”ک۔۔۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ بابا جان اب ٹھٹھکے تھے۔

”آپ آ کر دیکھ لیں۔“ وہ ہارٹ انیک کا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”پہلے ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔“ بابا جان دھاڑے تھے۔

”ڈاکٹر کی کپاس ہیں کارڈیو میں۔ آپ کو آنے میں تین گھنٹے لگیں گے بابا جان۔“ اس نے وقت کی نزاکت کا س دلا دیا۔

”ہاں، ہاں، ہمیں معلوم ہے۔ ہم بس ابھی آرہے ہیں۔ تم سکندر کے پاس رہو۔“

”ہاں ہی کے پاس ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون رکھ دیا پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے ان کے کمرے سے نکلا تو ار ہی میں نیل مل گئے۔

”کیسے ہیں انکل سکندر؟“ نیل نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ بس ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”دعا کریں، چوبیس گھنٹے خیریت سے گزر جائیں۔“

”تقی سیریس کنڈیشن ہے؟“

”ہوں۔“ اس نے ہوں کی صورت گہری سانس خارج کی پھر انہیں لے کر آئیہ کے پاس آ گیا۔

آئیہ نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”پھوپھو!“ نیل نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”آپ بہت ہمدرد ہیں پھوپھو! آپ کو حوصلہ نہیں ہارتا چاہیے۔ اللہ چاہے گا انکل بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 ”آسیہ کی آنکھوں میں رنے ہوئے آنسو پھر قطرہ قطرہ اس کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے۔
 ”رو میں نہیں پھوپھو پلیز۔“ نیل نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔
 ”مدد اور صبا اپنے باپ سے مل کر کتنی خوش تھیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”ان کی یہ خوشی قائم رہے گی انشاء اللہ۔“ نیل نے فوراً کہا تو وہ دل میں آمین کہہ کر پوچھنے لگی۔
 ”تم نے انہیں بتایا تو نہیں؟“
 ”نہیں البتہ حلیل بچا سے کہہ آیا ہوں۔“ نیل اسے جواب دے کر علی جمائیکر کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”علی! بیٹھ جاؤ یا رک ٹھیک جاؤ گے۔“
 ”آئی ٹھیک گئی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ انہیں گھر لے جائیں۔“ علی جمائیکر نے رک کر کہا تو نیل نے آ۔

کویوں دیکھا جیسے چل رہی ہیں۔
 ”نہیں بیٹا! جب تک ڈاکٹر طہینان نہیں دلاتے میں نہیں جاسکتی۔“ آسیہ کا جواب سن کر علی جمائیکر نے م کچھ نہیں کہا اور اپنی رست واپس پر نظر ڈال کر ٹھٹھا ہوا آگے چلا گیا۔
 پھر جس طرح وہ بار بار گھڑی دیکھنے کے ساتھ ریٹنگ سے بچے جھانک رہا تھا اس سے نیل سمجھ گئے کہ اسے ک کا انتظار ہے اور ان کا ذہن شاہ جمائیکر کی طرف گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی لاشعوری طور پر ان ہی کا انتظار کرنے لگے۔
 ”آسیہ جتنی قرآنی آیات یاد تھیں ان کا ورد کرنے میں لگ گئی تھی۔
 پھر پھر کی اذانوں کے ساتھ ہی بابا جان کی آمد ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ شاہ جمائیکر تھے۔
 نیل نے دور ہی سے شاہ جمائیکر کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھنا چاہتے تھے کہ ان ساتھ بابا جان کو دیکھ کر وہ قدرے خائف سے ہو گئے اور دوبارہ بیٹھ کر آسیہ کو متوجہ کرتے ہوئے بولے۔
 ”پھوپھو! شاہ پور سے لوگ آرہے ہیں۔“

آسیہ نے چونک کر سر اٹھا لیا تو اس کی پہلی نظری بابا جان پر پڑی تھی۔ گو کہ اس سے پہلے اس نے انہیں نیل دیکھا تھا پھر بھی وہ انہیں پہچان سکتی تھی۔ اونچا شملہ سر پر سجائے اس وقت وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ ان چال بھی بہت وہمی تھی۔ اس نے بہت خاموشی سے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا پھر سرگوشی میں نیل سے بولی۔

”گھر چلو نیل! اذان ہو رہی ہے۔ نماز گھر میں پڑھوں گی۔“

بابا جان نے بہت چاہا کہ وہ ایک نظری شاہ سکندر کو دیکھ لیں لیکن ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔ تب وہ بہت مایوس ہو کر اس جگہ آ بیٹھے تھے جہاں کچھ دیر پہلے آسیہ بیٹھی تھی اور وہ تو نہیں البتہ شاہ جمائیکر آسیہ کو دیکھ چکے تھے اس لیے بابا جان کے ساتھ بیٹھے ہوئے انہوں نے اشارے سے علی سے پوچھا کہ آسیہ کہاں گئی۔ جواب میں ان نے لا علمی کا اظہار کیا تھا۔

”کون لایا تھا سکندر کو یہاں؟“ بابا جان نے علی کو دیکھ کر پوچھا تو وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”جانتا نہیں بابا جان۔“

”تمہیں کیسے خبر ہوئی تھی؟“

”میرے پاس فون آیا تھا۔ رات ایک بجے کے قریب کہ شاہ سکندر کو انیک ہوا ہے اور وہ کارڈیو میں ہیں۔ بہر اتنا سن کر ہی میں بھاگا چلا آیا۔ پھر ڈاکٹر نے ان کی کنڈیشن معلوم کرنے کے بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“
 پورے دھیان سے بابا جان کی طرف متوجہ تھا کہ ان کی ہر بات کا جواب دے سکے۔

اس کے گھر میں خبر ہے، مہر النساء اور بچوں کو؟“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اگر ہوئی تو مہر النساء بچی یہاں موجود ہوتیں۔“
 ہوں۔“ بابا جان ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگے۔
 ”اکثر کیا کہتے ہیں؟“

”جہا نکیر نے کوئی جھوٹی اس دلائے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔
 جاؤ معلوم کرو ڈاکٹر سے۔ اگر اس کے بس میں نہیں ہے تو ہم باہر لے جاتے ہیں سکندر کو۔ جاؤ جمائیکر تمہا بات۔“ بابا جان کو علی کی خاموشی بری طرح کھٹکی تھی۔

میرے بابا جان! صبر سے۔ ایسی حالت میں ہم سکندر کو کہیں نہیں لے جاسکتے۔ دیئے اس طرف سے آپ ان رکھیں۔ یہاں بہت قابل ڈاکٹر موجود ہیں۔“ شاہ جمائیکر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔
 ”قابل ڈاکٹر ہمیں دیکھنے کیوں نہیں دے رہے۔“ بابا جان ٹوٹ رہے تھے۔ ”ایک نظر ہمیں ہمارے بچے کو بہت ناراض ہو کر آیا تھا وہ ہم سے ہمیں اسے منالینے دو۔“
 بابا جان! بابا جان پلیز۔“ علی جمائیکر نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ ”حوصلے سے کام لیں، چچا جان ٹھیک ہوں گے۔“

ٹھیک ہوتا ہے اسے۔ اس کی بیٹی کی شادی سر پر کھڑی ہے۔ جاؤ، بتاؤ اسے ہم آئے ہیں۔ اس کی بیٹی کو ت کرانے۔“ بابا جان کچھ دم لاچار بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔
 ”جہا نکیر کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تو آہستہ سے ان کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر دھیرے دھیرے کھسکتا ہداری میں نکل آیا۔ لیکن اس کا دھیان ابھی بھی بابا جان کی طرف تھا۔ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے اب تقدیر کے سامنے کس قدر بے بس ہو گئے تھے۔ سب آن بان شان دھری رہ گئی تھی۔

نر انسان سمجھتا کیوں نہیں
 تقدیر کے آگے کوئی تدبیر نہیں چلتی
 زکو خدا سمجھنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔
 ر خدا تو بڑا بے نیاز ہے اور اسی قدر باخبر۔
 اسے کچھ پوشیدہ نہیں
 سب دیکھتا ہے سب جانتا ہے۔
 انسان کس زعم میں ہے۔ سمجھتا ہی نہیں لیکن کب تک وہ ایک حد تک ہی دراز کرتا ہے۔
 اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ چاہے تو اولین لمحوں میں ہی گرفت کرے، لیکن وہ ہندوں کو موقع دیتا

کی شان ہے

ن شان والے سے کون لڑے گا ہے

میں

کے سامنے سب بے بس ہیں۔

ان لیتا ہے اور کوئی نہیں مانتا اور جو نہیں مانتا اس سے وہ یوں منواتا ہے۔

یہی سوچتا ہوا ہر نکل کر آیا تو اس کا دل چاہا یہاں سے کہیں بہت دور چلا جائے جہاں نہ کوئی بے بس ہو نہ بال اختیار۔ سب کے دکھ سکھ ایک جیسے ہوں۔ شاید بابا جان کی بے بسی پر اسے رحم آنے لگا تھا۔ اس لیے وہ نہیں سکا اور گھر چلا آیا۔

بیگم اس کے بارے میں کرم دین سے سوال جواب کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو اس پر ناراض ہونے

”یہ رات میں کون سی ڈیوٹی ہوتی ہے تمہاری اور مجھے جا کر نہیں جاسکتے تھے۔“

”آپ سو رہی تھیں۔“ وہ تھکا تھکا سا صوفے پر ڈھلے گیا۔

”اب تو جاگ رہی ہوں۔ اب بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟“ عارفہ بیگم اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

”کرم دین! ایک گھر پاس چائے اور ناشتے کا فن تیار کرو، جلدی۔“ اس نے پہلے کرم دین کو مخاطب کر کے کہا پھر عارفہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

”میں رات ہسپتال میں تھا، سکندر رچا کے پاس۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہائیں۔ اسے کیا ہوا؟“ عارفہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ ”بتاؤ ناں کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“

”بس امی دعا کریں۔ شاہ پور سے بابا جان بھی آگے ہیں۔ وہیں ہسپتال میں ہیں ابائے ساتھ۔ میں نے رات انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ البتہ سکندر رچا کے گھر میں ابھی کسی کو بتا نہیں ہے۔ آپ ایسا کرس ڈرائیور کے ساتھ مرنسٹا پیجی کے پاس چلی جائیں لیکن انہیں کچھ بتائیے گا نہیں، جب تک میں فون کر کے آپ کو چچا جان کی خیریت سے آگاہ نہ کر دوں۔“ وہ جیسے سوچ سوچ کر لول رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو علی؟“ عارفہ بیگم کا دل ہولنے لگا تھا۔

”فوفہ آپ تو... بس آپ کہیں نہیں جا رہیں، میں بیٹھی رہیں۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کرم دین سے کہیں جلدی کرے میں دو منٹ میں شاور لے کر آتا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ عارفہ بیگم نے کہا، لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے ہی کرم دین کو پکارتا ہوا نکلا تو آگے عارفہ بیگم تھرا س اور فون لیے کھڑی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے ساتھ جانے سے روکا اور ان کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے کر جلدی سے باہر نکل آیا۔

شاہ جہانگیر راجداری میں ٹھل رہے تھے اور بابا جان پتا نہیں کہاں تھے۔ وہ ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا شاہ جہانگیر کو پکار کر پوچھنے لگا۔

”بابا! بابا جان کہاں ہیں؟“

”ڈاکٹر کے کمرے میں۔ تم نے ناحق انہیں بلالیا۔ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے جواب دینے کے ساتھ کہا تو وہ گہری سانس لیٹھتے ہوئے بولا۔

”پریشانی کی بات تو ہے۔ چلیں آپ بھی ادھر ہی چلیں، میں آپ کے لیے ناشتا لایا ہوں۔ کسی طرح بابا جان کو بھی کچھ کھلا لایا۔“

”تم کو شش گرد دیکھو، مجھے تو منع کر چکے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے میں آئے تو آگے بابا جان بڑی عاجزی سے شاہ سکندر کو ایک نظر دیکھنے پر اصرار کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کے مسلسل اصرار سے تنگ ہو رہے تھے جب ہی شاہ جہانگیر کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”پلیز! آپ انہیں گھر لے جائیں۔ جب مریض کو ہوش آئے گا تب میں خود انہیں کال کر لوں گا۔“ شاہ جہانگیر نے یوں سر ہلایا جیسے یہ نہیں جائیں گے پھر آگے بڑھ کر بابا جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”بابا جان! دیکھیں علی آپ کے لیے گھرے ناشتا لایا ہے۔“

”پہلے ہم سکندر کو دیکھیں گے۔“ بابا جان کی انہی ضد تھی۔

”اوکے! ایسے! ایسے! ایسے! اگر وہ اجازت دیں گے تو۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ ”چلو! ہمیں لے جاؤ ڈاکٹر صدیقی کے پاس۔“ بابا جان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

آسیہ کی رات تو کارڈیو ہی میں آنکھوں میں کئی تھی پھر گھر آکر فجر کی نماز کے بعد وہیں جا نماز پر کچھ دیر کو اس کی لگ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ جلیبیر کی بلی کی مانند سارے میں چکرانی پھر رہی تھی۔ کبھی اپنے رے میں بند ہو کر نماز پکھا کر بیٹھ جاتی اور کبھی بھاگ کر فون کا ریہ پورا اٹھاتی۔

نبیل کے کہنے پر میمونہ بھابھی نے مدحیہ اور صاحت کو نیچے بلا کر کسی کام میں مصروف کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بالکل بے خبر تھیں ورنہ آسیہ کی حالت سے اگر وہ اصل بات تک نہ پہنچتیں تب بھی متوحش ضرور ہوتیں۔ پھر جانے کی کوشش بھی کرتیں اور نبیل کے لیے ان کے بے تگہ سوالوں کے جواب دیتا تھا مشکل تھا کیونکہ کانپا ذہن بری طرح متاثر ہوا تھا۔ خاص کر آسیہ کی پریشانی ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ سے تسلی بھی نہیں دے پارہے تھے نہ کچھ کھانے پر مجبور کر سکے۔

دوسرے میں میمونہ بھابھی اوپر آئیں تو انہوں نے زبردستی آسیہ کو تھوڑا کھانا کھلایا

”کوئی فون نہیں آیا۔ پتا نہیں سکندر کیسے ہیں؟ انہیں ہوش آیا کہ نہیں۔“

”آجائے گا ہوش اور وہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔“ میمونہ بھابھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”تم پہلے نے آپ کو تو سنبھالو اگر مدحو اور صابے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو۔“

”آپ نے انہیں بتایا تو نہیں؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں بتایا لیکن اب بتانے جا رہی ہوں، کیونکہ کسی بھی وقت ان کا ہسپتال سے بلاوا آسکتا ہے۔“ نہ بھابھی نے کہا تو اس نے چونک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کے دادا کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کو باپ کے پاس ہونا چاہئے اور ایسی حالت میں ہم منع بھی کر سکتے یا تم منع کرو گی؟“ میمونہ بھابھی نے وضاحت کر کے پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم پہلے سے انہیں تیار کر لیں۔ میں ابھی انہیں بلا کر بتاتی ہوں کہ۔۔۔“ دروازہ کھلنے لوازے سے میمونہ بھابھی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئیں تب ہی نبیل اندر آئے اور کارڈیس آسیہ کی بربھاتے ہوئے بولے۔

”چھو پھو! شاہ جہانگیر آپ سے بات کریں گے۔“

آسیہ نے جھپٹنے کے انداز میں کارڈیس لے کر کان سے لگایا تھا۔

”ہیلو!“

السلام علیکم ڈاکٹر صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ سکندر کا بتائیں انہیں ہوش آیا؟“ وہ کسی طرح اپنی بے تالی چھپا نہیں سکی۔

آپ کو بلانے کے لیے اس کا ہوش میں آنا شرط تو نہیں ہے۔ امی انی وہ بے ہوشی میں بھی آپ ہی کو پکار رہا ہے۔ شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ کچھ بوکھلا کر میمونہ بھابھی کو دیکھنے لگی تھی۔

”بلو! ڈاکٹر صاحبہ!“ ادھر سے شاہ جہانگیر نے پکارا تب وہ سنبھل کر بولی۔

”جی فرمائیے!“

آپ آج امی پلیز! اپنے مریض کے پاس۔“ شاہ جہانگیر نے ہاتھی لہجے میں کہا۔

میں۔۔۔“ وہ کہنے جا رہی تھی کہ میں آ رہی ہوں، لیکن اچانک بابا جان کا خیال آنے پر ہونٹ بھیج گئی جبکہ بن منتظر تھیں اور اس بار اس کی ساتویں سے جو آواز ٹکرائی وہ شاہ جہانگیر کی نہیں تھی۔

”مارے سکندر کی ہر سانس تمہیں پکار رہی ہے۔ آس تم ہی ہونا۔“

”لوں؟“ وہ بوڑھی کمزور آواز اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں الجھ گئی۔

”ہم شاہ حیات محمد۔“ بابا جان جو بیٹہ اپنا نام بتاتے ہوئے فخر سے گردن اکڑایا کرتے تھے اس وقت ان کا بھرانہ سالانہ تھا۔

آسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے گیا کرے۔ خود کو بے بس ہی محسوس کر رہی تھی بڑی مشکل سے خود کو سہارا دے کر بولی۔

”جی شاہ صاحب! کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”ہم کیا چاہیں گے وہ جو چاہئے والا ہے وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی پکار پر آؤ گی یا ہم فریاد کریں؟“

”جی نہیں آپ کو فریاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور کارڈ لیس ایک طرف رکھ کر آنکھوں میں اتر آنے والی نمی آنکھوں سے صاف کرنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے جہانگیر؟ ہوش آگیا سکندر کو؟“ میمونہ بھابھی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔

”چتا نہیں بھابھی! کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔ میں... میں جا رہی ہوں، نیل! مدد اور صبا کو بلاؤ انہیں بھی لے چلیں گے۔“ وہ میمونہ بھابھی سے نظریں چرا کر بولتی ہوئی بید سے اتر گئی۔

”انہیں کیوں لے جاؤ گی؟“ میمونہ بھابھی نے ٹوکا۔

آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور نیل کو اشارہ کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ نیل کے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھی تو صبا بحت اور مدحیہ سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا ہوا سپا کو؟“

”کہاں ہیں وہ اس وقت؟“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”تم دونوں اگر اس طرح کرو گی تو میں اتاریں گا۔“ نیل کی تنبیہ پر دونوں ایل دم خاموش ہو گئیں تو قدرے توقف سے آسیہ گردن پیچھے موڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! صبر اور حوصلے سے کام لو۔ تمہارے پیارے کارڈیو میں ہیں اور وہاں ان کے پاس تمہارے دادا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں انہوں نے ہی ہمیں بلایا ہے۔“

”دادا! یعنی بابا جان؟“ صبا بحت نے خفیف نظروں سے مدحیہ کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا پھر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

”مما! بابا کو انیک ہوا ہے؟“

”ہاں۔“ آسیہ نے اختصار سے کام لے کر اپنا رخ سیدھا کر لیا اور کچھ دیر آگے بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔

پھر ہینک سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ جانے، کچھ انجانے نقوش ابھرنے لگے۔

”بیٹا! اس وقت تمہیں صرف اپنے پیارے خیال کرنا ہے! انڈر اسٹینڈ۔“

”جی ممما! مدحیہ اثبات میں سر ہل کر سامنے دیکھنے لگی۔

بابا جان شاہ جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ بہت ست روی سے اسی طرف آرہے تھے۔

”مما وہ... بابا جان آرہے ہیں۔“ مدحیہ نے دھیمی آواز میں آسیہ کو متوجہ کر کے کہا۔

”ہاں! جاؤ ملوان سے۔ صبا کو بھی لے جاؤ۔“ وہ ان دونوں کو بھیج کر نیل کو پیچھے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی دیر سے پلٹ کر ڈاکٹر اکرام اللہ کے کمرے میں آئی۔

”اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب! میں ڈاکٹر آسیہ صلاح الدین۔“

”جی۔“ میں نے کل رات ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ ڈاکٹر عبدالوہاب۔ کے پاسٹیل میں ہوتی ہیں۔“

”آپ کی یادداشت کی داد دینی پڑے گی ڈاکٹر صاحب! کیونکہ یہ بہت پرانی بات ہے تقریباً پندرہ سال پرانی۔“

س نے کہا تو ڈاکٹر اکرام اللہ حیرت سے بولے۔

”واقعی۔“

”جی۔“

”اور اب آپ کہاں ہوتی ہیں؟“

”اپنے کلینک میں اور اس وقت میں اپنے عزیز شاہ سکندر حیات کو دیکھنے آئی ہوں۔“ اس نے رسمی گفتگو مختصر کر کے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

”ہاں۔ رات آپ شاہ سکندر کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ آپ کے عزیز ہیں؟“

”جی۔ اب کیسے ہیں وہ؟“

”بہتر تو نہیں کہہ سکتا بہر حال خطرے سے باہر ہیں۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”تھینک گاڈ! وہ ان کے ساتھ باہر آئی اور پھر آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے اس نے قصداً اس طرف نہیں دیکھا جہاں بابا جان اس کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ان کی نظریں اسی پر تھیں اور وہ محسوس بھی کر رہی تھی ہر بھی انہیں دیکھنے بغیر نظر آئی۔

شاہ سکندر کے چہرے پر آکسیجن مارک فٹ تھا۔ سانسوں کے ساتھ ان کی بند پلکیں بہت دھیرے دھیرے رکت کر رہی تھیں۔

وہ ان کے پیروں کے پاس رک گئی اور ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ ان کے پیروں پر رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا کہ ان کی سانسوں میں لسی اس کے نام کی منک نے سارے میں پائل چا دی۔

”آس۔ آس۔“

اس کے احساسات پر نرم نرم پھوار پڑنے لگی تھی۔

انسان فانی ہے روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔

زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی پھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

یہی کہا تھا ناں میں نے۔ یہی سچ ہے اب وقت ہمارا کچھ نہیں باگاڑ سکتا۔ ہم اس کی آنکھ پھولی سے بہت آگے نکل آئے ہیں جہاں دنیاوی بندھن کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اے میری روح کے امین۔ اس نے ایک بار پھر ان کا پاؤں دبایا تھا۔

شاہ سکندر کی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور پھر نظریں اس دفائی دیوی پر جم گئیں۔

کتنے لمحے سرک گئے۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ جانے کون سی دنیا کے دروازے پر تھے۔

”آس! آس! شاہ سکندر کی آواز واضح تھی۔

وہ چونکنے کے ساتھ جیسے ہوش میں آگئی۔ تب ہی اپنے سر پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

”کون؟“ اس نے ذرا سی گردن موڑی اور اپنے ساتھ بابا جان کو کھڑے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔

بابا جان نے آہستہ سے اس کا سر تھکا پھر شاہ سکندر کو آنکھیں بند کرتے دیکھ کر عاجزی سے بولے تھے۔

”ہم سے روٹھو مت سکندر! ہم تمہاری خوشی پوری کرنے آئے ہیں۔ تمہاری بیٹی کو بہت شان سے رخصت

کرا کے لے جائیں گے۔ سن رہے ہو ناں۔“ شاہ سکندر سب سن رہے تھے لیکن انہوں نے آنکھیں نہیں

کھولیں کیونکہ بند پلکوں کے اندر آنے والے دنوں کا بڑا حسین تصور تھا جس کی دلکشی ان کے چہرے کا احاطہ

کر رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”نیل بھائی! آپ کو ماما بلارہی ہیں۔“ صبا بحت نے نیل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

”کہاں ہیں چچھو۔“ نیل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اپنے کمرے میں۔“

”چلو۔“

”مجھے نہیں آپ کو بلایا ہے، آپ جائیں۔“ وہ کتابوں کے ریک کی طرف برحق ہوئی بولی۔
”اچھا دیکھو ابھی یہاں سے کوئی کتاب مت اٹھانا۔“ نیل اسے تنبیہ کرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر آسیر کے کمرے میں آگئے۔

”جی پھوپھو۔“

آسیر جانے کس خیال میں تھی چونک کر انہیں دیکھا پھر اپنے برابر اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

”آؤ بیٹا بیٹھو۔ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے تھے؟“

”نہیں پھوپھو۔“ نیل بیٹھ گئے۔ ”آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“

”کام تو نہیں ہے البتہ ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی۔“ نیل پوری طرح متوجہ ہو گئے تو کچھ دیر رک کر وہ کہنے لگی۔

”یہ اس روز کی بات ہے جس دن شاہ سکندر کو ہارٹ انیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ میرے پاس آئے تھے۔ مدیجہ کا رپوزل لے کر شاہ تیور غالباً ان کا بھتیجا ہے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم مدیجہ کو پسند کرتے ہو۔“

نیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نے چھب دکھائی تھی جس سے آسیر مطمئن ہو کر بولی۔

”تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا اور نہ ہی تم اسے میری خواہش سمجھ کر پوری کرنے کی سوچنا۔ تم صرف اپنا سوچو۔“

”آپ نے مدیجہ سے پوچھا ہے وہ کیا چاہتی ہے۔“ نیل نے اس کی یہ بات آن سنی کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

”وہ تمہیں چاہتی ہے۔“ پھر فوراً ہی احساس بھی ہو گیا تو بات بناتے ہوئے بولی۔ ”میرا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں پوچھا اور نہ پوچھوں گی کیونکہ وہ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ نہیں کر سکتی ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ میرے فیصلے سے اختلاف بھی نہیں کرے گی۔“

”پھر بھی پھوپھو! آپ اس سے پوچھ لیں۔“ نیل نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”یہ کام تم خود کر لو۔ اس کے بعد خود تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔“ آسیر نے بڑے آرام سے خود کو بری فیصلہ تو ہو چکا۔ نیل نے سوچا پھر آسیر کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آئے تو صباحت کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

”کیا وہ اپنے نیل بھائی؟“ صباحت واقعی ڈر گئی۔

”پھوپھو کو تم نے بتایا ہے؟“ انہوں نے ایسے ہی خونخوار لہجے میں پوچھا۔
”نہیں کیا؟“

”کہہ میں مدحو کو پسند کرتا ہوں۔“

”نہیں ایمان سے میں نے نہیں۔“ وہ اپنی صفائی میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو کر ان کی بات پر غور کرنے لگی پھر چیخ پڑی۔

”ہائے نیل بھائی! ماما کو پتا چل گیا۔ سچ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آپ اور وہ مدحو بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ بہت ایک دوسرے سے چھپایا آپ دونوں نے لیکن ممدادی گریٹ۔“

”شٹ اپ!“ نیل نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

”کوئی شٹ اپ وہاں نہیں۔“ وہ انہیں چراتی ہوئی بھاگ گئی۔

”نیل بھائی۔“ صباحت پھر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”مما کہہ رہی ہیں مجھے ہاسٹل لے جائیں بیبا کے پاس۔“

”کیوں وہاں مدحو ہے تو۔“

”مدحو ہے تو ایما مطلب۔ مجھے نہیں جانا چاہئے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، مجھے باباجان نے بلایا ہے ابھی ممّا کے پاس ان کا فون آیا تھا۔“ وہ نفسیلت بتانے لکھڑی ہو گئی۔

”اچھا چلو تم میں آ رہا ہوں۔“ وہ اسے لوگ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ صباحت کے ساتھ شاہ سکندر کے پاس پہنچے تو انہیں کمرے میں مدیجہ نظر نہیں آئی جبکہ تمام راستے وہ اس کے بارے میں سوچتے آئے تھے تب ہی کچھ بے چین سے ہو گئے اور شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے بے اختیار ان سے پوچھ لیا۔

”مدیجہ کہاں ہے؟“

”مدیجہ ابھی تو نہیں تھی۔“ شاہ سکندر نے باباجان کو دیکھا۔

”کون مدیجہ؟ وہ مہر النساء کے ساتھ بیچے اسٹور تک گئی ہے ابھی آتی ہوگی، تم بیٹھو بر خودارٹ باباجان نے ان کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی تو بیٹھے ہوئے ان کی نظر صباحت پر پڑی جو انہیں دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔
”ننان سینس“ وہ اسے ٹھور کر فوراً ”شاہ سکندر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے انکل آپ کی؟“

”پہلے سے بہتر۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر کتاب ہی مدیجہ آگئی اس کے پیچھے مہر النساء تھی جسے دیکھ کر نیل اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر بولے۔

”السلام علیکم۔“

مہر النساء جواب دینے کے بجائے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی تو ان سے پہلے صباحت بول پڑی۔

”یہ نیل بھائی ہیں آئی! ہمارے سب سے بڑے ماموں کے سب سے بڑے بیٹے۔“

”اچھا اچھا علیکم السلام۔“ مہر النساء نے اب جواب دیا تو مدیجہ بے ساختہ ہنسی پھر فوراً ”ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔
”بس چلتا ہوں، صبا کو چھوڑنے آیا تھا اور ہاں مدحو تم چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے آخر میں ایک دم مدیجہ کو مخاطب کر کے کہا تو صباحت نے بھی فوراً ”ان کی تائید کی۔

”ہاں مدحو! تم جاؤ نیل بھائی کے ساتھ بیبا کے پاس اب میں رہوں گی۔“

”نہیں نہیں۔“ مدیجہ نے اسی قدر کہا تھا کہ باباجان ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”باری باری ادھر الماس آنے کو تیار ہے۔ ویسے اب تین چار دنوں کی بات ہے ہجر انشاء اللہ سکندر گھر جائے گا تو سب مل کر اس کی سیوا کر لینا۔ کیوں سکندر؟“

”جی!“ شاہ سکندر اثبات میں سر ہلا کر مدیجہ اور نیل کو دیکھنے لگے۔ اچانک انہیں آسیر کی بات یاد آئی تھی، جب ہی کچھ کھوسے گئے تھے۔

”اوکے انکل!“ نیل مصدقہ کے لیے شاہ سکندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھنے لگے۔

”آپ کی اجازت سے مدیجہ کو لے جاؤں۔“

”ہاں ضرور۔“ شاہ سکندر نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تھینک یوس۔“ نیل نے ان کا شکریہ ادا کر کے باباجان سے معافہ کیا پھر مدیجہ کو ساتھ آئے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

رانداری میں انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار آہستہ کر لی تھی پھر بھی انتہام تک پہنچ گئے تھے تب مدیجہ آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے رک کر اس کا انتظار کیا پھر اسے ساتھ لے کر باہر آئے تھے۔

”تین چار دن کی تو بات تھی میں رہ جاتی بیبا کے پاس۔“ گاڑی میں بیٹھنے ہی مدیجہ نے انہیں سنا کر کہا۔

انہوں نے اس کی بات پر کوئی بصرہ نہیں کیا خاموشی سے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی تو وہ سامنے سے کیسٹ اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر اسے رکھ کر دو سرا کیسٹ اٹھایا پھر تیسرا آخر میں مایوس سی ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

نیل وقفے وقفے سے مر میں اس پر نظر ڈال رہے تھے اس کے رخ موڑنے پر انہوں نے ایک کیسٹ لگا کر آن کر دیا۔

دل نے یہ کہا ہے دل سے
محبت ہو گئی ہے تم سے

میری جان میرے دل میرے اعتبار کرو
بتانے پر قرار ہوں میں خود کو بے قرار کرو

نیل نے تو نبی ایک کیسٹ اٹھا کر لگا دیا تھا اب یہ اتفاق تھا کہ گانے کے بول ان کے جذبوں سے ہم آہنگ بلکہ ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ اور یہ حسین اتفاق انہیں برا بھلا لگ رہا تھا جب ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس موڈ میں نہیں تھے بلکہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔

اب یہ نیل بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی شور مچائی دھڑکنوں سے پریشان ہو کر سوچا۔ پھر بہت ہمت کر کے اپنا رخ سیدھا کیا اور ایکسٹ آف کر دیا تو ایک دم خاموشی چھا جانے پر نیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

اور دوبارہ ونڈا سکرین پر نظریں جمادیں۔

کچھ راہ تہ خاموشی میں کٹ گیا پھر باہر دیکھتے ہوئے وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“

نیل پتا نہیں کیوں خاموش تھے۔

”نیل بھائی!“ وہ ان کا بازو ہلانے لگی ”کہاں جا رہے ہیں؟“

”گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ پر۔۔۔ گھر۔۔۔“ عجیب جواب تھا وہ الجھ گئی۔

”کیا مطلب؟“

”کتے حصوں میں بنا ہوا ہوں میں پتا نہیں میری جڑیں کہاں ہیں، کہیں بھی مضبوطی سے قدم جما کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔“ نیل بولنا شروع ہوئے تھے کہ خاموش ہونے کے ساتھ ہی گاڑی بھی روک دی۔ تو وہ گھر دیکھ کر بولی۔

”ارے یہ تو بڑے ماموں کا گھر ہے۔“

”ہاں میرے باپ کا گھر اسے میں اپنا گھر نہیں کہتا جیسے تم اپنے باپ کے گھر کو اپنا گھر نہیں کہتیں یہ ایک قدر مشترک ہے ہم میں۔“ نیل نے کہہ کر ایک نظرات سے دیکھا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ ان کی بات میں الجھ گئی تھی جب ہی ٹوکا نہیں کہ وہ جاہری سے کیوں جا رہے ہیں اور ابھی وہ ٹھیک سے کچھ نہیں پائی تھی کہ پھر گاڑی رگ گئی۔ اس بار سامنے عالیشان گھر تھا۔

”یہ۔۔۔؟“ اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

”یہ میری ماں کا گھر ہے، چلو تمہیں ان سے ملو اؤں۔“ نیل کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے۔ پھر نیل کا مٹن پیش کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا وہ خاصی حیران اور پریشان سی آ رہی تھی۔

”ارے تم تو یوں حیران پریشان ہو جیسے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”بے وقوف۔۔۔“ وہ مسکرائے اور گیٹ کھلنے پر اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئے۔

”سنی۔۔۔!“ لاؤنج میں رک کر انہوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ ”رونا بھی کہاں ہیں آپ۔“

”نیل بھائی، ممی! نیل بھائی آئے ہیں۔“ سامنے کے دروازے سے ایک لڑکی بھاگتی چلاتی، ولی آ کر نیل سے ٹکرائی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”یہ کون ہے نیل بھائی؟“

”مدھیہ میری پھوپھو کی بیٹی اور مدھیہ میری بہن رونا ہے۔“ انہوں نے تعارف کرایا۔

”ہاؤ سوئیٹ، گلیڈ ٹو میٹ یو۔“ رونا کا حلیہ ہی نہیں لہجہ بھی انگریزی تھا۔

”ٹھیک یو۔“ وہ کچھ خائف سی، دنگی تھی جب ہی تو ہاتھ مارا کچھ بے ہوش گئی تب ہی نیلہ ایک کمرے سے نکلتی

نیل بولیں۔

”نیل! کیسے ہو بیٹا! اتنے دنوں بعد آئے کہیں باہر چلے گئے تھے کیا؟“

”نہیں ممی! نہیں تھا آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک یہ لڑکی؟“ نیلہ اسے دیکھ کر بولیں۔

”مدھیہ ممی پھوپھو کی بیٹی۔“

”آہ کی! ارے یہاں آؤ بیٹی میرے پاس۔“ نیلہ نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا پھر اپنے ساتھ لے کر بیٹھنے لگیں۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”جی ٹھیک ہیں۔“

”ارے۔۔۔!“ نیلہ اس کی منمناتی آواز پر زور سے نہیں۔ ”تم تو بالکل اپنی ماں جیسی ہو۔ ڈرپوک، بزدل۔“

”کیا؟“ نیل اچھل پڑے۔ ”پھوپھو ڈرپوک بزدل نہیں ہیں ممی۔“

”تمہیں کیا پتا، اس عمر میں ایسی ہی ہوتی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے جائز بات بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”لیکن یہ تو کسی سے نہیں ڈرتی ممی! بلکہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔“ نیل نے شرارت سے اسے دیکھا۔

وہ رونا کیسی ہو کر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ تب نیل کو اس پر رحم آیا، موضوع بدل گئے۔

”سنی! نظر نہیں آ رہا ممی۔“

”وہ اپنے باپ کے ساتھ اٹلی گیا ہے۔“

”تم نہیں جانتیں۔“ نیل نے رونا سے پوچھا تو وہ تڑن کر بولی۔

”جہاں سنی جانے کا وہاں میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“

”اوں، وہ! تمہیں سنی کے ساتھ ضد میں اگلی چاہیے، جیو نا تب وہ تم سے۔“ نیل نے نرمی سے ٹوکا۔

”یہ بات آپ اسے سمجھائیں۔“

”اوکے بابا اوکے! اسے بھی بتا دوں گا۔“ نیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا ممی! اجازت دیجئے۔“

”ارے ابھی تو آئے ہو، بیٹھو میں کھانا لآؤاتی، وہ۔“

”کھانا پھر سنی ابھی ہمیں آگے جانا ہے۔“ نیل نے سہولت سے کھانے کو منع کر دیا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتے تھے کہ وہ خود ہی کھڑی ہو گئی۔

”اچھا بیٹی! اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اور تم پھر نہ رونا۔“ نیلہ نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔“ وہ رونا سے ہاتھ مار کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے نیل کہہ گئے۔

”ممی آپ پوچھتی تھیں تاکہ میں کس سے شادی کروں گا تو آج آپ نے اسے دیکھ لیا۔ اچھی بہنار۔“

”بہت اچھی۔“ نیلہ نے پہلے رونا بول دی۔ ”میں بھی آؤں گی آپ کی شادی میں۔“

”ہاں! رات ڈھل گئی۔“ باباجان نے اباجی کو گئے وقت سے نکال کر آنے والے روشن دنوں کی نوید دے کر بٹھایا پھر کہنے لگے۔

”ہم کبھی گئے وقت کا ملال نہیں کرتے۔ ہماری نظرس ہمیشہ آنے والے وقت پر رہتی ہیں۔“

”چھی بات ہے جو دسترس سے نکل گیا اس کا ملال کیسا۔“ اباجی کی تائید دیکھ بھری تھی۔

آسیہ نے ذرا سی کلکیں اٹھا کر اباجی کو دیکھا تھا پھر باباجان کی طرف متوجہ ہو گئی، دپو چھ رہے تھے۔

”پھر آپ نے کیا طے کیا۔ دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ کریں گے؟“

”جی ہاں! میں یہی چاہتی ہوں“ آگے آپ کی مرضی۔“

”ہماری کیا مرضی، ہم تو ایک عرض لے کر آئے ہیں۔“ باباجان نے کہا تو اباجی فوراً بولے۔

”جی فرمائیے۔“

”دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ ٹھیک ہے لیکن ہماری خواہش ہے کہ مدیہ ہمارے گھر سے رخصت ہو۔

یعنی شاہ پور سے، ہم وہاں سے علی کی بارات لے کر آئیں گے اور صاحت رخصت ہو کر وہیں شاہ پور جائے گی پھر

اگلے روز ویسے کی تقریب کے ساتھ ہم مدیہ کی رخصتی رکھیں گے۔“ باباجان اپنا پروگرام تکرار کرتے ہوئے

لگے۔ فوراً کسی نے جواب نہیں دیا۔ یوں بھی گفتگو صرف باباجان اور اباجی کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس لیے سب

اباجی کو کہنے لگے کہ وہ کیا کہتے ہیں اچھوہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔

”ہوں اچھی بات ہے ایک بیٹی ماں کے گھر سے رخصت ہوگی تو ایک باپ کے گھر سے۔“

”واہ کیا پروگرام طے کیا ہے۔“ میوندہ بھابھی نے آسیہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں کہا پھر اٹھ کر مٹھائی لینے چلی

گئیں۔

پچھ دیر بعد میوندہ بھابھی واپس آئیں تو مٹھائی کے ساتھ مبارک سامت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ پھر بابا

جان نے اسی وقت مدیہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو آسیہ کے اشارے پر میوندہ بھابھی اسے تیار کرنے

کے لیے اوپر آگئیں۔

”صبا بیٹا! جلدی سے ایک بیگ میں مدھو کے کچھ کپڑے رکھ دو۔“ میوندہ بھابھی نے ان کے کمرے میں داخل

ہوتے ہی کہا تو وہ حیران ہو کر بولیں۔

”کیوں مای! مدھو کہاں جا رہی ہے؟“

”شاہ پور اپنے باباجان کے ساتھ۔“

”کیوں مای! میں نہیں جا رہی۔“ اس نے احتجاج کیا تو میوندہ بھابھی آگے جا کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر

بولیں۔

”بیٹا! اچھوہ دنوں کی بات ہے پھر ہم تمہیں رخصت کرا کے یہیں لے آئیں گے۔“

”بلے۔“ صاحت سمجھ کر خوشگوار حیرت میں گھبر گئی۔

”کیا کہہ رہی ہیں مای؟“ مدیہ کچھ سمجھتی کچھ نہیں۔

”صبا بیٹا! مٹی نہیں صبا بیٹا! جلدی کرو وہ لوگ جانے کو تیار ہیں۔“ میوندہ بھابھی اس کا گال تھپک کر صاحت

سے کشتی ہوئی چلی گئیں۔

”بے وقوف تمہاری شادی طے ہو گئی ہے نبیل بھائی کے ساتھ۔“ عمر جانے کب سے دروازے میں کھڑا تھا۔

مدھو کی ہونٹ شکل دیکھ کر چلتا پھرتا سرف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”ہائے بے چارے نبیل بھائی! ان کی ساری زندگی تمہیں ذرا ذرا سی بات کا مطلب سمجھانے گزر جائے گی۔“

”خبردار جو آگے ایک لفظ کہا تو درنہ میں ابھی نبیل بھابھی۔“

”نیا ہوتے تو آؤں تو شادی ہوئی ایسے ہے۔“ مٹی۔“

”بول۔“ نبیل جانے کس سوچ میں تھیں اپنے آپ اثبات میں سر ہانپتے تھیں۔

”اوکے ٹھیک۔“ نبیل نے متوجہ کیا تو دپو کھڑے تھے۔

”اچھا بیٹا! میں تمہاری چوچہ کو فون کروں گی مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی بہت اچھی لگی۔“

”تھیک ہے۔“ نبیل نے منکرات ہو کر خدا کا نام لے کر بابا پر آ کر دپو کی بیٹی تھی۔

”یہ تمہیں من مانا ہے۔“ نبیل کا اپنی انارٹ کر کے اسے مخاطب ہے بغیر کہنے لگے۔

”یہاں میں ایشیا تو ہے۔“ نبیل نے اپنے ماں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی باپ سے۔ اور اسے میں اپنی بہتر

نہیں سمجھتا کہ مجھے باپ سے اپنے پاس رحمت ہے۔ یہ وہ نہیں ہے ان دونوں سے پیہ کر جاننے والی ہستی ملی۔

پھوپھو ان کی عظمتوں میں پوشہ سلام کرتے رہوں گا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں بڑ

دئی۔ بلکہ تم دونوں سے ہی پتہ چلے گا۔ بابا ساتھ تھے اس وقت تھی میں زیادہ پھوپھو ہی کے پاس ہوتا تھا

ابھی۔ وقت نے میری آزمائش کی کہ مجھے ماں باپ اور پھوپھو میں۔ انتخاب کرنا پڑا تو میں پھوپھو کا اختیار

کروں گا۔

بہر حال ایسا وقت خدا کرے کبھی نہ آئے کہ مجھے انتخاب کرنا پڑے۔ زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہے یہی ٹھیک

ہے۔ میں ہمیشہ پھوپھو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ایک سعادت مند بیٹی کی طرح لیکن اس گھر میں نہیں۔ وہ اباجی

گھر ہے اور میری ماں جیسی پھوپھو نے ہماری خاطر اپنی زندگی اپنے اباجی کے گھر گزار دی لیکن ابھی بہت زندگی با

قیہ۔ ان کا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ انہیں اپنا گھر دے سکے۔ ہے ناں؟“ انہوں نے اسے گم سم حالت سے

نکالنے کی خاطر تائید چاہی تو گہری سانس کے ساتھ اس نے سر جھکا دیا۔

”جانتی ہو آج پھوپھو نے مجھ سے کیا کہا۔؟“ وہ آہستہ سے اس کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکرا کر بولے۔ ”م

وہ اپنی سر پھری بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔“

”میرے خدا! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”اور میں ان کی بات تو نہیں ٹال سکتا۔“ انہوں نے کن اکھیں سے اسے دیکھا۔

”کیوں کیوں نہیں ٹال سکتے؟“ وہ ایک دم جھج گئی۔

”مجھو رہی ہے۔“

”کوئی مجھو رہی نہیں آپ چاہیں تو صاف منع کر دیں۔“ وہ ساری محبتیں بھول کر ان کا بازو جھنجھوڑ کر بولی تھی۔

”اور اگر میں نہ چاہوں تو۔؟“ وہ ایک جھٹلے سے گاڑی روک کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر

مسکرائے تو وہ بری طرح سیٹھا گئی۔

”آپ۔۔۔ بہت۔۔۔“

نبیل نے آہستہ سے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

”برا نہیں ہوں میں۔“

”اچھے بھی نہیں ہیں۔“ وہ کہہ کر رخ موڑ گئی۔

تو نبیل نے شاید زندگی میں پہلی بار قہقہہ لگایا تھا۔



شاہ سکندر دسپانچ ہو کر گھر آگئے تھے اور اگلے ماہ انہیں بائی پاس کے لیے امریکہ جانا تھا اس لیے اس سے پہلے

ہی مدیہ اور صاحت کی شادی طے کرنے کے لیے شاہ سکندر اور شاہ جانیگر باباجان کو بھی اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ جنہیں دیکھ کر اباجی بے اختیار رو لے تھے۔

”بہت دیر گزری۔“

”ارے ارے۔۔۔! “عمر نے فوراً ”ٹوکا“ بھائی مت کہہ دینا نکاح ٹوٹ جائے گا۔“
 ”کہوں گی ایک بار نہیں سو بار کہوں گی۔“ نبیل۔۔۔! “بے ساختہ بولتے ہوئے اس کی زبان تالو سے چپک گئی۔
 ”ہاں ہاں بولو آگے بولو۔“ عمر اکسانے لگا۔
 ”تمہارا سہ۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر عمر کے سر پر دے مارا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا، تب ہی ثوبیہ بھاگتی آئی۔
 ”چلو ہمیں مدحو صبا نیچے سب بار ہے ہیں۔“

”مجھے بھی۔“ صبا حث نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
 ”کیوں تمہارا پردہ ہے سب سے؟“ عمر نے کہا تو وہ اسے دھکیل کر سب سے آگے چل بڑی لیکن ڈرائنگ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی وہیں رک کر انتظار کیا پچھد جیہ اور عمر کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”اوہ بیٹا!“ آسیہ اور شاہ سکندر بیٹیوں کو دیکھ کر ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے نئے اور دونوں ہی ہاتھ ان کی طرف برصائے تھے بالکل بے اختیاری حرکات تھیں جس نے سب کو اپنی اپنی جگہ جیسے ساکت کر دیا تھا۔

مدحیہ اور صبا حث نے بہت خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دھیرے دھیرے چلتی، دوئیں صبا حث آسیہ اور مدحیہ شاہ سکندر کے پہلو میں رکی تو ساکت و چوریکدم ممتحرک ہو گئے تھے۔
 ”چلو بیٹا۔“

”اجازت دیجئے۔“
 ”انشاء اللہ جلد ملیں گے۔“ مختلف آوازیں گونج رہی تھیں ساتھ گنگے مل رہے تھے اور ان گنگے ملنے لوگوں۔
 درمیان وہ ندی کے دو کنارے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے اندر اب گئے وقتوں کا ملال نہیں تھا بلکہ آئے وقتوں کے دنوں کا حسین تصور جہاں ان کی اولاد کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ جن کی دھمک انہیں اب سے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی۔

اور وہ دل جس میں محبت گھر کرے وہ پھولوں کی بستی اجاڑنے والے اسے خواہ کتنا ہی اجاڑ لیس وہ سدا مسکراتی رہتی ہے۔
 ”کیونکہ۔۔۔“
 ”محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔“

